ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری

DR. ZAKIR HUSAIN LIBRARY

JAMIA MILLIA ISLAMIA
JAMIA NAGAR

NEW DELHI

Please examine the book before taking it out You will be res-ponsible for damages to the book discovered while returning it

DUE DATE

*Cl. No.*____________ *Acc. No.*____________

Late Fine Ordinary books **25 p.** per day, Text Book **Re 1** per day, Over night book **Re 1** per day.

ISSN 0970-180x

28 DEC 1982
Dr. Zakir Husain Library
Jamia Nagar
J.M.I.

الرسالہ

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز



جلد دوم تیار

تذکیر القرآن

جلد اول : سورۃ فاتحہ۔ سورۃ بنی اسرائیل

جلد دوم : سورۃ الکہف۔ سورۃ الناس

قرآن کی بے شمار تفسیریں ہر زبان میں لکھی گئی ہیں۔ مگر تذکیر القرآن اپنی نوعیت کی پہلی تفسیر ہے۔ تذکیر القرآن میں قرآن کے اساسی مضمون اور اس کے بنیادی مقصد کو مرکز توجہ بنایا گیا ہے۔ جزئی تفصیلات اور غیر متعلق معلومات کو چھوڑتے ہوئے اس میں قرآن کے اصل پیغام کو کھولا گیا ہے اور عصری اسلوب میں اس کے تذکیری پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے۔ تذکیر القرآن عوام و خواص دونوں کے لیے یکساں طور پر مفید ہے۔ وہ طالبین قرآن کے لیے فہم قرآن کی کنجی ہے۔

EVO2

ہدیہ جلد اول ۱۰۰ روپیہ

جلد دوم ۱۰۰ روپیہ

مکتبہ الرسالہ، نئی دہلی

12177 27.1.88 Date

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اردو، انگریزی میں شائع ہونے والا

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

شمارہ ۱۳۴ جنوری ۱۹۸۸

فہرست

ماہانہ الرسالہ، سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳، فون: 697333, 611128

عمر بن عبد العزیز

عمر بن عبد العزیز (۱۰۱ ـ ۶۲ م) بنو امیہ کے امرار میں سے تھے ۔ ان کی ابتدائی زندگی تعیش کی زندگی تھی۔ ان کی رئیسانہ چال اتنی مشہور ہوئی کہ اس کو عمری چال (المشیۃ العمریۃ) کہا جانے لگا۔

۹۹ ھ میں سلیمان بن عبد الملک اموی کی وفات ہوئی ۔ اس کی وصیت کے مطابق حضرت عمر بن عبد العزیز خلیفہ مقرر ہوئے ۔ وہ اگرچہ بظاہر عیش وعشرت کے ساتھ رہتے تھے ۔ مگر ان کے سینہ میں ایک دردمندانہ دل تھا۔ چنانچہ خلافت کے عہدہ پر تقرر کے بعد ان کی زندگی بالکل بدل گئی۔ ذمہ داری کے احساس نے ان سے دنیوی لذت، وآرام کا احساس چھین لیا۔ ان کے ایک ساتھی ان کے بارے میں کہتے ہیں :

رأيتُه فى المدينة وهو أحسن الناس ملبسًا ومِن أطيب الناس ريحًا ومن اخيل الناس فى مشيته ۔ ثم رايتُه بعد ذالك يمشى مشيَةَ الرهبان۔

میں نے ان کو مدینہ میں دیکھا اور وہ سب سے بہتر لباس میں تھے ۔ اور سب سے اچھی خوشبو لگائے ہوئے تھے ۔ اور سب سے زیادہ امیرانہ چال چلتے تھے ۔ پھر میں نے ان کو اس کے بعد دیکھا کہ وہ درویش کی چال چل رہے تھے ۔

عمر بن عبد العزیز علم میں اتنے بڑھے ہوئے تھے کہ ان کی بابت ایک معاصر عالم نے کہا :
ما كان العلماءُ عند عمر بن عبد العزيز الا تلاميذ (عمر بن عبد العزیز کے سامنے علماء محض شاگرد معلوم ہوتے تھے)

عمر بن عبد العزیز سے پہلے بنو امیہ کے خلفار نہایت شان وشوکت کے ساتھ رہتے تھے ، مگر انھوں نے اس قسم کی تمام چیزوں کو چھوڑ دیا۔ خلافت کے عہدہ پر فائز ہونے کے بعد ان کے سامنے شاہانہ سواری لائی گئی جو نہایت شاندار اور مزین تھی، مگر انھوں نے اس کو قبول نہیں کیا۔ انھوں نے کہا کہ میرا جانور میرے لیے زیادہ ٹھیک ہے (دابتی اوفق لی)

حضرت عمر بن عبد العزیز شوریٰ کے اصول پر نہایت شدت کے ساتھ قائم تھے. خلافت

کے عہدہ پر ان کا تقرر سابق خلیفہ کی وصیت کے تحت ہوا تھا۔ مگر انھوں نے اس کو کافی نہیں سمجھا۔ اس سلسلہ میں تاریخ کا بیان ہے :

وجمع الناس فی المسجد، وکان من قولہ لھم : اِنّی قد خلعتُ ما فی اَعْنَاقِکم مِن بَیْعَتی، فَاخْتَارُوا لِاَنْفُسِکُمْ۔ فصاحَ الناسُ صیحۃً واحدۃ : قد اخترناك یا امیر المومنین۔

عمر بن عبد العزیز نے تقرری کے بعد لوگوں کو دمشق کی جامع مسجد میں جمع کیا۔ انھوں نے لوگوں سے کہا کہ میری بیعت کا قلادہ جو تمہاری گردن میں تھا اس کو میں نے اتار دیا۔ پس تم خود اپنے لیے کسی کو پسند کرکے خلیفہ بنالو۔ یہ سن کر تمام لوگ ایک آواز چیخ اٹھے : اے امیر المومنین ہم آپ ہی کو منتخب کرتے ہیں۔

سابق خلیفہ سلیمان بن عبد الملک کے انتقال کے بعد لوگ مسجد میں جمع کیے گیے۔ رَجار بن حَیوَہ نے سلیمان بن عبد الملک کا وہ وصیت نامہ پڑھ کر سنایا جس میں عمر بن عبد العزیز کو خلیفہ نامزد کیا گیا تھا۔ حضرت عمر بن عبد العزیز کا حال اس وقت یہ تھا کہ وہ خلافت کے لیے اپنا نام سن کر إنا للہ وانا الیہ راجعون پڑھ رہے تھے۔ اس تحریر کو سن کر وہ اپنی جگہ پر بیٹھے رہ گیے۔ ایک شخص نے ہاتھ پکڑ کر انھیں اٹھایا اور لے جاکر منبر پر بٹھایا۔ اس کے بعد خلافت کی بیعت ہوئی۔ جب آپ بیعت سے فارغ ہوکر گھر واپس آئے تو آپ کی داڑھی آنسوؤں سے تر تھی۔

خلافت کے بعد آپ کی خدمت میں سواری کے لیے شاہی گھوڑے پیش کیے گیے تو آپ نے فرمایا : میرا جانور میرے لیے زیادہ بہتر ہے (دابتی اوفق لی) اسی طرح آپ سے کہا گیا کہ شاہی محل میں قیام کریں۔ آپ نے فرمایا کہ میرا خیمہ میرے لیے کافی ہے (فی فسطاطی کفایۃ)

سلیمان بن عبد الملک کا ایک بھتیجا عبد العزیز بن ولید بن عبد الملک تھا۔ سلیمان بن عبد الملک کی وفات کے وقت وہ دار الخلافہ سے باہر تھا۔ اس کو عمر بن عبد العزیز کی بیعت کا حال معلوم نہ ہو سکا تھا۔ چنانچہ اس نے سلیمان کی وفات کی خبر سن کر خلافت کا دعوی کر دیا اور اپنی فوج لے کر دمشق کی طرف روانہ ہو گیا۔ جب وہ دمشق پہنچا اور اس کو معلوم ہوا کہ عمر بن عبد العزیز کے

ہاتھ پر خلافت کی بیعت ہوئی ہے تو بلا تاخیر وہ ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان کے ہاتھ پر خلافت کی بیعت کی۔

عبدالعزیز بن ولید نے کہا کہ مجھ کو آپ کی بیعت کا حال معلوم نہ تھا، ورنہ میں اپنی خلافت کا اعلان نہ کرتا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے کہا کہ اگر تم خلافت کے لیے کھڑے ہو جاتے تو میں ہرگز تمہارے مقابلہ پر نہ آتا بلکہ اس سے الگ ہو کر اپنے گھر میں بیٹھ جاتا۔ عبدالعزیز بن ولید نے کہا کہ خدا کی قسم آپ کی موجودگی میں کسی اور کو میں خلافت کا مستحق نہیں سمجھتا۔

مسلمانوں میں انتہا پسند خوارج کا ایک طبقہ پیدا ہو گیا تھا۔ وہ حضرت علی کے زمانہ سے ہر حکمراں کے خلاف جنگ چھیڑے رہتا تھا۔ مگر جب عمر بن عبدالعزیز خلیفہ ہوئے تو خوارج نے حکومت سے لڑائی ختم کر دی۔ انھوں نے کہا کہ ہمارے لیے جائز نہیں کہ ہم ایسے صالح آدمی سے جنگ کریں (ما ینبغی لنا أن نقاتل ھذا الرجل)

عمر بن عبدالعزیز ابتدا سے ایک حق پرست اور با اصول آدمی تھے۔ خلافت سے پہلے وہ مدینہ کے امیر تھے۔ ان کو حجاج بن یوسف کے ظلم کا حال معلوم ہوا تو انھوں نے اس کی شکایت لکھ کر خلیفہ کے نام روانہ کی۔ مگر حجاج خلیفہ کے ذہن پر چھایا ہوا تھا۔ چنانچہ حجاج کی معزولی تو نہیں ہوئی۔ البتہ اس شکایت کی بنا پر خود عمر بن عبدالعزیز امارت مدینہ سے معزول کر دیئے گئے۔ یہ واقعہ ۹۳ھ کا ہے۔

خراسان کے عامل جراح بن عبداللہ نے حضرت عمر بن عبدالعزیز کو لکھا کہ اہل خراسان بہت ناہموار لوگ ہیں، وہ تلوار کے بغیر سیدھے نہیں ہوں گے۔ اس لیے ان کے خلاف تلوار کے استعمال کی اجازت دی جائے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے جواب میں لکھا کہ تم جھوٹ کہتے ہو کہ اہل خراسان تلوار کے بغیر درست نہ ہوں گے۔ انصاف کرنا اور حق دار کو اس کا حق پہنچانا وہ چیزیں ہیں جو ہر ایک کو درست کر دیتی ہیں۔ اس لیے تم ان کے درمیان انھیں دونوں چیزوں کی اشاعت کرو۔

وقت کے تمام علماء نے آپ کے غیر معمولی علم کی گواہی دی ہے۔ مجاہد کا قول ہے کہ ہم عمر بن عبدالعزیز کے پاس اس خیال سے آئے کہ وہ ہم سے کچھ سیکھیں گے، مگر ان کے پاس آنے کے بعد ہمیں خود ان سے سیکھنا پڑا ـــــــ اس سے مراد کتابی علم نہیں، بلکہ وہ علم ہے جو

خشیتِ خداوندی (فاطر ۲۸) سے پیدا ہوتا ہے۔ کتابی علم کی ایک حد ہے، مگر خشیت کے ذریعہ ملنے والے علم کی کوئی حد نہیں۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز کا دینی مقام اتنا بلند ہے کہ وہ عمر ثانی کہے جاتے ہیں۔ ان کے مخالفین تک ان کی عظمت اور پاکبازی کا اعتراف کرتے تھے۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) کے مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ بنوامیہ میں وہ واحد شخص تھے جن کا احترام بعد کو آنے والے بنوعباس کرتے تھے، حتیٰ کہ وہ شیعوں کے درمیان بھی انتہائی محترم سمجھے جاتے تھے جو دوسرے مسلمانوں سے الگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے داماد علی کی پیروی کرتے ہیں:

He, alone of the Umayyads, was respected by the later Abbasid dynasty, and was highly regarded even among the Shi'ites, schismatic followers of Muhammad's son-in-law Ali (X/248).

جراح بن عبداللہ الحکمی خراسان کے عامل (گورنر) تھے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز کے پاس شکایت پہنچی کہ اہل ذمہ میں سے جو لوگ اسلام قبول کر لیتے ہیں، جراح بن عبداللہ ان سے بھی جزیہ وصول کرتے ہیں۔ آپ نے فوراً جراح بن عبداللہ کے پاس یہ حکم بھیجا کہ جو شخص نماز پڑھتا ہو اس کا جزیہ معاف کر دیا جائے۔ اس خبر کو سننے کے بعد لوگ کثرت سے اسلام میں داخل ہونے لگے۔

جراح بن عبداللہ نے حضرت عمر بن عبدالعزیز سے کہا کہ اگر ایسی پالیسی اختیار کی گئی تو ہماری آمدنی بہت کم ہو جائے گی اور حکومت کو سخت مالی نقصان ہوگا۔ آپ نے فرمایا: تمہارا برا ہو، محمدؐ ہدایت کے لیے بھیجے گئے تھے نہ کہ مال گزاری وصول کرنے کے لیے (ویحک اِنّ محمداً بعث ھادیًا ولم یبعث جابیًا)

زندہ یا مردہ

گاڑی کے چلنے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ اس کو ایک ڈرائیور چلائے۔ اور دوسری صورت یہ ہے کہ اس کے انجن کو چلا کر اس کو سڑک پر چھوڑ دیا جائے۔ بظاہر دونوں گاڑی چلتی ہوئی نظر آئے گی۔ مگر دونوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ ڈرائیور والی گاڑی چل کر اپنی منزل پر پہنچتی ہے۔ مگر بے ڈرائیور گاڑی کا انجام صرف یہ ہے کہ وہ کچھ دیر تک دوڑے اور اس کے بعد کسی چیز سے ٹکرا کر ختم ہو جائے۔

ایک باہوش ڈرائیور جب گاڑی کو چلاتا ہے تو وہ راستہ کو دیکھتا ہوا گاڑی چلاتا ہے۔ ضرورت کے مطابق وہ کبھی چلتا ہے اور کبھی رک جاتا ہے۔ کبھی آگے بڑھتا ہے اور کبھی پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ کبھی سیدھے چلتا ہے اور کبھی دائیں یا بائیں کی طرف مڑ جاتا ہے۔ یہی وہ گاڑی ہے جو کامیابی کے ساتھ اپنی منزل پر پہنچتی ہے۔

اس کے برعکس جو گاڑی ڈرائیور کے بغیر دوڑ رہی ہو وہ بس یک طرفہ طور پر دوڑتی رہے گی۔ اس گاڑی کے ساتھ عقل اور شعور شامل نہیں۔ وہ نہ رکے گی اور نہ پیچھے ہٹے گی۔ وہ نہ کہیں مڑے گی اور نہ کبھی سست ہوگی۔ وہ اندھا دھند بس آگے کی طرف دوڑتی رہے گی۔ ایسی گاڑی کا واحد انجام یہ ہے کہ وہ تھوڑی دور چلے اور اس کے بعد ٹکرا کر اپنا خاتمہ کرلے۔

اس مثال سے زندہ انسان اور مردہ انسان کا فرق معلوم ہوتا ہے۔ زندہ انسان باہوش انسان ہے اور مردہ انسان بے ہوش اور بے عقل انسان۔ زندہ انسان اگر کسی وقت بولے گا تو حسب موقع چپ بھی ہو جائے گا۔ وہ اگر چلے گا تو کبھی رک بھی جائے گا۔ وہ اگر آگے بڑھے گا تو حالات کو دیکھ کر پیچھے بھی ہٹ جائے گا۔ وہ اگر تیز دوڑے گا تو کبھی اپنی رفتار سست بھی کرے گا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ اپنی کامیابی تک پہنچ جائے گا —— اس کے برعکس مردہ انسان وہ ہے جو اس قسم کی سمجھ سے خالی ہو۔ جو بولنے کے بعد چپ نہ ہو سکے۔ جو چلنے کے بعد رکنا نہ جانے۔ جو صرف اپنی شرطوں کو منوانا جانتا ہو۔ فریق مخالف کی شرطوں پر راضی ہونا اس کے یہاں خارج از بحث ہو۔ ایسا انسان مردہ انسان ہے۔ خدا کی دنیا میں اس کے لیے صرف یہ مقدر ہے کہ وہ تباہی اور بربادی کا نشان بن کر رہ جائے۔

قرآنی نظریہ سزا کا اعتراف

ٹائمس آف انڈیا (۳۰ جون ۱۹۸۷) نے امریکی خبر رساں ایجنسی اے ایف پی کے حوالے سے ایک خبر شائع کی ہے۔ اس کے مطابق ٹکساس کے اٹارنی جنرل جم میڈاکس نے اپیل کی ہے کہ ان کی ریاست میں سزائے موت کے واقعات کو فلمایا جائے تاکہ عوام دیکھیں کہ کس طرح ایک مجرم کو موت کی سزا دی گئی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ موت کی (موجودہ) سزائیں معمول کی چیز بن گئی ہیں۔ انھوں نے اپنی مانع جرم حیثیت کھو دی ہے۔ ریاست ٹکساس نے ۱۹۸۲ سے اب تک ۲۸ قیدیوں کو سزائے موت دی ہے۔ یہ سب سزائیں مہلک انجکشن کے ذریعہ دی گئیں۔ سزائے موت کا یہ سلسلہ امریکی سپریم کورٹ کے ایک فیصلہ کے بعد شروع ہوا ہے جس میں کہا گیا تھا کہ ریاستوں کو چاہیے کہ وہ موت کی سزا کو دوبارہ شروع کریں۔ اس سے پہلے امریکہ میں سزائے موت کو یہ کہہ کر بند کر دیا گیا تھا کہ وہ سزا کا بے رحمانہ طریقہ ہے:

FILMING EXECUTIONS: Texas Attorney General Jim Maddox is calling for executions in his state to be filmed so the public can see how a criminal is put to death, reports AFP from Huntsville, Texas. He says executions have become so routine that their deterrent purpose is being lost. Texas has executed 28 prisoners — all by lethal injection — since 1982, after a supreme court ruling allowing states to reintroduce capital punishment, earlier banned as a 'cruel and unusual punishment' (p. 7).

امریکہ میں سزائے موت کو بے رحمانہ قرار دے کر اسے بند کر دیا گیا تھا۔ مگر اس کے بعد جرائم میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا۔ چنانچہ ۱۹۸۲ میں سپریم کورٹ کے فیصلہ کے تحت اسے دوبارہ کھولا گیا۔ تاہم اب بھی مجرم کو موت کی سزا دینے کا جو طریقہ اختیار کیا گیا وہ یہ تھا کہ اسے بے ہوش کرکے مہلک انجکشن دیا جائے۔ اور پھر خاموشی سے اس کو دفن کر دیا جائے۔

ایسی حالت میں سزائے موت صرف ایک خبر تھی نہ کہ عوامی سبق۔ اب امریکہ کے مدبرین کو احساس ہوا کہ سزائے موت کو عوامی مشاہدہ میں بھی آنا چاہیے تاکہ وہ دوسروں کو جرم سے روکنے کا سبب بن سکے۔ حتی کہ وہ چاہتے ہیں کہ سزائے موت کے عمل کو فلم پر ریکارڈ کیا جائے اور اس کو ٹیلی وژن پر دکھا کر تمام لوگوں کے لیے عبرت کا سامان بنا دیا جائے۔

الرسالہ جنوری ۱۹۸۸

ہر ایک کی کہانی

فیجی ایک چھوٹا سا ملک ہے جو بحر الکاہل کے جنوبی حصہ میں واقع ہے۔ ۱۹۷۰ میں وہ برطانی قبضہ سے آزاد ہوا۔ اس کی راجدھانی سوا (Suva) ہے۔ یہاں تقریباً ۵۰ فی صد ہندستانی نسل کے لوگ ہیں جو کہ برطانی قبضہ کے دور میں ہندستان سے جاکر وہاں آباد ہوئے۔

۱۱ اپریل ۱۹۸۷ کو فیجی میں الکشن ہوا۔ اس الکشن کے نتیجہ میں وہاں نئی حکومت بنی۔ اس حکومت کے وزیر اعظم تموکی باودرا (Timoci Bavadra) تھے۔ نئی حکومت میں چوں کہ ہندستانی نسل کے لوگوں کا غلبہ تھا۔ فیجی نسل کے لوگوں نے اس کے خلاف مظاہرے کیے۔ انھوں نے اس کو فیجی میں چھوٹا ہندستان (Little India) قائم کرنے کا نام دیا۔ اس کے جواب میں وزیر اعظم باودرا نے نہایت پر اعتماد بیان دیا۔ انھوں نے کہا:

I am in control. I will remain in control.

معاملات پوری طرح میرے قبضہ میں ہیں اور وہ بدستور میرے قبضہ میں رہیں گے (ٹائمس آف انڈیا ۱۵ مئی ۱۹۸۷) مگر اس اعلان کے صرف چند دن بعد ۱۴ مئی ۱۹۸۷ کو فیجی میں فوجی انقلاب آگیا۔ ۳۸ سالہ لفٹنٹ کرنل رابوکا (Sitiveni Rabuka) دس مسلح فوجیوں کے ساتھ پارلیمنٹ ہاؤس میں داخل ہوئے اور منتخب وزیر اعظم کو ان کے ۲۷ ساتھیوں سمیت گرفتار کرلیا اور ایک ٹرک پر بٹھا کر نامعلوم منزل کی طرف روانہ کر دیا۔ کرنل رابوکا نے ۱۷ سالہ دستور کو معطل کر دیا اور خود اپنے بنائے ہوئے دستور کے مطابق فیجی پر اپنی حکومت کا اعلان کر دیا۔

وزیر اعظم تموکی باودرا کی کہانی ہر انسان کی کہانی ہے۔ جس آدمی کو بھی یہاں کچھ مواقع ملتے ہیں وہ سمجھ لیتا ہے کہ سب کچھ میرے قبضہ میں ہے، کوئی مجھے بے دخل کرنے والا نہیں۔ مگر جلد ہی خدا کا قانون ظاہر ہوتا ہے اور وہ تنکے کی طرح نکال کر پھینک دیا جاتا ہے۔ یہ واقعہ اس دنیا میں ہر روز ہو رہا ہے۔ مگر ہر آدمی اس کو صرف اخبار کی خبر سمجھتا ہے، کوئی نہیں جو اس کو اپنی زندگی کی خبر سمجھے۔

الرسالہ جنوری ۱۹۸۸

زندگی کا سفر

انسان دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جن کی تربیت مصائب کی درس گاہ میں ہوتی ہے۔ ر دوسرے وہ جن کی تربیت آسانیوں کی درس گاہ میں ہوتی ہے۔ بظاہر آسانیوں میں پرورش نا اچھی بات ہے۔ مگر وہ چیز جس کو انسان سازی کہتے ہیں، اس کی حقیقی جگہ صرف مصائب کی درسگاہ ہے نہ کہ آسانیوں کی درس گاہ۔ کسی کا یہ قول نہایت درست ہے کہ سہولت نہیں بلکہ جدوجہد، آسانی نہیں بلکہ مشکل وہ چیز ہے جو انسان کو انسان بناتی ہے:

It is not ease but effort,
not facility but difficulty
that makes men.

زندگی کے سیلاب میں بے شمار لوگ مصیبتوں کی زد میں آتے ہیں۔ مگر مشاہدہ بتاتا ہے کہ عام طور پر لوگوں کا انجام دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک وہ لوگ جو مصیبتوں کے مقابلہ میں ٹھہر نہیں پاتے اور مایوسی اور دل شکستگی کا شکار ہو کر رہ جاتے ہیں۔ دوسرے وہ جو مضبوط اعصاب والے ثابت ہوتے ہیں۔ وہ مصائب کا مقابلہ کرتے ہیں اور آخر کار اپنے لیے ایک زندگی بنانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

تاہم دوسرے گروہ کو یہ کامیابی ہمیشہ ایک محرومی کی قیمت پر ملتی ہے۔ مادی تجربات انھیں فکر کے اعتبار سے بھی مادی بنا دیتے ہیں۔ وہ دیکھتے ہیں کہ مادی چیزوں سے محرومی نے انھیں ماحول میں بے قیمت کر دیا تھا اور جب انھوں نے مادی چیزوں کو پالیا تو اسی ماحول میں وہ دوبارہ قیمت والے ہو گئے۔ اس تجربہ کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ سراسر مادہ پرست انسان بن جاتے ہیں۔ وہ مادی چیزوں کے کھونے کو کھونا سمجھنے لگتے ہیں اور مادی چیزوں کے پانے کو پانا۔

مصیبتوں میں پڑنے کا اصل فائدہ سبق اور نصیحت ہے۔ مگر یہ فائدہ صرف اس وقت ملتا ہے جب کہ آدمی مصیبتوں کی زد میں آئے مگر وہ ہلاک نہ ہو۔ وہ زندگی کی تلخیوں سے دوچار ہو مگر وہ ان سے اوپر اٹھ کر سوچ سکے۔ مصیبتیں اور تلخیاں اس کے لیے تجربہ ثابت ہوں نہ کہ وہ اس کے ذہن کی معمار بن جائیں۔

ممکن اور ناممکن

سابق وزیر اعظم ہند لال بہادر شاستری جنوری ۱۹۶۶ میں انتقال کر گیے۔ اس کے بعد کانگریس پارٹی نے مسز اندرا گاندھی کو وزیر اعظم بنایا۔ تاہم مرار جی ڈیسائی سے ان کی کش مکش جاری رہی۔ کیوں کہ وہ خود وزیر اعظم بننا چاہتے تھے۔ ۱۹۶۷ کے الکشن کے بعد مرار جی ڈیسائی کو نائب وزیر اعظم بنا یا گیا۔

مگر مرار جی ڈیسائی نائب وزیر اعظم کے عہدہ کو اپنے لیے کمتر سمجھتے تھے۔ چنانچہ کش مکش بدستور جاری رہی۔ سابق وزیر اطلاعات مسٹر اندر کمار گجرال نے لکھا ہے کہ ۱۹۶۹ میں مسز اندرا گاندھی نے ان کے ذریعہ مرار جی ڈیسائی کو یہ پیش کش کی کہ ان کو مزید اعزاز دے کر راشٹرپتی (پریسیڈنٹ) کا عہدہ دیدیا جائے۔ مسٹر گجرال کا بیان ہے کہ جب انھوں نے یہ پیش کش مرار جی ڈیسائی کے سامنے رکھی تو بلا تاخیر ان کا جواب یہ تھا :

Why not she herself?

اندرا گاندھی خود کیوں نہیں (ٹائمس آف انڈیا ۱۲ جولائی ۱۹۸۷) یعنی اندرا گاندھی خود پریسیڈنٹ بن جائیں اور مجھے وزیر اعظم بنا دیں۔ واقعات بتاتے ہیں کہ مرار جی ڈیسائی کانگریس سے الگ ہو گیے۔ انھوں نے وزیر اعظم بننے کے لیے سارے ملک کو الٹ پلٹ ڈالا۔ مارچ ۱۹۷۷ کے الکشن میں جنتا پارٹی کی جیت کے بعد وہ مختصر مدت کے لیے وزیر اعظم بن بھی گیے۔ مگر جلد ہی بعد وہ سیاسی زوال سے دوچار ہوئے اور پھر کبھی ابھر نہ سکے۔

مرار جی ڈیسائی کی سیاسی ناکامی کا اصل سبب یہ تھا کہ وہ ممکن کو چھوڑ کر ناممکن کی طرف دوڑے۔ اگر وہ اس راز کو جانتے کہ موجودہ حالات میں ان کے لیے جو آخری ممکن چیز ہے وہ صدارت ہے نہ کہ وزارتِ عظمیٰ، تو یقیناً وہ ذلت اور ناکامی سے بچ جاتے۔ مگر ناممکن کے پیچھے دوڑنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ممکن سے بھی محروم ہو کر رہ گیے۔

ناممکن کے پیچھے دوڑنا، آدمی کو ممکن سے بھی محروم کر دیتا ہے۔ جب کہ ممکن پر قانع ہونے والا ممکن کو بھی پاتا ہے اور بالآخر ناممکن کو بھی۔

معذوری کے باوجود

میں نے ۱۹۸۲ میں اپنا پاؤں کھو دیا تھا۔ اور اسی وقت سے میں دنیا کے گرد سمندری سفر کرتا رہا ہوں۔ یہ بات ٹرسٹن جونز نے تھائی لینڈ کے معذور بچوں کے ایک گروپ سے بینکاک میں کہی۔ وہ ایک ملاح اور مصنف اور مہم جو ہیں۔ ان کا پیغام بہت واضح تھا، آپ یہ انتظار نہ کریں کہ دوسرے لوگ آپ کی مدد کریں۔ آپ کو اپنی مدد آپ کرنے کا فن سیکھنا چاہیے اور خود اپنے طریقہ پر کام کرنا چاہیے، باریش کیپٹن نے کہا۔ ۵۳ سالہ جونز ۱۹۵۲ سے اپنے طریقہ پر غیر معمولی کام کرتے رہے ہیں جب کہ وہ برطانیہ کے شاہی بحریہ سے یہ کہہ کر الگ کر دیے گئے تھے کہ وہ جسمانی طور پر سمندر کے لیے غیر موزوں ہیں۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران فوجی ڈیوٹی کرتے ہوئے ان کے ایک پاؤں کو زخم لگا تھا۔ یہ حادثہ بالآخر انھیں معذور قرار دینے تک پہنچا اور ۱۹۸۲ میں ان کا بایاں پاؤں گھٹنے کے اوپر سے کاٹ دیا گیا۔ ۱۹۵۳ سے مسٹر جونز دنیا کے سامنے یہ ثابت کرتے رہے ہیں کہ وہ کچھ اور ہو سکتے ہیں مگر وہ جسمانی طور پر سمندر کے لیے غیر موزوں ہرگز نہیں۔ پچھلے ۳۴ سالوں میں انھوں نے ۶ لاکھ ۴۰ ہزار کیلومیٹر کا بحری سفر کیا ہے۔ انھوں نے بیس بار اٹلانٹک سمندر کو پار کیا ہے اور کرہ ارض کے گرد تین بحری سفر مکمل کیے ہیں :

"I lost my leg in 1982 and have been sailing around the world ever since," Tristan Jones — sailor, author and adventurer — told a group of handicapped Thai children in Bangkok, reports DPA. The message was clear, "You must not wait for people to help you. You must learn to help yourself and must do things your own way," the bearded Welsh captain said. Jones, 53, has been doing extraordinary things his own way since 1952 when he was discharged from Britain's Royal Navy for being "physically unfit for sea." He had received a leg wound in active duty during World War II that eventually led to his invalid status and in 1982 resulted in the amputation of his left leg, above the knee. Since 1953 Jones has been proving to the world that he is anything but "physically unfit for sea." In the past 34 years he has sailed 640,000 kms (all in craft under 40 feet), made 20 trans-Atlantic ocean crossings (nine single-handed) and circumnavigated the world three times.

The Times of India (New Delhi) August 18, 1987

منفی عمل

ایک مغربی مصنف نے کہا کہ ہر بار جب میں حقیقت کے لیے اپنا دروازہ بند کرتا ہوں تو وہ کھڑکی کے راستے سے میرے گھر کے اندر داخل ہوجاتی ہے:

Every time I close the door on reality,
it comes in through the window.
— Ashleigh Brilliant

یہ بہت بامعنی قول ہے۔ حقیقت کی مثال سیلاب کی سی ہوتی ہے۔ اگر کوئی بند ٹوٹ جائے اور سیلاب کا دھارا آپ کے گھر کی طرف رخ کرے تو آپ اپنا دروازہ بند کرکے اس سے محفوظ نہیں رہ سکتے۔ اگر آپ نے سامنے کا دروازہ بند کیا تو وہ پیچھے کے دروازہ سے آپ کے گھر کے اندر داخل ہوجائے گا، حتیٰ کہ اگر آپ اپنے تمام دروازے اور تمام کھڑکیاں بند کرلیں تو وہ دیوار کو توڑ کر آپ کے گھر میں گھس پڑے گا۔ اس قسم کی کوئی تدبیر سیلاب کو روکنے کا ذریعہ نہیں بن سکتی۔

موجودہ زمانہ کے مسلمان مکمل طور پر اس کے مصداق ثابت ہوئے ہیں۔ موجودہ زمانہ میں حقائق کا ایک نیا طوفان اٹھا۔ اس نے مسلمانوں کے ملی وجود کو ہر طرف سے چیلنج کرنا شروع کیا۔ مگر مسلمانوں نے اپنے "دروازوں" اور "کھڑکیوں" کو بند کرکے سمجھا کہ وہ طوفان کی زد سے محفوظ ہوگئے ہیں۔ انھوں نے غیر جانب دارانہ طور پر مسئلہ کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ یہ سوچ کر مطمئن ہوگئے کہ "ہم نے "تو بحر ظلمات میں اپنے گھوڑے دوڑا دیئے ہیں اور آندھیوں سے کہہ دیا ہے کہ تم اپنا راستہ دوسری طرف تلاش کرلو۔ پھر یہ طوفان ہمارا کیا بگاڑ سکتے ہیں۔ مگر یہ خوش فہمیاں ہمارے کچھ کام نہ آئیں۔ سیلاب اس طرح ہمارے ٹھکانوں میں گھسا کہ وہ آخری متاع تک بہالے گیا۔

مسلمانوں کے لیے تعمیر نو کا آغاز یہ ہے کہ وہ کھلے دل سے اپنے پچھڑے پن کا اعتراف کریں، جب تک وہ اس کا اعتراف نہ کریں وہ اپنی منزل کی طرف کوئی حقیقی سفر شروع نہیں کرسکتے۔

ذہنیت کا فرق

۴ نومبر ۱۹۸۷ کو لاہور میں پاکستان اور آسٹریلیا کے درمیان ریلائنس کپ کے لیے کرکٹ میچ تھا۔ اس میچ میں پاکستان کی ٹیم ہار گئی۔ یہ خبر بہت سے پاکستانیوں کے لیے اتنی سخت ثابت ہوئی کہ ان پر دل کا دورہ پڑ گیا۔ حتی کہ بعض افراد اس صدمہ کو برداشت نہ کر سکے اور حرکت قلب بند ہونے کی وجہ سے انتقال کر گیے (ٹائمس آف انڈیا ۸ نومبر ۱۹۸۷)

یہی بات ہندستان میں اس وقت پیش آئی جب کہ اگلے دن ۵ نومبر کو بمبئی میں انگلینڈ کے مقابلہ میں ہندستان کی ٹیم ہار گئی۔ ہندستان میں کسی کے حرکت قلب بند ہونے کی اطلاع تو نہیں آئی۔ البتہ ایک اور شکل میں یہاں بھی موتیں واقع ہوئیں۔ دونوں طرف کے پرستاروں کے درمیان ایک سے زیادہ مقامات پر ٹکراو ہو گیا۔ اور وہ ناخوش گوار چیز پیش آئی جس کو ہندستان ٹائمس (۶ نومبر ۱۹۸۷) نے بجا طور پر میچ فسادات (Match riots) کا نام دیا ہے۔

۹ نومبر کی ایک ملاقات میں اس کا ذکر مسٹر شکیل احمد خاں (پیدائش ۱۹۴۰) سے ہوا۔ انھوں نے انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کی ہے، اور آج کل عرب امارات کی ایک فرم میں چیف انجینئر ہیں۔ انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا کہ اس معاملہ میں میرا طریقہ بالکل الگ ہے۔ میں کبھی شکست کے احساس سے دوچار نہیں ہوتا۔ کیوں کہ جیتنے والی ٹیم کو میں اپنی ٹیم سمجھتا ہوں:

I never lose, winning team is my team.

یہی وہ چیز ہے جس کو موجودہ زمانہ میں اسپورٹس مین شپ (Sportsmanship) کہا جاتا ہے۔ باعتبار مفہوم اس کو ہنر پسندی کہہ سکتے ہیں۔ یہ صحت مند ذہن کی علامت ہے۔ اس ذہن کے مطابق اصل چیز کھیل ہے نہ کہ کھیلنے والا۔ صحیح اسپورٹسمین اسپرٹ یہ ہے کہ آدمی کی نگاہ ہنر پر ہو۔ وہ یہ دیکھے کہ کھیل کیسا کھیلا گیا، نہ یہ کہ کون شخص کھیلا۔

۱۹۴۷ کے "انقلاب" کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ ہندستان اور پاکستان میں اس صحت مند مزاج کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ یہاں کے لوگ ہنرمندی سے محظوظ نہیں ہو پاتے۔ وہ صرف دیکھتے ہیں کہ جیتنے والا کون ہے اور ہارنے والا کون۔ اپنی قوم کا آدمی جیتے تو وہ خوشی منا

ہیں، اور اگر اتفاق سے دوسری قوم کا آدمی جیت جائے تو غم سے نڈھال ہو جاتے ہیں۔

یہ صحت مند ذہنیت نہیں، یہ مریضانہ ذہنیت ہے۔ جن لوگوں کا یہ مزاج ہو وہ کبھی کوئی اعلیٰ کامیابی حاصل نہیں کر سکتے۔ ان کے اندر قومی خود غرضی تو خوب ترقی کرے گی، مگر ان کے درمیان سائنٹفک مزاج کبھی ترقی نہیں کر سکتا۔ وہ مزاج جس کا ایک نمونہ موجودہ زمانہ میں جاپان نے پیش کیا ہے۔ یعنی یہ کہ آدمی قوم پسند یا فرقہ پسند نہ ہو بلکہ وہ معیار پسند ہو۔ جن لوگوں کے اندر یہ صفت ہو، وہ جب کوئی کام کرتے ہیں تو ان کی ساری توجہ معیار (Quality) پر ہوتی ہے۔ وہ اپنا کام اس طرح کرتے ہیں کہ اس کے بارے میں وہ اعلیٰ معیار سے کم تر کسی چیز پر راضی نہیں ہوتے۔

جاپانیوں کی یہی خصوصیت ہے جس کی بنا پر ان کے لیے یہ ممکن ہوا کہ وہ اپنی مصنوعات کو نقص بدرجہ صفر (Zero-defect) کے درجہ تک پہونچا سکیں۔ اور اپنے بڑھے ہوئے معیار کی بنا پر ساری دنیا کی مارکیٹ پر قبضہ کر لیں۔

اسرائیل کے قیام سے پہلے کی بات ہے، ایک مسلم پہلوان اور ایک یہودی پہلوان میں کشتی کا مقابلہ ہوا۔ اس مقابلہ میں مسلمان کامیاب رہا۔ اس نے یہودی پہلوان کو منٹوں کے اندر گرا دیا۔ بظاہر یہودی پہلوان کے لیے یہ بڑی ذلت کی بات تھی۔ مگر اس نے فوراً اٹھ کر مسلم پہلوان کو گلے سے لگا لیا۔ اس نے کہا: میں تمہاری ذات کی نہیں بلکہ تمہارے فن کی قدر کرتا ہوں۔ تم نے جس فن کاری کے ساتھ مجھے گرایا ہے وہ اتنا اعلیٰ ہے کہ میں نے اس کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔

کسی قوم میں اسپورٹسمین اسپرٹ کا ہونا یا نہ ہونا کوئی جزئی بات نہیں۔ اس کا تعلق اس قوم کے پورے کردار سے ہے۔ اس کا ظہور زندگی کے تمام معاملات میں ہوتا ہے۔ ایک نوعیت کا ذہن آدمی کو اپنے حریف سے صرف نفرت کرنا سکھاتا ہے۔ حریف کی خوبیاں بھی اس کو برائی کی صورت میں نظر آتی ہیں۔ یہ چیز اس کو ہر اعتبار سے پست کردار بنا دیتی ہے۔ اس کے برعکس دوسرا مزاج آدمی کو معیار پسند بناتا ہے اس سے آگے بڑھنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ اس کے اندر ایک ایسا انسان ابھرتا ہے جس کے لیے دشمن کا عمل بھی مفید سبق حاصل کرنے کا ذریعہ بن جائے۔

سب سے بڑی بھول

ڈک شان (Dick Shawn) ایک امریکی ایکٹر تھا۔ وہ فلم میں اور اسٹیج پر ہنسانے کا کردار ادا کرتا تھا۔ ۱۷ اپریل ۱۹۸۷ کی رات کو وہ کیلی فورنیا کے مقام لاجولا (La Jolla) میں ایک تھیٹر ہال کے اندر ایکٹنگ کر رہا تھا اور اپنی تفریحی باتوں سے لوگوں کو ہنسا رہا تھا۔ ہال کے اندر چھ سو تماشائی بیٹھے ہوئے اس کی تفریحی باتوں سے لطف لے رہے تھے۔ اس کی ایکٹنگ جاری تھی کہ اچانک وہ اسٹیج پر منھ کے بل گر پڑا۔ لوگوں نے سمجھا کہ یہ کوئی مذاق ہے جو اس نے اپنی ایکٹنگ کے جز کے طور پر کیا ہے :

People thought it was a joke, part of the act.

ایکٹر اسی حال میں چند منٹ تک فرش پر پڑا رہا۔ یہاں تک کہ اس کے لڑکے ایڈم (Adam) کو شبہہ ہوا۔ اس نے ایک ڈاکٹر کو بلایا۔ ڈاکٹر نے آکر دیکھا اور فوراً اسپتال لے جانے کا مشورہ دیا۔ ایمبولنس کے ذریعہ اس کو اسپتال پہنچایا گیا۔ اسپتال کے ڈاکٹروں نے جانچ کرنے کے بعد اعلان کیا کہ ڈک شان کا انتقال ہو چکا ہے۔ انتقال کا سبب غالباً دل کا دورہ (Heart attack) تھا۔ انتقال کے وقت اس کی عمر ۵۷ سال تھی (ٹائمس آف انڈیا ۲۰ اپریل ۱۹۸۷)

اس دنیا میں کوئی شخص روتے ہوئے مرجاتا ہے اور کوئی شخص ہنستے ہوئے۔ کسی پر اس کی موت بدحالی میں آجاتی ہے اور کسی پر خوش حالی میں۔ کوئی خاک پر بیٹھا ہوا اس دنیا سے چلا جاتا ہے اور کوئی تخت حکومت پر۔ موت ایک ایسا انجام ہے جو ہر ایک پر آتا ہے خواہ وہ ایک حالت میں ہو یا دوسری حالت میں۔

مگر موت ہی وہ سب سے بڑی حقیقت ہے جس کو انسان سب سے زیادہ بھولا ہوا ہے یہاں رونے والا اور ہنسنے والا دونوں ایک ہی حال میں مبتلا ہیں۔ وہ صرف اپنے آج کو جانتے ہیں، وہ اپنے کل کو نہیں جانتے۔ اگر وہ اپنے کل کو جان لیں تو ہنسنے والے کا حال بھی وہی ہو جائے جو رونے والے کا حال نظر آرہا ہے۔

یہ سب سے بڑی بھول ہے جس میں آج کا انسان مبتلا ہے۔

Dr. Zakir Husain Library, J. M. I. Jamia Nagar, New Delhi

دنیا اور آخرت

موجودہ دنیا میں حق کے پاس دلیل ہے مگر طاقت نہیں۔ آخرت کی دنیا میں حق کے پاس دلیل بھی ہوگی اور طاقت بھی ——— یہی ایک لفظ میں موجودہ دنیا اور آخرت کی دنیا کا خلاصہ ہے۔

اسی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کون لوگ ہیں جن کو آخرت کی دنیا میں عزت اور ترقی کا مقام دیا جائے گا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو حق کے سامنے اس وقت جھک گئے جب کہ وہ حق کے سامنے جھکنے کے لیے مجبور نہ تھے۔ جنھوں نے حق کا اعتراف اس وقت کیا جب کہ وہ اس کا انکار بھی کر سکتے تھے۔

موجودہ دنیا میں انسان کی سب سے بڑی خوبی اعتراف ہے۔ اپنے سے باہر جو واقعہ موجود ہے، اس کا اعتراف کسی تحفظ ذہنی کے بغیر کرنا، یہی کمالِ انسانیت ہے۔ یہی وہ بنیادی انسانی صفت ہے جس سے دوسری تمام صفاتِ انسانی پیدا ہوتی ہیں۔ جس آدمی کے اندر جتنا زیادہ اعتراف کا مادہ ہوگا، اتنا ہی زیادہ اس کی انسانیت ترقی کرے گی۔ اور کسی شخص کے اندر اعتراف کے معاملہ میں جتنی کمی ہوگی اتنا ہی وہ گراوٹ کا شکار ہوتا چلا جائے گا۔

اس اعتراف کا اظہار دو سطحوں پر ہوتا ہے۔ خدائی سطح پر، اور علمی حقائق کی سطح پر۔ مومن کے جذبہ اعتراف کا اظہار ذات خداوندی کی سطح پر ہوتا ہے جو نہ صرف سب سے بڑی حقیقت ہے بلکہ تمام حقیقتیں اسی کی مخلوق ہیں۔ غیر مومن کے جذبہ اعتراف کا اظہار ان حقائق کی سطح پر ہوتا ہے جن کا ادراک کرنے کے لیے صرف عقلی قوتوں کا اعتراف کافی ہو۔

سچا مومن خدا پرست ہوتا ہے اور سچا انسان حقیقت پرست۔ جو لوگ واقعی معنوں میں حقیقت پرست اور حقیقت پسند ہوں وہی لوگ اس امتحان کی دنیا میں ایمان (بالفاظ دیگر، اعتراف صداقت) کی توفیق پاتے ہیں۔ جو لوگ اس ابتدائی انسانی صفت سے خالی ہوں وہ گویا حیوان ہیں جن کے اوپر انسان کا لباس اوڑھا دیا گیا ہے۔ وہ دنیا میں باعتبار حقیقت اندھے ہیں اور آخرت میں وہ باعتبار حقیقت بھی اندھے ہوں گے اور باعتبار واقعہ بھی۔

الرسالہ جنوری ۱۹۸۸

اجنبی دین

عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ بدأ الاسلام غریباً وسیعود کما بدأ فطوبیٰ للغرباء (رواہ مسلم)

حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اسلام اجنبی حالت میں شروع ہوا، اور وہ پھر ویسا ہی ہو جائے گا جیسا کہ شروع ہوا تھا۔ تو ایسے اجنبیوں کو مبارکی ہو۔

وعن عمرو بن عوف قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ اِنّ الدین بدأ غریباً وسیعود کما بدأ فطوبیٰ للغرباء۔ وھم الذین یُصلِحون ما افسد الناس من بعدی من سُنّتی (رواہ الترمذی)

حضرت عمرو بن عوف کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ دین شروع ہوا تو وہ اجنبی تھا، اور وہ پھر ویسا ہی ہو جائے گا جیسا کہ شروع میں تھا۔ تو اجنبیوں کو مبارکی ہو۔ یہی لوگ ہیں جو اس بگاڑ کی اصلاح کریں گے جو میرے بعد میری سنت میں لوگ کریں گے۔

آدمی جب کوئی چیز کھاتا ہے تو اس کو اس کے مزہ کا احساس ہوتا ہے ـــــ نمکین، میٹھا کھٹا، کڑوا، وغیرہ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آدمی کی زبان میں مختلف قسم کے ذائقہ خلئے (Taste buds) ہیں۔ کھانے کے دوران جب کوئی چیز ان ذائقہ خانوں کو چھوتی ہے تو نازک تاروں کے ذریعہ ان کی خبر دماغ تک پہنچتی ہے۔ اس طرح آدمی جان لیتا ہے کہ وہ جو چیز کھا رہا ہے اس کا ذائقہ کیا ہے۔ زبان کے یہ ذائقہ خانے اگر اپنی فطری حالت میں ہوں تو ایسے آدمی کو چیزوں کا صحیح ذائقہ (True taste) ملے گا اور اگر کوئی شخص اپنے ذائقہ خانوں کو ان کی اصلی حالت میں محفوظ نہ رکھ سکے تو اس کو غلط ذائقہ (False taste) ملنے لگے گا۔

بگاڑ کے زمانہ میں ایسا ہوتا ہے کہ خدا اور رسول والا دین گم ہو جاتا ہے اور دین کی دوسری دوسری شکلیں رائج ہو جاتی ہیں۔ مثلاً قومی دین، برکت والا دین، رسم و رواج والا دین، آبائی فخر والا دین، لوگ دین کی انھیں خود ساختہ شکلوں سے مانوس ہوتے ہیں۔ چنانچہ وہ خدا اور رسول والے دین کو اجنبی سمجھ کر اس کو ماننے سے انکار کر دیتے ہیں۔

شیطان کی پیروی

روایات میں آتا ہے کہ ایک بار حضرت عمر فاروقؓ مدینہ کی مسجد نبوی میں آئے تو دیکھا کہ صحابہ وہاں بیٹھے ہوئے ہیں اور یہ ذکر کر رہے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تمام بیویوں کو طلاق دے دی ہے۔ اگرچہ اس بات کو بیان کرنے والے صحابہ کرام تھے اور یہ بات مسجد نبوی جیسے مقدس مقام پر بیان ہو رہی تھی، مگر حضرت عمرؓ نے اِس سے انکار کیا کہ وہ محض سُن کر اُس کو مان لیں۔ انھوں نے کہا کہ میں اس کے بارہ میں اس وقت تک کوئی رائے نہیں دے سکتا جب تک خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے براہِ راست دریافت نہ کر لوں۔

چنانچہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رہائش گاہ پر آئے اور دروازہ پر کھڑے ہو کر آواز دی۔ آپ سے اجازت لے کر اندر داخل ہوئے اور مذکورہ خبر بیان کر کے اس کی اصل حقیقت دریافت کی۔ آپ نے فرمایا کہ نہیں، میں نے طلاق نہیں دی ہے۔ حضرت عمر اس کے بعد دوبارہ مسجد نبوی میں آئے اور اس کے دروازے پر کھڑے ہو کر بلند آواز سے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عورتوں کو طلاق نہیں دی ہے۔ اس پر قرآن میں یہ آیت اتری:

وَاِذَا جَاءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِي الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطٰنَ اِلَّا قَلِيْلًا

(النساء ۸۳)

اور جب ان کو کوئی بات امن یا خوف کی پہنچتی ہے تو وہ اس کو پھیلا دیتے ہیں۔ اور اگر وہ اس کو رسول تک یا اپنے ذمہ دار اصحاب تک پہنچاتے تو ان میں سے جو لوگ تحقیق کرنے والے ہیں وہ اس کی حقیقت کو جان لیتے۔ اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو تھوڑے لوگوں کے سوا تم سب شیطان کے پیچھے لگ جاتے۔

آج کل فساد یا فرقہ وارانہ خبروں کے معاملہ میں تمام مسلمان اس اسلامی تعلیم کی خلاف ورزی کر رہے ہیں۔ میری معلومات کے مطابق شاید چند مسلمان بھی اس ملک میں ایسے نہیں ہیں جو ہندو تعصب یا فرقہ وارانہ فساد کی کوئی خبر سنیں تو اس کی پوری طرح تحقیق کریں اور اس کے

تمام متعلقہ پہلوؤں کی جانچ کے بعد اپنی رائے قائم کریں۔ ہر ایک کا یہ حال ہو رہا ہے کہ ہندو یا حکومتی شعبوں کے بارے میں جو کچھ سنا اس کو مان لیا اور فوراً ہی اس کو پھیلانا شروع کر دیا۔

آج کل کسی بات کو پھیلانے کا سب سے بڑا ذریعہ اخبارات ہیں۔ اس اعتبار سے مسلمانوں کے اردو اخبارات کو دیکھئے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسی ممنوعہ عمل کی ایجنسی بن گیے ہیں۔ مسلمانوں نے آج کل بے شمار اخبارات نکال رکھے ہیں، ان اخبارات کا مشترک کاروبار یہی ہے کہ ہندو۔ مسلم مسائل سے متعلق کوئی بات پا جائیں تو فوراً اس کو بڑھا چڑھا کر چھاپیں اور اس کو زیادہ سے زیادہ سنسنی خیز بنا کر لوگوں کے سامنے پیش کریں۔

صحابہ کرام سے تو اس قسم کی ایک معمولی لغزش محض وقتی طور پر ہو گئی تھی۔ اور تنبیہ کے بعد وہ فوراً پلٹ آئے۔ مگر اس ملک کے مسلمان نصف صدی سے اسی قسم کی صحافت میں گم ہیں۔ صحافت کی اس قسم کو موجودہ زمانہ میں زرد صحافت (ایلو جرنلزم) کہا جاتا ہے۔ مسلمانوں کے ایک طبقہ نے اس زرد صحافت کو نہایت نفع بخش کاروبار سمجھ کر اختیار کر رکھا ہے۔ مگر انھیں جاننا چاہیے کہ یہ عین وہی جرم ہے جس کو قرآن کی مذکورہ بالا آیت میں اتباع شیطان کہا گیا ہے۔

مذکورہ آیت میں کہا گیا ہے کہ جب کوئی اہم خبر ملے تو اس کو رسول کی طرف اور اصحاب امر کی طرف لوٹاؤ۔ اس سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں۔

ایک یہ کہ ایسی ہر خبر کو ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین اور آپ کی چھوڑی ہوئی سنت کی روشنی میں جانچنا چاہیے، اور اسی کی روشنی میں اس کے بارہ میں اپنا رویہ متعین کرنا چاہیے۔ مسلمانوں پر لازم ہے کہ اس طرح کے امور میں وہ سنتِ رسولؐ کی پابندی کریں نہ یہ کہ قومی جذبات جدھر چلنے کا تقاضا کریں اسی طرف تمام لوگ چل پڑیں۔

دوسری چیز اصحاب امر کی طرف رجوع کرنا ہے۔ اس حکم کی تعمیل اسی وقت ہو سکتی ہے جب کہ مسلمانوں کے درمیان "اصحاب امر" کا وجود ہو۔ اس لیے مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ اس کا اہتمام کریں۔ اگر با اختیار اصحاب امر موجود نہ ہوں تو رضاکارانہ بنیاد پر اپنے درمیان اصحاب امر کو وجود میں لائیں اور تمام اہم امور میں اسی اجتماعی ادارہ کے فیصلہ کی پیروی کریں نہ کہ اپنی انفرادی رائے کی۔

الرسالہ جنوری ۱۹۸۸

جن اور عملیات

عوام میں یہ عقیدہ پھیلا ہوا ہے کہ جنات انسانوں کے اوپر قابو پا لیتے ہیں اور انھیں پریشان رکھتے ہیں۔ یہ عقیدہ بالکل لغو ہے۔ قرآن و حدیث میں اس کے لیے کوئی بنیاد موجود نہیں۔

قرآن سے ثابت ہے کہ شیطان جنوں میں سے ایک جن ہے (فسجدوا الا ابلیس کان من الجن، الکہف ۵۰) اور شیطان کے بارہ میں واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ اس کو انسانوں کے اوپر کوئی عملی اختیار حاصل نہیں:

ان عبادی لیس لک علیہم سلطان الا من اتبعک من الغاوین (الحجر ۴۲)

جو میرے بندے ہیں، ان پر تیرا کوئی زور نہیں مگر وہ جو تیری راہ چلا بھٹکے ہوئے لوگوں میں سے۔

یہی بات قرآن میں دوسرے مقام پر ان الفاظ میں ہے کہ شیطان کو ان لوگوں پر کوئی اختیار نہیں جو ایمان والے ہیں اور اللہ پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ شیطان کا اختیار صرف ان لوگوں پر ہے جو اس کو اپنا دوست بنائیں (انہ لیس لہ سلطان علی الذین آمنوا وعلی ربہم یتوکلون۔ انما سلطانہ علی الذین یتولونہ، النحل)

غیر اہل ایمان پر بھی شیطان کو عملی یا جسمانی اعتبار سے کوئی اختیار نہیں۔ ان پر بھی اس کو صرف بہکانے کا اختیار ہے۔ جو لوگ معرفت حق سے خالی ہوں اور جو توہم پرستی میں مبتلا ہوں ان کو بہکانے میں شیطان کامیاب ہو جاتا ہے۔ یہی اس کی آخری حد ہے۔ چنانچہ قیامت کے دن شیطان اپنے پیرؤوں سے کہے گا کہ مجھے تمہارے اوپر کوئی اختیار حاصل نہ تھا۔ الا یہ کہ میں نے تمہیں پکارا تو تم نے میری بات سنی (وما کان لی علیکم من سلطان الا ان دعوتکم فاستجبتم لی، ابراہیم)

سورہ ابراہیم کی مذکورہ آیت (۲۲) کی تشریح علامہ ابوالبرکات عبداللہ بن احمد بن محمود النسفی نے ان الفاظ میں کی ہے:

(وما کان لی علیکم من سلطان) من تسلط واقتدار (الا ان دعوتکم) لکن دعوتکم الی الضلالۃ بوسوستی وتزیینی

"تمہارے اوپر مجھے سلطان نہ تھا" کا مطلب یہ ہے کہ تمہارے اوپر مجھے کوئی تسلط اور اقتدار حاصل نہ تھا۔ "الا یہ کہ میں نے تمہیں پکارا"۔ یعنی میں نے

(فاستجبتم لی) فاسرعتم اجابتی) تم لوگراہی کی طرف وسوسہ اور تزئین کے ذریعہ بلایا۔" تو تم نے میری پکار پر لبیک کہا" یعنی تم میری پکار پر دوڑ پڑے۔
التفسیر النسفی، الجزء الثانی، صفحہ ۲۶۰

شیطان کیا ہے، وہ ایک جن ہے۔ بلکہ وہ جنوں کا سردار ہے۔ قرآن کے مطابق اس کو انسان کے اوپر کوئی عملی یا جسمانی اختیار حاصل نہیں۔ جب قرآن کا بیان یہ ہے تو ایسے تمام خیالات بالکل باطل اور لغو ہیں جن میں یہ فرض کیا گیا ہو کہ شیطان (یا جنات) آدمی کے اوپر آتے ہیں اور وہ انسان کو جسمانی طور پر مغلوب کر کے اس کو اپنے قابو میں کر لیتے ہیں۔ شیطان (یا جنات) آدمی کو صرف بہکا سکتے ہیں، اس سے زیادہ کچھ اور کرنے پر وہ قادر نہیں۔

اسی طرح یہ خیال بھی سراسر لغو ہے کہ انسان عملیات کے ذریعہ جنوں کو مسخر کر لیتا ہے اور ان سے بڑے بڑے کام لیتا ہے۔ قرآن و حدیث کے پورے ذخیرہ میں اس قسم کے عقیدہ کے لیے کوئی بنیاد موجود نہیں۔ جنات کی تسخیر کا عقیدہ دراصل یہود کی خرافات ہے۔ یہ یہود سے دوسری قوموں میں بھی آگیا ہے۔ یہود نے حضرت سلیمان کے معاملہ کی غلط تشریح کر کے جن کی تسخیر اور عملیات کا فن ایجاد کیا اور اس کو بے بنیاد طور پر مذہبی حیثیت دیدی۔

حضرت سلیمان علیہ السلام بنی اسرائیل کے مشہور پیغمبر اور بادشاہ ہیں۔ ان کا زمانہ دسویں صدی قبل مسیح ہے۔ انھوں نے تقریباً چالیس سال تک حکومت کی۔ ان کا پایۂ تخت یروشلم تھا۔ شام و فلسطین کے علاوہ آپ کی سلطنت کے حدود ایک طرف فرات تک اور دوسری طرف مصر کی سرحد تک پھیلے ہوئے تھے۔ حضرت داؤد اور حضرت سلیمان کی سلطنت (۹۳۰ - ۱۰۰۰ ق م) کا نقشہ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) جلد ۱۷ صفحہ ۹۴۳ پر دیکھا جا سکتا ہے۔

قرآن کے بیان کے مطابق حضرت سلیمانؑ کو غیر معمولی طاقتیں حاصل تھیں۔ ہوا ان کے تابع تھی۔ جنات ان کے لیے مسخر کر دیئے گئے تھے۔ وہ جانوروں کی بولیاں سمجھتے تھے۔ وہ غیر معمولی واقعات ظہور میں لانے پر قادر تھے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کو یہ چیزیں پیغمبر کی حیثیت سے دی گئی تھیں۔ مگر یہودیوں میں ایک طبقہ پیدا ہوا جو یہ کہتا تھا کہ سلیمان جو غیر معمولی کام کرتے ہیں وہ سب جادو کے زور پر کرتے ہیں۔

ن یہودیوں میں اتنا بڑھا کہ وہ حضرت سلیمان کی پیغمبری کے منکر ہو گیے۔ وہ کہنے لگے کہ سلیمان جادوگر ہ کہ پیغمبر۔ چنانچہ موجودہ بائبل میں حضرت سلیمان کے بارہ میں جو باب ہے وہ نہ صرف یہ کہ آپ پیغمبر کی حیثیت سے پیش نہیں کرتا بلکہ اس کو پڑھ کر آپ کے کردار کے بارہ میں بھی کوئی اونچی تصویر ں بنتی :

کو رسول الله صلی الله علیه وسلم فیما نزل
من الله سلیمان بن داوٗد وعدّه فیمن عدّ
ن المرسلین. قال من کان بالمدینة من الیهود
تعجبون من محمد یزعم ان ابن داوٗد کان
یا والله ما کان الا ساحراً
تفسیر ابن کثیر، الجزء الاول، صفحہ ۱۳۶

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا ذکر کیا
جو سلیمان بن داؤد کے بارہ میں آپ پر اترا تھا
اور ان کو پیغمبروں میں سے شمار کیا تو مدینہ کے
یہودیوں نے کہا کہ کیا تم محمد پر تعجب نہیں کرتے۔
ان کا گمان ہے کہ ابن داؤد نبی تھے۔ خدا کی قسم
وہ تو صرف ایک جادوگر تھے۔

یہود کی تاریخ بتاتی ہے کہ قدیم زمانہ میں انھوں نے جادو اور عملیات کا زبردست کاروبار پھیلا رکھا تھا۔ جیوش انسائیکلوپیڈیا میں اس کا تفصیلی ذکر ہے، اس سلسلہ میں مقالہ نگار نے الفاظ لکھے ہیں :

Adultry and sorcery have destroyed everything; the Majesty of God departed from Israel. Exorcism also flourished. The Greco-Roman world regarded the Jews as a race of Magicians.
Jewish Encyclopedia, Vol. VII, p. 255.

بدکاری اور جادو نے ہر چیز کو برباد کر دیا تھا۔ خدا کی عظمت اسرائیل سے رخصت ہو گئی تھی۔ جھاڑ پھونک بھی ان کے درمیان کثرت سے پھیلا ہوا تھا۔ یونانی اور رومی دنیا یہود کو جادوگروں کی ایک نسل سمجھنے لگی تھی۔

جادو اور عملیات کے اس کاروبار کو یقینی ثابت کرنے کے لیے انھیں کوئی حوالہ درکار تھا اور یہ حوالہ انھوں نے حضرت سلیمان کی زندگی میں دریافت کر لیا۔ حضرت سلیمان کے حیرت انگیز واقعات لوگوں کو معلوم تھے۔ یہود نے کہا کہ سلیمان یہ تمام واقعات جادوگری کے زور پر کرتے تھے نہ کہ پیغمبری کے زور پر۔

بالفاظ دیگر، یہود نے حضرت سلیمان کو پیغمبروں کی صف سے نکال کر عام انسانوں کی صف میں کھڑا کر دیا۔ اگر وہ انہیں پیغمبر کہتے تو ان کے غیر معمولی واقعات معجزہ قرار پاتے اور معجزہ صرف پیغمبر سے صادر ہوتا ہے۔ عام انسان معجزہ دکھانے پر قادر نہیں۔ مگر جب انھوں نے حضرت سلیمان کو ایک عام انسان قرار دیا۔ اور ان کے غیر معمولی واقعات کو جادو بتایا تو ان واقعات کا ظاہر کرنا عام آدمی کے بس کی چیز بن گیا۔ کیوں کہ جادو کے کرشمے عام انسان دکھاتا ہے، اس کے لیے پیغمبر ہونے کی ضرورت نہیں۔

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے بعد کچھ مفاد پرست یہودیوں نے یہ کیا کہ جھوٹے قصے کہانیاں بنا کر انھوں نے مشہور کیا کہ حضرت سلیمان جو غیر معمولی کارنامے کرتے تھے وہ کوئی پیغمبری کا معاملہ نہ تھا، وہ جادو کا معاملہ تھا۔ پیغمبر کا معجزہ صرف پیغمبر کے لیے خاص ہوتا ہے۔ وہ ایک استثنائی واقعہ ہوتا ہے جس کو دوسرا عام آدمی دہرا نہیں سکتا۔ اس لیے انھوں نے آپ کے کارناموں کو معجزہ کے بجائے جادو بتایا تاکہ اس کے نام پر اپنا عملیاتی کاروبار جاری کرسکیں۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے:

واتبعوا ما تتلوا الشیاطین علیٰ ملک سلیمان وما کفر سلیمان ولکن الشیاطین کفروا یعلمون الناس السحر

(البقرہ ۱۰۲)

(یہود کے ایک گروہ نے آسمانی کتاب پس پشت ڈال دی) وہ اس چیز کے پیرو بن گئے جو شیاطین سلیمان کی بادشاہت پر پڑھتے تھے۔ اور سلیمان نے کفر نہیں کیا بلکہ شیاطین نے کفر کیا۔ وہ لوگوں کو سحر کی تعلیم دیتے تھے۔

اس آیت میں کفر سے مراد سحر ہے جیسا کہ آیت کا اگلا ٹکڑا واضح کر رہا ہے۔ سحر کو کفر اس کی شناعت کی بنیاد پر کہہ دیا۔ جیسے کوئی نوجوان جھوٹ بولے تو کوئی شخص کہے: یہ تم نے کیا شیطانی کی، ایسی شیطانی تو تمہارے باپ نے کبھی نہیں کی تھی۔ حضرت سلیمان کی وفات کے بعد یہودیوں نے آپ کی طرف منسوب کر کے سحر اور عملیات کا کاروبار شروع کر دیا تھا۔ اسی کی بابت فرمایا گیا کہ تم یہ جو سلیمان کی طرف منسوب کر کے کر رہے ہو یہ صرف تمہاری سرکشی ہے ورنہ سلیمان کا تعلق اس قسم کے جادو اور عملیات سے ہرگز نہ تھا۔

حضرت سلیمان علیہ السلام پیغمبر تھے۔ وہ جو کچھ کرتے تھے، خدا کی مدد سے کرتے تھے۔ اس کے برعکس سحر نام ہے غیر اللہ میں تصرف کی طاقت فرض کرکے اس کی بنیاد پر باطل کرشمے دکھانے کا۔ مثلاً ستاروں میں تاثیر کا عقیدہ، جنات کو مسخر کرنے کا عقیدہ، وغیرہ۔ مشرک قوموں اور توہم پرست طبقوں میں اس کا رواج کثرت سے پایا جاتا ہے۔ مگر جب اسلام آیا تو اس نے ان چیزوں کو حرام قرار دیدیا۔ یہاں سحر (جادو) سے متعلق کچھ حدیثیں نقل کی جاتی ہیں:

انی خلقتُ عبادی حنفاء فاجتالتهم الشیاطین عن دینهم۔
(تفسیر ابن کثیر، الجزء الثالث، صفحہ ۴۲۲)

حدیث قدسی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں نے اپنے بندوں کو سیدھا اور صحیح پیدا کیا ہے۔ پھر شیطانوں نے ان کو ان کے دین سے پھیر دیا۔

قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: من اتی عرافا او کاهنا فقد کفر بما اُنزل علی محمد

جو شخص نجومی یا کاہن کے پاس جائے تو اس نے اس چیز کا انکار کیا جو محمد پر اتاری گئی ہے۔

من عقد عقدة ونفث فیها فقد سحر

جس شخص نے گرہ لگائی اور اس میں پھونک ماری تو اس نے جادو کیا (اور جادو اسلام میں نہیں)

حد الساحر ضربه بالسیف

ساحر کی حد اس کو تلوار سے مارنا ہے۔

(تفسیر ابن کثیر، الجزء الاول، صفحہ ۱۴۴)

قرآن وحدیث کی ان تصریحات کی بنا پر فقہاء اسلام نے لکھا ہے کہ جس شخص کا یہ عقیدہ ہو کہ شیاطین اس کے لیے جو چاہے کر سکتے ہیں تو وہ کافر ہے (من اعتقد ان الشیاطین تفعل له مایشاء فهو کافر، تفسیر ابن کثیر، الجزء الاول صفحہ ۱۴۷)

تشویہ حقائق

دارالعلوم ندوۃ العلماء (لکھنؤ) سے ایک عربی اخبار نکلتا ہے جس کا نام الرّائد ہے۔ اس کے شمارہ ۲۱ صفر ۱۴۰۸ھ (۱۶ اکتوبر ۱۹۸۷) میں صفحہ اول پر ایک مضمون شائع ہوا ہے۔ اسلام کے معاندین اسلام کو پیش کرنے میں جو طریقہ اختیار کرتے ہیں، اس کو اس مضمون میں بجا طور پر تشویہ الحقائق سے تعبیر کیا گیا ہے، یعنی حقیقتوں کو مسخ کرکے پیش کرنا۔

معاندین اسلام کا یہی عام طریقہ ہے جو دور اول کے یہود سے لے کر موجودہ زمانہ کے مستشرقین تک میں پایا جاتا ہے۔ یہ طریقہ وہ اس لیے اختیار کرتے ہیں کہ وہ جانتے ہیں کہ اگر انھوں نے حقیقت کو اس کی اصلی اور واقعی صورت میں پیش کیا تو وہ لوگوں کو اسلام سے بدظن کرنے میں کامیاب نہ ہو سکیں گے۔ اس لیے وہ اسلام کی تعلیم یا اسلام کی تاریخ کو بگاڑ کر خود ساختہ صورت میں پیش کرتے ہیں تاکہ آسانی کے ساتھ اس کو اپنی تنقید کا نشانہ بنایا جا سکے۔

مثال کے طور پر ہجرت اسلامی تاریخ کا ایک مشہور واقعہ ہے۔ اس واقعہ کو اگر سادہ طور پر "ہجرت" کہا جائے تو اس سے یہ تصور سامنے آتا ہے کہ یہ مقام عمل کی تبدیلی تھی جو سوچے سمجھے منصوبہ کے تحت کی گئی۔ مگر معاندین اسلام بالقصد اس کے لیے ایسا لفظ استعمال کرتے ہیں جو فرار کے ہم معنی ہو۔ اس طرح ہجرت کا مفہوم بالکل بدل جاتا ہے۔ اب اس کا مطلب یہ ہو جاتا ہے کہ نعوذ باللہ یہ ایک بزدلانہ فعل تھا جو انفعالی نفسیات کے تحت اختیار کیا گیا۔

الرسالہ کے مشن کے خلاف آج کل بہت کچھ لکھا اور بولا جا رہا ہے۔ مگر حیرت انگیز بات یہ ہے کہ یہ تمام لوگ بلا استثنا اسی طریقہ (تشویہ حقائق) کو استعمال کر رہے ہیں، جس کا اوپر ذکر کیا گیا۔ یعنی الرسالہ کی بات کو بگاڑ کر پیش کرنا اور اس خود ساختہ بات کو الرسالہ کی بات قرار دے کر اس کی تنقید و تنقیص کرنا۔ مزید حیرت یہ ہے کہ خود ندوہ کے مذکورہ عربی اخبار (الرائد) نے بھی اسی آزمودہ طریقہ کو نہایت بے تکلفی کے ساتھ ہمارے خلاف استعمال کیا ہے، اور اس کا یہ استعمال عین اسی شمارہ میں ہے جس میں اس نے یہودیوں اور عیسائیوں کو تشویہ حقائق کا مجرم قرار دے کر شدت کے ساتھ ان کو نشانہ ملامت بنایا تھا۔

الرائد کے مذکورہ شمارہ میں آخری صفحہ پر "اخبار و تعلیقات" کے تحت ایک مضمون درج ہے۔ اس میں راقم الحروف (وحید الدین خاں) کے ایک مطبوعہ مقالہ (ٹائمس آف انڈیا ۵ استمبر ۱۹۸۷) کا حوالہ دیتے ہوئے میرے بارہ میں خبر دی گئی ہے کہ ——— " انھوں نے اس میں مسلمانوں کو یہ مشورہ دیا ہے کہ وہ اکثریتی فرقہ کی نسبت سے شکایت اور ناگواری کا طریقہ چھوڑ دیں اور اپنے مطالبات سے دستبردار ہو جائیں اور حالات کی تبدیلی کا اعتراف کریں اور شکست کو قبول کرلیں اور حقیقتِ حال کا سامنا کریں اور اپنے سیاسی موقف سے ہٹ جائیں اور پچھلی سیٹوں پر بیٹھ جائیں اور نئے حالات کی روشنی میں نئے دور کا آغاز کریں" الرائد کے اصل الفاظ یہ ہیں:

نصح فيه المسلمين بان يتركوا طريق الشكوى، والكراهية بالنسبة للاغلبية ويتنازلوا عن مطالبهم ويعترفوا بتغير الوضع، ويقبلوا الهزيمة، ويواجهوا حقائق الوضع، وينسحبوا من موقفهم السياسي، ويقعدوا في المقاعد الخلفية ويبدؤ عهداً جديداً في ضوء الظروف الجديدة۔

الرائد کی مذکورہ عبارت تشویہ حقائق کی کھلی ہوئی مثال ہے۔ اس کو پڑھ کر ایک آدمی سمجھے گا کہ راقم الحروف نے مسلمانوں سے یہ کہا ہے کہ وہ نئے حالات کے آگے ہتھیار ڈال دیں اور اکثریتی فرقہ کے مقابلہ میں ہزیمت اور پسپائی کی حیثیت کو قبول کرنے پر راضی ہو جائیں۔ حالاں کہ ٹائمس آف انڈیا (۵ استمبر ۱۹۸۷) کے مفصل مقالہ کو پڑھ کر کوئی بھی شخص سمجھ سکتا ہے کہ میں نے جو بات کہی ہے وہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ میں نے تدبیری حکمت کی بات کہی ہے نہ کہ کسی قسم کی انہزامی پوزیشن اختیار کرنے کی۔

الرائد کی مطبوعہ "خبر" سے بظاہر یہ متبادر ہوتا ہے کہ ہندستانی مسلمانوں کے لیے دو راستے ہیں۔ ایک کفاح اور مطالبۂ حقوق کا راستہ۔ دوسرا، استلام اور انہزام کا راستہ۔ اس کے مطابق میرا کہنا یہ ہے کہ مسلمان کفاح اور مطالبہ کا راستہ چھوڑ کر استلام اور انہزام کا راستہ اختیار کرلیں۔ یہی ان کے لیے موجودہ حالات کا تقاضا ہے۔ الرائد کی یہ بات یقینی طور پر تشویہ حقائق ہے نہ کہ اصل واقعہ کی ترجمانی۔

ٹائمس آف انڈیا کے زیر بحث مضمون میں جو بات کہی گئی، وہ اس کے برعکس یہ تھی کہ مسلمان

س ملک میں دو چیزوں کے درمیان ہیں۔ ایک پیش آمدہ مسائل، اور دوسرے امکانی مواقع۔ تاریخ کا تجربہ ہے کہ جو لوگ حال کے مسائل میں الجھتے ہیں، وہ مواقع کو استعمال کرکے اپنے مستقبل کی تعمیر نہیں کر پاتے۔ اس ملک کے مسلمان پچھلے چالیس سال سے مسائل میں الجھے ہوئے ہیں، اس لیے وہ مستقبل کی طرف ایک قدم بھی آگے نہ بڑھ سکے۔

اب مسلمانوں کے لیے بہترین راہ یہ ہے کہ وہ مسائل کے بارہ میں 'صبر' کی پالیسی اختیار کرتے ہوئے مواقع کو بھرپور طور پر استعمال کریں تاکہ ان کا کل ان کے آج سے بہتر ہو سکے۔ اس مشورہ کو انگریزی میں ان الفاظ میں درج کیا گیا تھا:

Starve the problems, feed the opportunities.

ہندستان کے مسلمان اپنے لیڈروں کی رہنمائی میں احتجاجی طریقہ پر عمل کرتے رہے ہیں۔ س کے مقابلہ میں میں تعمیری طریقہ اختیار کرنے کا داعی ہوں۔ یہی بات مذکورہ مضمون میں بھی کہی ئی ہے۔ مطبوعہ ریکارڈ کے مطابق، یہ بات میں نے پہلی بار انجمن تعلیمات دین کے ایک جلسہ میں یش کی تھی جو ۲۱ اکتوبر ۱۹۶۰ کو گونڈہ میں ہوا تھا اور جس میں مولانا ابوالحسن علی ندوی اور قاضی عدیل عباسی وغیرہ شریک تھے۔ ۶۶-۱۹۶۵ کے دوران میں نے یہی بات ندائے ملت (لکھنؤ) کے صفحات میں پیش کی۔ ۱۹۶۷ سے ۱۹۷۴ تک میں اس کو الجمعیۃ ویکلی (دہلی) میں پیش کرتا رہا ب ۱۹۷۶ سے یہی بات ماہنامہ الرسالہ کے صفحات میں پیش کر رہا ہوں۔

ٹائمس آف انڈیا کے مذکورہ مقالہ میں بھی میں نے یہی بات کہی ہے۔ یہ موجودہ حالات کے عتبار سے عین اسلامی بات ہے۔ اور یہ وہی بات ہے جس کا ایک اعلیٰ نمونہ خود پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم ی زندگی میں صلح حدیبیہ کی صورت میں ملتا ہے۔ مقالہ کا حسب ذیل پیراگراف میرے نقطۂ نظر کا خلاصہ ہے:

> In this world (of competition) it is only those who stop railing against defeat and accept it with a view to doing something positive about the situation who can ultimately succeed. We should never lose sight of the fact that a strategic retreat makes it possible to return to the fray. Such tactics were very well understood by the Muslims 1,400 years ago when they drew up the peace treaty of Hudaibiya which, although apparently over-conciliatory towards the opponent, ultimately permitted the Islamic mission to go forward unhindered.

یعنی یہ دنیا مقابلہ کی دنیا ہے۔ یہاں جو لوگ شکست کے خلاف شکوہ شکایت چھوڑ دیں اور حالات کے بارہ میں کچھ مثبت کام کرنے کی خاطر اس کو مان لیں، وہی آخر کار کامیاب ہوتے ہیں۔ ہمیں کبھی اس حقیقت کو بھولنا نہیں چاہیے کہ تدبیری طور پر پیچھے ہٹنا، دوبارہ میدان مقابلہ میں آنے کو ممکن بناتا ہے۔ اس حکمت عملی کو چودہ سو سال پہلے مسلمانوں نے بہت اچھی طرح سمجھ لیا تھا جب کہ انھوں نے حدیبیہ کے صلح نامہ کو تیار کیا تھا۔ یہ صلح اگرچہ بظاہر دشمن سے بہت زیادہ جھک کر کی گئی تھی۔ مگر آخر کار اس نے اسلامی مشن کو یہ موقع دیا کہ وہ کسی رکاوٹ کے بغیر آگے بڑھتا چلا جائے۔

ٹائمس آف انڈیا کے مذکورہ مضمون میں ایک ذیلی سُرخی ان الفاظ میں قائم کی گئی تھی:

Strategic Retreat

یعنی تدبیری واپسی۔ یہ عین وہی بات ہے جو خود قرآن (الانفال ۱۶) میں کہی گئی ہے۔ مگر الرّائد نے تشویہ حقائق کے اصول کے تحت یہ کیا کہ اس نے صرف لفظ Retreat کو لے لیا اور دوسرے لفظ Strategic کو حذف کر دیا۔ یعنی جو چیز "تدبیری واپسی" کے طور پر کہی گئی تھی اس کو صرف "واپسی" بنا کر پیش کر دیا۔

یہ وہی طریقہ ہے جس کے ذریعہ کسی نے قرآن سے یہ حکم نکال لیا تھا کہ "نماز کے قریب نہ جاؤ" اور اس عجیب وغریب قرآنی تعلیم کا ماخذ یہ تھا کہ اس نے قرآن کی ایک آیت کو ادھوری شکل میں پیش کیا۔ قرآن میں کہا گیا تھا کہ: لَاتَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْتُمْ سُكَارٰى۔ (النساء، ۴۳) اس نے سادہ طور پر یہ کیا کہ آیت کے آخری لفظ کو حذف کر دیا اور کہا کہ قرآن میں حکم دیا گیا ہے کہ لاتقربوا الصّلوٰة۔ اگر یہ کوئی طریق استدلال ہے تو اس طرح ہر بات ثابت کی جا سکتی ہے، خواہ وہ کتنی ہی زیادہ اُلٹی بات کیوں نہ ہو۔

ایک سفر

جموں میں ۱۲ ربیع الاول ۱۴۰۸ھ (۵ نومبر ۱۹۸۷) کو میلاد النبی کا سالانہ جلسہ تھا۔ اس موقع پر شرکت کے لیے جموں کا سفر ہوا۔ ۴ نومبر کو دہلی سے جموں جانے والا جہاز (۴۲۱) روانگی کے لیے تیار تھا کہ اچانک جہاز کے اندر ایک غیر معمولی سرگرمی شروع ہوگئی۔ جہاز کا عملہ انگریزی زبان اور ہندستانی زبان میں بار بار یہ اعلان کر رہا تھا کہ دہلی سے گوہاٹی جانے والے کوئی مسافر غلطی سے اس جہاز میں آگیے ہیں، وہ فوراً اتر جائیں۔ کیوں کہ یہ جہاز دہلی سے جموں جا رہا ہے۔ تھوڑی دیر کی تلاش و تحقیق کے بعد آخر کار مذکورہ مسافر کا پتہ چل گیا اور ان کو فوری طور پر جہاز سے اتار کر دوسرے جہاز پر سوار ہونے کے لیے روانہ کر دیا گیا۔ دوسری طرف میں نے دیکھا کہ جہاز کے عملہ کا ایک شخص "واکی ٹاکی" لیے ہوئے بار بار دوسرے جہاز کو یہ پیغام دے رہا ہے کہ براہ کرم جہاز کو روکیے، مسافر آرہا ہے:

Hold the flight please. Passenger is coming.

گیٹ کے نگراں نے بورڈنگ کارڈ کو چک کر کے پتہ کیا کہ اس جہاز میں ایک غلط مسافر داخل ہوگیا ہے۔ لاؤڈ اسپیکر نے مسافر کو اس کی غلطی سے مطلع کیا۔ اسی کے ساتھ وائرلیس نے دو جہازوں کو مسلسل مربوط رکھ کر اس کو ممکن بنایا کہ مذکورہ مسافر فلائٹ نمبر ۴۲۱ سے اترے اور فلائٹ نمبر ۴۸۷ میں جا کر سوار ہو سکے۔ اور یہ سب کچھ صرف چند منٹ کے اندر انجام پاگیا ——— یہ اجتماعی کوشش یا ہم آہنگ عمل کا نتیجہ تھا۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ اجتماعی عمل میں برکت ہے۔

دہلی سے چندی گڑھ تک کی پرواز میں ہمارے نیچے زمین ہموار دکھائی دے رہی تھی۔ جموں کی قریبی فضا میں پہنچے تو زمین اونچی نیچی نظر آنے لگی۔ یہ پہاڑی ابھار تھے جو دور سے اس طرح دکھائی دے رہے تھے جیسے کہ بے شمار اونٹ اپنی کوہانیں بلند کیے ہوئے کھڑے ہوں۔ زمین میں کچھ ہموار علاقے ہیں اور کچھ پہاڑی علاقے۔ دونوں میں کچھ کمیاں ہیں اور دونوں میں کچھ خوبیاں ہیں۔ زمین اگر سب کی سب ایک انداز کی ہوتی تو اس میں کچھ خصوصیات ہوتیں اور کچھ خصوصیات نہ ہوتیں۔ مگر اللہ تعالیٰ نے تنوع کا اصول جاری کر کے ہماری زمین کو ہر قسم کے خیر کا خزانہ بنا دیا ہے۔ اگر زمین میں یکسانیت کا اصول جاری ہوتا تو وہ انسان کے لیے ہر قسم کے خیر کا مجموعہ نہیں بن سکتی تھی۔

اس سے پہلے ۱۹۸۲ میں میں نے جموں کے اس سرسبز و شاداب علاقہ کا ایک مختصر سفر کیا تھا۔ اس وقت کا ایک تاثر میری ڈائری میں حسب ذیل الفاظ میں درج ہے۔

انسان زمین کے اوپر ایک تضاد ہے۔ وہ حقیقتوں کی دنیا میں حقیقتوں کو نظرانداز کرکے رہنا چاہتا ہے۔ انسان کو ایک نہایت حسین اور مکمل دنیا دی گئی ہے۔ مگر وہ اس طرح یہاں رہتا ہے جیسے وہ اپنی دنیا کی تردید کر رہا ہو۔

انسان کھلے ہوئے آسمان کے نیچے بند ذہن کے ساتھ جینا چاہتا ہے۔ لطیف ہواؤں کے درمیان اس کو صرف کثیف اخلاق کے ساتھ رہنا پسند ہے۔ اونچے پہاڑوں کے پڑوس میں وہ چھوٹے چھوٹے مسائل میں الجھا ہوا ہے۔ سرسبز و شاداب درختوں کے ماحول میں وہ ٹھنٹھ بنا ہوا نظر آتا ہے۔ دریاؤں اور چشموں کی روانی کے درمیان وہ جمود و تعطل کی تصویر بنا ہوا ہے۔

اس صورت حال کی سب سے زیادہ عبرت ناک مثال وہ لوگ ہیں جن کو مسلمان کہا جاتا ہے۔ ۱۲ جولائی ۱۹۸۲ کو میں جموں اسٹیشن پر ٹرین کے انتظار میں بیٹھا ہوا تھا۔ دو مسلمان میرے پاس آئے جو غالباً کشمیری تھے۔ ایک نے کہا "مولانا صاحب، مجھے ایک مسئلہ بتائیے۔ لبنان میں فلسطینی بھائیوں کا خون ہو رہا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ان کے خون کے صدقہ کے طور پر ایک بکرا ذبح کروں"۔ دوسرے نے کہا "میں فلسطین جانا چاہتا ہوں، مجھے بتائیے کہ فلسطین جانے کا راستہ کیا ہے"۔ دونوں مجھ سے مشورہ چاہتے تھے، مگر میں ان کو کوئی مشورہ نہ دے سکا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرے دماغ میں الفاظ کا ذخیرہ ختم ہو گیا ہے اور اب میرے پاس ان سے کہنے کے لئے کچھ نہیں ہے۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی شاید سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ خیالی پرواز میں سب سے آگے ہیں اور حقیقی عمل میں سب سے پیچھے۔ ان کو سیاست میں صرف نعرہ پسند ہے، ادب میں شاعری اور دین میں رومانیت۔ مسلمانوں نے نہ اپنی مقدس کتاب سے کچھ سیکھا اور نہ دنیا کے تجربات سے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اصاغر و اکابر کی تمام فوج خوش فکری کے خول میں بند ہے۔ اپنے فکری خول سے باہر کی حقیقتوں کی اسے خبر ہی نہیں۔

آخر ایسے لوگوں کو کیا مشورہ دیا جائے جو فلسطین جیسے سنگین مسئلہ میں اپنا حصہ ادا کرنے کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اس کے لئے ایک بکرا ذبح کر دیں۔ یا اپنی انتہائی بے خبری اور بے مائگی کے باوجود یہ سمجھتے ہیں کہ اگر وہ کسی طرح فلسطین پہنچ جائیں تو وہاں لڑ کر وہ اس کا سارا مسئلہ حل کر دیں گے۔

جموں ریاست جموں وکشمیر کی سرمائی راجدھانی ہے۔ یہاں ڈوگرہ راجپوت کی حکومت تھی۔ ۱۹ویں صدی میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اس پر قبضہ کرلیا۔ رنجیت سنگھ کے انتقال کے بعد دوبارہ گلاب سنگھ کا قبضہ ہوگیا۔ اب یہ ریاست دو حصوں میں تقسیم ہوگئی ہے۔

جموں کی ابتدائی تاریخ کے بارہ میں یہ روایت ہے کہ راجہ جمبو نے ایک مرتبہ اس علاقہ میں شکار کے دوران دیکھا کہ ایک شیر اور بکری ایک ہی تلاب میں اکٹھے پانی پی رہے ہیں۔ راجہ اس سے بہت متاثر ہوا۔ اس نے اس مقام کو مقدس سمجھتے ہوئے یہاں ایک نئے شہر کا سنگِ بنیاد رکھ دیا اور اس کو جمبو نگری کا نام دیا۔ بعد کو یہ مقام جموں کے نام سے مشہور ہوگیا۔ اور راجہ جمبو لوچن کی راجدھانی قرار پایا۔

۱۹۴۷ تک واقعۃً یہ علاقہ ایسا ہی تھا۔ یہاں مختلف فرقے اور مختلف طبقے کے لوگ محبت کے ساتھ مل جل کر رہتے تھے۔ مگر ۱۹۴۷ کے "انقلاب" نے صورت حال بدل دی اور وہ بدستور اب تک بدلی ہوئی ہے۔

میرے پاس انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کا ۱۹۸۴ کا اڈیشن ہے۔ اس میں جموں وکشمیر کا ذکر دو مقام پر ہے۔ ایک، مائیکروپیڈیا جلد پنجم (صفحہ ۵۱۲) میں، اور دوسرے میکروپیڈیا جلد ۱۰ (صفحہ ۲۹) میں۔

اس سفر کے دوران میں نے چاہا کہ جموں کے بارہ میں ضروری معلومات حاصل کروں۔ اس کو کھولا تو دونوں مقامات پر ایک مشترک منظر تھا۔ دونوں مقامات پر ابتدائی پیراگراف تقریباً ایک ایک انچ کے بقدر مٹایا ہوا تھا۔ (ملاحظہ ہو نقشہ اگلے صفحہ پر) مطبوعہ سطروں پر اتنی گہری سیاہی پھیری ہوئی تھی کہ کسی طرح بھی ان سطروں کا پڑھنا ممکن نہ تھا۔ غور کرنے کے بعد اندازہ ہوا کہ یہ ہندسرکار کے حکم سے مٹایا گیا ہے۔ غالباً اس میں کچھ ایسے الفاظ تھے جو ہندسرکار کے نزدیک قابل اعتراض تھے۔ اس قیاس کی تصدیق اس سے ہوتی ہے کہ انسائیکلو پیڈیا کی جلدوں میں ابتدائی صفحہ پر اسٹیمپ کے ذریعہ بعد کو یہ الفاظ ثبت کیے گئے ہیں:

The external boundaries of India as depicted in the maps
are neither correct not authentic.

(انڈیا کی بیرونی سرحدیں جو نقشوں میں دکھائی گئی ہیں وہ نہ صحیح ہیں اور نہ مستند)

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا ہندستان کی تمام قابلِ ذکر لائبریریوں میں پائی جاتی ہے۔ یہ ادارہ اپنی اس کتاب کے ذریعہ ہندستان سے ہر سال کروروں روپیہ حاصل کرتا ہے۔ اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ یہ کتاب (اسی نوعیت کی دوسری کتابوں کی طرح) مغربی علم کی برتری کی ایک خاموش تبلیغ ہے۔ وہ ہندستان کے اوپر ایک قسم کا فکری حملہ (Intellectual invasion) ہے۔ یہ فکری حملہ اتنا قوی ہے کہ وہ خود "جموں اینڈ کشمیر" کے اس آرٹیکل میں بھی بالواسطہ طور پر موجود ہے جس کی چند سطروں پر سیاہی پھیر کر ہند سرکار اپنے کو فتح مند سمجھ رہی ہے۔ اس سلسلہ میں آرٹیکل کی حسب ذیل سطریں ملاحظہ ہوں:

In the early 1970s, after a quarter of a century, the "Kashmir problem" remained intractable. Although there was a clear Muslim majority in the state before the 1949 partition and its economic, cultural, and geographic continuity with the Muslim-majority area of the Punjab could be convincingly demonstrated, the accidents of history have resulted in a division of territory that has no rational basis (Vol. 10, p. 32).

James Watt 512

was about to be abandoned by its inhabitants when Thomas West, Lord De La Warr, arrived with moral and financial aid. Other fires occurred in 1676 and 1698. Jamestown fell into decay when the seat of government of Virginia was moved in 1699 to the Middle Plantation (later Williamsburg).

By the mid-19th century the peninsula had become an island. Conservation efforts halted the erosion of the site, and excavations uncovered invaluable artifacts. In 1936 the island was incorporated into the Colonial National Historical Park, and 17th-century replicas have recreated the colonial atmosphere.

- British-American colonies 18:947e; map 950
- glass manufacture in 17th century 8:189g
- Puritan orientation of early colonies 15:306h
- Virginia Company settlement purpose 19:154b

James Watt, a British vessel, the largest steamship of the early 19th century.

- steamship development importance 18:654d

Jāmī, in full MOWLANĀ NŪR OD-DĪN 'ABD OR-RAḤMĀN EBN AḤMAD (b. Nov. 7, 1414, district of Jam, now in Khurasan, Iran—d. Nov. 9, 1492, Herāt, now in Afghanistan), Persian scholar, mystic, and poet who was the leading intellectual figure of 15th-century Herāt and is often regarded as the last great mystical poet of Iran.

Jāmī spent most of his life in Herāt, except for two brief pilgrimages to Meshed (Iran) and the Hejaz (Arabia). During his lifetime his fame as a scholar was so great that numerous offers of patronage were made to him by Islāmic rulers. Jāmī declined most of these offers, preferring the simple life of a mystic and scholar to that of a court poet; his voluminous work is nota-

was befriended by Stéphane Mallarmé and André Gide. His poetry reacted against Symbolism and followed a new poetic trend known as Naturism. It urged a return to nature, to the small daily happenings of life, to a childlike simplicity. He first attracted attention with *De l'Angélus de l'aube à l'Angélus du soir* (1898; "From the Morning Angelus to the Evening Angelus"). His conversion to Roman Catholicism (1905), under the guidance of Paul Claudel, led him to a growing piety. *Les Géorgiques chrétiennes* (3 vol., 1911–12, "The Christian Georgics") is the saga of a religious peasant family told in everyday language. He was content, despite his fame, to remain in the country, sharing the daily life of villagers. Short stories, novels, and his memoirs (1923) complete his literary production in the same pastoral and intimate tone. He had reached the stature of a patriarch for the young poets of the pre-World War II generation when he died at the age of almost 70.

jamming, in electronics, broadcasting a strong signal that overrides or obscures the signal being jammed. Jamming of radio and television broadcasting beyond the borders of a country may be carried out by another country that does not wish its citizens to receive programs from abroad. In military activities, jamming is frequently employed to confuse enemy radar or communications. The techniques of jamming are many and varied, but most of them simply consist of broadcasting a powerful radio signal, modulated with noise or other extraneous sounds, on the precise frequency of the signal being jammed.

- radar signal jamming and war tactics 15:374c
- radio communications disruption 15:432e
- satellite and jamming prevention 16:262g

Jammu, winter capital of the Indian sector of Jammu and Kashmir state, on the Tāwī Riv-

- map, Jammu and Kashmir 10:30
- population and traditions 10:31g

Jammu and Kashmir 10:29

The ...

west Frontier and Punjab provinces of Pa stan (west).

The territory's area of 86,023 sq mi (222,... sq km) is divided by a "line of control" agre upon in 1972, which leaves 32,358 sq mi (8 806 sq km) under Pakistani and 53,665 sq (138,992 sq km) under Indian administrati The population in 1971 was estimated to about 5,900,000, of whom 4,600,000 were the Indian sector and 1,300,000 in the Pa stani sector. The capitals of the Indian sec are Srinagar in summer and Jammu in w ter; the capital of the Pakistani sector Muzaffarābād.

The text article covers Jammu and Kashm history, physical geography including clim and vegetation, animal life, people, admin tration, economy, and transportation, a deals with the problem of sovereignty.

REFERENCES in other text articles

- area and population table 9:288
- Chinese aid to Pakistan 9:771d
- folk dance and modern theatre 17:169d
- Indian independence crisis 9:421c
- Indic racial characteristics 14:847a
- map India 9:278
- map, Pakistan 13:893
- Marco Polo voyage map 14:758
- Nehru's conflict with Pakistan 12:946d
- Neolithic cultural remains 9:337h
- Pandits kinship and domestic structure 10:479a
- racial and religious divisions 9:283f

ہندسہ کار نے ۳۰ جلدوں کی اس کتاب کی جن چند سطروں پر اعتراض کیا تھا اگر ان کے ناشرین اس اعتراض کو نہ مانتے اور ان سطروں کو مٹانے پر راضی نہ ہوتے تو یقینی تھا کہ اس کتاب کی درآمد ہندستان میں بند کر دی جائے۔ مگر انھوں نے اس اعتراض کو بلا بحث قبول کرتے ہوئے اس کو مٹا دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے لیے اپنی کتاب کی درآمد کا وسیع دروازہ کھل گیا۔

بعض اوقات اپنی لکھی ہوئی سطروں کو خود اپنے ہاتھ سے مٹانا پڑتا ہے تاکہ وہ دوبارہ زیادہ وسیع دائرہ میں لکھی جائیں۔ یہ زندگی کا اہم ترین راز ہے۔ اگرچہ بہت کم لوگ ہیں جو اس راز کو جانیں، اور اس سے بھی کم وہ لوگ ہیں جو اس پر عمل کرنے کا حوصلہ کر سکیں۔

جموں وکشمیر ہندستان کی واحد ریاست ہے جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ وادی کے علاقہ میں مسلمان ۹۰ فی صد ہیں۔ جموں کے علاقہ میں مجموعی طور پر ۳۰ فی صد ہیں۔ اور پوری ریاست جموں وکشمیر میں تقریباً ۶۵ فی صد۔ مزید یہ کہ اس ریاست کو دستور ہند کی دفعہ ۳۷۰ کے تحت مخصوص تحفظاتی درجہ ملا ہوا ہے۔

اس اعتبار سے جموں وکشمیر کے مسلمانوں کے لیے یہاں ترقی کا خصوصی راستہ کھلا ہوا تھا۔ مگر میرا اندازہ ہے کہ جموں وکشمیر کے مسلمان اپنی اس خصوصی حیثیت کا وہ فائدہ حاصل نہ کر سکے جو وہ حالات کے اعتبار سے حاصل کر سکتے تھے۔ اس کا واحد سبب وہی ہے جس کو مذہب کی اصطلاح میں عدم قناعت کہا جاتا ہے۔ یہاں کے مسلمانوں کے لیے عملاً جو چیز قابلِ حصول تھی، اس پر وہ قانع نہیں ہوئے۔ اور جو چیز عملاً قابلِ حصول نہ تھی، اس کے پیچھے دوڑتے رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے "ناممکن" کے تعاقب میں "ممکن" کو بھی کھو دیا۔

ماضی کو بھلا کر حال پر قانع ہونا، مستقبل کی تعمیر کا واحد راز ہے۔ لوگ ماضی کو بھلا نہیں پاتے، اسی لیے وہ حال کے امکانات کو بھی استعمال نہیں کر پاتے۔ یہ تبصرہ موجودہ زمانہ کے تمام مسلمانوں پر صادق آتا ہے، خواہ وہ اقلیتی علاقہ کے مسلمان ہوں یا اکثریتی علاقہ کے مسلمان۔

کچھ لوگوں نے بتایا کہ پونچھ میں دیوبندی اور بریلوی کے درمیان جھگڑا ہو گیا۔ حتی کہ پولیس کو مداخلت کرنی پڑی۔ گفتگو کے دوران میں نے پوچھا کہ بریلوی حضرات کس قسم کی باتیں کرتے ہیں جس کے ذریعہ وہ مسلم عوام کو دیوبندیوں کے خلاف بھڑکانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ انھوں

بتایا کہ مثلاً ایک بریلوی مقرر کھڑا ہو کر کہے گا، دیکھو قرآنی آیت (لیغفر لک اللہ ما تقدم من ذنبك وما تاخر) کا ترجمہ دیوبندی عالم نے اس طرح کیا ہے: "تاکہ اللہ تمہارے سب اگلے پچھلے گناہوں کو معاف کر دے"۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا کے محبوب پیغمبر بھی گنہ گار تھے۔ اور جو شخص خدا کے محبوب پیغمبر کو گنہ گار بتائے وہ کیسے مسلمان ہو سکتا ہے ——— اس قسم کی باتوں سے امت میں تفریق پیدا ہوتی ہے۔ مگر موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا یہ تضاد عجیب ہے کہ ایک طرف ہر ایک اتحاد کی بات کر رہا ہے۔ دوسری طرف ہر ایک مذکورہ نوعیت کی ایک یا دوسری بات لے کر امت کو ٹکڑوں ٹکڑوں میں بانٹ رہا ہے۔

حافظ عبد الرحمٰن (پیدائش ۱۹۰۰) نے اپنی زبان میں کہا " یہ جو ۱۹۴۷ ہوئی، وہ اسلام کے اندر رکاوٹ بن گئی " انھوں نے بتایا کہ پہلے ہندوؤں اور مسلمانوں میں کوئی نفرت نہیں تھی۔ اس وقت مذہبی تعصب نہیں تھا۔ کوئی مسلمان فقیر (بزرگ) آگیا تو ہندو مسلمان سب اس کی عزت کرتے تھے۔ حتیٰ کہ بہت سے غیر مسلم اس کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لیتے تھے اور کوئی برا نہیں مانتا تھا۔ اس وقت لوگ سادہ تھے۔ کوئی بھید بھاؤ نہیں تھا۔ اب محاذ آرائی ہونے لگی۔ اس کی وجہ سے دامن کے تمام امکانات برباد ہو گیے۔ اگر پہلے والے حالات جاری رہتے تو اب تک کیا سے کیا ہو گیا ہوتا۔

انھوں نے ایک شخص (مسٹر گنیش ایم اے) کا قصہ بتایا۔ ان کو اسلام سے سخت نفرت تھی۔ اسی نفرت کی وجہ سے انھوں نے اسلام پر کتابیں پڑھیں۔ وہ ابتداءً نفرت کا شکار رہے۔ وہ "رنگیلا رسول" کی باتیں دہراتے تھے۔ مگر مطالعہ کے بعد ان پر اسلام کی سچائی آشکارا ہو گئی۔ حافظ عبدالرحمٰن صاحب سے اپنی روداد بیان کرتے ہوئے انھوں نے کہا " مگر اب میں کیڑا مسلمان ہوں"۔ ان کا نیا نام عبد الاحد ہے۔ اب وہ راجستھان میں رہتے ہیں۔

موجودہ مسلمانوں کا مزاج یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اسلام کے خلاف کچھ کہہ دے تو فوراً اس کو اسلام کا مستقل دشمن سمجھ لیتے ہیں۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ ایسے لوگ ہمیشہ بہت ہی کم ہوتے ہیں جو کسی چیز کے ابدی دشمن ہوں۔ بیشتر لوگ ناسمجھی میں کوئی رائے قائم کر لیتے ہیں۔ اگر ان کی ناسمجھی کو دور کر دیا جائے تو عین ممکن ہے کہ جو شخص آج بظاہر دشمن نظر آتا ہے، وہ کل کے دن دوست

حامی بن جائے۔

جموں میں ہر سال ربیع الاول کے موقع پر میلاد النبی کا جلوس نکالا جاتا ہے۔ یہ جلوس روایتی شان کے ساتھ جموں شہر کے مختلف علاقوں میں گھومتا ہوا جامع مسجد پہنچتا ہے۔ یہاں "اسلامی جھنڈے" کو سلامی دی جاتی ہے۔ جھنڈے کی شان میں ایک نظم پڑھی جاتی ہے۔ اس تقریب کے بعد ظہر کی نماز ہوتی ہے اور ظہر کی نماز کے فوراً بعد جلسہ شروع ہو جاتا ہے۔

میں نے دیکھا تو جلوس میں کافی مسلمان شریک تھے۔ ابتداءً میں نے سمجھا کہ یہ سب جموں شہر کے مسلمان ہیں۔ مگر پوچھنے پر معلوم ہوا کہ اس میں جموں شہر کے لوگ پانچ فیصد یا دس فی صد ہوں گے۔ ورنہ زیادہ تر لوگ اطراف کے دیہاتوں سے آئے ہوئے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ ایسا کیوں ہے۔ ایک صاحب نے بتایا کہ اس قسم کے جلوسوں میں عام طور پر "شرفاء اور معززین" شریک نہیں ہوتے۔ عوام اور جاہل قسم کے مسلمان ہی زیادہ شریک ہوتے ہیں۔ اور یہی صورت حال ہر جگہ پائی جاتی ہے۔

جلوسوں کی اسی نوعیت کی وجہ سے اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جلوس کے بعد فساد شروع ہو جاتا ہے۔ میں ذاتی طور پر جلوس کی سیاست کا قائل نہیں، مگر جو لوگ جلوس کے طریقہ میں یقین رکھتے ہیں، انھیں سب سے پہلے شرفاء مسلمین کو شرکت جلوس کے لیے آمادہ کرنا چاہیے۔ اس سے پہلے جلوس نکالنا اس مقصد کے لیے مفید نہیں ہو سکتا جس کے لیے جلوس نکالا جاتا ہے۔

جلسہ کی دو نشستیں ہوئیں۔ ایک ظہر اور عصر کے درمیان۔ اور دوسری نشست نماز مغرب کے بعد۔ کئی مقررین کی تقریریں ہوئیں۔ میں نے دن کی نشست میں مختصر طور پر سیرت کے اخلاقی پہلو پر گفتگو کی۔ شام کی نشست میں مفصل خطاب کیا۔ اس خطاب کا موضوع سیرت کا عالمی اور آفاقی پہلو تھا۔ شام کے جلسہ کی کارروائی ٹیلی وژن پر بھی دکھائی گئی۔ ۶ نومبر کو جمعہ کا دن تھا۔ لوگوں کی فرمائش پر یہاں کی جامع مسجد میں "نماز" کے موضوع پر ایک خطاب ہوا۔ وسیع مسجد پوری کی پوری بھری ہوئی تھی۔ معلوم ہوا کہ ان نمازیوں میں بیشتر تعداد تعلیم یافتہ حضرات کی تھی۔

جموں شہر پوری ریاست جموں وکشمیر کا تجارتی مرکز ہے۔ مگر یہاں کی تجارتوں میں مسلمانوں کا کوئی قابل ذکر حصہ نہیں۔ یہاں مسلمانوں کی چند معمولی دکانیں ہیں۔ تمام بڑی بڑی تجارتیں

۹۹ فی صد سے بھی زیادہ ہندو صاحبان کے قبضہ میں ہیں۔ حتی کہ سیرت النبی کے جلسہ کے لیے جو ٹنٹ لگایا گیا تھا، میں نے دیکھا تو اس پر انگریزی میں لکھا ہوا تھا: "راما ٹنٹ اینڈ لائٹ ہاؤس"

شہر میں گھومتے ہوئے میں نے دو کافی بڑی بڑی بلڈنگیں دیکھیں۔ یہ دونوں بلڈنگیں مسلم اوقاف کے محکمہ کی ہیں۔ یہ دونوں اہم مقامات پر ہیں اور ان میں بہت سی دکانیں بنی ہوئی ہیں۔ مگر اس خالص "مسلم جائداد" میں بھی زیادہ تر دکانیں غیر مسلم صاحبان کی تھیں۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اوقاف والوں نے دکان کو الاٹ کرنے کے لیے "ایڈوانس" رقم کی شرط لگا رکھی تھی۔ مسلمان اپنی اقتصادی کمزوری کی وجہ سے ایڈوانس رقم کی شرط پوری نہ کر سکے۔ اس لیے زیادہ تر دکانیں غیر مسلم صاحبان کے قبضہ میں چلی گئیں۔

میں نے سوچا کہ مسلم اوقاف کی بلڈنگ پر ہندو صاحبان کا قبضہ کسی تعصب کی بنا پر نہیں ہو سکتا تھا۔ پھر وہ کیا چیز ہے جس نے غیر مسلم صاحبان کو یہ موقع دیا کہ وہ ایک مسلم جائداد پر قابض ہو جائیں۔ اس کا جواب ایک لفظ میں "انٹرسٹ" ہے۔ یہ دنیا انٹرسٹ کا کھیل ہے۔ ہر آدمی اپنے مفاد کے تحت عمل کرتا ہے۔ محکمہ اوقاف کو مالی فائدہ اس میں نظر آیا کہ وہ اپنی دکانیں غیر مسلم صاحبان کو دے۔ اس لیے اس نے اپنی دکانیں غیر مسلم صاحبان کو دے دیں۔ اس کے برعکس اگر وہ دیکھتے کہ مسلمانوں کو دینے میں فائدہ ہے تو وہ اپنی دکانیں مسلمانوں کے حوالے کرتے۔ مسلمان اگر اس ناگزیر شرط کو پورا نہ کر سکیں تو وہ یقینی طور پر ناکام رہیں گے۔ خواہ وہ مسلم اقلیت کے ملک میں ہوں یا مسلم اکثریت کے ملک میں۔ رعایت کی بنیاد پر کبھی کوئی قوم اس دنیا میں کھڑی نہیں ہو سکتی۔

ایک صاحب ایک کتاب لائے جس کا نام "انوار الانتباہ" تھا۔ اس میں عجیب و غریب قسم کی طلسماتی باتیں درج تھیں۔ اس کتاب کا خلاصہ یہ تھا کہ بزرگوں سے مدد مانگنا جائز ہے۔ "امام شیخ الاسلام شہاب رملی سے استفتار ہوا کہ عام لوگ جو سختیوں کے وقت انبیار و مرسلین اور اولیاء و صالحین سے فریاد کرتے اور یا رسول اللہ، یا علی، یا شیخ عبدالقادر جیلانی اور ان کے مثل کلمات کہتے ہیں۔ یہ جائز ہے یا نہیں، اور اولیار بعد انتقال کے مدد فرماتے ہیں یا نہیں۔ انھوں نے جواب دیا کہ بیشک انبیار و مرسلین اور اولیار و علمار سے مدد مانگنی جائز ہے اور وہ بعد انتقال بھی مدد فرماتے ہیں"

ایک "واقعہ" ان الفاظ میں درج تھا: ایک بار حضرت سیدی مدین بن احمد شمونی نے وضو

راستے میں ایک کھڑاؤں بلاد مشرق کی طرف پھینکی۔ سال بھر بعد ایک شخص حاضر ہوئے اور کھڑاؤں ان کے پاس تھی۔ انھوں نے حال عرض کیا کہ جنگل میں ایک بدوضع نے ان کی صاحبزادی پر دست درازی کرنا چاہا۔ لڑکی کو اس وقت اپنے باپ کے پیرومرشد حضرت سیدی مدین کا نام یاد نہ تھا۔ یوں ندا کی: یا شیخ ابی لاحظنی (اے میرے باپ کے پیر مجھے بچائیے) یہ ندا کرتے ہی وہ کھڑاؤں آئی۔ لڑکی نے نجات پائی۔ وہ کھڑاؤں ان کی اولاد میں اب تک موجود ہے، صفحہ ۱۶ —

اسی قسم کے خرافاتی عقائد اور جھوٹے قصے کہانیاں ہیں جن میں موجودہ زمانہ کے مسلمان جی رہے ہیں۔ یہ مسلمان ایک خود ساختہ اسلام پر قائم ہیں نہ کہ اس اسلام پر جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کی طرف سے لائے تھے۔

۴ نومبر کو لاہور میں ریلائنس ورلڈکپ ۱۹۸۷ کے لیے پاکستان اور آسٹریلیا کے درمیان کرکٹ کا سیمی فائنل تھا۔ میں جموں کے بازار میں نکلا تو ہر دکان پر لوگ ٹیلی ویژن کے اوپر بھیڑ لگائے ہوئے کھڑے تھے۔ کچھ لوگ اس حال میں راستہ چل رہے تھے کہ انھوں نے اپنے کان کے ساتھ ٹرانسسٹر لگا رکھا تھا۔ یہاں تک کہ سوا پانچ بجے چاروں طرف سے پٹاخے کی آوازیں آنے لگیں۔ معلوم ہوا کہ پاکستان ہار گیا ہے اور آسٹریلیا ۱۸ رن سے جیت گیا۔ اس خوشی میں ہندو صاحبان پٹاخے چھوڑ رہے ہیں۔

اگلے دن ۵ نومبر کو دوسرا منظر تھا۔ آج بھی دوبارہ سیمی فائنل کا مقابلہ تھا۔ یہ مقابلہ ہندستان اور انگلینڈ کے درمیان ہو رہا تھا۔ سہ پہر کے وقت میں یہاں کے ایک مسلم محلہ میں تھا کہ اچانک پٹاخہ کی آوازیں آنے لگیں۔ معلوم ہوا کہ آج ہندستان ہار گیا ہے اور انگلینڈ ۳۵ رن سے جیت گیا ہے۔ اب مسلمانوں کی خوشی کی باری تھی۔ آج کے دن مسلمان پٹاخے چھوڑ رہے تھے۔

میں نے ایک مسلمان سے کہا۔ یہ سراسر حماقت ہے۔ آخر مسلمان ایسی احمقانہ حرکت کیوں کرتے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا۔ اس کے ذمہ دار ہندو صاحبان ہیں۔ وہ لوگ پاکستان کی ہار پر خوشی مناتے ہیں۔ اس کے ردعمل میں مسلمان بھی ہندستان کی ہار پر خوشی منا رہے ہیں۔ میں نے کہا اگر یہی وجہ ہے تو ایسا کرنے سے ہندو صاحبان کا یہ ذہن مزید بڑھے گا اور مسئلہ پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہوتا چلا جائے گا۔ ہندو پٹاخہ بازی کا جواب مسلم پٹاخہ بازی نہیں ہے۔ اس کا حل صرف یہ ہے کہ

ہندو پٹاخہ چھوڑیں تو مسلمان پٹاخہ نہ چھوڑیں۔ اس کے بعد ہندو پٹاخہ بازی اپنے آپ ختم ہو جائے گی۔

ان مواقع پر مسلمان اگر اس چیز کا مظاہرہ کرتے جس کو "اسپورٹس مین اسپرٹ" کہا جاتا ہے تو وہ ملک میں ایک مفید روایت کو رواج دینے کا کریڈٹ پاتے۔ اس کے برعکس ردعمل کا مظاہرہ کرکے وہ صرف اس چیز کا اضافہ کر رہے ہیں جس کو ہندستان ٹائمس (۶ نومبر ۱۹۸۷) نے میچ فسادات (Match riots) کا نام دیا ہے۔

ایک صاحب سے گفتگو ہوئی۔ میں نے کہا کہ مسلمانوں کو حقیقت پسند بننا چاہیے۔ حقیقت پسندی ہی اس دنیا میں کامیابی کا راز ہے، خواہ آپ ہندستان میں ہوں یا کسی دوسرے ملک میں۔ میری یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آئی۔ اگلے دن معلوم ہوا کہ ریلائنس کپ کے میچ کے زمانہ میں وہ تمام دن گھر پر بیٹھے ہوئے کمنٹری سنتے رہتے ہیں۔ بجلی آرہی ہے تو ٹیلی ویژن پر اور اگر بجلی نہیں ہے تو ٹرانسسٹر پر۔ میں نے سوچا کہ جن لوگوں کا ذہن سطحی چیزوں میں اتنا زیادہ مشغول ہو وہ آخر کوئی گہری بات کس طرح سمجھ سکتے ہیں۔

جموں میں محکمہ اوقاف نے ایک نہایت وسیع اور شاندار جامع مسجد تعمیر کی ہے۔ مولینا صدرالدین قاسمی اس مسجد کے امام ہیں۔ ان کے حالات کو قریب سے جاننے کا اتفاق ہوا۔ میرا احساس یہ ہے کہ ائمہ کی جماعت کے لیے وہ ایک نمونہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

مسجد کے امام کو عام طور پر بہت کم تنخواہ ملتی ہے۔ اس لیے ہر امام کے سامنے یہ مسئلہ رہتا ہے کہ وہ اپنی آمدنی کو کس طرح بڑھائے۔ عام طور پر ائمہ یہ کرتے ہیں کہ وہ یا تو تعویذ گنڈے کا کاروبار شروع کر دیتے ہیں۔ یا متولیوں اور بڑے لوگوں کی خوشامد اور حاضر باشی کے ذریعہ مزید فوائد حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کچھ ائمہ مسلمانوں کے اختلاف اور نزاع کو بڑھا کر اپنی اہمیت ثابت کرتے ہیں تاکہ اس کے ذریعہ سے کچھ فائدے حاصل کر سکیں۔ مولانا صدرالدین قاسمی نے اس قسم کی کوئی تدبیر نہیں کی۔ اس کے بجائے انھوں نے اپنے دو بھائیوں کی مدد سے تجارت کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ۲۰ سالہ محنت کے نتیجہ میں آج یہاں ان کی دو کامیاب دکانیں وجود میں آچکی ہیں۔ ایک کپڑے کی اور دوسری کتابوں کی۔ ایک بھائی کپڑے کی دکان پر بیٹھتے ہیں اور دوسرے بھائی کتابوں کی دکان پر۔

تجارت کا یہ راستہ ہر امام کے لیے کھلا ہوا ہے۔ اپنے حالات کے لحاظ سے ہر امام اپنے مقام پر

کوئی تجارت شروع کر سکتا ہے اور محنت اور استقلال کے ذریعہ اس میں کامیابی حاصل کر سکتا ہے۔

عبدالمجید صاحب یہاں کی ایک مقبول شخصیت ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ اب تو وہ بزنس میں لگ گیے ہیں۔ مگر اس سے پہلے وہ سیاست میں دلچسپی رکھتے تھے اور مقامی الکشن میں حصہ لے کر یہاں کے کونسلر بھی منتخب ہوئے۔ میں نے پوچھا کہ جموں شہر میں تو مسلمانوں کی تعداد بمشکل ۵ فی صد ہوگی، پھر آپ کس طرح یہاں کے الکشن میں کامیاب ہوئے تھے۔

انھوں نے مسکرا کر کہا کہ میری پالیسی وہی ہے جس کا آپ الرسالہ میں سبق دیتے ہیں۔ میں سب سے یکساں طور پر خوش اخلاقی کے ساتھ ملتا ہوں۔ یہ اللہ کا فضل ہے کہ سب کے ساتھ میرے اچھے تعلقات ہیں۔ چنانچہ الکشن میں جس طرح مسلمانوں نے مجھے ووٹ دیا، ہندوؤں نے بھی بڑی تعداد میں مجھ کو ووٹ دیا اور میں کامیاب ہوگیا۔ اگرچہ میرے مقابلہ میں ایک ہندو امیدوار بھی تھا ——

جموں میں عبدالمجید صاحب کے لیے جو موقع تھا، وہی موقع مسلمانوں کے لیے پورے ملک میں ہے۔ بشرطیکہ وہ اس کو جانیں اور سلیقہ اور ہوشمندی کے ساتھ اس کو استعمال کر سکیں۔

عبدالمجید صاحب نے کہا کہ چلئے آپ کو شہر کی سیر کرا دیں۔ ان کے ساتھ روانہ ہو کر میں وہاں پہنچا جس کو " باغ بہو " کہا جاتا ہے۔ یہاں ایک پرانا قلعہ تھا۔ اس کے آس پاس کی زمین کو ترقی دے کر اس کو پرفضا تفریحی مقام بنا دیا گیا ہے۔

یہاں قلعہ کے پاس ایک صاف ستھری مسجد نظر آئی۔ معلوم ہوا کہ اس مسجد کو غالباً تین سو سال پہلے یہاں کے ہندو راجہ نے بنوایا تھا۔ یہ ایک علامت ہے کہ قدیم زمانہ میں یہاں کوئی ہندو مسلم مسئلہ نہ تھا۔ میں نے مسجد کو اندر جا کر دیکھا۔ اس کی از سرِ نو آرائش کی گئی ہے۔ میں نے تلاش کیا کہ کہیں اس کا ابتدائی سن تعمیر لکھا ہوا ہو تو اس کو نوٹ کروں۔ ایک بورڈ نظر آیا۔ قریب جا کر دیکھا تو اس پر " شاہی مسجد " کے ساتھ " ۸۶ ، " لکھنے کا اہتمام تو ضرور کیا گیا تھا، مگر وہاں مسجد کا سنِ تعمیر درج نہ تھا۔ مسلمانوں میں روایتی ذوق ضرورت سے زیادہ پایا جاتا ہے، مگر تاریخی ذوق ان کے اندر بقدرِ ضرورت بھی نہیں۔

باغ بہو کے قریب ایک جگہ بہت بڑے پیمانہ پر کھدائی اور تعمیر کا کام ہو رہا تھا۔ معلوم ہوا کہ ریلوے لائن کی توسیع کی جا رہی ہے۔ ۱۹۴۷ میں دہلی سے صرف پٹھان کوٹ تک ریلوے لائن

تھی۔ اس کے بعد اس کو بڑھا کر جموں توی تک پہنچایا گیا۔ اب مزید ۶۵ میل کی توسیع کے ذریعہ اس کو ادھم پور تک لے جایا جا رہا ہے۔ یہ پورا راستہ اونچے پہاڑوں اور گہری کھائیوں سے بھرا ہوا ہے۔ ریلوے لائن کا بہت بڑا حصہ پلوں اور سرنگوں کے درمیان سے گزرے گا۔ ۱۹۴۷ کے بعد کشمیر کے علاقہ میں جس رفتار سے کام ہو رہا ہے، اس کو دیکھتے ہوئے یہ قیاس کچھ زیادہ بعید نہیں کہ ایک دن یہ ریلوے لائن دہلی سے براہِ راست سری نگر تک پہنچا دی جائے گی۔ مسئلہ صرف اس کی "قیمت" کا ہے، اور ہندستان بہرحال اس کی قیمت ادا کرنے کے لیے تیار ہے۔

راستہ میں ایک "چھتری" نظر آئی۔ ایک پہاڑی پر بیٹھنے کی جگہ بنا کر اس کے اوپر خاص طرح کی چھتری بنی ہوئی تھی۔ محکمۂ سیاحت کی طرف سے اس علاقہ میں اس قسم کے بہت سے تفریحی مقامات بنائے گیے ہیں۔ اوپر چڑھ کر ہم لوگ کچھ دیر تک وہاں بیٹھے۔ یہاں خالص ہوا تھی۔ چاروں طرف سرسبز پہاڑوں کا منظر پھیلا ہوا تھا۔ دور جموں شہر نیچا اونچا بسا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ قدرت کے اس ماحول میں آدمی خدا کی تجلیات میں گم ہو جاتا ہے۔ دل نے کہا کہ زندگی کے تقاضے اگر مجبور نہ کریں تو میں خدا کی اس حسین دنیا میں کھو جاؤں اور پھر کبھی اس سے باہر نہ آؤں۔

مگر موجودہ دنیا میں انسان سے یہ مطلوب نہیں۔ چڑیاں اگر اس سرسبز دنیا میں اڑیں تو وہ ان کے لیے زندگی کی سرگرمیوں کے ہم معنی ہے۔ لیکن انسان اگر ایسا کرے تو وہ اس کے لیے زندگی سے فرار کے ہم معنی بن جائے گا۔

جب ہم لوگ چھتری کے نیچے بیٹھے ہوئے تھے، اس وقت میری نظر نیچے کی سڑک پر گئی۔ سڑک کے کنارے ایک پتھر لگا ہوا تھا جس پر یہ انگریزی الفاظ لکھے ہوئے تھے:

Drive with care.

(احتیاط کے ساتھ گاڑی چلاؤ) میں نے سوچا کہ سڑک بظاہر خاموش ہے۔ مگر وہ کتنی بڑی حقیقت کا اعلان کر رہی ہے۔ زندگی بھی ایک سڑک کی مانند ہے۔ یہاں ہم اکیلے نہیں چل رہے ہیں۔ بلکہ ہماری طرح دوسرے بہت سے لوگ اس پر اپنی گاڑیاں دوڑا رہے ہیں۔ ایسی حالت میں محفوظ سفر کا واحد یقینی طریقہ یہی ہے کہ ہر آدمی چوکنا رہے، ہر آدمی احتیاط کے ساتھ اپنی گاڑی چلائے۔

سڑکوں سے گزرتے ہوئے راستہ میں کئی جدید طرز کی کالونیاں دکھائی دیں۔ کشادہ سڑکیں، کھلے مکانات، صاف ستھری زندگی۔ میں نے پوچھا کہ ان کالونیوں میں مسلمان کتنے ہوں گے۔ جواب ملا کہ ایک بھی نہیں۔ "مسلمان تالاب کھٹیکان سے نکلنا پسند نہیں کرتے"۔ یہی ذہنیت اکثر مقامات پر مسلمانوں کی ہے۔ مگر میں اس کو مسلمانوں کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ سمجھتا ہوں۔ اس طرح مسلمان بیک وقت دو چیزوں سے محروم ہو رہے ہیں۔ ایک، ذہنی وسعت۔ اور دوسرے، جدید مواقع سے فائدہ اٹھانا۔

واپسی میں جب ہم قدیم جموں کے علاقہ میں پہنچے تو ایک جگہ سڑک کے ایک طرف چند ٹھیلے کھڑے ہوئے تھے۔ اس بنا پر وہاں سڑک تنگ ہو گئی تھی اور صرف ایک ہی گاڑی کے گزرنے کا راستہ باقی تھا۔ اتفاق سے عین اسی وقت سامنے کی سڑک پر ایک اور گاڑی آگئی۔ ایک لمحہ کے لیے دونوں گاڑیاں رک گئیں۔ اس کے بعد سامنے والے ڈرائیور نے اپنی گاڑی پیچھے کی طرف چلا کر ایک کنارے کھڑی کر دی۔ اب ہماری گاڑی کے لیے راستہ کھل گیا۔ ہم تیزی سے گزر گیے۔ اس کے بعد دوسری طرف کی گاڑی بھی روانہ ہو کر آگے چلی گئی۔

کبھی آگے بڑھنے کے لیے پیچھے ہٹنا پڑتا ہے۔ جن لوگوں کی ڈکشنری میں صرف آگے بڑھنے کا لفظ لکھا ہوا ہو، پیچھے ہٹنے کا لفظ ان کی ڈکشنری میں درج نہ ہو، ایسے لوگوں کے لیے اس دنیا میں اپنی منزل پر پہنچنا مقدر نہیں۔

ایک مسلمان ایک ادارہ کی طرف سے اس کی ایک شاخ کا مقامی انچارج تھا۔ اس نے فریب ہی کے ذریعہ اس کی اس عمارت پر غاصبانہ قبضہ کر لیا۔ اب وہ اپنے ناجائز قبضہ کو جائز ثابت کرنے کے لیے جھوٹا پروپیگنڈہ کرنے میں مشغول ہے۔

اس سفر میں ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے مذکورہ واقعہ کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ اس مسلمان کا کہنا ہے کہ ہمارے اکابر خود غاصبانہ قبضہ کیے ہوئے ہیں۔ اس لیے اگر میں نے بھی ایک غاصبانہ قبضہ کر لیا تو اس میں کیا ہرج ہے۔ میں نے پوچھا کہ اس کی کوئی مثال بتائیے۔ انھوں نے کہا کہ وہ مسلمان اس سلسلہ میں آپ کی مثال پیش کرتا ہے اور کہتا ہے کہ آپ نے جمعیۃ بلڈنگ (دہلی) کے دو کمروں پر غاصبانہ قبضہ کر رکھا ہے۔

41
Accession Number 121725
Date 27.10.89

میں نے کہا کہ یہ سراسر جھوٹی بات ہے۔ جمعیۃ بلڈنگ کا جو حصہ میرے پاس ہے اس کا میں باضابطہ کرایہ دار ہوں۔ جمعیۃ ٹرسٹ سوسائٹی کے سابق چیرمین حاجی عبدالعزیز صاحب کی رضامندی سے طرفین کے درمیان ایک تحریری اتفاق نامہ ہوا جس پر دونوں نے دستخط کیے۔ اس طرح طرفین کے متفقہ فیصلہ کے تحت اس کی کرایہ داری قائم ہوئی اور میں ۱۹۷۴ سے مسلسل ماہ بہ ماہ اس کا مقررہ کرایہ ادا کر رہا ہوں۔ کوئی بھی شخص ہمارے دفتر میں آکر ۱۹۷۴ سے اب تک کی رسیدیں دیکھ سکتا ہے۔

مذکورہ صاحب میرے جواب سے مطمئن ہوگیے۔ انھوں نے کہا کہ مجھے صحیح صورت حال کا علم نہ تھا۔ اس مسلمان کا آپ کے خلاف پروپیگنڈا یقیناً ایک بہتان ہے۔ البتہ اگر وہ بھی آپ کی طرح عمارت کے اصل مالک سے اتفاق نامہ کرے اور اس کے مطابق عمل درآمد کرے تو اس کے بعد اس کے معاملہ کو جائز معاملہ کہا جاسکتا ہے۔ ورنہ موجودہ صورت حال میں تو وہ خود اپنے اقرار کے مطابق غاصب اور خائن ثابت ہو رہا ہے۔

ایک صاحب نے لیتھو پر چھپا ہوا ایک اردو اخبار پیش کرتے ہوئے کہا: یہ ابھی ہفت روزہ ہے۔ اب میرا ارادہ ہے کہ اس کو روزنامہ بنا دیا جائے۔ میں نے کہا کہ اصل اہمیت یہ نہیں ہے کہ ہفت روزہ کے بجائے روزنامہ ہو، اصل اہمیت یہ ہے کہ وہ معیاری ہو۔ اردو زبان میں بے شمار اخبارات نکلتے ہیں، مگر شاید ان میں سے کوئی بھی نہیں جو جدید معیار صحافت کے مطابق ہو۔

میں نے کہا کہ حدیث میں ہے کہ اللہ جمیل ویحب الجمال۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ جمال وکمال کے اعلیٰ معیار پر ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ آپ جو کام کریں وہ سطح خداوندی کے مطابق ہو۔ آج کل مسلمان جو اخبارات نکال رہے ہیں وہ جدید معیار صحافت کے اعتبار سے سطح انسانی کے مطابق بھی نہیں، کجا کہ ان کو سطح خداوندی کے مطابق کہا جائے۔

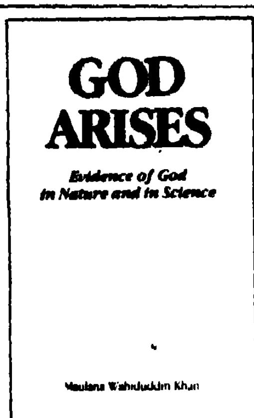
۶ نومبر ۱۹۸۷ کی سہ پہر کو انڈین ایرلائنز کی فلائٹ ۴۲۲ کے ذریعہ دہلی واپسی ہوئی۔ راستہ میں ہوائی کمپنی کے ماہنامہ سواگت (اکتوبر ۱۹۸۷) میں ایک مضمون پڑھا یہ مغل یادگاروں کے بارہ میں تھا۔ اس مضمون میں اکبر (۱۶۰۵-۱۵۵۶) سے لے کر شاہجہاں

۱۶۵۸ – ۱۶۲۷) تک کی مختلف عمارتوں کی تفصیل درج تھی۔ مضمون نگار مسٹر جگموہن مہاجن
ے مغل عمارتوں کا باتصویر تذکرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ مغلوں کے ظہور کے بعد ہندستان
ے فن تعمیر نے ایک نیا انداز اختیار کیا :

Indian architecture took on a new aspect
with the advent of the Mughals (p. 81).

جو وہ مسلمان ماضی کے "لال قلعہ" اور ماضی کے "تاج محل" پر فخر کرتے ہیں۔ مگر آج کے
ندستان کو وہ کوئی نیا لال قلعہ اور کوئی نیا تاج محل نہ دے سکے۔ مسلمانوں کی اسی
و تباہی میں ان کی تمام محرومیوں کا راز چھپا ہوا ہے۔

۶ نومبر ۱۹۸۷ کی شام کو میں جموں سے دہلی واپس آیا۔



God Arises
by Maulana Wahiduddin Khan

This English edition of *Mazbab Aur Jadeed Challenge*, is an updated version, incorporating considerable additional material.

It has also been translated into a number of other languages, including Arabic, French, Turkish, Malay, Serbo-Croatian (Yugoslavian), Sindhi, Tamil, etc., and has come to be accepted as standard work on the Islamic position vis-a-vis modern thought.

Pages 265 ISBN 81-85063-14-1 81-85063-17-6 Price Rs. 45

THE ISLAMIC CENTRE
C-29 Nizamuddin West New Delhi - 110 013

۱۔ "فیسٹول آف انڈیا" کے تحت ۲۴ ستمبر ۱۹۸۷ سے لیکر ۲۰ جنوری ۱۹۸۸ تک روس کی راجدھانی ماسکو میں ایک نمائش ہوئی جس میں ہندستانی کتابوں کی نمائش بھی شامل تھی۔ اس موقع پر اسلامی مرکز کی انگریزی مطبوعات بھی نمائش کے لیے رکھی گئیں۔ اس کا تذکرہ "نیشنل بک ٹرسٹ" کی شائع شدہ رپورٹ میں صفحہ ۱۴۸ پر کیا گیا ہے۔

۲۔ عربی پریس میں اسلامی مرکز اور اس کے کاموں کا تذکرہ مختلف انداز میں آتا رہتا ہے۔ مثلاً کویت کے عربی ماہنامہ الوعی الاسلامی (ربیع الاول ۱۴۰۸ھ) میں "الفکر الاسلامی" کے عنوان سے ایک مقالہ شائع ہوا ہے جس میں اسلامی مرکز کی مطبوعات کو اسلام کی فتح جدید قرار دیا گیا ہے۔ اصل الفاظ یہ ہیں :

اما من اعلام الفكر الاسلامي الاصيل المعاصر فنذكر ---- وحيد الدين خان ، الذي تعتبر كتبه الاسلام يتحدىٰ و الاسلام والعصر الحديث وحكمة الدين فتحاً جديداً في دنيا الدراسات الاسلامية (صفحہ ۲۵)

۳۔ ایک صاحب جو آجکل دمشق کے ایک کالج میں زیر تعلیم ہیں، اپنے خط (۴ نومبر ۱۹۸۷) میں لکھتے ہیں : ماہ اکتوبر کا الرسالہ موصول ہوا۔ ایک ہی مجلس میں پڑھ ڈالا۔ مغربی دنیا کا اسلامی اصولوں کی طرف رجوع معلوم ہوا۔ کتنا فطری ہے مذہب اسلام اور کتنے غیر فطری ہیں یہ مغرب وضع کردہ اصول۔ بلاشبہہ آپ کا یہ عصری اسلوب دین کی بڑی خدمت ہے۔ میں اس کا صفحہ صفحہ اپنے عرب ساتھیوں کو اور عرب طلبہ کو سنا رہا ہوں تو سب حیرت کرتے ہیں کہ یہ تو مغربی تہذیب کے شیدائیوں کے لیے تازیانہ ہے۔ پھر انھوں نے کہا کہ کاش یہ پرچہ عربی زبان میں بھی شائع ہوتا۔ ایک عرب طالب علم احمد عزالدین کے پاس آپ کی تمام عربی کتابیں موجود ہیں اور وہ آپ کے بڑے مداح ہیں۔ (شمس الدین ندوی)

۴۔ نئی دہلی میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی ایک مشترک میٹنگ میں ۲۹ اکتوبر ۱۹۸۷ کو صدر اسلامی مرکز کی ایک تقریر ہوئی۔ تقریر کا موضوع تھا : انسانی خرابیوں کی جڑ کیا ہے

صدر اسلامی مرکز نے بتایا کہ "اللہ اکبر" تمام بھلائیوں کا سرچشمہ ہے اور "الانسان اکبر" تمام خرابیوں کا سرچشمہ۔

نئی دہلی (گول مارکیٹ) میں تعلیم یافتہ مسلمانوں کا ایک اجتماع ۳۱ اکتوبر ۱۹۸۷ کو ہوا۔ صدر اسلامی مرکز نے اس موقع پر سیرت رسول ؐ کے موضوع پر تقریر کی۔ انھوں نے بتایا کہ انقلاب محمدی دنیا کا سب سے بڑا انقلاب تھا۔ دنیا کی ہر قسم کی ترقیاں براہ راست یا بالواسطہ طور پر اسی کا فیض ہیں۔ اس تقریر کا ٹیپ مرکز میں موجود ہے۔

صدر اسلامی مرکز کو جموں کے سیرۃ النبی کے اجتماع (۵ نومبر ۱۹۸۷) میں صدارت کے لیے بلایا گیا تھا۔ اس موقع پر انھوں نے شرکت کی اور وہاں تین تقریریں کیں۔ دو تقریروں کا موضوع سیرت نبوی ؐ تھا اور ایک تقریر جموں کی جامع مسجد میں نماز کے عنوان پر تھی۔ اس سفر کی تفصیلی روداد ان شاء اللہ الرسالہ میں شائع کر دی جائے گی۔

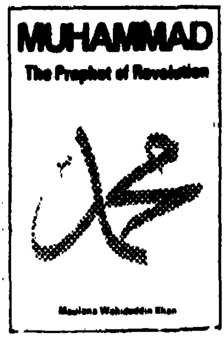
الرسالہ نومبر ۱۹۸۷ (صفحہ ۴۵) پر "من انصاری الی اللہ" کے نام سے ایک اپیل شائع کی گئی تھی۔ اس میں کہا گیا تھا کہ "ضرورت ہے کہ ہر مسلمان کم از کم ایک تعلیم یافتہ غیر مسلم بھائی کے نام الرسالہ انگریزی کو اپنی طرف سے جاری کرائے"۔ اس سلسلہ میں مولانا محمد رضوان اختر صاحب (مقیم سعودی عرب) نے خود بھی لبیک کہا اور اسی کے ساتھ انھوں نے اس صفحہ کی فوٹو کاپیاں تیار کرائیں اور ان کو بہت سے مسلمانوں میں تقسیم کیا۔ یہ ایک قابل تقلید طریقہ ہے۔ دوسرے لوگوں کو بھی اسی انداز پر اسے پھیلانا چاہیے۔

۸۔ ایک صاحب اپنے خط (۱۶ نومبر ۱۹۸۷) میں لکھتے ہیں: میں الرسالہ اردو کے علاوہ الرسالہ انگریزی ۵ عدد منگاتا ہوں اور غیر مسلم صاحبان کو بطور تحفہ دیتا ہوں۔ اب تو انگریزی الرسالہ ہمارے کچھ موٹرمین اور گارڈ اتنے شوق سے مانگتے ہیں کہ ۵ رسالے بہت کم پڑنے لگے ہیں۔ لہذا آپ انگریزی الرسالہ آئندہ دس عدد روانہ کیا کریں۔ مسٹر راڈ ریگ (موٹرمین ویسٹرن ریلوے) آج کل پیغمبر انقلاب (انگلش) پڑھ رہے ہیں اور بہت متاثر ہیں۔ ایک اور موٹرمین نے اکتوبر ۱۹۸۷ کا انگلش الرسالہ پڑھ کر بہت ہی خوشی کا اظہار کیا۔ مزید انگریزی کتابیں دو دو عدد روانہ کر دیں (محمد حنیف، بمبئی)

۹- اسلامی مرکز کے فکری حلقے خدا کے فضل سے پورے ملک میں ہیں اور ملک کے باہر بھی قائم ہیں۔ یہ لوگ اسلامی مرکز کے پروگرام کے تحت دینی اور تعمیری کوشش میں معروف ہیں مگر اب تک ان کی خبریں "خبر نامہ" میں بہت کم آسکی ہیں۔ ایسے تمام حلقوں سے گزارش ہے کہ وہ "خبر" کی نوعیت کی باتوں کو روانہ کرنے کا اہتمام کریں تاکہ ہر ماہ ان کو خبر نامہ میں شامل کرکے شائع کیا جاسکے۔

۱۰- اسلامی مرکز کا فکر خدا کے فضل سے دن بدن پھیل رہا ہے۔ الرسالہ (اردو) الرسالہ (انگریزی) اور دوسرے مرکزی ذرائع کے ساتھ اب وہ "قومی پریس" کے ذریعہ بھی ملک کے وسیع تر حلقہ میں پہونچ رہا ہے۔ ملک کے انگریزی اخبارات میں "خطوط" کے علاوہ مفصل مضامین بھی چھپ رہے ہیں۔ دو مضمون یہ ہیں:
آرٹیکل مطبوعہ دی ٹیلی گراف ۲۲ جولائی ۱۹۸۷، آرٹیکل مطبوعہ دی ٹائمس آف انڈیا ۱۵ ستمبر ۱۹۸۷۔ اس نوعیت کے اور بھی کئی مضامین اور خطوط انگریزی اخبارات میں شائع ہوئے ہیں۔

۱۱- محمود عبدالشکور شیخ صاحب (دھولیہ) لکھتے ہیں کہ فرقہ وارانہ فسادات کے مسئلہ میں میں آپ کے خیالات سے سو فیصد متفق ہوں۔ الحمد للہ آپ کے گرانقدر خیالات سے اکثریتی فرقہ کا امن پسند طبقہ متفق ہوتا جارہا ہے۔ اس کا ایک ثبوت ناسک سے شائع ہونے والے مراٹھی روزنامہ "گاؤں کری" کی ۲۴ جون ۱۹۸۷ کی اشاعت میں دیکھنے کو ملا۔ مذکورہ اخبار اپنے اداریہ میں لکھتا ہے کہ ..... "مولانا وحیدالدین خاں دہلی سے شائع ہونے والے اردو ماہنامہ "الرسالہ" کے چیف ایڈیٹر ہیں۔ بمبئی سے شائع ہونیوالے ایک روزنامہ میں خط لکھ کر انھوں نے اپنے 'مولانا پن' کا ثبوت دیا ہے۔ اس قسم کے مذہبی رہنما اگر ہر مذہب میں کثیر تعداد میں ہوگیے تو فرقہ وارانہ فسادات ختم ہونے میں بڑی مدد ملے گی۔ مولانا وحیدالدین خاں کے خیالات کا سبھی مذہب کے ماننے والوں کو احترام کرنا چاہیے"..... آگے آپ کے خط کا خلاصہ شائع کرنے کے بعد آخر میں مذکورہ اخبار کہتا ہے: "مولانا وحیدالدین خاں کے خیالات وسیع تو ہیں ہی اس کے علاوہ وہ عظیم ترین بھی ہیں۔ اگر اس ملک میں ہر مذہب کے افراد نے امن قائم کرنے کیلئے اعراض کی پالیسی پر عمل کرنے میں پیش قدمی کی تو فرقہ وارانہ فسادات کا نام و نشان بھی باقی نہیں رہے گا۔ یہ بات معلوم ہونے کے بعد کہ ایک دوسرے کا سر پھوڑ کر امن قائم نہیں ہوسکتا، برداشت کرنے کی شدید ضرورت ہر مذہب کے لوگوں کو سمجھنے کیلئے مولانا کے خیالات بہت ہی قیمتی ہیں۔"



MUHAMMAD

The Prophet of Revolution

By

Maulana Wahiduddin Khan

In making the Prophet Muhammad the greatest figure, and consequently one of the most resplendent landmarks in human history, God has bestowed his greatest favour on mankind. Whoever seeks guidance cannot fail to see him, for he stands out like a tower, a mountain on the horizon, radiating light like a beacon, beckoning all to the true path. It is inevitable that the seekers of truth will be drawn up to the magnificent pinnacle on which he stands.

ISBN 81-85063-00-1 (PB Rs 50 $ 5)
ISBN 81-85063-07-9 (HB Rs 90 $ 9)

Maktaba Al-Risala
C-29 Nizamuddin West New Delhi-110013

ایجنسی الرسالہ

الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کار نبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴۔ صاحب استطاعت افراد کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کردیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط وکتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

زر تعاون الرسالہ

زر تعاون سالانہ	۴۸ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	۲۵۰ روپیہ

بیرونی ممالک سے

ہوائی ڈاک	۲۰ ڈالر امریکی
بحری ڈاک	۱۰ ڈالر امریکی

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسؤل طابع نے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی-۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

AL-RISALA

Annual Subscription Rates:

	One year	Two year
INLAND	Rs. 48	Rs. 90
ABROAD (By air mail)	US $ 25	US $ 50
(By surface mail)	US $ 10	US $ 20

SUBSCRIPTION FORM

Please send me AL-RISALA

☐ Urdu ☐ English for ☐ 1 year ☐ 2 years

Name ....

Address ....

....

GIFT SUBSCRIPTION

Please send AL-RISALA to my friend/relative to the following address: ☐ Urdu ☐ English for ☐ 1 year ☐ 2 years I am enclosing cheque Postal Order/Bank Draft/M.O. Receipt No. ....

Name ....

Address ....

....

Please send this together with the payment to the Circulation Manager
AL-RISALA C-29 Nizamuddin West, New Delhi 110 013 (India)

[illegible]	Rs.
پیغمبر انقلاب	30/-
مذہب اور جدید چیلنج	30/-
عظمت قرآن	25/-
الاسلام	25/-
ظہور اسلام	25/-
اسلامی زندگی	20/-
احیاء اسلام	20/-
رازحیات (مجلد)	45/-
صراط مستقیم	25/-
خاتون اسلام	30/-
سوشلزم اور اسلام	25/-
اسلام اور عصر حاضر	20/-
حقیقت حج	25/-
اسلامی تعلیمات	20/-
تبلیغی تحریک	15/-
تعبیر کی غلطی	35/-
دین کی سیاسی تعبیر	10/-

[illegible]	3/-
قرآن کا مطلوب انسان	6/-
تجدید دین	4/-
اسلام دین فطرت	4/-
تعمیر ملت	4/-
تاریخ کا سبق	4/-
مذہب اور سائنس	4/-
عقلیات اسلام	4/-
فسادات کا مسئلہ	3/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	3/-
تعارف اسلام	4/-
اسلام پندرھویں صدی میں	4/-
راہیں بند نہیں	4/-
ایمانی طاقت	4/-
اتحاد ملت	[illegible]
سبق آموز واقعات	4/-
زلزلۂ قیامت	4/-
حقیقت کی تلاش	4/-
پیغمبر اسلام	[illegible]
آخری سفر	[illegible]

[illegible]	[illegible]
[illegible]	6/-
حل یہاں ہے	6/-
سچا راستہ	2/-
دینی تعلیم	4/-
حیات طیبہ	4/-
باغ جنت	4/-
نار جہنم	4/-
خاتون اسلام (مجلد)	60/-
حقیقت حج (مجلد)	65/-
God Arises	Rs. 45/-
Muhammad The Prophet of Revolution	50/-
Religion and Science	35/-
Tabligh Movement	20/-
The Way to Find God	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]

٣٢٨٨

الرسالہ

ISSN 0970-180X

زیر سرپرستی
مولانا وحیدالدین خان
صدر اسلامی مرکز

تدبیری واپسی ——————
منصوبہ بند اقدام کا پہلا مرحلہ ہے

فروری ۱۹۸۸
شمارہ ۱۳۵

جلد دوم تیار

۲۳

تذکیر القرآن

جلد اول : سورۃ فاتحہ ۔ سورۃ بنی اسرائیل
جلد دوم : سورۃ الکہف ۔ سورۃ الناس

قرآن کی بے شمار تفسیریں ہر زبان میں لکھی گئی ہیں۔ مگر تذکیر القرآن اپنی نوعیت کی پہلی تفسیر ہے ۔ تذکیر القرآن میں قرآن کے اساسی مضمون اور اس کے بنیادی مقصد کو مرکز توجہ بنایا گیا ہے ۔ جزئی تفصیلات اور غیر متعلق معلومات کو چھوڑتے ہوئے اس میں قرآن کے اصل پیغام کو کھولا گیا ہے اور عصری اسلوب میں اس کے تذکیری پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے ۔ تذکیر القرآن عوام و خواص دونوں کے لیے یکساں طور پر مفید ہے ۔ وہ طالبین قرآن کے لیے فہم قرآن کی کنجی ہے ۔

ہدیہ جلد اول ۱۰۰ روپیہ

جلد دوم ۱۰۰ روپیہ

مکتبہ الرسالہ ، نئی دہلی

Jamia Nagar

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اردو، انگریزی میں شائع ہونے والا

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

شمارہ ۱۳۵ فروری ۱۹۸۸

فہرست

ماہنامہ الرسالہ ، سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳ ، فون: 697333. 611128

قیمتی چیز

اخرج البخاری فی التاریخ الصغیر عن زید بن اسلم عن ابیہ ان عُمر بن الخطابؓ قال لاصحابہ۔ تمنّوا۔ فقال احدھم اتمنّی ان یکون ملءَ ھذا البیت دراھمَ فانفقھا فی سبیل اللہ۔ فقال تمنّوا۔ فقال اٰخر اتمنی ان یکون ملءَ ھذا البیت ذھباً فانفقھا فی سبیل اللہ۔ قال تمنّوا۔ قال اٰخر اتمنّی ان یکون ملءَ ھذا البیت جوھراً فانفقہ فی سبیل اللہ۔ فقال عمرؓ۔ تمنّوا۔ فقالوا ماتمنّینا بعد ھذا۔ قال عمرؓ: لکنّی اتمنّی ان یکون ملءَ ھذا البیت رجالاً مثل ابی عبیدۃ بن الجراح و معاذ بن جبل وحذیفۃ بن الیمان فاستعملھم فی طاعۃ اللہ (۲۳۳)

زید بن اسلم اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اپنے اصحاب سے کہا کہ تم لوگ اپنی تمنا بیان کرو۔ ان میں سے ایک شخص نے کہا کہ میری تمنا ہے کہ یہ گھر درہم سے بھرا ہوا ہوتا تو میں ان کو اللہ کے راستہ میں خرچ کرتا۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ اور تمنا کرو۔ دوسرے شخص نے کہا کہ میری تمنا ہے کہ اس گھر کے برابر سونا ہوتا تو میں اس کو اللہ کے راستہ میں خرچ کرتا۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ اور تمنا کرو۔ ایک اور شخص نے کہا کہ میری تمنا ہے کہ اس گھر کے برابر جواہرات ہوتے تو میں ان کو اللہ کے راستہ میں خرچ کرتا۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ اور تمنا کرو۔ لوگوں نے کہا کہ اس کے بعد ہماری کوئی تمنا نہیں۔ حضرت عمرؓ نے کہا: مگر میں یہ تمنا کرتا ہوں کہ یہ گھر ابو عبیدہ بن جراح اور معاذ بن جبل اور حذیفہ بن یمان جیسے آدمیوں سے بھرا ہوتا اور ان کو میں اللہ کی اطاعت میں استعمال کرتا۔

کام کا ایک آدمی اس دنیا کا سب سے زیادہ قیمتی سرمایہ ہے۔ وہ آدمی جس کی ایک رائے ہو مگر وہ اپنی رائے پر اصرار نہ کرے۔ جو اپنے خلاف تنقید کو بھی اسی طرح سنے جس طرح وہ اپنی تعریف کو سنتا ہے۔ جو اصول سے انحراف کا تحمل نہ کر سکے، جو اختلاف کے باوجود متحد ہونا جانتا ہو۔

آگ کا ٹکڑا

عن ام سلمة رضی اللہ عنہا ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: إنما انا بشر وانکم تختصمون الیَّ، ولعل بعضکم ان یکون الحن بحجتہ من بعض فاقضی لہ بنحو ما اسمع، فمن قضیت لہ بحق اخیہ فانما اقطع لہ قطعة من النار (متفق علیہ)

حضرت ام سلمہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں ایک انسان ہوں اور تم اپنے مقدمات میرے پاس لاتے ہو۔ ہوسکتا ہے کہ تم میں سے کوئی شخص دوسرے شخص کے مقابلہ میں زیادہ اچھے انداز میں اپنا دعویٰ پیش کرے اور میں اپنے سننے کے مطابق اس کے حق میں فیصلہ کردوں۔ تو میں نے جس شخص کو اس کے بھائی کا حق دیا، اس کو میں نے آگ کا ایک ٹکڑا دیا۔

یہ حدیث بتاتی ہے کہ ایک جائداد ہر حال میں اسی کی ہے جو اس کا واقعی حق دار ہے حتی کہ اگر خود پیغمبر کسی وجہ سے غیر حق دار کے لیے اس کا فیصلہ کردیں تب بھی وہ غیر حق دار کی نہیں ہوسکتی۔ پیغمبر کے فیصلہ کے باوجود وہ آخرت میں اس کے لیے آگ کا ٹکڑا ثابت ہوگی۔

موجودہ زمانہ میں ناجائز قبضہ بہت عام ہے۔ موجودہ بگڑے ہوئے نظام نے لوگوں کو موقع دیا ہے کہ وہ رشوت اور دھاندلی کے زور پر اپنی ناجائز خواہشات پوری کرسکیں۔ چنانچہ آج ہر بستی اور ہر شہر میں ایسے لوگ ملیں گے جنھوں نے غلط کارروائی کرکے کسی دوسرے شخص کی زمین یا عمارت پر قبضہ کرلیا ہے۔

ایسے لوگوں کے لیے یہ حدیث بہت زیادہ ڈرانے والی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب رسول خدا کے فیصلہ کے باوجود ایک جائداد کسی غیر حقدار کی نہیں ہوتی تو وہ ان لوگوں کی کیسے ہوجائے گی جو فرضی رجسٹری اور جھوٹے سرکاری کاغذات کی بنیاد پر دوسرے کی جائداد پر قبضہ کرکے بیٹھ گئے ہوں۔

دنیا میں آدمی غیر کی عمارت پر قابض ہوکر خوش ہوتا ہے۔ آخرت میں اس کا کیا حال ہوگا جب اس پوری عمارت کو آگ کی عمارت بناکر اس کے اندر اسے بند کردیا جائے گا۔

حديث شريف

(عن ابن عمر رضي الله عنهما قال أخذ رسول الله ﷺ بمنكبي فقال: كن فى الدنيا كأنك غريب أو عابر سبيل، وكان ابن عمر يقول: إذا أمسيت فلا تنتظر الصباح وإذا أصبحت فلا تنتظر المساءَ وخذ من صحتك لمرضك ومن حياتك لموتك)

(رواه البخاري)

مسافر کی زندگی

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے میرا کندھا پکڑ کر فرمایا: دنیا میں اس طرح رہو گویا کہ تم اجنبی ہو یا تم یہاں ایک مسافر ہو۔

اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کہا کرتے تھے کہ جب تم شام کرو تو تم صبح کا انتظار نہ کرو۔ اور جب تم صبح کرو تو تم شام کا انتظار نہ کرو۔ اور تم اپنی صحت سے اپنے مرض کے لیے لو اور تم اپنی زندگی سے اپنی موت کے لیے حاصل کرو۔ (بخاری)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس نصیحت اور صحابی کی اس تشریح میں زندگی کا راز بتا دیا گیا ہے۔ انسان جب اپنے گھر پر اور اپنے وطن میں ہو تو وہ سمجھتا ہے کہ میں اپنے مستقل مقام پر ہوں۔ یہ احساس اس کی پوری زندگی کو ایک خاص ڈھنگ پر ڈھال دیتا ہے۔ اس کے برعکس جو آدمی کسی اجنبی علاقہ میں سفر کر رہا ہو وہ سمجھتا ہے کہ میں ایک عارضی مقام پر ہوں۔ یہ احساس اس کی پوری زندگی کو بالکل دوسرا رُخ دیدیتا ہے ——— مومن کی زندگی ایک اعتبار سے اسی دوسرے انسان کی مانند ہوتی ہے۔

مومن موجودہ دنیا میں اپنے آپ کو وقتی مسافر سمجھتا ہے۔ یہ احساس اس کے اندر اس کی توجہ اور اس کی دلچسپیوں کو دنیا میں لگنے نہیں دیتا۔ وہ بظاہر دنیا میں رہتا ہے، مگر اپنی یاد اور سوچ کے اعتبار سے وہ آخرت کا باسی بنا رہتا ہے۔ یہ ذہن اس کے اندر بے پناہ صبر پیدا کر دیتا ہے۔ وہ ہر تلخی کو برداشت کر لیتا ہے، کیوں کہ ہر تلخی اس کو وقتی دکھائی دیتی ہے۔ بڑے سے بڑے نقصان کو وہ سہہ لیتا ہے، کیوں کہ وہ سمجھتا ہے کہ دنیا کا فائدہ بھی عارضی ہے اور یہاں کا نقصان بھی عارضی۔ شدید انتقامی جذبات بھی اس کے اندرونی سرد خانہ میں پہونچ کر بجھ جاتے ہیں۔ کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ انتقام لینے والا بھی بالآخر موت کی گرفت میں آنے والا ہے اور انتقام نہ لینے والا بھی۔

یہ چیز اس کو حد درجہ وقت کا احساس کرنے والا (Time-conscious) بنا دیتی ہے۔ اس کو یقین نہیں ہوتا کہ وہ اگلی صبح تک جیئے گا اس لیے وہ اپنی موجودہ شام کو آخری حد تک استعمال کر لینا چاہتا ہے۔ وہ اپنے ایک لمحہ کو بھی ضائع کرنا پسند نہیں کرتا۔

منافقت

ایک لمبی حدیث ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ موت کے بعد انسان کے اوپر کیا احوال گزریں گے۔ اس سلسلہ میں حدیث کا ایک جزء یہ ہے :

وان کان کافراً اومنافقاً یقول لہ ماتقول فی ھذا الرجل۔ فیقول لا ادری۔ سمعتُ الناس یقولون شیئاً فیقول لادریتُ ولا تلیتُ ولا اھتدیتُ۔ ثم یُفتح لہ باباً الی الجنّۃ فیقول لہ ھذا منزلک لوامنت بربّک فاما اذاکفرت بہ فان اللّٰہ عزوجل ابدلک بہ ھذا فیُفتح لہ باباً الی النار۔

(تفسیر ابن کثیر، الجزء الثانی، صفحہ ۵۳۳)

اگر مرنے والا منکر یا منافق ہے تو فرشتہ اس سے پوچھے گا کہ تم اس آدمی (پیغمبر) کے بارہ میں کیا کہتے ہو۔ وہ جواب دے گا کہ میں نہیں جانتا۔ میں نے لوگوں کو سنا کہ وہ کچھ کہہ رہے تھے۔ پھر وہ کہے گا کہ میں نے اس کو جاننے کی کوشش نہیں کی۔ نہ میں نے اس کی پیروی کی اور نہ میں نے اس سے رہنمائی حاصل کی۔ پھر اس کے لیے جنت کی طرف ایک دروازہ کھولا جائے گا۔ پھر فرشتہ اس سے کہے گا کہ یہ تمہاری جگہ تھی اگر تم اپنے رب پر ایمان لاتے۔ مگر جب تم نے اس کا انکار کیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کے بدلے تمہیں یہ دیدیا۔ پھر اس کے لیے جہنم کی طرف ایک دروازہ کھول دیا جائے گا۔

اس حدیث میں مرنے کے بعد جس انجام کا ذکر ہے، اس میں کافر کے ساتھ منافق کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ منافق کا لفظ پہلی بار مدینہ میں استعمال کیا گیا۔ وہاں کون لوگ تھے جن کو منافق کہا گیا۔ یہ وہ لوگ تھے جو کلمہ کا اقرار کرتے تھے۔ نماز اور دوسری عبادات پر بظاہر عمل کرتے تھے۔ البتہ ان کے دل میں ایمان پوری طرح نہیں اترا تھا۔ وہ ان مواقع پر پیچھے رہ جاتے تھے جہاں قربانی کی قیمت پر اپنے ایمان کا ثبوت دینا ہو۔ وہ مصلحت کی سطح پر مسلمان بنے تھے نہ کہ حقیقۃً قلبی شہادت کی سطح پر۔

دو نمونے

اس دنیا میں انسان کا اصل امتحان یہ ہے کہ وہ کسی صورت حال میں کس قسم کا جواب
یش کرتا ہے ۔ اس اعتبار سے انسانوں کی دو قسمیں ہو جاتی ہیں ۔ ایک صحیح جواب پیش کرنے
الے ، اور دوسرے غلط جواب پیش کرنے والے ۔ صحیح جواب کیا ہے اور غلط جواب کیا۔
س سلسلہ میں یہاں دور اول کی دو مثالیں نقل کی جاتی ہیں ۔

قرآن میں مختلف طریقہ سے اللہ کی راہ میں خرچ کرنے پر ابھارا گیا ہے ۔ ارشاد ہوا
ہے : من ذا الذی یقرض اللہ قرضاً حسناً (کون ہے جو اللہ کو قرض حسن دے) اس
سلسلہ میں ایک روایت حسب ذیل الفاظ میں آئی ہے :

نال سعید بن جبیر عن ابن عباس. لما نزل
قوله تعالیٰ (من ذا الذی یقرض اللہ قرضا
حسناً فیضاعفه له اضعافاً کثیرة) قالت
الیهود یا محمد ، افتقر ربك فسأل عبادہ
القرض ۔
(تفسیر ابن کثیر ، الجزء الاول ، صفحہ ۴۳۳)

حضرت عبد اللہ بن عباس کہتے ہیں کہ جب قرآن
میں یہ آیت اتری کہ کون ہے جو اللہ کو قرض
حسن دے تو اللہ اس کو کئی گنا لوٹائے ، تو
مدینہ کے یہود نے کہا کہ اے محمد ، تمہارا رب
فقیر ہو گیا ہے اس لیے اپنے بندوں سے قرض
مانگ رہا ہے ۔

یہ ایک قسم کے کردار کی مثال ہے ۔ یعنی وہ مثال جب کہ آدمی بات کو صحیح رخ سے نہ
لے ۔ وہ اس میں شوشہ نکال کر اس کا مذاق اڑانے لگے ۔ وہ اپنی ذمہ داریوں کو ادا نہ کرے
اس کے برعکس وہ داعی کی بات میں عیب نکال کر یہ ظاہر کرے کہ اس کی بات اس قابل
ہی نہیں کہ اس پر عمل کیا جائے ۔

اب دوسرے قسم کے کردار کی مثال لیجئے ۔ مذکورہ قرآنی آیت میں ایک شخص کو صرف
استہزاء کا مواد ملا تھا ۔ مگر یہی آیت جب دوسرے آدمی کے سامنے آئی تو اس پر بالکل مختلف
رد عمل ہوا ۔ روایات میں آتا ہے ۔

من عبد اللہ ابن مسعود قال لما نزلت

حضرت عبد اللہ بن مسعود کہتے ہیں کہ جب قرآن کی

ـذه الآية (من ذا الذي يقرض الله
قرضا حسنا فيضاعفه له) قال ابوالدحداح
الانصاري يارسول الله وان الله ليريد
منا القرض. قال نعم ياابا الدحداح.
قال ارني يدك يارسول الله. قال فناوله
يده. قال فاني قد اقرضت ربي حائطي.
وله حائط فيه ست مائة نخلة و
ام الدحداح فيه وعيالها. قال فجاء
ابوالدحداح فناداها ياام الدحداح.
قالت لبيك. قال اخرجي فقد اقرضته
ربي عزوجل. فقالت له ربح بيعك
ياابا الدحداح ونقلت منه متاعها و
صبيانها.

(تفسیر ابن کثیر، الجزء الرابع، صفحہ ۳۰۷)

یہ آیت اتری، کون ہے جو اللہ کو قرض حسن دے تو وہ اس کو کئی گنا بڑھا دے۔ اس آیت کو سن کر حضرت ابوالدحداح نے کہا کہ اے خدا کے رسولؐ، کیا اللہ ہم سے قرض چاہتا ہے۔ آپؐ نے فرمایا ہاں اے ابوالدحداح۔ انھوں نے کہا کہ اے خدا کے رسولؐ، مجھے اپنا ہاتھ دکھائیے۔ راوی کہتے ہیں کہ آپ نے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ انھوں نے کہا کہ پھر میں نے اپنا باغ اپنے رب کو قرض میں دے دیا۔ اور ان کا ایک باغ تھا جس میں چھ سو کھجور کے درخت تھے۔ اس وقت ان کی بیوی ام الدحداح اپنے بچوں کے ساتھ اس میں تھیں۔ راوی کہتے ہیں کہ ابوالدحداح آئے اور آواز دی کہ اے ام الدحداح۔ انھوں نے کہا کہ ہاں۔ ابوالدحداح نے کہا کہ اس باغ سے نکلو۔ کیوں کہ وہ میں نے اپنے رب کو قرض میں دے دیا۔ ام الدحداح نے کہا کہ اے ابوالدحداح، آپ کا سودا کامیاب رہا۔ اور اپنا سامان اور بچے لے کر وہاں سے چلی آئیں۔

قرآن کی جو آیت اوپر نقل کی گئی ہے، وہ انھیں الفاظ کے ساتھ یہود کے سامنے آئی۔ اور ٹھیک انھیں الفاظ کے ساتھ ابوالدرداء انصاری کے سامنے آئی۔ مگر دونوں کا ردعمل ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی کلام کو صحیح طور پر سمجھنے اور اس کا صحیح جواب دینے کے لیے سنجیدگی ضروری ہے۔ اگر آدمی سنجیدہ نہ ہو تو وہ نہ خدا کے کلام کے ساتھ انصاف کرسکتا ہے اور نہ انسان کے کلام کے ساتھ۔

ایک آیت

وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَیْنِھِمَا فَابْعَثُوْا حَکَمًا مِّنْ اَھْلِہٖ وَحَکَمًا مِّنْ اَھْلِھَا اِنْ یُّرِیْدَآ اِصْلَاحًا یُّوَفِّقِ اللّٰہُ بَیْنَھُمَا اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلِیْمًا خَبِیْرًا

النساء ۳۵

اور اگر تم کو دونوں کے درمیان بگاڑ کا اندیشہ ہو تو ایک منصف مرد کے اہل میں سے اور ایک منصف عورت کے اہل میں سے کھڑا کرو۔ اگر دونوں اصلاح چاہیں گے تو اللہ دونوں کے درمیان موافقت کر دے گا۔ بے شک اللہ سب کچھ جاننے والا باخبر ہے۔

اس آیت کی تشریح میں مولانا محمود حسن صاحبؒ لکھتے ہیں " یعنی اے مسلمانو، اگر تم کو اندیشہ ہو کہ خاوند اور عورت میں مخالفت اور ضد ہے۔ وہ اپنے باہمی نزاع کو خود نہ سلجھا سکیں گے تو تم کو چاہیے کہ ایک منصف مرد کے اقارب میں سے اور ایک منصف عورت کے اقارب میں سے مقرر کر کے بغرض فیصلہ زوجین کے پاس بھیجو۔ یہ دونوں منصف احوال کی تحقیق کریں گے۔ اور جس کا جتنا قصور دیکھیں گے اس کو سمجھا کر باہم موافقت کرا دیں گے۔ اگر دونوں منصف اصلاح بین الزوجین کا قصد کریں گے تو اللہ تعالیٰ ان کے حسن نیت اور حسن سعی سے زوجین میں موافقت کرا دے گا "

جب بھی دو مسلمانوں میں نزاع کی کوئی صورت پیدا ہو تو وہ قرآن کے اس حکم کے تحت آجائے گا۔ اور عام مسلمانوں پر لازم ہو جائے گا کہ اس طریقہ کو اختیار کر کے مسلمانوں کے باہمی اختلاف کو ختم کریں۔ تاہم اس قرآنی حکم کی برکت اسی وقت ظاہر ہو سکتی ہے جب کہ فریقین اپنے ذاتی اصرار کو چھوڑ کر خدائی فیصلہ کے آگے جھکنے پر راضی ہوں۔ حضرت علیؓ کے سامنے ایک مرد اور ایک عورت کا جھگڑا لایا گیا۔ آپ نے دونوں طرف سے ایک ایک حکم مقرر فرمایا۔ عورت نے کہا کہ میں کتاب اللہ کے فیصلہ پر راضی ہوں، خواہ وہ میرے موافق ہو یا میرے خلاف۔ مرد نے کہا کہ اگر تفریق کا فیصلہ ہوا تو وہ مجھے قبول نہیں۔ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ تم نے جھوٹ کہا۔ خدا کی قسم تجھ کو اللہ کی کتاب کے فیصلہ پر راضی ہونا پڑے گا، خواہ وہ تمہارے موافق ہو یا تمہارے خلاف۔

(تفسیر ابن کثیر، الجزء الاول، صفحہ ۴۹۳)

آدمی کی جانچ

موجودہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ یہاں ظاہری چیزوں کو سامنے رکھ کر اصل حقیقتوں کو پردہ کے پیچھے چھپا دیا گیا ہے۔ اب آدمی کی جانچ یہ ہے کہ وہ ظاہر سے گزر کر باطن تک پہونچ جائے۔ وہ شہود سے بلند ہو کر غیب کو دیکھ لے۔ وہ چھپی ہوئی حقیقتوں کو اس طرح جان لے جیسے کہ وہ اس کی آنکھوں کے سامنے کھلی ہوئی حالت میں موجود ہیں۔ ہمارے سامنے ایک پردہ پڑا ہوا ہے۔ اور آدمی کا امتحان اس میں ہے کہ کون پردہ کو پھاڑ کر پردہ کے دوسری طرف دیکھ لیتا ہے اور کون پردہ کے اُس پار دیکھنے میں کامیاب نہیں ہوتا۔

آدمی کی کامیابی یہ ہے کہ وہ ظاہر میں اُلجھے بغیر باطن تک پہونچ جائے ——— ایک چیز جو بظاہر خرید کر مل رہی ہے اس کو بطور عطیہ ملنے والی چیز سمجھنا، ایک چیز جو بازار سے مل رہی ہے اس کو کائناتی خزانہ سے ملنے والی چیز سمجھنا، ایک چیز جو بظاہر انسان سے مل رہی ہے اُس کو خدا سے ملنے والی چیز سمجھنا، اسی کا نام ایمان بالغیب ہے۔ اور وہی شخص صاحب معرفت ہے جس کو ایمان بالغیب کا یہ درجہ حاصل ہو جائے۔

جینے کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ہے اندھا بن کر جینا، ایک ہے آنکھ والا بن کر جینا۔ موجودہ دنیا میں یہی امتحان ہے کہ کون شخص کس طرح جیتا ہے۔ جو شخص آج کی امتحان گاہ میں اندھا بن کر جئے گا وہ آئندہ آنے والی مستقل دنیا میں ہمیشہ اندھا ہو کر بھٹکتا رہے گا۔ جو شخص آج کی امتحان گاہ میں بینا بن کر جئے گا وہ آئندہ کی دنیا میں آنکھوں والا ہو گا۔ دنیا کی تمام نعمتیں مزید اضافہ کے ساتھ اس کو ابدی طور پر دے دی جائیں گی۔ (ومن کان فی ھذہ اعمیٰ فھو فی الآخرۃ اعمیٰ واضل سبیلاً)

آپ کھانے کے دسترخوان پر بیٹھے ہیں۔ آپ کے سامنے میز پر دودھ اور گوشت اور پھل رکھا ہوا ہے۔ اب ایک شخص وہ ہے جو اس کو بس "بازار سے خریدی ہوئی چیز" سمجھ کر کھانا شروع کر دے۔ غفلت اور بے فکری کے ساتھ کھا کر ڈکار لے اور پھر دوبارہ اپنے غفلت کے مشغلوں میں لگ جائے۔

یہ اندھے شخص کا کھانا ہے ۔ کیوں کہ دودھ اور گوشت اور پھل " بازار سے خریدی ہوئی چیز " نہیں، وہ قدرت کے عظیم شاہکار ہیں ۔ ساری کائنات کے ناقابل بیان عمل کے بعد یہ ممکن ہوا ہے کہ زمین پر دودھ اور پھل اور گوشت موجود ہو اور انسان اس کو کھا کر بھوک مٹائے اور قوت اور زندگی حاصل کرے ۔

دوسرا شخص وہ ہے کہ جب اس کے سامنے دودھ اور گوشت اور پھل آیا تو اس کو دیکھتے ہی اس کے ذہن نے سوچنا شروع کیا ۔ اچانک اس پر منکشف ہوا کہ یہ قدرت کے کارخانہ کی مصنوعات ہیں ۔ خدا کی زندہ فیکٹری (گائے بھینس) گھاس چرتی ہے اور اس کو دودھ اور گوشت میں تبدیل کرتی ہے ۔ درخت زمین سے اور فضا سے مٹی اور پانی اور گیسیں لیتا ہے اور اس کو پھول اور پھل میں تبدیل کرتا ہے ۔ پھر اور آگے بڑھ کر جب وہ سوچتا ہے کہ ان فیکٹریوں کا قیام کیسے ممکن ہوا تو اس کے سامنے پوری کائنات کا نظام آجاتا ہے ۔ اس کو دکھائی دیتا ہے کہ ایک لامحدود کائنات کھرب ہا کھرب سال تک گردش کرتی رہی تب موجودہ دنیا کا نظام قائم ہوا ۔ موجودہ دنیا اپنی تمام وسعتوں کو لیے ہوئے کامل ہم آہنگی کے ساتھ مساعدت کرتی ہے اس کے بعد یہ ممکن ہوتا ہے کہ کوئی درخت پھل دے اور کوئی جانور دودھ اور گوشت تیار کرے ۔

یہ سب سوچ کر اس کے اندر ایک عجیب تھرتھراہٹ پیدا ہوتی ہے ۔ اس کے بعد جب وہ دودھ یا گوشت یا پھل اپنے منہ میں ڈالتا ہے تو اس کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ خدا کی ایک بے پایاں نعمت کو اپنے منہ میں ڈال رہا ہے ۔

ظاہر ہے کہ ان دونوں آدمیوں کا کھانا ایک نہیں، اس لیے دونوں آدمیوں کا انجام بھی ایک نہیں ۔ جس طرح پتھر کھانے والے کا انجام اور پھل کھانے والے کا انجام ایک نہیں ہو سکتا ۔ اسی طرح ان دو آدمیوں کا انجام بھی ایک نہیں ہو سکتا جن میں سے ایک نے اندھے پن کے ساتھ کھایا ہو اور دوسرے نے آنکھ والا بن کر کھایا ہو (قل هل تستوی الاعمیٰ والبصیر وهل تستوی الظلمات والنور)

اندھوں کے لیے دوزخ ہے اور آنکھ والوں کے لیے جنت ۔ آدمی نے جو چیز دنیا میں پائی ہے وہی وہ آخرت میں بھی پائے گا، نہ اس سے زیادہ اور نہ اس سے کم ۔

عُجب

قال علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ: الاعجاب آفۃ الالباب۔

حضرت علی رضی اللہ نے فرمایا کہ ناز اور خود پسندی عقل کی آفت ہے۔

قال ابو الدرداء رضی اللہ عنہ: علامۃ الجھل ثلاث۔ العجب وکثرۃ المنطق فیما لا یعنیہ وان ینھی عن شئ ویاتیہ۔

حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تین چیزیں جہالت کی پہچان ہیں۔ فخر و ناز اور بے فائدہ بولنا اور یہ کہ آدمی خود وہی کرے جس سے وہ دوسروں کو منع کرتا ہو۔

قال مسروق: کفی بالمرء علماً ان یخشی اللہ وکفی بالمرء جھلاً ان یعجب بعلمہ

حضرت مسروق تابعی نے کہا: آدمی کے عالم ہونے کے لیے یہ بات کافی ہے کہ وہ اللہ سے ڈرتا ہو۔ اور آدمی کے جاہل ہونے کے لیے یہ بات کافی ہے کہ وہ اپنے علم پر ناز کرے۔

فخر اور ناز اور غرور اور خود پسندی یہ سب ایک ہی ذہنی کیفیت کے مختلف نام ہیں۔ عربی میں اسی کو عُجب کہا جاتا ہے۔ عجب بلاشبہ سب سے بری اخلاقی بیماری ہے۔ وہ دین اور اخلاق اور انسانیت ہر چیز کی قاتل ہے۔

عُجب کا مریض اپنے آپ کو وہ سمجھتا ہے جو وہ حقیقۃً نہیں ہوتا۔ محدود انسان کا علم بھی ہمیشہ محدود ہوتا ہے۔ بالفرض اگر کوئی شخص تمام انسانی علوم کو جان لے تب بھی وسیع تر کائناتی علم کے مقابلہ میں اس کا علم جزئی ہی رہے گا۔ ایسی حالت میں اپنے علم پر ناز کرنا ایک سطحی فعل ہے جو بذات خود علم کی نفی ہے۔

اس سے بھی زیادہ سنگین بات یہ ہے کہ کسی انسان کا عُجب، اپنے آخری معنی کے اعتبار سے، دانائے کُل کے مقابلہ میں عُجب ہے، وہ اللہ کے آگے سرکشی کے ہم معنی ہے۔ اور اللہ کے آگے سرکشی سے زیادہ بڑا جرم بلاشبہ اس دنیا میں اور کوئی نہیں۔

نفع بخشی

آج مسلمان ساری دنیا میں بے قیمت ہو رہے ہیں۔ مسلمانوں کے بولنے والوں کو سنیے اور ان کے لکھنے والوں کو پڑھیے تو متفقہ طور پر سب کے سب اس کا ایک ہی سبب بتاتے ہوئے نظر آئیں گے۔ اور وہ غیر مسلم اقوام کا تعصب اور ان کا ظلم اور ان کی سازشیں ہیں۔ مگر میں اس قسم کی توجیہہ کو بالکل لغو سمجھتا ہوں۔ اس دنیا کا انتظام براہ راست طور پر اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ اس نے دنیا کے انتظام کو ہندوؤں یا یہودیوں یا عیسائیوں کے حوالے نہیں کر دیا ہے۔ ایسی حالت میں مسلمانوں کے المیہ کا ذمہ دار غیر مسلم اقوام کو قرار دینا ایک ایسی بات ہے جو زمین و آسمان میں کہیں جگہ پانے والی نہیں۔

مسلمانوں کی موجودہ حالت خدا کے قانون کے تحت ہے نہ کہ انسانی سازشوں کے تحت۔ قرآن کی سورہ نمبر ۱۳ میں دو مثالیں دی گئی ہیں۔ ایک، بارش کے بعد ندیوں میں پانی بہنے کی، دوسری، معدنی چیزوں کو صاف کرنے کے لیے انھیں آگ پر تپانے کی۔ دونوں واقعات میں ایسا ہوتا ہے کہ ابتداءً ان کے اوپر جھاگ آجاتا ہے جس کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس کے بعد دیکھنے والے دیکھتے ہیں کہ بے فائدہ جھاگ پھینک دیا گیا یا ہوا میں اڑ گیا اور ان کے نیچے جو نفع بخش چیز تھی (پانی یا مثلاً چاندی) وہ باقی رہ گیا:

فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ ۔ (الرعد ۱۷)

پس جو جھاگ ہے وہ سوکھ کر جاتا رہتا ہے اور جو چیز انسانوں کو نفع پہونچانے والی ہے وہ زمین میں ٹھہر جاتی ہے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ کا ایک ابدی قانون بیان کیا گیا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اس دنیا میں قوموں کے ساتھ معاملہ اس بنیاد پر ہوتا ہے کہ وہ نافع ہیں یا غیر نافع۔ غیر نافع اس دنیا میں "جُفَاء" بن کر رہ جاتا ہے اور نافع کو اس دنیا میں "مُكث" حاصل ہوتا ہے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمان اللہ تعالیٰ کے اسی قانون کی زد میں ہیں۔ آج کی دنیا میں انھوں نے اپنی نفع بخشی کھو دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جفاء (جھاگ) بن کر رہ گئے ہیں، انھیں ساری دنیا میں کہیں بھی مکث (قیام و استحکام) کا درجہ حاصل نہیں۔

رکاوٹیں زینہ ہیں

۲۶ مئی ۱۹۸۷ کو دہلی کے اخبارات نے اپنے پہلے صفحہ پر جو خبریں نمایاں طور پر دیں ان میں سے ایک خبر وہ تھی جو دہلی سینیر سکنڈری اسکول سرٹیفکیٹ امتحان سے متعلق تھی :

Delhi Senior Secondary School Certificate examination, Class XII, 1987

اس امتحان میں جن طالب علموں نے ٹاپ کیا ان میں اکثریت لڑکیوں کی ہے۔ اخبارات کے نمائندوں نے ان ٹاپ کرنے والے طلبہ اور طالبات سے ملاقات کرکے ان کا انٹرویو لیا اور اس کو باتصویر خبر کے طور پر شائع کیا۔

ان ممتاز طالب علموں کے حالات میں ایک نہایت سبق کی بات تھی۔ اکثر ٹاپ کرنے والوں میں مشترک طور پر یہ بات پائی گئی کہ وہ خوش حال گھرانوں سے تعلق رکھنے والے نہ تھے۔ درحقیقت ان میں سے کچھ طالب علموں کو سخت رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا۔ کیوں کہ غریب گھرانوں کا فرد ہونے کی وجہ سے ان کے پاس لکھنے پڑھنے کے لیے مناسب جگہ نہ تھی۔ کتابیں بہت کم تھیں۔ مزید یہ کہ شوروغل ان کے ذہن کو منتشر کرتا رہتا تھا۔ تاہم وہ ان عوامل کو پار کر گیے اور اپنے دل چسپی کے مضمون میں امتیازی نمبر حاصل کیا :

A common thread running the family background of most toppers is that they do not belong to affluent families. In fact, quite a few faced stiff resistance to their academic pursuits due to lack of space and books and noise disturbances. However, they overrode these factors and achieved distinction in their subjects of interest.

The Hindustan Times, New Delhi, May 26, 1987

اسباب کی فراوانی آدمی کے اندر بے فکری پیدا کرتی ہے، اور اسباب کی کمی سے آدمی کے اندر فکرمندی کا جذبہ ابھرتا ہے۔ اسباب کی فراوانی آدمی کو بے عملی کی طرف لے جاتی ہے اور اسباب کی کمی عمل کی طرف۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو وہ شخص زیادہ خوش قسمت نظر آئے گا جو اسباب کی کمی کے مسئلہ سے دوچار ہو۔

منفی بنیاد

ہندوؤں کا دانشور طبقہ شدت کے ساتھ یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ بحیثیت قوم ایک ناموافق صورت حال سے دوچار ہے۔ وہ یہ کہ اس کے پاس قومی اتحاد کی کوئی مثبت بنیاد نہیں۔ ایک ہندو، ہندو برادری سے تعلق رکھنے سے پہلے ایک مخصوص ذات سے تعلق رکھتا ہے :

A Hindu, generally speaking, belongs to a caste before he belongs to the Hindu fraternity.

ایک مشہور ہندو دانشور مسٹر گری لال جین نے اپنے مفصل مضمون میں لکھا ہے کہ ہندو قومیت کی دو قسمیں ہیں، منفی اور مثبت۔ منفی ہندو قومیت درجات کے فرق کے ساتھ محض مسلم مخالف جذبہ پر قائم ہے۔ مثبت ہندو قومیت کا تعلق ایک ہندو تشخص کے لیے اپیل کرنے پر ہے۔ مگر چوں کہ یہ تشخص ہندوؤں کے درمیان داخلی یکسانیت نہ ہونے کی وجہ سے غیر واقعی ہے اس لیے مثبت ہندو قومیت وجود میں آنے کے قابل نہیں۔ اس طرح جو چیز ممکن ہے وہ مطلوب نہیں اور جو چیز مطلوب ہے وہ ممکن نہیں :

There are two types of Hindu communalism : negative and positive. Negative Hindu communalism consists in being merely anti-Muslim in varying degrees: positive Hindu communalism consists in appealing in the name of a Hindu identity. But since this identity is very shadowy due to Hindu's lack of internal homogeneity, positive Hindu communalism is not viable. Thus what is possible is not desirable and what is desirable is not possible.

The Times of India, New Delhi, July 4, 1987

اکثریتی فرقہ کی فرقہ پرستی کا حل مسلمانوں نے اب تک ناکام طور پر صرف جوابی کارروائیوں میں تلاش کیا ہے۔ مگر مذکورہ بالا تجزیہ بتاتا ہے کہ اس کا بہترین حل اس کے برعکس طریق عمل میں ہے۔ وہ یہ کہ ہر قسم کی جوابی کارروائی سے مکمل پرہیز کیا جائے، حتی کہ جائز جوابی کارروائی سے بھی۔ اس طریق عمل کے لیے بلاشبہ صبر درکار ہے۔ لیکن اگر مسلمان اس صبر کا ثبوت دے سکیں تو وہ دیکھیں گے کہ اکثریتی فرقہ کا اتحاد بے زمین ہو کر ختم ہو گیا ہے، اور اسی کے ساتھ اس کی اکثریت کا افسانہ بھی۔

تاریخ یا عقیدہ

علامہ اقبال نے کہا ہے کہ جس طرح ایک شخص کی زندگی میں حافظہ کی زبردست اہمیت ہوتی ہے، حافظہ اگر گم ہوجائے یا بالکل ختم ہوجائے تو اس کی زندگی اس کے لیے بے معنی ہوجائے گی۔ اسی طرح ایک قوم یا ایک ملّت کی زندگی میں تاریخ کی زبردست اہمیت ہے۔ کیوں کہ اگر اس کی تاریخ گم ہوجائے یا گُم نامی کی موٹی تہوں کے نیچے دفن ہوجائے تو اس قوم کی زندگی بھی بے معنی اور لغو ہو کر رہ جاتی ہے :

Just as in the life of an individual, memory has great significance, in that if it fades or is lost altogether, then his life becomes meaningless for him. In similar way in the life of a community or a nation, history assumes great importance, because if its history is lost or is buried under thick layers of obscurity, then its life too becomes meaningless and absurd.

یہ نظریہ سے زیادہ شاعری ہے۔ کیوں کہ قومیں عقیدہ پر زندہ ہوتی ہیں نہ کہ تاریخ پر۔ مسلمانوں کا پہلا گروہ (صحابہ و تابعین) بلاشبہ زندہ ترین گروہ تھا۔ جس نے مسلمہ طور پر عظیم الشان کارنامے انجام دیے۔ مگر ان کی کوئی تاریخ نہیں تھی۔ ان لوگوں نے خود اپنے عمل سے یقیناً ایک عظیم ترین تاریخ بنائی۔ مگر خود وہ کسی تاریخ کے وارث نہ تھے۔ اس کے برعکس انھوں نے اپنی تاریخ سے کٹ کر از سر نو ایک بالکل جدید زندگی شروع کی تھی۔

دوسری مثال موجودہ مسلمانوں کی ہے۔ موجودہ زمانہ کے تمام مصلحین (بشمول علامہ اقبال) نے یہ کیا کہ مسلمانوں کو ان کی تاریخ یاد دلائی۔ تاریخ کے موضوع پر، براہ راست یا بالواسطہ انداز میں بے شمار کتابیں لکھی گئیں۔ ہمارے تمام شاعر اور خطیب اور انشا پرداز تاریخ کی زبان میں بیداری کا صور پھونکتے رہے۔ مگر قوم کے اندر ایک فی صد بھی کوئی حقیقی بیداری پیدا نہیں ہوئی۔ مسلمان سو سال پہلے جتنے پست حال تھے، آج بھی اتنا ہی یا اس سے زیادہ پست حال ہیں ــــــــ حقیقت یہ ہے کہ کسی قوم کے افراد اپنے اندرونی انقلاب سے ابھرتے ہیں نہ کہ واقعاتِ گزشتہ کی یاددہانی سے۔

صحیح طریقہ

ٹائمس آف انڈیا (۲۲ اگست ۱۹۸۷) میں مسٹر کے سبرا نیم کا ایک مضمون شائع ہوا ہے اس کا عنوان ہے : ایک حقیقت جس کو مسلمان نظر انداز کرتے ہیں (A Reality Muslims Ignore)

اس مضمون میں ہندستانی مسلمانوں کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ اس ذیل میں جو باتیں کہی گئی ہیں ان میں سے ایک بات وہ ہے جو مسلمانوں کی "تہذیبی تشخص" کی تحریکوں کے بارہ میں ہے۔ مضمون نگار نے لکھا ہے کہ ایک فرقہ جو ایک وسیع تر مجموعہ، جیسے ایک قوم کا جزء ہو، وہ اپنے تشخص کو صرف دو طریقوں سے برقرار رکھ سکتا ہے۔ وہ یا تو وسیع تر مجموعہ کے علی العموم کلچر میں اپنا کوئی بہت خاص حصہ ادا کرے، یا وہ بقیہ لوگوں سے اپنے آپ کو منقطع کر لینے پر اصرار کرے۔ اول الذکر سے یک جہتی پیدا ہوتی ہے، جب کہ ثانی الذکر تصادم کی طرف لے جاتا ہے :

> A community, as a constituent of a larger entity like a nation, can sustain its identity in two ways. It can either make its own unique contribution to the overall culture of the larger entity or it can insist on cutting itself off from the rest. While the former leads to integration, the latter leads to conflict.
>
> *The Times of India*, New Delhi, August 22, 1987

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ میں "اَلْاَمِیْن" کہا جاتا تھا۔ تعمیر کعبہ کے مشہور واقعہ میں صبح کو جب لوگوں نے آپ کو کعبہ میں پایا تو وہ کہہ پڑے : ھٰذَا الْاَمِیْنُ رَضِیْنَا (یہ امین ہیں، ہم ان پر راضی ہیں) آپ کا امانت دار ہونا آپ کا ایسا امتیاز بن گیا کہ مکہ میں آپ اپنی اسی صفت سے پہچانے جانے لگے۔ یہ تشخص حاصل کرنے کا صحت مندانہ طریقہ ہے۔ جو لوگ کسی سماج میں اخلاقی یا اصلاحی یا تعمیری اعتبار سے ممتاز ہو جائیں ان کو دوسروں کے درمیان ایسا تشخص حاصل ہوتا ہے جو حقیقی تشخص ہوتا ہے۔

اس کے برعکس جو لوگ اپنا تشخص اس طرح حاصل کرنا چاہیں کہ وہ ہر معاملہ میں دوسروں سے الگ ہونے کی کوشش کریں وہ لوگوں کے درمیان ایک قسم کے "اچھوت" بن کر رہ جاتے ہیں۔ ان کا تشخص موت کا تشخص ہوتا ہے نہ کہ زندگی کا تشخص۔

Islam in France

By Hanspeter Oschwald

PARIS :
Islam has made huge strides in France, with mosques spreading across the landscape and increasingly self-assured Muslims demanding recognition that this is now a partly Muslim country. Interior Minister Charles Pasqua has instructed his staff to prepare him a report on this strange new "France of the Thousand Mosques" detailing the influence of Islamic fundamentalists. The newspaper and broadcasting have also discovered the "Islamic French" thanks to a major new book by a specialist in Islamic studies and political science professor, Gilles Kepel.

The book, Islam's Suburbs surveys a Muslim community of about 3 million that has often been the target of racism. The numbers have not grown for 15 years, but Muslim consciousness has sharply altered. Kepel, 32, says it is still unclear whether French Muslims will one day be integrated into mainstream French society or simply insert themselves as a foreign body between its folds. But nobody ought to imagine French Muslims will just disappear. Many commentators on the book claim assimilation is inevitable. They say French society and culture is so powerful that even the most radical Muslims will little by little be absorbed. The sceptics prefer the insertion scenario, predicting that Muslims will form their own lobby with spokesmen and institutions that will eventually extract the same sort of recognition from the state enjoyed by Catholics, Protestants and Jews.

That has a catch. As a tolerant Western society, France will readily allot a niche to the purely religious aspects of Islam. But a conflict is in the making over Islam's vision of society and its political implications. The majority French favour a secular state and reject all religious influence on state affairs.

The huge majority of French Muslims are from North Africa and Muslim regions of Black Africa, either migrant workers or holders of French passports. Some are from Turkey. Only a handful are converts of purely French descent.

The bulk of the faithful who bow towards Mecca at the Grand Mosque de Paris in the Rue Jean-Pierre Timbaud are underprivileged outsiders clad in cheap clothes — mostly manual workers, many unable to read or write some have never attended any school. Well-off Muslims worship more discreetly or do not turn up for prayers at all, but they provide the cash that makes the flowering of Islam possible. A look at the bell-pushes in the plush West End of Paris shows plenty of residents of Arab extraction. Backing up their contributions are donations from Gulf Arab foundations or from the Islamic Republic of Iran. The flow of cash has ensured that most Muslims have a place of prayer near at hand.

In just 15 years the number of mosques and places of prayer has grown from just a dozen or so in the whole of France to 1,000. There are a total of 635 Islamic congregations or organisations incorporated under French law. The teachers of this new breed of Islam run the gamut from anti-Western militants to advocates of tolerance, but few preach a distinctively French form of Islam. Kepel sets out the choices in his book but does not predict which will win the day.

He says the anti-Western advocates of isloation from mainstream France are currently making the loudest pitch. They find a ready ear among mingrants ill at ease among the French, unable to speak the French language properly and chary of becoming integrated. The petty racism of day-to-day life in the midst of Christendom drives many such Muslims to take comfort in their religion.

Kepel's book contains many interviews showing that elderly people rediscover their sense of dignity in Islam and try hard to convey that sense to their children. Younger Muslims mostly identify with Islam but do not regard it as a contradiction to their Western lifestyle. Girls in Muslim families absorb French mores and behaviour more readily than any other group. Kepel proposes as the best solution that the French state take the initiative and try to integrate Muslims into mainstream life. He says that the minds and hearts of the Muslims will mainly be won in the schools, where the next generation is growing up. (DPA-Feature)

The Hindustan Times, December 11, 1987

فرانس میں اسلام

اسلام فرانس میں تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ پورے ملک میں کثرت سے مسجدیں بن رہی ہیں۔ فرانس کے وزیر داخلہ چارلس پاسکا نے اپنے عملہ کو ہدایت کی ہے کہ وہ اس نئے اور عجیب منظر پر ایک رپورٹ تیار کر کے انھیں دیں جس کو انھوں نے "ہزار مسجدوں کا فرانس" کہا ہے۔ پندرہ سال کے اندر فرانس میں مسجدوں کی تعداد ایک درجن سے ایک ہزار تک پہنچ گئی ہے۔

علم سیاست کے پروفیسر گلیز کیپل کی ایک نئی کتاب شائع ہوئی ہے جس کا نام ہے "مضافاتِ اسلام"۔ اس میں انھوں نے انکشاف کیا ہے کہ اس مغربی ملک میں ایک "اسلامی فرانس" وجود میں آرہا ہے۔ اس کے مطابق، فرانس میں مسلمانوں کی تعداد تقریباً تین ملین ہے۔ ۳۲ سالہ پروفیسر کیپل کا کہنا ہے کہ ابھی تک یہ بات غیر واضح ہے کہ فرانس کے مسلمان ایک روز یہاں کے قومی دھارے میں ضم ہو جائیں گے یا نہیں۔ اکثر مبصرین کا خیال ہے کہ فرانس کی سوسائٹی اور اس کا کلچر اتنا طاقتور ہے کہ مسلمان دھیرے دھیرے یہاں کی سوسائٹی میں ضم ہو جائیں گے۔ دوسرے لوگوں کا کہنا ہے کہ یہاں کے مسلمان اپنی شناخت کو محفوظ رکھیں گے اور کیتھولک، پروٹسٹنٹ یا یہود کی طرح ایک علحدہ فرقہ بن کر باقی رہیں گے۔

فرانسیسی مسلمانوں کی بہت بڑی اکثریت شمالی افریقہ کی سیاہ فام نسل سے تعلق رکھتی ہے جو یا تو مہاجر ہیں یا پاسپورٹ پر یہاں رہ رہے ہیں۔ کچھ ترک مسلمان ہیں۔ صرف مٹھی بھر ایسے لوگ ہیں جو اصلاً فرانسیسی ہیں اور مذہب تبدیل کر کے مسلمان بنے ہیں۔ فرانسیسی مسلمان زیادہ تر غریب طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں بہت سے ہیں جو بالکل جاہل ہیں۔

فرانس یورپ کا اہم ترین ملک ہے۔ فرانس جیسے ملک میں تین ملین مسلمانوں کا اجتماع انھیں مغربی دنیا میں اسلام کی دعوت واشاعت کا زبردست موقع دے رہا ہے۔ مگر دعوتی ذہن نہ ہونے کی وجہ سے ان کی ساری توجہ صرف اس پر لگی ہوئی ہے کہ اس مغربی ملک میں وہ اپنی گروہی شناخت کو باقی رکھ سکیں۔ دعوت و تبلیغ کا ذہن آدمی کے اندر آفاقیت پیدا کرتا ہے اور قومی شناخت کا ذہن صرف محدودیت۔

حکمتِ تدریج

اگر یہ سوال کیا جائے کہ گھر کیا ہوتا ہے تو گھر کی پوری تصویر اس کے تمام اجزار سمیت بیک وقت آدمی کے سامنے رکھ دی جائے گی۔ لیکن اگر سوال یہ ہو کہ گھر کیسے بنتا ہے تو جواب کی شکل دوسری ہوگی۔ اب کہا جائے گا کہ پہلے زمین کی فراہمی، پھر بنیاد، اس کے بعد دیواریں، اس کے بعد چھت وغیرہ۔ اسی طرح اگر سوال کیا جائے کہ درخت کیا ہے تو جواب دینے والا بیک وقت پورے درخت کا تعارف کرائے گا۔ لیکن اگر سوال یہ ہو کہ درخت کیسے وجود میں آتا ہے تو جواب دینے والا دوبارہ ایک ترتیب کے ساتھ اجزار درخت کا ذکر کرے گا ——— پہلے زمین، اس کے بعد بیج، پھر پانی اور حفاظت، یہاں تک کہ دھیرے دھیرے پورا درخت۔

یہی معاملہ اسلام کا بھی ہے۔ اگر سوال یہ ہو کہ "اسلام کے احکام کیا کیا ہیں" تو اس کا جواب یہ ہوگا کہ قرآن وحدیث میں جن احکام کا ذکر ہے، ان سب کی فہرست تیار کر کے رکھ دی جائے لیکن اگر سوال کرنے والا یہ سوال کرے کہ "اسلام کی اشاعت کیسے کی جائے" تو جواب کی شکل بدل جائے گی۔ اب "الاقدم فالاقدم" کے اصول پر جواب دیا جائے گا۔ اب بتایا جائے گا کہ اسلام میں بہت سے احکام ہیں مگر اس کے کچھ اجزار پہلے مرحلہ میں مطلوب ہیں اور کچھ اجزار بعد کے مرحلہ میں۔

بیانِ احکام میں فہرست مطلوب ہوتی ہے اور اشاعتِ احکام میں ترتیب۔ ایک صورت میں تمام احکام بیک وقت بتانے ہوتے ہیں، جب کہ دوسری صورت کا تقاضا ہوتا ہے کہ احکام کو تدریج کے ساتھ ایک کے بعد ایک سامنے لایا جائے۔

تمام کتب فقہ "بیان احکام" کے اسلوب پر لکھی گئی ہیں، اس لیے ان میں ایک ہی کتاب میں تمام احکام کی تفصیل دینے کی کوشش کی جاتی ہے۔ مگر دعوت واشاعت کے مصالح اس سے الگ ہیں۔ فقہ میں اگر فہرست بندی کی اہمیت ہے تو دعوت واشاعت میں ترتیب و تدریج کی۔ دعوت واشاعت کے کام کی یہی حکمت ہے جو اس حدیث میں بیان ہوئی ہے جو صحاح ستہ کی تمام کتابوں میں مختلف طریقوں سے منقول ہوئی ہے:

قال البخاری: حدثنا حبان، اخبرنا عبد الله، عن زکریا بن ابی اسحاق، عن یحییٰ بن

عبد الله بن صیفی، عن ابی معبد مولی ابن عباس، عن ابن عباس، قال: قال رسول الله صلی الله علیہ وسلم لمعاذ بن جبل حین بعثہ الی الیمن: "انک ستاتی قوما اهل کتاب، فاذ جئتهم فادعهم الی ان یشهدوا ان لا الٰہ الا اللہ وان محمدا رسول اللہ، فان هم اطاعوا لک بذالک فاخبرهم ان اللہ فرض علیهم خمس صلوات فی کل یوم ولیلة، فان هم اطاعوا لک بذالک فاخبرهم ان اللہ فرض علیهم صدقة توخذ من اغنیائهم فترد علی فقرائهم، فان هم اطاعوا لک بذالک فایاک وکرائم اموالهم، واتق دعوة المظلوم فانه لیس بینها وبین اللہ حجاب"

حضرت عبد اللہ بن عباس کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب معاذ بن جبل کو یمن کی طرف بھیجا تو ان سے کہا۔ تم ایک ایسی قوم کی طرف جا رہے ہو جو اہل کتاب ہیں۔ جب تم ان کے پاس پہونچو تو ان کو دعوت دو کہ وہ اس بات کی گواہی دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ محمد اللہ کے رسول ہیں۔ پس اگر وہ تمہاری یہ بات مان لیں تو ان کو بتاؤ کہ اللہ نے ان کے اوپر ہر رات اور دن میں پانچ نمازیں فرض کی ہیں۔ پس اگر وہ تمہاری یہ بات بھی مان لیں تو ان کو بتاؤ کہ اللہ نے ان کے اوپر زکواۃ فرض کی ہے جو کہ ان کے دولت مندوں سے لی جاتی ہے اور ان کے غریبوں کو لوٹا دی جاتی ہے۔ پس اگر وہ تمہاری یہ بات مان لیں تو اس سے بچو کہ تم ان کا صرف اچھا مال لو۔ اور مظلوم کی پکار سے ڈرو، کیوں کہ اس کے اور اللہ کے درمیان کوئی حجاب نہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں اس کی متعدد مثالیں موجود ہیں کہ آپ نے بیانِ احکام اور عملی مطالبہ میں فرق فرمایا ہے۔ حکم بیان کرتے وقت تو آپ نے تمام ضروری احکام بیان فرمائے۔ مگر عمل کے مطالبہ کے معاملہ میں آپ نے نرمی اور رخصت کا اور ترتیب وتدریج کا لحاظ فرمایا۔

مثلاً قبیلہ ثقیف (طائف) کا وفد رمضان ۹ھ میں مدینہ آیا۔ یہ لوگ چھ آدمی تھے۔ اور ان کے سردار عبد یالیل تھے۔ یہ لوگ مسجد نبوی میں ٹھہرائے گیے۔ وہ کئی دن تک قرآن کو سنتے رہے اور اسلام کے احکام ومسائل کی بابت دریافت کرتے رہے۔

اس سلسلہ میں جو تفصیلات سیرت وحدیث کی کتابوں میں آئی ہیں، ان سے معلوم

ہوتا ہے کہ احکام اسلام کو بیان کرنے کے معاملہ میں ان سے کوئی کمی نہیں کی گئی۔ تمام احکام پوری طرح سنائے جاتے رہے اور بیان کیے جاتے رہے۔ مگر احکام کے عملی مطالبہ کے معاملہ میں ان سے حسب گنجائش رخصت کا اور تدریج کا طریقہ اختیار کیا گیا۔ اس سلسلہ میں ایک روایت ان الفاظ میں آئی ہے :

قال الامام احمد : حدثنا عفان، حدثنا محمد بن مَسلمة، عن حُميد، عن الحسن، عن عثمان بن ابی العاص، ان وفد ثقیف قدموا علی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فانزلهم المسجد لیکون ارقّ لقلوبهم، فاشترطوا علیٰ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم (الّا یصلّوا) والا یُحشروا ولا یعشّروا ولا یجبوا ولا یستعمل علیهم غیرهم، فقال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: " لکم ان لا تحشروا ولا تعشروا ولا یستعمل علیکم غیرکم، ولا خیر فی دین لا رکوع فیه "

ثقیف کا وفد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مدینہ آیا۔ آپ نے ان کو مسجد میں ٹھہرایا تاکہ وہاں کے ماحول سے ان کے دل نرم ہوں۔ انھوں نے اسلام قبول کرنے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ شرط لگائی کہ انھیں جہاد کے لیے جمع نہیں کیا جائے گا۔ اور ان سے عُشر نہیں لیا جائے گا اور ان پر ٹیکس نہیں لگایا جائے گا اور ان کے اوپر کسی غیر کو حاکم نہیں بنایا جائے گا۔ اس کے جواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے کہا کہ تم سے جہاد میں شرکت کے لیے نہیں کہا جائے گا اور تم پر عُشر نہیں لگایا جائے گا اور تمہارے اوپر کسی غیر کو حاکم نہیں بنایا جائے گا۔ اور اس دین میں کوئی خیر نہیں جس میں اللہ کے آگے جھکنا نہ ہو۔

ایک اور روایت ان الفاظ میں آئی ہے :

قال ابوداؤد : حدثنا الحسن بن الصباح، حدثنا اسماعیل بن عبد الکریم، حدثنی ابراهیم بن عقیل بن معقل بن منبه، عن وهب، سالت جابراً عن شان ثقیف اذ بایعت قال: اشترطت علی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ان لا صدقة علیها ولا جهاد، وانه سمع رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یقول بعد ذالك : " سیتصدقون ویجاهدون اذا اسلموا "

وہب کہتے ہیں کہ میں نے حضرت جابر سے ثقیف کی بابت پوچھا جب کہ انھوں نے بیعت کی تھی انھوں نے کہا کہ ثقیف نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ شرط لگائی کہ ان پر زکوٰۃ نہ ہوگی اور ا

پر جہاد نہ ہوگا۔ اور یہ کہ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ شرط مان لی) اور اس کے بعد انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ جب وہ اسلام قبول کرلیں گے تو آئندہ وہ زکواۃ بھی دیں گے اور جہاد بھی کریں گے۔

اس رخصت یا حکمت تدریج کے لیے کوئی ایک ہی لگا بندھا اصول مقرر نہیں کیا گیا ہے۔ اس کا تعلق زیادہ تر حالات سے ہے۔ جن لوگوں کے ساتھ رخصت برتی جارہی ہے، یا جن کے ساتھ تدریج کا معاملہ کیا جارہا ہے، ان کی استعداد اور حالات کی روشنی میں اس کا فیصلہ کیا جائے گا نہ کہ کسی مطلق اصول یا کسی متعین فہرست کی بنیاد پر۔

اس نظریہ کے حق میں ایک ثبوت یہ ہے کہ ثقیف کے ساتھ صدقہ اور جہاد کے معاملہ میں رخصت کا معاملہ اختیار کیا گیا۔ مگر اسی صدقہ اور جہاد کی رخصت ایک اور شخص نے طلب کی تو اس کو اس کی رخصت نہیں دی گئی۔ یہاں ہم اس سلسلہ میں ایک واقعہ نقل کرتے ہیں۔

عن بشير بن الخصاصية رضي الله عنه قال: أتيتُ رسول الله صلى الله عليه وسلم لابايعه فقلت علام تبايعني يارسول الله. فمدّ رسول الله صلى الله عليه وسلم يده فقال: تشهد ان لا اله الا الله وحده لا شريك له وتصلي الصلوات الخمس لوقتها وتودي الزكوة المفروضة وتصوم رمضان وتحج البيت، وتجاهد في سبيل الله؛ قلت يارسول الله، كلاًّ نطيق الا اثنتين فلا اطيقهما الزكوٰة، والله مالي الا عشر ذود هنّ رسل اهلي وحمولتهن. واما الجهاد فاني رجل جبان، ويزعمون انّه من ولّى فقد باء بغضب من الله، واخاف ان حضر القتال ان اخشع بنفسي فافرّ فاَبوء بغضب من الله. فقبض رسول الله صلى الله عليه وسلم يده ثم حرّكها، ثم قال: "يابشير، لا صدقة ولا جهاد: فبِمَ اذن تدخل الجنة؟" قلت: يارسول الله، ابسط يدك ابايعك، فبسط يده فبايعته عليهن كلّهن. كذا في كنز العمال (١٢/٧) واخرجه احمد، ورجاله موثقون كما قال الهيثمي (٤٢/١)

بشیر بن خصاصیہؓ کہتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا تاکہ بیعت کروں (اور اسلام میں داخل ہوجاؤں) میں نے کہا کہ اے خدا کے رسول، آپ مجھ سے کس چیز پر بیعت لیں گے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنا ہاتھ بڑھایا اور کہا کہ تم گواہی دو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود

نہیں، وہ اکیلا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ اور تم پانچ نمازیں ان کے وقت پر پڑھو، تم فرض زکواۃ ادا کرو اور رمضان کے روزے رکھو اور بیت اللہ کا حج کرو۔ اور اللہ کے راستہ میں جہاد کرو ۔ میں نے کہا کہ اے خدا کے رسول، میں یہ سب کرسکتا ہوں سوا دو کے، کیوں کہ میں ان دو کی طاقت نہیں رکھتا۔ ایک، زکواۃ۔ خدا کی قسم، میرے پاس صرف دس اونٹ اور اونٹنیا ہیں۔ وہ میرے گھر والوں کیلئے دودھ کا ذریعہ بھی ہیں اور بار برداری کا بھی۔ اور جہاں تک جہاد کا معاملہ ہے تو میں ایک بزدل آدمی ہوں۔ اور لوگ کہتے ہیں کہ جو شخص جہاد کے میدان سے پیٹھ پھیر لے تو وہ خدا کے غضب کا مستحق ہو جاتا ہے۔ میں ڈرتا ہوں کہ جب جنگ کا موقع ہو تو میں ڈر جاؤں اور میدان سے بھاگ جاؤں، پھر میں اللہ کے غضب کا مستحق بنوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور اس کو حرکت دیتے ہوئے کہا کہ اے بشیر، نہ صدقہ اور نہ جہاد، پھر تم کیسے جنت میں جاؤ گے۔ میں نے کہا کہ اے اللہ کے رسول، اپنا ہاتھ بڑھائیے میں آپ سے بیعت کرتا ہوں۔ آپ نے اپنا ہاتھ بڑھایا تو میں نے ان سب چیزوں پر آپ سے بیعت کی۔

قرآن کے متعلق معلوم ہے کہ وہ بیک وقت ایک کامل کتاب کی صورت میں نہیں اترا، بلکہ تھوڑا تھوڑا کر کے ترتیب وار اترا۔ اس طرح اس کے نزول میں ۲۳ سال لگ گئے۔ قرآن کے اس طرح نازل ہونے کا سبب کیا تھا، اس کا جواب حضرت عائشہ کی ایک روایت میں ملتا ہے جو کہ حسب ذیل ہے:

انما نزل اول ما نزل سورة من المفصل، فیها ذکر الجنة والنار۔ حتی اذا ثاب الناس الی الاسلام نزل الحلال والحرام۔ ولو نزل اول ما نزل لا تشربوا الخمر لقالوا لا ندع الخمر ابداً۔ ولو نزل لا تزنوا لقالوا لا ندع الزنا ابداً (بخاری، باب تالیف القرآن)

قرآن میں پہلے وہ مکی سورتیں اتریں جن میں جنت اور جہنم کا ذکر ہے۔ یہاں تک کہ جب لوگ اسلام کی طرف مائل ہوگئے تب حلال اور حرام کے احکام اترے۔ اور اگر پہلے ہی یہ حکم اترتا کہ شراب نہ پیو تو یقیناً لوگ کہتے کہ ہم کبھی شراب نہ چھوڑیں گے۔ اور اگر پہلے ہی یہ حکم اترتا کہ زنا نہ کرو تو یقیناً لوگ کہتے کہ ہم ہرگز زنا نہ چھوڑیں گے۔

بیانِ احکام میں ہمیشہ فہرست مطلوب ہوتی ہے اور نفاذِ احکام میں ہمیشہ ترتیب و تدریج۔

ایک سفر

۱۲ جون ۱۹۸۷ کو مجھے ایک اسلامی کانفرنس میں شرکت کے لئے افریقہ کے سفر پر روانہ ہونا تھا۔ اتفاق سے آج ہی ایک صاحب کا خط ملا جس میں "سفر نامہ" کے بارہ میں سخت ناراضگی کا اظہار کیا گیا تھا۔ انھوں نے لکھا تھا کہ الرسالہ میں سفر نامہ کی اشاعت بند کر دی جائے کیوں کہ اس میں شخصی تذکرے ہوتے ہیں۔ میں نے سوچا کہ الرسالہ کا سفر نامہ تو تمام تر سبق اور معلومات سے بھرا ہوا ہوتا ہے۔ پھر کیوں بعض افراد سفر نامہ کے بارہ میں مخالفانہ رائے کا اظہار کرتے ہیں۔

یہ سوچتے ہوئے میرا ذہن سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۲۶ کی طرف چلا گیا۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ قرآن سے بہت سے لوگوں کو گمراہی ملتی ہے اور بہت سے لوگوں کو ہدایت۔ میں نے سوچا کہ قرآن تو خدا کی کتاب ہے، وہ پوری طرح بے عیب اور کامل ہے، پھر کیا وجہ ہے کہ اس سے بھی بہت سے لوگوں کو صرف گمراہی کا رزق حاصل ہوتا ہے۔ اس کی وجہ قرآن کی اسی آیت میں موجود ہے۔ قرآن میں مکھی کی مثال دی گئی تو کچھ لوگوں نے کہا کہ قرآن تو خداوند عالم کی کتاب ہے۔ پھر اس میں مکھی اور مچھر جیسی چھوٹی اور معمولی چیزوں کا ذکر کیوں۔

ان لوگوں کی نظر "مکھی" اور "مچھر" کی طرف چلی گئی۔ وہ اس سبق کی طرف نہیں گئی جو مکھی اور مچھر کے تذکرہ میں چھپا ہوا تھا۔ اس لئے ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ خدا کی کتاب میں مکھی اور مچھر کا تذکرہ کیوں۔ یہی معاملہ الرسالہ کے سفر ناموں کا بھی ہے۔ اس میں بعض اوقات "مکھی" اور "مچھر" کے تذکرے ہوتے ہیں۔ اب جن لوگوں کی نگاہ مکھی اور مچھر پر اٹک کر رہ جائے انھیں سفر نامہ بے فائدہ معلوم ہوگا۔ مگر جن لوگوں کی نگاہ مکھی اور مچھر سے گزر کر اس کے سبق تک پہنچ جائے وہ سفر نامہ میں اپنے لئے قلب و دماغ کی غذا پائیں گے۔ اور خدا کے فضل سے ہمارے قارئین میں ایسے لوگوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔

یہ سفر براستہ کراچی ہوا۔ دہلی سے پاکستان ایرویز کی فلائٹ نمبر ۲۹۱ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ جہاز کے اندر پاکستان کے اردو اخبارات برائے مطالعہ موجود تھے۔ ان اخبارات میں میرٹھ کے فرقہ وارانہ فساد کی خبریں تھیں۔ مگر ان کا عنوان "میرٹھ میں فرقہ وارانہ فساد" نہیں تھا۔ بلکہ ان کا

عنوان حسب ذیل الفاظ میں قائم کیا گیا تھا:

بھارت میں مسلم کشی

بھارت میں مسلمانوں کا قتل عام

بھارت میں مسلمانوں کے خون کی ہولی

ایک طرف اس قسم کی مبالغہ آمیز بلکہ خلاف واقعہ خبریں تھیں۔ دوسری طرف روزنامہ جنگ (کراچی) ۱۲ جون ۱۹۸۷ کے آخری صفحہ پر مہاجر قومی موومنٹ (MQM) کے لیڈر مسٹر الطاف حسین کا ایک بیان تھا جس میں دوسری باتوں کے ساتھ حسب ذیل الفاظ چھپے ہوئے تھے:

"پاکستان کی جو سیاسی اور مذہبی جماعتیں ہندستانی مسلمانوں کے غم میں گھل رہی ہیں، اگر انھیں واقعی ہندستان کے مظلوم مسلمانوں سے ہمدردی ہے تو وہ سڑکوں پر نکل آئیں اور اس وقت تک کے لئے دھرنا مار کر بیٹھ جائیں جب تک کہ مظلوم مسلمانوں کے لئے پاکستان کی سرحد کھولنے کا مطالبہ تسلیم نہ کرالیں۔ ان مذہبی اور سیاسی جماعتوں کو یہ اعلان کرنا چاہئے کہ ہم آدھا کھانا بھارت کے مظلوم مسلمانوں کو دیں گے اور انھیں یہاں رکھیں گے۔ بھارتی مسلمانوں کے لئے صرف زبانی جمع خرچ کیا جارہا ہے۔"

بظاہر یہ دونوں بیان ایک دوسرے سے مختلف نظر آتے ہیں۔ مگر حقیقت کے اعتبار سے ان کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ دونوں ہی کا مقصد اپنے مدمقابل کو ڈسکریڈیٹ کرنا ہے۔ یہ محض اتفاق کی بات ہے کہ ایک کا مدمقابل ہندستان کا ہندو ہے اور دوسرے کا مدمقابل خود پاکستان کا غیر مہاجر مسلمان۔

۱۲ جون کی شام کو ۱۰ بجے میں کراچی پہنچا۔ یہاں تقریباً دو رات اور ایک دن قیام رہا۔ یہ قیام جناب فضل الرحمن صاحب ایم اے کے مکان پر تھا۔ وہ ایک ذہین اور صاحب مطالعہ آدمی ہیں، ان سے یہاں کے بارہ میں کافی معلومات حاصل ہوئیں۔

آجکل یہاں مہاجر اور غیر مہاجر مسئلہ زوروں پر ہے۔ یہ مسئلہ اس سے زیادہ شدید صورت اختیار کر چکا ہے جس کو ہندستان میں "ہندو مسلم مسئلہ" کہا جاتا ہے۔ اسی تناؤ کا یہ نتیجہ ہے کہ اپریل ۱۹۸۵ میں جب ایک مہاجر لڑکی بشریٰ زیدی ایک غیر مہاجر (پٹھان) کی ٹرک سے دب کر

ہلاک ہوگئی تو کراچی میں مہاجرین نے بگڑ کر پٹھانوں کو مارا اور ان کی گاڑیوں کو جلایا۔ اس کا بدلہ پٹھانوں نے سہراب گوٹھ میں لیا جس کے قریب "علی گڑھ کالونی" کے چھ سو مہاجر جلا دئے گئے یا گولیوں کا نشانہ بنا دئے گئے۔ اس باہمی قتل وخون کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔

پاکستان کی تمام بڑی بڑی تحریکوں کی تہ میں یہی مہاجر اور غیر مہاجر کا مسئلہ پایا جاتا ہے۔ پاکستان بننے سے پہلے یہاں کی تجارتوں پر ہندو چھائے ہوئے تھے۔ ان کے جانے کے بعد یہاں زبردست خلا پیدا ہوا۔ اس کو مہاجرین نے بھرپور طور پر استعمال کیا۔ یہاں تک کہ وہ پاکستان کی صنعت و تجارت کے ۸۰ فی صد حصہ پر قابض ہوگئے۔ اس کے نتیجہ میں مقامی باشندوں میں محرومی کا احساس پیدا ہوا۔ اس معاشی عدم توازن میں توازن پیدا کرنے کی کوشش پہلی بار جنرل ایوب خاں کے دور حکومت میں شروع ہوئی۔ مگر مہاجر طبقہ کے پاس پیسہ تھا۔ چنانچہ مہاجر سرمایہ کے اوپر ایوب خاں کے خلاف شدید تحریک شروع ہوئی۔ ایوب خاں کی بعض "کمزوریوں" کو شوشہ بنا کر ان کے خلاف طوفان کھڑا کر دیا گیا۔ مولانا ابو الاعلیٰ مودودی کی نظام اسلام تحریک جو ایوب خاں کے خلاف اٹھی، اس کی تہ میں اصلاً اسی مہاجر تحریک کا زور تھا۔ اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہ ایک مہاجر تحریک تھی نہ کہ فی الواقع کوئی اسلامی تحریک۔

اس کے بعد مسٹر بھٹو کے خلاف نظام مصطفیٰ کی تحریک بھی اصلاً مہاجر تحریک تھی۔ مسٹر بھٹو مقامی باشندوں (سندھیوں) کے نمائندہ تھے، اور اسلام پسند قیادت مہاجرین کی نمائندہ۔ مسٹر بھٹو کے لئے "سوشلزم" کا نعرہ مفید مطلب تھا، کیوں کہ وہ بڑے بڑے صنعتی اداروں کو نجی ملکیت سے نکالنے کا جواز فراہم کرتا تھا جن پر مہاجر طبقہ قابض تھا۔ اسی طرح دوسرے طبقہ کے لئے اسلام کا نعرہ مفید مطلب تھا۔ کیوں کہ وہ نجی ملکیت کو مقدس قرار دے کر ان کو ان کے مالکوں (مہاجرین) کے قبضہ میں باقی رکھنے کا جواز مہیا کرتا تھا۔ یہ اسلام کے نام پر سراسر غیر اسلامی سیاست تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے ذریعہ سے منفی نتائج (ایوب اور بھٹو کا زوال) تو رونما ہوئے۔ مگر اس کے ذریعہ کوئی تعمیری مقصد حاصل نہ کیا جا سکا۔

پاکستان میں اس وقت دو مہاجر تحریکیں چل رہی ہیں۔ ایک مہاجر قومی مومنٹ MQM دوسری مہاجر اتحاد تحریک۔ اول الذکر زیادہ بڑی سمجھی جاتی ہے۔ ۱۳ جون ۱۹۸۷ کی شام کو مسٹر

طارق جاوید (پیدائش ۱۹۵۷) سے ملاقات ہوئی۔ وہ مہاجر قومی موومنٹ کے وائس چیرمین ہیں۔

میں نے ان سے پوچھا کہ "آپ کی یہ تحریک قومی تحریک ہے یا اسلامی تحریک"۔ انھوں نے ایک لمحہ کے توقف کے بغیر کہا "نیشنلسٹ تحریک"۔ ہم لوگوں کو اسلام کی بنیاد پر اکٹھا نہیں کر رہے ہیں، ہم صرف مسائل کی بنیاد پر لوگوں کو اکٹھا کر رہے ہیں۔ کسی نیشنلسٹ تحریک کے لئے زمین ضروری ہے اس لئے ہم نے پانچویں صوبہ (مہاجر صوبہ) کا نعرہ لگایا ہے"۔

مہاجر قومی موومنٹ میں مسٹر الطاف حسین کو "قائد تحریک" کی حیثیت حاصل ہے۔ مسٹر الطاف حسین کراچی یونیورسٹی میں طالب علم تھے۔ انھیں فارمیسی (بی فارما) میں داخلہ نہیں ملا۔ الطاف حسین صاحب نے اس کو مہاجر کے ساتھ امتیاز قرار دیا۔ انھوں نے ۱۱ جون ۱۹۷۸ کو مہاجر اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن (APMSO) کی بنیاد ڈالی اور دھواں دھار تحریک شروع کر دی۔ ان کا کہنا تھا کہ مہاجرین کی کوئی تنظیم نہیں۔ مہاجرین کا کوئی علیٰحدہ تشخص نہیں۔ ان کو ہر جگہ نظر انداز کیا جاتا ہے۔ وغیرہ۔ اس کے بعد یونیورسٹی میں مہاجرین کے خلاف فضا مزید خراب ہو گئی۔ الطاف حسین اور ان کے ساتھیوں پر ریوالور اور خنجر سے حملے کئے گئے یہاں تک کہ یہ حال ہو گیا کہ الطاف حسین صاحب کے لئے یونیورسٹی جانا ناممکن ہو گیا۔ اب انھوں نے تعلیم چھوڑ دی اور ۱۷ مارچ ۱۹۸۴ کو مہاجر قومی تحریک MQM کی بنیاد ڈالی۔

مسٹر طارق جاوید نے حالات بتلاتے ہوئے کہا: "پاکستان میں زندگی کے ہر شعبہ میں مہاجر کے ساتھ امتیازی سلوک برتا جا رہا ہے۔ کراچی کے اندر کوئی ویکنسی ہوتی ہے تو اس کا اشتہار اخبار میں اس طرح دیا جاتا ہے "کراچی، حیدر آباد اور سکھر کے لوگ درخواست دینے کی زحمت نہ کریں"۔ ان الفاظ کا مطلب صرف یہ ہوتا ہے کہ مہاجر لوگ درخواست نہ دیں، کیوں کہ ان تینوں شہروں کی زیادہ آبادی مہاجرین پر مشتمل ہے۔ ہر قسم کے ذمہ دارانہ منصب پر پنجابی مسلمان بیٹھے ہوئے ہیں۔ وہ پنجابی کے سوا کسی اور کو لینا نہیں چاہتے۔ کراچی پولیس کی بھرتی ہوتی ہے تو اس کا اشتہار کراچی کے اخبار میں نہیں دیا جاتا بلکہ لاہور کے اخبار میں دیا جاتا ہے تاکہ مہاجرین اس میں درخواست نہ دے سکیں۔ پاکستان ایر لائنز میں سب پنجابی بھرے ہوئے ہیں۔ حقیقت

ہے کہ پی آئی اے پنجاب انٹرنیشنل ایر لائنز ہے نہ کہ پاکستان انٹرنیشنل ایر لائنز۔ ایک پنجابی اگر ٹرافک رول کی خلاف ورزی کرے تو اس کی چالان نہیں ہوگی۔ اور اگر کوئی مہاجر ٹریفک رول کی غلطی کر جائے تو فوراً اس کی چالان ہو جاتی ہے۔ اس وقت پاکستان میں ہمارے لئے بقا کا مسئلہ ہے۔ ۱۴ دسمبر ۱۹۸۶ کو "علی گڑھ کالونی" اور "قصبہ کالونی" میں ۶ گھنٹے تک قتل عام ہوتا رہا۔ بچوں کو زندہ آگ میں ڈال دیا گیا۔ قریب ہی پولیس چوکی تھی۔ چند کلو میٹر کے فاصلہ پر فوج موجود تھی۔ مگر پولیس یا فوج نے کوئی مداخلت نہیں کی۔ یہ باقاعدہ پلاننگ سے ہوا ہے۔ پولیس والے شہری لباس میں آئے اور انھوں نے منظم طریقہ پر مہاجرین کو مارا اور جلایا"

مسٹر طارق انور یہ باتیں کہہ رہے تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ یہ پاکستان کا مسلم لیڈر بول رہا ہے یا ہندستان کا کوئی مسلم لیڈر۔

میں نے جناب فضل الرحمٰن صاحب سے پوچھا کہ مہاجرین کا مسئلہ ہندستان اور پاکستان دونوں جگہ پیدا ہوا۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ ہندستان میں یہ مسئلہ جلد ہی ختم ہو گیا۔ چنانچہ آج وہاں "شرنارتھی" نام کے کسی علیحدہ فرقہ کا وجود نہیں۔ اس کے برعکس پاکستان میں یہ مسئلہ آج بھی موجود ہے۔ بلکہ وہ مزید شدت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ حتیٰ کہ یہاں کے مہاجرین اب اپنے لئے ایک نئی قومیت (مہاجر قوم) کو منوانا چاہتے ہیں اور ایک نیا صوبہ (مہاجر صوبہ) بنانے کا مطالبہ کر رہے ہیں۔

فضل الرحمٰن صاحب نے کہا کہ ہندستان کے شرنارتھی محض پناہ لینے کے لئے ہندستان میں داخل ہوئے تھے۔ وہ اپنے آپ کو صرف پناہ گزیں سمجھتے تھے۔ اس کے برعکس شمالی ہند کے مسلمان مہاجر یہاں آئے تو اس احساس کے ساتھ آئے کہ ہم پاکستان کے خالق ہیں۔ وہ یہاں ہیرو اور فاتح کی حیثیت سے داخل ہوئے۔

اسی فرق کا یہ نتیجہ تھا کہ ہندستان کے شرنارتھیوں میں برتری کا کوئی جذبہ پیدا نہیں ہوا انھوں نے ہر اعتبار سے اپنے آپ کو نئے ماحول کے ساتھ ہم آہنگ کر لیا۔ اس کے برعکس یہاں کے مسلم مہاجرین میں مقامی آبادی کے مقابلہ میں برتری کا احساس پایا جاتا تھا۔ جس کا اظہار بار بار مختلف شکلوں میں ہوتا رہا۔ اس کا ردعمل یہ ہوا کہ یہاں کے مقامی باشندوں میں فرزندان

وطن (Sons of the soil) کا نظریہ پیدا ہوا۔ مہاجر کے لئے فخر کی بنیاد تخلیق پاکستان تھ
تو مقامی باشندوں نے علاقہ کا قدیم باشندہ ہونے کو فخر کا عنوان بنا لیا۔ اس طرح مہاجر اور غیر
مہاجر کی کشمکش بڑھتی چلی گئی۔

پاکستان کے مہاجرین کا مسئلہ دراصل اردو بولنے والے مسلمانوں کا مسئلہ ہے۔ اسی طرح
ہندستانی مسلمانوں کا مسئلہ بھی بنیادی طور پر اردو بولنے والے مسلمانوں کا مسئلہ ہے۔ یہ اشتر
صرف زبان کا نہیں، بلکہ نفسیات کا بھی ہے۔ دونوں جگہ کا "اردو طبقہ" ایک ہی قسم کی نفسیات
مبتلا ہے۔ فرق یہ ہے کہ پاکستان کے اردو طبقہ کی نفسیات کا اظہار پاکستانی حالات کے اعتبار
ہوا ہے اور ہندستان کے اردو طبقہ کی نفسیات کا اظہار ہندستانی حالات کے اعتبار سے۔

پاکستان کے مہاجرین کا مسئلہ اس لئے پیدا ہوا کہ وہ وہاں کے مقامی باشندوں کے مقابل
احساس برتری کا شکار تھے۔ یہی چیز ہندستان میں بھی مسلم مسئلہ کو پیدا کرنے کا سبب بنی
ہندستان کے جتنے مسلم لیڈر ہیں، خواہ وہ ایک مکتب خیال سے تعلق رکھتے ہوں یا دوسرے مکتب
خیال سے، وہ سب کے سب اس بات میں مشترک ہیں کہ وہ مسلمانوں کے اندر فخر کی نفسیات
کرتے رہے ہیں ——— ہم نے اس ملک کے لوگوں پر ایک ہزار سال تک حکومت کی
ہم نے اس ملک کے لوگوں کو تہذیب سکھائی ہے۔ ہم نے اس ملک کو تاج محل کا حسن
قطب مینار کی بلندی عطا کی۔ اس ملک کے پاس آزادی کے بعد اپنا جھنڈا لہرانے کی بھی
جگہ نہ تھی، ہم نے اس کو لال قلعہ دیا۔۔۔۔۔ جو لوگ بھی مسلم خطیبوں اور مسلم لیڈروں کی تقر
سنتے رہے ہیں وہ جانتے ہیں کہ ہمارے تمام قائدین ایک یا دوسرے انداز میں اسی قسم
کرتے رہے ہیں۔ ان باتوں نے مسلمانوں کے اندر اسی طرح برتری کا احساس پیدا کیا جس
پاکستان کے مہاجرین میں وہاں کے مقامی باشندوں کے مقابلہ میں برتری کا احساس پیدا ہ

یہی احساس برتری ہے جس نے دونوں ملکوں کے مسلمانوں (اردو داں مسلمانوں
مسائل پیدا کئے ہیں۔ پاکستان میں اس کا اظہار مسلمانوں اور مسلمانوں کے درمیان ہو رہا
ہندستان میں اس کا اظہار ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ہوا ہے۔ ان مسائل کا کو
اس کے سوا نہیں کہ دونوں ملکوں کے مسلمان اپنا یہ مزاج ختم کریں اور حقیقت پسند بن کر

سیکھیں۔ اگر وہ حقیقت پسندی پر راضی نہیں ہوئے تو دونوں کے لئے بربادی کے سوا کوئی
اور انجام مقدر نہیں۔

"پاکستان بنا کر ہمارے بزرگوں نے ایسی غلطی کی ہے جس کی سزا ہم اب تک بھگت رہے ہیں
چودھری منیر جاوید (پیدائش ۱۹۴۲) نے کہا۔ انھوں نے مہاجرین کے خلاف ان "مظالم
کی تفصیل بیان کی جو علی گڑھ کالونی اور قصبہ کالونی میں ان کے ساتھ کئے گئے۔ میں نے پوچھا
یہ معاملہ شروع کہاں سے ہوا۔ انھوں نے بتایا کہ اکتوبر ۱۹۸۶ میں حیدرآباد (سندھ) میں مہاجر
قومی موومنٹ کا جلسہ تھا۔ اس موقع پر کراچی سے ۲۵ ہزار آدمی گئے۔ کراچی سے جانے والی بسوں کا خرچ
۴۰ لاکھ تھا۔

مہاجرین کا یہ قافلہ جب سہراب گوٹ (پٹھانوں کی بستی) کے پاس پہنچا تو انھوں نے پٹھانوں
کے خلاف نعرے لگائے۔ اس کے بعد دونوں کے درمیان فائرنگ ہوئی۔ پولیس کے بیان کے مطابق
پہلے مہاجر کی طرف سے فائر کیا گیا۔ اس کے بعد پٹھانوں نے جواب میں گولی چلائی۔ مہاجرین کا کہنا
کہ پہلے پٹھانوں کی طرف سے گولی آئی۔ اس کے بعد مہاجرین نے فائر کیا۔ اس موقع پر ایک پولیس افسر (اتفاقی طور)
کو بھی گولی لگی۔

یہ واقعہ ۳۱ اکتوبر ۱۹۸۶ کا ہے۔ اس وقت سے اب تک مہاجر اور پٹھان کے درمیان
کشمکش جاری ہے۔ دونوں طرف اشتعال ہے اور کوئی بھی چھوٹا سا واقعہ دونوں کو ایک دوسرے
سے ٹکرا دیتا ہے۔ باقاعدہ گولیاں چلتی ہیں۔ آتش زنی کی جاتی ہے۔ ایک صاحب نے بتایا
اب تک دونوں طرف سے تقریباً ڈیڑھ ہزار آدمی مارے جا چکے ہیں۔

میں نے یہاں کے ایک تعلیم یافتہ صاحب سے کہا کہ کیسی عجیب بات ہے کہ مسلمان اور مسلمان اس
طرح آپس میں لڑ رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ یہ تو زندگی کی علامت ہے۔ زندہ لوگ ہی آپس میں
لڑتے ہیں۔ مردہ لوگ کیا لڑیں گے۔" میں نے کہا کہ اسی قسم کا واقعہ جب ہندستان میں ہندوؤں
اور مسلمانوں کے درمیان ہوتا ہے تو آپ اس کو ہندو بربریت کے خانہ میں ڈال دیتے ہیں۔ اور
جب یہی واقعہ پاکستان میں ہو تو اس کو مسلمانوں کی زندگی قرار دے رہے ہیں۔

کراچی میں کئی ایسے لوگوں سے ملاقات ہوئی جو قدیم سندھی ہیں۔ ان سے تفصیلی گفتگو ہوئی

سن تفہیم (پیدائش ۱۹۲۹) جیکب آباد کے رہنے والے ہیں۔ ان سے میں نے سندھ کے ہندوؤں بارہ میں پوچھا۔ انھوں نے کہا کہ سندھ کے ہندو سندھ کے مسلمانوں سے زیادہ خوش حال ہیں" ہماری بات گورنمنٹ میں کم سنی جاتی ہے اور ہندوؤں کی بات گورنمنٹ میں زیادہ سنی جاتی ہے"۔ انھوں یہ کہا "یہاں کا ہندو ہماری چھاتی پر بیٹھا ہوا ہے اور ہم اس کو چوم رہے ہیں"

اس کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندو لوگ مسلمانوں سے زیادہ باشعور ہیں۔ میرٹھ کے ماد کے بعد اس کے ردعمل میں مئی ۱۹۸۷ میں جیکب آباد وغیرہ میں مسلمانوں نے ہندوؤں کی دکانیں توڑیں۔ مندر جلائے۔ مگر ہندوؤں نے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا۔ اس فساد میں ہندوؤں کا تقریباً پانچ کروڑ روپیہ کا نقصان ہوا۔ مگر جس وقت ان کی دکانوں میں آگ لگ رہی تھی وہ اپنے گھروں میں چلے گئے اور دروازہ بند کرکے بیٹھ گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خود مسلمانوں نے اور پولیس نے ان کی آگ بجھائی۔ وہ بڑے سیانے لوگ ہیں"

گل حسن تفہیم نے کہا کہ ہماری سندھی زبان میں ایک مثل ہے اور یہاں کے ہندو پوری طرح اس پر عمل کرتے ہیں۔ وہ مثل اس طرح ہے: جا ستے حاجت ناہیں ہتھیارن جی اتے بھجن کم وریامن جو (جہاں ہتھیار کام نہ دیں وہاں بھاگ جانا ہی دانش مندی ہے) انھوں نے بتایا کہ اس ہوشیاری کا نتیجہ ہندوؤں کو یہ ملا ہے کہ جیکب آباد کی تجارت آج ہندوؤں کے ہاتھ میں ہے۔ گورنمنٹ نے زراعت کے لئے "انٹرسٹ فری لون" کی اسکیم چلائی تو اس کا بھی زیادہ فائدہ ہندوؤں کو ملا۔

انھوں نے بتایا کہ جیکب آباد میں تقریباً تمام رائس ملیں ہندوؤں کی ہیں۔ ہندو اس کام کو نہایت ہوشیاری کے ساتھ کرتے ہیں۔ مثلاً وہ برائے نام کسی مسلمان کو اپنی مل میں حصہ دار بنالیں گے اور اس کے بعد اس کا نام "اسماعیل رائس مل" رکھ دیں گے۔ وغیرہ وغیرہ۔

۱۴ جون ۱۹۸۷ کی دوپہر کو میں کراچی سے طرابلس پہنچا۔ یہاں میرا قیام الفندق الکبیر کے کمرہ نمبر ۳۰۴ میں تھا۔ ٹیلیوژن پر اعلان کی وجہ سے فوراً ہی بہت سے لوگوں کو اطلاع ہوگئی۔ چنانچہ شہر کے کئی لوگ اسی دن ملنے کے لئے آگئے۔ تقریباً ایک درجن عرب نوجوان بھی جمع ہوگئے۔

عرب نوجوانوں پر عام طور پر سید قطب کے انقلابی فکر کا غلبہ ہے۔ میں نے اسی کو گفتگو کا موضوع بنایا۔ میں نے کہا کہ یہ اسلام کی سراسر غلط تفسیر ہے۔ اور اس تفسیر نے پوری نسل کو برباد

ے رکھ دیا ہے۔ ان لوگوں نے اسلام کو سیاسی ٹکراؤ کے ہم معنی بنا دیا۔ جہاں جہاں یہ اسلامی
ن فکر بنا، لوگ اپنے حکمرانوں کے خلاف صف آرا ہو گئے۔ اس کے نتیجہ میں حکمرانوں نے انھیں
ی کوشش کی۔ اب انھوں نے یہ مشہور کرنا شروع کر دیا کہ مسلم حکمراں اسلام کے دشمن ہیں۔ حالانکہ
صرف یہ تھا کہ مسلم حکمراں اپنے اقتدار کو چیلنج کرنے والوں کے دشمن تھے۔ یہ لوگ اگر غیر سیاسی انداز
کام کرتے تو اپنے ملک کے مسلم حکمرانوں کو وہ اپنا معاون پاتے۔ مگر سیاسی انداز میں کام کرنے کی
سے ایسا نہ ہو سکا اور مسلم ملکوں کے تمام بہترین امکانات برباد ہو کر رہ گئے۔

سیاسی قربانیوں سے عملاً قوم کو کچھ نہیں ملتا۔ البتہ سیاسی قربانی دینے والا بعد کی نسلوں کے لئے
و بن جاتا ہے۔ اس انقلابی فکر کے موجودہ حاملین کا حال یہ ہے کہ وہ عملاً دوسروں کی طرح دنیا
غرق ہو چکے ہیں۔ اب انھیں "سید قطب" کی طرح قربانی نہیں دینا ہے، البتہ "سید قطب" کو
ریفائی کر کے سیاسی اور مادی فائدہ حاصل کرنا ہے۔

اس اسلامی کانفرنس میں مجموعی طور پر تقریباً چالیس آدمی شریک تھے۔ یہ سب کے سب
تعلیم یافتہ مسلمان تھے اور دنیا کے مختلف حصوں سے آئے تھے۔ ان میں اکثریت اسلامی اداروں
اسلامی تنظیموں کے ذمہ دار حضرات کی تھی۔ تین زبانیں اظہار خیال کا ذریعہ تھیں۔ عربی،
یزی اور فرانسیسی۔

میں مختلف ملکوں کی اسلامی کانفرنسوں میں شریک ہوا ہوں۔ میرا احساس ہے کہ ہر جگہ لوگوں
تقریروں کا نمایاں پہلو "دشمنان اسلام" کے حملوں پر اپنے ردعمل کا اظہار کرنا ہوتا ہے۔ مخططات
د الاسلام والمسلمین، محاولات الاعداء، بس اس قسم کے الفاظ ہر ایک کی زبان پر ہوتے ہیں۔
نے کہا کہ اغیار کے خلاف غم و غصہ کا اظہار کرنے سے زیادہ ضروری کام یہ ہے کہ ہم ان لوگوں کو
م کے سایۂ رحمت میں لانے کی کوشش کریں۔ ان کا جواب یہ تھا: غیر مسلموں کو اسلام کی
ف لانا بھی ایک کام ہے، مگر اس سے زیادہ اہم کام یہ ہے کہ مسلمانوں کو موجودہ اجنبی حملوں
سے بچایا جائے ——— موجودہ مسلمانوں کے فکر پر دفاعی مسائل اتنے زیادہ غالب ہیں
وہ دعوتی باتوں کو سمجھ نہیں پاتے۔ یہی تمام مسلم ملکوں کا حال ہے۔

یہاں ایک صاحب سے ملاقات ہوئی جو افریقہ سے آئے تھے۔ ان کے یہاں الرسالہ انگریزی

جاتا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ اس کو بہت سے لوگ نہایت دلچسپی کے ساتھ پڑھتے ہیں اور ہر ماہ اس کے منتظر رہتے ہیں۔ ایک قاری کا تاثر انھوں نے اِن الفاظ میں بتایا :

قرأت الكثير من الكتب الاسلامية وكانت لدي استفسارات حول الاسلام ـ فما وجدت الاجوبة الا بعد قرأتي لمجلة الرسالة الصادرة من نيو دلهي باللغة الانجليزيه

شريف سالم حسين ، ص ب ١٢٨ مارسبت ، افريقه

ایک اور صاحب سلیمان عمرانی کیلیمیلی سے ملاقات ہوئی۔ وہ دارالسلام (تنزانیہ) سے آئے تھے۔ انھوں نے کہا کہ ایک بار میں ایران گیا تھا۔ وہاں مجھے آپ کی کتاب الاسلام یتحدی ملی۔ اس کو میں تین بار پڑھ چکا ہوں۔ اس کتاب پر عربی کی یہ مثل صادق آتی ہے: کل اللحم فی جوف الفرا۔ اس کتاب میں اتنی زیادہ باتیں ہیں کہ آدمی ہر بار پڑھنے میں نئی بات پاتا ہے (من يقرأ كتاب الاسلام يتحدى يستفيد في كل مرة شيئا جديدا. فاذا اقرأ الانسان في المرة الاولى واستفاد شيئا ففي المرة الثانية يستفيد شيأ آخر، وهكذا ذو اليك)

Suleimab Amrani Kilemile
P.O. Box 45257, Dar-es-Salam, Tanzania, Africa

محمد ارشد الفرحان (کویت) نے ایک بحث میں مداخلت کرتے ہوئے کہا کہ ہم کو چاہئے کہ مسجدوں کو سیاست سے الگ رکھیں۔ عرب ممالک میں لوگوں نے مساجد کے اندر سیاسی تقریریں شروع کر دیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج تمام عرب ممالک میں مساجد نماز کی ادائیگی کے فوراً بعد بند کر دی جاتی ہیں۔ حالانکہ مساجد کو ثقافت اسلامی کا مرکز بننا تھا مگر ان کو سیاسی مرکز بنانے کی کوشش میں مسجد کی یہ دینی حیثیت ہم سے چھن گئی ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہم کو چاہئے کہ ہم بقیہ ملکوں میں ان مساجد کو سیاست سے دور رکھیں تاکہ ان کے ساتھ وہ پیش نہ آئے جو عالم عرب کی مساجد کے ساتھ پیش آچکا ہے (حتى لا يصيب لهذه المساجد ما اصاب في العالم العربي)

ویسٹ انڈیز کے ایک صاحب نے بتایا کہ اس وقت سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی تصویر ایک دہشت پسند انسان کی تصویر بن گئی ہے۔ انھوں نے کہا کہ ایک بار میری ملاقات ایک عیسائی عالم سے ہوئی۔ اس نے ان کی داڑھی اور ٹوپی کو دیکھ کر سمجھا کہ یہ مسلمان ہیں۔ اس کے بعد دونوں کے درمیان جو گفتگو ہوئی اس کا ایک حصہ یہ تھا:

Are you a Muslim ?
Yes.
Then you are a terrorist.

یہاں کے دوران قیام میں کئی بار عربوں کی مجالس کو خطاب کرنے کا موقع ملا۔ میں نے اسلام کے مختلف فکری پہلوؤں پر اظہار خیال کیا۔ ایک مجلس میں میں نے اس بات کی وضاحت کی کہ موجودہ زمانہ میں جہاد کا غلط مفہوم لے لیا گیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمان غیر ضروری طور پر دوسروں سے اور خود اپنے حکمرانوں سے ٹکراؤ کر رہے ہیں، اور اس کی وجہ سے نہایت قیمتی وسائل اور مواقع برباد ہو رہے ہیں۔

ایک مجلس میں میں نے صلح حدیبیہ کی حکمت کے بارہ میں تفصیل کے ساتھ اظہار خیال کیا۔ میری عربی اگرچہ ہندستانی عربی تھی مگر وہ لوگ بے حد غور کے ساتھ سنتے رہے۔ انھوں نے کہا کہ ہندستانی ہونے کے باوجود آپ کی زبان ہم کو پسند ہے، کیوں کہ وہ محدّد اسلوب میں ہوتی ہے اور پوری طرح سمجھ میں آجاتی ہے۔ صلح حدیبیہ کی حکمت بیان کرتے ہوئے میں نے کہا:

بعد ما تم صلح الحديبية نزلت سورة الفتح وجاء فيها ويهديك صراطاً مستقيماً فكأنّ هذا الصلح كان هادياً ابديا لكيفية معاملة الاعداء كي نحقق النصر عليهم۔ ثم انظر كيف كان صلح الحديبية۔ كان على شروط قريش۔ فهذا الصلح ما حصل الّا بعد ما رضي صلى الله عليه وسلم على شرط أعدائه بطرف واحد۔ وبتعبير آخر، رضي الرسول صلى الله عليه وسلم بالهزيمة فجاءه الفتح العظيم۔ فهذا هو سر النجاح في هذا العالم، وفي العصر الحاضر نرى جماعات وشخصيات كثيرة قامت من اجل الاسلام ولكنهم فشلوا في ادراك النجاح حتى بعد مئات السنين۔ والسبب واحد۔ فهم يريدون

ان يتعاملوا مع الاعداء على شروطهم فلم يتحقق لهم النجاح۔ و لو رضوا على شرط الطرف الآخر لَتَمَّ لهم النجاح و لتحقق مستقبل جديد للاسلام فی هذا القرن۔

ان لوگوں نے مختلف قسم کے سوالات کئے جن کا جواب میں اپنی عربی میں دیتا رہا۔ مثلاً ایک مجلس میں ایک عرب نے سوال کیا کہ اسم اعظم کیا ہے۔ اس کے جواب میں میں نے کہا:

ان الاسم الاعظم هو بمعنی النعت الاعظم او الحمد الاعظم۔ فهو صفة للمعرفة لا صفة للفظ۔ ان الانسان حين يدرك ربه بعظمته وجلاله فتخرج من اعماق روحه كلمات فيها انوار لعظمة الله تعالى، فذالك هو الاسم الاعظم۔ فليس هناك لفظ واحد بعينه الذى هو اسم اعظم بصفة مطلقة بل لكل واحد منا لفظ و لكل واحد منا اسم اعظم۔ فالاسم الاعظم هو اسم معنوی لا اسم لفظی۔

ایک عرب عالم نے "عبادت" کی سیاسی تشریح کی۔ انھوں نے کہا کہ عبادت کا مطلب تذلل اور خضوع نہیں بلکہ اس کا مطلب خلافت ارض کے لئے انسان کو تیار کرنا ہے (تهيئة الانسان و اعداده للخلافة فی الارض) اپنے اس نقطۂ نظر کے حق میں انھوں نے لسانیات سے استدلال کیا۔ میں نے کہا:

العلم باللغة العربية وحدها لا يكفی۔ و اوضح مثال على ذالك انه يروى ان عتبة بن ربيعة اتی رسول الله صلی الله عليه وسلم وسأله عن دينه۔ فقرأ عليه الرسول جزءًا من القرآن۔ فلما رجع الى قومه اخبرهم انه جاء من محمد و سمعه يقرأ القرآن ولكن ما فهمت شيئاً مما قاله غير انه ينذركم صاعقة مثل صاعقة عاد و ثمود۔ قالوا ويلك يكلمك الرجل بالعربية لا تدری ما قال۔ قال لا والله ما فهمت شيئاً مما قال غير ذكر الصاعقة۔ ان هذا العربی لم يفهم القرآن رغم انه كان باللغة العربية۔ لانه كانت عنده العقلية اللغوية و لم تكن عنده العقلية الدينيا

فالعقلية اللغوية وحدها لاتكفي۔

اسی طرح کچھ عرب نوجوانوں کے سامنے میں نے حضرت عمرؓ کے ایک قول کی تشریح کی جس سے انھوں نے پوری طرح اتفاق کیا۔ وہ قول یہ ہے: ليس العاقل الذي يعرف الخير من الشر ولكنه الذي يعرف خير الشرين (عقل مند وہ نہیں ہے جو خیر اور شر کو جانے۔ عقلمند وہ ہے جو یہ جانے کہ دو شر میں سے خیر کون سا ہے)

میں نے کہا کہ زندگی میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ انتخاب (Choice) خیر اور شر کے درمیان نہیں ہوتا بلکہ ایک شر اور دوسرے شر کے درمیان ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں آدمی کو ایک کم تر شر پر راضی ہونا پڑتا ہے تاکہ وہ اس کو اختیار کر کے خیر کامل تک پہنچ سکے۔

اس کی ایک مثال حدیبیہ کا واقعہ ہے۔ حدیبیہ کے موقع پر جو انتخاب تھا وہ عمرہ ادا کرنے اور عمرہ ادا نہ کرنے کے درمیان نہیں تھا بلکہ عمرہ ادا نہ کرنے اور لڑ کر ہلاک ہو جانے کے درمیان تھا۔ آپ نے اس کو اہون سمجھا کہ وقتی طور پر عمرہ کی ادائیگی پر اصرار نہ کیا جائے تاکہ آئندہ ہمیشہ کے لئے عمرہ اور حج کی ادائیگی کا دروازہ کھل سکے۔

الاخوان المسلمون کے لئے مصر میں اور جماعت اسلامی کے لئے پاکستان میں اسی قسم کے حالات تھے۔ انھیں ابتداءً کم تر شر پر راضی ہونا تھا تاکہ آخر کار وہ خیر برتر تک پہنچ سکیں۔ مگر وہ اس راز کو سمجھ نہ سکے۔ اگر وہ اس پیغمبرانہ نہج پر کام کرتے تو یقیناً آج مصر اور پاکستان کی تاریخ دوسری ہوتی۔

ایک مرتبہ میں نے اندازہ کرنا چاہا کہ عرب نوجوان اس فکر کو کتنا سمجھے ہیں۔ چنانچہ میں نے عرب نوجوانوں کی ایک جماعت سے سوال کیا:

هل منكم من يفسر هذا القول: الذي سيجري على الكافر في الآخرة يجري على المؤمن في هذه الدنيا (کیا آپ میں سے کوئی ہے جو میرے اس قول کی تشریح کرے: جو کچھ کافر پر آخرت میں گزرے گا وہ مومن پر اسی دنیا میں گزر جاتا ہے)

مجھے یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کہ انھوں نے سوال کی گہرائی کو پوری طرح سمجھ لیا اور بالکل درست طور پر اس کا جواب دیا۔

یہاں عرب نوجوانوں کی کافی بڑی تعداد ہے جو اسلامی مرکز سے بخوبی واقف ہے اور اس دینی فکر سے بہت قریب ہے جو اسلامی مرکز کے تحت سامنے لایا جارہا ہے۔ چند سفروں میں وہ لوگ مجھ سے زبانی طور پر اس مشن کے بارہ میں سنتے رہے ہیں۔ اور اب خدا کے فضل سے وہ اس مشن سے بہت قریب آچکے ہیں۔

ایک عرب نوجوان جو انجینئر ہیں، انھوں نے تاثرات بیان کرتے ہوئے اپنے اور اپنے ساتھیوں کے بارہ میں یہ الفاظ کہے:

إننا نشعر اننا كنّا في ظلام، لا نعرف اين نسير. وعندما عرفنا الفكرة وعرفنا صاحب هذه الفكرة شعرنا كاننا خرجنا الى النور والهداية وكأننا وُلِدنا من جديد. هذا واحد في المأة من الشعور الحقيقي الاصلي، لاننا لا نعرف كيف نعبّر عن هذه الحقيقة التي نجدها في قلوبنا۔

۱۶ جون ۱۹۸۷ کی صبح کو عرب طلبہ کی ایک جماعت میرے کمرہ میں آگئی۔ ان سے مختلف اسلامی موضوعات پر گفت گو ہوئی۔ اس گفتگو کے دوران میں نے کہا کہ سنت میں ہر قسم کی رہنمائی موجود ہے۔ مگر نقص مطالعہ کی وجہ سے ہم سنت سے رہنمائی حاصل نہیں کر پاتے۔

میں نے کہا کہ مثال کے طور پر ایک حدیث ہے۔ اُمِرتُ بقرية تأكل القرىٰ يقولون يثرب وهي المدينة (مجھے ایک بستی کا حکم دیا گیا ہے جو تمام بستیوں کو کھا جائے گی۔ لوگ اس کو یثرب کہتے ہیں اور وہ مدینہ ہے) آپ حدیث کی کتابیں پڑھیں تو یہ حدیث آپ کو "فضائل مدینہ" کے باب کے تحت لکھی ہوئی ملے گی۔ چنانچہ پڑھنے والا جب اس کو پڑھتا ہے تو وہ اس کو مدینہ نامی ایک بستی کی فضیلت کے خانہ میں ڈال کر آگے بڑھ جاتا ہے۔ حالانکہ گہرائی کے ساتھ غور کیجئے تو اس حدیث میں دعوت اسلامی کا منہاج بتایا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ "مکہ" میں اگر کام کے مواقع نہ مل رہے ہوں تو "مدینہ" کو اپنے کام کا مرکز بناؤ۔ کیوں کہ مدینہ کے راستہ سے تم مکہ تک بلکہ تمام بستیوں تک پہنچ سکتے ہو۔

اس سلسلہ میں میں نے سید جمال الدین افغانی کی مثال دی۔ جس زمانہ میں وہ پیرس میں

تھے اور العروۃ الوثقی کے نام سے ایک سیاسی اور احتجاجی پرچہ نکال رہے تھے، انھوں نے اپنے شاگرد مفتی محمد عبدہ سے کہا کہ یورپ کے مقابلہ میں امریکہ میں اسلامی دعوت کی کامیابی کے بہت زیادہ مواقع ہیں۔ یورپ چونکہ صلیبی لڑائیوں میں براہ راست شریک تھا، اس کے یہاں اسلام اور مسلمانوں سے نفرت پائی جاتی ہے۔ مگر امریکی قوم اس قسم کی نفسیات سے خالی ہے۔ اس لئے امریکہ میں اگر تبلیغ کا کام کیا جائے تو ان کے اندر تیزی سے اسلام پھیلے گا۔ شیخ محمد عبدہ نے کہا کہ پھر کیوں نہ ہم موجودہ سیاسی کام چھوڑ دیں اور امریکہ جا کر دینی تبلیغ کا کام کریں۔ مگر جمال الدین افغانی کو یہ کام چھوٹا کام نظر آیا۔ انھوں نے کہا: انما انت مثبط۔

جمال الدین افغانی کے لئے امریکہ گویا "مدینہ" تھا۔ وہ امریکیوں میں دعوتی کام کر کے بالآخر غیر امریکیوں کو بھی اپنے دائرۂ اثر میں لا سکتے تھے۔ مگر انھوں نے اس راز کو نہیں سمجھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے امریکیوں کو بھی کھویا اور غیر امریکیوں کو بھی۔

اپنے ذوق کے اعتبار سے سفر میرے لئے نہایت وحشت خیز ہوتا ہے۔ میں صرف اس لئے سفر کرتا ہوں کہ سفر کے دوران جو تجربات ہوتے ہیں ان کا حصول کسی اور طریقہ سے ممکن نہیں۔ اپنے ہوٹل کے کمرہ میں میں اپنے تجربات کو اپنی یادوں کی دنیا میں سمیٹ رہا تھا اس وقت میرے ذہن میں یہ سوال آیا کہ اگر کوئی شخص مجھ سے پوچھے کہ تمہارے اس سفر کے تجربات کا آخری خلاصہ کیا ہے تو میں کیا کہوں گا۔ یہ سوچتے ہوئے یہ فقرہ میری زبان پر آگیا ——— کامل انسان وہ ہے جو اپنے کو غیر کامل سمجھے، جو بڑا ہونے کے باوجود اپنے آپ کو چھوٹا بنا لے۔ اور یہ حقیقتہً ہو نہ کہ اظہار خاکساری کے طور پر۔

واپسی روم کے راستہ سے ہوئی۔ الیتالیا کے جہاز کے ذریعہ ۲۰ جون کی سہ پہر کو روم پہنچا۔ یہاں ہوائی اڈہ کے پسنجر سروس پر میں نے اپنا ٹکٹ دکھایا اور معلوم کیا کہ ایر انڈیا کا بورڈنگ پاس لینے کے لئے مجھے کہاں جانا چاہئے۔ کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے اطالوی آدمی نے کمپوٹر پر انگلیاں ماریں اور کہا کہ "گیٹ نمبر ۱۴۱"۔ وسیع ہوائی اڈہ کے مختلف حصوں سے گزرتا ہوا میں گیٹ نمبر ۱۴۱ پر پہنچا تو وہاں کاؤنٹر پر ایک خاتون بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کو میں نے اپنا ٹکٹ دیا۔ اس نے دوبارہ کمپوٹر پر اپنی انگلیاں ماریں اور اس کے نقوش کو دیکھ کر بتایا کہ آپ گیٹ نمبر ۱۴ پر جائیں۔

اب دوبارہ نیچے اس سرے سے اس سرے کا سفر کرنا پڑا۔

خاتون کی اطلاع درست تھی۔ اس نے ۴۱ کو ۱۴ پڑھا۔ جب کہ مرد نے ۴۱ کو ۴۱ پڑھ لیا۔ اس دنیا میں وہی رہنما سچا رہنما ہے جو ۴۱ کو ۴۱ پڑھے۔ جو رہنما ۴۱ کو ۱۴ پڑھ لے وہ لوگوں کو بھٹکانے کے سوا کوئی اور خدمت انجام نہیں دے سکتا۔

گیٹ ۴۱ پر میں نے اپنا ٹکٹ دیا تو اس نے اکانومی کلاس کا بورڈنگ کارڈ دیدیا حالانکہ میرا ٹکٹ اوپر کے درجہ کا تھا۔ دریافت کرنے پر اس نے بتایا کہ اوپر کے درجہ میں آپ کا نام ویٹنگ لسٹ میں تھا، چوں کہ اس میں سیٹ خالی نہیں ہے اس لئے اگر آپ اس جہاز سے سفر کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو اکانومی کلاس میں جانا ہوگا۔ میں بورڈنگ پاس لے کر انتظار گاہ میں بیٹھ گیا اور یہ سوچکر مطمئن ہوگیا کہ دونوں درجہ کے مسافر ایک ہی وقت میں منزل پر پہنچیں گے، پھر اس کے لئے پریشان ہونے کی کیا ضرورت۔

انتظار گاہ میں میرے قریب ایک اور صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔ گفت گو کے بعد معلوم ہوا کہ وہ ایک جرمن انجنیر ہیں اور ٹکنکل تعاون کے تحت ہندستان جارہے ہیں:

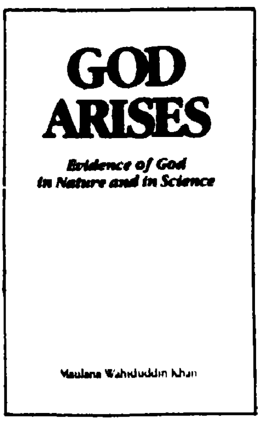
Gunter Gentzsch, Ingenieur
DDR-6530 Hermsdorf, Thur. Telefon: 510

ان سے گفت گو ہونے لگی۔ میں نے پوچھا کہ آپ خدا کو مانتے ہیں۔ انھوں نے کہا نہیں۔ میرے والدین خدا و مذہب کو مانتے ہیں، مگر میں نہیں مانتا۔ میں نے پوچھا پھر آپ کس چیز پر عقیدہ رکھتے ہیں انھوں نے کہا عوام (People) پر۔ انھوں نے کہا کہ اصل اہمیت کی چیز انسانیت ہے نہ کہ مذہب۔ اس طرح کی گفتگو دیر تک ہوتی رہی۔

اتفاق سے ان کا کیس بھی وہی تھا جو میرا تھا۔ یعنی ان کا ٹکٹ بھی اوپر کے درجہ کا تھا مگر ریزرویشن کے وقت ان کا نام ویٹنگ لسٹ میں تھا۔ چنانچہ سیٹ نہ ہونے کی بنا پر ان کو اکانومی کلاس کا بورڈنگ پاس دیا گیا تھا۔ ہم لوگ انتظار میں بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے کہ اتنے میں ایر انڈیا کا ایک نمائندہ آیا۔ اس نے کہا کہ اوپر کے درجہ میں صرف ایک سیٹ ہے۔ اب آپ دونوں فیصلہ کرلیں۔ میں نے کہا کہ آپ (جرمن انجنیر) ہمارے ملک میں

بطور مہمان جارہے ہیں اس لئے ان کا حق مقدم ہے۔ مگر میرے اصرار کے باوجود وہ سیٹ لینے پر راضی نہ ہوئے۔ انھوں نے کہا کہ میں ایک "ینگ" آدمی ہوں اور آپ "اولڈ" آدمی ہیں اس لئے آپ کا حق پہلے ہے۔ آخر کار انھوں نے میرا بورڈنگ پاس بدلوا کر اس کو اوپر کے درجہ کے لئے کرادیا۔

۲۱ جون ۱۹۸۶ کی صبح کو میں واپس دہلی پہنچا۔



God Arises
by Maulana Wahiduddin Khan

This English edition of *Mazhab Aur Jadeed Challenge*, is an updated version, incorporating considerable additional material.

It has also been translated into a number of other languages, including Arabic, French, Turkish, Malay, Serbo-Croatian (Yugoslavian), Sindhi, Tamil, etc., and has come to be accepted as standard work on the Islamic position vis-a-vis modern thought.

Pages 265 ISBN 81-85063-14-1 81-85063-17-6 Price Rs. 45

THE ISLAMIC CENTRE
C-29 Nizamuddin West New Delhi - 110 013

الرسالہ اور اسلامی مرکز کی کتابوں کے لیے حیدرآباد میں بک اسٹال

زیر اہتمام: الرسالہ اکیڈمی، حیدرآباد

اسٹال نمبر ۱، ۴، ۲، ۴۔ نمائش میدان، قرب منی ریلوے اسٹیشن، حیدرآباد

ایک مثال

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا زمانہ تیرھویں صدی قبل مسیح کا زمانہ ہے۔ آپ کی پرورش قدیم مصر کی راجدھانی ممفس (Memphis) میں ہوئی۔ اس زمانہ میں مصر میں دو قومیں آباد تھیں۔ ایک قبطی جو ملک کا اکثریتی فرقہ تھا۔ فرعون اسی فرقہ کا ایک فرد تھا جس کا خاندان اس زمانہ میں مصر میں حکومت کر رہا تھا۔ دوسرا فرقہ وہ تھا جس کو بنی اسرائیل (یہود) کہا جاتا ہے۔ یہ فرقہ نہ صرف اقلیت میں تھا بلکہ حکمراں اکثریتی فرقہ اس کو زبردست ظلم وستم کا نشانہ بنائے ہوئے تھا۔ وہ مصر میں پست طبقہ کی حیثیت رکھتے تھے اور محنت مزدوری کے ذریعہ اپنی روزی حاصل کرتے تھے۔ مزید یہ کہ اگر بنی اسرائیل میں کوئی نوجوان اعلیٰ صلاحیت کا نظر آتا تو فرعون (شاہِ مصر) اس کو قتل کرا دیتا تاکہ وہ بنی اسرائیل کا قائد بن کر حکمراں طبقہ کے لیے کوئی مسئلہ نہ کھڑا کرے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اگرچہ اسرائیلی فرقہ سے تعلق رکھتے تھے، مگر اللہ تعالیٰ نے ایسے حالات پیدا فرمائے کہ آپ کی پرورش شاہ مصر (فرعون) کے محل میں ہوئی۔ جب آپ بڑے ہوئے تو آپ کو اپنی قوم (بنی اسرائیل) کا حال معلوم ہوا۔ غالباً ۲۵ سال کی عمر تھی۔ ایک روز آپ شہر میں نکلے تو آپ نے یہ منظر دیکھا کہ دو آدمی ایک دوسرے سے لڑ رہے ہیں۔ ان میں سے ایک قبطی تھا اور دوسرا اسرائیلی۔ اسرائیلی نے حضرت موسیٰ کو اپنی قوم کا ایک فرد سمجھ کر اپنی مدد کے لیے پکارا۔ اس نے قبطی کو ظالم اور اپنے آپ کو مظلوم بتایا۔ حضرت موسیٰ نے اسرائیلی کی حمایت میں قبطی کو ایک گھونسہ مارا۔ آپ کا مقصد محض قبطی کا دفاع تھا، مگر گھونسہ ایسے مقام پر لگا کہ وہ قبطی مر گیا۔

قبطی نے اسرائیلی کو قتل نہیں کیا تھا، اس لیے اس کو قتل کرنا انصاف کے خلاف تھا۔ چنانچہ حضرت موسیٰ کو فوراً اپنی لغزش کا احساس ہوا۔ آپ نے کہا کہ یہ تو ایک شیطانی کام ہوگیا۔ شیطان انسان کو بہکا کر غلط کام کرواتا ہے۔ انھوں نے اللہ تعالیٰ سے معافی کی درخواست کی تو اللہ تعالیٰ نے ان کو ان کی نادانستہ غلطی پر معاف کر دیا۔ (القصص ۱۵-۱۶)

اس وقت آپ نے جو دعا کی اس میں آپ کی زبان سے یہ الفاظ بھی نکلے:

رب بما انعمت علیّ فلن اکون ظهیرا للمجرمین (القصص)

اے میرے رب، جیسا تونے مجھ پر فضل فرمایا تو اب کبھی میں مجرموں کا مددگار نہ بنوں گا۔

چنانچہ اگلے دن جب حضرت موسیٰ دوبارہ شہر کی طرف نکلے تو آپ نے دیکھا کہ وہی اسرائیلی دوبارہ ایک اور قبطی سے لڑ رہا ہے۔ اس نے دوبارہ آپ کو مدد کے لیے پکارا۔ مگر اس کی بار بار کی لڑائی سے آپ نے یہ سمجھا کہ یہ شخص خود ہی غلط کار ہے اور وہ غیر ضروری طور پر دوسروں سے لڑتا رہتا ہے۔ چنانچہ آپ نے کہا کہ تم خود ایک کھلے ہوئے شریر آدمی ہو۔ یہ اسرائیلی اگرچہ آپ کی اپنی قوم کا آدمی تھا، مگر آپ نے دوبارہ اس کی مدد نہیں کی۔ جب آپ نے اس کی مدد نہیں کی تو اس اسرائیلی نے کل کے دن کا راز کھول دیا جو ابھی تک چھپا ہوا تھا۔ اس نے شور کر دیا کہ وہ موسیٰ ہی ہیں جنھوں نے کل کے دن اسی مقام پر ایک قبطی کو گھونسا مار کر ہلاک کر دیا تھا۔ اسرائیلی کے اس فعل نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ ایک کمینہ شخص ہے۔ کیوں کہ ایک کمینہ شخص ہی ایسا کر سکتا ہے کہ ایک ذاتی اختلاف پیش آنے کی بنا پر کسی کے نازک راز کو عوام کے سامنے کھولنے لگے۔

جب قتل کا راز کھل گیا تو مصر کے حکمراں گروہ نے آپ کو پکڑنا چاہا تاکہ آپ سے قبطی کے قتل کا انتقام لے۔ مگر آپ خاموشی کے ساتھ ممفس سے نکل کر مدین کی طرف روانہ ہو گیے۔ (القصص)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ واقعہ جو قرآن میں نقل کیا گیا ہے، اس میں ہندستان کے موجودہ فرقہ وارانہ فسادات کے سلسلہ میں نہایت اہم رہنمائی ملتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مومنانہ طریقہ یہ ہے کہ آدمی مجرم کا مددگار نہ بنے۔

ہندستان کے موجودہ حالات یہ ہیں کہ مسلمان یہاں اقلیت میں ہیں۔ وہ مختلف پہلوؤں سے اکثریتی فرقہ کے مقابلہ میں دبے ہوئے ہیں۔ اس بنا پر اکثر مسلم رہنما یہ فرض کر لیتے ہیں کہ یہاں کے فرقہ وارانہ جھگڑوں میں کبھی مسلمانوں کا قصور نہیں ہو سکتا۔ کیوں کہ کمزور فریق ہونے کی بنا پر وہ فریق ثانی سے لڑ کر جیت نہیں سکتے۔ مگر یہ مفروضہ غلط ہے۔ قرآن کی شہادت کے مطابق بنی اسرائیل نسبتاً زیادہ مغلوب ہونے کے باوجود مصر میں "مجرم" بن گیے۔ پھر مسلمان اس سے کمتر درجہ کی مغلوبیت کے باوجود یہاں مجرم کیوں نہیں بن سکتے۔

خبرنامہ اسلامی مرکز — ۴۷

۱۔ رابطۃ الجامعات الاسلامیہ (ریاض) نے حال میں صدر اسلامی مرکز کی دو کتابوں (حقیقت حج اور مارکسزم) کا عربی ترجمہ شائع کیا ہے۔ ان کتابوں کے عربی نام یہ ہیں (۱) حقيقة الحج (۲) سقوط الماركسية۔ پہلی کتاب بڑے سائز کے ۱۲۰ صفحات پر مشتمل ہے، اور دوسری کتاب ۷۲ صفحات پر۔

۲۔ نئی دہلی (پیشوا روڈ) پر ۱۴ نومبر ۱۹۸۷ کو ایک اجتماع ہوا۔ اس میں جدید تعلیم یافتہ مسلمان شریک ہوئے۔ صدر اسلامی مرکز نے "جدید دعوتی امکانات" کے موضوع پر ایک تقریر کی۔ صدر اسلامی مرکز نے بتایا کہ جدید سائنسی اور صنعتی ترقیاں اسلامی انقلاب کی ضمنی پیداوار ہیں۔ اس انقلاب سے جہاں مادی ترقیاں ظہور میں آئیں اسی طرح نہایت دور رس نوعیت کے نئے دعوتی امکانات پیدا ہوئے۔

۳۔ قرآن ہندی سوسائٹی آف انڈیا کے زیر اہتمام بھوپال میں ایک سہ روزہ اجتماع ہو اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس اجتماع میں شرکت کی اور ۲۹ نومبر ۷ کی نشست میں "قرآن کا عالمی پیغام" کے عنوان پر مفصل تقریر کی۔

۴۔ سید قاسم صاحب (بڑودہ) نے اپنے خط مورخہ ۱۰ دسمبر ۱۹۸۷ میں اطلاع دی کہ وہ الرسالہ کے بعض مضامین گجراتی زبان میں ترجمہ کرکے لوگوں کے درمیان تقسیم کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے لیے انھیں اجازت دے دی گئی ہے۔

۵۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے زیر اہتمام ۱۵ — ۱۷ جنوری ۱۹۸۶ کو ایک کانفرنس ہو اس کا موضوع تھا، سائنس ایجوکیشن ان دی کنٹری، اس موقع پر مختلف اہل اپنے مقالات پیش کیے تھے۔ ان مقالات کا مجموعہ یونیورسٹی کی طرف سے شائع ہے۔ اس میں صدر اسلامی مرکز کا سات صفحات کا وہ مقالہ بھی شامل ہے جو م نے اس موقع کے لیے لکھا تھا۔ اس مقالہ کا عنوان ہے:

Muslims and the Science Education

۶۔ اسلامی مرکز اور ایک عالمی عیسائی ادارہ کے تعاون کے تحت مسٹر عرفان انیس نے

کے مختلف ملکوں کا سفر کیا۔ اولاً انھوں نے پرتگال (لزبن) میں ہونے والی آل مذاہب کانفرنس میں شرکت کی۔ اس میں تمام مذاہب کے نوجوان لوگ شریک ہوئے تھے۔ مسٹر عرفان انیس اپنے ساتھ الرسالہ انگریزی اور اسلامی مرکز کی انگریزی کتابیں لے گیے تھے۔ ان کو انھوں نے وہاں کے شرکار کو دیا۔ کانفرنس کے پروجکٹ ڈائرکٹر مسٹر گوری ینگ (Gary Young) اور سرپرست جارج ایمری (George Emery) کو بھی الرسالہ انگریزی کی کاپیاں دیں۔ نائجیریا کی ایک مسلم خاتون (فوزیہ کرومی) جو خود بھی ایک انگریزی رسالہ کی ایڈیٹر ہیں۔ انھوں نے الرسالہ کو پسند کرتے ہوئے اس کے مضامین کو اپنے رسالہ میں نقل کرنے کی اجازت حاصل کی۔ جاپانی نومسلم یوسف فوکوئی کو بھی کتابیں دیں۔ مسٹر انیس کانفرنس کے بعد میڈرڈ، لندن، پیرس، ہیم برگ (جرمنی) وغیرہ گیے۔ ہر جگہ انھوں نے مختلف لوگوں سے ملاقاتیں کرکے اسلامی مرکز کا تعارف کرایا اور انگریزی کتابیں اور الرسالہ (انگریزی) انھیں دیا۔

۷۔ عربی زبان میں اسلامی مرکز کی تقریباً ۲۰ کتابوں کے ترجمے شائع ہو چکے ہیں۔ عرب علمار عام طور پر اپنی تقریروں اور تحریروں میں ان کا ذکر کرتے ہیں اور ان کے جدید اسلوب کی بنا پر عرب نوجوانوں کو ان کے مطالعہ کا مشورہ دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر مشہور عرب عالم دکتور یوسف القرضاوی نے اپنی عربی کتاب ثقافة الداعية میں چار عنوانات کے تحت کچھ قابل مطالعہ منتخب کتابوں کی فہرست دی ہے۔ اس میں انھوں نے پہلے عنوان (فی مجال العقيدة والاسس الفكرية) کے تحت صدر اسلامی مرکز کی کتاب الاسلام يتحدىٰ کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیا ہے (صفحہ ۹۹)

۸۔ کویت کے ہفتہ وار عربی جریدہ البلاغ (۱۵ ربیع الآخر ۱۴۰۸ھ مطابق ۶ دسمبر ۱۹۸۷) نے صدر اسلامی مرکز کا ایک انٹرویو اس عنوان کے ساتھ شائع کیا ہے: لقاء مع المفكر الاسلامى وحيد الدّين خان۔ انٹرویو لینے والے ایک فلسطینی عالم ہیں جن کا نام محمد یاسر القضمانی ہے۔

۹۔ برابر اطلاعات مل رہی ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قارئین الرسالہ میں ایک رجحان

یہ پیدا ہوا ہے کہ مرکز کی مطبوعات لوگوں کو تحفہ میں دیں۔ مثلاً دہلی کے ایک صاحب نے حال میں اپنی لڑکی کی شادی کی تو لڑکی کو تحفہ میں "خاتون اسلام" دی اور داماد کو تحفہ میں "پرافٹ آف ریولیوشن" عطا کیا۔

۱۰۔ الرسالہ خدا کے فضل سے حیرت انگیز طور پر لوگوں کے درمیان نفوذ کر رہا ہے۔ اس کی مثالیں روزانہ مختلف صورتوں میں سامنے آتی رہتی ہیں۔ ایک خاتون لکھتی ہیں: آپ کا الرسالہ بغور پڑھتی ہوں، بار بار پڑھتی ہوں۔ پھر بھی دل کی تشنگی باقی رہتی ہے۔ اب تک میں رسالہ دوسروں سے مانگ کر پڑھ رہی تھی۔ اب میں چاہتی ہوں کہ جو رسالہ میں بار بار پڑھنا چاہتی ہوں اور جس سے ہر بار ایک نیا نقطۂ نظر میرے سامنے آتا ہے اور عقل حیران رہ جاتی ہے کہ آپ کے لکھنے کا انداز کیسا نرالا اور اچھوتا ہے۔ خدا آپ کی عمر دراز کرے مجھے الرسالہ کا ممبر بنا لیجئے۔ میں یہ رسالہ اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں چاہتی ہوں اور اس کے لیے ڈرافٹ بھیج رہی ہوں (مسز خورشید عباس، پونہ)

۱۱۔ دلشاد گارڈن (دہلی ۳۲) میں ۲۶ دسمبر ۱۹۸۷ کو سیرۃ النبی کا ایک جلسہ ہوا۔ اس میں تعلیم یافتہ مسلمان اور ہندو شریک ہوئے۔ صدر اسلامی مرکز نے اس موقع پر ایک گھنٹہ تقریر کی۔ تقریر کا موضوع تھا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کی روشنی میں انسانی کامیابی کا راز۔ منتظمین نے اس موقع پر الرسالہ انگریزی اکتوبر ۱۹۸۷ صفحہ ۱۰ کے مضمون کی فوٹو کاپیاں تیار کر کے لوگوں کے درمیان تقسیم کیا۔ ایک صاحب نے کہا کہ الرسالہ نے ہمارے کام کو بہت آسان کر دیا۔ کیوں کہ ہم ایک صفحہ کا کوئی بامعنی انگریزی مضمون شائع کر کے تقسیم کرنا چاہتے تھے۔ ایسا مضمون ہم کو کہیں اور سے نہیں مل سکتا تھا۔ وہ ہم کو انگریزی الرسالہ میں بآسانی مل گیا۔

۱۲۔ مالدیپ میں ۷-۱۱ دسمبر ۱۹۸۷ کو ایک انٹرنیشنل اسلامک کانفرنس ہوئی۔ صدر اسلامی مرکز نے کانفرنس کی دعوت پر اس میں شرکت کی۔ اس سفر کی مفصل روداد انشاء اللہ الرسالہ میں شائع کر دی جائے گی۔

۱۳۔ الرسالہ کی یہ انوکھی صفت ہے کہ جو شخص اس کو ایک بار دیکھ لیتا ہے وہ اس کا گرویدہ

ہو جاتا ہے۔ حتیٰ کہ الرسالہ کا مخالف بھی اس کو پڑھے بغیر نہیں رہتا۔ اس کی مثالیں مختلف صورتوں میں بار بار سامنے آتی رہتی ہیں۔ جناب عبدالحمید عمر بھائی اپنے خط (۵ نومبر ۱۹۸۷) میں لکھتے ہیں: بہت سے رسالے نکلتے ہیں اور ان کو دیکھنے کا موقع ملتا ہے۔ مگر اسلامی مرکز کا الرسالہ ابتک نظر سے نہیں گزرا تھا اور ہمارے بھاونگر (گجرات) میں شاید کوئی اس کو جانتا بھی نہیں۔ حسن اتفاق سے احمد آباد کے ایک صاحب کے پاس الرسالہ دستیاب ہو گیا اور مطالعہ کیا اور اپنے مدرسہ کے صدر مدرس مولانا امانت اللہ قاسمی کو دیا۔ مطالعہ کے بعد ہم دونوں کو الرسالہ کی کشش نے بیتاب کر دیا اور الرسالہ منگوانے کا داعیہ پیدا ہوا۔ الرسالہ اور تذکیر القرآن کے لیے دو منی آرڈر روانہ ہے۔

۱۱۔ ایک صاحب لکھتے ہیں: میرے اندر غصہ پن اور کسی بھی بات کو اپنے مزاج کے خلاف پانے کے بعد بالکل آپے سے باہر ہو جانے کا مزاج تھا۔ لیکن آپ کی کتابیں پڑھنے کے بعد میرے اندر زبردست تبدیلی آئی جس کو گھر والے اور احباب بھی محسوس کرتے ہیں۔ میرے والد جو تبلیغی جماعت سے تعلق رکھتے ہیں، آپ کی کتابوں کے بڑے مداح ہیں اور بڑے شوق سے پڑھتے ہیں۔ ابھی میں "اللہ اکبر" لے کر بیٹھا ہوں۔ رہ رہ کر آپ کا تصور ذہن میں آرہا تھا۔ کتاب کا ہر صفحہ پڑھنے کے بعد آپ کے لیے ایک دعا ضرور کرتا ہوں۔ اسی طرح نمازوں کے بعد دعا میں بھی آپ کے لیے دعائے خیر ضرور کرتا ہوں۔ یہاں کچھ لوگوں سے میرا کبھی کبھی الجھاؤ ہو جاتا ہے۔ اور موضوع بحث آپ کی تصانیف ہوا کرتی ہیں۔ جب تک وہ اپنی باتوں کو دلیل سے پیش کرتے ہیں میں بھی دلیل سے ان کی تردید کرتا ہوں۔ مگر جب وہ بغیر دلیل بحث کرتے ہیں تو میں خاموش ہو جاتا ہوں، کیوں کہ آپ کی کتابوں میں میں نے یہی پڑھا ہے۔ بہر حال حقیقت اپنا لوہا منوا لیتی ہے۔ اب وہ بھی نرم پڑ رہے ہیں۔ نومبر کے شمارہ میں "آزمودہ حل" پڑھ کر کئی نے تو کھل کر تائید کی اور کہا کہ اب تو الرسالہ کے نظریات سے اتفاق کرنا پڑے گا (قاری مختار احمد ملی۔ مالیگاؤں)

۱۵۔ تذکیر القرآن جلد دوم اور گاڈ ارائزز (انگریزی) چھپ کر دفتر میں آگئی ہیں۔ طالب حضرات فرمائش بھیج کر منگا سکتے ہیں۔

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴۔ صاحب استطاعت افراد کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کردیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط و کتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

زر تعاون الرسالہ

زر تعاون سالانہ	۴۸ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	۲۵۰ روپیہ

بیرونی ممالک سے

ہوائی ڈاک	۲۰ ڈالر امریکی
بحری ڈاک	۱۰ ڈالر امریکی

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی ۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

AL-RISALA

Annual Subscription Rates:

	One year	Two year
INLAND	Rs. 48	Rs. 90
ABROAD (By air mail)	US $ 25	US $ 50
(By surface mail)	US $ 10	US $ 20

SUBSCRIPTION FORM

Please send me AL-RISALA

☑ Urdu ☑ English for ☐ 1 year ☑ 2 years

Name M. I.

Address

GIFT SUBSCRIPTION

Please send AL-RISALA to my friend/relative to the following address:
☐ Urdu ☐ English for ☐ 1 year ☐ 2 years I am enclosing cheque Postal Order/Bank Draft/M.O. Receipt No.

Name

Address

Please send this together with the payment to the Circulation Manager
AL-RISALA C-29 Nizamuddin West, New Delhi 110 013 (India)

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحیدالدین خاں کے قلم سے

	Rs
تذکیر القرآن جلد اول	100/-
" جلد دوم	100/-
اللہ اکبر	40/-
پیغمبر انقلاب	30/-
مذہب اور جدید چیلنج	30/-
عظمت قرآن	25/-
الاسلام	25/-
ظہور اسلام	25/-
اسلامی زندگی	20/-
احیاء اسلام	20/-
رازِ حیات (مجلد)	45/-
صراطِ مستقیم	25/-
خاتونِ اسلام	30/-
سوشلزم اور اسلام	25/-
اسلام اور عصر حاضر	20/-
حقیقت حج	25/-
اسلامی تعلیمات	20/-
تبلیغی تحریک	15/-
تعبیر کی غلطی	35/-
دین کی سیاسی تعبیر	10/-

دین کیا ہے	3/-
قرآن کا مطلوب انسان	6/-
تجدیدِ دین	4/-
اسلام دین فطرت	4/-
تعمیرِ ملت	4/-
تاریخ کا سبق	4/-
مذہب اور سائنس	4/-
عقلیاتِ اسلام	4/-
فسادات کا مسئلہ	3/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	3/-
تعارفِ اسلام	4/-
اسلام پندرھویں صدی میں	4/-
راہیں بند نہیں	4/-
ایمانی طاقت	4/-
اتحادِ ملت	4/-
سبق آموز واقعات	4/-
زلزلۂ قیامت	4/-
حقیقت کی تلاش	4/-
پیغمبر اسلام	4/-
آخری سفر	4/-

اسلامی دعوت	4/-
خدا اور انسان	4/-
حل یہاں ہے	6/-
سچا راستہ	2/-
دینی تعلیم	4/-
حیاتِ طیبہ	4/-
باغِ جنت	4/-
نارِ جہنم	4/-

God Arises	Rs. 45/-
Muhammad The Prophet of Revolution	50/-
Religion and Science	35/-
Tabligh Movement	20/-
The Way to Find God	4/-
The Teachings of Islam	5/-
The Good Life	5/-
The Garden of Paradise	5/-
The Fire of Hell	5/-
Muhammad The Ideal Character	4/-
Man Know Thyself !	4/-
इन्सान अपने आपको पहचान	2/-
सच्चाई की तलाश	4/-

مکتبہ الرسالہ سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۱۳

Rs. 4

2 MAR 1988

الرسالہ

ISSN 0970-180X

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

فساد صرف حکیمانہ تدبیروں سے ختم ہوتا ہے
نہ کہ فساد ختم کرو کا مطالبہ کرنے سے

مارچ ۱۹۸۸ شمارہ ۱۳۶

GOD
ARISES

Evidence of God
in Nature and in Science

Maulana Wahiduddin Khan

God Arises

By Maulana Wahiduddin Khan

This is a translation with some additions of the famous Urdu book of Maulana Wahiduddin Khan, *Mazhab Aur Jadeed Challenge*, translated into Arabic as *Al-Islam Yatahaddah*, which became a best-seller throughout the Arab world. It has also been translated into a number of other languages including Turkish, Malay, Serbo-Croatian (Yugoslavian), French, Sindhi, Tamil etc., and has come to be accepted as a standard work on the Islamic position vis-à-vis modern thought.

A Review

"... in the fourteen hundred years of Islamic history, innumerable books on Islam have appeared. There are just a few books calling mankind to God which are clearly distinguishable from the rest because of the clarity and force with which they make their appeal. Without doubt, this book is one of that kind".

— Daily AL-AHRAM (Cairo)

Pages 265 ISBN 81-85063-14-1 (Pbk)
81-85063-17-6 (Hbd) Price Rs. 45

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اردو، انگریزی میں شائع ہونے والا

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

شمارہ ۱۳۶ مارچ ۱۹۸۸

فہرست

ۃ الرسالہ، سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳ ، فون : 697333, 611128

یہ انسان

قرآن میں ارشاد ہوا ہے : " زمین و آسمان میں کتنی ہی نشانیاں ہیں جن سے لوگ گزرتے رہتے ہیں۔ مگر ان پر وہ دھیان نہیں دیتے" (یوسف ۱۰۵) جو بات ہم انسانی زبان میں کہنا چاہتے ہیں، وہ کائنات میں زیادہ بہتر طور پر خدائی زبان میں نشر ہو رہی ہے۔ پھر خدا کی آواز کو سننے کے لیے جب لوگوں کے کان بہرے ہوں تو انسان کی آواز سے وہ کیا اثر قبول کریں گے۔ جو لوگ خدا کی تحریر کو نہ پڑھ سکیں وہ انسان کی تحریر کو پڑھ کر کیا پائیں گے۔

کائنات کی وسعتوں اور عظمتوں سے زیادہ کون اس بات کا سبق دے سکتا ہے کہ انسا انتہائی طور پر ایک حقیر وجود ہے۔ عجز کے سوا کوئی اور رویہ اس کے لیے درست نہیں۔ اس کے باوجود انسان گھمنڈ کرتا ہے (اسراء۔ ۳۷)

پہاڑوں کے پتھریلے سینے سے بہہ نکلنے والے پانی کے دھارے سے بڑھ کر کون اس حقیقت بیان کر سکتا ہے کہ تم دوسروں کے لیے سیرابی اور تراوٹ کے دریا بن جاؤ۔ مگر انسان دوسرو کے لیے پتھر سے بھی زیادہ سخت ثابت ہوتا ہے (بقرہ۔ ۷۴)

زمین کے سینے پر کھڑے ہوئے تناور درختوں سے زیادہ بہتر طور پر کون اس حقیقت کا اا کر سکتا ہے کہ اپنی اجتماعی زندگی کو مضبوط بنیادوں پر قائم کرو تاکہ کوئی اس کو اکھاڑ نہ سکے اس کے باوجود لوگ وقتی جھاڑ جھنکاڑ کی مانند اپنی تعمیرات کھڑی کرتے ہیں اور پھر شکایت کر ہیں کہ فلاں نے میرے درخت کو اکھاڑ لیا (ابراہیم۔ ۲۶)

اگر لوگوں کے پاس سننے والے کان اور دیکھنے والی آنکھ ہو تو کائنات ہر آن خدائی سچائی کا اعلان کر رہی ہے۔ اور جب خدائی اعلان کو سننے کے لیے لوگوں کے کان بہرے ہو جائیں خدائی نشانیوں کو دیکھنے کے لیے لوگوں کی آنکھیں اندھی ہو چکی ہوں تو کوئی انسانی آواز انھیں فائدہ پہنچا سکتی ہے۔ اس کے بعد تو لوگوں کو ہوش میں لانے کے لیے قیامت کی چنگھاڑ کا انتظار کرنا چاہیے۔

ماضی اور حال کا فرق

پروفیسر ہولٹ (P.M. Holt) اور دوسرے مستشرقین نے اسلامی تاریخ پر ایک کتاب تیار کی ہے جو حسب ذیل نام سے چار جلدوں میں شائع ہو چکی ہے :

The Cambridge History of Islam

اس کتاب کی جلد ۲۔ بی کے ایک باب میں تفصیل کے ساتھ دکھایا گیا ہے کہ ماضی میں اسلام نے مغربی دنیا کے علوم اور تہذیب پر نہایت گہرے اثرات ڈالے۔ اس کا عنوان ہے :

Literary impact of Islam on the modern West

اس باب کے آخر میں مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ قرون وسطی کے دوران علم کا بہاؤ تقریباً تمام تر مشرق سے مغرب کی طرف تھا، جب کہ اسلام مغرب کا معلّم بنا ہوا تھا، اب موجودہ زمانہ میں صورت حال اس کے برعکس ہے، اب یہ بہاؤ مغرب سے مشرق کی طرف جاری ہے :

Whereas during the Middle Ages the trend was almost entirely from East to West (when Islam acted as the teacher of the West), in modern times the direction of influence has been reversed (pp. 888 - 89).

ماضی میں مسلمان دنیا کے معلّم تھے، موجودہ زمانہ میں وہ دنیا کے شاگرد بن گئے۔ اسی فرق میں اس سوال کا جواب چھپا ہوا ہے کہ مسلمان ماضی میں قوموں کے درمیان باعزت کیوں تھے، اور حال میں وہ قوموں کے درمیان بے عزت کیوں ہو گئے ہیں۔

موجودہ زمانہ کے مسلمان ساری دنیا میں صرف ایک کام کر رہے ہیں۔ وہ اپنی محرومی پر احتجاج کرنے میں مشغول ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا اللہ تعالیٰ نے اپنی دنیا کے قانون کو موجودہ زمانہ میں بدل دیا ہے۔ پچھلے زمانہ میں اگر یہ قانون تھا کہ دینے والا پائے، تو اب یہ قانون ہے کہ احتجاج اور مطالبہ کرنے والوں کو دیا جائے۔

اگر اللہ تعالیٰ نے اپنی دنیا کے قانون کو نہیں بدلا ہے تو مسلمانوں کا موجودہ مشغلہ صرف ان کی بربادی میں اضافہ کرنے والا ثابت ہوگا۔ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔

دو قسم کے لوگ

جسم کے اوپر کیچڑ لگ جائے تو اس کو پانی سے دھویا جاسکتا ہے۔ لیکن اگر جسم کے اندر کوئی
بی پیدا ہو جائے تو اس کو دھو کر صاف کرنا ممکن نہیں۔ یہی معاملہ دین کا بھی ہے۔ اگر
ری طور پر کسی دینی خرابی میں مبتلا ہو تو اس کے متعلق امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے درگذر
ا۔ مگر جن کے گناہوں نے جسم سے لے کر روح تک ان کا احاطہ کر لیا ہو، ان کے لیے اللہ تعالیٰ
ں معافی نہیں۔

ایک برائی وہ ہے کہ جب آدمی اس کو کرے تو اس کا دل اس کا ساتھ نہ دے۔ اس کو یہ
ستاتا رہے کہ وہ گناہ کر رہا ہے۔ اپنے اس فعل کی بنا پر اس کو خود اپنے آپ سے نفرت
،۔ وہ شرمندہ ہو کر معافی چاہے اور شیطان سے پناہ مانگتا ہوا اللہ کی طرف دوڑ پڑے۔ ایسے
اندرونی حالت اس بات کا ثبوت ہوتی ہے کہ اس کا گناہ اوپری گناہ تھا۔ وہ اس کی روح کا
تھا۔ اس کی برائی کی مثال ایسی ہے جیسے کسی کے جسم کا اندرونی نظام تو صحت مند تھا۔ البتہ اس کے
اوپر کسی وجہ سے گندگی لگ گئی۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے لیے تزکیہ کا وعدہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو پاک
گا۔ اور آخرت میں ان کو اس قابل بنا دے گا کہ وہ جنت کی پاکیزہ دنیا میں آباد ہو سکیں۔

دوسرے لوگ وہ ہیں جن کی برائی ان کے اندر تک داخل ہو گئی ہو۔ ان کے اعضاء جو کچھ کریں
کے دل و دماغ کا سوچا سمجھا منصوبہ ہو۔ ان کا فعل محض وقتی جذبہ کے تحت صادر نہ ہوا ہو بلکہ
، پیچھے حسد، بغض، کبر، انتقام، اور سرکشی جیسے اندرونی جذبات کام کر رہے ہوں۔ ان کے ظاہری
ں ان کے اندرونی احساسات پوری طرح شریک ہوں۔ ایسے لوگوں کی خرابی اوپری خرابی نہیں،
ی شخصیت میں آخری گہرائی تک اتری ہوئی ہے۔ اس قسم کے لوگ تزکیۂ خداوندی سے محروم
ئے، وہ آخرت میں جہنم کے مستحق قرار پائیں گے۔

پہلی قسم کے لوگ دنیا ہی میں اپنا حساب آپ کر رہے ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ آخرت کے حساب سے
یں گے۔ دوسری قسم کے لوگ دنیا میں اپنے حساب سے غافل ہوتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جو
یں پکڑے جائیں گے۔ اور جو شخص آخرت میں پکڑا جائے اس کے لیے نجات کی کوئی صورت نہیں۔

ایک شہادت

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) میں پیغمبر اسلام صلے اللہ علیہ وسلم پر جو مقالہ ہے، اس کے آخر میں مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ بہت کم بڑے لوگ اتنا زیادہ بدنام کیے گیے ہیں جتنا کہ محمد کو بدنام کیا گیا۔ قرون وسطی کے یورپ کے مسیحی علماء نے ان کو فریبی اور عیاش اور خونی انسان کے روپ میں پیش کیا حتی کہ آپ کے نام کا ایک بگڑا ہوا تلفظ مہاونڈ (نعوذ باللہ) شیطان کے ہم معنی بن گیا۔ محمد اور ان کے مذہب کی یہ تصویر اب بھی کسی قدر اپنا اثر رکھتی ہے۔ انگریز مصنف ٹامس کارلائل پہلا قابل ذکر مغربی شخص تھا جس نے ۱۸۴۰ میں بتاکید عوامی طور پر کہا کہ محمد یقیناً سنجیدہ تھے کیوں کہ یہ فرض کرنا بالکل مضحکہ خیز ہے کہ ایک فریبی آدمی ایک عظیم مذہب کا بانی ہو سکتا ہے:

Few great men have been so maligned as Muhammad. Christian scholars of medieval Europe painted him as an impostor, a lecher, and a man of blood. A corruption of his name, 'Mahound. even came to signify the devil. This picture of Muhammad and his religion still retains some influence. The English author Thomas Carlyle in 1840 was the first notable European to insist publicly that Muhammad must have been sincere, because it was ridiculous to suppose an impostor would have been the founder of a great religion (12/609).

مغربی پروپیگنڈے کی تردید کے لیے ٹامس کارلائل نے یہاں جو دلیل استعمال کی ہے، وہی کسی شخصیت کے بارے میں رائے قائم کرنے کے لیے سب سے زیادہ درست اور یقینی ہے۔ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے، اسی طرح انسان اپنے کردار سے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جو شخص پیغمبر اسلام صلے اللہ علیہ وسلم کا کلام پڑھے، جو یہ دیکھے کہ روز و شب آپ کن سرگرمیوں میں مصروف رہتے تھے اور یہ کہ آپ کے اثر سے کس قسم کی تحریک برپا ہوئی، وہ ہرگز یقین نہیں کر سکتا کہ یہ سب نعوذ باللہ ایک فریبی انسان کا کارنامہ ہے۔

ایک شخص جس کے کلام میں تعمیر انسانیت کی باتیں ہوں، جس کا لہجہ درد اور سوز سے بھرا ہوا ہو، جس کے مشن سے لوگوں کی زندگیوں میں صالح انقلاب آ رہا ہو، وہ کبھی فریبی انسان نہیں ہو سکتا فریبی انسان ایک فریبی تحریک اٹھا سکتا ہے نہ کہ ایک صالح ربانی تحریک۔

اعلان، اقدام

حق کا اعلان ہر حال میں مطلوب ہے، خواہ سننے والا اس کو سنے یا نہ سنے، خواہ مخاطب اس کو مانے یا نہ مانے۔ مگر حق کے لیے عملی اقدام کا معاملہ سراسر مختلف ہے۔ وہ نتیجہ کی شرط کے ساتھ مشروط ہے۔ اگر نتیجہ نکلنے کا یقینی امکان ہو تو اقدام کیا جائے گا۔ ورنہ اقدام سے باز رہ کر صرف صبر کیا جاتا رہے گا۔

اعلان اور اقدام کا یہ فرق قرآن وسنت میں واضح طور پر ملتا ہے۔ مثلاً قرآن میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا کہ لوگوں کو حق بات کی یاد دہانی کراؤ۔ تم صرف یاد دہانی کرنے والے ہو۔ تم لوگوں کے اوپر داروغہ نہیں ہو۔ (الغاشیہ) یعنی نتیجہ نکلے یا نہ نکلے، ہر حال میں تبلیغ حق کا کام کرتے رہو۔ تمہارا کام پہنچا دینا ہے، نتیجہ نکالنا تمہارے ذمہ نہیں۔ یہ وہ بات ہے جو تبلیغ کے بارہ میں کہی گئی۔

دوسری طرف روایات میں آتا ہے کہ مکہ کے زمانے میں حضرت ابوبکر نے عملی اقدام کی بات کی تو آپ نے فرمایا: یا ابا بکر انا قلیل (اے ابوبکر ہم تھوڑے ہیں) اسی طرح حضرت عمرؓ نے عملی اقدام کے لیے کہا تو آپ نے دوبارہ فرمایا: یا عمر انا قلیل (اے عمر ہم تھوڑے ہیں) سیرت ابن کثیر، جلد اول۔

دوسرے لفظوں میں یہ کہ قلّت تعداد اور قلّت وسائل کی وجہ سے ابھی ہم اس حالت میں نہیں ہیں کہ فریق ثانی کے خلاف اقدام کر کے کوئی واقعی نتیجہ برآمد کر سکیں۔ اس لیے ابھی ہم کوئی عملی اقدام نہیں کریں گے۔ ابھی ہم پیغام رسانی پر قانع رہ کر بقیہ امور میں صبر کی روش پر قائم رہیں گے۔

بولنے سے پہلے سوچنا ضروری ہے۔ اسی طرح ضروری ہے کہ آدمی کرنے سے پہلے کرنے کی تیاری کرے۔ جو شخص سوچے بغیر بولے وہ فضول گوئی کا مرتکب ہوگا۔ اسی طرح جو شخص ضروری تیاری کے بغیر اقدام کرے، اس کا اقدام نتیجہ خیز نہیں ہو سکتا۔ ایسا اقدام ایک قسم کی خودکشی ہے۔ وہ موت کی چھلانگ ہے نہ کہ زندگی کی طرف سفر۔

دشمن میں دوست

ڈاکٹر سید عبداللطیف (۱۸۹۱ - ۱۹۷۱) کرنول (دکن) میں پیدا ہوئے۔ وہ اپنے انگریزی ترجمۂ قرآن اور دوسری خدمات کی وجہ سے کافی مشہور ہیں۔ وہ مقامی ہائی اسکول میں اپنے والد کی اطلاع کے بغیر داخل ہوگیے تھے۔ والد کو انگریز اور انگریزی تعلیم سے سخت نفرت تھی۔ ان کو معلوم ہوا تو غصہ ہوگیے اور درشت لہجے میں پوچھا کہ انگریزی پڑھ کر کیا کرے گا۔ دبلے پتلے، پست قامت لڑکے نے جواب دیا: انگریزی پڑھ کر قرآن کا ترجمہ انگریزی زبان میں کروں گا۔ ۱۹۱۵ میں انھوں نے بی اے کا امتحان امتیاز کے ساتھ پاس کیا۔ ۱۹۲۰ میں جامعہ عثمانیہ حیدر آباد میں انگریزی کے استاد مقرر ہوئے۔ ۱۹۲۲ میں ان کے لیے نیا تعلیمی موقع پیدا ہوا جب کہ جامعہ عثمانیہ کے چار استادوں کو اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ بھیجا طے پایا اور ان کے لیے ریاست کی طرف سے ۳۰ ہزار روپے کا بلاسودی قرض منظور کیا گیا۔ ان میں سے ایک سید عبداللطیف بھی تھے۔

لندن پہنچ کر وہ وہاں بی اے (آنرز) میں داخلہ لینا چاہتے تھے۔ مگر کنگس کالج کے صدر شعبۂ انگریزی اور دوسرے انگریز اساتذہ آپ کی صلاحیت سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ آپ کو بی اے اور ایم اے سے مستثنیٰ کرتے ہوئے براہ راست پی ایچ ڈی کرنے کی اجازت دے دی۔ آپ کے مقالہ کا عنوان "اردو ادب پر انگریزی ادب کے اثرات" طے پایا۔ مقالہ کی تیاری کی مدت تین سال مقرر کی گئی تھی۔ مگر آپ نے دو سال ہی میں پی ایچ ڈی کے مقالہ کی تکمیل کرلی۔ کنگس کالج کے ذمہ داروں نے اس کو منظور کرتے ہوئے ڈاکٹریٹ کا مستحق قرار دیا۔ سید عبداللطیف مقررہ مدت سے ایک سال پہلے ڈاکٹر ہوکر حیدرآباد واپس آگیے۔ یہاں آپ کو فوراً جامعہ عثمانیہ کا پروفیسر بنا دیا گیا۔ (انجمن، از حسن الدین احمد آئی اے ایس)

۱۹۲۲ میں انگریز کو مسلمانوں کا سب سے بڑا دشمن سمجھا جاتا تھا۔ مگر اسی دشمن نے مسلمان طالب علم کے ساتھ فیاضی کا وہ معاملہ کیا جس کی مثال مسلم اداروں میں بھی مشکل سے ملے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ "دشمن انسان" کے اندر بھی "دوست انسان" موجود ہوتا ہے۔ مگر اس دوست انسان کو وہی لوگ پاتے ہیں جو دوستی اور دشمنی سے اوپر اٹھ کر انسانوں سے معاملہ کرنا جانتے ہوں۔

ترقی کا راز

جاپان کے بارہ میں ایک امریکی مصنف کی ایک کتاب چھپی ہے جس کا نام ہے: جاپان نمبر ایک کی حیثیت سے۔ ڈھائی سو صفحہ کی اس کتاب میں مصنف نے دکھایا ہے کہ جاپان کس طرح دوسری جنگ عظیم میں مکمل شکست سے دوچار ہونے کے بعد دوبارہ اس طرح کھڑا ہو گیا کہ خود اپنے فاتح (امریکہ) کے لیے چیلنج بن گیا۔ مصنف کے الفاظ میں، جاپانی لوگ تبدیلی کے آقا بن گیے، بجائے اس کے کہ وہ اس کا شکار ہو جائیں۔ دوسرے ممالک کو بیرونی اثرات نے برباد کر دیا مگر جاپان نے اس سے طاقت پائی:

Thus they became the masters of change rather than the victims. Other countries were devastated by foreign influence, but Japan was invigorated.

Ezra F. Vogel, *Japan As Number One,*
Harward University Press, London 1979, p 256.

مصنف کے نزدیک جاپان کی اس غیر معمولی کامیابی کا راز یہ ہے کہ اس نے فوجی اور سیاسی میدان میں شکست کھانے کے بعد اپنے میدان عمل کو بدل دیا اور اپنی ساری توجہ علم کی راہ میں لگا دی۔ اس کتاب کے تیسرے باب میں مصنف نے بتایا ہے کہ جاپان کی موجودہ کامیابی کا واحد عامل (Single factor) اگر کسی چیز کو قرار دیا جا سکتا ہے تو وہ صرف ایک ہے۔ اور وہ ہے جاپانی قوم میں علم (Knowledge) کی تلاش کا لامتناہی جذبہ۔ اس سلسلہ میں مصنف نے لکھا:

When a foreign visitor comes to Japan, most Japanese almost instinctively think, "What can I learn from him?" And the three million Japanese who now travel abroad each year look for little hints of new ideas they might apply at home (p. 29).

جب باہر کا کوئی آدمی جاپان آتا ہے تو اکثر جاپانی تقریباً جبلی طور پر سوچتے ہیں: "میں اس سے کیا بات سیکھ سکتا ہوں" اور تین ملین جاپانی جو آج کل ہر سال باہر کی دنیا کا سفر کرتے ہیں وہ جب باہر پہنچتے ہیں تو وہ یہ کوشش کرتے ہیں کہ انھیں کوئی نیا تصور ہاتھ آ جائے جس کو واپس جا کر وہ اپنے ملک میں استعمال کر سکیں۔

ایک مثال

ڈاکٹر ایم خلیل اللہ امراض قلب کے ماہر سمجھے جاتے ہیں۔ وہ اس وقت نئی دہلی کے گوبند بلبھ اسپتال میں ڈائرکٹر ہیں۔ انھوں نے اندرون ملک ہندستان کا پہلا پیس میکر (Pacemaker) تیار کیا ہے۔ یہ وہ طبی آلہ ہے جو دل کی حرکت کو مصنوعی طور پر باقاعدہ کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے جب کہ اس کا قدرتی نظام کام نہ کر رہا ہو۔ ان کی اس قسم کی ممتاز طبی خدمات کی بنا پر ناگپور یونیورسٹی نے ان کو ڈاکٹر آف سائنس کی ڈگری عطا کی ہے۔

ڈاکٹر خلیل اللہ کو یہ اعزاز ناگپور یونیورسٹی کے ۵، ویں کنونشن پر وائس چانسلر ڈاکٹر مدھو سودن چن سر کار نے ۵ جنوری ۱۹۸۸ کو پیش کیا۔ کنونشن کے مہمان خصوصی لوک سبھا کے اسپیکر مسٹر بلرام جاکھڑ تھے۔

ڈاکٹر خلیل اللہ نے ایک جدید برقی لیبارٹری قائم کر کے امراض قلب کی تشخیص میں نمایاں کامیابی حاصل کی ہے۔ ان کو ۱۹۸۴ میں پدم شری کا ایوارڈ دیا گیا تھا۔ اسی سال انھیں بی سی رائے قومی ایوارڈ بھی ملا۔ ڈاکٹر خلیل اللہ نے کئی نصابی کتابوں کی تیاری میں حصہ لیا ہے اور قومی اور بین اقوامی طبی جرنل میں ان کے ۱۲۰ مقالے شائع ہو چکے ہیں۔ (قومی آواز ۶ جنوری ۱۹۸۸)

"ایم خلیل اللہ" اگر ڈاکٹر کی ڈگری لینے کے لیے مطالبات کی مہم چلاتے۔ وہ جلسوں اور تقریروں کے ذریعہ یہ مانگ کرتے کہ مجھے ڈاکٹریٹ کی ڈگری دو تو کوئی یونیورسٹی ان کی طرف توجہ نہ کرتی۔ مگر جب انھوں نے ممتاز کام کر کے اپنے آپ کو ڈگری کا مستحق ثابت کر دیا تو مانگ کے بغیر ان کو ڈگری مل گئی۔ آدمی اگر واقعی معنوں میں کوئی قابل قدر کام کرے تو وہ قدر دانی پا کر رہتا ہے، خواہ وہ ایک فرقہ کا آدمی ہو یا دوسرے فرقہ کا۔

موجودہ دنیا کا نظام نفع بخشی کے اصول پر قائم ہے۔ یہاں سب سے زیادہ بے قیمت چیز مانگنا ہے اور سب سے زیادہ باقیمت چیز دینا۔ مانگنے والا اپنے گھر کے اندر بھی حقیر ہو جاتا ہے اور اپنے گھر کے باہر بھی۔ مگر جو شخص اپنے آپ کو دینے والا بنا لے وہ اپنوں کے اندر بھی عزت پائے گا اور اپنوں کے باہر بھی۔

زاویہ نظر کی غلطی

منشی پریم چند (۱۹۳۶-۱۸۸۰) کو ناول نگاری میں اگرچہ غیر معمولی مقام ملا مگر وہ نہایت سادہ مزاج کے آدمی تھے۔ اور شہرت سے بہت دور رہنا چاہتے تھے۔ ان کے ایک دوست مسٹر جے نند کمار لکھتے ہیں کہ پریم چند کو میں نے پایا کہ وہ بڑے بننے کے پیچھے نہیں ہیں، سچا بننا ان کا مقصد ہے۔ میں نے انھیں بار بار دیکھا ہے وہ دھوم دھام کے آدمی نہیں تھے۔ وہ ہمیشہ کسی اور گہری سچائی کے خواہاں رہتے تھے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ہم نے ایک لٹریری کانفرنس میں صدر بنا کر پریم چند کو دہلی بلایا۔ لیکن وہ آنے کو راضی ہی نہ ہوتے تھے۔ خط لکھا، تار دیئے، لیکن انھوں نے لکھا، تم ذاتی طور پر بلاؤ تو آجاؤں لیکن کانفرنس کی تہمت کیوں دیتے ہو۔ آخر رضامندی دی بھی تو تار میں لکھا:

Reaching the protest

مسٹر جے نند کمار لکھتے ہیں کہ ایک بات پر اکثر ان کے ساتھ میری بات چیت ہوئی اور وہ ہے ایشور اور دھرم۔ وہ ایشور کے وجود کے قائل نہیں تھے۔ کیوں کہ وہ دیکھتے تھے کہ ایشور اور دھرم اچھے سے زیادہ برے کام میں لائے جاتے تھے۔ وہ پوچھتے، دنیا میں زور ہے، ظلم ہے، لوگ ستائے جاتے ہیں اور بھوکوں مرتے ہیں۔ چاروں طرف دکھ کی چیخ پکار ہے۔ تم اس ایشور کو مانو گے جو اس سب کی اجازت دیتا ہے۔ وہ مصیبت زدوں کی حالت دیکھ کر خدا کے منکر ہو جاتے تھے (کیا خوب آدمی تھا)

منشی پریم چند نہایت نیک مزاج آدمی تھے مگر دنیا کے حالات کو انھوں نے صحیح رخ سے نہ دیکھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ حالات کی معنویت کو سمجھ نہ سکے اور خدا کے منکر ہو گیے۔ موجودہ دنیا کو سمجھنے کا راز یہ ہے کہ اس کو اس نظر سے دیکھا جائے کہ وہ "دار الامتحان" ہے۔ یہی موجودہ دنیا کو دیکھنے کا صحیح زاویہ ہے اور کسی چیز کا مطالعہ اسی وقت صحیح ہوتا ہے جب کہ اس کو صحیح زاویہ سے دیکھا جائے۔

موجودہ دنیا کو آخرت سے الگ کر کے دیکھا جائے تو مذکورہ نقطۂ نظر درست نظر آئے گا۔ لیکن اس کو آخرت سے ملا کر دیکھیے تو موجودہ خرابیاں معقول معلوم ہونے لگتی ہیں۔ کیوں کہ دار الامتحان ہونے کا تقاضا یہ ہے کہ لوگوں کو عمل کی آزادی ہو۔ اور جب تمام لوگوں کو آزادی ہوگی تو کوئی صحیح کرے گا اور کوئی غلط، اور پھر وہی صورت حال پیش آئے گی جو موجودہ حالت میں، دنیا میں دکھائی دے رہی ہے۔

ایمانی کردار

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے آخری زمانہ کی بات ہے۔ لوگ نماز کے لیے مسجد میں اکٹھا تھے۔ جماعت کا وقت ہو گیا مگر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم بیماری کی شدت کی وجہ سے حجرہ سے باہر تشریف نہ لاسکے۔ اس وقت حضرت ابو بکر بھی مسجد میں موجود نہ تھے۔ چنانچہ عبداللہ بن زمعہ اور دوسرے لوگوں نے اصرار کر کے حضرت عمر کو امامت کے لیے آگے کر دیا۔

حضرت عمرؓ نہایت بلند آواز تھے۔ جب انھوں نے "اللہ اکبر" کہہ کر نماز شروع کی تو ان کی آواز رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے حجرہ تک پہنچ گئی۔ آپ نے سن کر فرمایا: ابو بکر کہاں ہیں۔ اللہ اور مسلمان اس پر راضی نہیں، (این ابوبکر، یابی اللہ ذالک والمسلمون) اس کے بعد آپ کی ہدایت کے مطابق حضرت ابو بکر بلائے گیے، اور حضرت عمر کے بجائے انھوں نے نماز پڑھائی۔

جس وقت یہ واقعہ ہوا، اس وقت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہ کے حجرہ میں تھے۔ چونکہ اسی امامتِ نماز پر آئندہ خلافتِ حکومت کا فیصلہ ہونے والا تھا، اس لیے حضرت عمر یہ سوچ سکتے تھے کہ ان کو خدانخواستہ کسی "سازش" کے تحت امامت کے مقام سے ہٹایا گیا ہے، اور اس سازش کا اصل دماغ عائشہ ہیں جو حضرت ابو بکر کی صاجزادی ہیں۔ انھوں نے اپنے والد کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد خلیفہ بنانے کے لیے یہ ڈرامہ کروایا ہے۔

مگر حضرت عمر کا خوفِ خدا اس میں مانع تھا کہ وہ اس قسم کی بدگمانی کو اپنے دل میں جگہ دیں۔ راوی کہتے ہیں کہ عمر نے ابو بکر پر کسی قسم کا الزام نہیں لگایا (کان عمر غیر مُتّہم علیٰ ابی بکر، سیرۃ النبی لابن ہشام، الجزء الرابع، صفحہ ۳۳۲)

کسی گروہ کو متحد رکھنے اور اس کی اجتماعی زندگی کو مستحکم بنیاد پر قائم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے افراد کے اندر ایک دوسرے کے بارہ میں حسنِ ظن پایا جاتا ہو۔ مضبوط اجتماعیت کے لیے حسنِ ظن اتنا ہی ضروری ہے جتنا مضبوط تعمیر کے لیے سمنٹ۔ دور اول کے مسلمان اپنی اسی خصوصیت کی بنیاد پر کامل اتحاد کا نمونہ تھے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں نے اس خصوصیت کو کھو دیا ہے، اسی لیے وہ اجتماعیت اور اتحاد کو بھی کھوئے ہوئے ہیں۔

اعتراف اور بے اعترافی

انسان دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جن کے اندر اعتراف کا مادہ نہ ہو۔ دوسرا انسان وہ ہے جس کے سامنے حق واضح ہو کر آئے تو وہ اس کا اعتراف کرلے۔ قرآن میں دونوں قسم کے انسان کی مثالیں دی گئی ہیں۔

ایک انسانی کردار وہ ہے جس کا ذکر سورہ مریم میں کیا گیا ہے۔ حضرت مریم نہایت پاکباز خاتون تھیں۔ وہ فلسطین کے ایک یہودی خاندان میں پیدا ہوئیں۔ اللہ تعالیٰ کی حکمت خاص کے تحت ان کے یہاں بغیر باپ کے ایک لڑکا پیدا ہوا۔ یہ ایک پاکدامن خاتون کے لیے بڑی سخت آزمائش تھی، تاہم فرشتہ کی ہدایت پر وہ گود کے بچہ کو لے کر شہر میں آئیں۔ یہود نے جب ایک غیر شادی شدہ خاتون کو اس حال میں دیکھا کہ وہ ایک چھوٹا بچہ گود میں لیے ہوئے ہے تو انھوں نے کہا: اے مریم، تو نے غضب کر دیا۔ اے ہارون کی بہن، تیرا باپ برا آدمی نہ تھا اور نہ تیری ماں بدکار تھی۔ پھر یہ حرکت تجھ سے کیوں کر سرزد ہوئی۔

حضرت مریم خود کچھ نہیں بولیں۔ فرشتہ کی ہدایت کے مطابق انھوں نے بچہ کی طرف اشارہ کر دیا۔ یہود نے کہا کہ ایک چھوٹے بچہ سے ہم کس طرح بات کریں۔ عین اس وقت حیرت انگیز طور پر گود کا بچہ بول اٹھا۔ اس نے نہایت فصیح زبان میں کہا کہ میں اللہ کا بندہ (مسیح) ہوں۔ اللہ نے مجھ کو کتاب دی ہے اور اس نے مجھ کو پیغمبر بنایا ہے۔

ایک چھوٹے بچہ کا اس طرح کلام کرنا انتہائی طور پر غیر معمولی تھا۔ اس طرح معجزاتی سطح پر یہ ثابت ہو گیا کہ حضرت مریم بدکار خاتون نہیں ہیں۔ حضرت مریم کی پاکبازی کا اس سے بڑا ثبوت کوئی اور نہیں ہو سکتا کہ گود کا بچہ کلام کر کے آپ کی پاکبازی کا اعلان کرے۔ مگر اس کے باوجود یہود نے حضرت مریم کو پاکباز تسلیم نہیں کیا۔ ان کی گود میں چھوٹا بچہ دیکھ کر ان کے خلاف الزام لگانے میں تو انھوں نے بہت تیزی دکھائی۔ مگر معاملہ کی وضاحت کے بعد وہ اپنی غلطی ماننے کے لیے تیار نہ ہوئے۔

جو لوگ اس روش کا ثبوت دیں ان کو کبھی حق کی ہدایت نہیں ملتی۔ حق کے داخلہ کا واحد دروازہ اعتراف ہے، اور مذکورہ قسم کے لوگوں کے یہاں یہ دروازہ موجود ہی نہیں۔

اللہ اکبر

اس کائنات کی اہم ترین حقیقت یہ ہے کہ اس کا ایک خالق ہے، اور یہ خالق سب سے بڑا ہے۔ اس سے بڑا اور کوئی نہیں۔ اذان اور نماز میں بار بار اللہ اکبر کہنا اسی سب سے بڑی سچائی کا مسلسل اعلان ہے۔ اذان اور نماز کے ذریعہ گویا ہم کائنات کی سب سے بڑی حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں۔

سب سے بڑی حقیقت کا اعتراف کوئی معمولی چیز نہیں۔ یہ خود اپنے آپ کو سب سے بڑے مقام کا مستحق بنانے کے ہم معنی ہے۔ مغرب نے اس کا اعتراف کیا کہ کائنات سب سے بڑی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغرب کو تمام قوموں کے مقابلہ میں سب سے زیادہ بڑی حیثیت حاصل ہوگئی۔ پھر جو لوگ کائنات کے خالق کی بڑائی کو پالیں، ان کا حال کتنا عظیم ہونا چاہیے۔

مگر موجودہ زمانہ کے مسلمان ہر جگہ کمزور اور مغلوب ہیں۔ ہمارے حق میں "اللہ اکبر" کی وہ برکتیں ظاہر نہیں ہوتیں جو مغرب کے حق میں "الکون اکبر" کہنے کے نتیجہ میں ظاہر ہوئیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے اللہ اکبر کے الفاظ کو پایا۔ مگر ہم نے اس کی حقیقت کو نہیں پایا۔ ہم اللہ اکبر کے الفاظ فضا میں بکھیرتے ہیں۔ مگر خود اپنے اندر اسے داخل نہیں کرتے۔

میں نے ایک عربی اخبار میں ایک مضمون پڑھا۔ اس کا عنوان تھا: اللہ اکبر فی سماء لندن (لندن کی فضا میں اللہ اکبر کی آواز) یہ لندن کی جامع مسجد کا تعارف تھا۔ مضمون کے ساتھ لندن کی نو تعمیر عظیم مسجد کی تصویر تھی اور دکھایا گیا تھا کہ یہاں سے ہر روز پانچ وقت "اللہ اکبر" کی آواز لاؤڈ اسپیکر پر بلند کی جاتی ہے جو لندن کی فضاؤں میں گونجتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ لاؤڈ اسپیکر کی ایجاد نے ہمیں یہ موقع دیا ہے کہ ہم آسمان تک اللہ اکبر کی آواز کو پہنچا دیں، مگر خود اپنے سینہ کے اندر ہم اللہ اکبر کی آواز کو نہ پہنچا سکے۔ آلۂ مکبر الصوت کے ذریعہ ہم نے بلند فضاؤں میں اللہ اکبر کا ارتعاش پیدا کر دیا۔ مگر اس واقعہ کو ریکارڈ کرنے کے لیے ابھی خدا کے فرشتے انتظار کر رہے ہیں جب کہ خدا کی کبریائی کا احساس ہمارے دلوں میں ارتعاش پیدا کر دے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ اکبر کی

[illegible]

وہ نہیں دیکھتے

وَإِنْ تَدْعُوهُمْ إِلَى الْهُدَىٰ لَا يَسْمَعُوا وَتَرَاهُمْ يَنْظُرُونَ إِلَيْكَ وَهُمْ لَا يُبْصِرُونَ ۔

(الاعراف ۱۹۸)

اور (اے پیغمبر) اگر تم ان (مشرکین) کو ہدایت کی طرف بلاؤ تو وہ نہیں سنیں گے۔ اور تم کو نظر آتا ہے کہ وہ تمہاری طرف دیکھ رہے ہیں، اور وہ (تم کو) نہیں دیکھتے۔

اس آیت میں ضمیر غائب اہل کفر وشرک کی طرف راجع ہے اور ضمیر مخاطب کا رخ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے۔ حضرت حسن نے آیت کی تشریح اسی کے مطابق کی ہے:

قال الحسن معنی الآیۃ إن تدعوهم یعنی المشرکین الی الاسلام لا یسمعوا ای لا یعقلون ذالک بقلوبهم وتراهم ینظرون الیک باعینهم وهم لا یبصرون بقلوبهم

(التفسیر المظہری، المجلد الثالث، صفحہ ۴۴۵)

حسن نے کہا، آیت کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم مشرکین کو اسلام کی طرف بلاؤ تو وہ نہیں سنیں گے۔ یعنی وہ اس کو دل سے نہیں سمجھتے۔ تم دیکھتے ہو کہ وہ اپنی آنکھوں سے تمہاری طرف دیکھ رہے ہیں مگر وہ اپنے قلوب سے نہیں دیکھتے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اپنے زمانہ کے لوگوں کے لیے بظاہر انسانوں میں سے ایک انسان تھے اس وقت آپ کے نام کے ساتھ وہ تاریخی عظمتیں جمع نہیں ہوئی تھیں جو آج جمع ہو چکی ہیں اور جن کی وجہ سے آج ہر آدمی آپ کا احترام کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اس وقت آپ کو پہچاننے کے لیے اندرونی جوہر کو دیکھنے والی نگاہ درکار تھی۔ چنانچہ جن لوگوں کے پاس یہ نگاہ تھی انھوں نے اسی وقت آپ کو پہچان لیا اور آپ کے ساتھی بن گیے، مگر جو لوگ اس قسم کی نگاہ سے محروم تھے وہ آپ کو پہچان نہ سکے اور آپ کے منکر بن گیے۔

ایک ہے ظاہری رونقوں کی بنیاد پر کسی کو جاننا۔ دوسرا ہے، اندرونی جوہر کی بنیاد پر کسی کا قدرداں بننا۔ جو لوگ صرف ظاہری چیزوں کو دیکھ سکتے ہوں وہ ایسے کسی انسان کی قدردانی نہیں کر سکتے جو باطنی حقیقتوں کا خزانہ اپنے اندر لیے ہوئے ہو۔ وہ بظاہر اسے دیکھیں گے مگر وہ اس کو پہچاننے والے نہیں بنیں گے۔

حکمت اور صبر

موجودہ دنیا میں کامیابی کی منزل تک پہنچنے کے لیے حکمت اور صبر لازمی طور پر ضروری ہیں۔ حکمت اور صبر کے بغیر نہ دین کا کوئی مقصد حاصل کیا جا سکتا اور نہ دنیا کا۔

حکمت کی جڑ یہ ہے کہ آدمی ایک چیز اور دوسری چیز کے فرق کو جانے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں ہر قسم کے ظلم کے باوجود ظالموں سے نہیں لڑے۔ مگر مدینہ میں حسب ضرورت آپ نے ظالموں کا مقابلہ کیا۔ غزوۂ حمراء الاسد کا سفر با آواز بلند کیا گیا مگر فتح مکہ کے سفر میں آپ نے بلند آوازی سے منع فرمادیا۔ معاہدۂ حدیبیہ کے وقت آپ نے مکہ والوں کی یک طرفہ شرائط پر صلح کرلی۔ مگر بنو بکر اور بنو خزاعہ کا واقعہ پیش آنے کے بعد آپ نے مکہ کے سردار (ابوسفیان) کی تجدید صلح کی پیش کش کو قبول نہیں فرمایا۔ وغیرہ

حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں کبھی بولنا ضروری ہوتا ہے اور کبھی یہ ضروری ہوتا ہے کہ آدمی اپنے منہ میں زبان رکھتے ہوئے چپ ہو جائے۔ کبھی حالات اقدام کرنے کا تقاضا کرتے ہیں اور کبھی اقدام نہ کرنے کا۔ کبھی آگے بڑھنا افضل ہوتا ہے اور کبھی یہ افضل ہوتا ہے کہ آدمی پیچھے کی سیٹ پر بیٹھنے کے لیے اپنے آپ کو راضی کرے۔ اسی فرق کو جاننے کا نام حکمت ہے۔

صبر کی حقیقت یہ ہے کہ آدمی رد عمل سے رکے اور غیر متاثر ذہن کے تحت سوچ سمجھ کر اپنے عمل کی منصوبہ بندی کرے۔ آپ سڑک پر اپنی گاڑی دوڑا رہے ہیں اور سامنے اچانک دوسری گاڑی آگئی۔ اب گاڑی کو روک کر اپنے لیے راستہ نکالنے کا نام صبر ہے، اور روکے بغیر گاڑی دوڑانے کا نام بے صبری۔

صبر کا طریقہ موجودہ دنیا میں کوئی حقیقی کامیابی حاصل کرنے کے لیے انتہائی حد تک ضروری ہے۔ جو ڈرائیور بے صبری کے ساتھ سڑک پر گاڑی چلائے وہ خود بھی تباہ ہوگا اور اپنی گاڑی کو بھی تباہ کرے گا۔ اسی طرح جو لوگ صبر کی شرط کو پورا کیے بغیر زندگی میں کامیاب ہونا چاہیں وہ صرف بربادی کی تاریخ بنائیں گے، ترقی اور کامیابی کی تاریخ بنانا ان کے لیے مقدر نہیں۔

چرچل کا اقرار

سر ونسٹن چرچل (۱۸۷۴-۱۹۶۵) انگلستان کے انتہائی مشہور سیاست داں تھے۔ وہ ۱۹۴۰ سے ۱۹۴۵ تک برطانیہ کے وزیر اعظم رہے۔ ان کے متعلق مورخین مغرب یہ الفاظ لکھتے ہیں کہ انھوں نے دوسری جنگ عظیم میں برطانیہ کو شکست سے بچا کر فتح تک پہنچایا:

He lead Britain from near defeat to victory in Word War II

چرچل جنگ کے رہنما تھے مگر وہ امن کے رہنما نہ تھے۔ برطانیہ کے لوگوں کا یہ سیاسی شعور قابل داد ہے کہ جنگ عظیم کے فوراً بعد برطانیہ میں عام الکشن ہوا تو انھوں نے اپنے جنگی ہیرو کے حق میں ووٹ نہیں دیا، کیوں کہ جنگ کے بعد برطانیہ کی تعمیر نو کے لیے وہ چرچل کو موزوں نہیں سمجھتے تھے۔

چرچل کے اندر بڑی عجیب وغریب خصوصیات تھیں۔ ان کی ایک خصوصیت کا ذکر مسز وجے لکشمی پنڈت نے اپنی سوانح عمری میں اس طرح کیا ہے:

ہندستان کے مطالبہ آزادی کے جواب میں چرچل نے اعلان کیا تھا کہ وہ سلطنت برطانیہ کے وزیر اعظم اس لیے نہیں بنے ہیں کہ وہ اس کے خاتمہ کی تقریب کی صدارت کریں۔ یہ بات قابل تعجب نہیں ہے کہ ہم لوگ ان سے محبت نہیں کرتے تھے۔ جو چیز قابل تعجب ہے وہ یہ کہ آخر میں جب وہ میرے بھائی (جواہر لال نہرو) سے اس وقت ملے جب کہ عبوری حکومت بن چکی تھی تو دونوں نے ایک دوسرے کو چاہا اور دونوں میں آزادانہ گفتگو ہوئی۔ جب وہ جدا ہوئے تو چرچل نے جواہر لال کو یہ کہہ کر مبارک باد دی کہ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آپ نے انسان کے دو سب سے بڑے دشمنوں پر فتح پائی ہے۔ وہ ہیں نفرت اور خوف:

He was the man who had announced that he had 'not become His Majesty's first minister to preside over the liquidation of His Majesty's empire'. It was not surprising that we did not love him. What was surprising was that when he finally met by brother after the formation of the interim government, they liked each other and were able to talk freely. When they parted, Sir Winston paid Bhai a handsome tribute: "I want to say that you have conquered two of man's greatest enemies — hate and fear."

Vijai Lakshmi Pandit, *The Scope of Happiness*

ایک سفر

ڈیگو گارشیا سے لے کر لکا دیپ تک سمندر میں جگہ جگہ چٹانی ابھار اس طرح پھیلا ہوا ہے جیسے کسی نے اتھاہ پانی کے درمیان لکڑی کے بہت سے تنے ڈال دئے ہوں۔ انی بلے سلسلہ کے درمیان وہ "ملک" ہے جس کو جزائر مالدیپ کہتے ہیں۔ یہ جزائر ہندستان کے جنوبی ساحل سے تقریباً ۴۰۰ میل کے فاصلہ پر واقع ہیں۔

مالدیپ کے بارہ میں راقم الحروف نے سب سے پہلے الجمعیۃ ویکلی ۲۹ مارچ ۱۹۷۴ء میں ایک مفصل مضمون شائع کیا تھا۔ اس کا عنوان ان الفاظ میں قائم کیا گیا تھا: مالدیپ کا رقبہ صرف ۳۰۰ مربع کلومیٹر ہے، مگر کلیدی محل وقوع کی وجہ سے وہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

اس کی اسی اہمیت کی بنا پر برطانیہ نے پہلی بار مالدیپ (مالے) میں ایک ہوائی اڈہ بنایا۔ دوسری عالمی جنگ میں فوجی اہمیت کے اس ہوائی اڈہ سے برطانیہ نے بہت کام لیا تھا۔ بحر ہند کے درمیان اس ہوائی اڈہ کو دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ انگریز واقعۃً دوررس نظر رکھتے تھے۔ اسی لئے وہ دنیا کے اتنے بڑے رقبہ پر حکومت کرنے میں کامیاب ہوسکے۔

الجمعیۃ کے اس مضمون میں راقم الحروف نے مزید لکھا تھا: جزائر مالدیپ کی پوری آبادی مسلمان ہے۔ یہ پانچ سو سال پہلے کے اس واقعہ کی یادگار ہے جب کہ عرب تاجروں کے ذریعہ اسلام جنوبی ہند کے ساحل سے لے کر سیلون، مشرقی بنگال، ملیشیا اور چین تک پھیل رہا تھا۔ پندرہویں صدی کے آخر میں پرتگالی قافلے بحر ہند میں آگئے، اور انھوں نے اس علاقہ سے عربوں کی تجارت منقطع کر دی۔ اس کے بعد اس علاقہ میں اسلام کی اشاعت کا کام بھی بند ہوگیا (صفحہ ۱۰)

مالدیپ کے لئے میرا پہلا سفر جنوری ۱۹۸۲ میں ہوا۔ یہ سفر ایک اسلامی کانفرنس کی دعوت پر تھا۔ اس سفر کی روداد الرسالہ مئی ۱۹۸۲ میں شائع ہو چکی ہے۔ اس کانفرنس میں مجھے ایک مقالہ "جنوبی اور جنوب مشرقی ایشیا میں اسلام کی اشاعت" کے موضوع پر پیش کرنا تھا۔ مقالہ کی تیاری کے لئے کتابوں کی ضرورت تھی۔ دہلی کے مسلم اداروں میں مجھے اس موضوع پر کوئی کتاب نہ ملی۔ اس کے بعد میں نے دہلی کے ایک مسیحی ادارہ کو ٹیلیفون کیا۔ انھوں نے کہا کہ آپ آج شام


INDIA
SRI
LANKA

ہماری لائبریری میں آجاتیں۔ شام کو میں وہاں پہنچا تو انھوں نے دس انگریزی کتابیں خاص اس موضوع پر میرے حوالے کر دیں ——— کتنا فرق ہے ایک میں اور دوسرے میں۔

مالدیپ کے لئے میرا دوسرا سفر دسمبر ۱۹۸۷ میں ہوا۔ یہ سفر دوبارہ ایک انٹرنیشنل اسلامک کانفرنس میں شرکت کے لئے تھا جس کا اہتمام حکومت مالدیپ کے تعاون سے کیا گیا تھا۔

۵ دسمبر ۱۹۸۷ کی صبح کو فجر سے پہلے گھر سے روانہ ہونا تھا۔ ۴ دسمبر کی شام کو مختلف کاموں میں دیر ہوئی اور میں ساڑھے بارہ بجے سے پہلے بستر پر نہ جا سکا۔ سوتے وقت دل سے دعا نکلی کہ خدایا مجھے تین بجے جگا دیجئے۔ تاخیر کی وجہ سے نیند بھی کسی قدر دیر میں آئی۔ میں گہری نیند سو گیا۔ بالکل بے خبر سو رہا تھا کہ خلاف معمول اچانک نیند کھل گئی۔ دیکھا تو گھڑی کی ایک سوئی تین پر تھی اور دوسری سوئی بارہ پر۔ میں نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔ دل نے کہا کہ اللہ کی مدد ٹھیک اپنے وقت پر آتی ہے۔ اگرچہ انسان اپنی عجلت پسندی کی وجہ سے گھبرا اٹھتا ہے اور سمجھتا ہے کہ شاید خدا کی مدد آنے والی نہیں۔

۵ نومبر ۱۹۸۷ کی صبح کو انڈین ایئر لائنز کی فلائٹ نمبر ۴۶۷ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ میرے پاس جو ریٹرن ٹکٹ ہے، اس پر لکھا ہوا ہے: دہلی ——— مالدیپ ——— دہلی۔ اس کو دیکھ کر خیال آیا کہ اسی طرح ہر آدمی کے پاس ایک اور ریٹرن ٹکٹ ہے۔ یہ دوسرا ٹکٹ بظاہر دکھائی نہیں دیتا۔ مگر اس پر غیر تحریری زبان میں پختہ طور پر لکھا ہوا ہے: آخرت ——— دنیا ——— آخرت۔ مجھے دہلی سے مالدیپ پہنچ کر وہاں چند دن قیام کرنا ہے اور پھر دوبارہ دہلی واپس آجانا ہے۔ اسی طرح ہر آدمی جو یہاں ہے وہ آخرت سے دنیا میں آیا ہے، اور دوبارہ اس کو یہاں سے آخرت کی طرف جانا ہے۔ پہلی قسم کے سفر کو ہر شخص جانتا ہے، مگر دوسری قسم کے سفر کو جاننے والے اتنے کم ہیں کہ دوربین اور خوردبین سے تلاش کرنے پر بھی کہیں کوئی نہیں ملتا۔

ہوائی جہاز کے اعلانات میں ہمیشہ ایک ضروری اعلان سگرٹ نوشی کے بارہ میں ہوتا ہے ——— ٹوائلٹ میں اسموکنگ نہ کریں، لینڈنگ کے وقت اسموکنگ نہ کریں، وغیرہ۔ اعلان کرنے والا سگرٹ نوشی کے بارہ میں ہمیشہ "نہ کریں" والے مواقع کو بتاتا ہے، وہ "کریں" والے موقع کا اعلان نہیں کرتا۔ بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں جن کے بارہ میں "کریں" والی بات کہنے کی ضرورت نہیں۔ وہ تو آدمی بتائے بغیر کرے گا۔ ایسی چیزوں کیلئے صرف "نہ کریں" والا پہلو یاد دلانے

کی ضرورت ہے۔ کیوں کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اپنے طبعی تقاضوں کے جوش میں وہ اس دوسرے پہلو کو بھول جاتا ہے۔

جہاز میں مختلف اخباروں کے ساتھ ہندی روزنامہ نوبھارت ٹائمس (۵ نومبر ۱۹۸۷) بھی تھا۔ میں نے اس کو کھولا تو درمیان کے صفحہ پر ایک مضمون تھا جس کا عنوان حسب ذیل الفاظ میں قائم کیا گیا تھا: "پنجاب پر ایک آشا وادی نظر" اڈیٹوریل کے عنوانات یہ تھے: واپسی لمبی ہوگی، عام آدمی کو انصاف۔ آجکل ہندی اخبارات میں جو زبان ہوتی ہے وہ سادہ اردو ہوتی ہے۔ زیادہ بڑا فرق رسم الخط کا ہے۔ یہ صورت حال بتاتی ہے کہ ہندستان میں "اردو والوں" کے لئے کبھی وہ چیز پیدا ہونے والی نہیں جس کو لینگوئج گیپ کہا جاتا ہے۔ یعنی زبان کی دوری۔ اصل فرق رسم الخط کا ہوگا۔ اور وہ کوئی زیادہ بڑا فرق نہیں۔

راقم الحروف نے ہندی صرف سات دن پڑھی ہے، روزانہ ایک گھنٹہ کی رفتار سے۔ اعظم گڈھ کے زمانہ قیام میں ایک کائستھ بھولیشور لال نے ایک ہفتہ ہمارے گھر پر آکر ہندی زبان پڑھائی تھی۔ اس سات گھنٹہ کی تعلیم کا یہ نتیجہ ہے کہ میں ہندی کے بڑے حروف (عنوان، پوسٹر، نام) بآسانی پڑھ لیتا ہوں۔ اردو داں لوگ اگر صرف ہندی رسم الخط سیکھ لیں تو وہ کبھی ہندی علاقہ میں اجنبی نہیں ہوں گے۔

انڈین ایئرلائنز کے میگزین سواگت (دسمبر ۱۹۸۷) میں ایک مضمون لکادیپ کے بارہ میں تھا لکادیپ جغرافی اعتبار سے بالکل مالدیپ کا ایک حصہ معلوم ہوتا ہے۔ اگرچہ وہ ہندستانی ایڈمنسٹریشن کے تحت ہے۔ یہاں کے ایک حصہ میں مالدیپی زبان بولی جاتی ہے۔ آبادی چالیس ہزار ہے جو سب کی سب مسلمان ہے۔ ۳۶ جزائر کا یہ مجموعہ صرف ۳۲ مربع کلو میٹر کا رقبہ رکھتا ہے۔

مضمون نگار مسٹر پی۔ کے۔ ڈے مالدیپ گئے۔ وہاں سمندر کے کنارے کے خوبصورت سیپ انھیں بہت پسند آئے اور انھوں نے بہت سے سیپ اپنے بیگ میں جمع کرلئے۔ وہ لکھتے ہیں:

> I managed to collect a bagful of sea shells of various shapes and hues. However, many of these I had to throw back as soon as it was discovered that inside these were nestling live hermit crabs!

وہ خوبصورت سیپ جن میں دنیا کے کیکڑے بیٹھے ہوئے ہوں، ان کو ہر آدمی دیکھ لیتا ہے اور اپنے سے دور پھینک دیتا ہے۔ مگر یہاں دوسرے بہت سے خوبصورت سیپ ہیں جن میں آخرت کے کیکڑے بیٹھے ہوئے ہیں۔ ان دوسری قسم کے کیکڑوں کو کوئی نہیں دیکھتا۔ ان کو ہر آدمی اپنے بیگ میں محفوظ کئے ہوئے ہے۔ وہ ان کو صرف آخرت میں پھینکنا چاہے گا۔ مگر اس وقت کا پھینکنا کسی کے کچھ کام نہ آئے گا۔

جہاز میں انگریزی اخبار دکن کرانیکل (۵ دسمبر ۱۹۸۷) نظر سے گزرا۔ اس کی ایک خبر کی سرخی تھی — معمولی جھگڑے پر موت:

Petty quarrel leads to death

خبر میں بتایا گیا تھا کہ حیدرآباد میں ایک شخص نے رات کے وقت کسی آدمی کا دروازہ کھٹکھٹایا صاحب مکان کو اتنی رات میں دروازہ کھٹکھٹانا قابل اعتراض معلوم ہوا۔ وہ آنے والے سے جھگڑنے لگا۔ اب دوسرا شخص جو اس کا جاننے والا تھا اور سادہ طور پر صرف ملنے کے لئے آیا تھا۔ وہ بھی غصہ میں آکر لڑنے لگا۔ یہاں تک کہ مارپیٹ کی نوبت آگئی اور ایک شخص شدید زخمی ہو کر ہلاک ہو گیا۔

بظاہر یہ دو جاہل آدمیوں کی کہانی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہی پوری ملت کی کہانی ہے۔ آج تمام دنیا میں مسلمانوں کا حال یہی ہے کہ وہ معمولی معمولی باتوں پر لڑ جاتے ہیں اور لڑائی شروع ہونے کے بعد ان کی لڑائی دوبارہ اس وقت تک ختم نہیں ہوتی جب تک ان کے اندر لڑنے کی سکت ہی ختم نہ ہو جائے — عراق۔ ایران کی حکومتی جنگ سے لے کر بستیوں کی انفرادی مقدمہ بازی تک ہر جگہ مسلمانوں کا حال یہی ہے۔

راستہ میں ہمارا جہاز کچھ دیر کے لئے کوچن اترا۔ ۲۵ سال پہلے میں ایک بار چند دن کے لئے کوچن آیا تھا۔ اس وقت کی کئی باتیں ابھی تک مجھ کو یاد ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ میں کوچن سے راس کماری (کیپ کورن) گیا تھا۔ اس وقت یہاں تعمیرات نہیں ہوتی تھیں۔ ہندستان کے آخری ساحل پر بیٹھ کر دیر تک میں سمندر کے مناظر کو دیکھتا رہا۔ ساحل سے تقریباً نصف فرلانگ کے فاصلہ پر سمندر کے درمیان ایک چٹان تھی۔ اس سے سمندر کا پانی ٹکرا کر اچھلتا تھا تو عجیب منظر پیدا ہوتا تھا۔ سوامی ویویکانند ہندستان کا سفر کرتے ہوئے یہاں آئے تو

انھوں نے سمندر میں چھلانگ لگادی۔ وہ تیرتے ہوئے مذکورہ چٹان کے اوپر پہنچے اور وہاں دھیان گیان کیا۔ اب اس چٹان پر ان کے نام سے بہت بڑا اسنٹر بنا یا گیا ہے۔ تاہم قدرت کا سابقہ منظراب وہاں موجود نہیں۔

آتے اور جاتے ہوئے تھوڑی دیر کے لئے جہاز گوا میں ٹھہرا۔ بہت سی پرانی یادیں تازہ ہوگئیں۔ گوا ۱۵۰۵ سے پرتگال کے قبضہ میں تھا۔ ۱۹۶۱ میں دوبارہ وہ ہندستان کے قبضہ میں آیا۔ آزادی (۱۹۴۷) سے قبل ہندستان میں تین مغربی طاقتیں تھیں۔ زیادہ بڑے حصہ پر انگریز اور چند چھوٹے مقامات پر فرانسیسی اور پرتگالی۔ انگریزوں اور فرانسیسیوں نے بدلے ہوئے حالات کا اعتراف کرتے ہوئے پر امن طور پر اپنے زیر قبضہ علاقے خالی کر دئے۔ مگر پرتگالی پر امن تخلیہ کے لئے راضی نہیں ہوتے۔ ملک میں آزاد قومی حکومت کے قیام کے بعد جواہر لال نہرو نے مسلسل یہ کوشش کی کہ پرتگالی پر امن طور پر اپنے علاقے کو آزاد کر دیں۔ مگر وہ راضی نہیں ہوئے۔ آخر کار دسمبر ۱۹۶۱ میں ہندستان نے فوجی کارروائی کرکے بزور گوا پر قبضہ کرلیا۔

اس سلسلہ میں انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) کے مقالہ نگار نے نہایت بامعنی بات لکھی ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ نہرو کے فوجی قبضہ کے بعد مغربی ملکوں میں اس کے خلاف کافی شور وغل ہوا مگر تاریخ کی روشنی میں نہرو کا اقدام جائز تھا۔ برطانی اور فرانسیسی واپسی کے بعد ہندستان میں پرتگالی مقبوضات کی موجودگی ایک خلاف زمانہ حرکت تھی:

> With the withdrawl of the British and the French, the Portugese colonial presence in India became an anachronism (12/946).

حقیقتِ واقعہ کا اعتراف اگر آپ بخوشی نہ کریں تو بالآخر آپ کو حقیقتِ واقعہ کا اعتراف بجبر کرنا پڑے گا۔ اور دوسری صورت کے مقابلہ میں پہلی صورت یقینی طور پر زیادہ اہون ہے۔

تریوندرم سے جہاز بدلنا تھا، اس لئے یہاں چند گھنٹے رکنا پڑا۔ تریوندرم ریاست کیرلا کا دار السلطنت ہے جو ساحل سمندر سے ایک میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ تریوندرم کو پہلی بار ۱۷۴۵ میں اہمیت حاصل ہوئی جب کہ راجہ مارتنڈ اورما نے اس کو اپنی راجدھانی قرار دیا۔ کیرلا یونیورسٹی یہیں قائم ہے۔ مشہور اورینٹل کانفرنس (۱۹۳۷) تریوندرم ہی میں ہوئی تھی۔ اس کے صدر

ڈاکٹر ٹامس (F.F. Thomas) تھے۔ انھوں نے میکس مولر کا حوالہ دیتے ہوئے یہ انوکھی بات کہی تھی کہ سنسکرت اس ملک میں اتنی ہی عام ہے جتنا کہ قدیم یورپ میں لاتینی تھی۔ اور سنسکرت کی ایک سادہ صورت (Simple form) کو پورے ملک کی مشترک زبان بنانے کی حوصلہ افزائی کی جانی چاہئے (ڈسکوری آف انڈیا، صفحہ ۱۲۷)

تریوندرم جنوبی ساحل پر واقع ہے جہاں بحر عرب کی لہریں آکر ہندستان کی سرزمین سے ٹکراتی ہیں۔ اس علاقہ کی اہم ترین خصوصیت یہ ہے کہ یہاں اسلام عرب تاجروں کے ذریعہ آیا۔ اس طرح یہاں کے لوگ اسلام سے اس خالص تعمیری پہلو کی حیثیت سے آشنا ہوئے جس کو پنڈت جواہر لال نہرو نے شاندار کلچر (Brilliant culture) سے تعبیر کیا ہے۔

عرب تاجروں کے غیر سیاسی اور تعمیری انداز نے لوگوں کو اسلام کا گرویدہ بنا دیا۔ نہ صرف عوام بلکہ راجے اور مہاراجے بھی اسلام سے شدید طور پر متاثر ہوئے۔ کالی کٹ کے راجہ زمورن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ عرب تاجروں کا سرپرست بن گیا۔ اور اپنی رعایا میں قبول اسلام کی حوصلہ افزائی کرنے لگا (پریچنگ آف اسلام، ۲۶۹)

پروفیسر آرنلڈ نے لکھا ہے کہ سولھویں صدی کے آغاز میں موپلا نومسلم مالا بار کی آبادی کا تقریباً پانچواں حصہ تھے۔ اگر پرتگالی اس علاقہ میں نہ پہنچتے تو اس ساحل کے تمام لوگ مسلمان ہو جاتے۔ کیوں کہ وہ کثرت سے اسلام قبول کر رہے تھے اور مسلم تاجروں کا طبقہ ان کے اوپر نہایت گہرا اثر ڈال رہا تھا (۲۶۹)

9 ہندستان میں "ملک" ایک واحد جغرافی خطہ کا نام ہوتا ہے۔ مگر جب آپ مالدیپ کی فضا میں پہنچ کر نیچے کی طرف نظر ڈالیں تو "ملک" کا تصور بالکل بدلا ہوا ہوگا۔ یہاں "ملک" ایک ایسے مجموعہ کا نام ہے جو متفرق صورت میں سمندر کے اندر دور دور تک بکھرا ہوا ہو۔ مالدیپ ۱۰۸۴ چھوٹے چھوٹے جزیروں پر مشتمل ہے۔ ان کا مجموعی رقبہ ۲۹۸ مربع کیلومیٹر ہے۔ یہ چھوٹے چھوٹے جزیرے سمندر میں تقریباً ساڑھے سات سو کیلومیٹر لمبائی اور تقریباً سوا سو کیلومیٹر چوڑائی میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ان میں سے صرف ۲۱۹ جزیرے آباد ہیں جن میں یہاں کے تقریباً پونے دو لاکھ باشندے رہتے ہیں۔ باقی جزیرے زیادہ تر جنگلات کی صورت میں ہیں۔ مالے (Male) نامی

جزیرہ یہاں کا دار السلطنت ہے۔ یہ جزیرہ صرف ایک میل چوڑا اور ڈیڑھ میل لمبا ہے۔

مالدیپ کے سابق وزیر اعظم مسٹر احمد ذکی مارچ ۱۹۷۴ میں ہندستان آئے تھے۔ یہاں انھوں نے ایک بیان میں کہا تھا کہ " ان کا ملک چھوٹے چھوٹے جزیروں میں بٹا ہوا ہے، اس بنا پر رسل ورسائل (Communication) کی بہت دشواری ہے۔ اس سلسلہ میں ہمیں آپ کی مدد کی ضرورت ہے"۔ آزادی (۱۹۶۵) کے بعد مالدیپ نے اس میدان میں خصوصی توجہ دی۔ اب یہ مسئلہ کافی حد تک حل ہو چکا ہے۔ تمام آباد جزائر میں بندرگاہیں بنی ہوئی ہیں۔ جدید طرز کی کشتیاں جزائر کو مربوط کرنے کے لئے ہر وقت سمندر میں دوڑتی رہتی ہیں۔ وائرلیس کا عمدہ نظام قائم ہے جس کی وجہ سے ایک لمحہ میں ایک جزیرہ اور دوسرے جزیرہ کے درمیان ربط قائم کیا جا سکتا ہے۔

ان چیزوں کو دیکھ کر میں نے سوچا کہ مالدیپ کے ذمہ دار اگر یہ مہم چلاتے کہ مالدیپ کے ۱۰۸۷ جزیروں کو ملا کر ایک کر دیا جائے تاکہ دوسرے ملکوں کی طرح ان کا ملک بھی ایک واحد زمینی خطہ بن جائے جس میں اس سرے سے اس سرے تک سڑکیں ہوں اور ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک ریلیں دوڑتی ہوں۔ اگر وہ ایسی مہم چلاتے تو وہ صرف ایک بے فائدہ لفظ بازی ہوتی جس کا موجودہ اسباب کی دنیا میں کوئی حاصل نہیں۔ مگر انھوں نے اس قسم کی کوئی مہم نہیں چلائی۔ اس کے برعکس انھوں نے صورت واقعہ کا اعتراف کرتے ہوئے اپنے حسب حال اپنے مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۲۵ سال کے اندر ان کا مسئلہ حل ہو گیا۔ جب کہ جزائر کی یکجائی کے لئے ان کی "مطالباتی مہم" ۲۵ ہزار سال میں بھی کسی نتیجہ پر پہنچنے والی نہیں تھی۔

اس دنیا میں کامیابی کی پہلی شرط حقیقت واقعہ کا اعتراف ہے۔ حقیقت واقعہ کے اعتراف کے بعد ہی کسی شخص یا قوم کا سفر شروع ہوتا ہے۔ جو لوگ حقیقت واقعہ کا اعتراف نہ کریں، ان کا سفر ہی شروع نہیں ہوگا۔ اور جس سفر کا آغاز نہ ہوا ہو وہ سفر اختتام پر کیسے پہنچ سکتا ہے۔

۵ دسمبر ۱۹۸۷ کی سہ پہر کو مالدیپ پہنچے۔ یہاں کا خاص شہر اور دار السلطنت مالے ہے۔ مالے سے کچھ فاصلہ پر ایک چھوٹا اور لمبا جزیرہ ہے۔ اس جزیرہ پر ہوائی اڈہ بنا ہوا ہے۔ اس جزیرہ کا رقبہ بس اتنا ہی ہے کہ وہ ایک اوسط درجہ کے ہوائی اڈہ کے طور پر استعمال ہو سکے۔

اس کا طرز تعمیر عام ہوائی اڈوں سے مختلف ہے۔ وہ جس طرح فطری ماحول میں ہے، اسی طرح وہ فطری انداز میں بنایا گیا ہے اور نہایت خوبصورت ہے۔

ہوائی اڈہ اور ملے کے درمیان سمندر حائل ہے۔ یہ فاصلہ جدید طرز کی موٹر بوٹ کے ذریعہ طے ہوا۔ یہ سفر اس درجہ پرکشش تھا کہ میرے ساتھ بیٹھے ہوئے ایک عرب شیخ بار بار "جمیل، جمیل" کہے جا رہے تھے۔ ہمارے پیچھے ہوائی اڈہ پر جہاز رن وے پر دوڑ رہا تھا، اور ہمارے سامنے مشینی کشتی سمندر کی موجوں کو پھاڑتی ہوئی آگے چلی جا رہی تھی۔ چاروں طرف آفاقی مناظر اور حسین فطرت آدمی کو مبہوت کر رہے تھے۔ اس تجربہ کے زیر اثر میں ہوٹل کے کمرے میں داخل ہوا تو وہاں دیوار پر ایک خوبصورت تصویر تھی جس میں سمندر کے پس منظر میں جزیرہ کو دکھایا گیا تھا۔ اس تصویر کے نیچے انگریزی میں یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے:

A taste of paradise

میں نے سوچا کہ جس جنت کی دور کی ایک جھلک اتنی حسین ہو، وہ جنت خود کتنی زیادہ حسین ہوگی۔ بے اختیار یہ دعا نکلی کہ خدایا، میرے پاس کوئی عمل نہیں جس سے میں جنت جیسی قیمتی چیز کا امیدوار بن سکوں۔ دوسرے لوگوں کو آپ جنت بطور جزا دیں گے، مجھ کو جنت بطور عطیہ دے دیجئے۔

موٹر بوٹ سے اتر کر سڑک پر آئے تو وہاں سب سے پہلے جو چیز نظر کے سامنے تھی وہ ایک بڑا سا بینر تھا جس پر لکھا ہوا تھا: مرحبا بالعلماء المسلمین علیٰ ارض الاسلام (اسلام کی سرزمین پر مسلم علماء کا آنا مبارک) یہ گویا پہلی تحریری علامت تھی کہ اب ہم اس منزل پر پہنچ گئے ہیں جہاں مذکورہ انٹرنیشنل اسلامک کانفرنس کا انعقاد ہونے والا ہے۔

پروفیسر ٹی ڈبلیو آرنلڈ نے اپنی کتاب پریچنگ آف اسلام میں مالدیپ کے تذکرہ کے ذیل میں لکھا ہے کہ گمان غالب ہے کہ مالابار کے راستہ سے اسلام مالدیپ میں پہنچا۔ اس جزیرے کے باشندے عرب اور ایرانی تاجروں کے ذریعے مسلمان ہوئے۔ یہ تاجر ان علاقوں میں آباد ہوتے۔ انھوں نے مقامی عورتوں سے شادیاں کیں اور اس طرح انھوں نے یہاں مؤثر تبلیغ کا راستہ ہموار کیا۔ اندازہ ہے کہ مالدیپ میں پہلا اسلام قبول کرنے والا شخص سلطان احمد شنورازہ تھا جو ۱۲۰۰ء کے قریب مسلمان ہوا۔ (صفحہ ۲۷۳) کچھ مورخین کا خیال ہے کہ لگ بھگ ۵۰۰ ء میں سیلون سے کچھ بدھسٹ یہاں آکر آباد

ہوئے۔ ۱۲ ویں صدی عیسوی میں ان لوگوں۔ اجتماعی طور پر اسلام قبول کر لیا۔

جناب ابراہیم شہاب (اسپیکر) نے مالد پ میں اسلام کے آغاز کی تاریخ کسی قدر مختلف انداز میں بتائی۔ انھوں نے کہا کہ پہلے یہاں ایک راجہ شری ہونا دیت تھے۔ ان کے زمانہ میں مغرب (افریقہ) سے ایک "ولی" ابوالبرکات یوسف البربری یہاں آئے۔ ۵۴۸ھ میں ان کے ہاتھ پر راجہ مسلمان ہوگیا اور اپنا نام محمد بن عبد اللہ رکھا۔ اس کے بعد تھوڑی مدت میں مالدیپ کے تمام باشندے مسلمان ہوگئے۔

جناب ابراہیم شہاب نے ایک اور عجیب بات یہ بتائی کہ سابق سلطان کا خاندان مالدیپ میں نئے حالات سے مکمل موافقت کر کے رہتا ہے۔ دوسرے باشندوں کی طرح اس کے افراد یا سروس میں ہیں یا تجارت میں۔ کسی شاہی خاندان کے لئے بدلے ہوتے حالات سے مطابقت کی یہ انوکھی مثال ہے جو غالباً یہاں کے سادہ فطری مزاج کی دین ہے۔

مالدیپ جیسے چھوٹے ممالک قدیم زمانہ میں ہمیشہ خطرہ کی حالت میں رہتے تھے۔ کسی بھی صبح دشام کو ئی بڑی طاقت آکر ان پر قبضہ کر سکتی تھی۔ مثلاً پرتگالی ۱۵۵۸ میں آکر مالدیپ پر قابض ہوگئے۔ ان کا قبضہ ۱۵۷۳ تک جاری رہا۔ سترہویں صدی عیسوی میں وہ ڈچ حکمرانوں کے ماتحت رہا۔ ۱۸۸۷ سے وہ برٹش کے قبضہ میں چلا گیا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد نو آبادیاتی نظام کمزور ہوا تو ۱۹۶۵ میں اس کو برطانیہ سے آزادی حاصل ہوگئی۔ ۱۹۶۸ سے مالدیپ میں مکمل جمہوریہ قائم ہے۔ موجودہ دور میں پہلی بار یہ ممکن ہے کہ چھوٹی قومیں بھی اپنی آزاد حکومت قائم کر سکیں۔ مالدیپ ۱۹۶۵ سے اقوام متحدہ کا ممبر ہے۔ یہاں تقریباً ۸۵ فی صد لوگ تعلیم یافتہ ہیں۔

مساوات اور قومی سالمیت اور انسانی آزادی کے احترام کا دور جو موجودہ زمانہ میں پیدا ہوا ہے اس کو عام طور پر لوگ اس جدید مغربی انقلاب سے منسوب کرتے ہیں جس کی ایک علامت اقوام متحدہ ہے۔ مگر خود جدید انقلاب اور اقوام متحدہ اس اسلامی انقلاب کی پیداوار ہیں جو چودہ سو سال پہلے پیغمبر اسلام اور آپ کے اصحاب نے عالمی سطح پر پیدا کیا تھا۔

۱۶ ویں صدی کے پرتگالی سیاح باربوسا (Duarte Barbosa) نے جنوبی ہند کا سفر کیا تھا۔ وہ ۱۵۰۴ اور ۱۵۱۷ کے درمیان وجیا نگرم آیا تھا۔ اس نے لکھا ہے کہ اس زمانہ

مالدیپ میں جہازسازی کی صنعت قائم تھی۔ اور جنوبی ہند کے لوگ اپنی ضرورت کے جہاز مالدیپ میں بنوایا کرتے تھے۔ وجیانگرم کے راجہ کے جہاز بھی مالدیپ سے بن کر آتے تھے۔

جواہرلال نہرو نے اپنی کتاب ڈسکوری آف انڈیا میں لکھا ہے کہ سلطان ٹیپو کا باپ حیدر علی (۸۲-۱۷۲۲) نہایت عزم اور حوصلہ والا آدمی تھا۔ وہ ہندستان کی تاریخ میں ممتاز شخصیت کا مالک تھا۔ وہ پورے ملک کا لیڈر بننے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ حیدر علی نے دوسروں سے بہت پہلے سمندری طاقت کا اندازہ کرلیا تھا اور یہ سمجھ گیا تھا کہ انگریزوں کی کامیابی کا اصل راز بحری طاقت میں ان کی برتری ہے۔ اس نے خود اپنا ایک بحری بیڑہ بنانا چاہا اور مالدیپ پر قبضہ کرکے اس کو جہازسازی اور بحری سرگرمیوں کا مرکز بنانے کی کوشش کی:

> He started building his own navy and, capturing the Maldive Islands, made them his headquarters for ship building and naval activities (p. 275).

مالدیپ کے ساحل پر جب میں نے یورپ کی بنی ہوئی مشینی کشتیوں کی قطاریں دیکھیں تو میں نے کہا: روایتی جہازسازی کے دور میں مالدیپ جہاز کا "تاجر" تھا، مگر سائنسی جہازسازی کے دور میں مالدیپ صرف "خریدار" بن کر رہ گیا۔ یہی موجودہ زمانہ میں تمام دنیا کے مسلمانوں کا حال ہے۔ مسلمان دور قدیم میں سب سے آگے تھے، مگر دور جدید میں وہ سب سے پیچھے ہوگئے۔

یہاں میرا قیام نسَن دُھرا پیلیس ہوٹل کے کمرہ نمبر ۱۰۸ میں تھا۔ یہ عین سمندر کے کنارے واقع ہے۔ ایک طرف ہوٹل کی عمارتوں کی صورت میں انسانی مصنوعات کا منظر ہے اور دوسری طرف سمندر کی لہروں اور پھیلے ہوئے آسمان کی صورت میں خدائی مصنوعات کا۔ ہوٹل اور سمندر کے درمیان صرف ایک سڑک حائل ہے۔ سمندر کا یہ منظر میرے لئے ہمیشہ وسخر لکم ما فی السمٰوات والارض کی تصویر ہوتا ہے۔ ان چھوٹے چھوٹے جزیروں کے مقابلہ میں سمندر ہیبت ناک حد تک بڑا ہے۔ مگر اس کی موجیں ساحل کو چھوکر اس طرح واپس چلی جاتی ہیں جیسے کہ ان کو ایک برتر حکم کے تحت پابند کردیا گیا ہو کہ تمہاری حد یہاں ختم ہوگئی، اس سے آگے تجاوز کرنے کی تمہیں اجازت نہیں۔

زندہ چیزوں میں ہاتھی اور غیر زندہ میں سمندر کا انسان کے لئے مسخر ہونا انتہائی عجیب ہے۔

اگرچہ سفر کا مقصد ایکسرسائز کرنا نہیں تھا مگر سفر کے دوران بہت سے تجربات ہوئے۔ ... یعنی اس سے بھی زیادہ عجیب ہیں۔ مگر ان کو جاننے کے لئے سائنسی معلومات کی ضرورت ہے لیکن ہاتھی اور سمندر کا منظر ہونا ایسے کھلے ہوئے واقعات ہیں جن کو ایک عام آدمی بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے۔ اور ان سے اپنے لئے سبق حاصل کر سکتا ہے۔

مالدیپ کو "سیاحوں کی جنت" کہا جاتا ہے۔ یہاں کثرت سے مغربی ملکوں کے لوگ تفریح اور سیاحت کے لئے آتے ہیں۔ ان میں سے کچھ لوگوں سے یہاں میری گفتگو ہوئی۔ میرا عام تاثر یہ ہے کہ مسلمانوں میں اور مغربی اقوام میں ایک خاص فرق پایا جاتا ہے۔ اگر آپ ایک مسلمان سے کسی موضوع پر گفتگو کریں تو اس کے لئے انتہائی مشکل ہوگا کہ وہ اپنے ذاتی خیالات سے الگ ہو کر آپ کی بات سن سکے۔ وہ آپ کی بات کو اس طرح سنتا ہے جیسے کہ کب آپ کی بات ختم ہو اور وہ دوبارہ اپنے دماغ کا ٹیپ کھول دے۔

میں نے اپنے تجربہ میں بار بار یہ محسوس کیا ہے کہ اس معاملہ میں مغربی انسان کا حال بالکل مختلف ہے۔ ذاتی طور پر وہ خواہ کوئی بھی خیال رکھتا ہو، مگر جب آپ اس سے ایک بات کہیں تو وہ اپنے خیالات سے جدا ہو کر آپ کی بات کو سنے گا۔ ایسا معلوم ہوگا جیسے کہ تھوڑی دیر کے لئے وہ خالی الذہن ہے اور ہر دوسری چیز سے بالکل بے تعلق ہو کر آپ کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ یہ بے حد فرق ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ سب سے بڑا سبب ہے جس نے موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کو جمود کی حالت میں مبتلا کر دیا ہے، اور مغربی قومیں مسلسل ترقی کی طرف اپنا سفر جاری کئے ہوئے ہیں۔

یہاں ایک پاکستانی افسر سے ملاقات ہوئی۔ وہ دہلی میں پیدا ہوئے تھے اور اگست ۱۹۴۷ میں پاکستان منتقل ہو گئے۔ گفتگو کے دوران انھوں نے کہا کہ میرا ڈس ایڈوانٹیج یہ ہے کہ میں "اردو اسپیکنگ مہاجر" ہوں، اس لئے بڑی ترقیوں کے دروازے میرے لئے بند ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہمارا گروہ اقلیت میں ہونے کی وجہ سے پاکستان میں بے حیثیت ہو رہا ہے۔ ان کے الفاظ میں: مہاجرین کے اندر Nuisance value تو ہے، مگر ان کے اندر Democratic value اس لئے وہ شور و غل تو کر سکتے ہیں، مگر وہ ملک کے ڈھانچہ میں کوئی موثر تبدیلی لانے کی طاقت نہیں رکھتے ——— جو لوگ "ہندو اکثریت" سے خائف ہو کر پاکستان چلے گئے تھے، وہ د

خود مسلم اقلیت" کا شکار ہو کر رہ گئے۔

یہ بات جو مذکورہ پاکستانی نے اپنے ملک کے بارہ میں کہی، یہی ہندستان کے مسلمانوں کے بارہ میں بھی درست ہے۔ یہاں کے مسلمان جلسے جلوس، تقریروں اور بیانوں کے ہنگامے تو دکھا رہے ہیں مگر وہ ملکی نظام پر اثر انداز نہیں ہو پاتے۔ اور اس کی مشترک وجہ یہ ہے کہ وہ اقلیت میں ہیں اور اس کے ساتھ غیر منظم بھی۔ ان کے موجودہ طریق کار کا یہ نتیجہ ہے کہ وہ صرف غوغائی گروہ Clamorous group کا لقب حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ ہندستانی مسلمانوں کو اس کے بجائے "تخلیقی گروہ" بننا چاہئے۔ انھیں احتجاج اور مطالبہ کے بجائے اپنی افادیت ثابت کرکے اس ملک میں اپنا مقام حاصل کرنا چاہئے۔

ایک اور پاکستانی مسلمان نے بتایا کہ ۱۹۸۶ میں کراچی میں شیعہ سنی فساد کا سبب جلوس تھا۔ شیعہ حضرات نے ایک ایسے راستہ سے اپنا جلوس نکالا جس پر سنی حضرات کو اعتراض تھا۔ انھوں نے روٹ بدلنے پر اصرار کیا۔ تاہم روٹ میں تبدیلی نہ ہو سکی اور فساد ہو گیا۔ یہی کہانی ہندستان میں بھی بار بار دہرائی جا رہی ہے۔ جلوس کے روٹ پر اعتراض کا سبب غالباً مسلمانوں کا بڑھا ہوا جذبہ فخر ہے۔ جلوس کو مسلمان شان وشوکت کا مظاہرہ سمجھتے ہیں، اس لئے غیر قوم کے جلوس کا اپنے علاقہ سے گزرنا انھیں گوارا نہیں ہوتا۔ مسلمانوں سے اگر جھوٹے فخر کی یہ نفسیات ختم ہو جائے تو جلوس جیسی چیزوں پر فساد برپا ہونے کا سلسلہ بھی یقیناً ختم ہو جائے گا۔

ڈاکٹر شیر چودھری جنوبی افریقہ سے آئے تھے۔ وہ اصلاً پنجاب سے تعلق رکھتے ہیں۔ مگر اب افریقہ میں وہاں کے شہری کی حیثیت سے رہ رہے ہیں۔ انھوں نے ایک گفتگو کے دوران بہت دل چسپ بات کہی۔ انھوں نے کہا کہ مسلمانوں کی اصلاح کیسے ہو۔ کوئی شخص جب مسلمانوں کی اصلاح کے لئے نکلتا ہے، تو خواہ وہ جدھر بھی نکلے، فوراً راستہ میں ایک مردہ آکر کھڑا ہو جاتا ہے اور اس کا سفر وہیں رک جاتا ہے (مردہ کھڑا ہونے سے ان کی مراد کیا تھی، اس کی تشریح ناظرین خود کر سکتے ہیں)

مذکورہ اسلامی کانفرنس کا ایجنڈا (جدول الاعمال) حسب ذیل تھا:

عالمی اسلامی مسائل پر رپورٹ

اسلامی تعلیم کا جائزہ

مشکلات جو عالم اسلامی کو درپیش ہیں (المشاکل التی تواجه العالم الاسلامی)

دنیا میں مسلم اقلیتوں کی حالت (اوضاع الاقلیات الاسلامیة فی العالم)

دعوت اسلامی میں مسلم عورت کا حصہ (دور المرأة المسلمة فی الدعوة الاسلامية)

۸ دسمبر سے ۱۱ دسمبر تک ان موضوعات پر بحث و گفتگو جاری رہی۔ اپنے عام طریقہ کے مطابق میں اس سفر نامہ میں رپورٹ کے انداز کی تفصیلات درج نہیں کروں گا۔ میں صرف ان چند یادوں کو پیش کروں گا جن میں کوئی سبق ہے اور جن میں عام لوگوں کے لئے غور وفکر کا سامان ملتا ہے۔

کانفرنس کا افتتاح ۸ دسمبر ۱۹۸۷ کی صبح کو اسلامک سنٹر کے ہال میں کیا گیا۔ یہ وسیع اور خوبصورت اسلامک سنٹر ابھی حال میں مختلف اسلامی ملکوں کے تعاون سے تعمیر کیا گیا ہے۔ کارروائی کا آغاز مالدیپ کے ایک قاری کی قرأت قرآن سے ہوا۔ قاری جب قرآن کی قرأت کر رہا تھا تو اچانک مجھے یاد آیا کہ دنیا کے جس گوشہ میں بھی میں نے کسی شخص کو قرآن پڑھتے ہوئے سنا ہے، اس کی زبان اور اس کا لہجہ ہمیشہ ٹھیک وہی ہوتا ہے جو یہاں اس چھوٹے سے جزیرہ میں مجھ کو سنائی دے رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا چودہ سو سال پہلے ایک زندہ ٹیپ تیار کیا گیا تھا، یہ ٹیپ آج بھی اپنی اصل صورت میں محفوظ ہے اور اسی ابتدائی آواز میں ہر جگہ لوگوں کو خدا کا ابدی پیغام سنا رہا ہے۔

مالدیپ کے صدر مامون عبد القیوم کے کلمات سے کانفرنس کی کارروائی شروع ہوئی۔ انھوں نے اپنی عربی تقریر میں خصوصیت کے ساتھ باہمی اتفاق واتحاد پر زور دیتے ہوئے کہا:

لقد نسینا قول الله عز وجل (ولا تنازعوا فتفشلوا وتذهب ریحکم) ونسینا قول رسوله الکریم (لا تباغضوا ولا تحاسدوا ولا تدابروا ولا تقاطعوا وکونوا عباد الله اخوانا)

میں نے سوچا کہ مسلمان کس قدر خوش قسمت ہیں کہ خدا اور رسول کے کلام کی صورت میں ان کے پاس ایک ایسا مستند ہدایت نامہ موجود ہے جس کا حوالہ باہمی معاملات میں دیا جا سکتا ہو اور جس

آگے تمام لوگوں کی گردنیں جھک جائیں۔ اس کے باوجود یہ کیسی عجیب بات ہے کہ مسلمانوں کا حال موجودہ زمانہ میں ایسا ہو رہا ہے جیسے کہ ان کے پاس کوئی متفقہ اعتقادی بنیاد ہی نہیں — کسی قوم کے افراد میں اگر بے حسی پیدا ہو جائے تو انتہائی قیمتی پیغام بھی اس کے لئے بے اثر ہو جاتا ہے۔

• مجھے جہاں کہیں بھی موقع ملا، میں نے دعوت کے پہلو پر زور دیا۔ ایک عرب مقرر نے اپنی تقریر میں کہا کہ کیف ندعوا غیر المسلمین الی الاسلام و المسلمون منہزمون امام اعدائھم (ہم کیسے غیر مسلموں کو اسلام کی طرف دعوت دے سکتے ہیں جب کہ مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ اپنے دشمنوں کے سامنے شکستہ اور مغلوب ہو رہے ہیں) میں نے کہا کہ قدیم زمانہ میں مسلمان اپنے دشمنوں سے مغلوب تھے، اس کے باوجود انھوں نے ان کو دعوت دی اور کامیابی حاصل کی۔ تاتاری حملہ کے بعد مسلمان مغلوب ہو گئے تھے، پھر بھی انھوں نے ان کو دعوت دی اور اسلامی دعوت کے ذریعہ دوبارہ مسلم دنیا میں اسلام کی ایک نئی تاریخ ظہور میں آئی۔

موجودہ زمانہ میں مسلمان ہر دوسرے پروگرام کو فوراً سمجھ لیتے ہیں۔ مگر خالص اسلامی دعوت کا پروگرام ان کی سمجھ میں نہیں آتا، اگرچہ اس کے حق میں کتنے ہی زیادہ دلائل پیش کر دئے جائیں۔ دوسرے پروگراموں کی مسلسل ناکامی کے باوجود اس طریقہ کے بارے میں ان کا یقین ختم نہیں ہوتا۔ اصل یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں پر "مسائل دنیا" کا غلبہ ہے۔ ان کے اوپر "مسائل آخرت" کا غلبہ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قومی اور دنیوی نوعیت کے مسائل فوراً ہر شخص کی سمجھ میں آجاتے ہیں۔ مگر ان کی سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ اللہ تعالیٰ آخرت میں مسلمانوں کو اقوام عالم کے اوپر گواہ بنانا چاہتا ہے اور آخرت کی یہ گواہی وہ اسی وقت دے سکتے ہیں جب کہ اس سے پہلے دنیا میں انھوں نے دعوت الی اللہ کا کام کیا ہو۔

عام طور پر لوگ بڑے بڑے واقعات سے دلچسپی لیتے ہیں۔ اس کے برعکس مجھے ہمیشہ ان چیزوں سے دلچسپی ہوتی ہے جن کو لوگ معمولی سمجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ مثلاً بین اقوامی اجتماعات میں فوری ترجمہ کا انتظام۔ یہ ایک عام اور معلوم بات ہے۔ مگر جب میں اس کو دیکھتا ہوں تو وہ مجھ کو اتنا عظیم معلوم ہوتا ہے کہ شدت تاثر سے میرے جسم میں تھرتھری پیدا ہو جاتی ہے۔

ایک شخص عربی زبان میں تقریر کر رہا ہے۔ عین اسی وقت اس کی تقریر انگریزی زبان میں منتقل کی جا رہی ہے۔ مثلاً ایک مقرر اپنی تقریر کے دوران ایک تجویز پیش کرتے ہوئے کہتا ہے: لہذا انی اقترح، عین اسی وقت مترجم کہتا ہے Therefore I propose اسی طرح مثلاً ایک شخص کی تقریر کے دوران دوسرا شخص مداخلت کرتے ہوئے کہتا ہے: نقطۃ نظام۔ عین اسی وقت مترجم کہتا ہے: Point of order بظاہر یہ ایک انسانی واقعہ ہے مگر جب میرے سامنے یہ واقعہ گزرا تو وہ مجھے ایک خدائی کرشمہ معلوم ہونے لگا۔ میں نے سوچا کہ دو الگ الگ ذہنوں کے درمیان ایک انتہائی پیچیدہ معاملہ میں انتہائی کامل مطابقت اس کے بغیر ممکن نہیں کہ دونوں شخصیتوں کا خالق (بالفاظ دیگر منصوبہ ساز) ایک ہو۔ اور دونوں کا منصوبہ ساز ایک ہستی کو مانتے ہی یہ ماننا بھی لازم ہو جاتا ہے کہ انسان کا خالق "شعور" ہے نہ کہ بے روح مادی اسباب کا اندھا تعامل۔

اسی طرح بڑی کانفرنسوں میں یہ منظر عام ہے کہ ٹیلی وژن کے آدمی مشینیں لئے ہوئے موجود ہیں اور لوگوں کی آوازیں اور ان کی حرکات ریکارڈ کر رہے ہیں۔ ۹ دسمبر کی رات کو میٹنگ چل رہی تھی۔ حسب معمول دو آدمی اپنی مشینوں کے ساتھ اپنی کارگزاری میں مصروف تھے۔ میں نے اس منظر کو دیکھا تو اچانک وہ میرے ذہن میں اس واقعہ میں مبدل ہو گیا جس کا ذکر قرآن میں ان الفاظ میں آیا ہے: اذ یتلقی المتلقیان عن الیمین وعن الشمال قعید (ق: ۱۷) ایک منٹ کے لئے مجھے ایسا لگا جیسے واقعۃً ہمارے دونوں طرف فرشتے کھڑے ہوئے ہیں اور نہایت صحت کے ساتھ ہمارے قول و عمل کا ریکارڈ تیار کر رہے ہیں۔

ایک بزرگ (شیخ راشد فرحان) نے کہا تھا کہ ہمیں سیاست سے الگ رہ کر صرف دعوت کے کام پر مرتکز رہنا چاہئے۔ اس پر ایک نوجوان نے پرجوش طور پر کہا کہ اسلام صرف مذہب نہیں، اسلام سیاست بھی ہے۔ اس لئے ہم اپنے پروگراموں سے سیاست کو الگ نہیں کر سکتے۔ اس کے جواب میں ڈاکٹر اسکندر نے کہا: یہ صحیح ہے کہ اسلام دین اور سیاست دونوں ہے۔ مگر اسی کے ساتھ اسلام حکمت بھی ہے۔ اور حکمت کا تقاضا ہے کہ اس وقت ہم سیاسی میدان سے الگ رہیں۔ ورنہ کوئی بھی کام کرنا مشکل ہو جائے گا۔ ہم کو ایسا نہیں کرنا چاہئے کہ کل کو...

کی کوشش میں جزء کو بھی کھو دیں، حتی کہ خود دعوت کو بھی۔

ایک عرب نوجوان نے پرجوش طور پر اس چیز کا ذکر کیا جس کو آجکل صحوۃ اسلامیۃ (اسلامی بیداری) کہا جاتا ہے۔ میں نے کہا کہ یہ صحوہ اسلامیہ نہیں ہے بلکہ صحوہ قومیہ ہے۔ ان تحریکوں کے پیچھے رومانی جوش کے سوا اور کچھ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے منفی دھوم میں تو ضرور اضافہ کیا ہے۔ مگر ان کے ذریعہ اب تک کوئی مثبت انجام ظاہر نہ ہو سکا۔

اسلامی صحافت کے موضوع پر کلام کرتے ہوئے ایک صاحب نے کہا جو لندن سے آئے تھے، کہ ہمارے نزدیک اسلامی صحافت کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کو معصوم فرض کرتے ہوئے صرف اغیار کو ظالم اور فاسد بتایا جائے۔ انھوں نے کہا کہ ایک طرف ہماری یہ "اسلامی صحافت" ہے۔ دوسری طرف یہودی صحافت کا حال یہ ہے کہ میں یہودیوں کے بڑے بڑے اخبارات کو پابندی کے ساتھ پڑھتا ہوں۔ میں نے پایا ہے کہ یہودی اخبارات میں کسی تحفظ کے بغیر یہودیوں کے درمیان پائی جانے والی خرابیوں کو بتایا جاتا ہے اور کوئی یہودی اس کو برا نہیں مانتا۔ انھوں نے مزید کہا کہ مسلمانوں کی یہ شکایت اگر صحیح مان لی جائے کہ یہودی اور عیسائی اخبارات ہمیشہ مسلمانوں کی بری تصویر پیش کرتے ہیں تو یہی بات خود مسلم اخبارات بھی عیسائیوں اور یہودیوں کے بارہ میں کر رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ مسلم صحافت سے اگر ہماری مراد مسلم وکالت ہے تو یہ بالکل بے فائدہ ہے۔ اس کے برعکس مسلم صحافت کو بیانِ واقعہ پر مبنی ہونا چاہئے۔ اس طرح ایک طرف ہم اپنے نقائص سے مطلع ہو کر اس کی اصلاح کی طرف توجہ دے سکیں گے۔ دوسری طرف ہمارے اخبار کو قارئین کے درمیان مقبولیت حاصل ہوگی۔ وکیلانہ صحافت کو کبھی عمومی ریڈر شپ نہیں مل سکتی، حتی کہ اس گروہ کے درمیان بھی نہیں جس کی وکالت کے لئے اسے جاری کیا گیا ہے۔

سری لنکا سے ایک صاحب کانفرنس میں شریک ہوئے۔ انھوں نے ان مظالم کی تفصیل بیان کی جو اکتوبر۔ نومبر ۱۹۸۷ میں وہاں کے مسلمانوں کو پیش آئے اور جس کے نتیجے میں تقریباً پچاس ہزار آدمی اپنے وطن کو چھوڑنے پر مجبور ہوئے۔ انھوں نے جو تفصیلات بیان کیں، ان سے میں نے جو نتیجہ نکالا، وہ یہ تھا کہ سری لنکا کے ایک علاقہ میں تامل باشندوں نے آزاد تامل اسٹیٹ کا مطالبہ کیا۔ اس علاقہ کے ایک مختصر حصہ میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ ان مسلمانوں کو اندیشہ ہوا کہ وہ تامل اسٹیٹ کے

اندر کمزور اقلیت بن جائیں گے۔ چنانچہ ان کے لیڈروں نے مطالبہ کیا کہ اس علاقے میں ایک "مسلم پراونشیل کونسل" بنائی جائے جس کو اپنے اندرونی معاملات میں آزادی حاصل ہو۔ اس مقصد کے لئے براہ راست یا بالواسطہ مطالبے اور مظاہرے شروع ہوئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سری لنکا کے مسلمان حکومت اور تامل "ٹائیگرس" دونوں کی نظر میں مشتبہ ہو گئے۔ اسی سیاست کا نتیجہ ہے کہ جس سے آجکل سری لنکا کے ایک ملین سے زیادہ مسلمان دوچار ہیں۔

سری لنکا اور دوسرے بہت سے ملکوں (مثلاً برما، فلپائن، اریٹیریا وغیرہ) میں آج کل مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے وہ میرے نزدیک "تقسیم" کی سیاست کی توسیع ہے۔ اس طرز کار کی نادرستگی خود اس ملک میں ثابت ہو چکی ہے جو تقسیم کی سیاست کے نتیجہ میں بنا تھا۔ یہ منقسم ملک ۱۹۷۱ میں دو ملک میں تقسیم ہو گیا اور اب وہاں تقسیم کرانے والے لوگ دوبارہ ایک اور تقسیم (مہاجر صوبہ) کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ اس واضح ناکامی کے باوجود جو لوگ بدستور تقسیم کو اپنے مسئلہ کا حل سمجھیں اور اس کے لئے تحریک چلائیں، ان کے متعلق کم سے کم جو بات کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ بصیرت سے محروم ہیں۔ ان کو ماضی کا گزرا ہوا واقعہ بھی دکھائی نہیں دیتا، پھر کیسے امید کی جا سکتی ہے کہ وہ مستقبل کے آنے والے واقعہ کو دیکھ سکتے ہیں۔

"جمہوریت" بظاہر اچھی چیز ہے۔ مگر جمہوریت کی صحیح کارکردگی کے لئے شعوری پختگی اور فکری انضباط نہایت ضروری ہے ورنہ جمہوریت بے فائدہ ہو کر رہ جاتی ہے۔ مثلاً اس کانفرنس میں ایک موضوع خواتین کے دعوتی رول (دور المرأة المسلمة فی الدعوة الاسلامیة) اس موضوع کا آغاز ایک صاحب کی تقریر سے ہوا۔ ان کی تقریر عمومی نوعیت کی تھی۔ چنانچہ فوراً ایک صاحب نے کہا کہ یہ تقریر غیر متعلق ہے۔ کیوں کہ ایجنڈا کے مطابق موضوع "دعوت اسلام میں مسلم عورت کا رول" ہے اور مقرر نے عمومی طور پر مسئلہ خواتین پر تقریر کی ہے۔ دوسرے صاحب نے کہا کہ "دعوت" کسی محدود چیز کا نام نہیں۔ دعوت سے مراد تمام اسلامی سرگرمیاں ہیں۔ ایک صاحب نے اپنی پرجوش تقریر میں کہا کہ دعوت کا مطلب میرے نزدیک اسلام کا عملی پہلو (Practical aspect of Islam) ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح کی بحثیں دیر تک ہوتی رہیں اور کوئی متعین اور مثبت چیز سامنے نہ آسکی۔

جمہوری انداز کی ہر میٹنگ یا کانفرنس میں میں نے یہی منظر دیکھا ہے۔ ہمارے لیڈر جو جمہوریت کی حمایت میں پر جوش تقریریں کرتے ہیں، انھیں اس سے پہلے لوگوں کے اندر یہ صلاحیت پیدا کرنی چاہئے کہ وہ فکری انضباط کے ساتھ سوچنے کے قابل ہوسکیں۔

مدرسہ کی تعلیم کے زمانہ میں میرے ایک ساتھی محمد عبدالرشید برمی تھے۔ وہ رنگون کے رہنے والے تھے۔ اپنے ملک واپس جانے کے بعد انھوں نے " برمی مسلم آرگنائزیشن " کے نام سے ایک جماعت بنائی۔ وہ اس کے صدر تھے۔ یہ تنظیم برما میں بہت مقبول ہوئی۔ وہ ایک اچھے مقرر تھے انھوں نے الکشن میں حصہ لیا۔ پارلیمنٹ کے ممبر منتخب ہوئے اور اس کے بعد " لیبر اینڈ انڈسٹری " محکمہ کے وزیر مقرر ہوئے۔ دوسرے ممالک سے برما کے تعلقات قائم کرنے میں انھوں نے اہم رول ادا کیا اور ملک میں غیر معمولی مقبولیت حاصل کی۔

مالدیپ کی کانفرنس میں برما کے ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ عبدالرشید (ایم اے رشید) کے ساتھیوں میں سے تھے۔ ان سے ان کے بارہ میں کافی معلومات حاصل ہوئیں۔ انھوں نے بتایا کہ ۱۹۶۲ میں جب برما میں فوجی حکومت قائم ہوئی اور اس نے منتخب حکومت کو ختم کر دیا تو عبدالرشید صاحب کھل کر اس کے خلاف تنقیدیں کرنے لگے:

He used to criticise the government openly

چنانچہ حکومت ان کی مخالف ہوگئی۔ آخر عبدالرشید صاحب پاکستان چلے گئے اور وہیں ۱۹۷۸ میں ان کا انتقال ہوگیا۔

انھوں نے مزید بتایا کہ عبدالرشید صاحب نے اپنی وزارت کے زمانہ میں علماء کی ایک کمیٹی بنائی تھی۔ اس کمیٹی نے قرآن کا ترجمہ برمی زبان میں کیا۔ تاہم اس کے چھپنے سے پہلے عبدالرشید صاحب کی حکومت ختم ہوگئی۔ بعد کو قرآن کا یہ ترجمہ خود موجودہ حکومت کے تعاون سے شائع ہوا۔ موجودہ حکومت مسلم تنظیموں کو ۶۵۰۰۰ چاٹ (برمی سکہ) سالانہ امداد دیتی ہے۔ اسی سے مذکورہ ترجمہ قرآن شائع کیا گیا ہے۔

میں نے کہا کہ عبدالرشید صاحب نے ختم حکومت کے بعد جو راستہ اختیار کیا، وہ یہ تھا کہ نئی حکومت کے مخالف بن کر کھڑے ہوں اور بالآخر پاکستان جاکر خاموشی کے ساتھ فوت ہو جائیں۔ اگر

کے بجائے اگر انھوں نے بدلے ہوئے حالات سے مطابقت کی روش اختیار کی ہوتی تو عین ممکن تھا کہ ان کو نئے حالات میں دوبارہ مواقع کار مل جائیں جس طرح ان کے ترجمہ قرآن کے کام کو نئی حکومت کے زمانہ میں مواقع ملے۔ مذکورہ برمی مسلمان میری یہ بات سن کر خاموش ہو گئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ طرز فکر ان کے لئے بالکل نیا ہے۔

ایک صاحب جنوبی افریقہ سے آئے تھے۔ میں نے دیکھا کہ وہ اچھی انگریزی بولتے ہیں اور کافی معلومات رکھتے ہیں۔ میرے پاس گاڈ ارائزز (God Arises) کا ایک نسخہ تھا۔ میں نے واپسی کی شرط پر ان کو یہ کتاب دیکھنے کے لئے دی۔ اگلے دن انھوں نے بتایا کہ میں کتابیں چوری کرنے کا قائل نہیں ہوں۔ مگر آپ کی اس کتاب کو دیکھنے کے بعد اس کے بارہ میں میری نیت خراب ہوگئی ہے۔ میں اس کو واپس کرنا نہیں چاہتا۔ انھوں نے کہا کہ اس کی انگریزی اتنی اچھی ہے کہ میں نے بے شمار کتابیں پڑھی ہیں مگر اب تک کسی دینی شخصیت کی کتاب میں مجھے ایسی انگریزی زبان نہیں ملی۔ مجھے حیرت ہے کہ آپ نے کیوں کر ایسی کتاب تیار کی۔ میں نے وہ کتاب ان کے حوالے کر دی۔ گفتگو سے اندازہ ہوا کہ وہ علمی ذوق رکھتے ہیں اور کثرت سے مطالعہ کرتے رہتے ہیں۔ چنانچہ میں نے ایک اور کتاب انھیں دیدی جو "پرافٹ آف ریولیوشن" کے نام سے شائع ہوئی ہے۔

"بغیر دیکھے میں جانتا ہوں آپ کو آپ کی کتابوں سے" یہ کہتے ہوئے ایک صاحب مجھ سے ملے۔ ان کے صاف اردو لہجہ پر مجھے تعجب ہوا۔ یہ جناب ابراہیم شہاب تھے جو مالدیپ کی اسمبلی میں اسپیکر ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ انھوں نے جامعہ ملیہ (دہلی) میں اس وقت تعلیم حاصل کی ہے جب کہ جامعہ قرول باغ میں تھی، پھر انھیں کے زمانے میں وہ اوکھلا منتقل ہوگئی۔

ملاقاتوں کے دوران معلوم ہوا کہ یہاں بہت سے مرد اور عورتیں ہیں جو الرسالہ سے واقف ہیں یا اسلامی مرکز کی اردو یا عربی یا انگریزی کتابیں پڑھی ہیں۔ ایک خاتون جو ایک مقامی اخبار سے منسلک ہیں، انھوں نے بتایا کہ ہم نے الرسالہ کے کئی مضامین دویہی زبان میں ترجمہ کر کے مقامی اخبار میں شائع کئے ہیں۔ (مالدیپ کی مقامی زبان کا نام دویہی ہے)

جناب عبد اللطیف صاحب کا تعلق ایجوکیشن منسٹری سے ہے۔ انھوں نے بتایا کہ مالدیپ میں بہت سے لوگ ہیں جنھوں نے آپ کی کتابیں (عربی یا انگریزی) پڑھی ہیں۔ ہم لوگ دینی علمی موضوعات

ہیں آپ ہی کے افکار کا حوالہ دیتے ہیں، کیوں کہ وہ سائنٹفک انداز میں ہوتے ہیں۔ ان کو میں نے الرسالہ انگریزی (نومبر، دسمبر ۱۹۸۷) ایک ایک عدد دیا۔ جناب عبدالحمید عبدالوہاب (ہائیکورٹ) کا خط مجھے دہلی میں ملا تھا، انھوں نے دو کتابوں کی فرمائش کی تھی۔ یہ کتابیں میں اپنے ساتھ لایا تھا اور یہاں ان کے حوالہ کر دیا۔ یہ کتابیں تھیں : خاتون اسلام اور گاڈ ارائزز۔

ایک صاحب کناڈا سے آئے تھے۔ وہ کناڈا ہی میں پیدا ہوئے، ان کی مادری زبان انگلش ہے۔ انھوں نے اعلیٰ مرحلہ تک کناڈا ہی میں تعلیم حاصل کی ہے۔ ان کو میں نے انگریزی الرسالہ دیکھنے کے لئے دیا۔ انھوں نے اسی دن سب پڑھ ڈالا۔ انھوں نے خاص طور پر "چھوٹے چھوٹے بامعنی مضامین" کو پسند کیا۔ میں نے الرسالہ کی زبان کے بارہ میں ان کی رائے پوچھی۔ انھوں نے کہا:

> The articles were not written as translations from Urdu or Arabic into English, but as from English to English.
>
> Haroon Salamat, P.O. Box 66
> Station U, Toronto, ONT, Canada M8Z ITO

۷ دسمبر ۱۹۸۷ کی شام کا کھانا ایک اور جزیرہ پر رکھا گیا تھا۔ اس کو یہاں کی زبان میں کورمبا گاؤں (Kurumba village) کہا جاتا ہے۔ کانفرنس کے تمام شرکاء بڑی موٹر بوٹ کے ذریعہ مالے سے کورمبا لے جائے گئے۔ اس جزیرہ پر سیاحوں کے لئے بہت بڑا ہوٹل بنایا گیا ہے۔ اسی ہوٹل میں کھانے کا انتظام کیا گیا تھا۔

جزیرہ مالے سے جزیرہ کورمبا تک ۲۰ منٹ کا راستہ ہے۔ اس وقت سمندر میں کسی قدر تموج تھا، اس لئے موٹر بوٹ معمول سے زیادہ ہلنے لگی۔ اس قسم کا تموج مہلک نہیں، تاہم وہ انسان کے عجز کے مقابلہ میں سمندر کی طاقت کا تجربہ کراتا ہے۔ میں نے کہا کہ خدایا، جس طرح آپ اتھاہ سمندر میں غرقابی سے بچاتے ہوئے میرا سفر طے کرا رہے ہیں، اسی طرح معاندین کی سازشوں سے محفوظ رکھ کر اس مشن کو جاری رکھئے، جس کے لئے اٹھنے کی آپ نے اس عاجز اور حقیر بندے کو توفیق عطا فرمائی ہے۔

ایک روز کھانے کی میز پر میرے سامنے نئے حلیہ کے ایک آدمی تھے۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ وہ جاپانی ہیں۔ ان کا نام تسوگو کٹ کورا ہے۔ مالدیپ میں آجکل جاپان کی امداد کے تحت ٹیلیفون لگائے جا رہے ہیں، اس میں وہ بطور کنسلٹنٹ یہاں آئے ہیں۔ وہ ٹوکیو کے مضافات میں ۱۷ جنوری ۱۹۳۰ کو

پیدا ہوئے۔ وہ دوسری جنگ عظیم کے وقت مڈل اسکول کے طالب علم تھے۔

ان سے انگریزی میں گفتگو ہوئی۔ میں نے کہا کہ جاپانیوں کے بارہ میں مجھے سب سے زیادہ عجیب چیز ان کی تبدیلی کی صلاحیت معلوم ہوتی ہے۔ یہی ان کی ترقی کا راز ہے۔ دوسری جنگ عظیم تک وہ بالکل جنگ جو قوم تھے۔ دوسری جنگ کے خاتمہ پر اچانک وہ پر امن قوم بن کر تعلیم اور سائنس کے میدان میں سرگرم ہوگئے۔ جاپانیوں نے اس صلاحیت کا سوچشمہ کیا ہے۔

انھوں نے اس کا سبب جاپانی جغرافیہ کو قرار دیا۔ انھوں نے کہا کہ جاپان میں سال میں چار موسم ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ سے ہمیں بار بار اپنے آپ کو بدلنا پڑتا ہے۔ جاپان میں کثرت سے زلزلے اور طوفان آتے ہیں اس لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ ہم ہر وقت نئی صورت سے مطابقت کرنے کے لئے تیار رہیں۔ اسی کا یہ نتیجہ بھی ہے کہ جاپانی لوگ نئی باتوں کو جاننے کے لئے بے حد متجسس رہتے ہیں:

Japanese are very curious to know new things, new ideas

جاپانی قوم کی اسی صلاحیت کا نتیجہ تھا کہ جنگ عظیم کی بربادی کے بعد ان کے اندر شدت سے نئی سوچ ابھری۔ انھوں نے سابقہ روش کو ترک کرکے نئے حالات کے مطابق دوسری روش اختیار کر لی۔ میں سوچا کہ یہ فرق بھی کتنا عجیب ہے۔ ایک قوم کے لئے اس کے "زلزلے" ترقی کا زینہ بن جاتے ہیں، اور دوسری قوم کے "زلزلے" اس کو صرف فریاد و ماتم کی غذا دے رہے ہیں۔

مسٹر شوگو کٹاکورا سے دوسری بار ۱۰ دسمبر کو ملاقات ہوئی تو میں نے خدا اور مذہب کے موضوع پر تفصیلی گفتگو کی۔ انھوں نے اپنا کارڈ دیا جس میں ان کا حسب ذیل پتہ لکھا ہوا تھا

Shogo Katakura, 33, Udagawa-Cho, Shibuya-Ku
Tokyo 150, Japan. Phone 81-3-4622221

وہ پیدائشی طور پر بدھسٹ ہیں۔ مگر خدا اور مذہب کے بارہ میں زیادہ یقین نہیں رکھتے۔ زندگی بعد موت کے بارہ میں مشتبہ ہیں۔ میں نے کہا کہ ایک برطانی مصنف نے لکھا ہے کہ جاپان کی جدید نسل کے اندر میٹریلزم سے بے اعتمادی پیدا ہو رہی ہے، وہ کہہ رہے ہیں ہمارا کلچر تو صرف مرچنٹ کلچر ہے، زندگی کے لئے صرف اتنا ہی کافی نہیں۔

انھوں نے کہا کہ یہ صحیح ہے۔ انھوں نے بتایا کہ دوسری جنگ کے بعد جاپان میں زندگی بہ

مشکل ہوتی تھی۔ کھانا اور کپڑا جیسا ضروری سامان بھی بہت کم ملتا تھا۔ چنانچہ جاپانیوں میں شدت سے کمانے کا جذبہ پیدا ہوا۔ اب موجودہ جاپانی کے پاس سب کچھ بافراط موجود ہے تو اس کو احساس ہو رہا ہے کہ صرف مادی ساز و سامان کافی نہیں۔ چنانچہ جاپان میں ایسے افراد کی تعداد تیزی سے بڑھ رہی ہے جو سب کچھ ہوتے ہوئے بھی سادہ زندگی گزارتے ہیں۔ اور مادیت سے آگے کسی اور چیز کی تلاش کر رہے ہیں۔

جاپان کے لوگوں کو اسلام سے متعارف کیا جائے تو وہاں بہت تیزی سے اسلام پھیل سکتا ہے۔ مگر یہ کام صرف جاپانی زبان میں ممکن ہے کیوں کہ جاپان میں ایسے لوگ بہت کم ہیں جو جاپانی کے سوا کوئی اور زبان بخوبی جانتے ہوں۔

ایک صاحب سے گفتگو کے دوران یہ مسئلہ زیر بحث آیا کہ موجودہ زمانہ میں جو مسلم رہنما اٹھے، ان کے ساتھ اتنے زیادہ لوگ جمع ہوگئے جو کبھی کسی پیغمبر کے ساتھ بھی جمع نہیں ہوئے تھے، حتی کہ پیغمبر اسلام کے ساتھ بھی نہیں۔ اس کا سبب کیا ہے۔

میں نے کہا کہ اس کا سبب یہ ہے کہ پیغمبر کی دعوت ہمیشہ داخل رخی ہوتی ہے اور موجودہ زمانہ کے رہنماؤں کی دعوت خارج رخی تھی۔ یہی وہ فرق ہے جس نے دونوں کے پیروؤں کی تعداد میں اتنا زیادہ فرق پیدا کر دیا۔ اگر آپ ایسی تحریک اٹھائیں جس کی زد آدمی کی اپنی ذات پر پڑتی ہو، جو خود اپنے اندر تبدیلی کا تقاضا کرتی ہو تو آپ کو بہت کم ساتھ دینے والے ملیں گے، کیوں کہ احتساب خویش انسان کے لئے سب سے زیادہ مشکل چیز ہے۔ اس کے برعکس اگر آپ ایسی تحریک اٹھائیں جس کی زد دوسروں کے اوپر پڑتی ہو، جس میں دوسروں کے خلاف جھنڈا اٹھانے کا موقع ملتا ہو تو آپ کے ساتھ بھیڑ کی بھیڑ جمع ہو جائے گی۔ کیوں کہ احتساب غیر انسان کی محبوب ترین چیز ہے۔

دکتور حسن القوتلی (پیدائش ۱۹۳۱) لبنان سے آتے تھے۔ کھانے کی میز پر ایک بار ان کا ساتھ ہو گیا۔ گفتگو کے دوران انھوں نے کہا کہ ہمارے ساتھیوں کے درمیان ایک مسئلہ پر کئی دن تک بحث ہوتی رہی۔ وہ مسئلہ یہ تھا کہ قرآن خدا کا مکمل کلام ہے یا جزئی کلام۔ اس سوال کی بنیاد یہ تھی کہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ اگر تمام سمندر سیاہی بنا دئے جائیں اور خدا کے کلمات لکھے جائیں تو سمندر ختم ہو جائیں گے، مگر خدا کے کلمات ختم نہ ہوں گے (الکہف ۱۰۹) گویا خدا کے کلمات غیر محدود ہیں جبکہ

قرآن محدود کتاب ہے۔ اسی طرح قرآن۔۔۔ ہے کہ ۔۔۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ خدا کا کلام جاری ہے، وہ ختم نہیں ہوا۔

میں نے پوچھا کہ پھر آپ لوگوں نے کس رائے پر اتفاق کیا۔ انھوں نے کہا کہ ہم نے اس پر اتفاق کیا کہ: إنّ كلام الله في القرآن هو كلام الله بالمجمل. أما كلامه بالتفصيل فهو موجود في الكون (قرآن میں اللہ کا کلام مجمل ہے، اس کا تفصیلی کلام کائنات میں موجود ہے)

اسی نشست میں ان سے لبنان کے حالات پر گفتگو ہوئی تو وہ فوراً لبنانی عیسائیوں کی شکایت کرنے لگے۔ انھوں نے کہا کہ عیسائی ہم پر مسلسل ظلم کر رہے ہیں۔ وہ مسلمانوں کو ہر قسم کا نقصان پہنچا رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ قرآن کے بارہ میں ایک غیر متعلق بحث میں آپ اور آپ کے ساتھیوں نے کئی دن صرف کر دئے۔ مگر عیسائی مسئلہ کا جواب آپ نے قرآن میں تلاش نہیں کیا۔ حالانکہ وہ براہ راست آپ سے تعلق رکھتا ہے۔ پھر میں نے آیات اور احادیث کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ یہ دنیا دار الامتحان ہے، یہاں ہر آدمی کو آزادی حاصل ہے۔ اس بنا پر یہاں ہر ایک اپنے امکان کے بقدر استغلال میں لگا رہتا ہے۔ لبنان کے عیسائی علم اور ثقافت کے میدان میں مسلمانوں سے آگے بڑھے ہوئے ہیں، یہی وجہ یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کا استغلال کر رہے ہیں۔ اس کا حل شکایت اور فریاد نہیں۔ اس کا حل صرف یہ ہے کہ مسلمانوں کو ترقی کے راستوں میں آگے بڑھایا جائے۔ اس کے بعد یہ مسئلہ اپنے آپ ختم ہو جائے گا۔

۱۰ دسمبر کی شام کو مالدیپ کے صدر مامون عبد القیوم سے اجتماعی ملاقات ہوئی۔ وہ عربی اور انگریزی دونوں زبانیں روانی کے ساتھ بولتے ہیں۔ وہ مطالعہ کا ذوق رکھتے ہیں اور انھوں نے میری عربی کتابیں قاہرہ میں تعلیم کے زمانہ میں پڑھی ہیں۔ مالدیپ کے وزیروں اور اعلیٰ عہدیداروں میں اکثر لوگ انگریزی کے ساتھ عربی زبان بھی بخوبی جانتے ہیں۔

ایک صاحب نے کہا: " مالدیپ موجودہ زمانہ میں واحد مسلم ملک ہے جہاں مولویوں کی حکومت ہے"۔ میں نے کہا کہ آپ کی بات صرف جزئی طور پر صحیح ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں ہر مسلم حکمراں خواہ وہ بظاہر بے ریش ہو، اندر سے وہ "مولوی" ہی تھا۔ مگر مسلم قائد

کی جھوٹی مخالفانہ سیاست نے ہر مولوی حکمراں کو مسٹر حکمراں بنا دیا۔

استاذ محمود احمد کفتارو (۴۰ سال) دمشق سے آئے تھے۔ وہ وہاں مفید دینی کام کر رہے ہیں۔ دوسرے بہت سے مسلم نوجوانوں کی طرح ان کا انجام بھی یہ ہو سکتا تھا کہ جہاد کے نام پر حکمرانوں سے بے معنی جنگ کریں اور پھر ناکام ہو کر دنیا کو یہ خبر دیں کہ یہ حکمراں اسلام اور اسلامی تحریکوں کے دشمن ہیں۔ مگر ان کی خوش قسمتی تھی کہ ان کو ایسا باپ ملا جو واقعی معنوں میں حکیم تھا۔ اس نے ان کو صحیح ترین مشورہ دیا۔ اور سعادت مند بیٹے نے اس مشورہ کو قبول کر لیا۔

دکتور الشیخ احمد کفتارو (المفتی العام للسوریۃ، رئیس المجلس الاعلیٰ) نے اپنے لائق بیٹے کو بتایا کہ کوئی حقیقی کام کرنے کے لئے لازمی طور پر حکمت درکار ہوتی ہے۔ حکمت کے بغیر نہ دین کا کوئی کام کیا جا سکتا اور نہ دنیا کا۔ حکمت کیا ہے، حکمت یہ ہے کہ مطلوب کام مطلوب وقت پر اور مطلوب شکل میں کیا جائے (الحکمۃ: فعل ماینبغی، فی الوقت الذی ینبغی، وعلی الشکل الذی ینبغی)

شیخ کفتارو کا کہنا ہے کہ موجودہ حالات میں ہمارے لئے لازم ہے کہ ہمارا بنیادی کام دعوت کے میدان میں ہو۔ ہم سیاسی لوگوں سے جھگڑا نہ کریں تاکہ دعوت اسلامی کے مواقع ضائع نہ ہو جائیں (یجب ان یکون عملنا الاساسی فی میدان الدعوۃ ولا نتناحر مع السیاسیین حتی لا تضیع علی الدعوۃ الاسلامیۃ الفرص)

شیخ کفتارو کے صاحبزادہ محمود احمد کفتارو کی زبان سے میں نے یہ باتیں سنیں تو میں نے کہا کہ بلاشبہ یہی حکیمانہ طریقہ ہے اور اسی کا نام اسلام ہے۔ اس کے سوا جو کچھ آج اسلام کے نام پر کیا جا رہا ہے وہ محض بے معنی لیڈری ہے جس کی کوئی قیمت نہ دین کے اعتبار سے ہے اور نہ دنیا کے اعتبار سے۔

ایک صاحب نے اپنی پر جوش تقریر میں کہا کہ غیر مسلم تنظیموں اور غیر مسلم حکومتوں میں ایک اور دوسرے کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ سب کے سب اسلام کے دشمن ہیں۔

All are enemies of Islam

میں نے کہا کہ آپ کا فرمانا ہے کہ سب اسلام دشمن ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ سب اسلام دوست

ہیں۔ آپ کی مشکل یہ ہے کہ آپ معاملہ کو اس کے ظاہری پہلو (Face value) پر دیکھ رہے ہیں۔ اور میں معاملہ کو اس کی حقیقت کے اعتبار سے دیکھ رہا ہوں۔ یہ وہی فرق ہے جو خود پیغمبرؐ کے زمانہ میں بھی موجود تھا۔ اس وقت عرب کے بیشتر لوگ پیغمبر کے سخت ترین مخالف بنے ہوئے تھے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ سب کے سب اسلام کے دشمن ہیں۔ مگر بعد کو لوگوں نے دیکھا کہ حالات بدلے اور انھیں لوگوں نے اسلام کی صف میں شامل ہو کر اسلام کی تاریخ بنائی۔ یہ سب کچھ آج بھی ممکن ہے، بشرطیکہ ہم پیغمبر اسلام والے طریقہ پر چلنے کے لئے تیار ہوں۔

ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے بڑے جوش سے کہا: میں قرآن کو مانتا ہوں مگر میں حدیث کو نہیں مانتا۔ میں نے پوچھا کیوں۔ انھوں نے کہا کہ حدیث میں ایسی ایسی باتیں ہیں جو سمجھ میں نہیں آتیں۔ میں نے کہا کوئی مثال دیجئے۔ انھوں نے مثال میں وہ حدیث پیش کی جس میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو ہریرہ سے کہا کہ جاؤ لوگوں کو خوش خبری دے دو کہ جو شخص لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی گواہی دے وہ جنت میں جائے گا۔ حضرت عمر راستہ میں مل گئے۔ جب انھوں نے دیکھا کہ حضرت ابو ہریرہ اس طرح کہہ رہے ہیں تو ان کو پکڑ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لائے اور کہا کہ ایسا مت کیجئے۔ ورنہ لوگ اسی پر بھروسہ کر لیں گے (اذاً یتکلوا) آپ نے حضرت عمر کی رائے سے اتفاق کر لیا۔

میں نے کہا کہ یہ حدیث انتہائی بامعنی ہے۔ اصل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو بات فرمائی تھی وہ باعتبار حقیقت تھی۔ مگر حضرت عمر کو اندیشہ ہوا کہ لوگ اس کو باعتبار الفاظ لے لیں گے اور محض تلفظ کلمہ کو جنت کا زینہ سمجھنے لگیں گے۔ حالانکہ اصل چیز حقیقتِ کلمہ ہے نہ کہ تلفظِ کلمہ۔ یہ عین وہی بات ہے جو خود قرآن میں ساتویں پارہ کے شروع میں بیان ہوئی ہے۔

۱۰ دسمبر کو دن کا کھانا حکومت مالدیپ کی طرف سے جزیرہ بانڈوس (Bandos) پر تھا۔ دو موٹر بوٹ کے ذریعہ کانفرنس کے شرکاء جزیرہ پر پہنچائے گئے۔ یہ سفر دن میں ہوا۔ اس لئے جسمانی سفر کے ساتھ روحانی سفر کی منازل بھی خدا کی توفیق سے طے ہوتی رہیں۔

مالدیپ کی اقتصادیات کا انحصار، مچھلی کے بعد "ٹورسٹ انڈسٹری" پر ہے۔ اس لئے یہاں کی ہر چیز سیاحت رخی انداز میں بنائی گئی ہے۔ بانڈوس جزیرہ پر بھی سیاحوں کے ذوق کے

مطابق ایک ہوٹل بنایا گیا ہے۔ اسی ہوٹل میں دوپہر کا کھانا کھایا گیا۔

کھانے سے فراغت کے بعد سمندر کے کنارے میں ایک "چھتری" کے نیچے بیٹھا ہوا تھا۔ میرے سامنے ساحل تھا اور ساحل پر مغربی مرد اور عورتیں نیم برہنہ حالت میں تفریح میں مشغول تھے۔ میں نے سوچا کہ مغربی تقسیم کے مطابق سامان حیات کے تین درجے ہیں: ضرورت، راحت، تعیش۔ جدید انقلاب نے مغربی انسان کو موقع دیا کہ وہ ایک کے بعد ایک ان تینوں مراحل سے گزر سکے۔ مگر تعیش کے اعلیٰ مرحلہ پر پہنچنے کے بعد بھی اس کو تسکین نہیں ملی۔ چنانچہ اب مغربی انسان اباحیت کا تجربہ کر رہا ہے۔ یہ اس کی زندگی کا آخری مرحلہ ہے، اس کے بعد کوئی اور مرحلہ نہیں۔ اس کے بعد جو مرحلہ ہے وہ صرف مایوسی کا مرحلہ ہے۔ مغربی زندگی میں اس مرحلہ کا آغاز ہو چکا ہے اور وہ دن بدن بڑھتا جا رہا ہے۔ اس طرح اب وہ آخری وقت آگیا ہے جب کہ انسان کو خدا کے سچے دین کا پیغام پہنچایا جائے اور وہ اس کو اپنے اندرونی اضطراب کا جواب پا کر اسے قبول کرلے۔

۱۱ دسمبر کو جمعہ کا دن تھا۔ جمعہ کی نماز اسلامک سنٹر کی مسجد میں ادا کی۔ یہ سنٹر غالباً مالدیپ کی سب سے زیادہ شاندار عمارت ہے۔ کم از کم صدر مالدیپ کی قیام گاہ سے یقینی طور پر زیادہ شاندار ہے۔ نماز سے فراغت کے بعد جب باہر آئے تو امام کے خطبہ کی فوٹو کاپیاں لوگوں کو تقسیم کی جا رہی تھیں۔ امام اپنا خطبہ عربی اور مالدیپی میں پہلے سے لکھ لیتا ہے۔ اس کے بعد اس کی فوٹو کاپی تیار کر لی جاتی ہے اور اس کو نماز کے بعد تقسیم کیا جاتا ہے۔ ایسا ہر جمعہ کو کیا جاتا ہے۔

پہلے دن جب میں مالدیپ میں داخل ہوا تو یہاں کی دنیا مجھ کو بہت پرکشش معلوم ہوئی تھی۔ اتھاہ سمندر کے درمیان جگہ جگہ ابھری ہوئی خشکی اور اس کے اوپر ہرے بھرے درخت، سمندر میں ہر طرف دوڑتی ہوئی کشتیاں، چاروں طرف کھلی ہوئی فضا اور کھلا آسمان، اس طرح کے مختلف مناظر جو یہاں افراط کے ساتھ موجود ہیں وہ کچھ دیر کے لئے آدمی کی توجہ اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں۔ مگر چند ہی دن کے بعد وہ کیفیت پیدا ہونے لگتی ہے جس کو آجکل کی زبان میں بورڈم Boredom کہا جاتا ہے۔ چنانچہ ۱۲ دسمبر ۱۹۸۷ کو جب میں مالدیپ سے روانہ ہوا تو تمام ابتدائی کشش ختم ہو چکی تھی۔ انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے لامحدود دنیا چاہتا ہے، یہی وجہ ہے کہ موجودہ محدود دنیا اس کے لئے مستقل خوشی کا سبب نہیں بنتی۔ ابدی مسرت صرف ان انسانوں کے لئے

مقدر ہے جن کو اللہ اپنی رحمتِ خاص سے آخرت کی ابدی جنتوں میں داخل کر دے۔

اس سفر کا ایک عجیب واقعہ وہ ہے جو واپسی میں تریوندرم انٹرنیشنل ایرپورٹ پر گزرا۔ دہلی کا جہاز لینے کے لئے دوبارہ مجھے یہاں اترنا تھا۔ ایمگریشن سے فارغ ہو کر اندر داخل ہوا تو کسٹم کاؤنٹر سامنے تھا جہاں لوگوں کے بکس اور بنڈل کھول کھول کر دیکھے جا رہے تھے۔ چونکہ میرے پاس کوئی کسٹم والی چیز نہیں تھی، میں نے چاہا کہ میں سیدھا گیٹ پر چلا جاؤں۔ مگر پولیس کے آدمی نے مجھے روک دیا اور کہا کہ پیچھے جا کر لائن میں کھڑے ہو جائیے۔ یہ بڑا سخت مرحلہ تھا۔ کیوں کہ میں سب سے پیچھے تھا اور لمبی لائن میں مجھے گھنٹوں تک کھڑا رہ کر انتظار کرنا پڑتا۔ اتنے میں کسٹم کے ایک آدمی نے شاید میرا "مولویانہ" حلیہ دیکھ کر خود ہی مجھ کو بلایا۔ اس نے پوچھا کہاں سے آرہے ہیں۔ میں نے کہا کہ مالدیپ سے۔ کس لئے گئے تھے۔ میں نے دوبارہ کہا اسلامی کانفرنس میں شرکت کے لئے۔ اس نے چیک کئے بغیر کہا کہ جائیے۔

دوسرا شدید تر مرحلہ یہ تھا کہ میری دہلی کی فلائٹ اگلے دن تھی۔ چنانچہ مجھے تقریباً ۲۴ گھنٹے تریوندرم میں رکنا تھا۔ راستہ میں میں نے بعض مسافروں سے پوچھا کہ کیا یہاں انڈین ایرلائنز کی طرف سے ٹرانزٹ پسنجر کو ٹھہرانے کا انتظام ہے۔ انھوں نے کہا کہ نہیں۔ میں باہر نکل کر لاونج میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ رات کے وقت اس نامعلوم جگہ پر کہاں جاؤں۔ اتنے میں ایک تپلون پوش ادھیڑ عمر کے آدمی آئے۔ میں نے ان سے کہا کہ میں ایک ٹرانزٹ پسنجر ہوں .... ابھی بات پوری بھی نہیں ہوئی تھی کہ انھوں نے کہا: اپنا بیگ اٹھا لیجئے اور میرے ساتھ آئیے۔ وہ مجھ کو ایرپورٹ کے ایک افسر کے پاس لے گئے اور اس کو میرا معاملہ بتایا:

K.V. Thimothy, Station Duty Officer
Air Customs, International Airport, Trivandrum.

مذکورہ افسر نے کہا کہ یہ میری ڈیوٹی تو نہیں ہے۔ مگر میں ہوٹل لوسیا کانٹی نینٹل (Luciya Continental) کو ٹیلی فون کر کے پتہ کرتا ہوں۔ چنانچہ انھوں نے فوراً ہی ہوٹل کے منیجر سے ٹیلی فون پر بات کی اور پھر مجھ سے کہا کہ آپ وہاں چلے جائیں۔ آپ کا کمرہ، کھانا، ٹیکسی کا کرایہ سب انڈین ایرلائنز کے ذمہ ہوگا۔ مزید انھوں نے پولیس کے ایک آدمی کو میرے ساتھ کیا اور اس سے کہا

ان کو لے جاکر ٹیکسی پر بٹھاؤ اور ٹیکسی کا نمبر نوٹ کرلو۔ اس میں اتنا اور اضافہ کر لیجئے کہ مذکورہ افسر نے نہ میرا پاسپورٹ مانگا اور نہ میرا ٹکٹ دیکھا۔ اس نے صرف میرے زبانی بیان پر اعتماد کرتے ہوئے یہ پوری کارروائی کی۔

میں نے سوچا کہ جس ملک میں اتنے شریف انسان بستے ہوں، وہاں چند استثنائی واقعات کو لے کر سارے ملک میں ہندو مسلم مسئلہ کھڑا کرنا کتنا بڑا جرم ہے۔ اور افسوس کہ اس ملک کی مسلم قیادت اسی مجرمانہ کام میں پچھلے پچاس برس سے مبتلا ہے۔ اس کو نہ قرآن کی آیتیں اس بے معنی کام سے روکنے والی ثابت ہورہی ہیں اور نہ مسلمانوں کے حق میں اس پالیسی کے اندوہناک نتائج۔

ہوٹل لوسیا کانٹی نینٹل کا کمرہ نمبر ۳۱۶ ہے۔ میں رات کے وقت سویا ہوا ہوں۔ نیند کھلتی ہے تو میں وقت جاننا چاہتا ہوں۔ اپنی گھڑی کے بارہ میں مجھے کچھ شبہ ہوتا ہے۔ میں ٹیلیفون کا ریسیور اٹھاتا ہوں۔ اس کے بعد میرے اور ریسپشن کے آدمی کے درمیان مختصر گفتگو ہوتی ہے جو حسب ذیل ہے:

Good Morning, Sir
Good Morning, Time please.
Three, thirty
Thank you

یہ ایک سادہ سی بات ہے جو ہر ایک کے ساتھ پیش آتی ہے۔ مگر جب ۱۲ دسمبر کی رات کو اس اجنبی جگہ پر میرے ساتھ یہ واقعہ گزرا تو اچانک مجھے محسوس ہوا جیسے کہ وہ اس آیت کی عملی تفسیر ہو: و اذا سألك عبادي عني فاني قريب اجيب دعوة الداع اذا دعان فليستجيبوا لي وليؤمنوا بي لعلهم يرشدون (البقرة ۱۸۶) اس دنیا کے محسوس واقعات غیر محسوس حقیقتوں کی کہانی بیان کر رہے ہیں۔ مگر اس کو وہی شخص جان سکتا ہے جو اس پر کان لگائے اور خالی الذہن ہو کر اس کو سننے کے لئے تیار ہو۔

لوسیا ہوٹل میں گیڈینس (Gideons) کی بائبل رکھی ہوئی تھی۔ یہ بائبل تمام دنیا کے ہوٹلوں میں مفت رکھی جاتی ہے۔ بائبل کے اس نسخہ میں دوسری باتوں کے ساتھ یہ بھی چھپا ہوا تھا کہ اگر آپ اس علاقہ میں گیڈینس سے ربط قائم کرنا چاہتے ہیں تو براہ کرم مقامی ٹیلیفون ڈائرکٹری سے معلوم کیجئے:

If you desire to contact Gideons in this area,
please consult the local telephone directory.

موجودہ زمانہ میں بے شمار نئے امکانات پیدا ہوئے۔ ان میں سے ایک یہ تھا کہ دنیا کے تمام بڑے بڑے شہروں میں جدید طرز کے ہوٹل بنے ہوئے ہیں جن میں بے شمار انسانی قافلے ٹھہرتے ہیں۔ ہر جگہ ٹیلی فون کا نظام قائم ہے اور ڈائرکٹریاں چھپی ہوئی موجود ہیں۔ ان ذرائع نے کسی فکر کی اشاعت کا زبردست نیا امکان پیدا کر دیا تھا۔ مگر ہمارے رہنماؤں نے بےمعنی لڑائیوں میں پورا ایک دور ضائع کر دیا۔ جدید ذرائع میں سے کسی ذریعہ کو بھی وہ دین خداوندی کی اشاعت کے لئے استعمال نہ کر سکے۔

بائبل کے اس نسخہ کے شروع میں درج تھا کہ بائبل (John 3:16) میں ایک جملہ ہے جس کو گیارہ سو سے زیادہ زبانوں میں ترجمہ کیا جا چکا ہے۔ مذکورہ نسخہ میں چند درجن زبانوں کے ترجمے نقل کئے گئے تھے۔ اس کا عربی ترجمہ ان الفاظ میں درج کیا گیا تھا:

لانه هكذا احب الله العالم حتى بذل ابنه الوحيد
لكي لا يهلك كل من يؤمن به بل تكون له الحيوة الابدية

ابنیت مسیح کا یہ عقیدہ چرچ کے مطابق، مسیحی مذہب کا اہم ترین عقیدہ ہے۔ بلکہ اسی عقیدہ پر موجودہ مسیحیت قائم ہے۔ مگر چرچ کے نزدیک وہ جتنا اہم ہے، عام انسان کو وہ اتنا ہی زیادہ غیر اہم معلوم ہوتا ہے۔ اس کا ایک مظاہرہ خود بائبل کے اس نسخہ میں موجود تھا جو لوسیا ہوٹل میں رکھا ہوا تھا۔ اس کو میں نے الٹ پلٹ کر دیکھا تو اس کے آخری صفحہ پر ایک جملہ درج تھا۔ یہ کسی مسافر کا تاثر تھا جو اس نے "مقدس کتاب" کے آخر میں ثبت کیا تھا۔ اگرچہ وہاں مسافر کا نام نہیں تھا تاہم اس کا فقرہ بہت بامعنی تھا۔ اس نے اپنے قلم سے لکھا تھا:

Man is only a personality. Nothing beyond that.

یعنی آدمی صرف ایک شخصیت ہے، اس کے آگے اور کچھ نہیں۔ موجودہ مسیحی مذہب کی بنیاد الوہیت کے عقیدہ پر قائم ہے مگر انسان کی عقل میں کسی طرح یہ بات نہیں آتی کہ ایک شخص جو ایک عورت کے پیٹ پیدا ہوا وہ خدا یا خدا کا بیٹا تھا ——— اگر آپ مسیحیت کو مانیں تو آپ کو عقل سے دست بردار ہو پڑتا ہے اور اگر عقل کو مانیں تو مسیحیت سے۔

تریوندرم سے واپسی میں ایئرپورٹ پر اٹلی کے ایک سیاح سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے اپنا نام اسٹفانو گرافینی (Stefano Garaffini) بتایا۔ وہ اٹلی کے شہر فرنز (Firenze) کے رہنے والے ہیں۔ چھٹی میں اپنی بیوی کے ساتھ سیاحت کے لئے نکلے ہیں۔ ابتدائی تعارف کے بعد میں ان سے اس طرح کے سوالات کرتا رہا: کیا آپ خدا کو مانتے ہیں، کیا آپ مذہب میں عقیدہ رکھتے ہیں۔ ان سے گفتگو کے بعد خیال آیا کہ ہمارے پاس ایک چھپا ہوا دوورقہ ہونا چاہئے۔ جو اس طرح کے لوگوں کو فوری مطالعہ کے لئے دیا جاسکے۔ اس میں مختصر اور واضح انداز میں اسلام کا تعارف کیا گیا ہو۔ انشاء اللہ مرکز کی طرف سے اس قسم کا دوورقہ چھاپنے کی کوشش کی جائے گی۔

۱۳ دسمبر کو تریوندرم ایئرپورٹ پر تین ہندو نوجوانوں سے ملاقات ہوئی۔ ان کے "لیڈر" سنجیو بھارگوا تھے جو نئی دہلی میں انڈین ایرلائنز کالونی میں رہتے ہیں۔ ان سے بہت دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ یہ لوگ مکمل طور پر ہندوؤں کی نئی نسل کے نمائندہ تھے۔ ان کی گفتگو کا خلاصہ میرے نزدیک یہ تھا کہ ہندو نوجوانوں کا بگاڑ محض وقتی ہے نہ کہ دائمی اور ابدی۔ سنجیو بھارگوا نے کہا کہ ایک سادہ مثال لیجئے۔ ایک شخص بس میں سفر کر رہا ہے۔ اس کے پاس ایک روپیہ کا پھٹا ہوا نوٹ ہے۔ اگر وہ اس نوٹ کو فولڈ کر کے بس کنڈکٹر کو دے تو وہ اس کو لے لے گا۔ اور اگر وہ اسی نوٹ کو دکھا کر دے تو کنڈکٹر کبھی بھی نہیں لے گا اور اس کو بس سے اتار دے گا۔ یہ تجربات ہیں جو جدید نسل کو بگاڑ رہے ہیں۔

سنجیو بھارگوا نے کہا کہ میری ایج کے ہر آدمی کا پنچر یہ ہوتا ہے کہ وہ غلط کو غلط سمجھتا ہے اور اس سے لڑنا چاہتا ہے۔ مگر جیسے جیسے اس کا تجربہ بڑھتا ہے، وہ دیکھتا ہے کہ غلط کو غلط بتانے میں خود غلط ہو رہا ہے تو اب اس میں ایک تبدیلی آنا شروع ہوتی ہے۔ پنچر کی سطح پر درست ہونے کے باوجود اس کی سطح پر وہ ایک نیا انسان بن جاتا ہے۔ ان کی تقسیم کے مطابق، جدید بھارتی نوجوان کے تین دور ہیں ـــــــ پنچر، فرسٹریشن، چیلنج۔

جدید ہندستانی نوجوان کی جارحیت جس کے خلاف ہمارے لیڈر فریاد کرتے رہتے ہیں، وہ اوپری بگاڑ کا نتیجہ ہے۔ اپنے اندر اب بھی وہ وہی فطرت لئے ہوئے ہے جو خدا نے ہر ایک کے اندر رکھی ہے۔ اگر ہم حکمت اور اخلاق کے ذریعہ اس کی اندرونی فطرت کو جگا سکیں تو یہاں بھی وہی

یں آئے گا جس کو قرآن نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے ...... فاذا الذی بینک
نہ عداوۃ کأنہ ولی حمیم (حم السجدہ ۳۴)

واپسی کے بعد کانفرنس کے شرکاء میں سے ایک صاحب سے دہلی میں ملاقات ہوئی۔ یہ ڈاکٹر
ہم طیبی ہیں۔ وہ افغانی ہیں اور آجکل سوئزرلینڈ میں رہتے ہیں۔ وہ سید جمال الدین افغانی سے
متاثر ہیں اور ان کے تاریخی ماہنامہ العروۃ الوثقیٰ کو اسی نام سے عربی اور انگریزی میں جنیوا سے
ے ہیں۔

کانفرنس کے بعد وہ ایک ضرورت کے تحت دہلی آئے اور ہمارے مرکز اور ہمارے کام کو
ہاں آکر دیکھا۔ انھوں نے کہا کہ آپ یہاں جو کام کر رہے ہیں وہ اتنا اہم ہے کہ اس کے مقابلہ
ی "انٹرنیشنل کانفرنس" میں شرکت کی کوئی اہمیت نہیں۔

میں نے کہا کہ مجھے اس قسم کی کانفرنسوں میں شرکت سے کوئی دلچسپی نہیں۔ بعض اوقات وہ مجھے
ت کا کم تر مصرف معلوم ہوتی ہیں۔ تاہم ایک فائدہ ہے جس کی وجہ سے میں ان کانفرنسوں میں
ہوں۔ اور وہ تجربہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دوسرے ممالک کا سفر اور بین اقوامی کانفرنسوں میں
ن سے جو تجربات حاصل ہوتے ہیں وہ دفتر میں یا لائبریری میں بیٹھ کر حاصل نہیں کئے جاسکتے۔

یہی خاص وجہ ہے جس کی بنا پر میں بیرونی ممالک کا سفر کرتا ہوں۔ میرے یہ تجربات "سفرنامہ"
ورت میں الرسالہ میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ مگر وہ اردو زبان میں ہوتے ہیں، اس لئے
جیسے لوگ ان کو پڑھ نہیں سکتے۔ تاہم اب انگریزی الرسالہ میں بھی سفرناموں کا خلاصہ شائع
ے کا سلسلہ شروع کیا گیا ہے۔

جلد دوم تیار

تذکیر القرآن

جلد اول : سورۃ فاتحہ۔ سورۃ بنی اسرائیل

جلد دوم : سورۃ الکہف۔ سورۃ الناس

قرآن کی بے شمار تفسیریں ہر زبان میں لکھی گئی ہیں۔ مگر تذکیر القرآن اپنی نوعیت کی پہلی تفسیر ہے۔ تذکیر القرآن میں قرآن کے اساسی مضمون اور اس کے بنیادی مقصد کو مرکز توجہ بنایا گیا ہے۔ جزئی مسائل اور معلوماتی تفصیلات کو چھوڑتے ہوئے اس میں قرآن کے اصل پیغام کو کھولا گیا ہے اور عصری اسلوب میں اس کے دعوتی اور تذکیری پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے۔ تذکیر القرآن عوام و خواص دونوں کے لیے یکساں طور پر مفید ہے۔ وہ طالبینِ قرآن کے لیے فہم قران کی کنجی ہے۔

ہدیہ جلد اول ۱۰۰ روپیہ

جلد دوم ۱۰۰ روپیہ

مکتبہ الرسالہ، نئی دہلی

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

	Rs
تذکیر القرآن جلد اول	100/-
〃 〃 جلد دوم	100/-
اللہ اکبر	40/-
پیغمبر انقلاب	30/-
مذہب اور جدید چیلنج	30/-
عظمتِ قرآن	25/-
الاسلام	25/-
ظہورِ اسلام	25/-
اسلامی زندگی	20/-
احیاءِ اسلام	20/-
رازِ حیات (مجلد)	45/-
صراطِ مستقیم	25/-
خاتونِ اسلام	30/-
سوشلزم اور اسلام	25/-
اسلام اور عصرِ حاضر	20/-
حقیقتِ حج	25/-
اسلامی تعلیمات	20/-
تبلیغی تحریک	15/-
تعبیر کی غلطی	35/-
دین کی سیاسی تعبیر	10/-

دین کیا ہے	3/-
قرآن کا مطلوب انسان	6/-
تجدیدِ دین	4/-
اسلام دینِ فطرت	4/-
تعمیرِ ملت	4/-
تاریخ کا سبق	4/-
مذہب اور سائنس	4/-
عقلیاتِ اسلام	4/-
فسادات کا مسئلہ	3/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	3/-
تعارفِ اسلام	4/-
اسلام پندرھویں صدی میں	4/-
راہیں بند نہیں	4/-
ایمانی طاقت	4/-
اتحادِ ملت	4/-
سبق آموز واقعات	4/-
زلزلۂ قیامت	4/-
حقیقت کی تلاش	4/-
پیغمبرِ اسلام	4/-
آخری سفر	4/-

اسلامی دعوت	4/-
خدا اور انسان	4/-
حل یہاں ہے	6/-
سچا راستہ	2/-
دینی تعلیم	/-
حیاتِ طیبہ	/-
باغِ جنت	/-
نارِ جہنم	/-

d Arises	Rs. 45/-
hammad e Prophet of Revolution	50/-
ligion and Science	35/-
oligh Movement	20/-
e Way to Find God	4/-
e Teachings of Islam	5/-
Good Life	5/-
Garden of Paradise	5/-
Fire of Hell	5/-
hammad Ideal Character	4/-
Know Thyself !	4/-
र अपने आपको पहचान	2/-
ई की तलाश	4/-

مکتبہ الرسالہ [illegible]

MAR

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

الرسالہ

ISSN 0970-180X

روزہ بھوک پیاس کی سالانہ رسم نہیں
روزہ اخلاقی ڈسپلن کی سالانہ تربیت ہے

شمارہ ۱۳۷ اپریل ۱۹۸۸

GOD ARISES

Evidence of God
in Nature and in Science

God Arises

By Maulana Wahiduddin Khan

This is a translation with some additions of the famous Urdu book of Maulana Wahiduddin Khan, *Mazhab Aur Jadeed Challenge,* translated into Arabic as *Al-Islam Yatahaddah,* which became a best-seller throughout the Arab world. It has also been translated into a number of other languages including Turkish, Malay, Serbo-Croatian (Yugoslavian), French, Sindhi, Tamil etc., and has come to be accepted as a standard work on the Islamic position vis-à-vis modern thought.

A Review

"... in the fourteen hundred years of Islamic history, innumerable books on Islam have appeared. There are just a few books calling mankind to God which are clearly distinguishable from the rest because of the clarity and force with which they make their appeal. Without doubt, this book is one of that kind".

— *Daily AL-AHRAM (Cairo)*

Pages 265 ISBN 81-85063-14-1 (Pbk) Price Rs. 45
81-85063-17-6 (Hbd)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اردو، انگریزی میں شائع ہونے والا

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

شمارہ ۱۳۷ اپریل ۱۹۸۸

فہرست

ماہنامہ الرسالہ، سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳ ، فون: 697333. 611128

روزہ کے بارہ میں

روایات میں آتا ہے کہ رمضان کا مہینہ آیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کے سامنے خطبہ دیا۔ اس خطبہ میں آپ نے رمضان کے مہینہ میں روزہ رکھنے کی فضیلت بتائی:

قال علی رضی اللہ عنه فقمت فقلت یا رسول اللّٰہ، ما افضل الاعمال فی هذا الشهر فقال یا ابا الحسن، افضل الاعمال فی هذا الشهر الورع من محارم اللّٰہ

علی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اس کے بعد میں کھڑا ہوا اور میں نے کہا کہ اے خدا کے رسول، اس مہینہ میں سب سے بہتر عمل کیا ہے۔ آپ نے فرمایا: اے ابوالحسن، اس مہینہ میں سب سے بہتر عمل ہے اللہ کی حرام کی ہوئی چیزوں سے بچنا۔

اس روایت سے روزہ کی اصل روح معلوم ہوتی ہے۔ روزہ کی اصل روح ان چیزوں سے اپنے آپ کو روکنا ہے جن سے رکنے کا خدا نے حکم دیا ہے۔ رمضان کے دنوں میں کھانے پینے جیسی چیزوں سے روزہ رکھنے کا حکم دراصل اسی کا عملی سبق ہے۔ کھانا پینا وہ آخری چیز ہے جس سے کسی آدمی کو روکا جائے۔ انسان کو آخری ضرورت سے روکنا اس کو شدید تر انداز میں یہ سبق دینا ہے کہ خدا نے جن چیزوں سے تمہیں روکا ہے ان سے لازماً تمہیں رکنا ہے، خواہ یہ رکنا تمہارے ذوق اور عادت کے لیے کتنا ہی سخت کیوں نہ ہو، خواہ اس کی فہرست تمہاری زندگی کی لازمی ضرورتوں تک کیوں نہ پہونچ جائے۔ ایک اور روایت کے الفاظ یہ ہیں:

قال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم: ما من عبد صائم یُشتم فیقول سلام علیکم لا اشتمك کما تشتمنی إلا قال الرب تبارك وتعالیٰ: استجار عبدی بالصوم من شر عبدی فقد اجرتُه من النّار۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب بھی کسی روزہ دار کو گالی دی جائے اور وہ کہے کہ تم پر سلام ہو، میں تم کو گالی نہیں دوں گا جیسے تم نے مجھ کو گالی دی تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میرے بندے نے ایک شخص کی برائی سے روزہ کی پناہ لی تو میں نے بھی اس کو آگ سے پناہ دیدی۔

روزہ کا مقصد یہ صلاحیت پیدا کرنا ہے کہ آدمی کی زندگی پابند زندگی ہو نہ کہ بے قید زندگی۔

یہ اسلام نہیں

ایک مقام پر رمضان کے زمانہ میں فساد ہوگیا۔ وہاں کے ایک صاحب سے ۲۵ دسمبر ۱۹۸۷ کو میری ملاقات ہوئی۔ میں نے واقعہ کی تفصیل پوچھی۔ انھوں نے بتایا کہ رات کا وقت تھا۔ مسلمان مسجد میں تراویح کی نماز پڑھ رہے تھے۔ اتنے میں سڑک سے شور وغل سنائی دیا۔ معلوم ہوا کہ دوسری قوم کے لوگوں کی شادی پارٹی گزر رہی ہے اور جگہ جگہ رک کر گاتی بجاتی ہے۔ اس وقت مسجد سے نکل کر کچھ مسلمان سڑک پر آئے اور جلوس والوں سے کہا کہ آپ لوگ یہاں شور نہ کریں۔ کیوں کہ مسجد کے اندر ہماری نماز ہو رہی ہے۔ مگر وہ لوگ نہیں مانے۔ اس پر تکرار ہوئی یہاں تک کہ بڑھتے بڑھتے فساد ہوگیا۔

میں نے کہا کہ یہ تو آپ لوگوں کا طریقہ ہے۔ اب میں آپ کو بتاتا ہوں کہ اس معاملہ میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا طریقہ کیا تھا۔ میں نے کہا کہ آپ جانتے ہیں کہ ابتدائی زمانہ میں مکہ پر اور بیت اللہ پر مشرکین کا قبضہ تھا۔ وہ لوگ رسول اللہ کو اور آپ کے ساتھیوں کو طرح طرح سے ستاتے تھے۔ اسی میں سے ایک یہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب جب بیت اللہ میں جاتے تو وہ لوگ وہاں آکر شور وغل کرتے۔ وہ سیٹی بجاتے اور تالیاں پیٹتے اور کہتے کہ یہ ہمارا عبادت کا طریقہ ہے۔ قرآن میں بتایا گیا ہے :

وما كان صلاتهم عند البيت الا مكاء و تصدية فذوقوا العذاب بما كنتم تكفرون (الانفال ۳۵)	اور بیت اللہ کے پاس ان کی نماز اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ سیٹی بجانا اور تالی پیٹنا۔ تو اب عذاب چکھو اپنے انکار کی وجہ سے۔

اس آیت کی تشریح کے سلسلے میں چند تفسیروں کے حوالے یہ ہیں :

عن ابن عمر انه قال۔ انهم كانوا يضعون خدودهم على الارض ويصفقون ويصفرون. ويصنعون ذالك ليخلطوا بذلك على النبي صلى الله عليه وسلم صلاته۔ وقال الزهري	حضرت عبداللہ بن عمر نے کہا کہ مکہ کے مشرکین اپنے رخسار زمین پر رکھتے اور تالی بجاتے اور سیٹی بجاتے۔ وہ ایسا اس لیے کرتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کو گڈمڈ کر دیں۔ اور

يستهزؤن بالمومنين۔

(تفسیر ابن کثیر)

زھری نے کہا کہ وہ مسلمانوں کا مذاق اڑانے کے لیے ایسا کرتے تھے۔

ذالك انهم كانوا يطوفون بالبيت عراة وهم مشبكون بين اصابعهم يصفرون فيها و يصفقون وكانوا يفعلون نحو ذالك اذا قرأ رسول الله صلى الله عليه وسلم فى صلوته يخلطون عليه (تفسیر نسفی)

وہ بیت اللہ کا ننگے طواف کرتے اور وہ انگلیوں میں انگلیاں ڈال کر اس میں سیٹی بجاتے اور تالیاں بجاتے۔ وہ ایسا اس وقت کرتے جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں قرآن پڑھتے، وہ گڈمڈ کرنا چاہتے تھے۔

اى ما كانت عبادة المشركين وصلاتهم عند البيت الحرام الا تصفيرا وتصفيقا۔ وكانوا يفعلونهما اذا صلى المسلمون ليخلطوا عليهم صلاتهم۔

(صفوۃ التفاسیر)

یعنی بیت اللہ الحرام میں مشرکین کی عبادت اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ وہ سیٹی بجاتے اور تالیاں بجاتے۔ اور یہ دونوں کام وہ اس وقت کرتے جب کہ مسلمان نماز پڑھتے تاکہ ان کی نماز کو گڈبڈ کردیں۔

عن سعيد قال: كانت قريش يعارضون النبى صلى الله عليه وسلم فى الطواف يستهزؤن به يصفرون ويصفقون۔ وقال مقاتل كان النبى صلى الله عليه وسلم اذا صلى فى المسجد قام رجلان عن يمينه فيصفران ورجلان عن يساره فيصفقان ليخلطوا على النبى صلى الله عليه وسلم صلوته۔

(التفسیر المظہری)

حضرت سعید نے کہا کہ قریش طواف کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آتے۔ وہ آپ کا مذاق اڑاتے، وہ سیٹی بجاتے اور تالی بجاتے۔ اور مقاتل نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مسجد حرام میں نماز پڑھتے تو آپ کے دائیں طرف دو آدمی کھڑے ہو جاتے اور وہ سیٹی بجاتے اور دو آدمی آپ کے بائیں طرف کھڑے ہو جاتے اور تالیاں بجاتے تاکہ رسول اللہ پر آپ کی نماز کو گڈمڈ کردیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں ۱۳ سال تک رہے۔ وہاں مسلسل آپ کے ساتھ وہ سلوک کیا جاتا رہا جس کا ذکر اوپر کے اقتباسات میں آیا ہے۔ مگر کبھی ایسا نہیں ہوا کہ آپ اس

خلاف کوئی احتجاج یا کوئی جوابی کارروائی کریں۔ آپ اس قسم کی تمام باتوں پر یکطرفہ طور پر صبر کرتے رہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس زمانہ میں اہل ایمان کی ایک تعداد جمع ہو گئی تھی۔ یہ لوگ نہایت بہادر اور جاں نثار تھے۔ مگر ایک بار بھی ایسا نہیں ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ساتھیوں کو لے کر مشرکوں پر ہجوم کریں یا ان کو شوروغل سے روکنے کے لیے کوئی جوابی عملی کارروائی کریں۔

مشرکوں کے شوروغل پر آپ کا چپ رہنا خوف کے تحت نہیں تھا بلکہ منصوبہ کے تحت تھا۔ اس دنیا کا قانون یہ ہے کہ یہاں ایک کام کو کرنے کے لیے دوسرے کام کو چھوڑنا پڑتا ہے۔ آپ خدا کے پیغام کی پیغام رسانی کرنا چاہتے تھے، اس لیے آپ نے ضروری سمجھا کہ جھگڑے اور ٹکراؤ والی باتوں سے اپنے آپ کو دور رکھیں۔ چنانچہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مشرکین کی ان تمام باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے صرف دعوت و تبلیغ کی محنت میں لگے رہے۔ یہاں تک کہ وہ وقت آیا کہ اللہ تعالیٰ نے حالات میں تبدیلی فرمائی۔ اس کے بعد مشرکین کے شور کا بھی خاتمہ ہو گیا اور خود مشرکین کا بھی۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں مسجد کے اندر گھس کر شوروغل کیا جاتا تھا۔ تب بھی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب نے اس کے خلاف کوئی جوابی کارروائی نہیں کی۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ مسجد کے قریب کی سڑک پر کوئی جلوس شور کرتا ہوا گزرے تو وہ اس سے لڑنے کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اگر اسلام وہ ہے جو رسول اللہؐ نے کیا تو مسلمان جو کچھ کر رہے ہیں وہ اسلام نہیں۔ اور اگر اسلام وہ ہے جو موجودہ زمانہ کے مسلمان کر رہے ہیں تو رسول اللہؐ نے جو کچھ کیا وہ اسلام نہیں تھا۔ اب مسلمانوں کو اختیار ہے کہ وہ دونوں میں سے جس بات کو چاہیں اپنے لیے پسند کریں۔

اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ

دے کر پانا

ڈاکٹر تارا چند کی ایک کتاب ہے جس کا نام ہے "ہندستانی کلچر پر اسلام کے اثرات" سوا تین سو صفحہ کی یہ کتاب ایک مفید اور منصفانہ کتاب ہے اور ہر شخص کو اسے پڑھنا چاہیے۔ اس کتاب کے ایک حصہ میں فاضل مصنف نے دکھایا ہے کہ ساتویں اور آٹھویں صدی عیسوی میں مسلمان تاجر جنوبی ہند کے ساحل پر اترے تو یہاں ان کو زبردست اہمیت (Great importance) حاصل ہوگئی۔ مقامی لوگوں نے ان کو "ماپلا" کا خطاب دیا جس کے معنی عظیم فرزند کے ہوتے ہیں تقریبات کے موقع پر مسلمان نمبوتری برہمن کے ساتھ بٹھائے جاتے تھے۔ یہ ایک ایسا اعزاز تھا جو اس وقت نائر لوگوں کو بھی حاصل نہ تھا (۳۵) وغیرہ وغیرہ

کالی کٹ کے راجہ زمورن نے ان عرب مسلمانوں کی غیر معمولی قدر و منزلت کی۔ حتیٰ کہ اس نے واضح طور قبول اسلام کی حوصلہ افزائی کی تاکہ اسے اپنے ان جہازوں کے لیے کارکن مل سکیں جن پر اس کی عظمت و ترقی کا انحصار تھا۔ اس نے یہ حکم دے دیا کہ اس کی مملکت میں ماہی گیروں کے ہر گھرانے میں سے ایک یا دو مرد افراد کی تربیت مسلمان کی حیثیت سے کی جائے:

> The Zamorin thought so highly of the Muslims that he definitely encouraged conversion in order to man the Arab ships on which he depended for his aggrandizement. He gave orders that in every family of fishermen (Makkuvans) in his dominion one or more of the male members should be brought up as Muhammadans.
>
> Dr. Tara Chand, ***Influence of Islam on Indian Culture***, The Indian Press Ltd., Allahabad, 1963, p. 36

یہ واقعہ اس زمانہ کا ہے جب کہ عرب مسلمان جہازرانی میں ساری دنیا پر فوقیت رکھتے تھے۔ اپنی اس امتیازی خصوصیت کے ساتھ جب وہ ہندستان کے ساحل پر اترے تو یہاں کے ذمہ داروں کو محسوس ہوا کہ وہ ہماری بحری ضرورت ہیں۔ ان کے ذریعہ ہم اپنی ترقی میں اضافہ کر سکتے ہیں۔ یہ ابتدائی مسلمان اہل ہند کے لیے قیمتی سرمایہ بن گئے۔ انھوں نے دوسروں کو دیا، اس لیے دوسروں نے بھی انھیں دیا۔ اس کے برعکس موجودہ زمانہ کے مسلمان صرف دوسروں سے مانگ رہے ہیں، اس لیے وہ ابتک پانے والے بھی نہیں بنے۔ موجودہ دنیا میں دینے والے کو دیا جاتا ہے نہ کہ مانگنے والے کو۔

چیلنج نہ کہ ظلم

ایڈمنڈ برک (Edmund Berke) کا قول ہے کہ جو شخص ہم سے لڑتا ہے وہ ہمارے اعصاب کو مضبوط کرتا ہے اور ہماری استعداد کو تیز بناتا ہے۔ ہمارا مخالف ہمارا مددگار ہے:

He that wrestles with us, strengthens our nerves,
and shapens our skill. Our antagonist is our helper.

یہ عین وہی بات ہے جو شیخ سعدی نے گلستاں کی ایک کہانی کے تحت تمثیلی طور پر اس طرح کہی ہے کہ کیا تم دیکھتے نہیں کہ بلّی جب عاجز ہو جاتی ہے تو وہ اپنے چنگل سے شیر کی آنکھ نکال لیتی ہے:

نہ بینی کہ چوں گربہ عاجز شود — برآرد بہ چنگال چشم پلنگ

دوسروں کی طرف سے آپ کے خلاف کوئی واقعہ پیش آئے تو اس کے ردعمل کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ آپ اس کو ظلم سمجھیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ آپ اس کو چیلنج قرار دیں۔ ظلم سمجھنے کی صورت میں شکایت کا ذہن پیدا ہوتا ہے، اور چیلنج سمجھنے کی صورت میں مقابلہ کا۔

شکایتی ذہن کو اپنے کرنے کا کام صرف یہ نظر آتا ہے کہ وہ فریق ثانی کے خلاف چیخ پکار شروع کر دے۔ وہ اس کے خلاف اپنے تمام احتجاجی الفاظ استعمال کر ڈالے۔ اس کے برعکس مقابلہ کا ذہن عمل کی طرف لے جاتا ہے۔ وہ حالات کو سمجھ کر جوابی طریقہ تلاش کرنے میں لگ جاتا ہے تاکہ حکمت اور تدبیر کے ذریعہ فریق ثانی کے مخالفانہ منصوبوں کو ناکام بنا دے۔

شکایت اور احتجاج کا ذہن آدمی کو ایسے راستوں کی طرف لے جاتا ہے جہاں وہ اپنی بچی ہوئی قوت بھی بے فائدہ ہنگاموں میں ضائع کر دے۔ جب کہ چیلنج اور مقابلہ کا ذہن آدمی کی چھپی ہوئی صلاحیتوں کو جگاتا ہے، وہ اس کو نیا حوصلہ عطا کرتا ہے۔ وہ اس کو اتنا عظیم بنا دیتا ہے کہ کمزور بھی طاقت ور پر غالب آجائے، اور بلّی بھی شیر کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دے۔

ہار مان کر

دوسری جنگ عظیم میں جاپان کو امریکہ کے مقابلہ میں شکست ہوئی۔ اس کے بعد اپریل ۱۹۴۵ میں امریکی فوجیں جاپان میں اتر گئیں۔ جنرل ڈگلس میک آرتھر (Douglas MacArthur) امریکہ کی طرف سے جاپان کے سپریم کمانڈر مقرر ہوئے۔ جو ۱۹۵۱ تک وہاں رہے۔ اس کے بعد جنرل میک آرتھر کی مرضی کے مطابق جاپان کا نیا دستور بنایا گیا جو ۳ نومبر ۱۹۴۶ کو جاپانی اسمبلی میں منظور کر لیا گیا۔ اس دستور کے تحت شہنشاہ جاپان کی حیثیت گھٹا کر اس کو علامتی حکمراں (Symbol of the State) کا درجہ دے دیا گیا۔ دستور کی دفعہ ۹ کے تحت جاپانی قوم نے عہد کیا کہ وہ کبھی نہ زمینی، بری یا ہوائی فوج رکھے گی اور نہ کسی قسم کی اور کوئی جنگی تیاری کرے گی:

Land, sea, and air forces, as well as other war potential, will never be maintained (10/87).

یہ دستور بظاہر جاپان کی مستقل قومی موت کے ہم معنی تھا۔ مگر جاپان کے لیڈروں نے دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے اس کو مکمل طور پر منظور کر لیا۔ کیوں کہ انھوں نے دیکھا کہ یہ دستور اگرچہ فوجی اور سیاسی اعتبار سے جاپان کے لیے اقدام کا راستہ بند کر رہا ہے۔ مگر اس کے باوجود ان کے لیے سائنس اور صنعت میں اقدام کا راستہ پوری طرح کھلا ہوا ہے۔ جاپان کی قوم جنگی اور سیاسی ٹکراؤ کے میدان سے واپس آکر علم اور صنعت کے میدان میں باقی ماندہ مواقع استعمال کرنے لگی۔ یہاں تک کہ صرف ۴۰ سال بعد مورخ کو جاپان کے بارے میں یہ الفاظ لکھنے پڑے ——— ۱۹۴۵ کی دوسری عالمی جنگ میں شکست کھایا ہوا جاپان، دوبارہ جنگ کے کھنڈروں سے اٹھ کھڑا ہوا اور دنیا کی ایک عظیم اقتصادی طاقت بن گیا:

Defeated in World War II (1945), Japan emerged from the ruins of war as one of the major economic powers in the world (V/519).

حال کو مان لینا آدمی کے لیے مستقبل کا راستہ کھولتا ہے۔ جو لوگ حال کو نہ مانیں وہ مستقبل کے عظیم تر امکانات کو پانے سے بھی محروم رہیں گے۔

تاریخ کا سبق

سر ٹامس رو (Sir Thomas Roe) سترھویں صدی عیسوی کے شروع میں لندن سے ہندستان آیا اور یہاں تین سال (۱۶۱۸-۱۶۱۵) تک رہا۔ اس نے مغل حکمراں جہانگیر سے تعلق پیدا کیا۔ دوسری اعلیٰ صفات کے ساتھ اس کی ایک صفت یہ تھی کہ وہ ترکی زبان جانتا تھا اور جہانگیر سے براہ راست گفتگو کر سکتا تھا۔

سر ٹامس رو (۱۶۴۴-۱۵۸۱) جب ہندستان آیا، اس وقت جہانگیر اجمیر میں تھا۔ ٹامس رو اجمیر پہنچا اور تین سال تک یہاں رہا۔ جہانگیر کبھی کبھی اس کو اپنے دربار میں بلاتا اور اس سے ادھر ادھر کی گفتگو کرتا۔ ٹامس رو نے اندازہ کیا کہ جہانگیر کو فن مصوری سے بہت دل چسپی ہے۔ اس نے ایک روز جہانگیر کی خدمت میں ایک تصویر پیش کی۔ جہانگیر کو یہ تصویر بہت پسند آئی۔

ٹامس رو نے محسوس کیا کہ وہ جس وقت کا منتظر تھا، وہ وقت اب اس کے لیے آگیا ہے۔ اس نے بادشاہ سے ایک ایسی چیز مانگی جو بظاہر بہت معمولی تھی۔ یہ چیز تھی، ہندستان کے ساحلی شہر سورت میں فیکٹری (تجارتی ادارہ) قائم کرنے کی اجازت۔ بادشاہ نے ایک فرمان لکھ دیا۔ جس کے مطابق انگریز (ایسٹ انڈیا کمپنی) کو سورت میں اپنا تجارتی ادارہ قائم کرنے کی اجازت مل گئی۔

ہندستان کے ایک شہر میں تجارتی ادارہ کھولنے کی اجازت بظاہر بہت معمولی چیز تھی۔ کیونکہ اس کے باوجود ہندستان کا وسیع ملک مغل حکمراں ہی کے حصہ میں تھا۔ عظمت وشان اور قوت وطاقت کے تمام مظاہر پر دوسروں کا قبضہ بدستور باقی تھا۔ مگر سورت میں تجارتی ادارہ قائم کرنا انگریز کو وہ سرا دے رہا تھا جو بالآخر اس کو تمام دوسری چیزوں پر قبضہ دلادے۔ چنانچہ انگریز نے اس کمتر چیز کو قبول کر لیا اور اس کے بعد تاریخ نے بتایا کہ جو کم تر پر راضی ہو جائے وہ آخر کار برتر پر بھی قبضہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔

یہ تاریخ کا سبق ہے، مگر بہت کم لوگ ہیں جو اس تاریخ سے سبق حاصل کریں۔

تشخیص کا مسئلہ

مسلمان موجودہ زمانہ میں احساس محرومی کا شکار ہوئے۔ وہ ایسے حالات سے دوچار ہوئے جس نے انھیں یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ کوئی چیز ان سے کھوئی گئی ہے۔ اس موقع پر اصل سوال یہ تھا کہ وہ کیا چیز ہے جو مسلمانوں سے کھوئی گئی ہے، کیوں کہ آدمی جس چیز کے بارے میں احساس محرومی سے دوچار ہو اسی کو وہ پانے کی کوشش کرے گا۔ اسی کے بارے میں وہ اپنا سارا زور لگا دے گا۔

اس موقع پر ایک سنگین حادثہ پیش آیا۔ وہ یہ کہ مسلمانوں کے تمام لیڈروں نے انھیں یہ احساس دلایا کہ ان سے جو چیز کھوئی گئی ہے وہ حکومت ہے۔ مسلمانوں کے درمیان جو شاعر اور خطیب اور انشار پرداز پیدا ہوئے، اور جو نام نہاد مفکرین ان کے درمیان اٹھے ان سب نے اپنے اپنے انداز سے مسلمانوں کو یہ احساس دلایا کہ تم حکومت سے محروم ہو گیے ہو اور یہی سب سے بڑی وجہ ہے جس نے تم کو موجودہ زمانہ میں حقیر اور کمزور کر دیا ہے۔

اس تشخیص کے قدرتی نتیجہ کے طور پر یہ ہوا کہ تمام مسلمان نہ صرف ہندستان بلکہ ساری دنیا میں حکومت و اقتدار کو دوبارہ حاصل کرنے کے لیے دوڑ پڑے۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں نے احیار ملت اور تجدید اسلام کے نام سے جو کوششیں کی ہیں وہ تقریباً سب کی سب اسی ایک خانہ میں جاتی ہیں۔ مگر ان کوششوں کی صد فی صد ناکامی بتاتی ہے کہ وہ تشخیص صد فی صد غلط تھی جس کی بنیاد پر یہ تحریکیں اٹھائی گئیں۔

حقیقت یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں نے جو چیز کھوئی ہے وہ تعلق باللہ ہے۔ اللہ پر زندہ عقیدہ، اللہ کی سچی پرستش، اللہ کے آگے مسئولیت کی تڑپ، اللہ کے لیے جینے اور مرنے کا احساس، یہ ہے وہ اصل چیز جو موجودہ زمانہ کے مسلمانوں سے کھوئی گئی ہے یہ محرومی اتنی عام ہے کہ اصاغر اور اکابر، حتی کہ بے ریش اور باریش دونوں قسم کے مسلمان اس سے خالی ہیں۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی یہی اصل کمی ہے جس نے ان کے اندر دوسری تمام کمیاں پیدا کی ہیں۔ جب تک ان کی یہ کمی دور نہ ہو وہ اپنی اسی موجودہ حالت میں پڑے رہیں گے۔ کسی بھی دوسری چیز کا حصول ان کے مرض کا علاج نہیں بن سکتا۔

علامتی سرزمین

شارلی مان (۷۴۲ - ۸۱۴ء) عباسی خلیفہ ہارون رشید کا ہم عصر تھا۔ مغربی یورپ کے بڑے حصہ پر اس کی حکومت قائم تھی۔ ہارون رشید کے زمانہ حکومت (۷۸۶ - ۸۰۹ء) میں ایسا ہوا کہ خلیفہ اور فرینک شہنشاہ شارلی مان کے درمیان بعض سفارتی تبادلے ہوئے۔ اس میں بظاہر شارلی مان کا مقصد یہ تھا کہ لاتینی اہل کلیسا کے لیے یروشلم میں کچھ مراعات حاصل کی جائیں:

It was in Harun's reign that certain diplomatic exchanges took place between the caliph and the Frankish emperor Charlemagne.

پروفیسر ہٹی نے بعض مسیحی ماخذ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ خلیفہ بغداد کی طرف سے اس وقت شارلیمان کے لیے جو قیمتی تحفے بھیجے گیے، ان میں ایک پیچیدہ گھڑی (Intricate clock) بھی شامل تھی۔ (ہسٹری آف دی عربس، صفحہ ۲۹۸)

۱۲ سو سال پہلے مسلمانوں کی حالت یہ تھی کہ وہ یورپ کے بادشاہ کو وقت کا وہ اعلیٰ تحفہ بھیج سکتے تھے جو خود یورپ میں ناقابل حصول تھا۔ اور یورپ کا مسیحی بادشاہ فلسطین میں اپنے ہم مذہبوں کے حق میں معمولی مراعات حاصل کرنے کے لیے مسلم خلیفہ سے رجوع کرتا تھا، آج یہ حال ہے کہ اسی فلسطین میں مسلمانوں کی خود اپنی جان و مال بھی محفوظ نہیں۔

فلسطین کے قدیم وارثوں (یہود) کے لیے یہ قانون تھا کہ اگر وہ خدا کے دین پر قائم رہیں تو انھیں فلسطین میں باعزت زندگی حاصل ہو۔ اور اگر وہ خدا کے دین سے ہٹ جائیں خدا کا فر قوموں کے ذریعہ انھیں فلسطین میں ذلیل کر دے (بنی اسرائیل ۸) فلسطین اپنے قدیم وارثوں کے لیے خدا کے رحمت اور غضب دونوں کی علامت تھا۔ اسی طرح فلسطین اپنے وارثوں (مسلمانوں) کے لیے بھی خدا کے رحمت اور غضب کی علامت ہے۔ مسلمان اگر خدا کے دین پر قائم ہوں تو وہ فلسطین میں عزت پائیں گے۔ اور اگر وہ خدا کے دین پر قائم نہ رہیں تو اندیشہ ہے کہ فلسطین میں ان کا وہی انجام ہو جو اس کے سابق وارثوں کا اس بابرکت زمین میں ہوا۔

بربادی کے باوجود

"ہر ناکامی میں ایک نئی کامیابی کا امکان چھپا ہوا ہوتا ہے" یہ ایک ابدی اصول ہے۔ اسلام
یخ میں اس اصول کے بہت سے عملی نمونے پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک نمونہ یہ ہے کہ
یں صدی میں جن مسلمانوں کے اوپر اسپین کے دروازے بند کیے گئے تھے، انھیں کے ذریعہ
ے بربری قبائل میں اسلامی دعوت کے دروازے کھلے۔

پروفیسر ٹی ڈبلیو آرنلڈ نے اس سلسلہ میں لکھا ہے کہ بربری قبائل کے لوگ اپنے پہاڑوں کے
یں بند تھے اور اپنی خود مختاری کے دلدادہ تھے۔ اس لیے انھوں نے اپنے یہاں عربی عناصر
اخلہ کو کامیابی سے روکا۔ اور اس بنا پر ان کو مسلمان بنانے میں بہت دشواریاں حائل ہوئیں۔
یہ سلسلہ کی ایک خانقاہ (ساقیۃ الحمراء) کے صوفیوں نے ان کے یہاں ایک تبلیغی مشن قائم کرنے
وشش کی تھی مگر انھیں اس مقصد میں کامیابی نہ ہو سکی۔

بربری قبائل کے درمیان اسلام کے لیے راستہ ہموار کرنے کا سہرا اندلسی مسلمانوں کے سر ہے۔
سقوط غرناطہ (۱۴۹۲ء) کے بعد اسپین سے نکال دیے گئے تھے۔ اور اس کے بعد افریقہ آکر اسی
نقاہ میں پناہ گزیں ہوئے تھے۔ خانقاہ کے شیخ نے دیکھا کہ یہ لوگ تبلیغ کے اس دشوار کام کے
ے بہت موزوں ہیں جس کو سر انجام دینے میں ان کے اپنے مریدوں کی کوششیں ناکام رہی تھیں۔
ں کار خیر پر روانہ کرنے سے پہلے انھوں نے ان کو ان الفاظ میں مخاطب کیا:

"ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم اسلام کی مشعل ان ملکوں میں لے جائیں جو برکات اسلام کی نعمت سے
محروم ہو چکے ہیں۔ ان بدقسمت قبائل کے ہاں نہ تو مدارس ہیں اور نہ کوئی شیخ ہے جو ان کے بچوں کو
اصولِ اخلاق اور محاسنِ اسلام کی تعلیم دے سکے۔ یہ لوگ جانوروں کی طرح رہتے ہیں جن کو نہ خدا
کا علم ہے، نہ دین کا۔ لہٰذا میں نے ارادہ کیا ہے کہ اس ناگوار صورتِ حال کی اصلاح کے لیے
تمہاری دینی حمیت اور نورِ ایمان سے درخواست کروں تاکہ یہ کوہستانی لوگ اپنی قابلِ رحم جہالت
کی دلدل میں غلطاں و پیچاں نہ رہیں اور ہمارے دین کی شاندار صداقتوں سے باخبر ہو جائیں۔
جاؤ اور ان کے ایمان کی بجھتی ہوئی آگ کو ہوا دو اور اس کی دبی ہوئی چنگاریوں کو دوبارہ

روشن کرو۔ اپنے پہلے مذہب یعنی عیسائیت کی جس ضلالت سے وہ اب تک آلودہ ہیں، اس سے ان کو پاک کرو اور ان کو یہ سمجھاؤ کہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دین میں عیسائیت کے برعکس میل کچیل اللہ تعالیٰ کی نظروں میں مقبول نہیں ہے۔ میں تم سے یہ بات پوشیدہ نہیں رکھنا چاہتا کہ تمہارے کام میں بہت سی دشواریاں ہیں لیکن تمہاری ناقابل تسخیر حمیت اسلامی اور حرارت ایمانی خدا کے فضل و کرم سے تمام مشکلات پر غالب آئے گی۔ میرے بچو! جاؤ، اور اس بدنصیب قوم کو خدا اور اس کے رسول کی طرف دوبارہ لاؤ جو اس وقت جہالت اور کفر کی دلدل میں پھنسی ہوئی ہے۔ ان کو نجات کا پیغام پہونچاؤ۔ خدا تمہارے شامل حال رہے اور تمہاری مدد فرمائے۔

یہ مبلغ پانچ پانچ، چھ چھ کی جماعتوں میں مختلف اطراف میں روانہ ہوگیے۔ وہ پھٹے پرانے کپڑے پہنے اور ہاتھ میں عصا لیے چل دیئے اور انھوں نے پہاڑوں کے سنسان اور غیر آباد مقامات انتخاب کر کے وہاں کے غاروں میں چٹانوں کے درمیان خانقاہیں قائم کیں۔ قبائل کے درمیان ان کی پرہیزگاری اور عبادت گزاری کا چرچا ہونے لگا۔ چنانچہ یہ قبائل جلد ہی ان کے ساتھ راہ و رسم پیدا کرنے لگے۔ ان مبلغوں نے آہستہ آہستہ اپنے علم طب اور صنائع وحرفت اور تمدن کے دیگر فوائد کی بدولت بربری قبائل کے ہاں اپنا مطلوبہ اثر و رسوخ قائم کر لیا اور ہر ایک خانقاہ اسلامی تعلیم کا مرکز بن گئی۔ ان نو واردوں کے علم وفضل کی کشش سے بہت سے طالب علم ان کے گرد و پیش جمع ہوگیے، اور کچھ عرصے کے بعد یہی طالب علم اپنے ابنائے وطن میں اسلام کی تبلیغ کرنے لگے، یہاں تک کہ ان کا مذہب ان قبائل کے تمام علاقوں اور صحرائے الجزائر کی بستیوں میں پھیل گیا۔" پریچنگ آف اسلام، صفحہ ۳۵-۱۳۴

پروفیسر آرنلڈ کا مذکورہ اقتباس بتاتا ہے کہ قدیم اسپین کی تاریخ سے دو قسم کے واقعات وابستہ ہیں۔ ایک یہ کہ عیسائیوں نے انھیں اسپین سے ظالمانہ طور پر نکالا۔ دوسرے یہ کہ ان نکلے ہوئے مسلمانوں نے باہر آکر اسلام کا ایک عظیم کارنامہ انجام دیا۔ مگر موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ ان میں سے ہر شخص "پہلے اسپین" کو جاننے کا ماہر بنا ہوا ہے، "دوسرے اسپین" کو جاننے والا ان کے درمیان کوئی نہیں۔ کیسے عجیب ہیں وہ لوگ جنھیں اندھیرے تو خوب نظر آئیں، مگر اجالے ان کو دکھائی نہ دے سکیں۔

حکمتِ دعوت

لکل اُمّۃ جعلنا منسکا ھم ناسکوہ فلا ینازعنّک فی الامر وادع الیٰ ربّک انّک لعلیٰ ھدًی مستقیم وان جادلوک فقل اللہ اعلم بما تعملون ۔ اللہ یحکم بینکم یوم القیامۃ فیما کنتم فیہ تختلفون ۔

(الحج ۶۷-۶۹)

ہر امت کے لیے ہم نے ایک طریقہ ٹھہرا دیا تو وہ اسی طرح عمل کرتے ہیں۔ پس وہ تم سے اس امر میں جھگڑا نہ کریں۔ اور تم اپنے رب کی طرف بلاؤ۔ بیشک تم سیدھی راہ پر ہو۔ اور اگر وہ تم سے جھگڑا کریں تو کہو کہ اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ تم کر رہے ہو۔ اللہ تمہارے درمیان قیامت کے دن فیصلہ کر دے گا جس چیز میں تم اختلاف کرتے تھے۔

اس آیت کے شانِ نزول کے سلسلہ میں یہ روایت آئی ہے کہ وہ اس وقت اتری جب کہ مشرکوں (بدیل بن ورقا، بشر بن سفیان، یزید بن خنیس) نے اہلِ ایمان سے کہا کہ تمہارا کیا حال ہے کہ جس جانور کو تم نے مارا اس کو تم کھاتے ہو اور جس جانور کو خدا نے مارا اس کو تم نہیں کھاتے۔ یعنی مردار کو (نزلت حین قال المشرکون للمسلمین ما لکم تأکلون ما قتلتم ولا تأکلون ما قتلہ اللہ یعنی المیتۃ، تفسیر النسفی، الجزء الثالث، صفحہ ۱۱۰)

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جب عرب میں تشریف لائے تو عرب کے لوگ معروف معنوں میں بے دین نہ تھے۔ انھوں نے حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل کے نام پر ایک ڈھانچہ اختیار کر رکھا تھا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی تعلیمات اس مذہبی ڈھانچہ سے ٹکراتی تھیں۔ (مثلاً ان کے مروجہ مذہب میں مردار جائز تھا، جب کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اس کو حرام بتاتے تھے) اس طرح کے اختلافات کی بنا پر وہ آپ سے بدکتے تھے۔ وہ اپنے آپ کو بزرگوں کے راستہ پر چلنے والا کہتے تھے، اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں ان کا کہنا تھا کہ انھوں نے بزرگوں سے ہٹ کر نیا راستہ نکالا ہے۔

اس سلسلہ میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت دی گئی کہ آپ ان ظواہر میں نہ الجھیں۔ لوگ اس قسم کی چیزوں کو لے کر بحث کرنے آئیں۔ ان سے اعراض کرتے ہوئے اصل صراطِ مستقیم (دعوت الی اللہ) پر قائم رہیں۔ داعی کو چاہیے کہ وہ اپنے مدعو کے سامنے ہمیشہ اساسی تعلیمات

رکھے، وہ ظاہری امور اور فروعی اختلافات میں اس سے نہ اُلجھے۔

آیت میں فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْأَمْرِ کا فقرہ ہے۔ اس کا لفظی ترجمہ یہ ہے کہ اس امر میں وہ تم سے جھگڑا نہ کریں۔ یہاں خطاب کا رُخ بظاہر فریق ثانی کی طرف ہے۔ مگر یہ ایک اسلوب ہے۔ ورنہ یہاں اصل مخاطب خود فریق اول ہے۔ یعنی ظاہر کلام کے اعتبار سے مدعو سے کہا جا رہا ہے کہ وہ جھگڑا نہ کریں۔ مگر حقیقت کے اعتبار سے یہاں یہ کہا گیا ہے کہ تم ان سے جھگڑا نہ کرو۔ عربی میں اگر یہ کہا جائے کہ لا يضربنّك زيدٌ تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوگا کہ زید کو منع کیا گیا کہ وہ تم کو نہ مارے۔ بلکہ خود مخاطب سے کہا گیا کہ تم یک طرفہ احتیاط کے ذریعہ اس کی کوشش کرو کہ زید تم کو مارنے نہ پائے:

قال الزجاج معنى قوله (لاينازعنك) لاتنازعهم انت۔ كما يقال لايخاصمنّك فلان۔ اى لاتخاصمه۔ وهذا جائزٌ فيما يكون بين اثنين۔ وذالك لان المنازعة والمخاصمة لاتتم الا باثنين فاذا ترك احدهما ذهبت المخاصمة۔

(التفسیر المظہری، المجلد السادس، صفحہ ۳۴۶)

زجاج نے کہا کہ لَا يُنَازِعُنَّكَ کا مطلب یہ ہے کہ تم خود ان سے نزاع نہ کرو۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے فلاں آدمی تم سے مخاصمت نہ کرے، یعنی تم اس سے مخاصمت کی نوبت نہ آنے دو۔ یہ اس وقت کے لیے ہے جب کہ نزاع دو آدمیوں کے درمیان ہو۔ اس لیے کہ نزاع اور جھگڑا دو آدمیوں کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ پس جب دونوں میں سے ایک شخص نزاع چھوڑ دے تو جھگڑا اپنے آپ ختم ہو جائے گا۔

اس قرآنی حکم کا واضح مطلب یہ ہے کہ جو شخص خدا کے دین کی دعوت دینا چاہتا ہو، اس پر لازم ہے کہ وہ دعوت کے ساتھ نزاع کو جمع نہ کرے۔

داعی اور مدعو کے درمیان اگر نزاع کی فضا ہو تو مدعو کبھی کھلے ذہن کے ساتھ داعی کی بات نہیں سنے گا۔ اس لیے داعی کو یک طرفہ طور پر یہ ذمہ داری لینی پڑتی ہے کہ صبر اور اعراض کا طریقہ اختیار کر کے اپنے اور مدعو کے درمیان معتدل فضا کو باقی رکھے تاکہ مدعو اس کی باتوں پر ہمدردانہ غور کر سکے۔

ہر نزاع ختم ہو سکتی ہے، بشرطیکہ ایک فریق اس کو بلا شرط ختم کر دے۔

تین قسم

عن بُریدۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم القضاۃ ثلاثۃ۔ واحد فی الجنۃ واثنان فی النار۔ فاما الذی فی الجنۃ فرجلٌ عرف الحق فقضٰی بہ ورجلٌ عرف الحق فجار فی الحکم فھو فی النار ورجلٌ قضٰی للناس علی جھل فھو فی النار۔

(رواہ ابوداؤد وابن ماجہ)

حضرت بریدہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ فیصلہ کرنے والے تین قسم کے ہوتے ہیں۔ ان میں ایک جنت میں جائے گا اور دو آگ میں جائیں گے۔ پس جنت والا وہ شخص ہے جس نے حق کو پہچانا اور اس کے مطابق فیصلہ کیا۔ اور دوسرا شخص وہ ہے جس نے حق کو پہچانا پھر اس کے خلاف فیصلہ دیا تو وہ آگ میں جائے گا۔ تیسرا شخص وہ ہے جو جہالت کی بنیاد پر لوگوں کے لیے فیصلہ کرے تو وہ بھی آگ میں جانے والا ہے۔

حق کو جاننے کے لیے باطل کے پردوں کو پھاڑنا پڑتا ہے۔ پھر حق کو جاننے کے بعد اس کو ماننا اور اس کی بنیاد پر فیصلہ کرنا بھی قربانی کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ جو لوگ اس معرفت اور اس قربانی کا ثبوت دیں وہ اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت کرتے ہیں کہ انھیں جنت میں داخل کیا جائے اور بلاشبہ یہی وہ لوگ ہیں جو جنت کے ابدی باغوں میں داخل کیے جائیں گے۔

بقیہ دو قسم کے لوگ جنت میں جگہ پانے کے قابل نہیں۔ جو شخص حق کو جاننے کے بعد اس سے انحراف کرے وہ خدا کے مقابلہ میں سرکشی کرتا ہے۔ ایسے شخص کو جہنم کے سوا اور کہاں جگہ مل سکتی ہے۔ اسی طرح تیسرا شخص بھی خدا کی سزا کا مستحق ہے۔ کیوں کہ وہ خدا کے معاملہ میں سنجیدہ ثابت نہ ہو سکا۔ کوشش کے باوجود اجتہادی خطا کرنا قابل معافی ہے مگر تیاری اور تحقیق کے بغیر شرعی امور میں فیصلے دینا قابل معافی نہیں۔

یہاں جس "فیصلہ" کا ذکر ہے، اس کا تعلق صرف عدالت سے نہیں بلکہ تمام امور سے ہے۔ آدمی ہر آن فیصلے کر رہا ہے، ہر آدمی ہر آن اپنے آپ کو یا جنت کا مستحق بنا رہا ہے یا دوزخ کا۔

موقع شناسی

عزوۂ احد شوال ۳ ھ میں پیش آیا۔ اس جنگ میں ابتداءً مسلمان غالب رہے۔ مگر بعد کو انھیں شکست ہوئی۔ تقریباً ستر اصحاب شہید ہوئے۔ جب مسلمان منتشر ہوگیے تو دشمنوں کا ہجوم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بڑھا۔ انھوں نے آپ کے اوپر پتھر پھینکنے شروع کیے۔ عبداللہ بن قمئہ اور عتبہ بن ابی وقاص وغیرہ نے آپ پر اس زور کے ساتھ پتھر مارے کہ آپ کا چہرہ لہولہان ہوگیا۔ سامنے کا دانت ٹوٹ گیا۔ لوہے کی خود کی دو کڑیاں آپ کے رخسار میں اندر تک گھس گئیں۔ بعد کو ابو عبیدہ بن الجراح نے ان کڑیوں کو اپنے دانتوں سے پکڑ کر کھینچا تو ان کے دو دانت ٹوٹ گیے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زخمی ہو کر ایک پہلو پر گر پڑے۔ اس وقت آپ نے پہاڑ کے ایک گڑھے میں پناہ لی تاکہ آپ دشمنوں کی نظر سے اوجھل ہو جائیں۔ لوگوں نے آپ کو نہیں دیکھا تو مشہور ہوگیا کہ آپ شہید ہوگیے۔ اس خبر سے آپ کے اصحاب میں زبردست سراسیمگی پھیل گئی۔ اس ہنگامی حالت میں جو مختلف واقعات پیش آئے ان میں سے ایک یہ تھا :

قال ابن اسحاق : وکان اول من عرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعد الهزیمة وقول الناس قُتِلَ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم — کما ذکر ابن شهاب الزهری — کعب بن مالك، قال : عَرَفْتُ عینیه الشریفتین تزهران من تحت المِغْفَر، فنادیتُ باعلی صوتی یا معشر المسلمین ابشروا، هذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، فاشار اليّ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم " انْ اَنْصِتْ " سیرۃ ابن ہشام صفحہ ۳۱

ابن اسحاق کہتے ہیں۔ اور پہلا شخص جس نے شکست کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچانا اور لوگوں کے اس قول کے بعد کہ آپ قتل کر دیئے گیے، جیسا کہ ابن شہاب زہری نے بیان کیا، وہ کعب بن مالکؓ ہیں۔ انھوں نے کہا کہ میں نے آپ کی دونوں آنکھوں کو خود کے اندر سے چمکتے ہوئے دیکھ اس وقت میں نے بلند آواز سے پکارا، اے مسلمانو، تمہارے لیے خوش خبری ہو۔ یہ ہیں اللہ کے رسول۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میری طرف اشارہ فرمایا کہ چپ رہو۔

صحابی نے اس وقت جو جملہ کہا تھا اس کو الگ کر کے دیکھیے۔ انھوں نے صرف یہ کہا تھا کہ

مسلمانو، تمہیں خوش خبری ہو، اللہ کے رسول یہاں موجود ہیں۔ بظاہر یہ ایک صحیح اور معصوم جملہ ہے۔ بلکہ وہ ایک ایسا جملہ ہے جس پر کہنے والے کو ثواب ملنا چاہیے اور اس کی تعریف میں اَحْسَنْتَ وَصَدَقْتَ کا غلغلہ بلند ہونا چاہیے۔ مگر عملاً اس کے برعکس ہوا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں چپ رہنے کے لیے کہا۔ اور وہ بھی زبان سے نہیں کہا بلکہ اشارہ سے کہا۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ نے اس وقت نہ خود بولنا پسند فرمایا اور نہ یہ چاہا کہ کوئی دوسرا شخص اس موقع پر بولے۔

مذکورہ موقع پر کیوں ایسا ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بولنے سے منع فرمایا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت آپ دشمنوں کی نگاہ سے اوجھل تھے۔ چوں کہ اس وقت آپ شدید زخمی تھے۔ اس لیے آپ کا لوگوں کی نظروں سے اوجھل رہنا ہی قرین مصلحت تھا۔ اگر وہ لوگ جان لیتے کہ آپ یہاں گڈھے میں ہیں تو وہ ہجوم کرکے وہاں آتے اور آپ کے اوپر مزید پتھر برسانا شروع کر دیتے۔ ایسے نازک موقع پر چپ رہنا زیادہ بہتر تھا نہ کہ بولنا۔

اسی کا نام موقع شناسی ہے۔ عملی کارروائی ہمیشہ حالات اور مواقع کے لحاظ سے کی جاتی ہے۔ جس کارروائی میں حالات اور مواقع کی رعایت شامل نہ ہو وہ خودکشی ہے نہ کہ حقیقی معنوں میں کوئی عملی کارروائی۔

حالات کبھی یکساں نہیں رہتے، ان میں بار بار تبدیلی ہوتی ہے، اس لیے طریق عمل میں بھی بار بار تبدیلی کی ضرورت پیش آتی ہے۔ کبھی ایک مقصد کو اعلان کے ساتھ حاصل کیا جاتا ہے کبھی اسی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ اخفا کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ کبھی آدمی مجبور ہوتا ہے کہ فریق ثانی کے ساتھ مقابلہ کرے، کبھی زیادہ کامیاب تدبیر یہ ہوتی ہے کہ آدمی اپنے آپ کو مقابلہ کے میدان سے ہٹا دے۔ کبھی پانے کی کوشش کا نام پانا ہوتا ہے اور کبھی پانا اس کا نام ہوتا ہے کہ کھونے کو برداشت کر لیا جائے۔

موجودہ دنیا میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے یہ حکمت اتنی زیادہ ضروری ہے کہ اللہ کے پیغمبر کو بھی اس کی رعایت کرنی پڑی، پھر دوسرے لوگ اس کی رعایت کیے بغیر کیسے کوئی حقیقی کامیابی حاصل کر سکتے ہیں۔

راہِ عمل

قرآن کے فضائل کے سلسلہ میں جو حدیثیں آئی ہیں ان میں سے ایک حدیث یہ ہے :

عن عُمَر بن الخطاب ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال، إنَّ اللہَ یَرْفَعُ بِھٰذا الکِتَابِ أقْوامًا وَیَضَعُ بِہٖ آخَرِیْن (رواہ مسلم)

حضرت عمر بن خطاب سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اللہ اس کتاب (قرآن) کے ذریعہ کچھ لوگوں کو اٹھاتا ہے اور کچھ دوسرے لوگوں کو گرادیتا ہے۔

اس حدیث کا یہ مطلب نہیں ہو سکتا کہ کسی گروہ کے پاس قرآن کی محض موجودگی وہ چیز ہے جو اس کو ترقی اور کامیابی کے اعلیٰ درجہ پر پہونچا دیتی ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو موجودہ زمانہ کے مسلمان ہرگز تباہی اور بربادی کا شکار نہ ہوتے۔ کیوں کہ آج مسلمانوں کے پاس ہر جگہ قرآن موجود ہے۔ آج پریس کا دور ہے۔ قرآن کے نہایت صحیح نسخے کروروں کی تعداد میں چھپ کر ساری دنیا میں پھیل گیے ہیں۔ کوئی گھر اور کوئی مسلم بستی ایسی نہیں ہے جہاں قرآن کے نسخے لوگوں کے پاس موجود نہ ہوں۔

پھر اس حدیث کا کیا مطلب ہے۔ کیوں کر ایسا ہوتا ہے کہ قرآن کے ذریعہ کوئی قوم اوپر اٹھتی ہے، اور دوسری قوم قرآن کے ذریعہ سے گر کر تباہ ہو جاتی ہے۔ جواب یہ ہے کہ یہ نتیجہ قرآنی نقطۂ نظر کو اختیار کرنے یا نہ کرنے کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ جو لوگ قرآنی نقطۂ نظر کو اختیار کریں وہ اس دنیا میں کامیاب ہوتے ہیں، اور جو لوگ قرآنی نقطۂ نظر کو اختیار نہ کریں وہ ناکام و نامراد ہو کر رہ جاتے ہیں۔

قرآن میں زندگی کی تمام حقیقتیں بتادی گئی ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہوا ہے :

لَقَدْ أَنْزَلْنَا إِلَيْكُمْ كِتَابًا فِيهِ ذِكْرُكُمْ (الانبیاء ۱۰)

ہم نے تمہاری طرف ایک کتاب اتاری جس میں تمہارا ذکر ہے۔

اس آیت میں "ذکر" سے کیا مراد ہے، اس سلسلہ میں ہم دو حوالے نقل کرتے ہیں :

(فیہ ذکرکم) ای ذکر ما تحتاجون الیہ

یعنی ان تمام باتوں کا تذکرہ جو دین کے معاملہ

من امر دینکم (التفسیر المظہری) فیہ ذکر دینکم — میں تمہیں درکار ہیں۔ قرآن میں تمہارے دین کا بھی ودنیاکم (تفسیر النسفی) ذکر ہے اور تمہاری دنیا کا بھی۔

ایک حدیث میں ہے کہ حضرت جبرئیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہا کہ آئندہ فتنے ہوں گے۔ آپ نے فرمایا کہ اے جبریل، پھر اس کا حل کیا ہے۔ حضرت جبریل نے کہا کہ اللہ کی کتاب۔ اس میں آپ سے پہلے کی خبر ہے اور اس میں آپ کے بعد کی خبر ہے اور اس میں فیصلہ موجود ہے (نزل جبریل علیہ السلام علی عہد رسول صلی اللہ علیہ وسلم فاخبرہ انہا ستکون فتن۔ قال فما المخرج منہا یا جبریل۔ قال کتاب اللہ۔ فیہ نبأ ما قبلکم و نبأ ما ھو کائن بعدکم وفیہ الحکم بینکم، جامع الاصول، جزء ۸، صفحہ ۴۶۴)

جب قرآن کی حیثیت یہ ہے تو ہم کو چاہیے کہ ہم اپنے مسائل کے لیے قرآن کو دیکھیں اور اسی کے اندر اس کا حل تلاش کریں۔ قرآن کے اندر جب تمام باتیں ہیں تو یقیناً اس کے اندر ہمارے موجودہ سنگین مسائل کا بیان بھی ہونا چاہیے، اور یہ بھی کہ ان مسائل کا واقعی حل کیا ہے۔ ہمیں قرآن میں دیکھنا چاہیے کہ وہ ہمارے مسائل کے بارہ میں ہمیں کیا نقطۂ نظر دیتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ قرآن میں تمام مسائل کے بارہ میں اعلیٰ رہنمائی موجود ہے۔ مگر اس رہنمائی کو پانے کے لیے صرف قرآن کو پڑھ لینا کافی نہیں، اس کے لیے ضروری ہے کہ قرآن کو اس کامل آمادگی کے ساتھ پڑھا جائے کہ جو رہنمائی قرآن میں ملے گی اس کو میں بے چون وچرا قبول کرلوں گا

قرآن کی رہنمائی ان لوگوں کے لیے ہے جو اپنی ذات کی نفی کی قیمت پر قرآن سے رہنمائی حاصل کریں۔ جو قرآن کی رہنمائی کو ماننے کے لیے اس طرح تیار ہوں کہ قرآن اگر ان کی سوچ کی تصدیق نہ کرے تو وہ پکار اٹھیں کہ "میں غلطی پر تھا" معاد یا ذاتی وقار کا سوال جن کے لیے سچائی کو مان لینے میں رکاوٹ نہ بنے۔

سچائی کو پانے کے لیے اپنے آپ کو جھوٹا کرنا پڑتا ہے۔ جو شخص اپنے جھوٹ کو جھوٹ کہنے کا حوصلہ نہ کرے وہ اس دنیا میں سچائی کو پانے والا بھی نہیں بنتا۔

تخلیق کا مقصد

یہ دنیا جس میں ہم ہیں، اس کو اگر بامقصد دنیا سمجھا جائے تو اِس سے آدمی کے اندر یہ احساس ابھرے گا کہ وہ اپنے آپ کو اس کے مطابق بنائے۔ اسی کا نام ذمہ دارانہ زندگی ہے۔ اور ذمہ دارانہ زندگی کا احساس ہی تمام انسانی خوبیوں کا اصل محرک ہے۔

اس کے برعکس اگر موجودہ دنیا کو بے مقصد دنیا فرض کرلیا جائے تو اس کے بعد یہ احساس بھی مٹ جاتا ہے کہ ہم سے اوپر کوئی مقصد ہے، اور ہم کو اسی مقصد سے مطابقت کرکے اس دنیا میں رہنا ہے۔ اس کے بعد قدرتی طور پر بے قید آزادی کا ذہن وجود میں آتا ہے، اور بے قید آزادی کا مزاج بلاشبہ تمام خرابیوں کی اصل جڑ ہے۔

اب دیکھنے کی بات یہ ہے کہ دونوں باتوں میں سے کون سی بات ہے جو انسانی فطرت سے زیادہ ہم آہنگ ہے۔ اور جو کائنات کے مجموعی نظام کے ساتھ مطابقت رکھتی ہے۔ اس حیثیت سے جب غور کیا جائے تو بلاتاخیر یہ ماننا پڑتا ہے کہ کائنات کی تخلیق ایک بامقصد منصوبہ کے تحت ہوئی ہے۔ بے مقصدیت کا نظریہ کائنات کے مجموعی نظام میں درست نہیں بیٹھتا، اس لیے وہ صحیح بھی نہیں ہو سکتا۔

انسانی فطرت چاہتی ہے کہ اچھے عمل کا اچھا انجام ہو اور برے عمل کا برا انجام۔ اگر کائنات کو بامقصد نہ مانا جائے تو انسانی فطرت یہاں بالکل بے جواب ہو کر رہ جائے گی۔ کائنات کو بے مقصد قرار دینا گویا انسان کو ایک ایسی دنیا رہنے کے لیے دینا ہے جو اس کے گہرے تقاضوں سے مطابقت نہیں رکھتی۔

اسی طرح کائنات کا وسیع تر نظام حد درجہ بامعنی انداز میں قائم ہے۔ انسان سورج کو خدا کہتا ہے مگر سورج ڈوب کر اعلان کرتا ہے کہ وہ خدا نہیں ہے۔ انسان تکبر کرتا ہے مگر اس پر موت آکر اس کے اس قسم کے تمام دعووں کو باطل کر دیتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ دنیا کسی بے مقصد توجیہہ کو قبول نہیں کرتی۔ اس دنیا میں وہی نظریہ صحیح نظریہ ہے جو انسان کو مقصدیت کا احساس عطا کرے۔

ایک مثال

موجودہ زمانہ میں جو مسلم مصلحین اٹھے وہ زیادہ تر حالات کے رد عمل میں اٹھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں وہ رأفت اور ہمدردی بہت کم پائی جاتی ہے جو پیغمبر کے کلام میں کامل طور پر موجود ہوتی ہے۔ اس کی ایک مثال مشہور مسلم مصنف کی اس کتاب میں نظر آئی جو انھوں نے پردہ (حجاب) کے موضوع پر لکھی ہے۔ پردہ کی اہمیت پر کلام کرتے ہوئے انھوں نے اپنی کتاب کو ان الفاظ پر ختم کیا ہے:

"میں کہتا ہوں کہ ہندستان کے احوال پردے کی تخفیف کے نہیں، اور زیادہ اہتمام کے مقتضی ہیں۔ کیوں کہ آپ کے نظام معاشرت کی حفاظت کرنے والے دو ستون گر چکے ہیں اور اب تمام دارومدار صرف ایک ہی ستون پر ہے۔ تمدن اور معیشت اور سیاست کے مسائل آپ کو حل کرنے ہیں تو سر جوڑ کر بیٹھئے، غور کیجئے۔ اسلامی حدود کے اندر اس کے حل کی دوسری صورتیں بھی نکل سکتی ہیں، مگر اس بچے کھچے ستون کو، جو پہلے ہی کافی کمزور ہو چکا ہے اور زیادہ کمزور نہ بنائیے۔ اس میں تخفیف کرنے سے پہلے آپ کو کم از کم اتنی قوت پیدا کرنی چاہیے کہ اگر کوئی مسلمان عورت بے نقاب ہو تو جہاں اس کو گھورنے کے لیے دو آنکھیں موجود ہوں، وہیں اُن آنکھوں کو نکال لینے کے لیے پچاس ہاتھ بھی موجود ہوں"

یہ واضح طور پر رد عمل کی نفسیات کے تحت نکلا ہوا کلام ہے۔ کیوں کہ کسی بگڑی ہوئی معاشرت کو صالح معاشرت بنانے کا کام یقینی طور پر حکمت اور تدریج کے ساتھ کرنا ہوگا نہ یہ کہ ہم مصلحین کے اندر یہ مزاج بنائیں کہ جہاں ایک مرد کی آنکھ کسی عورت پر اٹھے، تم فوراً اس کی دونوں آنکھیں نکال کر اس کو ہمیشہ کے لیے اندھا کر دو۔

جو داعی مثبت نفسیات کے تحت اٹھے، اس کا طریقہ اس کے بالکل برعکس ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی سنت اس کا نمونہ ہے۔ یہاں میں ایک مماثل واقعہ کا حوالہ دیتا ہوں۔ حجۃ الوداع کے سلسلہ میں جو واقعات حدیث کی کتابوں میں آئے ہیں۔ ان میں سے ایک واقعہ حسب ذیل الفاظ میں منقول ہوا ہے:

عن ابن عباسؓ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اردف الفضل بن العباس یوم النحر خلفہ وکان رجلاً حسن الشعر ابیض وسیماً فجاءته امراة من خثعم تستفتیه فجعل الفضل ینظر الیها وتنظر الیه فجعل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یصرف وجه الفضل الی الشق الآخر۔ (رواہ البخاری ومسلم)

حضرت عبداللہ بن عباس کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یوم نحر کے موقع پر فضل بن عباس کو اپنی سواری کے پیچھے بٹھالیا تھا۔ وہ خوبصورت بالوں والے اور پرکشش شخصیت والے آدمی تھے۔ اس دوران قبیلہ خثعم کی ایک عورت آپ سے مسئلہ پوچھنے کے لیے آئی۔ فضل بن عباس اس کی طرف دیکھنے لگے اور وہ عورت فضل بن عباس کی طرف دیکھنے لگی۔ پس رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فضل بن عباس کا چہرہ دوسری طرف پھیرنے لگے۔

اوپر موجودہ زمانہ کے ایک مسلمان مصنف کا جو اقتباس نقل کیا گیا ہے وہ ردعمل کی نفسیات سے نکلے ہوئے کلام کی مثال ہے اور پیغمبر اسلام کا مذکورہ واقعہ مثبت نفسیات کے تحت ظاہر ہونے والے رویہ کی مثال۔

اسلام کی خدمت کے لیے اٹھنے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک صورت یہ ہے کہ آدمی اسلام کی ابدی تعلیمات سے متاثر ہو کر اٹھے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ وہ اس قسم کے مسائل سے متاثر ہو کر اٹھے جو موجودہ زمانے میں مسلمانوں کو سیاسی اور تہذیبی شکست کے نتیجہ میں پیش آئے۔ اول الذکر آدمی کے اندر ایجابی نفسیات ہو گی، اور ثانی الذکر آدمی کے اندر سلبی نفسیات۔ پہلا آدمی اس جذبہ سے سرشار ہو گا کہ خدا کی جس آفاقی رحمت سے وہ آشنا ہوا ہے، اس میں دوسروں کو حصہ دار بنائے۔ اس کے برعکس دوسرا آدمی اس جذبہ میں کھول رہا ہو گا کہ جن لوگوں نے اس کو نقصان اور شکست سے دوچار کیا ہے، ان پر اپنی ساری طاقت کے ساتھ ٹوٹ پڑے۔

بدقسمتی سے موجودہ زمانہ کے مصلحینِ ملت دوسری قسم سے تعلق رکھتے تھے، یہی وجہ ہے کہ انھوں نے لوگوں کو "اندھا" بنانے کی مثالیں قائم کیں۔ وہ لوگوں کو "بینا" بنانے کی مثال قائم نہ کرسکے۔

ملت کا المیہ

ایک لڑکا باہر سے اپنے گھر میں آتا ہے اور اپنے باپ سے کہتا ہے کہ فلاں لڑکے نے مجھے گالی دی ہے۔ باپ فوراً غصہ ہو جاتا ہے اور باہر نکل کر اس لڑکے سے جھگڑنے لگتا ہے جس کے خلاف اس کے بیٹے نے شکایت کی تھی۔ اس کے برعکس ایک اور باپ ہے۔ اس کا لڑکا باہر سے منہ بنائے ہوئے آیا اور محلہ کے لڑکے کے بارے میں شکایت کی کہ اس نے مجھے گالی دی ہے۔ باپ نے دوسرے لڑکے کے خلاف کچھ نہیں کہا۔ اس نے صرف اپنے بیٹے کو سرزنش کی کہ تم ایسے لڑکوں کے پاس کیوں گئے۔ کیا تمہارے پاس کرنے کا کوئی اور کام نہ تھا۔

وہ باپ یقیناً جھوٹا باپ ہے جو ہر معاملہ میں اپنے بیٹے کی حمایت کرتا ہے۔ ایسے باپ کے لڑکوں کا انجام یہ ہوتا ہے کہ وہ آوارہ ہو جاتے ہیں۔ وہ نہ کوئی ہنر سیکھتے اور نہ تعلیم حاصل کر پاتے۔ آخر کار وہ داد اگیری کا پیشہ اختیار کر لیتے ہیں تاکہ اپنی نالائقی کو دوسروں کے اوپر انڈیل سکیں۔ اس کے برعکس دوسرا باپ سچا باپ ہے۔ اس کے لڑکے خود تعمیری کی راہ پر لگتے ہیں۔ وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ اور پھر ترقی کرکے اپنا مستقبل بھی بناتے ہیں اور اسی کے ساتھ اپنی قوم کا مستقبل بھی۔

ہندستان کے مسلمانوں کی بدقسمتی یہ ہے کہ ان کے تمام لیڈر، خواہ وہ بے ریش ہوں یا باریش، سب کے سب اپنی قوم کے حق میں صرف "جھوٹے باپ" ثابت ہوئے ہیں۔ یہ لیڈر نصف صدی سے بھی زیادہ مدت سے جو کچھ کر رہے ہیں، اس کا خلاصہ ایک لفظ میں یہ ہے کہ ــــــ مسلمانوں کو یک طرفہ طور پر بے قصور بتا کر ایڈمنسٹریشن کو یک طرفہ طور پر قصوروار ٹھہرانا ہمارے تمام لیڈر بلا استثنار مسلمانوں کے معاملہ میں مسلسل یہی روش اختیار کیے ہوئے ہیں۔

یہ روش کسی قوم کے لیے ہلاکت سے کم نہیں۔ اس کا نقصان تمام فرقہ وارانہ فسادات میں ہونے والے مجموعی نقصان سے بھی سیکڑوں گنا زیادہ ہے۔ قوم کے قاتل کا لقب اگر صحیح طور پر کسی کے اوپر چسپاں ہوتا ہے تو وہ بلاشبہ یہی مسلم لیڈر ہیں جو قوم کی خیر خواہی کے نام پر قوم کے سب سے بڑے بدخواہ بنے ہوئے ہیں۔

اس قسم کی قومی وکالت قوم کے حق میں حوصلہ کشی کے ہم معنی ہے۔ اس روش کا سب
بڑا نقصان یہ ہے کہ اس نے مسلمانوں سے عمل کا جذبہ چھین لیا ہے۔ اس دنیا میں ہر گروہ ہر
ں میں مسائل سے دوچار ہوتا ہے۔ یہ گروہ اگر مسائل کی ذمہ داری خود قبول کرے تو اس کے
رعمل کا جذبہ ابھرے گا۔ اس کے برعکس اگر وہ اپنے مسائل کی ذمہ داری دوسروں کے اوپر
ل دے تو قدرتی طور پر اس کے اندر عمل کا محرک ختم ہو جائے گا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ کسی گروہ کے مسائل کا ذمہ دار دوسروں کو بتانا اس گروہ کو بے عملی
سبق دینا ہے، اور ہمارے تمام لیڈر مسلسل یہی مجرمانہ فعل انجام دے رہے ہیں۔ ہر معاملہ میں
ڈمنسٹریشن (انتظامیہ) کو ملزم ٹھہرانا بظاہر بہت خوش کن معلوم ہوتا ہے۔ مگر قوم کو اس کی
ہنگی قیمت دینی پڑتی ہے کہ اس کا جذبۂ عمل سرد پڑ جاتا ہے۔ اس کے افراد کے اندر یہ مزاج
ن جاتا ہے کہ ہم جن کمیوں اور خرابیوں سے دوچار ہیں، اس کے ذمہ دار ہم خود نہیں ہیں بلکہ کچھ
دوسرے لوگ ہیں جو ہمیں ان کمیوں اور خرابیوں میں مبتلا کیے ہوئے ہیں۔ یہ نفسیات جن لوگوں
کے اندر پیدا ہو جائے وہ "اپنی تعمیر آپ" کی تڑپ سے خالی ہو جاتے ہیں، اور جو لوگ اپنی تعمیر
آپ کی تڑپ سے خالی ہو جائیں ان کے لیے مقابلہ کی اس دنیا میں ناکامی کے سوا کوئی اور چیز
مقدر نہیں۔

مسلم قیادت کی اس مجرمانہ روش کی ایک مثال علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ہے۔ مسلم یونیورسٹی
میں مسلسل یہ منظر دکھائی دیتا ہے کہ وہاں جو شخص بھی وائس چانسلر ہو کر جاتا ہے۔ شروع میں اس کا
استقبال کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد جلد ہی وہ معتوب ہو جاتا ہے۔ اس کے خلاف یونیورسٹی کے مسلم
طلبہ ایجی ٹیشن چلاتے ہیں۔ اس ایجی ٹیشن میں مسلم صحافت اور مسلم قیادت بلا استثنار ان کا
ساتھ دیتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وائس چانسلر کو بدنامی کا داغ لے کر یونیورسٹی کو خیرباد
کہنا پڑتا ہے۔

ایسا کیوں ہوتا ہے۔ اس کی سادہ سی وجہ یہ ہے کہ وائس چانسلر جب علی گڑھ پہونچ کر
قریب سے حالات کو دیکھتا ہے تو وہ پاتا ہے کہ اس "قومی ادارہ" میں بہت سی اندرونی خرابیاں
ہیں جو اس کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔ وہاں ایسے "نونہالانِ ملت" گھسے ہوئے ہیں

جن کو پڑھنے سے زیادہ داد گیری سے دل چسپی ہے ۔ وغیرہ وغیرہ ۔

وائس چانسلر اس قسم کے عناصر کے خلاف ضروری کارروائی کرتا ہے تاکہ یونیورسٹی کے فاسد عضو کا آپریشن کرکے اس کے بقیہ جسم کو صحت مند بنا سکے ۔ اب جن افراد پر اس اصلاحی عمل کی زد پڑتی ہے ، وہ " اسلام خطرہ میں " اور " یونیورسٹی کا اقلیتی کردار خطرہ میں " جیسے جذباتی نعرے لے کر کھڑے ہو جاتے ہیں ۔ وہ اپنے ذاتی مسئلہ کو ایک ملی مسئلہ بنا دیتے ہیں ، ہنگامہ بازی کا طریقہ اختیار کرکے یونیورسٹی کی تعلیمی فضا کو درہم برہم کر دیتے ہیں ۔

جب ایسا ہوتا ہے تو ہر بار تمام مسلم قائدین ، خواہ وہ بے ریش قیادت سے تعلق رکھتے ہوں یا باریش قیادت سے ، دوبارہ اسی سبق کو دہرانا شروع کر دیتے ہیں جس کو دوسرے مسلم معاملات میں دہراتے رہے ہیں ۔ وہ وائس چانسلر کو " ایڈمنسٹریشن " کا نمائندہ فرض کر لیتے ہیں اور طلبہ کو " مسلم ملت " کا نمائندہ ۔ اور پھر بلا تحقیق مسلم طلبہ کو معصوم قرار دے کر یک طرفہ طور پر وائس چانسلر کو ملزم ٹھہرانے لگتے ہیں ۔ وہ اپنے الفاظ کے تمام کارتوس اس کے اوپر خالی کر دیتے ہیں ۔

اس صورت حال کا سب سے بڑا نقصان خود یونیورسٹی کو پہنچا ہے ۔ اس نے مسلم یونیورسٹی کے تعلیمی معیار کو مسلسل طور پر پست کر دیا ہے ۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ اب خود اچھے مسلم خاندانوں کے طلبہ کے لیے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی " سکنڈ چوائس " بن چکی ہے ۔ یعنی اب وہ مسلم یونیورسٹی میں صرف اس وقت داخلہ لیتے ہیں جب کہ انھیں کسی اور یونیورسٹی میں داخلہ نہ ملا ہو ۔ یہاں تک کہ وہ مسلم لیڈر جو اخباری بیان میں مسلم یونیورسٹی کے چیمپین بنے ہوئے نظر آتے ہیں وہ بھی اپنے بیٹے بیٹیوں کی تعلیم کے لیے مسلم یونیورسٹی کے بجائے دوسری یونیورسٹیوں کو پسند کرتے ہیں ۔

یہ طریقہ جو ہمارے لیڈروں نے اسلام کے نام پر اختیار کر رکھا ہے ، وہ اسلامی ہوگا وہ غیر اسلام بھی نہیں ہے ۔ کیوں کہ اسلام خوف خداوندی کی زمین پر کھڑا ہوتا ہے اور غیر اسلام حقیقت پسندی کی زمین پر ۔ اور مذکورہ بالا روش کا تعلق نہ خوف خدا سے ہے نہ حقیقت پسندی سے ۔

ہندستان کے دستور نے مذہبی اقلیتوں کو یہ خصوصی حق دیا ہے کہ وہ حکومت کی اعانت پر اپنے تعلیمی ادارے قائم کر سکیں۔ اس رعایت کا اطلاق جن مذہبی اقلیتوں پر ہوتا ہے، ان میں سے دو اقلیتیں خاص ہیں۔ ایک مسلمان، دوسرے عیسائی۔ چنانچہ دونوں نے اپنے تعلیمی ادارے قائم کیے ہیں جن کو حکومت کے خزانہ سے باقاعدہ طور پر مالی امداد دی جاتی ہے۔

مگر دونوں اقلیتوں میں انتہائی نمایاں فرق ہے۔ مسلمانوں نے "اقلیتی ادارہ" کا مطلب یہ سمجھا ہے کہ اس میں مسلم اقلیت کو خصوصی رعایت دی جائے۔ مثلاً مسلمان لڑکے کم نمبر لائیں، حتیٰ کہ فیل ہو جائیں تب بھی انھیں جگہ دی جائے۔ کسی مسلمان طالب علم کو داخلہ سے محروم نہ کیا جائے۔ عیسائی حضرات نے اپنے اقلیتی اداروں میں اس کے بالکل برعکس اصول کی پیروی کی۔ انھوں نے یہ کوشش کی کہ اپنے ادارہ کو اعلیٰ ترین تعلیمی معیار پر ترقی دیں۔ مسلمانوں نے اقلیتی ادارہ کا مطلب اقلیتی رعایت کا ادارہ سمجھا تھا۔ مگر عیسائی حضرات نے اقلیتی ادارہ کو اقلیتی آئیڈیل کا ادارہ بنانے پر ساری توجہ لگا دی۔ انھوں نے داخلہ کے معاملہ میں حد درجہ سختی اور اصول پسندی کا طریقہ اختیار کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عیسائی تعلیمی ادارے ملک کے سب سے زیادہ اچھے ادارے سمجھے جانے لگے۔ ان کے معیار کے بارہ میں یہ کہنا کافی ہوگا کہ وہ "کرسچین اسکول" ہے۔

ایک طرف مسلمانوں کے تعلیمی ادارے ہیں جو کمتر معیار کے لیے نمونہ بن گیے ہیں۔ دوسری طرف عیسائی حضرات کے تعلیمی ادارے ہیں جو سارے ملک میں برتر معیار کا نمونہ بنے ہوئے ہیں۔ حتیٰ کہ اب خود صاحب حیثیت مسلمان بڑی بڑی فیس ادا کر کے اپنے بچوں کو عیسائی تعلیمی اداروں میں داخل کرتے ہیں اور ان کو وہاں کا طالب علم بنا کر فخر محسوس کرتے ہیں۔

مسلمانوں کا یہ مزاج میرے نزدیک علمی خودکشی کے ہم معنی ہے۔ مسلمان اگر آج کی دنیا میں باعزت زندگی حاصل کرنا چاہتے ہیں تو انھیں اپنے اداروں کو رعایت کی بنیاد پر نہیں بلکہ اصول کی بنیاد پر چلانا ہوگا۔ اور اس پر حد درجہ سختی کے ساتھ عمل کرنا ہوگا تاکہ مسلمانوں کے ادارے اعلیٰ معیار کا نمونہ بنیں۔ حتیٰ کہ سارے ملک میں وہ طالبان علم کے لیے "فرسٹ چوائس" بن جائیں۔ نہ کہ "سکنڈ چوائس" یا "تھرڈ چوائس" جیسا کہ آج وہ عملاً بنے ہوئے ہیں۔

اکثر ایسا ہوا ہے کہ علیگڈھ کے وائس چانسلر کو سفیر یا گورنر وغیرہ بنا دیا گیا۔ اس بنا پر کہا جاتا ہے کہ جو شخص بھی یونیورسٹی میں وائس چانسلر ہو کر آتا ہے، اس کا ذہن یہ بن جاتا ہے کہ نئی دہلی کو زیادہ سے زیادہ خوش کرے تاکہ آئندہ کے لیے اس کی اعزازی سیٹ محفوظ ہو جائے۔ علیگڈھ کے وائس چانسلر کے لیے نئی دہلی کو خوش کرنے کا سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ وہ یونیورسٹی کا اسٹینڈرڈ بڑھانے کے نام پر داخلوں میں میرٹ کا اصول جاری کر دے۔ چوں کہ ہندو طلبہ تعلیم میں آگے ہیں اس لیے اس اصول کو جاری کرنے کا نتیجہ عملاً یہ ہوتا ہے کہ یونیورسٹی کے تمام اہم شعبوں (سائنس، انجینیرنگ، طب) پر ہندو طلبہ قابض ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ مسلم یونیورسٹی میں ہر سال مسلمانوں کا تناسب گھٹتا جا رہا ہے۔ اس بنا پر علی گڑھ میں مسلمانوں کو رعایتی داخلے ملنے چاہئیں۔

ان حضرات کو شاید معلوم نہیں کہ پاکستان (سندھ) میں بھی ہندو طلبہ وہاں کے سائنس اور انجینیرنگ اور طب کے شعبوں پر چھائے ہوئے ہیں۔ پھر پاکستان میں کس وائس چانسلر کی "غداری" کی بنا پر ایسا ہو رہا ہے۔

میرے نزدیک اس قسم کا مطالبہ زندگی کا مطالبہ نہیں بلکہ موت کا مطالبہ ہے۔ یہ حقیقتِ وا سے لڑنا ہے، اور حقیقتِ واقعہ سے لڑنے والا صرف اپنا سر توڑتا ہے۔ وہ حقیقتِ واقعہ میں کو تبدیلی پیدا نہیں کرتا۔ یہ بالکل یقینی ہے کہ مسلمانوں کے مطالبہ اور احتجاج کے باوجود یونیورس میں یہ عمل جاری رہے گا، جیسا کہ وہ اب تک جاری رہا ہے۔ خواہ یونیورسٹی کا وائس چانسلر خو احتجاجی مہم کے کسی لیڈر کو کیوں نہ بنا دیا جائے۔ یہ ایک ناقابل عمل مطالبہ ہے، اور نا قا عمل مطالبہ اس دنیا میں کبھی واقعہ نہیں بنتا۔

یہ مقابلہ کی دنیا ہے۔ یہاں کسی کو زندگی کا مقام صرف استحقاق ثابت کرنے پر ملتا ہے۔ اس دنیا صرف وہ شخص کامیاب ہوتا ہے جس کا حال یہ ہو کہ رعایت کی بنیاد پر حق نہ ملے تو وہ امتیاز کی بنیاد پر حق وصول کرے۔ دنیا اگر اس کو برابری (Equal) کی سطح پر قبول نہ کر رہی ہو تو وہ برابری سے زیا (More than equal) کی سطح پر اپنی حیثیت کو منوائے۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ حقیقت کو بد کے بجائے خود اپنے آپ کو بدلنے کی کوشش کریں۔ علی گڑھ میں اگر مسلمان طلبہ کم ہو رہے ہیں تو ان اپنی محنت کو بڑھا کر اس کمی پر قابو پانا چاہیے۔ احتجاج اور مطالبہ کے ذریعہ یہ مسئلہ کبھی حل ہونے والا

ایک واقعہ

ایک لیڈر صاحب سے میری گفتگو ہوئی۔ ان کے دو لڑکے ایک "غیر مسلم" تعلیمی ادارہ ں اعلیٰ سائنسی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ آپ نے اپنے لڑکوں کو مسلم یونیورسٹی یکیوں نہیں داخل کیا، ان کو آپ غیر مسلم ادارہ میں کیوں تعلیم دلا رہے ہیں۔ انھوں نے ۔اکہ وہاں مقابلہ (Competition) کا ماحول ہے، جب کہ مسلم یونیورسٹی میں مقابلہ کا ماحول یں اور آپ جانتے ہیں کہ بڑی ترقی حاصل کرنے کے لیے مقابلہ کا ماحول بے حد ضروری ہے۔

میں نے کہا کہ مسلم یونیورسٹی کے بارے میں آپ جو بیانات دیتے رہے ہیں اس ں آپ نے مسلسل اس نظریہ کی وکالت کی ہے کہ مسلم یونیورسٹی میں داخلوں کے لیے رعایت (Relaxation) ہونا چاہیے۔ پھر جب بڑی ترقیاں مقابلہ کے ذریعہ ہوتی ہیں تو آپ مسلم نیورسٹی میں اس کے خلاف ماحول کیوں بنانا چاہتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ عام مسلم طلبہ ے ساتھ اگر مسلم یونیورسٹی میں رعایت نہ کی جائے تو دوسری کون سی جگہ ہے جہاں وہ اپنے لیے رعایت پا سکیں گے۔ پھر ان کا انجام کیا ہوگا۔

میں نے کہا، اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنی اولاد کے لیے تو آپ یہ چاہتے ہیں کہ ان کو یے ماحول میں ڈالیں جہاں محنت کا محرک موجود ہو تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ محنت کر کے یادہ سے زیادہ آگے بڑھیں۔ مگر قوم کے بچوں کے لیے محنت کا محرک ختم کر کے انھیں کاہل بنا دینا چاہتے ہیں تاکہ وہ ہمیشہ کے لیے تعلیمی طور پر پیچھے ہو جائیں۔ اپنے بچوں کو آپ تعلیمی ہیرو دیکھنا چاہتے ہیں اور دوسروں کے بچوں کو تعلیمی ہریجن۔

یہی موجودہ زمانہ کے تمام مسلم لیڈروں کا حال ہے۔ وہ اپنی اولاد کے لیے کچھ پسند کرتے ہیں اور ملت کی اولاد کے لیے کچھ۔ یہی وجہ ہے کہ لیڈر اور ان کے متعلقین کامیابی کی راہ میں آگے بڑھ رہے ہیں۔ مگر ملت کے حصہ میں اس کے سوا کچھ اونہ آیا کہ وہ جلسوں کی بھیڑ کے ذریعہ لیڈروں کی شانِ قیادت میں اضافہ کریں اور اس کے بعد بربادی کا نشان بن کر رہ جائیں۔

خلاصۂ کلام

سیاست کی دو قسمیں ہیں۔ ایک باہر رُخی (Outward oriented) سیاست۔ اور دوسرے اندر رُخی (Inward oriented) سیاست۔ باہر رخی سیاست وہ ہے جس میں کسی بیرونی طاقت کو نشانہ بنا کر اس کے خلاف دھوم مچائی جائے۔ اس کے مقابلہ میں اندر رخی سیاست وہ ہے جس میں اندرونی کمیوں کو نشانہ بنا کر ان کی اصلاح پر ساری طاقت صرف کی جائے۔ پہلے قسم کی سیاست احتجاجِ غیر کا ذہن پیدا کرتی ہے اور دوسرے قسم کی سیاست تعمیرِ خویش کا۔

یہ مسلمانوں کی بدقسمتی ہے کہ ان کے درمیان نصف صدی سے بھی زیادہ مدت سے باہر رخی سیاست کا ہنگامہ جاری ہے۔ یہ بلاشبہ جھوٹی سیاست ہے۔ اس قسم کی سیاست کچھ سطحی لیڈروں کے لیے ذاتی طور پر مفید ہو سکتی ہے، مگر وسیع تر ملت کے لیے وہ یقینی طور پر زہر ہے۔ موجودہ مقابلہ کی دنیا میں ترقی کا واحد راز ذاتی جدوجہد ہے، اور یہی وہ قیمتی سرمایہ ہے جس سے لیڈروں کی موجودہ قسم کی سیاست نے مسلمانوں کو محروم کرکے رکھ دیا ہے۔

یہ دنیا جدوجہد کی دنیا ہے۔ یہاں رکاوٹوں کے باوجود آگے بڑھنا ہے۔ یہاں مخالفتوں کے باوجود اپنے لیے راہ نکالنا ہے۔ جو لوگ اس امتحان میں پورے اتریں، وہی اس دنیا میں کامیاب ہوں گے۔ اور جو لوگ اس امتحان میں پورے نہ اتریں، ان کے لیے خدا کی اس دنیا میں ناکامی کے سوا کوئی اور انجام مقدر نہیں۔

آسان حل

ایک قائد فرقہ وارانہ فساد کے موضوع پر بول رہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ میں جو فسادات کے
ف تحریک چلا رہا ہوں اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ مجھے ذاتی طور پر کوئی خطرہ محسوس ہو رہا
ہے۔ میرے لیے دولت مند عرب ملکوں میں قیمتی پیش کشیں موجود ہیں اور میں وہاں جاکر آرام
ر عافیت کی زندگی گزار سکتا ہوں۔

یہ آدھی سچائی ہے۔ کسی مسلمان کے لیے عرب ملکوں میں قیمتی جگہ صرف اس شرط پر ہے کہ وہ وہاں
ے نظام سے مکمل موافقت کرے۔ اگر وہ وہاں جاکر اس قسم کی مخالفِ نظام تقریر کرنے لگے جیسی تقریریں
اسے قائدین یہاں کرتے رہتے ہیں تو عرب ملکوں میں اس کی کم سے کم سزا یہ ہوگی کہ اس کو
رًا وہاں سے "ڈی پورٹ" کر دیا جائے۔

موجودہ زمانہ میں اصاغر اور اکابر کی بہت بڑی تعداد عرب ملکوں سے قیمتی فوائد حاصل کر رہی
ہے۔ کچھ لوگ وہاں مستقل طور پر آباد ہیں۔ کچھ لوگ تقریبات اور کانفرنسوں میں شریک ہو کر اپنی شہرت
د اعزاز میں اضافہ کر رہے ہیں۔ مگر ان فوائد کا حصول صرف اس قیمت پر ممکن ہوا ہے کہ ہر ایک
ہاں کے سیاسی نظام کے بارہ میں مکمل طور پر خاموش رہتا ہے۔ وہ وہاں کی ان خرابیوں کے
لاف کبھی نہیں بولتا جن کے خلاف بولنا حکومتی نظام سے ٹکرانے کے ہم معنی ہو۔ حتیٰ کہ اگر وہاں
وڈ اسپیکر کے عمومی استعمال پر پابندی ہو تو وہ یہ مطالبہ لے کر نہیں کھڑے ہوتے کہ ہم کو لاؤڈ اسپیکر
ے عام استعمال کی اجازت دی جائے۔ یہی وہ واحد قیمت ہے جس کی ادائیگی نے انھیں یہ موقع دیا ہے
ہ وہ عرب ملکوں کے قیمتی فوائد اپنے لیے سمیٹ سکیں۔

ایسی حالت میں کہنے والوں کو یہ کہنا چاہیے کہ جس طرح عرب ملکوں میں جاکر ہم لوگ
وہاں کے نظام سے موافقت کر کے رہتے ہیں اسی طرح ہم کو یہاں بھی نظام سے موافقت کر کے رہنا
چاہیے۔ اس کے بعد ہم کو یہاں بھی اسی طرح آرام اور عافیت کی زندگی مل جائے گی جس طرح ہم کو عرب
ملکوں میں آرام اور عافیت کی زندگی ملی ہوئی ہے۔ یہ صرف قیمت کی ادائیگی کا مسئلہ ہے نہ کہ ایک
ملک اور دوسرے ملک میں فرق کا۔

ایک سفر

قرآن ہندی سوسائٹی آف انڈیا کی دعوت پر بھوپال کا سفر ہوا۔ ۲۸ نومبر ۱۹۸۷ کی شام کو دہلی سے بھوپال پہنچا، اور ۲۹ نومبر کی شام کو وہاں سے واپسی ہوئی۔

۲۸ نومبر کو جب میں انڈین ایرلائنز کی فلائٹ نمبر ۴۱۹ میں داخل ہوا تو اچانک مجھے خیال آیا کہ ہندستان کے موجودہ وزیر اعظم مسٹر راجیو گاندھی سیاست میں آنے سے پہلے انڈین ایرلائنز کے ایک پائلٹ تھے۔ وہ عام طور پر دہلی اور بھوپال کے درمیان جہاز چلاتے تھے۔ ان کو ابھی اس قابل نہیں سمجھا گیا تھا کہ انڈین ایر لائنز کی زیادہ لمبی پرواز ان کے حوالے کی جائے یا وہ ایرانڈیا کی انٹرنیشنل پروازوں کی کمانڈ کریں۔ مگر جمہوری سیاست کے قانون نے پورے ملک کا "جہاز" ان کے ہاتھ میں دے دیا ——— جمہوری نظام کا یہ معاملہ بھی کیسا عجیب ہے۔

جہاز میں ایک صاحب داخل ہوئے۔ ان کو رخصت کرنے کے لیے پولیس کے کئی آدمی آئے ہوئے تھے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کوئی بڑے سرکاری افسر ہیں۔ اتفاق سے ان کی سیٹ میرے پاس تھی۔ وہ میری نشست سے ملی ہوئی نشست پر بیٹھ گیے۔ جلد ہی بعد انھوں نے اپنا بیگ کھولا اور اس میں سے ایک موٹی کتاب نکال کر پڑھنے لگے۔ میں نے ایک نظر ڈالی تو کتاب کا نام یہ تھا :

The Secret Wars of the CIA

(سی آئی اے کی خفیہ جنگیں) میں نے سوچا کہ لوگ سی آئی اے کے خفیہ عمل کو جاننے کے شائق ہوتے ہیں مگر فرشتوں کے خفیہ عمل کو جاننے کا کسی کو شوق نہیں۔ سی آئی اے کے خفیہ عمل کو جا[ننا] آدمی کو صرف ایک تفریحی معلومات دیتا ہے۔ لیکن اگر آدمی اس عمل کو جان لے جو فرشتے خفیہ طو[ر] پر ہر ایک کے چاروں طرف کر رہے ہیں تو وہ تڑپ اٹھے اور اس کی ساری زندگی کچھ سے کچھ ہو جائے۔

ایک گھنٹے کی پرواز کے بعد ہمارا جہاز بھوپال کی فضا میں پہنچا اور نیچے اترنا شروع ہ[وا]۔ اب رات ہو چکی تھی۔ میں نے کھڑکی سے نیچے کی طرف دیکھا تو چاروں طرف بجلی کے قمقمے بے ش[مار]

تعداد میں جگ مگ کر رہے تھے۔ بالکل وہی منظر تھا جو رات کے وقت کھلے آسمان میں ستاروں کی جگمگاہٹ سے پیدا ہوتا ہے۔ تھوڑی دیر کے لیے ایسا معلوم ہوا گویا ہمارا جہاز تاروں بھرے آسمان میں اتر رہا ہو۔

ایک لمحہ کے لیے یہ واقعہ میرے لیے زندگی کے وسیع تر سفر کی تمثیل بن گیا۔ ہم میں سے ہر شخص دنیا سے آخرت کی طرف سفر کر رہا ہے۔ ہر ایک کا "جہاز" تیزی سے رواں ہے تاکہ وہ بالآخر "آسمان" میں اتر جائے۔ مگر لوگ صرف پہلے سفر کو جانتے ہیں۔ دوسرے سفر کو جاننے والا کوئی نظر نہیں آتا۔

ایر انڈیا کے انفلائٹ میگزین نمسکار (جون ۱۹۸۷) میں ایک مضمون حسب ذیل عنوان کے ساتھ شامل ہے:

Bhopal: Old and New

سات صفحہ کے اس مضمون میں مسلم بھوپال کے بارہ میں دلچسپ معلومات ہیں۔ اس کا صفحہ ۴۵ سب سے زیادہ سبق آموز ہے۔ اس صفحہ پر شہر بھوپال کا ایریل فوٹو دیا گیا ہے۔ اس تصویر میں بھوپال کی تاج المساجد اس طرح نمایاں طور پر ابھری ہوئی نظر آتی ہے جیسے کہ چھوٹے چھوٹے پیڑوں کے باغ میں یوکلپٹس کے دو اونچے درخت کھڑے ہوئے ہوں۔

بھوپال ایرپورٹ پر اترا تو وہاں دوسرے صاحبان کے علاوہ حضرت قبلہ پیر سعید میاں مجددی مدظلہ العالی بھی موجود تھے۔ یہ دیکھ کر بہت شرمندگی ہوئی۔ کیوں کہ وہ میرے لیے اور تمام لوگوں کے لیے بزرگ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ واپسی کے وقت بھی وہ از راہِ عنایت ایرپورٹ پر دوبارہ تشریف لائے۔ ان کی بزرگانہ حیثیت کی بنا پر میں زیادہ اصرار بھی نہیں کر سکتا تھا۔ بھوپال میں میرا قیام بھی حضرت قبلہ مدظلہ العالی کی خانقاہ مجددیہ ہی پر رہا۔ دوران قیام کے تجربات اور فیوض کا کچھ تذکرہ اگلے صفحات میں درج ہے۔

ایک مرتبہ میں نے ایک صاحب کا "سفرنامہ بھوپال" پڑھا۔ انھوں نے لکھا تھا: "شہر میں داخل ہوتے ہی پہلی نظر دو بلند میناروں پر پڑتی ہے جو اس شہر کی عظمت اور وقار کے اکلوتے گواہ ہیں۔ انھیں دیکھ کر ذہن میں اسلامی بھوپال کی تاریخ رقص کرنے لگتی ہے۔"

یہ ایک حقیقت ہے کہ تاج المساجد کے دو مینارے شہر کے سب سے بلند عمارتی نمونے

ہیں۔ اپنی بلندی کے اعتبار سے وہ پورے شہر کی فضا پر چھائے ہوئے ہیں۔ مگر یہ مینارے بھوپال کے "اسلامی دور" میں نہیں بنے۔ وہ آزادی کے بعد اس کے سیکولر دور میں، یا زیادہ سخت الفاظ میں، اس کے "ہندو دور" میں بنائے گیے ہیں۔ اس لحاظ سے ان بلند میناروں کا اصل پہلو یہ نہیں ہے کہ وہ یہ یاد دلاتے ہیں کہ بھوپال کیا تھا، بلکہ وہ یہ بتاتے ہیں کہ بھوپال کیا ہے۔ یہ مینارے ماضی کی یادگار کے طور پر نہیں کھڑے ہوئے ہیں بلکہ وہ مسلمانوں کو علامتی طور پر بتاتے ہیں کہ آج بھی اس ملک میں ان کے لیے یہ موقع کھلا ہوا ہے کہ وہ اپنی عظمت کا مینار بے روک ٹوک تعمیر کر سکیں۔ وہ حال کے امکان کو بتاتے ہیں نہ کہ صرف گزرے ہوئے ماضی کو۔

ایک صاحب جو شاعر ہیں، انھوں نے بھوپال پر گفتگو کرتے ہوئے کہا: شہر بھوپال کو یہ اعزاز میسر ہے کہ اس نے اپنے سینہ پر قیامت سے پہلے ایک قیامت جھیلی ہے۔ ایک زہریلی قیامت جو ایک ہی رات میں ہزاروں بے گناہوں کی دردناک موت کا سبب بنی اور لاکھوں لوگوں کو زہر آلود کر گئی۔ قدیم روایتوں اور تہذیب کے اس شہر نے جدید سائنسی دور کے اس تحفہ کو کمال تحمل سے اپنے سینہ پر جھیلا اور کسی سے شکوہ تک نہیں کیا!

مذکورہ صاحب کی مراد گیس کے اس حادثہ سے تھی جو بھوپال میں ۳ دسمبر ۱۹۸۴ کو پیش آیا تھا۔ میں نے کہا کہ آپ نے صحیح فرمایا۔ مگر اس کلام میں "اعزاز" اور "جھیلا" جیسے الفاظ میرے ذوق کے مطابق نہیں۔ اگر میں اس کو کہوں تو میں یوں کہنا پسند کروں گا کہ: اس شہر کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس نے قیامت سے پہلے ایک قیامت کا تجربہ کیا۔

۲۸ نومبر کی شام کو ٹیگور ہال میں عمومی جلسہ تھا۔ علماء اور رہنماؤں کی بڑی تعداد جمع تھی وسیع ہال پوری طرح بھرا ہوا تھا۔ مختلف لوگوں نے اپنے اپنے انداز میں تقریریں کی۔ تاہم سب کی تقریروں کا موضوع قرآن اور اس کی تعلیمات تھا۔ مسٹر روی پرکاش ماتھر (سابق وائس چانسلر بھوپال یونیورسٹی) بھی اسٹیج پر موجود تھے۔ مگر میں ان کی تقریر سن نہ سکا۔

میری تقریر کا عنوان قرآن کا عالمی پیغام تھا۔ میں نے قرآن اور سنت کی روشنی میں تفصیل کے ساتھ اظہار خیال کیا۔ پورا ہال مکمل طور پر بھرا ہوا تھا۔ عوام اور خواص سب نے اس سے غیر معمولی اتفاق کا اظہار کیا۔ جناب پریم نارائن گپتا ایڈوکیٹ نے اس کو "آسمانی آواز

قرار دیتے ہوئے اپنی زبان میں کہا: آکاشس وانی سے شبد بلیک بورڈ پر لکھے جارہے تھے اور ہم ان کو پڑھ رہے تھے۔

دوسرے دن ۲۹ نومبر کی شام کو مجھے واپس آنا تھا۔ منتظمین کی فرمائش پر دوبارہ میں نے دس منٹ کی ایک مختصر تقریر کی۔

ریاست کے ایک ہندو منسٹر (شیو بھانو سولنکی) نے اپنی تقریر میں کہا کہ اسلام میں بہت سی خوبیاں ہیں جن کا مجھ کو ذاتی تجربہ ہوا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اسلام سے خود میرے گھر کو ایک فائدہ ہوا۔ میرے ایک لڑکے نے انڈسٹری لگانا چاہا۔ میرے پاس جتنی رقم تھی وہ میں نے ان کو دے دی۔ مگر یہ رقم کم تھی۔ مزید سرمایہ فراہم کرنے کے لیے میں نے اپنے ایک مسلمان دوست سے کہا۔ وہ اس کے لیے تیار ہوگئے۔ انھوں نے کہا کہ ہمارے مذہب میں سود لینا حرام ہے۔ اس لیے میں رقم تو دوں گا، مگر سود نہیں لوں گا۔ چنانچہ انھوں نے ہم کو بلا سودی قرض دے دیا۔ اگر میرا لڑکا بینک سے قرض لیتا تو اس کو کافی سود دینا پڑتا، مگر مسلمان کے ذریعہ اس کو سود کے بغیر قرض مل گیا۔ اس طرح خود میرے گھر نے اسلام کے ایک فائدہ کا تجربہ کیا۔

اسی طرح انھوں نے کہا کہ میں مسلمانوں کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھتا ہوں تو مجھ کو یہ بہت اچھی چیز معلوم ہوتی ہے۔ یہ بہترین یوگا ہے۔ اس سے آدمی کی عبادت بھی ہوتی ہے اور اس کا آسن بھی پورا ہو جاتا ہے۔ نماز سے وہ بھی ملتا ہے جو روح کو ملنا چاہیے اور وہ بھی ملتا ہے جو سریر کو ملنا چاہیے۔

مذکورہ ہندو منسٹر کی تقریر سن کر میں نے سوچا کہ اس ملک میں اگر صرف اتنا کیا جائے کہ ہندو مسلمان زیادہ سے زیادہ ایک دوسرے سے قریب ہوں تو سارا مسئلہ اپنے آپ حل ہو جائے۔ وہ کتنے نادان لیڈر تھے جنھوں نے ہندو مسلم مسئلہ کا حل دوری اور علحدگی میں سوچا۔ حالانکہ وہ قربت اور تعلق میں زیادہ بہتر طور پر موجود تھا۔

دہلی کے کرنل نرائن صاحب نے ایک مرتبہ گفتگو میں یہ بات کہی تھی کہ ضرورت ہے کہ ایک تنظیم "فرینڈز آف اسلام سوسائٹی" کے نام سے بنائی جائے۔ ہندستان کے اکثریتی فرقہ میں بے شمار ایسے لوگ ہیں جو بظاہر اگرچہ الگ مذہب رکھتے ہیں مگر انھیں اسلام سے گہری

دل چسپی ہے۔ ایسے تمام لوگ اس میں جڑ جائیں گے۔ اور اس طرح ایک بہت مفید اور دور رس کام کا آغاز ہوسکے گا۔

مذکورہ منسٹر صاحب کی تقریر سن کر مجھے خیال آیا کہ اس قسم کی تنظیم وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ " قرآن ہندی سوسائٹی آف انڈیا " میں ایک طرف اگر مولانا واجد الحسینی اور جناب فاروق ارگلی جیسے لوگ شریک ہیں تو اسی کے ساتھ اس میں شری رام سہائے یاتری جیسے لوگ بھی خلوص دل کے ساتھ شامل ہیں۔ یہ سوسائٹی اگر " فرینڈز آف اسلام سوسائٹی " والے خواب کی تعبیر بن سکے تو یقیناً یہ ملک و قوم کی بہت بڑی خدمت ہوگی۔

اس اجتماع میں ملک کے مختلف حصوں سے علماء اور دانشور آئے تھے۔ سب نے راقم الحروف کے نقطہ نظر سے اتفاق کیا۔ ایک مقرر (جناب جاوید حبیب صاحب) نے نہایت کھل کر الرسالہ کے نقطۂ نظر کی تائید کی۔

محمد یوسف بھوپالی ندوہ سے فارغ ہیں اور اب حال میں انھوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے امتیاز کے ساتھ ایم اے کا امتحان پاس کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ پہلے مجھے الرسالہ سے صرف جزئی دل چسپی تھی۔ مگر پچھلے دو سال سے میں نے الرسالہ کو اور آپ کی کتابوں کو غور سے ساتھ پڑھا۔ اب تو میں الرسالہ کا عاشق ہو گیا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں الرسالہ ہی کا ایک مشن ہے جو خالص قرآن وسنت کی بنیاد پر مسلمانوں کی رہنمائی کر رہا ہے۔

بھوپال کے ہندی اور اردو اخبارات نے ۲۸ نومبر کی تقریر کی نمایاں رپورٹ شائع کی۔ روزنامہ افکار (۲۹ نومبر ۱۹۸۷) کے صفحہ اول پر اس کی جو رپورٹ شائع ہوئی اس کا عنوان انھوں نے ان الفاظ میں قائم کیا تھا:

عہد جدید کی ترقیات کا سہرا حاملین قرآن کے سر ہے

اصل تقریر کی رپورٹ تو بڑی حد تک صحیح تھی، مگر اس کی مذکورہ سرخی تقریر کی اصل روح کے مطابق نہ تھی۔ اگر میں خود اس کی سرخی قائم کرتا تو اس کے الفاظ یقیناً دوسرے ہوتے۔ کیوں کہ اس سرخی میں قومی فخر کی نفسیات جھلک رہی ہے۔ جب کہ میں نے اپنی تقریر میں قرآنی تعلیمات کی عظمت کو بیان کیا تھا نہ کہ کسی قوم کے شاندار کارناموں کو۔

افکار کے ہندی اڈیشن میں نسبتاً زیادہ بہتر رپورٹنگ نظر آئی۔

خانقاہ مجددیہ میں بہت قدیم سے یہ روایت ہے کہ ہر اتوار کو ۱۲ بجے دن میں ایک مجلس ہوتی ہے۔ اس مجلس کو پہلے حضرت شاہ محمد یعقوب مجددی رحمۃ اللہ علیہ خطاب فرمایا کرتے تھے ب ان کے جانشین حضرت پیر سعید میاں صاحب قبلہ اس سے خطاب فرماتے ہیں۔ ۲۹ نومبر کو توار تھا۔ چنانچہ حسب معمول لوگ کافی تعداد میں جمع ہوگیے۔ حضرت پیر سعید میاں صاحب قبلہ کے حکم سے میں نے اس مجلس میں ایک تقریر کی۔ تقریر کا موضوع تعلق باللہ تھا۔ میں نے اپنی یک گھنٹہ کی تقریر میں شکر اور عبادت کی حقیقت بیان کی۔ اس کا اور دوسری تقریروں کا ٹیپ بھوپال کے بعض اصحاب کے پاس موجود ہے۔

۲۹ نومبر کو نماز ظہر کے بعد قدسیہ بیگم کی مسجد میں ایک نشست ہوئی۔ اس میں الرسالہ کے قارئین اور شہر کے باشعور مسلمان شریک ہوئے۔ اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے میں نے کہا کہ ـــــ اس ملک میں مسلمانوں کا المیہ، ایک لفظ میں یہ ہے کہ مسلمان پانے سے آغاز کرنا چاہتے ہیں، جب کہ اس دنیا میں زندگی کا راز یہ ہے کہ کھونے سے آغاز کیا جائے۔

کھیت سے فصل لینے کے لیے پہلے اپنے دانہ کو زمین میں دفن کرنا پڑتا ہے۔ دکان سے فائدہ حاصل کرنے کے لیے پہلے اپنے سرمایہ کو دکان میں لگا دینا پڑتا ہے۔ ایک رہائشی مکان کا لک بننے کے لیے پہلے یہ کرنا پڑتا ہے کہ اپنی اینٹوں کو بنیاد میں دفن کر دیا جائے۔ یہ اس نیا میں زندگی کا قانون ہے۔ مگر مسلمان اس قانون الٰہی کو الٹی طرف سے چلانا چاہتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ کھوئے بغیر پائیں اور دیئے بغیر حاصل کریں، تو مسلمانوں کو جاننا چاہیے کہ ایسا بھی ہونے والا نہیں۔ مسلمان اپنی اس الٹی جدوجہد میں آزادی کے بعد چالیس سال ضائع کر چکے ہیں۔ اگر وہ مزید چالیس ہزار سال تک اپنی یہ الٹی کوشش جاری رکھیں تب بھی انھیں کچھ ملنے والا نہیں۔ تقریر میں اس نقطۂ نظر کو حوالوں اور مثالوں سے واضح کیا گیا۔

بھوپال میں میرا قیام خانقاہِ مجددیہ میں تھا۔ حضرت مولانا پیر سعید میاں صاحب مجددی کے روحانی فیض اور بابرکت کلمات سے مستفید ہونے کا موقع ملا۔ حضرت مولانا نے حضرت شاہ محمد یعقوب صاحب مجددی کے بہت سے نہایت قیمتی ملفوظات سنائے۔ ایک ملفوظ یہ تھا:

"یہ طبی اصول ہے کہ جب مرض شدید ہو جاتا ہے تو علاج پہلے ہلکی دوا سے شروع کیا جاتا ہے کیوں کہ مرض کی شدت کا اثر دل، دماغ اور اعضائے رئیسہ پر بھی ہوتا ہے اس لیے اگر علاج میں تیز دوا دیدی جائے تو دل، دماغ اور دیگر اعضائے رئیسہ پر ناقابل برداشت اثر مرتب ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ لہذا علاج ہلکی دوا سے شروع کیا جاتا ہے پھر حسب ضرورت بتدریج دوا کو تیز کیا جاتا ہے۔ یہی طبی اصول ہے۔

اسی طرح اصلاح نفس میں بھی یہ اصول قائم رکھنا ضروری ہوتا ہے کہ اگر فساد نفس شدید ہو اور طغیانی کی حد تک پہونچ گیا ہو تو طریقۂ اصلاح نرم انداز میں شروع کرنا چاہیے۔ اس کا ثبوت قرآن مجید سے حاصل ہو رہا ہے ارشاد خداوندی ہے کہ: اِذْهَبَا اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى (طٰہٰ ۴۴) تم دونوں (موسیٰ و ہارون) فرعون کے پاس جاؤ بے شک وہ سرکشی پر پہونچ گیا ہے۔ پس اس سے نرم بات کہنا تاکہ وہ نصیحت قبول کرے یا اللہ سے ڈرے۔"

یہ اصلاح کی لازمی شرط ہے۔ مگر اس پر عمل کرنے کے لیے صبر و برداشت کی بے پناہ مقدار درکار ہے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں نے صبر کی متاع کھو دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ وقت کے "فراعنہ" کے مقابلہ میں اس اصول کو استعمال نہیں کر پاتے۔

حضرت مولانا نے حضرت شاہ رؤف احمد صاحب (۱۲۵۳ — ۱۲۰۱ھ) کی فارسی کتاب "ارکان اسلام" کا ایک صفحہ بتایا جو کہ حسب ذیل تھا:

بزرگے فرمودہ است کہ چہار ہزار اشتر کتاب خواندیم و از آنجملہ چہار سخن اختیار کردیم۔ یکے آنکہ اے نفس آنچہ ترا حق تعالیٰ منع کردہ است از آں باز آ و الاّ از ملک او بدر شو۔ دوم آنکہ اے نفس اگر طاعت او میکنی بکن و الاّ روزیٔ او مخور۔ سوم آنکہ اے نفس بر قسمت خویش راضی باش و الاّ خدائے دیگر طلب کن تا ترا بیشتر دہد۔ چہارم آنکہ اے نفس اگر قصد گناہ داری اول جائے بہم رساں کہ ترا حق تعالیٰ نہ بیند و الاّ مکن۔

ایک بزرگ نے فرمایا ہے کہ چار ہزار اونٹ کے بوجھ کے برابر میں نے کتابیں پڑھیں اور ان سے میں نے چار باتیں حاصل کیں۔ ایک یہ کہ اے انسان، اللہ نے تجھ کو جس چیز سے منع کر دیا ہے

اس کو نہ کر، ورنہ تو اس کے ملک سے باہر چلا جا۔ دوسرے یہ کہ اے انسان، اگر تو اللہ کی اطاعت کرتا ہے تو کر، ورنہ اس کا رزق نہ کھا۔ تیسرے یہ کہ اے انسان، اپنی قسمت پر راضی ہو جا، ورنہ اپنے لیے دوسرا خدا حاصل کر تاکہ وہ تجھ کو زیادہ دے۔ چوتھے یہ کہ اے انسان، اگر تو گناہ کرنا چاہتا ہے تو ایسی جگہ تلاش کر جہاں خدا تجھ کو نہ دیکھے ورنہ گناہ نہ کر۔

انسان اگر سنجیدگی کے ساتھ سوچے تو وہ خدا کی اطاعت کرنے پر مجبور ہے۔ اس کے سوا کوئی اور راستہ اس کے لیے ممکن ہی نہیں۔

جلسہ میں شرکت کے بعد میں اپنی قیام گاہ (خانقاہ مجددیہ) واپس آچکا تھا کہ اچانک ایک صاحب آئے۔ بظاہر وہ بالکل سیدھے سادے قسم کے معلوم ہوتے تھے۔ انھوں نے مجھے ایک بند کاغذ دیا اور اس کے بعد فوراً واپس چلے گئے۔ انھوں نے نہ مزید کچھ کہا اور نہ وہاں ٹھہرے۔ ان کے چلے جانے کے بعد میں نے کاغذ کو کھولا تو اس پر یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے، حضرت خواجہ معین الدین چشتی کی طرف سے سلام قبول ہو"

اوپر میں نے جو کچھ نقل کیا، اس سے زیادہ مجھے اس کے بارے میں اور کچھ نہیں معلوم ہے۔

ایک صاحب ملے۔ انھوں نے اپنا تعارف اس طرح کرایا کہ وہ الرسالہ کے مستقل قاری ہیں اس کے بعد انھوں نے عام طرز کی لمبی چوڑی باتیں شروع کر دیں اور دیر تک بولتے رہے۔ میں نے کہا: آپ الرسالہ کے قاری نہیں ہیں۔ آپ نے ابھی وہ چیزیں پڑھی ہیں جو آدمی کو بولنے والا بناتی ہیں۔ الرسالہ کا قاری تو وہ ہے جس پر چپ لگ جائے، جو الرسالہ پڑھنے کے بعد یہ محسوس کرے کہ اس کے پاس الفاظ کا ذخیرہ ختم ہو چکا ہے، اور اب اس کے پاس بولنے کے لیے کچھ نہیں۔

ایک مجلس میں اسلامی دعوت پر گفتگو تھی۔ میں نے کہا کہ اہم ترین بات یہ ہے کہ ہم یہ جانیں کہ ہمارا تعلق دوسری قوموں سے داعی اور مدعو کا تعلق ہے۔ نہ کہ حریف اور رقیب کا تعلق۔ ایک صاحب نے کہا کہ یہ کوئی خاص بات نہیں۔ آج کل تو سبھی لوگ دعوت اور داعی اور مدعو کی بات کرتے ہیں۔ میں نے کہا کہ دعوت کسی تقریری مظاہرہ کا نام نہیں۔ دعوت ایک سنجیدہ ترین عمل ہے۔ دعوت کی اصل بندوں کی خیر خواہی ہے ——— مدعو کو محبوب بنانا پڑتا ہے

اس کے بعد ہی دعوت کے عمل کا آغاز ہوتا ہے۔

یہاں جن صاحبان سے ملاقات ہوئی، ان میں سے ایک مسٹر راج تیواری ہیں۔ وہ پابندی سے الرسالہ انگریزی پڑھ رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ الرسالہ نے تو مجھ کو بدل کر رکھ دیا۔ انھوں نے کہا کہ مجھ کو آپ ایک آدمی نہ سمجھیے۔ میرے جیسے بے شمار لوگ ہیں جو کسی سچے پیغام کے منتظر ہیں۔ بس آپ سیٹی بجا دیجئے، اس کے بعد آپ دیکھیں گے کہ یہاں مسافروں سے لدی ہوئی ایک پوری گاڑی چل پڑی ہے۔

ایک مجلس میں میں نے کہا کہ کسی بات کو واقعی طور پر سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی پیشگی طور پر کچھ باتوں کو جانتا ہو۔ مثلاً اگر میں کہوں کہ "میں دہلی سے آیا ہوں" تو آپ کو پہلے سے اس کا علم ہونا چاہیے کہ "دہلی" کیا ہے۔ اگر آپ "دہلی" سے واقف نہ ہوں تو آپ میرے جملہ کو ٹھیک طور پر سمجھ نہیں سکتے۔

بھوپال کا سفر مختصر ہونے کے باوجود خدا کے فضل سے کافی مفید رہا اور اس کا کریڈٹ تمام تر ڈاکٹر حمید اللہ ندوی کو جاتا ہے۔ وہ دس برس سے پابندی کے ساتھ الرسالہ کو پھیلا رہے ہیں۔ اور انھوں نے تقریباً پورے بھوپال کے لوگوں کو الرسالہ کے مشن سے متعارف کرادیا ہے۔ چنانچہ میں بھوپال پہنچا تو وہاں وہ ذہنی پس منظر پوری طرح موجود تھا جو الرسالہ والی بات کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے۔ اس چیز نے بھوپال کے سفر کو توقع سے زیادہ کامیاب بنا دیا۔ فللہ الحمد۔

ایک صاحب نے اخبار ریڈینس (۲۹ نومبر ۱۹۸۷) پیش کیا اور کہا کہ دیکھئے خود مسلمان ہی اسلام کو مٹانے پر تلا ہوا ہے، پھر ہم غیروں سے کیا امید کر سکتے ہیں۔ اس اخبار کے ایک مضمون میں بتایا گیا تھا کہ جموں اور کشمیر کے مسلم وزیر اعلیٰ اسلام دشمن ہیں۔ اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ کشمیر میں اسلام پسند جماعت نے ایک سو سے زیادہ اسلامی اسکول قائم کر رکھے ہیں اور ڈاکٹر فاروق عبداللہ ان کو طاقت سے بند کر دینا چاہتے ہیں:

The Chief Minister has received his anti-Islamic legacy from his late father who struck a deadly blow to the Islamic education in 1975.

میں نے کہا کہ یہ ایک غیر حقیقت پسندانہ انداز فکر ہے۔ اور اسی غیر حقیقت پسندانہ انداز فکر

نے موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کو برباد کر رکھا ہے۔

عربی کا ایک مقولہ ہے: تُعْرَفُ الْاَشْیَاءُ بِاَضْدَادِهَا (چیزیں اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہیں) مذکورہ واقعہ میں بھی اس کا ایک ضد پایا جاتا ہے۔ آپ اس کے ضد کو ملا کر دیکھیے، اس کے بعد ہی آپ اس معاملہ میں صحیح رائے قائم کر سکتے ہیں۔ ایک طرف یہ واقعہ ہے کہ ڈاکٹر فاروق عبداللہ اسلام پسند جماعت کے اسلامی اسکولوں کو بند کرنے کی دھمکی دے رہے ہیں۔ دوسری طرف ہمارے سامنے یہ واقعہ آتا ہے کہ یہی ڈاکٹر فاروق عبداللہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ جاتے ہیں اور وہاں وہ یونیورسٹی کے لیے پانچ لاکھ روپیہ سالانہ کے عطیہ کا اعلان کرتے ہیں۔ تاکہ غریب مسلم طلبہ کو مدد دے کر انھیں تعلیم میں آگے بڑھایا جا سکے (اخبار نو ۵ نومبر ۱۹۸۷)

اب سوچنے کی بات ہے کہ ایک ہی شخص کیوں ایسا کرتا ہے کہ ایک طرف وہ کشمیر کی "اسلامی درسگاہ" کو کچلنا چاہتا ہے اور دوسری طرف وہی شخص علی گڑھ کی "اسلامی درسگاہ" کی ترقی کے لیے گراں قدر مستقل رقم پیش کر رہا ہے۔ اس کا راز یہ ہے کہ علی گڑھ کی اسلامی تعلیم گاہ اس کی سیاسی حریف نہیں۔ جب کہ کشمیر کی اسلامی تعلیم گاہ ریاست کے الیکشن ۱۹۷۵ اور اس کے بعد موجودہ الیکشن (مارچ ۱۹۸۷) میں اس کی سیاسی مخالفت کا اڈا بنی رہی۔

یہ عین وہی چیز ہے جس کی روایت سب سے پہلے اس ملک میں اس شخص نے قائم کی جس کو آپ سب لوگ "عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ" کہتے ہیں۔ اورنگ زیب عالم گیر نے کچھ عبادتخانوں کو جاگیریں دیں اور دوسرے عبادتخانے ایسے بھی ہیں جن کو اس نے ڈھا دیا۔ اس فرق کا سبب یہی تھا کہ جو عبادتخانہ صرف عبادتخانہ تھا۔ اس کے ساتھ اورنگ زیب عالمگیر نے تعاون کا معاملہ کیا۔ اور جو عبادتخانہ اس کی سیاسی مخالفت کا اڈہ بنا ہوا تھا اس کو اس نے منہدم کرا دیا۔

اس دنیا میں کوئی بھی شخص اپنے حریفوں کو نہیں بخشتا۔ خواہ وہ سیکولر قسم کے لیڈر ہوں یا مقدس اسلامی رہنما۔ جو لوگ اس دنیا میں کوئی واقعی کام کرنا چاہتے ہیں، ان پر لازم ہے کہ سب سے پہلے زندگی کی اس حقیقت کو جانیں، اس کے بعد وہ میدان عمل میں اپنا قدم رکھیں۔

جناب سلیم شمسی صاحب (پیدائش ۱۹۴۲) نے بتایا کہ جس زمانہ میں جن سنگھ کو ختم کرکے بھارتیہ جنتا پارٹی بنائی گئی تھی اٹل بہاری باجپئی مسلم موافق تقریریں کرنے لگے تھے۔ سلیم شمسی صاحب نے ان سے ایک

ملاقات کے دوران کہا کہ پہلے تو آپ مسلم مخالف تقریریں کرتے تھے۔ اب آپ کا لہجہ بدل گیا ہے۔ شاید آپ نے مسلمانوں کا ووٹ حاصل کرنے کے لیے ایسا کیا ہے۔ اٹل بہاری باجپئی نے اس کو سن کر کہا :

" میاں ، آدمی نہیں بولتا ، پلیٹ فارم بولتا ہے "

اٹل بہاری باجپئی کے اس جواب پر ایک تاثر یہ ہو سکتا ہے کہ یہ بے اصول سیاست یا زیادہ سخت لفظوں میں منافقت ہے۔ مگر میں نے اس کو سنا تو میرے دل نے کہا کہ ہم کو انسان کی اس کمزوری کو مانتے ہوئے یہ کرنا چاہیے کہ ایسا "پلیٹ فارم" وجود میں لائیں جہاں آدمی ہمارے موافق بولنے پر مجبور ہو جائے۔

اس بات کی ایک دلچسپ مثال اسی جلسہ میں شیعہ رہنما جناب پرنس انجم قدر صاحب نے پیش کی۔ انھوں نے کہا کہ ایک مرتبہ ہمارے شہر میں ایک مشہور سنی عالم آئے۔ ہم نے ان کو اپنے امام باڑہ میں بلا کر استقبالیہ دیا اور ان سے تقریر کرائی۔ وہ تقریر کے لیے کھڑے ہوئے تو انھوں نے اس حدیث کو اپنی تقریر کا موضوع بنایا : تَرَكْتُ فِيكُمُ الثَّقَلَيْنِ كِتَابَ اللهِ وَعِتْرَتِي۔ اور اہل بیت کی فضیلت پر شاندار تقریر کی۔ اس سنی عالم کے شہر والے شیعہ حضرات کو معلوم ہوا تو انھوں نے پرنس انجم قدر صاحب سے کہا کہ یہ سنی عالم ہمارے یہاں تو دوسرے قسم کی باتیں کرتے ہیں۔ پرنس انجم قدر نے جواب دیا : تم ان کے ساتھ جیسا کرتے ہو ویسا وہ تمہارے ساتھ کرتے ہیں، ہم نے ان کے ساتھ جیسا کیا ویسا انھوں نے ہمارے ساتھ کیا (واضح ہو کہ سنی علماء کے نزدیک زیادہ صحیح اور مستند روایت وہ ہے جس کے الفاظ یہ ہیں : تَرَكْتُ فِيكُمْ أَمْرَيْنِ لَنْ تَضِلُّوا مَا تَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا كِتَابَ اللهِ وَسُنَّةَ رَسُولِهِ)

سبق آموز

۳۱ اگست ۱۹۸۷ کی صبح کو تمام اخبارات یہ خبر لے کر آئے کہ ہرجندر سنگھ جندا اور ستنام سنگھ باوا کو دہلی میں گرفتار کر لیا گیا۔ جندا پنجاب کے انتہائی خطرناک دہشت پسندوں میں سے تھا۔ وہ خالصتان کمانڈو فورس میں "جنرل" کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس نے جنرل ویدیہ، للت ماکن ایم پی، ارجن داس کونسلر، کئی پولس افسر اور بیسیوں دوسرے افراد کو قتل کیا تھا۔ پنجاب نیشنل بنک لدھیانہ میں پانچ کرور روپیہ سے زیادہ کی ڈکیتی میں اسی کا ہاتھ تھا۔ وغیرہ۔ گرفتاری کے وقت اس کے پاس سے نہایت خطرناک ہتھیار، پانچ لاکھ روپے نقد، بہت سا سونا اور دوسری چیزیں برآمد ہوئیں۔ اس گرفتاری کے ذیل میں بہت سی تفصیلات اخباروں میں آئی ہیں۔ ان میں سے ایک جزء یہ تھا کہ:

> The police found in Jinda's pocket some powder which they suspect is cyanide. Jagdish Singh had swallowed cyanide when he was taken to the police post at Paharganj. If Jinda had died, it would have robbed the police of a chance to interrogate him and obtain vital information (p.3).

پولس نے نہایت صحیح وقت پر اس کو پکڑ لیا۔ کیوں کہ یہاں ایک اور خطرہ تھا۔ جندا خودکشی کر سکتا تھا جیسا کہ جگدیش سنگھ زیلا والا نے دو سال پہلے کیا تھا۔ پولیس کو جندا کی جیب میں کچھ سفوف ملا ہے جس کے متعلق ان کا خیال ہے کہ وہ سائنائڈ زہر ہے۔ جگدیش سنگھ نے اس وقت سائنائڈ کھا لیا تھا جب کہ وہ پہاڑ گنج کی پولیس چوکی کی طرف لے جایا جا رہا تھا۔ اگر جندا مر جاتا تو پولیس کے لیے یہ موقع ختم ہو جاتا کہ وہ اس سے سوالات کرے اور اہم معلومات حاصل کرے۔ (انڈین اکسپریس یکم ستمبر ۱۹۸۷)

دہشت پسند تنظیم کا کوئی شخص اگر زندہ حالت میں پولیس کے قبضہ میں چلا جائے تو پولیس اس پر ناقابل برداشت سختیاں کر کے اس سے تمام راز اگلوا سکتی ہے، اور پھر پوری تنظیم کا خاتمہ کر سکتی ہے۔ ایسی حالت میں دہشت پسند فوراً خودکشی کر لیتا ہے۔ وہ اپنا وجود مٹا دیتا ہے تاکہ اپنی تنظیم کے وجود کو بچا سکے۔

یہی قربانی جماعتوں کی زندگی کی ضمانت ہے، خواہ وہ تخریبی جماعت ہو یا تعمیری جماعت۔
موجودہ دنیا میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ فرد کے تقاضے اور جماعت کے تقاضے میں ٹکراؤ پیدا ہوجاتا ہے۔ ایسی حالت میں فرد کو چاہیے کہ وہ اپنے کو "ہلاک" کرلے تاکہ جماعت کو زندگی حاصل ہوسکے۔

تاہم جسمانی قتل اس قربانی کی سب سے چھوٹی صورت ہے۔ اس راہ کی زیادہ بڑی قربانی وہ ہے جس کو حیاتی قتل یا نفسیاتی ہلاکت کہا جاسکتا ہے۔ پہلا اگر جہادِ اصغر ہے تو دوسرا جہادِ اکبر۔

اجتماعی زندگی میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ فرد کو اپنی حق تلفی کا احساس ہوتا ہے۔ اس کی انا کو چوٹ لگتی ہے۔ ایسے واقعات پیش آتے ہیں جو اس کے اندر منفی جذبات کو جگا دیتے ہیں۔ وہ اتحاد کے بجائے اختلاف کی باتیں سوچنے لگتا ہے۔

ایسے تمام مواقع پر اس کو وہی کام کرنا ہے جو دہشت پسند تنظیم کا ایک ممبر کرتا ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ دہشت پسند تنظیم کا ممبر اپنے جسم کو قتل کرتا ہے، مگر تعمیری اجتماعیت کے رکن کو ایسے موقع پر اپنے احساس کو قتل کرنا ہے۔ اس کو اپنی منفی نفسیات کو پوٹاشیم سائنائڈ کی خوراک کھلانا ہے۔

جس اجتماعیت کو ایسے افراد مل جائیں، اس کو دنیا کی کوئی رکاوٹ کامیابی کی منزل تک پہنچنے سے روک نہیں سکتی۔

اجتماعیت کو زندگی دینے کے لیے انفرادی نفسیات کا یہ قتل ہر حال میں ضروری ہے۔ کہ پیغمبر کے زمانہ کی اجتماعیت بھی اس ناگزیر قربانی کے بغیر قائم نہیں ہوسکی۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں آپ کے مقدس ساتھیوں نے بار بار اس قسم کی نفسیاتی خودکشی کی قربانی دی۔ اس کے بعد ہی یہ ممکن ہوا کہ عرب میں وہ طاقت ور اجتماعی ہیئت ظہور میں آئی جو سارے عالم کی قسمت بدل دے، اور انسان کو ایک نئے تاریخی دور میں داخل کرے۔
فرد کی ہلاکت پر اجتماع کو زندگی ملتی ہے، اجتماع کی زندگی کا اس کے سوا کوئی اور راستہ نہیں۔

۱۔ حیدرآباد کی سالانہ نمائش کے موقع پر فروری ۱۹۸۸ میں الرسالہ اور اسلامی مرکز کا بک اسٹال لگایا گیا۔ اس کا اسٹال نمبر ۲۷۔۱۷۴ تھا۔ لوگوں نے بڑی تعداد میں الرسالہ کی خریداری قبول کی اور کتابیں حاصل کیں۔ یہ اسٹال اسلامی مرکز کے مشن کے مزید وسیع پیمانہ پر تعارف کا ذریعہ بنا۔ اس اسٹال کا اہتمام الرسالہ اکیڈمی حیدرآباد کی طرف سے کیا گیا تھا۔

۲۔ بھوپال میں ۲۶۔۲۹ دسمبر ۱۹۸۷ کو تبلیغی جماعت کا سالانہ اجتماع ہوا۔ اس موقع پر مقامی حلقہ کی طرف سے اسلامی مرکز کا اسٹال لگایا گیا جس میں تمام کتابیں رکھی گئیں۔ لوگوں نے بڑی تعداد میں آکر معلومات کیں اور کتابیں حاصل کیں۔ اس کے علاوہ متعدد دوسرے اسٹالوں پر بھی مرکز کی کتابیں موجود تھیں وہاں سے بھی لوگ کتابیں حاصل کرتے رہے۔ بیک وقت کئی مکتبوں پر مرکز کی کتابوں کا رکھا جانا اس کی عوامی طلب میں اضافہ کا ثبوت ہے۔

۳۔ محمد عابد شاہ صاحب نے "اخبار اردو" کے لیے صدر اسلامی مرکز کا مفصل انٹرویو لیا۔ انٹرویو میں اسلامی مرکز کے مشن کے علاوہ مسلمانوں کے مسائل زیر گفتگو آئے۔ یہ انٹرویو اخبار اردو کے شمارہ ۲۹ جنوری ۱۹۸۸ میں شائع ہوا ہے۔

۴۔ مسٹر آر بی ایل نگم دہلی کے ایک جرنلسٹ ہیں جو مختلف ہندی اور انگریزی اخبارات میں لکھتے رہتے ہیں۔ انھوں نے ۲۵ جنوری ۱۹۸۸ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ انٹرویو کا موضوع زیادہ تر ہندستانی مسلمانوں کے معاملات و مسائل تھے۔

۵۔ امراوتی یونیورسٹی (مہاراشٹر) نے بی اے فائنل (اردو) کے کورس کے لیے "انتخاب اردو" کے نام سے ایک کتابی سلسلہ شائع کیا ہے۔ اس کتاب کے تیسرے حصہ میں الرسالہ جنوری ۱۹۸۴ کے ایک مضمون کو مکمل طور پر شامل گیا ہے۔ یہ مضمون "ایٹمی ہلاکت" کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ واضح ہو کہ امراوتی یونیورسٹی کے تحت اس وقت چار اضلاع میں ۸۰ کالج چل رہے ہیں۔

۶۔ نئی دہلی میں آٹھویں عالمی کتابی نمائش ۵ فروری سے ۱۵ فروری ۱۹۸۸ تک ہوئی۔ اس

نمائش میں ہندستان کے علاوہ ۵۷ دوسرے ملکوں نے حصہ لیا اور مجموعی طور پر سات سو ناشرین اور کتب فروشوں نے اپنے اسٹال لگائے۔ اس موقع پر مکتبہ الرسالہ اور اسلامی مرکز کی مطبوعات کا بھی اسٹال لگایا گیا۔ لوگ کثیر تعداد میں آئے اور گہری دلچسپی کا اظہار کیا۔

۷۔ الرسالہ ریڈرس سرکل دہلی کی طرف سے ۳۰ جنوری ۱۹۸۸ کی شام کو غالب اکیڈمی (نئی دہلی) میں ایک اجتماع ہوا۔ اس کے صدر جناب سید حامد صاحب (سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) تھے۔ صدر اسلامی مرکز نے اس موقع پر ایک مفصل تقریر کی۔ تقریر کا موضوع تھا: ہندستانی مسلمانوں کے مسائل اور ان کا حل۔ پورا ہال نیچے سے اوپر تک بھرا ہوا تھا۔ شہر کا اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ کثیر تعداد میں شریک ہوا۔ اور مسٹر جاوید حبیب نے اناؤنسر کے فرائض انجام دیے۔

۸۔ مسلسل اطلاعات مل رہی ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ الرسالہ کا مشن اب خدا کے فضل سے عمومی تائید کے مرحلہ میں داخل ہو رہا ہے۔ جگہ جگہ لوگ فساد کو روکنے کے لیے الرسالہ میں بتائی جانے والی حکیمانہ تدبیر کو اختیار کر رہے ہیں۔ الرسالہ نومبر ۱۹۸۷ میں شائع شدہ مضمون "آزمودہ حل" کو بہت سے اخبارات و رسائل نے نقل کیا۔ مختلف لوگ الرسالہ کے حوالہ کے بغیر الرسالہ والی بات کو دہرا رہے ہیں۔ روزنامہ قومی آواز (۵ جنوری ۱۹۸۸) نے "ضرورت ہے نئی قیادت کی" کے زیر عنوان ایک مفصل مضمون نمایاں طور پر شائع کیا ہے جس میں الرسالہ کے نقطۂ نظر کی صد فی صد تائید کی گئی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

۹۔ الرسالہ کا مشن الحمد للہ خاموشی کے ساتھ صالح ذہن بنا رہا ہے۔ مثال کے طور پر یہاں ایک خط کا خلاصہ نقل کیا جاتا ہے۔ ایک نوجوان لکھتے ہیں: میں کالج کے میدان میں کچھ لڑکوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا کہ ایک ہم عمر بھائی نے مجھے بھری محفل میں بے عزت کر دیا۔ حالاں کہ میں نے کوئی ناشائستہ لفظ اپنی زبان سے نہیں نکالا تھا۔ مگر اچانک وہ اتنا ترش ہوا کہ میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ میں ایک لفظ نہیں بولا اور وہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔ اس واقعہ کے دو دن بعد وہ نوجوان دوبارہ مجھ سے ملا اور مجھ سے معافی مانگنے لگا کہ غلطی اسی کی تھی بظاہر یہ ایک معمولی واقعہ ہے۔ لیکن اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ میں نے صبر کے ذریعہ اس نوجوان

کے دل و دماغ پر فتح پائی۔ یہی وہ پیغام ہے جس کی تلقین آپ اپنی اعلیٰ تحریروں میں کرتے ہیں آپ کی کتابوں نے میرے ذہن کو حقیقت پسند بنا دیا۔ اور میری زندگی کا نیا دور شروع ہو گیا۔ اب میں کہوں کہ میں نے از سر نو زندگی کا آغاز کیا ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ (الطاف حسین شاہ کشمیر)

۱۰۔ ایک صاحب اپنے خط (۱۲ فروری ۱۹۸۸) میں لکھتے ہیں: الرسالہ کے ذریعہ آپ قوم کو جو پیغام دے رہے ہیں وہ بہت تعمیری اور مثبت ہے۔ الرسالہ کے مطالعہ نے میری زندگی میں ایک خوش گوار تبدیلی پیدا کی ہے۔ پہلے میں مسلمانوں کی حالت زار کے لیے اکثریتی فرقہ اور حکومت کو ذمہ دار ٹھہراتا تھا اور اس کے لیے فریق ثانی سے بدلہ لینا چاہتا تھا۔ جس سے ہر وقت میں انتہا پسندی اور جذباتیت کا شکار رہتا تھا۔ اب میں مسلمانوں کی موجودہ حالت زار کو خود مسلمانوں کی غفلت، کوتاہی اور ناعاقبت اندیشی کا نتیجہ مانتا ہوں جس سے مجھ میں جوش کی جگہ ہوش اور شکایت کی جگہ عمل کی صلاحیت پیدا ہو رہی ہے۔ (غفران الحق، نالندہ)

۱۱۔ ایک صاحب "تعبیر کی غلطی" کا مطالعہ کرنے بعد لکھتے ہیں: میں نے اسلام کی انقلابی تشریح کا جو تصور اپنے ذہن میں بنایا تھا، آج اس کتاب (تعبیر کی غلطی) کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ ۳۵ سالہ عمارت دھڑام سے گر پڑی۔ اب میں نئی عمارت بنانے کی کھوج میں از سر نو منہمک ہو گیا ہوں (ہاشم، بنگلور)

۱۲۔ ایک نئی کتاب چھپنے کے لیے پریس میں بھیجی گئی ہے۔ اس کا نام "میوات کا سفر" ہے۔ صدر اسلامی مرکز نے پچھلے ۲۰ برسوں میں میوات کے علاقہ کے بہت سے سفر کیے تھے۔ ان کے سفرنامے بھی پہلے شائع ہوئے تھے۔ اب ان تمام مضامین کو یکجا کر کے "میوات کا سفر" کے نام سے شائع کیا جا رہا ہے۔ پوری کتاب سبق اور نصیحت کی باتوں سے اور مختلف قسم کے تجربات سے بھری ہوئی ہے۔ میوات کا سفر ایک اعتبار سے پوری ملت اسلامیہ ہند کا مطالعہ ہے۔

۱۳۔ اسلامی مرکز ایک دینی اور تعمیری ادارہ ہے۔ اسلامی مرکز کے ساتھ تعاون کرنا دینی دعوت اور تعمیری مہم میں تعاون کرنا ہے۔ آپ کا ہر قسم کا تعاون شکریہ کے ساتھ قبول کیا جائے گا۔ اپنی رقوم بھیجتے ہوئے مد کی ضرور صراحت فرما دیں۔

AL-RISALA represents a mission, the aims and objectives of which are to proclaim a divine message. It is a voluntary effort, which belongs to everyone who is in accord with the message it proclaims. Such people are invited to join us in this divine cause. and assist in conveying the truth to those around them.

The best and simplest way of serving AL-RISALA cause is to take on an agency of it.

The best and simplest way of serving the AL-RISALA cause is to take on an agency of the magazine. The more people who do this, the wider the area over which the message will be disseminated.

An AL-RISALA agency will be alloted on the basis of at least five copies. Packing and forwarding charges will be borne by the office. Commission will be at the rate of 25%. If the number of copies exceeds one hundred, the rate of commission will be 33%. (Price per

Please note that small numbers of copies cannot be posted by VPP every month due to high postage rates. We would appreciate it if payments, in such cases, are made by money-order or draft in the name of AL-RISALA Monthly, either in advance or after the receipt of the magazine.

Where this is not possible, we can send the magazine by Book Post every month and recover the amount due on them by VPP once every few months, the interval being dependent upon the number of copies dispatched.

God has entrusted YOU with a message to be communicated to the rest of the world. Are you ready to fulfill that trust?

THE CIRCULATION DEPARTMENT
AL-RISALA MONTHLY
C-29, Nizamuddin West
New Delhi-110013, INDIA

جلد دوم تیار

تذکیر القرآن

جلد اول : سورۃ فاتحہ ۔ سورۃ بنی اسرائیل

جلد دوم : سورۃ الکہف ۔ سورۃ الناس

قرآن کی بے شمار تفسیریں ہر زبان میں لکھی گئی ہیں۔ مگر تذکیر القرآن اپنی نوعیت کی پہلی تفسیر ہے۔ تذکیر القرآن میں قرآن کے اساسی مضمون اور اس کے بنیادی مقصد کو مرکز توجہ بنایا گیا ہے۔ جزئی مسائل اور معلوماتی تفصیلات کو چھوڑتے ہوئے اس میں قرآن کے اصل پیغام کو کھولا گیا ہے اور عصری اسلوب میں اس کے دعوتی اور تذکیری پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے۔ تذکیر القرآن عوام و خواص دونوں کے لیے یکساں طور پر مفید ہے۔ وہ طالبینِ قرآن کے لیے فہم قرآن کی کنجی ہے۔

ہدیہ جلد اول ۱۰۰ روپیہ

جلد دوم ۱۰۰ روپیہ

مکتبہ الرسالہ، نئی دہلی

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحیدالدین خاں کے قلم سے

	Rs
تذکیرالقرآن جلد اول	100/-
" " جلد دوم	100/-
اللہ اکبر	40/-
پیغمبر انقلاب	30/-
مذہب اور جدید چیلنج	30/-
عظمتِ قرآن	25/-
الاسلام	25/-
ظہورِ اسلام	25/-
اسلامی زندگی	20/-
احیاءِ اسلام	20/-
رازِ حیات (مجلد)	45/-
صراطِ مستقیم	25/-
خاتونِ اسلام	30/-
سوشلزم اور اسلام	25/-
اسلام اور عصر حاضر	20/-
حقیقتِ حج	25/-
اسلامی تعلیمات	20/-
تبلیغی تحریک	15/-
تعبیر کی غلطی	35/-
دین کی سیاسی تعبیر	10/-

دین کیا ہے	3/-
قرآن کا مطلوب انسان	6/-
تجدیدِ دین	4/-
اسلام دینِ فطرت	4/-
تعمیرِ ملت	4/-
تاریخ کا سبق	4/-
مذہب اور سائنس	4/-
عقلیاتِ اسلام	4/-
فسادات کا مسئلہ	3/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	3/-
تعارفِ اسلام	4/-
اسلام پندرھویں صدی میں	4/-
راہیں بند نہیں	4/-
ایمانی طاقت	4/-
اتحادِ ملت	4/-
سبق آموز واقعات	4/-
زلزلۂ قیامت	4/-
حقیقت کی تلاش	4/-
پیغمبرِ اسلام	4/-
آخری سفر	4/-

اسلامی دعوت	4/-
خدا اور انسان	4/-
حل یہاں ہے	6/-
سچا راستہ	2/-
دینی تعلیم	4/-
حیاتِ طیبہ	4/-
باغِ جنت	4/-
نارِ جہنم	4/-

God Arises	Rs. 45/-
Muhammad The Prophet of Revolution	50/-
Religion and Science	35/-
Tabligh Movement	20/-
The Way to Find God	4/-
The Teachings of Islam	5/-
The Good Life	5/-
The Garden of Paradise	5/-
The Fire of Hell	5/-
Muhammad The Ideal Character	4/-
Man Know Thyself!	4/-
इंसान अपने आपको पहचान	2/-
सच्चाई की तलाश	4/-

مکتبہ الرسالہ

الرسالہ

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

ISSN 0970-180X

ہر شام کے بعد دوبارہ نئی صبح آتی ہے
مگر صبح کو پانے والا صرف وہ شخص ہے
جو صبح کے آنے تک اس کا انتظار کرے

مئی ۱۹۸۸
شمارہ ۱۳۸

God Arises

By Maulana Wahiduddin Khan

This is the translation with some additions of *Mazhab Aur Jadeed Challenge*, translated into Arabic as *Al-Islam Yatahaddah,* which became a best-seller throughout the Arab world. It has also been translated into a number of other languages including Turkish, Malay, Serbo-Croatian (Yugoslavian), Sindhi, etc., and has come to be accepted as a standard work on the Islamic position vis-à-vis modern thought.

"... *in the fourteen hundred years of Islamic history, innumerable books on Islam have appeared. There are just a few books calling mankind to God which are clearly distinguishable from the rest because of the clarity and force with which they make their appeal. Without doubt, this book is one of that kind*".

— *Daily AL-AHRAM (Cairo)*

Pages 265 ISBN 81-85063-14-1 (Pbk) 81-85063-17-6 (Hbd) Price Rs 45

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اردو، انگریزی میں شائع ہونے والا

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

شمارہ ۱۳۸ مئی ۱۹۸۸

ماہنامہ الرسالہ ، سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳ ، فون: 611128 ،697333

۴۰ منٹ کی آزادی

ٹائمس آف انڈیا (سکشن ۲ صفحہ ۸) کے شمارہ ۱۶ فروری ۱۹۸۸ میں ایک خبر چھپی ہے۔ اس کا عنوان ہے ــــــ ۴۰ منٹ کی آزادی ختم ہوتی ہے:

40 minutes of freedom ends

اس خبر کا خلاصہ یہ ہے کہ مغربی جرمنی میں جیل کے اصلاحی قوانین کے تحت اس طریقہ کا تجربہ کیا جا رہا ہے کہ ہفتہ میں ایک دن جیل کے بعض قیدیوں کو چھٹی دی جائے اور انھیں یہ موقع دیا جائے کہ وہ جیل کی بند فضا سے نکل کر باہر کی آزاد فضا میں گھوم سکیں۔

۱۴ فروری ۱۹۸۸ کا واقعہ ہے۔ مغربی جرمنی کے شہر لنگن (Lingen) میں دو قیدی اس نئے نظام کے تحت وقتی طور پر رہا کر دیے گئے تاکہ وہ جیل سے باہر جا کر "چھٹی" منا سکیں۔ مگر جلد ہی ان کی آزادی ختم ہو گئی۔ وجہ یہ تھی کہ وہ جیل سے نکلتے ہی ایک ہوٹل میں گھس گئے جو جیل خانہ سے صرف ۲۰۰ میٹر کے فاصلہ پر واقع تھا۔ وہاں انھوں نے گڑبڑ شروع کر دی۔ ہوٹل کے آدمی نے فوراً پولیس کو ٹیلی فون کیا۔ پولیس کی گاڑی آئی اور دونوں مجرمین کو پکڑ کر واپس لے گئی۔ آزادی کے صرف چالیس منٹ بعد دونوں دوبارہ جیل کی سلاخوں کے پیچھے بند تھے:

Two convicts allowed out of prison on weekend leave found themselves back behind bars after just 40 minutes of freedom.

"۴۰ منٹ آزادی" کا یہ معاملہ جو جرمنی کے دو آدمیوں کے ساتھ پیش آیا، یہی تمام انسانوں کا معاملہ ہے۔ ہر شخص جو اس دنیا میں چل پھر رہا ہے، وہ صرف ۴۰ منٹ کے لیے چل پھر رہا ہے۔ ہر ایک کو صرف ایک محدود مدت تک کے لیے موقع دیا گیا ہے، اس کے بعد اسے پکڑ لیا جائے گا۔ جرمنی کے مذکورہ دو آدمیوں کو جرمنی کی پولیس نے پکڑا۔ اسی طرح تمام انسانوں کے اوپر خدا کی پولیس لگی ہوئی ہے اور اس بات کی منتظر ہے کہ کب "۴۰ منٹ" کی مدت پوری ہو اور وہ لوگوں کو عین حالت جرم میں پکڑ لے۔

آدمی اگر اس حقیقت کو جان لے تو اس کی پوری زندگی بدل جائے۔

جدوجہد کی تربیت

رمضان کے مہینہ کو حدیث میں صبر کا مہینہ (شہر الصبر) کہا گیا ہے۔ صبر و استقامت بلاشبہ زندگی کی سب سے بڑی طاقت ہے۔ یہی تمام فتوحات اور کامیابیوں کا راز ہے۔ حقیقی روزہ صبر کی صفت پیدا کرتا ہے اور صبر ہی وہ چیز ہے جو تمام اعلیٰ کامیابیوں کا دروازہ ہے۔

روزہ کے لیے عربی لفظ صوم ہے۔ صوم کے اصل معنی ہیں رکنا۔ صائم کے معنی ہیں رکنے والا۔ قدیم زمانہ میں مشکل اوقات میں گھوڑا انسان کا سب سے بڑا ساتھی تھا۔ جنگ اور سخت قسم کے سفر میں وہ انسان کے کام آتا تھا۔ اس مقصد کے لیے تربیت دینے کا ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ گھوڑے کو محدود مدت کے لیے بھوکا پیاسا رکھا جائے تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ سختی کو برداشت کرسکے۔ اس طرح کے تربیت یافتہ گھوڑے کو خیل صائم (روزہ دار گھوڑا) کہتے تھے۔ نابغہ نے میدان جنگ کی تصویر کشی میں گھوڑوں کے بارہ میں کہا ہے کہ کچھ گھوڑے روزہ والے تھے اور کچھ گھوڑے بغیر روزہ والے :

خیلٌ صیام وخیلٌ غیرُ صائمۃ

اس طرح انسان صائم سے مراد وہ انسان ہے جو کھانے پینے اور ازدواجی تعلقات سے وقتی طور پر رک جائے۔ یہ رکنا اور پرہیز کرنا آدمی کے اندر برداشت کی صلاحیت پیدا کرتا ہے، وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ جب سختیاں پیش آئیں تو وہ ان کے مقابلہ میں پوری طرح جم سکے۔

رمضان کا مہینہ آدمی کے لیے اپنے نفس اور اپنی خواہشات سے لڑنے کا مہینہ ہے۔ یہ وہ مہینہ ہے جب کہ مومن شیطانی طاقتوں کو زیر کرکے ان کے اوپر قابو پاتا ہے اور دوبارہ خدا کی بندگی کا عزم لے کر نئے سال میں داخل ہوتا ہے۔

تاریخ حیرت انگیز طور پر روزہ کی اس خصوصیت کی تصدیق کرتی ہے۔ چنانچہ روحانی مقابلہ کا یہ مہینہ اسلام کی تاریخ میں فوجی مقابلہ کا مہینہ بھی رہا ہے۔ اسلام اور غیر اسلام کے کئی بڑے بڑے معرکے اسی مہینہ میں پیش آئے۔ مثال کے طور پر ان میں سے چند معرکوں کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے :

۱۔ غزوۂ بدر (رمضان ۲ ھ)
جب کہ رسول اور اصحاب رسول کو قریش کے اوپر فیصلہ کن فتح حاصل ہوئی۔
۲۔ فتح مکہ (رمضان ۸ ھ) جس نے پورے عرب پر اسلام کو غالب کر دیا۔
۳۔ غزوۂ تبوک (رمضان ۹ ھ) جس نے رومیوں کے اوپر اہل اسلام کی دھاک قائم کر دی۔
غزوۂ تبوک رجب میں شروع ہو کر رمضان میں ختم ہوا۔
۴۔ فلسطین (رمضان ۱۵ ھ) عمرو بن العاص نے فلسطین کو فتح کر کے بیت المقدس کو
اسلام کے حدود سلطنت میں شامل کیا۔
۵۔ معرکہ اسپین (رمضان ۹۱ھ) جب کہ طارق بن زیاد نے اسپین میں کامیاب پیش قدمی کی۔
۶۔ سندھ (رمضان ۹۶ھ) محمد بن قاسم سندھ میں داخل ہوئے اور وہاں اسلام کو پھیلایا۔
۷۔ دولت اندلس (رمضان ۱۳۸ھ) عبد الرحمٰن الداخل اندلس میں داخل ہوئے اور
وہاں باقاعدہ دولت امویہ قائم کی۔
۸۔ صقلیہ (رمضان ۲۱۲ھ) زیاد بن الاغلب نے جزیرہ صقلیہ کو فتح کیا۔
۹۔ حروب صلیبیہ (رمضان ۵۸۴ھ) حطین کی مشہور جنگ میں صلاح الدین ایوبی نے
صلیبی طاقتوں پر فتح حاصل کی۔
۱۰۔ معرکہ عین جالوت (رمضان ۶۵۸ھ) جس نے تاتاریوں کو شکست دے کر مسلم دنیا میں
ان کی پیش قدمی کو روک دیا۔
۱۱۔ معرکۂ سوئز (رمضان ۱۳۹۳ھ) جب کہ مصری فوجوں نے اسرائیلی فوجوں کو شکست
دے کر نہر سوئز پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔
اس قسم کے تاریخی واقعات بتاتے ہیں کہ روزہ اور جدوجہد حیات میں کوئی تضاد نہیں۔ روزہ کی مشقت آدمی کو کمزور نہیں کرتی۔ بلکہ وہ اس کو اس قابل بناتی ہے کہ زندگی کے معرکہ میں وہ زیادہ قوت اور طاقت کے ساتھ حصہ لے سکے۔

واحد راستہ

سفرنامہ (الرسالہ مارچ ۱۹۸۸) میں ایک جاپانی انجینیر شوگو کٹا کورا (Shogo Katakura) کا ذکر آیا ہے جن سے میری ملاقات مالدیپ میں ہوئی تھی۔ انھوں نے میرے ایک سوال کے جواب میں کہا کہ جاپان کے جغرافی حالات نے جاپانیوں کے اندر یہ ذہن پیدا کیا ہے کہ وہ ہمیشہ نئے خیالات (New ideas) کی تلاش میں رہیں۔ وہاں باربار موسم بدلتے ہیں، زلزلے اور طوفان سے باربار نئے حالات پیدا ہوتے ہیں۔ اس لیے جاپانیوں کو باربار یہ سوچنا پڑتا ہے کہ بدلے ہوئے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے وہ کیا کریں۔

اس صورت حال نے نئے خیالات کی تلاش کو جاپانیوں کا مستقل مزاج بنا دیا ہے۔ یہی مزاج ہے جو دوسری جنگِ عظیم کی بربادی کے بعد جاپانیوں کے کام آیا۔ انھوں نے جنگ کے بعد بدلے ہوئے حالات کی روشنی میں اپنے معاملہ پر ازسرِنو غور کیا۔ اور نئے حالات کے مطابق نیا منصوبہ بنا کر دوبارہ زیادہ بڑی کامیابی حاصل کی۔ جاپانیوں کی اسی خصوصیت کو ایک امریکی مصنف نے ان لفظوں میں ادا کیا ہے کہ وہ تبدیلی کے آقا بن گئے، بجائے اس کے کہ وہ اس کا شکار ہو جائیں:

They became the masters of change
rather than the victims.

زندگی کا سفر کبھی ہموار راستہ پر طے نہیں ہوتا۔ زندگی حادثات اور مشکلات سے بھری ہوئی ہے۔ یہ حادثے اور مشکلیں افراد کو بھی پیش آتے ہیں اور قوموں کو بھی۔ یہ خود خالق کا قائم کیا ہوا نظام ہے، اس سے بچنا کسی بھی طرح ممکن نہیں۔

ایسی حالت میں انسان کے لیے کامیابی کا راستہ صرف ایک ہے۔ وہ مشکلات کے باوجود اپنے سفر کو جاری رکھے۔ وہ راستہ کے کانٹوں اور پتھروں کے باوجود منزل تک پہونچنے کا حوصلہ کر سکے۔

حالات کی تبدیلی کے بعد حالات کے خلاف شکایت نہ کیجئے بلکہ نئے حالات کے مطابق اس کا نیا حل سوچئے، اور آپ ہمیشہ کامیاب رہیں گے۔

Ticket to Success

No matter what their route, young Asian Americans, largely those with Chinese, Korean and Indochinese backgrounds, are setting the educational pace for the rest of America and cutting a dazzling figure at the country's finest schools.

Trying to explain why so many Asian-American students are superachievers, Harvard Psychology Professor Jerome Kagan comes up with this simple answer: "To put it plainly, they work harder." Even with the problems (o. restriction and discrimination), many Asian-American students are making the U.S. education system work better for them than it has for any other immigrant group since the arrival of East European jews began in the 1880s. Like the Asians, the Jews viewed education as the ticket to success. Both groups "feel an obligation to excel intellectually," says New York University Mathematician Sylvain Cappell, who as a Jewish immigrant feels a kinship with his Asian-American students. The two groups share a powerful belief in the value of hard work and a zealous regard for the role of the family. Such achievements are reflected in the nation's best universities, where math, science and engineering departments have taken on a decidedly Asian character. At the University of Washington, 20% of all engineering students are of Asian descent, at Berkeley the figure is 40%. To win these places Asian-American students make the SAT seem as easy as taking a driving test. The average math score of Asian-American high school seniors in 1985 was 518 (of a possible 800), 43 points higher than the general average.

A telling measure of parental attention is homework. A 1984 study of San Francisco-area schools by Stanford Sociologist Sanford Dornbusch found that Asian-American students put in an average of eleven hours a week, compared with seven hours by other students. Some Asian Americans may be pushing their children too hard. Says a Chinese-American high schooler in New York City: "When you get an 80, they say, 'Why not an 85?' If you get an 85, it's 'Why not a 90?' "Years ago," complains Virginia Kee, a high school teacher in New York's Chinatown, "they used to think you were Fu Manchu or Charlie Chan. Then they thought you must own a laundry or restaurant. Now they think all we know howto do is sit in front of a computer." The image of Asian Americans is as relentless book-worms. "If you are weak in math or science and find yourself assigned to a class with a majority of Asian kids, the only thing to do is transfer to a different section," says a white Yale sophomore.

The performance of Asian Americans also triggers resentment and tension, "Anti-Asian activity in the form of violence, vandalism, harassment and intimidation continues to occur across the nation," the U.S. Civil Rights Commission declared last year. Young immigrant Asians complain that they are constantly threatened. To some Asian Americans being only "very good" is tantamount to failure. "It seems to me that having people like this renews our own striving for excellence," observes Emmy Werner, professor of human development at the University of California at Davis. "We shouldn't be threatened but challenged." Mathematician Cappell is thrilled by the new inheritors. "Their presence," he says, "is going to be a great blessing for society."

نمونہ کی اقلیت

ایشیائی ملکوں کے جو لوگ امریکہ میں ہیں ان کو ایشیائی امریکی (Asian Americans) کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ ۱۹۶۵ سے آکر یہاں آباد ہونا شروع ہوئے۔ وہ زیادہ تر چین، کوریا، انڈوچائنا وغیرہ ملکوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ لوگ جب یہاں آئے تو ان کا حال یہ تھا کہ ان میں سے بہت سے لوگ انگریزی میں معمولی گفت گو بھی نہیں کر سکتے تھے۔ آج وہ ریڈرس ڈائجسٹ کی رپورٹ کے مطابق، امریکہ کے بہترین انگلش اسکولوں میں اعلیٰ ترین طالب علم (Superstudents) کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ ان کی تعداد اگرچہ مجموعی آبادی میں صرف ۲ فی صد ہے۔ مگر مختلف امریکی اداروں میں انھوں نے ۲۰ فی صد تک جگہ لینے میں کامیابی حاصل کر لی ہے۔ وہ ہر جگہ زیادہ لائق (Overqualified) ثابت ہو رہے ہیں۔

اس صورت حال نے امریکی دماغوں کو سوچنے پر مجبور کر دیا۔ چنانچہ اس پر باقاعدہ ریسرچ کی گئی۔ اس ریسرچ کی رپورٹ مختلف امریکی اور غیر امریکی جرائد میں شائع ہوئی ہے۔ چند حوالے یہ ہیں :

1. *New York Times,* New York, August 3, 1986
2. Why Asian Americans are doing so well
   Time Magazine, New York, August 31, 1987
3. Why Asian American students excel
   Reader's Digest, August 1987
4. Why Asians succeed in America
   Span monthly, December 1987
5. Among the top 6 science students of the United States
   The Hindustan Times, New Delhi, August 30, 1987.

عام امریکی نوجوانوں کے مقابلہ میں ایشیائی امریکی تعلیم کے ہر شعبہ میں آگے کیوں ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی کوشش کی مقدار امریکی نوجوانوں سے بڑھی ہوئی ہے۔ ہارورڈ یونیورسٹی میں نفسیات کے پروفیسر جیروم کاگن سے پوچھا گیا کہ کیا سبب ہے کہ ایشیائی امریکی طلبہ اصل امریکی طلبہ کے مقابلہ میں زیادہ کامیاب ہیں۔ ٹائم کی رپورٹ کے مطابق، انھوں نے کہا کہ اس کا سادہ سا جواب یہ ہے کہ وہ زیادہ محنت کرتے ہیں :

To put it plainly, they work harder.

یہ لوگ تعلیم کو اپنے لیے کامیابی کا ٹکٹ (Ticket to success) سمجھتے ہیں۔ اور واقعی امریکہ کا تعلیمی نظام ان کے لیے کامیابی کا یقینی ٹکٹ ثابت ہوا ہے۔ اس ٹکٹ کو حاصل کرنے کے لیے انھوں نے جو قیمت ادا کی ہے وہ ایک لفظ میں امتیاز (Excellence) ہے۔

اپنے اس عمل سے انھوں نے امریکہ میں نمونہ کی اقلیت (Model minority) کا درجہ حاصل کر لیا ہے۔ تاہم امریکہ میں ان کے لیے راستہ بالکل کھلا ہوا نہیں تھا۔ ان کو نسلی امتیاز اور حقارت آمیز سلوک کا سامنا کرنا پڑا۔ امریکی نوجوان ان کا مذاق اڑاتے اور ان کو زرد خطرہ (Yellow peril) کہتے۔ حتی کہ جسمانی طور پر مارنے پیٹنے کے واقعات بھی ہوتے رہے۔ مگر ایشیائی امریکنوں نے اس کے مقابلہ میں کسی بھی قسم کا ردعمل ظاہر نہیں کیا۔ وہ شکایت اور احتجاج کے طریقہ سے مکمل پرہیز کرتے رہے۔ اس کے جواب میں انھوں نے جو کچھ کیا وہ صرف یہ تھا کہ انھوں نے اپنی محنت کی مقدار بڑھا دی۔ ان کے والدین نے ان کے جذبات کو جوابی اشتعال سے بچایا اور اس کو جوابی محنت کے رخ پر ڈال دیا۔ ایشیائی خاندانوں میں تعلیم ایک قسم کا کابوس (Obsession) بن کر چھا گئی۔ ایشیائی امریکیوں کے گھروں کی فضا یہ ہو گئی کہ اگر ان کا لڑکا ۸۰ فی صد نمبر لائے تو وہ کہیں گے کہ ۸۵ فی صد کیوں نہیں۔ اور اگر لڑکا ۸۵ فی صد نمبر لائے تو اس کا باپ کہے گا کہ تم ۹۰ فی صد بھی تو لا سکتے تھے۔

کسی گروہ کو مسائل کا سامنا ہو تو اس کے لیے اپنے مسئلہ کو حل کرنے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک وہ جس کا نمونہ ہم کو ہندستان میں نظر آتا ہے۔ یعنی مطالبہ اور احتجاج۔ اس طریق کار پر چلنے میں بیک وقت دو نقصانات ہیں۔ ایک یہ کہ اصل مسئلہ حل ہونے کے بجائے اور پیچیدہ ہو جاتا ہے۔ اس دنیا میں ہر چیز عمل کے ذریعہ ملتی ہے نہ کہ مطالبہ کے ذریعہ۔ اور جو چیز عمل کے ذریعہ ملتی ہو اس کو مطالبہ کے ذریعہ حاصل کرنے کی کوشش کرنا اس کو دور سے دور تر کر دینا ہے۔ دوسری بات یہ کہ ایسا گروہ دوسروں کی نظر میں بے عزت ہو جاتا ہے۔ مطالبہ اور احتجاج کا مطلب اپنے مسائل کا بوجھ دوسروں کے اوپر ڈالنا ہے، اور کون ہے جو اپنے مسائل کا بوجھ دوسروں کے اوپر ڈالنے کے بعد دوسروں کی نظر میں حقیر اور بے عزت نہ ہو جائے۔

اس کے برعکس مثال امریکہ کے ایشیائی امریکی گروہ کی ہے۔ انھوں نے اپنے مسئلہ کا حل یہ دریافت کیا کہ وہ اس کی ساری ذمہ داری خود قبول کریں۔ وہ اشتعال کے باوجود مشتعل نہ ہوں۔ اور آخری حد تک پر امن رہتے ہوئے دوسروں سے زیادہ محنت کریں۔ ان کا تجربہ بتاتا ہے کہ اس طرح عمل کرنے کے نتیجہ میں ان کا مسئلہ مکمل طور پر حل ہو گیا، بلکہ انھوں نے اپنے عددی تناسب سے زیادہ بڑا حصہ اپنے لیے پا لیا۔

منفی رویہ اختیار کرنا گویا اپنے مسئلہ کا بوجھ دوسرے کے سر پر ڈالنا ہے، اور مثبت رویہ کا مطلب اپنے مسئلہ کی ذمہ داری خود قبول کرنا۔ اس لیے مثبت رویہ اختیار کرنے کا مزید فائدہ یہ ہوتا ہے کہ ایسے لوگ سماج میں کوئی پیچیدگی پیدا کرنے کا سبب نہیں بنتے۔ چنانچہ ایشیائی امریکیوں نے جب مثبت انداز سے اپنے مسئلہ کو حل کرنے کی راہ نکالی تو وہ امریکی سماج میں مزید فائدوں کو ظہور میں لانے کا ذریعہ بن گئے۔

اول یہ کہ انھوں نے امریکی نوجوانوں کے درمیان مقابلہ و مسابقت کی فضا پیدا کی۔ وہ امریکی نوجوان جو اپنے کو محفوظ سمجھ کر محنت میں کمی کرنے لگے تھے، ان کے اندر یہ جذبہ ابھر آیا کہ اگر انھیں زندہ رہنا ہے اور ترقی کرنا ہے تو ان کو بھی ایشیائیوں کی طرح زیادہ محنت کرنی پڑے گی۔

ٹائم کی رپورٹ کے مطابق، خود امریکی دانشوروں کو اعتراف کرنا پڑا کہ ایشیائی امریکیوں نے ہمارے نوجوانوں کی سستی کو ختم کر کے ان کو ازسر نو چست بنا دیا ہے۔ ہمارے سماج میں ان کی موجودگی ہمارے لیے ایک عظیم رحمت ہے:

Their presence is going to be a great
blessing for society (p. 53).

اسپان (دسمبر ۱۹۸۷) کی رپورٹ کے مطابق، نیویارک کے ایک درمیانی عمر کے آدمی نے کہا کہ ایشیائی امریکیوں کے لیے خدا کا شکریہ، وہ ہمارے اسکولوں میں دوبارہ معیار کو واپس لا رہے ہیں:

Thank God for the Asians. They're bringing back
standards to our schools (p. 32).

۲۔ ایشیائی امریکی گروہ کو دوسرا فائدہ یہ ملا کہ جب انھوں نے معاشی عزت حاصل کی تو ان کی تہذیب بھی لوگوں کی نظر میں باعزت بن گئی۔ ان کی قومی روایات امریکیوں کی نظر میں محترم بن گئیں۔ یہ ایشیائی امریکی لوگ کنفیوشسش کو اپنا مذہبی پیشوا مانتے ہیں۔ جب ایشیائی امریکیوں کی ایک قابل تعریف خصوصیت امریکہ والوں کے سامنے آئی تو انھوں نے ان کی اس خصوصیت کو ان کے قومی بزرگ (کنفیوشسش) سے جوڑ دیا۔ ایشیائی امریکیوں کے ممتاز عمل نے امریکیوں کی نظر میں ان کے مذہب اور ان کی تہذیب کو قابلِ توجہ بنا دیا۔ اسپان کی رپورٹ کے مطابق، نیویارک یونیورسٹی کے پریسیڈنٹ نے کہا کہ جب میں اپنے ایشیائی طلبہ کو دیکھتا ہوں تو مجھے یقین ہوتا ہے کہ ان کی کامیابی زیادہ تر کنفیوشسش کی تعلیمات کا نتیجہ ہے:

When I look at our Asian-American students, I am certain that much of their success is due to Confucianism (p. 32).

ایشیائی مہاجرین کا مقابلہ جہاں عام امریکیوں سے پیش آتا ہے، وہ ان کے مقابلہ میں زیادہ لائق (Overqualified) ثابت ہوتے ہیں۔ اس طرح وہ عام امریکیوں کے لیے ایک مہمیز یا چیلنج بن گئے ہیں۔ وہ امریکی نوجوانوں میں محنت کا نیا جذبہ ابھارنے کا ذریعہ ثابت ہو رہے ہیں۔ ایشیائی مہاجرین نے مثبت طور پر اپنا ذاتی مسئلہ حل کیا تھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ امریکی سماج کا اپنا مسئلہ بھی حل ہو گیا۔

ایشیائی مہاجرین نے امریکہ میں صرف ایک نسل کے اندر وہ کامیابی حاصل کی ہے جس کو عام طور پر لوگ تین نسلوں میں حاصل کرتے ہیں۔ ان کی اس غیر معمولی کامیابی نے امریکہ میں ایک نئی اصطلاح پیدا کی ہے جس کو ایشیائی اخلاقیاتِ عمل (Asian work ethics) کہا جاتا ہے۔ اب وہاں کہا جانے لگا ہے کہ اگر اعلیٰ ترقی حاصل کرنا ہے تو ایشیائی اخلاقیاتِ عمل کو اختیار کرو۔

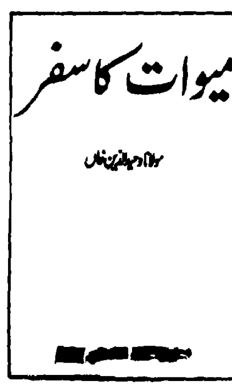
یہی دروازہ ہندستانی مسلمانوں کے لیے بھی زیادہ بڑے پیمانے پر کھلا ہوا ہے۔ مسلمان اگر ان قومی جھگڑوں کو چھوڑ دیں جن میں ان کے سطحی لیڈروں نے انھیں بے فائدہ طور پر الجھا رکھا ہے، اور وہ اسلام کے دیے ہوئے ابدی اصولوں پر اپنی زندگی کی مثبت تعمیر شروع کر دیں تو

اس ملک میں وہ ایک نئے انقلاب کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔ اس طرح مسلمان نہ صرف اپنا مسئلہ حل کریں گے بلکہ وہ اس ملک کو ایک نیا معیار دیں گے جس کو ایک لفظ میں (Muslim work ethics) (مسلم اخلاقیات عمل) کہا جا سکتا ہے۔ اور جب ایسا ہوگا تو مسلمان اس ملک میں سرمایہ (Asset) بن جائیں گے جو کہ اس وقت ملک کے لیے صرف ایک بوجھ (Liability) بنے ہوئے ہیں۔

ہندستان کے مسلمان ابھی تک تہذیبی تشخص (Cultural identity) حاصل کرنے کے لئے مطالباتی تحریکیں چلانے میں مشغول رہے ہیں۔ میرے نزدیک اس قسم کی تمام کوششیں سراسر بے فائدہ ہیں۔ کیوں کہ تہذیبی تشخص اپنی داخلی قوت سے قائم ہوتا ہے، وہ مطالبہ کرکے حاصل نہیں کیا جاتا۔

زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ مسلمان اخلاقی تشخص کو اپنا نشانہ بنائیں۔ وہ اسلامی اخلاق اختیار کرنے کو اپنا نشان امتیاز قرار دیں۔ مسلمان اگر اخلاقی حیثیت سے اپنا تشخص قائم کر سکیں تو وہ تہذیبی حیثیت سے بھی اپنے آپ اپنا تشخص پالیں گے جس کے لئے وہ بے فائدہ طور پر مطالباتی مہم چلانے میں مشغول ہیں۔

میوات کا سفر



میوات کے تاریخی علاقہ پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ مگر میوات کا سفر اپنی نوعیت کی منفرد کتاب ہے۔ وہ سادہ معنوں میں صرف ایک علاقہ کا تذکرہ نہیں، وہ ۲۰ سالہ مشاہدہ کا ایک تحریری ریکارڈ ہے۔ براہ راست طور پر اگرچہ وہ علاقہ میوات کی ایک تصویر ہے۔ مگر بالواسطہ طور پر وہ پوری ملت اسلامیہ سے تعلق رکھتی ہے۔ وہ سفرنامہ کی زبان میں ملت کے حال کا جائزہ اور اس کے مستقبل کی تعمیر کا نقشہ ہے۔

صفحات ۲۱۸ ہدیہ ۲۵ روپیہ

فکری طاقت

قرآن میں آئندہ آنے والے زمانہ کے بارہ میں جو خبریں دی گئی ہیں ان میں سے ایک پیشگی خبر وہ ہے جو سورہ نمبر ۴۱ میں ان الفاظ میں آئی ہے :

سنریہم آیاتنا فی الآفاق وفی انفسہم حتی یتبین لہم انہ الحق ۔ اولم یکف بربك انہ علی کل شیٔ شہید ۔ (حم السجدة ۵۳)

عنقریب ہم ان کو اپنی نشانیاں دکھائیں گے، آفاق میں اور انفس میں، یہاں تک کہ ان پر کھل جائے کہ یہ حق ہے ۔ کیا یہ تیرے رب کے لیے کافی نہیں کہ وہ ہر چیز پر گواہ ہے ۔

اس آیت کے مطابق، نزول قرآن کے بعد وہ زمانہ آنے والا ہے جب کہ فطرت کی نشانیوں کا ظہور ہی تبیینِ حق کے لیے کافی ہو جائے ۔ جب کہ کائنات اور انسان کے بارہ میں علمی انکشافات ہی ان حقائق کو ثابت شدہ بنا دیں جن کی خبر قرآن اور صاحب قرآن (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ذریعہ اہل عالم کو دی گئی ہے ۔

یہی بات حدیث میں ایک اور انداز سے آئی ہے ۔ یہاں ہم اس سلسلہ میں صحیح مسلم کی ایک روایت نقل کرتے ہیں :

عن ابی ہریرۃؓ، ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: "ہل سمعتم بمدینۃ، جانب منہا فی البر، وجانب منہا فی البحر" قالوا: نعم یارسول اللہ! قال: "لاتقوم الساعۃ حتی یغزوہا سبعون الفاً من بنی اسحاق، فاذا جاؤوہا نزلوا، فلم یقاتلوا بسلاح ولم یرموا بسہم، قالوا: لا الٰہ الا اللّٰہ واللہ اکبر، فیسقط احد جانبیہا۔ قال ثور بن زید الراوی: لا اعلمہ الا قال: "الذی فی البحر، ثم یقولون الثانیۃ: لاالٰہ الّا اللّٰہ، واللہ اکبر، فیسقط جانبہا الآخر، ثم یقولون الثالثۃ: لاالٰہ الا اللّٰہ، واللہ اکبر، فیفرج لہم فیدخلوہا فیغنموا، فبیناہم یقتسمون المغانم اذجاءہم الصریخ، فقال: ان الدجال قد خرج، فیترکون کل شیٔ ویرجعون" رواہ مسلم۔

حضرت ابوہریرہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ کیا تم نے ایک شہر کے بارہ میں سنا ہے

جس کا ایک رُخ خشکی کی طرف ہے اور اس کا دوسرا رخ سمندر کی طرف ہے۔ لوگوں نے کہا کہ ہاں اے خدا کے رسول۔ آپ نے فرمایا کہ قیامت اس وقت تک نہ آئے گی جب تک بنو اسحاق کے ستر ہزار افراد اس سے جنگ نہ کریں۔ جب وہ لوگ اس شہر تک آئیں گے تو وہ وہاں اتریں گے۔ وہ کسی ہتھیار سے نہ لڑیں گے اور نہ کوئی تیر ماریں گے۔ وہ کہیں گے کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور اللہ سب سے بڑا ہے۔ پس اس کے دو رخوں میں سے ایک رُخ گر جائے گا۔ ثور بن زید (راوی حدیث) نے کہا کہ میں اس کے سوا نہیں جانتا کہ آپ نے فرمایا کہ وہ جو سمندر کی جانب ہے۔ پھر وہ لوگ دوبارہ کہیں گے کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور اللہ سب سے بڑا ہے، پس اس کا دوسرا رُخ گر جائے گا۔ پھر وہ لوگ تیسری بار کہیں گے کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور اللہ سب سے بڑا ہے، پس وہ ان کے لیے کھل جائے گا وہ اس میں داخل ہو جائیں گے اور غنیمت حاصل کریں گے۔ پس جب وہ غنیمت تقسیم کر رہے ہوں گے، اسی اثنار میں پکار سنائی دے گی۔ کہنے والا کہے گا کہ دجال نکل آیا۔ پس وہ ہر چیز چھوڑ دیں گے اور لوٹ آئیں گے۔

اس روایت کی ذیلی تفصیلات سے ہٹ کر اس کے اصل مدعا کو دیکھئے تو اس کا خلاصہ یہ ہے کہ آئندہ ایسا زمانہ آئے گا جب لاالٰہ الا اللہ، اللہ اکبر کہدینے سے فتح حاصل ہو گی۔ بالفاظ دیگر، ہتھیار کو استعمال کرنے کی ضرورت نہ ہو گی۔ بلکہ اسلام کی فکری اور نظریاتی طاقت ہی قوموں کو مسخر کرنے کے لیے کافی ہو جائے گی۔

مذکورہ حدیث میں آخری زمانہ کے ایک واقعہ کا ذکر ہے جس کے لیے حدیث میں "غزوہ" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ مگر اس کے بعد جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس غزوہ کی تشریح فرمائی تو کہا کہ وہ نہ کسی ہتھیار سے لڑیں گے اور نہ کوئی تیر چلائیں گے۔ وہ صرف لاالٰہ الا اللہ کہیں گے اور ان کے لیے فتح کے دروازے کھلتے چلے جائیں گے۔

اس سے معلوم ہوا کہ "غزوہ" کا مطلب لازمی طور پر جنگ و قتال نہیں ہے۔ فکری اور نظریاتی مہم بھی اسلام کے نزدیک غزوہ ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشینگوئی کے مطابق، دور آخر میں غزوہ کی یہی قسم مسلمانوں کے لیے غلبہ اور کامیابی کا سب سے بڑا ذریعہ ہو گی۔

ردعمل

سعید نورسی (۱۹۶۰ - ۱۸۷۳ء) ترکی کے ایک عالم اور مجاہد تھے۔ وہ بے حد ذہین اور قابل آدمی تھے۔ ترک حکومت کے خلاف ان کے پرجوش بیانات کی وجہ سے حکومت ان کی مخالف ہوگئی۔ وہ گرفتار کر لیے گیے۔ وہ فوجی عدالت کے سامنے پیش کیے گیے۔ وہاں انھوں نے بیان دیتے ہوئے کہا:

لوان لی الف روح لما ترددت ان اجعلها فداء لحقیقة واحدة من حقائق الاسلام۔

اگر میرے پاس ایک ہزار روح ہوتی تب بھی میں اس سے نہ ہچکچاتا کہ ان سب کو اسلام کی حقیقتوں میں سے کسی ایک حقیقت کے لیے قربان کردوں۔

(دعوة الحق، رباط، نومبر ۱۹۸۵، صفحہ ۸۰)

سعید نورسی تعلیم اور مطالعہ میں مشغول تھے کہ ایک واقعہ گزرا جس نے ان کی زندگی کو مجاہدانہ زندگی بنادیا:

وفی هذه الاثناء قرأ بدیع الزمان فی الجرائد المحلیة ان وزیر المستعمرات البریطانی غلادستون صرح فی مجلس العموم البریطانی وهو یخاطب النواب و بیده نسخة من القرآن الکریم قائلاً: مادام هذا القرآن بید المسلمین فلن نستطیع ان نحکمهم۔ لذالك فلامناص لنا من أن نزیله من الوجود او نقطع صلة المسلمین به۔

(صفحہ ۷۸)

(۱۸۹۴ کے دوران) بدیع الزماں سعید النورسی نے بعض مقامی اخبارات میں پڑھا کہ برطانیہ کے وزیر نو آبادیات گلیڈسٹون نے برطانی دارالعوام میں تقریر کی۔ ان کے ہاتھ میں قرآن تھا اور انھوں نے نمائندگان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ جب تک یہ قرآن مسلمانوں کے ہاتھ میں رہے گا ہم ان کے اوپر اپنا حکم نہیں چلاسکتے۔ اس بنا پر ہمارے لیے اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ یا تو اس کتاب کا وجود مٹا دیں یا مسلمانوں کا رشتہ اس سے کاٹ دیں۔

سعید نورسی کے اندر یہ تڑپ نہیں اٹھی کہ وہ "گلیڈ اسٹون" کو گمراہی سے نکالیں اور

اس کو جنت کا راستہ دکھانے کی کوشش کریں۔ البتہ اس نے سعید نورسی کی مقدس کتاب کی توہین کر دی تو وہ بھڑک اٹھے۔ یہی موجودہ زمانہ میں تمام مسلم شخصیتوں کا حال رہا ہے۔ مثبت مقصد کے لیے وہ نہ اٹھ سکے۔ البتہ ردعمل کے جذبہ کے تحت وہ کبھی ایک کے خلاف جھنڈا لے کر کھڑے ہو گئے اور کبھی دوسرے کے خلاف۔

اسلام مثبت حقیقتوں کا دین ہے۔ وہ ردعمل کے تحت بھڑک اٹھنے کا نام نہیں۔ مومن وہ ہے جو خدا کی عظمتوں کو دریافت کرے اور اس میں جینے والا بن جائے۔ وہ کائنات میں خدا کی نشانیوں کو پڑھے اور اس کے ذہن میں ربانی علوم کا چشمہ پھوٹ نکلے۔ وہ غیب کے پردہ کو پھاڑ کر جنّت اور جہنّم کو دیکھ لے اور پھر شدید ترین طور پر اس بات کا حریص بن جائے کہ خدا اس کو جہنّم کی آگ سے بچائے اور اس کو جنّت کے باغوں میں داخل کرے۔

اسی معرفت کا نام ایمان واسلام ہے۔ اور یہ ایمان و اسلام اپنی آخری انتہا پر پہونچ کر دعوت بن جاتا ہے۔

سعید نورسی نے پرجوش طور پر کہا تھا کہ اسلام کی باتوں میں سے کسی ایک بات کا مسئلہ بھی ہو تو وہ اس کے لیے اپنا پورا وجود صرف کرنے کے لیے تیار ہیں۔ بظاہر ان کے یہ الفاظ تمام اسلام کو سمیٹے ہوئے ہیں۔ لیکن گہرائی کے ساتھ دیکھئے تو اس کا تعلق صرف جزئی اسلام سے ہے نہ کہ کلی اسلام سے۔

ایک غیر مسلم شخص کا قرآن کے خلاف گستاخی کرنا اسلام کے مسائل میں سے ایک مسئلہ ہے اسی طرح اسلام کا ایک اور مسئلہ یہ ہے کہ اس غیر مسلم کو اور اس کے جیسے دوسرے غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت پہونچائی جائے۔ سعید نورسی اور ان کے جیسے دوسرے لوگ اول الذکر اسلامی مسئلہ کے لیے تو بہت تڑپے۔ مگر ثانی الذکر اسلامی مسئلہ کے لیے ان میں سے کسی کے اندر تڑپ پیدا نہیں ہوئی۔ یہی موجودہ زمانہ کے تمام مسلم مجاہدین کا معاملہ ہے۔ وہ دوسروں سے نفرت کرنے کے مجاہد بنے، مگر وہ دوسروں سے محبت کرنے کے مجاہد نہ بن سکے۔ لوگوں کو جہنّم میں داخل کرنے کے لیے انھوں نے بہت سرگرمی دکھائی، مگر وہ اس کے لیے سرگرم نہ ہو سکے کہ لوگوں کو خدا کی رحمتوں کے سایہ میں پہونچائیں۔

اختلافِ امّت

حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہود ۷۱ فرقوں میں بٹ گیے۔ اور نصاریٰ ۷۲ فرقوں میں بٹ گیے۔ اور میری امت ۷۳ فرقوں میں بٹ جائے گی (افترقت الیھود علی احدی وسبعین فرقۃ وافترقت النصاریٰ علی اثنتین وسبعین فرقۃ۔ و ستفترق امتی علیٰ ثلاث وسبعین فرقۃ)

علماء سنت نے اس حدیث کی صحت پر کلام کیا ہے۔ تاہم، جیسا کہ المقبلی نے اپنی کتاب العلم الشامخ میں لکھا ہے، اس بارے میں کثیر روایتیں حدیث کی کتابوں میں آئی ہیں جو ایک دوسرے کو مضبوط کرتی ہیں، اس لیے اس کے اصل مفہوم میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا (حدیث افتراق الامۃ الی ثلاث وسبعین فرقۃ روایاتہ کثیرۃ یشد بعضھا بعضاً بحیث لا تبقی ریبۃ فی حاصل معناہ)

اکثر لوگوں نے ۷۳ کی تعداد کو حسابی گنتی کے معنی میں لیا ہے، چنانچہ انھوں نے مسلم فرقوں کی فہرست بنانے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً ابن حزم شہرستانی نے اپنی کتاب الملل والنحل میں ان کی تعداد ۷۶ بتائی ہے۔ الاشعری نے مقالات الاسلامیین میں ان کی تعداد ایک سو سے زیادہ تک شمار کی ہے۔ الخوارزمی کے نزدیک ان فرقوں کی تعداد ۷۲ ہے (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ڈکتور محمد عمارۃ کی کتاب الخلافۃ ونشأۃ الاحزاب الاسلامیۃ) مگر حقیقت یہ ہے کہ حدیث میں ۷۳ کا لفظ تعداد کی کثرت بتانے کے لیے آیا ہے نہ کہ تعداد کی حد بتانے کے لیے۔ اس لیے ہمیں تعداد کا شمار کرنے کے بجائے اختلاف کی اصل حقیقت پر غور کرنا چاہیے۔

صحابہ کی رائے

ان مسألۃ الخلاف بین المسلمین ارقت امیر المومنین عمر بن الخطاب فی لحظۃ تامل وتفکر، فظل یسأل نفسہ: کیف تختلف ھذہ الامۃ ونبیھا واحد؟ ثم اعاد طرح السوال علی عبد اللہ بن عباس، فیما تشیر الروایۃ، وقال لہ: کیف تختلف ھذہ الامۃ ونبیھا واحد، وقبلتھا واحدۃ، وکتابھا واحد

ره ابن عباس ... : يا امير المومنين انما انزل علينا القران فقرأناه وعلمنا فيما انزل،
وانه سيكون بعدنا اقوام يقرأون القران ولا يدرون فيما نزل، فيكون لكل قوم رأى.
فاذا كان لكل قوم فيه راي لاختلفوا فاذا اختلفوا اقتتلوا ۔ تقول الرواية ان سيدنا
عمر زجر ابن عباس و نهره سيدنا علی ؛ فانصرف ابن عباس ونظر عمر فيما قال
فعرفه .... فارسل اليه وقال : اعد علی ما قلته فاعاد عليه فعرف عمر قوله
واعجبه (د.. يوسف القرضاوی ۔ الصحوة الاسلامية ص ۸۹ نقلاً عن
مصادر اخری)

مسلمانوں کے باہمی اختلاف کے معاملہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو فکر میں مبتلا کر دیا۔ وہ اپنے آپ سے سوال کرتے رہے کہ یہ امت کیوں کر مختلف اور متفرق ہو جائے گی جب کہ اس کا پیغمبر ایک ہے جیسا کہ روایات بتاتی ہیں، انھوں نے اس سوال کو عبداللہ بن عباس کے سامنے رکھا اور ان سے کہا کہ یہ امت کیسے مختلف ہو جائے گی جب کہ اس کا پیغمبر ایک ہے اور اس کا قبلہ ایک ہے اور اس کی کتاب ایک ہے۔ عبداللہ بن عباس نے جواب دیتے ہوئے کہا کہ اے امیر المومنین ہمارے اوپر قرآن اترا، پھر ہم نے اس کو پڑھا اور یہ جانا کہ وہ کس بارہ میں اترا ہے۔ اور ہمارے بعد ایسے لوگ ہوں گے جو قرآن کو پڑھیں گے مگر وہ نہیں جانیں گے وہ کس بارہ میں اترا ہے۔ چنانچہ ہر ایک کی الگ الگ رائے ہو جائے گی، اور جب ہر ایک کی الگ رائے ہوگی تو وہ اختلاف کریں گے اور جب اختلاف کریں گے تو آپس میں لڑیں گے۔ روایت کہتی ہے کہ حضرت عمر نے عبداللہ بن عباس کو جھڑک دیا اور حضرت علیؓ نے بھی ان کو ڈانٹا۔ وہ واپس چلے گیے۔ پھر حضرت عمرؓ نے ان کے قول پر غور کیا تو وہ سمجھ گیے۔ حضرت عمر نے دوبارہ انھیں بلایا اور کہا کہ اپنے قول کو دہراؤ۔ انھوں نے دہرایا۔ حضرت عمر ان کے قول کو سمجھ گیے اور اس کو پسند کیا۔

حضرت عبداللہ بن عباس نے جو بات کہی اور حضرت عمر نے جس کی تصدیق فرمائی، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کو پڑھنے کے دو درجے ہیں۔ ایک ہے معرفت کے ساتھ پڑھنا، اور دوسرا ہے معرفت کے بغیر پڑھنا۔ جو شخص معرفت کی سطح پر قرآن کو پڑھے، وہی قرآن کو حقیقی طور پر سمجھے گا، اور جو شخص معرفت کے بغیر قرآن کو پڑھے وہ پڑھنے کے باوجود قرآن کو سمجھنے سے قاصر رہے گا۔

اصل دین

ایک صاحب نے پر جوش طور پر لکھا ہے کہ "توحید صرف ذاتی عقیدہ یا انفرادی عبادت کا نام نہیں۔ اس سے بڑھ کر توحید یہ ہے کہ اللہ کی حکمرانی کو تمام انسانوں کے اوپر قائم کیا جائے۔ اللہ کے سیاسی اور اجتماعی قوانین کو سارے عالم میں غالب اور نافذ بنا دیا جائے"

بظاہر یہ ایک بے ضرر کلام معلوم ہوتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ بالکل لغو کلام ہے۔ وہ تحریفِ دین کی حد تک قابلِ اعتراض ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف نے عقیدہ کو محض اقرار اور عبادت کو صرف مراسم پرستش کی ادائیگی کے ہم معنی سمجھا ہے۔ حالاں کہ یہ عقیدہ اور عبادت کی تصغیر ہے۔

عقیدہ سے مراد صرف تلفظ کلمہ یا اقرار لسانی نہیں ہے۔ عقیدہ ایک شعوری سفر کی منزل یا ایک ذہنی انقلاب کی تکمیل ہے۔ عقیدہ ایک عظیم ترین روحانی تجربہ ہے یہ اس ناقابلِ بیان ربانی حالت کا نام ہے جب کہ ایک بندہ حقیقتِ اعلیٰ کے سمندر میں نہاتا ہے، جب وہ ایک ابدی نور سے روشن ہو کر چمک اٹھتا ہے۔

اسی طرح عبادت کو صرف کچھ ظاہری مراسم کی ادائیگی کے ہم معنی سمجھنا، عبادت سے سراسر ناواقفیت کا ثبوت ہے۔ عبادت اس کائنات کا عظیم ترین واقعہ ہے۔ عبادت اس لرزہ خیز لمحہ کا نام ہے جب کہ عاجز مطلق قادر مطلق سے ملاقات کرتا ہے۔ جب کہ ایک با اختیار انسان خود اپنے ارادہ سے اپنے کو بے اختیار بنا لیتا ہے۔ جب وہ حقیقتِ واقعہ کا آزادانہ اعتراف کرتے ہوئے اپنے آپ کو ہمہ تن اللہ کے آگے ڈال دیتا ہے۔ عبادت اس کائنات کے اس نادر ترین لمحہ کا نام ہے جب کہ ایک بندہ رب العالمین کے آگے ڈھ پڑتا ہے حالاں کہ وہ ایسا کرنے کے لیے مجبور نہ تھا۔

عقیدہ اور عبادت دین خداوندی کا جزء نہیں، وہ دینِ خداوندی کی اصل ہیں۔ جہاں یہ اصل موجود ہو وہاں لازماً دوسری تمام مطلوب چیزیں بھی موجود ہوں گی۔ جہاں یہ اصل نہیں وہاں بقیہ چیزوں میں سے کوئی چیز بھی پائی نہیں جاسکتی۔

ایک نظریہ

جدید ذہن پر جن چند لوگوں نے بہت زیادہ اثرات ڈالے ہیں ان میں سے ایک ممتاز نام سگمنڈ فرائڈ (Sigmund Freud) کا ہے۔ وہ تحلیل نفسی (Psychoanalysis) کا ماہر تھا۔ اپنے نفسیاتی مریضوں کا مطالعہ کرنے کے بعد اس نے انسان کے ذہنی ساخچہ (Mental structure) کا ایک نقشہ بنایا۔ اس نے اس بات کی توجیہہ کی کہ آدمی کا لاشعور (Unconscious mind) کس طرح عمل کرتا ہے۔

فرائڈ نے کہا کہ انسان کا لاشعور ہی دراصل یہ فیصلہ کرتا ہے کہ وہ کیا کرے۔ اس نظریہ کے مطابق انسان کا نیت اور ارادہ ہر قسم کے جرم کی ذمہ داری سے بری ہوگیا۔ جب آدمی کا عمل اس کے شعور اور ارادہ سے صادر نہیں ہوتا بلکہ اس کے لاشعور یا اس کے غیر شعوری ذہن کے تحت صادر ہوتا ہے تو انسان باعتبار حقیقت ارادی مجرم نہ رہا۔ ایک مبصر نے لکھا ہے :

> Perhaps no science has been a more powerful source of forgiveness than the psychoanalysis of Freud. The sinner becomes a patient. And if he seems to do wrong, it is not really he who does it but an unconscious whose machinations are unknown to him. (*Times,* London)

غالباً کوئی اور علم نہیں جس نے فرائڈ کی تحلیل نفسی سے زیادہ انسان کی بے گناہی ثابت کرنے کا کام کیا ہو۔ اس نظریہ کے مطابق گناہ گار ایک مریض کی حیثیت حاصل کرلیتا ہے۔ اور اگر وہ غلطی کرتا ہوا نظر آئے تو حقیقۃً وہ خود نہیں ہے جو ایسا کر رہا ہے بلکہ ایک لاشعور ہے جس کا نظام اس کے اپنے لیے بھی غیر معلوم ہے۔

فرائڈ کے اس نظریہ کے مطابق انسانوں میں جو تقسیم ہے وہ صحیح اور غلط (Right and wrong) کی نہیں ہے بلکہ صحیح اور ذہنی اعتبار سے غیر صحت مند (Right and not mentally healthy) کی ہے۔ جس چیز کو پہلے نظم کہا جاتا تھا وہ اب غیر صحت مند دباؤ ہے :

What was once discipline is now unhealthy repression

مگر انسانی فطرت کے بارہ میں جدید ترین تحقیقات نے اس نظریہ کو غلط ثابت کر دیا ہے۔

بدتر از گناہ

ٹائمس آف انڈیا (۱۵ ستمبر ۱۹۸۷) میں راقم الحروف کا ایک مضمون چھپا تھا۔ ایک بزرگ نے اس کو غلط شکل میں پیش کر کے مجھ کو بدنام کرنے کی کوشش کی۔ ان صاحب سے میری ملاقات ہوئی تو میں نے انھیں تنبیہ کی۔ میں نے کہا کہ اگر بات کو غلط شکل میں پیش کر کے مطعون کرنا درست ہو تو اس طرح آپ کسی بھی شخص کو مطعون کر سکتے ہیں، خواہ وہ کتنا ہی زیادہ صحیح کیوں نہ ہو۔

میں نے مثال دیتے ہوئے کہا کہ مولانا احمد رضا خاں بریلوی نے ۱۳۲۲ھ میں ایک فتویٰ مرتب کیا۔ اس میں چار دیوبندی علماء (مولانا قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا خلیل احمد سہارن پوری، مولانا اشرف علی تھانوی) کو کافر قرار دیا گیا تھا۔ تکفیر کا یہ فتویٰ بظاہر اتنا قطعی تھا کہ مولانا احمد رضا خاں بریلوی جب حجاز گیے اور مکہ اور مدینہ کے عرب علماء کو اسے دکھایا تو حرمین کے علماء نے بھی اس کو صحیح سمجھ کر اس کی تصدیق کر دی۔ اور مولانا احمد رضا خاں بریلوی نے ہندستان واپس آکر اس کو "حسام الحرمین" کے نام سے شائع کر دیا۔ مگر تحقیق سے معلوم ہوا کہ یہ فتویٰ صحیح نہ تھا۔ کیونکہ اس میں مذکورہ علماء دیوبند کی عبارتوں کو غلط شکل میں پیش کیا گیا تھا۔

میری یہ بات سن کر مذکورہ بزرگ نے کہا کہ میں نے وہ بات اپنی طرف سے نہیں کہی تھی۔ فلاں صاحب نے آپ کے خلاف ایک مراسلہ چھپوایا تھا، اسی کو میں نے دہرا دیا۔ میں نے کہا کہ آپ کی اس توجیہ سے آپ کا جرم کم نہیں ہوتا۔ کیوں کہ حدیث میں بتایا گیا ہے کہ کسی شخص کے جھوٹا ہونے کے لیے یہ کافی ہے کہ وہ جو بات سنے اس کو بیان کرنے لگے (کفی بالمرء کَذِباً ان یحدّث بکل ما سمع) اگر آپ خود سے ایسی بات کہیں تو آپ مسخ حقیقت (Distortion of facts) کے مجرم ہیں اور اگر آپ اخباری خط کو پڑھ کر بلا تحقیق اس کو دہرائیں تو حدیث کے مطابق کذب بیانی کے مجرم۔ غلطی کو چھپانے کے لیے جھوٹی توجیہ کا سہارا لینا عذر گناہ بدتر از گناہ کا مصداق ہے۔

عبرت ناک

مریم جمیلہ ایک امریکی نومسلمہ ہیں۔ وہ آج کل پاکستان میں رہتی ہیں۔ انھوں نے اسلام کے بارے میں انگریزی میں کئی کتابیں لکھی ہیں۔ ان کی ایک کتاب کا نام یہ ہے:

Islam in Theory and Practice

اس کتاب کا اردو ترجمہ "اسلام ایک نظریہ، ایک تحریک" کے نام سے پاکستان سے شائع ہوا ہے اس کتاب کا ایک باب "اسلام اور صفائی پسندی" کے بارے میں ہے۔ اس باب کے آغاز میں وہ لکھتی ہیں:

"آج مسلمان ممالک میں بے حد گندگی اور غلاظت پائی جاتی ہے۔ باہر سے آنے والے لوگ مسلمانوں سے جو نفرت کرتے ہیں اس کی ایک بڑی وجہ یہ گندگی اور غلاظت بھی ہے۔ یہ چیز مسلمانوں کی ساری شہرت اور ساکھ پر پانی پھیر دیتی ہے۔ کسی بھی یوروپی سیاح سے پوچھئے۔ دنیائے اسلام کے ملکوں اور عوام کے متعلق اس کا کیا خیال ہے؟ آپ کو ہمیشہ ایک جواب ملے گا: "وہ کتنے غلیظ ہیں!" افسوسناک حقیقت یہ ہے کہ ان کی یہ نکتہ چینی بسا اوقات اس قدر صحیح ہوتی ہے کہ خود یورپی نژاد نومسلم محض اسی وجہ سے ارتداد کے کنارے پہونچ جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر میری ایک بہت اچھی دوست ایک جرمن نومسلم —— بیگم فاطمہ ہیرن سرکا ہیں۔ وہ اور ان کے شوہر اُن دنوں ایک مسلمان ملک میں اسلامی زندگی بسر کرنے کی انتہائی کوشش کر رہے تھے۔ ۱۱ اگست ۱۹۶۴ کو بیگم فاطمہ نے مجھے ایک خط میں لکھا:

"میرے شوہر اس ملک میں پھیلی ہوئی گندگی سے بے حد متنفر ہو چکے ہیں۔ ان کے دفتر کی دیواریں خصوصاً سیڑھیاں پان کی پیک سے لال سیاہ ہو رہی ہیں۔ لوگ اپنی پتلون کے بٹن باتھ روم میں نہیں، اپنے میز کی طرف واپس آتے ہوئے لگاتے ہیں۔ جس ٹونٹی پر میرے شوہر نماز کے لیے وضو کرتے ہیں دوسرے لوگ وہاں اپنے مصنوعی دانت صاف کرنے بیٹھ جاتے ہیں اور پان کی سرخی سے ارد گرد کی ہر چیز کو لال کر دیتے ہیں۔ اسی دوران میں نوکر جا کر پینے کا پانی بھرتے رہتے ہیں۔ جمعہ کے روز نہا دھو کر اور صاف ستھرے کپڑے پہن کر مسجد میں آنے

کے بجائے گندے اور بدبو دار کپڑوں میں جمع ہو جاتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پاکستان میں جس قسم کے حالات ہیں ان کے پیش نظر میرے شوہر کی رائے یہ ہے کہ ہمیں اپنے ایمان کی سلامتی مطلوب ہے تو جلد سے جلد مسلمانوں سے الگ ہو جانا چاہیے ۔ جرمنی میں وہ اپنی تبلیغی جدوجہد کے لیے کہیں زیادہ مفید ثابت ہو سکیں گے "

انھوں نے پاکستان کے مسلمان معاشرہ میں بود و باش اختیار کرنے کی سر توڑ کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوئے اور اگلے سال دونوں میاں بیوی اپنی آبائی سرزمین کو لوٹ گیے ۔ کس قدر اندوہناک بات ہے ۔ آج کے مسلمان ممالک اپنی گندگی کی وجہ سے دنیا بھر میں بدنام ہیں ۔ حالانکہ اسلام سے زیادہ کوئی دوسرا مذہب جسم اور ماحول کے پاک صاف ہونے کی ضرورت و اہمیت پر زور نہیں دیتا " (صفحہ ۸۴ - ۸۳)

پاکستان اور دوسرے مسلم ملکوں میں تقریباً نصف صدی سے " اسلامی نظام قائم کرو " کا غلغلہ مچا ہوا ہے ۔ اس کے باوجود یہ حال ہے کہ آج ایک نومسلم اپنے اسلام کو بچانے کے لیے " اسلام پسندوں " کے ملک کو چھوڑ کر " کفر پسندوں " کے ملک میں پناہ لے رہا ہے ۔

اس صورت حال کی ذمہ داری تمام تر ان نام نہاد اسلامی قائدین پر ہے جنھوں نے دین میں " لازم " کو " متعدی " کرنے کا مجرمانہ فعل انجام دیا ۔ قرآن میں اَقِیمُوا الدِّینَ کا حکم اس معنی میں تھا کہ ہر مسلمان دین پر قائم ہو جائے ۔ مگر جھوٹی تعبیرات کے ذریعہ اس کا مفہوم یہ بنا دیا گیا کہ حکمرانوں کے اوپر دین کو قائم کرو ۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر آدمی دوسروں کے خلاف دین کا جھنڈا اٹھائے ہوئے ہے ، خود اپنی زندگی میں اس کو دین پر کاربند ہونے کی کوئی فکر نہیں ۔

اسی طرح تمام اسلامی احکام کو فعلِ لازم سے فعلِ متعدی کر دیا گیا ہے ۔ اس معنوی تحریف کا نتیجہ یہ ہے کہ لوگ حکمرانوں کے اوپر دین کو نافذ کرنے کے لیے تو قتال اور مسلح اقدام تک جانے کی تقریریں کر رہے ہیں ، اور خود اپنی زندگی میں معمولی اخلاقی آداب کا اہتمام کرنے کی ضرورت بھی نہیں سمجھتے ۔

ایک آیت

سورہ لقمان کے آخر میں ارشاد ہوا ہے : بے شک قیامت کا علم صرف اللہ کے پاس ہے۔ اور وہی بارش اتارتا ہے۔ اور وہ جانتا ہے جو کچھ رحموں میں ہوتا ہے۔ اور کسی کو بھی علم نہیں کہ وہ کل کیا کمائی کرے گا۔ اور کسی کو یہ علم نہیں کہ وہ کس سرزمین میں مرے گا۔ بے شک اللہ علیم وخبیر ہے۔

جو لوگ قیامت کے بارے میں شک کرتے ہیں اس کی وجہ زیادہ تر یہ ہوتی ہے کہ قیامت کی ساری تفصیلات انسان کے علم میں نہیں۔ مگر زندگی کی بہت سی حقیقتیں ہیں جن کے وقت اور ان کی نوعیت کا کسی کو علم نہیں۔ ہم اپنی بشری محدودیت کی وجہ سے ان کا احاطہ نہیں کر پاتے۔ پھر بھی کوئی شخص ان کا انکار نہیں کرتا۔ زندگی کے تمام معاملات اسی قسم کی "ناکافی" معلومات کی بنیاد پر چلائے جاتے ہیں۔ پھر اسی قسم کی معلومات کو قیامت کے انکار کے لیے معقول وجہ مان لینا کیوں کر درست ہو سکتا ہے۔

بارش آتی ہے اور آنے والی ہے، مگر انسان کو قطعیت کے ساتھ معلوم نہیں ہوتا کہ کب آئے گی۔ آج بھی محکمہ موسمیات اس معاملہ میں اتنا ہی عاجز ہے جتنا قدیم دور کا انسان اپنے کو عاجز محسوس کرتا تھا۔

عورت حاملہ ہوتی ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ یہ جننے والی ہے۔ مگر کیا جنے گی یہ کسی کو نہیں معلوم۔ پیدا ہونے والا کتنی مدت تک دنیا میں رہے گا اور کب مر جائے گا۔ وہ کیا کمائے گا۔ وہ برا نکلے گا یا بھلا۔ وہ دوسروں کو کیا دے گا اور خود کیا حاصل کرے گا۔ اندر کا انسان باہر آکر کیا ثابت ہوگا۔ یہ سب باتیں لامعلوم رہتی ہیں۔ پھر بھی انسان یقین رکھتا ہے کہ عورت کے پیٹ سے ایک جان ظاہر ہونے والی ہے۔ وہ مذکورہ عدم واقفیت کو اس کے انکار کی وجہ نہیں بنا لیتا۔

کسی آدمی کو یہ نہیں معلوم کہ وہ آئندہ کیا کچھ حاصل کرے گا۔ آدمی پروگرام بناتا ہے مگر اس کی تکمیل ہمیشہ غیر یقینی رہتی ہے۔ وہ بڑے بڑے منصوبے بناتا ہے۔ مگر اس کا منصوبہ بالآخر کیا صورت اختیار کرے گا، اس کو کوئی نہیں جانتا۔

موت ہر ایک کے لیے یقینی ہے۔ مگر کون شخص کہاں مرے گا اور کہاں اپنی کتاب زندگی کا آخری صفحہ لکھے گا، اس کے بارے میں کوئی بھی قطعی پیشین گوئی نہیں کی جا سکتی۔

کب، کیا، کتنا اور کہاں کے سوالات جن کو لوگ قیامت کے انکار کے لیے بنیاد بناتے ہیں، ٹھیک انھیں سوالات کی موجودگی میں دوسری باتوں کو مان لیتے ہیں اور ان کی بنیاد پر اپنی زندگی کا نظام چلاتے ہیں۔ پھر اسی قسم کی کمتر واقفیت کی بنا پر قیامت کے بارے میں کیوں شبہ کیا جانے لگے۔

اور اللہ ہی جانتا ہے کہ رحموں میں کیا ہے (وَیعلم مافی الارحام) اس آیت کی تفسیر عام طور پر یہ مشہور ہو گئی ہے کہ یہ خدا ہی کے علم میں ہے کہ حاملہ عورت کے پیٹ میں لڑکا ہے یا لڑکی۔ مگر آیت کے الفاظ میں اس تفسیر کی کوئی بنیاد موجود نہیں۔ آیت کے الفاظ بالکل عام ہیں۔ "رحم کے اندر کیا ہے، یہ خدا ہی کو معلوم ہے" ان الفاظ میں ہر وہ بات آسکتی ہے جو پیدا ہونے والے کی زندگی اور مستقبل سے متعلق ہو۔ یہاں ایسا کوئی بھی قرینہ موجود نہیں ہے جس کی بنا پر اس کو مذکر اور مؤنث کے ساتھ خاص کیا جائے۔

جہاں تک قرآن کی قدیم تفسیروں کا تعلق ہے۔ اس سلسلہ میں عام طور پر دو باتیں کہی جاتی رہی ہیں۔ یہاں ہم صرف ایک تفسیر کا حوالہ نقل کرتے ہیں۔

(ویعلم مافی الارحام) ای من ذکر او انثی شقی او سعید۔ صفوۃ التفاسیر، محمد علی الصابونی

خدا ہی جانتا ہے کہ رحموں میں کیا ہے، یعنی مذکر یا مؤنث، برا یا بھلا۔

اس آیت میں مذکر اور مونث کا قصہ زیادہ تر عوامی ذوق کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ عوام کو چوں کہ اس سے بہت زیادہ دل چسپی ہوتی ہے کہ ان کے یہاں پیدا ہونیوالی اولاد لڑکا ہے یا لڑکی، اس لیے یہ تفسیر مشہور ہو گئی۔ ورنہ خود قدیم تفاسیر میں شقی اور سعید کے الفاظ بھی موجود ہیں۔ یعنی یہ خدا ہی کو معلوم ہے کہ پیدا ہونے والا بڑا ہو کر برا نکلے گا یا بھلا ثابت ہوگا۔ "برا اور بھلا" کے الفاظ انتہائی عام اور وسیع ہیں ان میں انسان کی زندگی سے متعلق ہر بات موجود ہے۔ انسان زیادہ عمر کو پہنچ کر جو کچھ بنتا ہے وہ سب ان دو لفظوں میں شامل ہے۔

مذکر اور مؤنث کے بارے میں پہلے بھی انسان اندازے کرتا تھا اور موجودہ زمانہ میں مزید اضافہ کے ساتھ اس کا اندازہ کرنا ممکن ہو گیا ہے۔ تاہم اصل بات بدستور انسان کے لیے لامعلوم ہے اور وہ یہ کہ مکمل معنوں میں پیدا ہونے والے کے بارے میں پیشین گوئی کی جائے کہ وہ کیسا عورت یا مرد ثابت ہوگا اور کیسا عورت یا مرد ثابت نہیں ہوگا۔ رحم مادر کا یہ راز اب بھی انسان کے لیے لامعلوم ہے۔

ایمانی برکتیں

دنیا میں دو قسم کی چیزیں ہیں۔ جامد اور نمو پذیر۔ جامد وہ ہے جو یکساں طور پر اپنی حالت پر باقی رہے۔ نمو پذیر وہ ہے جو ہمیشہ بڑھتا رہے۔ پتھر پہلی چیز کی مثال ہے اور درخت دوسری چیز کی مثال۔

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان کوئی جامد چیز نہیں۔ وہ درخت کی طرح اضافہ پذیر چیز ہے۔ وہ برابر بڑھتا رہتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ درخت اپنے مادی وجود کے اعتبار سے بڑھتا ہے اور مومن کا ایمان اپنے شعوری وجود کے اعتبار سے۔ درخت کا بڑھنا یہ ہے کہ اس کی لکڑی اور پتی بڑھے۔ ایمان کا بڑھنا یہ ہے کہ اس کی معرفت بڑھے۔ اس کا یقین بڑھے۔ اس کا اعتماد علی اللہ بڑھے۔ اس کی ربانی گہرائیوں میں اضافہ ہو۔

اس اضافۂ ایمان کے دو خاص راستے ہیں۔ ایک فکر اور دوسرا صبر۔ آدمی جب اللہ کو یاد کرتا ہے۔ جب وہ اللہ کی کاریگری میں غور کرتا ہے تو اس کا شعورِ ایمان بڑھتا ہے وہ معرفت کے نئے نئے پہلوؤں کا تجربہ کرتا ہے۔ اسی طرح موجودہ امتحان کی دنیا میں جب وہ مختلف قسم کے ناموافق حالات سے دوچار ہوتا ہے۔ اور ان حالات میں وہ اپنے ایمانی تقاضوں پر قائم رہتا ہے تو اس کے ذریعہ سے وہ اپنی ایمانی قوت کو بڑھاتا ہے۔ وہ اپنے ایمان کو پختہ سے پختہ تر کرتا چلا جاتا ہے

فکر کی راہ سے اضافہ

آدمی کے ایمان میں فکر کی راہ سے جو اضافہ ہوتا ہے، اس کا ذکر قرآن میں متعدد مقامات پر کیا گیا ہے۔ اس سلسلہ کی ایک آیت یہ ہے:

واذا ما انزلت سورۃ فمنهم من يقول ايكم اور جب کوئی سورہ اترتی ہے تو ان میں سے بعض

زادتہ هٰذہٖ ایمانا۔ فاما الذین اٰمنوا فزادتھم ایمانا وھم یستبشرون۔ (التوبۃ ۱۲۴)

کہتے ہیں کہ اس سورہ نے تم میں سے کس کا ایمان بڑھا دیا۔ پس جو ایمان والے ہیں ان کا ایمان اس نے بڑھا دیا اور وہ خوش ہو رہے ہیں۔

قرآن میں خالق کا تعارف ہوتا ہے۔ انسان کے اندر چھپے ہوئے بندگی کے احساسات کو ابھارا جاتا ہے۔ یہ چیزیں آدمی کے ذہن کو جگاتی ہیں۔ وہ اس کے لاشعور کو شعور کی سطح پر لے آتی ہیں۔ وہ اس کے اندر خالق و مخلوق کے تعلق کو زیادہ اجاگر کرتی ہیں۔ اس طرح قرآن کو سن کر اور پڑھ کر آدمی کا شعورِ ایمان بڑھتا ہے اور برابر بڑھتا چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ وہ اپنے رب سے جا ملے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے بارہ میں روایات میں آتا ہے کہ وہ اپنے اصحاب میں سے ایک یا دو آدمی کا ہاتھ پکڑتے اور کہتے کہ آؤ ہم اپنے ایمان میں اضافہ کریں (کان عمر رضی اللّٰہ عنہ یاخذ بید الرجل والرجلین من اصحابہ فیقول تعالوا حتی نزداد ایمانا۔ مظہری، رابع ۳۲۶)

حضرت عبد اللہ بن رواحہ کا ایک واقعہ امام بیہقی نے ان الفاظ میں نقل کیا ہے:

عن عطاء بن یسار۔ ان عبد اللّٰہ بن رواحۃ قال لصاحب لہ تعال، حتی نؤمن ساعۃ۔ قال اَوَلسنا بمومنین قال بلیٰ۔ ولکنا نذکر اللّٰہ فنزداد ایمانًا۔

عطاء بن یسار کہتے ہیں کہ عبد اللہ بن رواحہ نے اپنے ایک ساتھی سے کہا کہ آؤ ہم ایک گھڑی کے لیے ایمان لائیں۔ ساتھی نے کہا، کیا ہم مومن نہیں ہیں۔ عبد اللہ بن رواحہؓ نے کہا کہ ہاں۔ مگر ہم اللہ کو یاد کرتے ہیں تو ہم ایمان میں بڑھ جاتے ہیں۔

اس کا مطلب یہ تھا کہ آؤ ہم بیٹھ کر اللہ کی بڑائی بیان کریں۔ ہم اللہ کے کمالات کو یاد کریں۔ ہم اللہ کے آلاء (کرشموں) کا اجتماعی تذکرہ کریں۔ اس سے اللہ کے بارہ میں ہمارا احساس تازہ ہوگا۔ اللہ کے بارہ میں ہمارا یقین بڑھے گا۔ اللہ کے بارہ میں ہماری معرفت مزید ترقی کرے گی۔

صحابہ کرام میں یہ مزاج قرآن کے مطالعہ سے بنا تھا جو اپنے پڑھنے والے کو بار بار اکساتا ہے کہ وہ ذکر و فکر کے ذریعہ اپنے ایمان کو بڑھائے۔ وہ اپنے ایمان کو مسلسل ترقی دیتا رہے۔ رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں قرآن میں بتایا گیا ہے کہ آپ اہل ایمان کا تزکیہ کرتے ہیں (ویزکیھم البقرہ ۱۲۹) اس تزکیہ کا خاص پہلو یہی ہے۔ ابن جریر نے ایک روایت ان الفاظ میں نقل کی ہے:

قال ابوذر: ولقد ترکنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وما یقلب طائر جناحیہ فی السماء الا ذکر لنا منہ علماً

تفسیر ابن کثیر، جزء ۲، صفحہ ۱۳۱

حضرت ابوذر کہتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑا اور حال یہ تھا کہ ایک چڑیا بھی آسمان میں اپنا پر نہیں پھڑپھڑاتی تھی مگر آپ اس سے ہم کو ایک علم کی یاد دلاتے تھے۔

ذکر و فکر سے کس طرح ایمان بڑھتا ہے، اس کی ایک تازہ مثال لیجئے۔

جدید معلومات کے مطابق ہماری دنیا ناقابل قیاس حد تک بڑی دنیا ہے۔ سائنس دان کہتے ہیں کہ یہ کائنات اتنی زیادہ بڑی ہے کہ ایک ہوائی جہاز اگر روشنی کی رفتار سے روانہ ہو۔ یعنی اس کی رفتار ایک لاکھ ۸۶ ہزار میل فی سکنڈ ہو تو اس ناقابل قیاس حد تک تیز رفتار جہاز کو کائنات کے گرد ایک چکر لگانے میں ایک ارب سال سے زیادہ لگ جائیں گے۔ بشرطیکہ وہ جہاز اور اس کے مسافر اتنی لمبی مدت تک باقی بھی رہیں۔

اس عظیم کائنات میں بے شمار ستارے ہیں۔ دنیا کے تمام سمندروں کے کنارے ریت کے جتنے ذرے ہیں اس سے بھی زیادہ آسمان میں ستاروں کی تعداد ہے۔ یہ ستارے بے حد بڑے ہیں۔ اتنے بڑے کہ ہماری زمین جیسی کروروں زمینیں کسی ایک ستارہ پر رکھ دی جائیں تب بھی اس کے اوپر جگہ باقی رہے گی۔ صرف ہماری کہکشاں میں ۱۰۰۰۰۰ ملین ستارے پائے جاتے ہیں۔

یہ تمام کے تمام ستارے آگ کے دہکتے ہوئے اتھاہ سمندر ہیں۔ ان میں انسانی آبادی کسی طرح ممکن نہیں۔ اس عظیم کائنات میں ایک ہی معلوم شمسی نظام ہے اور اس میں ہماری زمین جیسی ایک ہی زمین ہے۔ ساری کائنات میں کوئی بھی دوسرا معلوم کرہ نہیں جس میں پانی ہو، جس میں سبزہ ہو جس میں زندگی پائی جاتی ہو۔ جہاں وہ تمام چیزیں اور وہ تمام متوازن اسباب موجود ہوں جن سے تمدن کی تعمیر کی جاتی ہے۔

اس طرح کی ان گنت معلومات ہیں جو موجودہ زمانہ میں ہماری دنیا کے بارہ میں حاصل ہوئی ہیں۔ اگر آدمی ان معلومات کو سامنے رکھ کر غور کرے تو خالق کی عظمت کے احساس سے اس کا دل دہل

اٹھے گا۔ نیز یہی مطالعہ اس کو بتائے گا کہ کائنات کے خالق نے انتہائی استثنائی طور پر اس کے لیے یہاں زندگی اور ترقی کا سامان کیا ہے۔ اس احساس سے اس کے سینے میں شکر کا سمندر موجزن ہو جائے گا۔ یہ چیزیں اس کی معرفتِ حق میں بے پناہ اضافہ کر دیں گی۔

جس زمانہ میں میں اپنی کتاب "مذہب اور جدید چیلنج" کے سلسلہ میں فلکیات اور ارضیات کا مطالعہ کر رہا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہونے لگا تھا جیسے کہ میں کارخانہ کائنات میں خدا کو بالکل عیاناً دیکھ رہا ہوں۔ اسی زمانہ کا واقعہ ہے، اعظم گڈھ کے ایک صاحب (شاہ نصیر احمد مرحوم) نے مجھ سے پوچھا: کیا انسان خدا کو دیکھ سکتا ہے۔ معاً میری زبان سے نکلا "کیا آپ نے ابھی تک خدا کو نہیں دیکھا"۔ حقیقت یہ ہے کہ آدمی اگر واقعی معنوں میں ذکر و فکر کرے تو وہ خدا کو دیکھنے لگے۔ اس کا ایمان غیب سے آگے بڑھ کر شہود تک پہونچ جائے۔

صبر کی راہ سے اضافہ

ایمان میں اضافہ کا دوسرا ذریعہ وہ ہے جس کو صبر کہا جاتا ہے۔ صبر کا مطلب ہے جمنا۔ آدمی کے سامنے جب ایسی صورت حال آئے کہ دین پر قائم رہنے کے لیے اسے قربانی دینی ہو، اسے اپنے جذبات کو کچلنا پڑے۔ خدا کا خوف اسے مجبور کر دے کہ وہ اپنی سوچ کو موڑ کر خدائی سوچ کے تابع کرے اس قسم کا ہر عمل صبر ہے اور جب آدمی اس قسم کا عمل کرتا ہے تو وہ خدا کے حق میں اپنی قوت ارادی کو بڑھاتا ہے، وہ خدا کے تعلق کا نیا تجربہ کرتا ہے۔

اسلام کی ابتدائی تاریخ میں اسی قسم کی ایک مثال صلح حدیبیہ کا واقعہ ہے۔ صلح حدیبیہ تمام تر دشمن کی یک طرفہ شرائط پر کی گئی تھی۔ چنانچہ صحابہ کرام اس پر سخت برہم تھے، ان کا دل و دماغ کسی طرح تیار نہ تھا کہ اس قسم کی ذلت آمیز صلح پر راضی ہو جائیں۔ مگر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا کہ اس وقت اللہ کی مرضی یہی ہے تو سب نے جذبات کے طوفان کے باوجود اپنے آپ کو اس کے آگے جھکا دیا۔ انھوں نے اپنے دماغ کا سانچہ خود اپنے ہاتھوں سے توڑ دیا۔ اس کا فوری فائدہ انھیں یہ ملا کہ ان کے ایمان میں اضافہ ہو گیا۔ قرآن میں اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہے:

هو الذي انزل السكينة في قلوب المومنين — وہ اللہ ہی ہے جس نے مومنین کے دل پر اطمینان

لیزدادوا ایمانا مع ایمانھم (الفتح ۴) — تاکہ ایمان کے ساتھ ان کا ایمان اور زیادہ ہو جائے۔

حدیبیہ کے موقع پر دشمن نے صلح کی یک طرفہ شرطیں پیش کی تھیں۔ صحابہ جب اللہ کی خاطر ان یک طرفہ شرطوں پر راضی ہوئے تو انھوں نے ایک نئے ایمان کا تجربہ کیا۔ پہلے اگر انھوں نے اللہ کو بطور ایک خارجی واقعہ کے مانا تھا تو اب انھوں نے اللہ کو اپنی نفی کی قیمت پر مانا۔ اس واقعہ کے ذریعہ انھوں نے اس ایمان کا تجربہ کیا کہ اپنی بڑائی ختم ہو تب بھی وہ خدا کے حکم کو مانیں۔ اپنی خواہشات پامال ہوں تب بھی وہ خدا کے طریقہ کو نہ چھوڑیں۔ اپنا ذہنی سانچہ ٹوٹے تب بھی وہ اپنی رائے کو خدا کی رائے کے تابع کریں۔ یہ ہے ایمان پر ایمان کا اضافہ۔

ایک حدیث

اضافۂ ایمان کے اس معاملہ کو ایک حدیث قدسی میں تمثیل کے انداز میں واضح کیا گیا ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:

إذا ابتليتُ عبدي المومن فصبر فلم يشكني الى عوّاده اطلقتُه من إساري ثم ابدلته لحماً خيراً من لحمه ودماً خيراً من دمه ثم يستأنف العمل

(رواہ الحاکم عن ابی ھریرہ)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا، جب میں اپنے مومن بندے کو تکلیف میں مبتلا کرتا ہوں پھر وہ صبر کرتا ہے، وہ حال پوچھنے والوں سے شکایت نہیں کرتا تو میں اس کو اپنی قید سے آزاد کر دیتا ہوں۔ پھر میں اس کے گوشت کو زیادہ بہتر گوشت سے بدل دیتا ہوں اور اس کے خون کو زیادہ بہتر خون سے بدل دیتا ہوں۔ پھر وہ از سرِ نو عمل کرنے لگتا ہے۔

تکلیف پر صبر کرنا یہ ہے کہ آدمی تکلیف کے حالات میں بھی حق پر قائم رہے۔ جب آدمی ایسا کرتا ہے تو وہ اس حقیقت کا تجربہ کرتا ہے کہ جو حق اس نے پایا ہے وہ ہر دوسری چیز سے زیادہ بڑا ہے۔ ہر دوسری چیز کو کھونا قابلِ برداشت ہے، مگر حق کو کھونا اس کے لیے قابلِ برداشت نہیں۔

اس تجربہ سے پہلے حق اگر اس کی نگاہ میں بہت سی چیزوں میں سے ایک چیز تھا تو اب حق اس کے لیے تمام چیزوں سے زیادہ بڑا اور قیمتی بن جاتا ہے۔ ایسی آزمائش کے موقع پر جو شخص صبر کا ثبوت دے اس کے اندر ایک نئی شخصیت ابھر آتی ہے۔ اس کے بعد وہ اپنے اندر ایک نئے انسان کا تجربہ کرتا ہے اس کا خون اب نیا خون اور اس کا گوشت اب نیا گوشت بن جاتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں اس کے کردار میں نئی جان آجاتی ہے۔ اس کا عمل ایک نئے انسان کا عمل بن جاتا ہے۔

۱۔ حضرت یعقوب علیہ السلام ایک پیغمبر تھے۔ ان کے یہاں پہلی بیوی سے دو اولاد ہوئی۔ ایک یوسف، دوسرے بن یمین۔ یہ دونوں بھائی ابھی چھوٹے تھے کہ ان کی ماں کا انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد حضرت یعقوب نے دوسرا نکاح کیا جس سے دس لڑکے پیدا ہوئے۔ سوتیلے بھائیوں کو شکایت ہوئی کہ ان کے والد یوسف کو زیادہ مانتے ہیں۔ چنانچہ وہ حضرت یوسف کے دشمن ہوگیے۔ حضرت یوسف کی عمر تقریباً ۱۶ سال تھی کہ ان کے سوتیلے بھائی ان کو ایک سنسان مقام پر لے گیے اور وہاں ان کو ایک اندھے کنوئیں میں ڈال دیا۔ اس کے بعد انھوں نے آپ کے ایک کپڑے کو جانور کے خون میں رنگا اور اس کو اپنے والد کو دکھا کر کہہ دیا کہ یوسف کو بھیڑیا کھا گیا۔

حضرت یعقوب اپنے بیٹوں میں سے حضرت یوسف کو سب سے زیادہ مانتے تھے۔ اس لیے قدرتی طور پر ان کو اس کا بے حد صدمہ ہوا۔ حتی کہ غم سے ان کی آنکھیں سفید ہوگئیں۔ مگر اس دردناک حادثہ پر انھوں نے کسی قسم کا ردعمل ظاہر نہیں کیا۔ قرآن کے مطابق انھوں نے اس پر صبر کر لیا اور زبان سے صرف یہ کہا:

انما اشکوا بثی وحزنی الی اللہ ۔ میں اپنی پریشانی اور اپنے غم کی فریاد صرف اللہ سے کرتا ہوں۔

(یوسف ۸۶)

حضرت یعقوب پر جو غم پڑا تھا وہ بظاہر انسانوں کی طرف سے آیا تھا مگر اس کے بارہ میں وہ جو کچھ کہنا چاہتے تھے اس کو انھوں نے خدا سے کہنا شروع کر دیا۔ اپنی توجہ کو انھوں نے انسانوں سے ہٹا کر خدا کی طرف کر لیا۔ اس طرح انھوں نے اس اعلیٰ حقیقت کا تجربہ کیا کہ واقعات خواہ بظاہر انسانوں کی طرف سے پیش آئے ہوں مگر حقیقۃً وہ خدا کی اجازت کے تحت ہوتے ہیں۔ اور وہی تنہا یہ طاقت رکھتا ہے کہ وہ آدمی کے کھونے کی تلافی کر سکے۔

۲۔ ہجرت کے تیسرے سال غزوۂ احد پیش آیا۔ اس جنگ میں ابتداءً مسلمانوں کو فتح ہوئی تھی۔ مگر بعد کو ایک غلطی کی وجہ سے فتح شکست میں تبدیل ہوگئی اور مسلمانوں کو زبردست جانی اور مالی نقصان ہوا۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے قرآن میں کہا گیا ہے :

فاثابکم غمّاً بغمٍّ لکیلا تحزنوا علیٰ ما فاتکم ولا ما اصابکم واللہ خبیر بما تعملون (آل عمران ۱۵۳)

پھر اللہ نے تم کو رنج پر رنج دیا تاکہ جو کچھ تم سے کھویا جائے یا جو مصیبت تم پر پڑے اس پر تم غمگین نہ ہو۔

احد کی جنگ میں شکست رسول کی موجودگی میں ہوئی تھی۔ وہ براہ راست اللہ کے علم میں تھی۔ مگر اللہ نے اس کو ہونے دیا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کے شعور ایمان میں اضافہ ہو۔ ان کے اندر یہ طاقت پیدا ہو کہ وہ کھونے کو برداشت کر سکیں۔ وہ ایک چیز کو کھو کر جانیں کہ دوسری اس سے زیادہ بڑی چیز اب بھی ان کے پاس موجود ہے اور وہ ان کا عقیدہ ہے۔

ایمان کا اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ آدمی دنیا کو کھونے کے بعد بھی خدا کو نہ کھوئے۔ نقصان اس کے لیے اس تجربہ کا ذریعہ بن جائے کہ فانی چیزوں کے درمیان ایک ایسی چیز بھی موجود ہے جو کبھی فنا نہ ہو جو کبھی آدمی سے کھوئی نہ جائے۔ دنیا کے کھونے کو برداشت کرکے اپنے اندر اس قسم کا احساس زندہ کرنا گویا ایک قسم کا ذہنی سفر کرنا ہے۔ یہ اپنے آپ کو مزید آگے کی طرف لے جانا ہے۔ جو شخص اس غیر فانی سرمایہ کو پالے وہ محرومیوں کی اس دنیا میں کبھی احساس محرومی سے دوچار نہ ہوگا۔

۳۔ غزوۂ بنی المصطلق (۵۶ھ) کے بعد مدینہ کے کچھ شر پسندوں نے ایک معمولی واقعہ کو شوشہ بنایا اور اس کو غلط رُخ دے کر حضرت عائشہ صدیقہؓ پر نعوذ باللہ جھوٹا الزام لگایا۔ حضرت عائشہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اہلیہ اور حضرت ابوبکر کی صاحبزادی تھیں۔ قدرتی طور پر حضرت ابوبکر کو اس کا بے حد رنج ہوا۔ کسی باپ کے لیے اس سے زیادہ تکلیف کی بات اور کوئی نہیں کہ اس کی پاکباز لڑکی پر بدکاری کا جھوٹا الزام لگایا جائے۔

اس جھوٹی مہم میں مدینہ کے ایک سادہ لوح مسلمان بھی شریک ہوگئے تھے جن کا نام مسطح بن اثاثہ تھا۔ یہ حضرت ابوبکر کے ایک غریب رشتہ دار تھے اور حضرت ابوبکر ان کی ماہانہ امداد کیا کرتے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیق نے شدت احساس کے تحت قسم کھائی کہ اب میں مسطح کی کوئی مدد

نہیں کروں گا۔ اس پر قرآن میں یہ آیت اتری :

ولایاتل اولوا الفضل منکم والسعۃ ان یوتوا اولی القربیٰ والمساکین والمہاجرین فی سبیل اللہ۔ ولیعفوا ولیصفحوا۔ الاتحبون ان یغفر اللہ لکم واللہ غفور رحیم۔

(النور ۲۲)

تم میں سے جو لوگ فضل اور وسعت والے ہیں وہ اس کی قسم نہ کھائیں کہ وہ اپنے رشتہ دار اور مسکین اور اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے والوں کی مدد نہ کریں گے۔ چاہیے کہ وہ انھیں معاف کردیں اور درگذر کریں۔ کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تم کو معاف کردے۔ اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

حضرت ابوبکر نے یہ آیت سنی تو فوراً کہا : خدا کی قسم ہم ضرور چاہتے ہیں کہ اے ہمارے رب، تو ہمیں معاف کردے (بلیٰ واللہ انّا نحبُّ ان تغفرلنا یا ربّنا)

اس سے پہلے حضرت ابوبکر ایک ایسے "مسطح" کی مدد کر رہے تھے جس سے انھیں کوئی چوٹ نہیں لگی تھی۔ اب مسطح کی مدد کرنا ایک ایسے شخص کی مدد کرنا تھا جس سے انھیں سخت چوٹ پہونچی تھی۔ پہلے اگر وہ نفس سے لڑے بغیر مسطح کی مدد کر رہے تھے تو اب ان کے فیصلہ کا مطلب یہ تھا کہ وہ نفس سے لڑکر مسطح کی مدد کریں گے۔ اس طرح انھوں نے سیکھا کہ غصہ کو الگ کرکے ایک شخص کے ساتھ سلوک کریں۔ انھوں نے جانا کہ صرف معمول کے حالات میں مومنانہ اخلاق نہیں برتنا ہے۔ بلکہ غیر معمولی حالات میں بھی مومنانہ اخلاق برتنا ہے۔ ان کے اس عمل نے ان کے ایمان کو ایک درجہ اوپر کردیا۔

۴۔ حضرت عائشہ صدیقہ پر نعوذ باللہ برائی کا جو الزام لگایا گیا، اس سلسلہ میں مدینہ میں بہت سے واقعات پیش آئے۔ ان میں سے ایک واقعہ روایات میں اس طرح آیا ہے :

عن افلح مولیٰ ابی ایوب قالت لہ امرأتہ امّ ایوب یا ابا ایوب الاتسمع مایقول الناس فی عائشۃ۔ قال بلیٰ وذالک الکذب۔ افکنتِ یا امّ ایوب فاعلۃ

حضرت ابو ایوب انصاری کے غلام افلح کہتے ہیں کہ ان کی بیوی ام ایوب نے ان سے کہا کہ اے ابو ایوب کیا آپ نے نہیں سنا کہ عائشہ کے بارے میں لوگ کیا کہتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہاں۔ اور وہ

ذالك. قالت لا والله. قال فعائشة والله خير منك (تفسیر ابن کثیر ۲۷۲/۳)

جھوٹ ہے۔ اے ام ایوب کیا تم ایسا کروگی۔ ان کی بیوی نے کہا کہ خدا کی قسم نہیں۔ انھوں نے کہا کہ پھر عائشہ خدا کی قسم تم سے بہتر ہیں۔

حضرت عائشہ صدیقہ پر جو الزام لگایا گیا اس کے معاملہ میں ایک طریقہ ان لوگوں کا تھا جن کا حال یہ تھا کہ انھوں نے جو کچھ سنا اس کو بلا تحقیق بیان کرنے لگے۔ مگر حضرت ابو ایوب نے اپنے آپ کو اس سے اوپر اٹھایا۔ انھوں نے معاملہ کو اپنی عقل سے جانچا۔ انھوں نے محسوس کیا کہ وہ خود ایسا نہیں کر سکتے اس لیے انھوں نے کہہ دیا کہ عائشہ نے بھی ایسا نہیں کیا۔

یہ ایک شعوری صبر کا واقعہ تھا۔ حضرت ابو ایوب نے جب ایسا کیا تو حدیث کے الفاظ میں ان کا خون زیادہ بہتر خون اور ان کا گوشت زیادہ بہتر گوشت بن گیا۔ ان کے اندر وہ شخصیت پیدا ہوئی جو دوسرے کے معاملہ کو اپنا معاملہ بنا کر دیکھے۔ وہ ہر معاملے کو اصول کی روشنی میں جانچے نہ کہ سطحی خواہشات کی روشنی میں۔

خلاصہ

ایک اسلام معمول والا اسلام ہے۔ دوسرا اسلام وہ ہے جب کہ آدمی معمول کے خلاف اسلام پر عمل کرے۔ خدا کی دنیا کو ظاہری طور پر دیکھنا بھی خدا کی یاد دلاتا ہے۔ مگر جب آدمی دنیا کے ظاہر سے گزر کر اس کے اندرونی عجائب پر غور کرتا ہے تو اس کی معرفت کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔ معتدل حالات میں اخلاق برتنا بھی ایک اچھا کام ہے۔ مگر جب آدمی ایک ایسے شخص سے اخلاق برتے جس سے اس کے تعلقات خراب ہو گیے ہوں تو وہ ایسے ایمان کا تجربہ کرتا ہے جس کا اس نے پہلے تجربہ نہیں کیا تھا۔ ایک ایسے شخص سے انصاف کرنا بھی انصاف ہے جس سے آپ کا بناؤ ہو۔ مگر جب آپ ایک ایسے شخص سے انصاف کریں جس سے آپ کا بگاڑ ہے تو اس وقت آپ کا عمل سادہ معنوں میں محض انصاف کا عمل نہیں ہوتا بلکہ وہ آپ کو خدا سے براہِ راست ملانے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ عمل کے دوران ایمان کی یہی مزید خوراک ہے جس کو اضافۂ ایمان کہا جاتا ہے۔ ایمان ہمیشہ بڑھتا ہے۔ مگر یہ بڑھنا ہمیشہ اس نسبت سے ہوتا ہے جتنا آدمی کے اندر حوصلہ ہو۔

حصّہ دوم

ایمان اس دنیا کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ ایمان ایک طرف آدمی کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ خدا کی دنیا میں پتھر کی طرح جامد نہ رہے، بلکہ درخت کی طرح ہمیشہ بڑھنے والا اور ترقی کرنے والا وجود بن جائے۔ اسی طرح ایمان آدمی کے اندر وہ اعلیٰ صفت پیدا کرتا ہے جو دنیا میں ہر قسم کی کامیابی کا واحد یقینی ذریعہ ہے۔ اس صفت کا نام ایک لفظ میں صبر ہے۔

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ ان اللہ مع الصابرین (اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے) یہی بات حدیث میں ان لفظوں میں کہی گئی ہے: اعلم ان النصر مع الصبر (جان لو کہ خدا کی مدد صبر کے ساتھ وابستہ ہے) یعنی اللہ بلاشبہ سب سے زیادہ طاقت ور ہے۔ اللہ کی مدد کامیابی کا یقینی ذریعہ ہے۔ مگر اللہ کی مدد کا دروازہ صرف اس شخص یا گروہ کے لیے کھلتا ہے جو مشکل پیش آنے کے وقت صبر کا ثبوت دے۔ مدد ہمیشہ اللہ کی طرف سے آتی ہے مگر اس کو لینے کے لیے بندے کی طرف سے صبر کا پیمانہ درکار ہے۔

یہ کوئی پر اسرار قسم کی اعتقادی بات نہیں۔ بلکہ یہی اس دنیا کے لیے خدا کا عام قانون ہے۔ اس قانون کو زیادہ واضح طور پر قرآن کی سورۃ نمبر ۹۴ میں بیان کیا گیا ہے جس کا نام الانشراح ہے۔ اس سورۃ میں اسی بات کو ان لفظوں میں فرمایا گیا ہے کہ ان مع العسر یسرا (بلاشبہ ہر مشکل کے ساتھ آسانی ہے) یعنی اس دنیا میں خدا نے آسانیوں کو مشکلات کے ساتھ وابستہ کر دیا ہے۔ یہاں جو شخص آسانی کی منزل تک پہونچنا چاہے اس کو جاننا چاہیے کہ وہ دشواریوں سے بھرے ہوئے راستے سے گزر کر ہی اپنی منزل مقصود تک پہونچ سکتا ہے۔ یہ اس دنیا کے لیے خدا کا قانون ہے اور اس قانون میں کوئی استثناء نہیں۔

مشکل میں آسانی

سورہ الانشراح یا سورہ الم نشرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے اس دور میں اتری جس کو مکی دور کہا جاتا ہے۔ اس وقت مکہ کے حالات بہت سخت تھے۔ اس وقت کے مکہ میں مشرکین کا غلبہ تھا۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اور مسلمانوں کو ناقابل بیان تکلیفوں میں مبتلا کیے ہوئے تھے۔ تکلیف

کی کوئی قسم ایسی نہ تھی جو قدیم مکہ کے لوگوں نے آپ پر نہ ڈالی ہو۔

حضرت طارق بن عبد اللہ المحاربی کہتے ہیں کہ میں نے بعثت کے ابتدائی زمانہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ذو المجازکے بازار میں پہلی بار دیکھا تھا۔ آپ لوگوں کے درمیان یہ کہتے ہوئے گزر رہے تھے کہ : یاایھاالناس قولوا لا الٰہ الاّ اللہ تفلحوا (اے لوگو کہو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، تم فلاح پاؤگے) آپ یہ کہتے جاتے تھے اور ایک شخص آپ کے پیچھے آپ کو پتھر مارتا ہوا چل رہا تھا۔ ساتھ ساتھ وہ کہتا جاتا تھا : یاایھاالناس لاتطیعوہ فانہ کذاب (اے لوگو اس کی بات نہ مانو کیوں کہ وہ جھوٹا ہے)

حضرت عروہ ابن زبیر کہتے ہیں کہ میں نے ایک بار عبد اللہ بن عمرو بن العاص سے کہا کہ قدیم مشرکین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جو تکلیف پہونچاتے تھے اس کا کچھ حال بیان کیجئے۔ عبد اللہ بن عمرو نے کہا کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حطیم میں نماز پڑھ رہے تھے۔ اتنے میں عقبہ بن ابی معیط آیا۔ اس نے آپ کی گردن میں کپڑا ڈال کر اتنے زور سے کھینچا کہ آپ کا گلا گھٹنے لگا۔

اس طرح کے بہت سے واقعات حدیث اور سیرت کی کتابوں میں آئے ہیں جو بتاتے ہیں کہ قدیم مکہ میں اسلام کے دشمن آپ کے ساتھ کس قسم کا سلوک کرتے تھے۔

مکہ کے ابتدائی سالوں میں یہ حال تھا کہ نماز پڑھنا یا قرآن کی تلاوت کرنا بھی مشرکین کو گوارا نہ تھا۔ ابن ہشام اپنی سیرت کی کتاب میں لکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کو نماز پڑھنا ہوتا تو وہ پہاڑ کی گھاٹیوں میں چلے جاتے۔ وہ اپنی نماز کو اپنی قوم سے چھپاتے تھے۔ (کان اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا صلّوا ذھبوا فی الشعاب واستخفوا بصلاتھم من قومھم، صفحہ ۲۷۵)

قدیم مکہ کے مشرکین صرف برا بھلا کہنے پر نہیں رکتے تھے، وہ باقاعدہ مارپیٹ بھی کرتے تھے۔ وہ ہر طرح مسلمانوں کو ستاتے تھے جس کی تفصیل سیرت کی کتابوں میں موجود ہے۔

یہی سخت حالات تھے جب کہ قرآن میں یہ آیت اتری :

فان مع العسر یسرا	پس مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔
ان مع العسر یسرا	بے شک مشکل کے ساتھ آسانی ہے

ابن جریر نے ایک روایت ان الفاظ میں نقل کی ہے :

خرج النبی صلى الله عليه وسلم يوما مسرورا وهو يضحك وهو يقول : لن يغلب عسر يسرين لن يغلب عسر يسرين فان مع العسر يسرا ان مع العسر يسرا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک روز نکلے ۔ آپ خوش تھے اور ہنس رہے تھے اور یہ فرما رہے تھے کہ ایک مشکل دو آسانیوں پر غالب نہیں آسکتی ، ایک مشکل دو آسانیوں پر غالب نہیں آسکتی ۔ کیوں کہ قرآن میں ہے کہ بے شک مشکل کے ساتھ آسانی ہے ، بے شک مشکل کے ساتھ آسانی ہے ۔

یہ آیت موجودہ دنیا میں خدا کے قانون کو بتا رہی ہے ، اس دنیا کو بنانے والے نے اس کو اس طرح بنایا ہے کہ یہاں جب بھی آدمی کوئی کام کرنا چاہتا ہے تو اس کے سامنے مشکلات آتی ہیں ۔ مگر ہر مشکل میں آسانی کا پہلو بھی موجود ہوتا ہے ۔ یہاں ہر ڈس ایڈوانٹج میں ایڈوانٹج چھپا ہوا ہوتا ہے اس لیے یہاں آدمی کو یہ کرنا چاہیے کہ جب بھی مشکل پیش آئے تو وہ مشکل میں چھپی ہوئی آسانی کو دریافت کرے ، وہ ڈس ایڈوانٹج میں ایڈوانٹج کو پالے ۔ یہی اس دنیا میں کامیابی کا راز ہے ۔ جو لوگ اس راز کو دریافت کر سکیں وہ کامیاب ہیں اور جو لوگ اس راز کو دریافت نہ کر سکیں وہی وہ لوگ ہیں جو ناکام ہو گئے ۔

انسانی علم کی تصدیق

زندگی کی یہ حقیقت جو قرآن میں بیان کی گئی ہے ، یہ اتنی واضح ہے کہ علماء نفسیات جنھوں نے انسان کا مطالعہ خالص علمی انداز سے کیا ہے انھوں نے بھی اس راز کو پالیا ہے ۔ اور اس کو مختلف انداز میں بیان کیا ہے ۔

یہاں میں مشہور عالم نفسیات ڈاکٹر الفرڈ ایڈلر (۱۹۳۷ - ۱۸۷۰) کا حوالہ دوں گا ۔ کہا جاتا ہے کہ یہ پہلا شخص ہے جس نے احساس کمتری (Inferiority feeling) کا لفظ استعمال کیا ۔ اور اس کی سختی سے تردید کی ۔

الفرڈ ایڈلر نے پوری زندگی اس مطالعہ میں صرف کر دی کہ انسان کیا ہے اور وہ کس طرح اپنی قوتوں کو استعمال کرتا ہے ۔ وہ ایک ممتاز ترین ماہر نفسیات تھا ۔ اس نے تمام عمر کے مطالعہ کے بعد ایک کتاب

لکھی جس کا نام ہے (The Individual Psychology) اس میں اس نے لکھا ہے کہ انسانوں کے اندر میں نے ایک انتہائی حیرت ناک خصوصیت پائی۔ ان کی یہ طاقت کہ وہ ایک نہیں کو ہے میں تبدیل کر سکیں :

...... their power to turn a minus into a plus.

الفرڈ ایڈلر نے جس چیز کو انسان کی طرف منسوب کیا ہے۔ وہ دراصل خدا کا عطیہ ہے۔ انسان بلاشبہ اس دنیا میں اپنے نہیں کو ہے میں تبدیل کرتا ہے۔ مگر یہ معجزہ انسانی طاقت کی بنا پر نہیں ہوتا۔ وہ اس لیے ہوتا ہے کہ خدا نے اس دنیا کو اس ڈھنگ سے بنایا ہے کہ اس کے اندر یہ امکان بے پناہ حد تک موجود ہے کہ ناموافق حالات کبھی بھی انسان کے لیے آخری اور کلی معنوں میں ناموافق نہ بنیں۔ یہاں ہمیشہ ناموافق میں موافق پہلو موجود رہے تاکہ انسان اس کو استعمال کر کے کامیابی کی منزل تک پہونچ سکے۔

یہاں ہم رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور اسلامی تاریخ کے بعض واقعات کا ذکر کریں گے جو اس حقیقت کی زندہ مثال ہیں۔ یہ واقعات بتاتے ہیں کہ اللہ کے بندوں کے ساتھ جو عُسر پیش آیا، کس طرح اس کے اندر خدا نے یُسر کا پہلو رکھ دیا تھا۔ اور اللہ کے یہ بندے جب منفی نفسیات کا شکار نہیں ہوئے تو انھیں اس پہلو کو جاننے میں دیر نہیں لگی۔ انھوں نے یُسر کے پہلو کو استعمال کر کے تاریخ کے رُخ کو موڑ دیا۔ جو واقعہ بظاہر ان کے خلاف جا رہا تھا اس کو انھوں نے اپنے موافق بنا لیا۔

مخالفت سے رفع ذکر

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ سے مکہ میں اسلام پھیل گیا اور لوگوں میں اس کا چرچا ہونے لگا۔ یہاں ابن ہشام نے یہ الفاظ لکھے ہیں : ثم دخل الناس فی الاسلام ارسالاً من الرجال والنساء حتی فشا ذکر الاسلام بمکۃ، وتُحُدِّثَ بہ ، صفحہ ۲۷۴ (پھر عورتوں اور مردوں کی ایک جماعت اسلام میں داخل ہوگئی، یہاں تک کہ اسلام کا ذکر مکہ میں پھیل گیا اور اس کا چرچا کیا جانے لگا۔

قریش نے جب یہ دیکھا کہ اسلام کی رفتار دن بدن بڑھ رہی ہے تو ان کے سردار ولید بن مغیرہ کے مکان پر جمع ہوئے۔ انھوں نے یہ مشورہ کیا کہ حج کا موسم قریب آگیا ہے اور تمام عرب کے قبائل مکہ میں جمع ہوں گے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ محمد کی باتوں سے متاثر ہو جائیں۔ اس لیے ہمیں پہل کر کے آنے والے قبائل

سے کوئی ایسی بات کہدینی چاہیے کہ وہ محمد کی طرف سے بدگمان ہوجائیں اور ان کی طرف دھیان نہ دیں۔

اس سلسلہ میں مختلف سرداروں نے مختلف رائیں دیں۔ آخری مشورہ کے بعد یہ طے ہوا کہ عرب کے وفود جب حج کے موسم میں مکہ میں جمع ہوں تو تمام سرداران کے درمیان جائیں اور انھیں قومی تفریق پیدا کرنے والا بتاکر لوگوں کو ان سے دور رکھنے کی کوشش کریں۔

اس وقت مکہ میں اسلام بہت کمزور حالت میں تھا۔ ایسی حالت میں مکہ کے تمام سرداروں کا متفق ہوکر اسلام کے خلاف پروپیگنڈہ کرنا بظاہر ایک مایوس کن بات تھی۔ عرب کے قبائل پر مکہ کے سرداروں کا زبردست اثر تھا۔ اس لیے ان کا متفقہ طور پر اسلام کے خلاف کھڑا ہونا بظاہر یہ معنی رکھتا تھا کہ لوگ اسلام سے بدک جائیں اور اس کے پیغام کو سننے کے تیار نہ ہوں۔

مگر یہ واقعہ کا ایک پہلو تھا۔ اس کا دوسرا پہلو یہ تھا کہ اس طرح اسلام کی زبردست تشہیر ہوگئی۔ اتنے بڑے پیمانے پر لوگوں نے اسلام کو جان لیا جن کو بتانا اس وقت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے لیے ممکن نہ تھا۔ مکہ کے سردار اگرچہ اسلام کی مخالفت میں بولتے تھے۔ مگر انسان کی یہ نفسیات ہے کہ جس چیز کی مخالفت کی جائے اس کے بارے میں اس کے اندر تجسس (Curiosity) پیدا ہوتا ہے۔ وہ سنی ہوئی بات پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ مزید اس کے بارے میں جاننا چاہتا ہے۔ چنانچہ اسلام کو جاننے کے لیے ان کے اندر مزید اشتیاق بڑھ گیا۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم قدرتی طور پر سرداروں کی اس مخالفانہ مہم پر غم زدہ تھے۔ مگر قرآن نے اس واقعہ کے دوسرے پہلو کو لیا اور قرآن میں یہ آیت اتری :

وَرَفَعۡنَا لَكَ ذِكۡرَكَ (اور ہم نے تمہارے لیے تمہارا مذکور بلند کیا) قریش کی مہم ایک اعتبار سے مخالفانہ پروپیگنڈے کی مہم تھی۔ مگر دوسرے اعتبار سے وہ اسلام کا چرچا کرنے کی مہم تھی۔ قرآن نے دوسرے پہلو کو لیتے ہوئے بتایا کہ اس مہم کے تاریک پہلو میں ایک روشن پہلو چھپا ہوا ہے۔ جو چیز ایک پہلو سے مخالفانہ پروپیگنڈا ہے وہ دوسرے پہلو سے رفع ذکر ہے۔ تم اس دوسرے پہلو کو جانو اور اس کو استعمال کرو۔

اس طرح اس وقت کے مسلمانوں کو سوچ کی ایک مثبت لائن مل گئی۔ انھوں نے محسوس کیا کہ قریش کے پیدا کیے ہوئے تجسس کو وہ اسلام کی تبلیغ کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔ چنانچہ وہ پہلے سے زیادہ متحرک ہوگئے۔ جو لوگ قریش کے پروپیگنڈے کی وجہ سے اس سوال سے دوچار تھے کہ — "یہ نیا دین کیا ہے"

ان کو بتایا کہ اسلام کا اصل پیغام یہ ہے ۔ اس طرح اچانک اسلام کا رفیع ذکر ہو گیا ۔ مسلمانوں کی اپنی کوشش سے برسوں میں جتنا اسلام پھیلا تھا ، دشمنوں کی مخالفت کے بعد وہ اس سے کئی گنا زیادہ مقدار میں تھوڑے دنوں میں پھیل گیا ۔

تاخیر نعمت بن گئی

قدیم مکہ کے لوگوں نے اسلام کے خلاف جو تدبیریں کیں ان میں سے ایک تدبیر یہ تھی کہ انھوں نے اپنے دو خاص آدمی ، نضر بن حارث اور عقبہ بن ابی معیط مدینہ بھیجے ۔ وہ وہاں یہودی علماء سے ملے اور ان سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا حال بیان کیا ۔ انھوں نے کہا کہ تم لوگ اہل تورات ہو ۔ ہم تمہارے پاس آئے ہیں تاکہ تم ہمارے آدمی کے بارہ میں بتاؤ ۔ یہود نے کہا کہ تم لوگ ان سے چند چیزوں کی بابت سوال کرو ۔ اگر وہ ان کے بارہ میں بتادیں تو وہ واقعی خدا کے پیغمبر ہیں اور اگر وہ نہ بتا سکیں تو وہ صرف باتیں بنانے والے ہیں ۔

(فإنْ اخبركمْ بهنّ فهو نبيٌّ مرسل والاّ فرجل متقوِّل)

ان باتوں میں سے ایک سوال اس شخص کے بارے میں تھا جو مشرق سے لے کر مغرب تک پہونچا ۔ دوسرا سوال ان نوجوانوں کے بارے میں تھا جو غار میں جاکر سو گئے ۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان سوالات کو سنا تو فرمایا : اخبركم غداً عما سألتم عنه ۔ جن چیزوں کے بارے میں تم نے پوچھا ہے ان کے بارے میں تم کو میں کل بتاؤں گا ۔ روایات میں آتا ہے کہ آپ نے یہ فرمایا مگر ان شاء اللہ نہ کہا ۔ آپ کو خیال تھا کہ حضرت جبریل کل آئیں گے تو ان سے پوچھ کر بتا دوں گا ۔ مگر خلاف معمول حضرت جبریل کل کے دن نہ آئے ۔ حتی کہ پندرہ دن گزر گیے اور حضرت جبریل نہ آئے ۔

یہ بے حد نازک معاملہ تھا ۔ یہودی علماء نے جن شخصیتوں کی بابت سوال کیا تھا وہ اس وقت عام لوگوں کے لیے سراسر نامعلوم شخصیتیں تھیں ۔ ان کا ذکر صرف یہود کے بعض نوشتوں میں تھا ۔ چونکہ اس وقت تک پریس کا دور نہیں آیا تھا ، یہ نوشتے صرف بعض یہودی علماء کے پاس تھے ۔ عام لوگوں کو ان کی مطلق کوئی خبر نہ تھی ۔ چنانچہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو بھی ان کی بابت اس وقت کسی قسم کی کوئی اطلاع نہ تھی ۔

مکہ کے مشرکین ہر روز آپ سے پوچھتے ۔ اور آپ سوال کا جواب نہ دے پاتے ۔ اس طرح مکہ کے مخالفین کو موقع مل گیا کہ وہ آپ کا مذاق اڑائیں اور لوگوں سے کہیں کہ یہ سچے پیغمبر نہیں ہیں ۔ اگر وہ سچے پیغمبر ہوتے تو یقیناً خدا انھیں بتا دیتا اور وہ سوال کا جواب دیدیتے ۔

بظاہر یہ ایک ایسا واقعہ تھا جو اسلام کے خلاف تھا ۔ یہ اسلام کی صداقت کو مشتبہ کر رہا تھا ۔ مگر یہاں بھی "عسر" کے اندر ایک "یسر" چھپا ہوا تھا ۔ وحی کا رکنا اور مخالفین کا اس کو استعمال کرکے پروپیگنڈا کرنا اپنے اندر ایک روشن پہلو رکھتا تھا ۔ اس طرح یہ ہوا کہ سارے مکہ میں اسلام ایک سوالیہ نشان بن گیا ۔ ہر گھر میں اس کا چرچا پہونچ گیا ۔ پوری آبادی کے اندر سننے کی فضا پیدا ہوگئی ۔

پندرہ دن وحی رکنے کے بعد حضرت جبریل سورہ الکہف لے کر آئے جس میں مذکورہ سوالات کا تفصیلی جواب تھا ۔ عام حالت میں یہ سورہ اترتی تو اس کا اترنا لوگوں کو زیادہ قابلِ توجہ واقعہ نظر نہ آتا مگر اب وہ اتری تو سارا مکہ اس کو سننے کے لیے کان لگائے ہوئے تھا ۔ چنانچہ اس کے اترتے ہی وہ سارے مکہ میں پھیل گئی ۔ ہر آدمی اس کو جاننے کے لیے دوڑ پڑا کہ دیکھیں "محمد" نے ان سوالات کا کیا جواب دیا ہے ـــــ جو چیز بظاہر اسلام کے غیر موافق تھی وہ اسلام کے موافق بن گئی ۔

ہجرت سے تبلیغ

مشرکین مکہ کی مخالفت کے باوجود اسلام برابر پھیل رہا تھا ۔ مشرکین کی ہر تدبیر اسلام کی مزید اشاعت کا سبب بن رہی تھی ۔ اس کو دیکھ کر مکہ کے مشرکین اور زیادہ سخت ہوگیے ۔ انھوں نے مسلمانوں کے اوپر اپنی سختیاں تیز تر کر دیں ۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں سے کہا کہ وہ مکہ کو چھوڑ کر باہر چلے جائیں (تفرقوا فی الارض فان اللہ سیجمعکم) لوگوں نے پوچھا کہ کہاں جائیں تو آپ نے فرمایا کہ حبش چلے جاؤ ۔

حبش افریقہ کی طرف عرب کا ایک پڑوسی ملک ہے ۔ دونوں کے درمیان بحر احمر حائل ہے اس سمندر کی چوڑائی یمن کے پاس بہت کم ہو جاتی ہے ۔ چنانچہ قدیم زمانہ میں یہیں سے لوگ کشتیوں کے ذریعہ عرب سے حبش کا اور حبش سے عرب کا سفر کیا کرتے تھے ۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اس مشورہ کے بعد رجب ۵ھ میں ایک درجن آدمی مکہ کو چھوڑ کر حبش چلے گیے ۔ جلد ہی بعد دوسرا زیادہ بڑا قافلہ مکہ کو چھوڑ کر حبش گیا ۔ ابن ہشام کے مطابق ان کی تعداد

۸۹ تھی۔ اس طرح مجموعی طور پر تقریباً ایک سو مسلمان افریقہ کے ملک حبش پہونچ گیے۔

بظاہر یہ واقعہ پسپائی کا واقعہ تھا۔ مگر خدا کے فضل سے اس کے اندر اقدام کا پہلو نکل آیا۔

یہ لوگ جو مکہ سے حبش گیے تھے یہ کوئی اسٹیچو نہ تھے بلکہ اسلام کے زندہ مبلغ تھے۔ ان کا حبش جانا قدرتی طور پر اسلام کے مبلغین کا ایک براعظم سے دوسرے براعظم جانا بن گیا۔ ان کے حبش پہونچتے ہی سمندر پار کے اس ملک میں اسلام کا چرچا ہونے لگا۔ ان کی دعوتی اور اخلاقی تاثیر سے حبش کے لوگوں میں اسلام پھیلنے لگا۔ حتی کہ جب اس کا چرچا بڑھا تو خود شاہ حبش نجاشی نے ان لوگوں کو اپنے دربار میں بلایا۔ جو حبش کے قدیم شہر اکسوم پر واقع تھا۔

اس وقت حضرت جعفر نے مسلمانانِ حبشہ کی نمائندگی کی۔ انھوں نے اسلام کے تعارف پر ایک تقریر کی۔ جو لوگ کسی مقصد کے لیے ستائے جائیں اور پھر بھی اس سے نہ پھریں خواہ اس کی خاطر اپنا سب کچھ چھوڑ دینا پڑے۔ ایسے لوگوں کی آواز میں قدرتی طور پر سوز پیدا ہو جاتا ہے۔ ان کے الفاظ دل کی گہرائیوں سے نکلتے ہیں۔ چنانچہ حضرت جعفر نے جب بھرے دربار میں تقریر کی تو ہر طرف سناٹا چھا گیا۔ حتی کہ خود شاہ نجاشی رونے لگا۔ اس کی داڑھی آنسوؤں سے تر ہو گئی۔ حضرت جعفر بظاہر ستائے گیے تھے۔ مگر اسی ستانے کے واقعہ نے آپ کے کلام میں وہ زور اور تاثر پیدا کر دی جس نے بادشاہ کو اور اس کے تمام درباریوں کو تڑپا دیا۔

ہجرت حبشہ سے متعلق اس قسم کے بہت سے واقعات سیرت کی کتابوں میں آئے ہیں۔ اس طرح ایک بظاہر پسپائی کا واقعہ اقدام کا واقعہ بن گیا۔ اسلام کی دعوت ایشیا کے علاقہ سے نکل کر افریقہ کے علاقہ میں پہونچ گئی۔ اس کے بعد وہ افریقہ میں بڑھتی رہی۔ یہاں تک کہ افریقہ کا نصف سے زیادہ حصہ اسلام میں داخل ہو گیا۔ ایک مقامی دعوت عالمی دعوت میں تبدیل ہو گئی۔ اریٹریا کا علاقہ جو مسلم اکثریت کا علاقہ ہے، وہ اسی ہجرت حبشہ کے بعد وجود میں آیا۔

خاتمہ میں نیا آغاز

عسر میں یسر کے اسی امکان کی ایک مثال حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ ہے۔ آپ کا قصہ ابتداءً اسوء القصص معلوم ہوتا ہے۔ مگر قرآن کے الفاظ میں بالآخر وہ احسن القصص بن گیا۔ حضرت یوسف کے دشمنوں نے جہاں آپ کی تاریخ ختم کرنی چاہی تھی، وہیں آپ کے لیے ایک شاندار تاریخ

کے امکانات پیدا ہوگیے ۔

حضرت یوسف علیہ السلام کی زندگی میں یہ نئے امکانات کیسے پیدا ہوئے ۔ اس کی طرف قرآن میں ان لفظوں میں اشارہ ملتا ہے : وقال ادخلوا مصر (یوسف ۹۹) وجاء کم من البدو (یوسف ۱۰۰) اس آیت میں اشارہ ہے کہ حضرت یوسف اور ان کے خاندان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا ایک خاص احسان یہ تھا کہ وہ ان کو دیہات سے نکال کر مصر جیسے متمدن ملک میں لایا اور وہاں کی راجدھانی میں ان کے قیام کے اسباب پیدا کیے ۔

حضرت یوسف علیہ السلام فلسطین کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے ۔ عام حالات میں وہ اسی گاؤں میں پڑے رہتے ۔ ان کی اعلیٰ صلاحیتیں گاؤں کے حالات میں اپنے ظہور کا راستہ نہ پاتیں ۔ مگر اس کے بعد یہ ہوا کہ نوجوانی کی عمر میں آپ کے سوتیلے بھائیوں کو آپ سے ضد ہوگئی ۔ ان کی ضد یہاں تک پہونچی کہ وہ ایک روز آپ کو دور جنگل میں لے گیے اور آپ کو ایک اندھے کنویں میں ڈال دیا ۔

بظاہر یہ ایک زبردست ناکامی کا واقعہ تھا ۔ مگر اس ڈِس ایڈوانیج میں ان کے لیے ایک ایڈوانیج نکل آیا ۔ وہ ایک تجارتی قافلہ کے ہاتھ لگ گیے جو مصر کی راجدھانی کی طرف تجارت کے لیے جارہا تھا ۔ آپ کی پرکشش شخصیت کو دیکھ کر ان تاجروں کو دلچسپی ہوئی ۔ کیوں کہ انھیں امید ہوئی کہ وہ آپ کو مصر کے بازار میں فروخت کر کے کچھ رقم حاصل کر سکتے ہیں ۔ چنانچہ انھوں نے حضرت یوسف کو اپنے قافلہ میں شامل کر لیا اور ان کو لے جاکر مصر کی راجدھانی میں ایک سرکاری افسر کے ہاتھ فروخت کر دیا ۔

حضرت یوسف کا کنویں میں ڈالا جانا بظاہر ایک ناپسندیدہ واقعہ تھا ۔ مگر اسی ناپسندیدہ واقعہ کے اندر سے یہ امکان نکل آیا کہ وہ معمولی دیہات سے نکل کر ترقی یافتہ شہر میں پہونچیں ۔ اور اس طرح ان کی صلاحیتوں کے استعمال کے لیے زیادہ وسیع میدان حاصل ہو ۔ چنانچہ یہی ہوا ۔ اپنے گاؤں میں وہ صرف بکریاں چرایا کرتے تھے ۔ مگر مصر میں آخر کار وہ ملک کے اقتدار تک پہونچا دئے گیے ۔

حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ بتاتا ہے کہ اس دنیا میں اسود القصص بھی احسن القصص بن سکتا ہے ۔ بشرطیکہ آدمی تقویٰ اور صبر کا ثبوت دے ۔ تقویٰ آدمی کو سنجیدہ بناتا ہے ۔ اور صبر سے

آدمی کے اندر انتظار کی طاقت پیدا ہوتی ہے۔ اور یہی دونوں چیزیں زندگی میں فیصلہ کن حیثیت رکھتی ہیں۔ سنجیدگی آدمی کو حقیقی اور درست رائے قائم کرنے میں مدد دیتی ہے اور انتظار کی طاقت آدمی کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ بے فائدہ قسم کے عاجلانہ اقدام سے بچتا رہے۔ یہاں تک کہ وہ محفوظ طور پر اپنی منزل تک پہونچ جائے۔

مثبت شعور کی ضرورت

یہ ایک حقیقت ہے کہ ہر ناموافق صورت حال میں ایک موافق امکان چھپا ہوا ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسا کلیہ ہے جس میں کوئی استثنار نہیں۔ خدا کی اس دنیا میں ایسا ہونا ممکن نہیں کہ آدمی کو صرف ناموافق حالات گھیرے ہوئے ہوں۔ اور کوئی موافق امکان اس کے لیے سرے سے موجود نہ ہو۔

مگر اس موافق پہلو کو پانے اور اس کو استعمال کرنے کے لیے مثبت شعور کی ضرورت ہے۔ جب آدمی کسی ناموافق صورت حال میں گھر جائے تو عام طور پر وہ اس سے اتنا متاثر ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے قریبی حالات سے اوپر اٹھ کر سوچ نہیں پاتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ناموافق حالات بیشتر آدمیوں کو صرف ایک ہی تحفہ دیتے ہیں اور وہ ہے ردعمل میں مبتلا ہو جانا۔ جب آدمی ردعمل کی نفسیات میں مبتلا ہو جائے تو وہ اپنے حالات سے صرف مایوسی اور نفرت کی غذا لے گا۔ وہ اس سے کبھی مثبت فکر کی غذا نہیں لے سکتا۔

ناموافق حالات میں چھپے ہوئے موافق امکان کو جاننے اور اس کو استعمال کرنے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی قریبی حالات سے الگ ہو کر سوچ سکے۔ وہ اپنے آپ کو فکری اعتبار سے اس مقام پر لے جائے جہاں وہ غیر متاثر ذہن کے ساتھ رائے قائم کرنے کی پوزیشن میں ہو۔

آدمی ہر تاریکی میں روشنی پا سکتا ہے۔ وہ ہر ناموافق صورت حال میں اپنے لیے ایک موافق پہلو ڈھونڈ سکتا ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو حقیقت پسند بنائے۔ وہ جھنجلاہٹ کی نفسیات سے دور رہے۔ وہ دشمن کو بھی غیر دشمن کی نظر سے دیکھے۔ وہ اپنے آپ سے الگ ہو کر اپنے آپ کو پڑھ سکے۔ اسی کا نام مثبت طرز فکر ہے اور اس دنیا میں بلاشبہ مثبت طرز فکر ہی کے اندر تمام کامیابیوں اور ترقیوں کا راز چھپا ہوا ہے۔

روزہ

غالباً ۱۹۴۲ کی بات ہے۔ گورکھپور میں ایک بڑے مسلم افسر رہا کرتے تھے۔ رمضان کے مہینے میں کچھ روز کے لئے ان کے یہاں ٹھہرنے کا اتفاق ہوا۔ ان کے بنگلہ کے سامنے ایک علیحدہ بیٹھک بنی ہوئی تھی۔ میں نے دیکھا کہ روزانہ صبح کو ایک "حافظ صاحب" قرآن بغل میں لئے ہوئے آتے ہیں۔ کچھ دیر بیٹھ کر تلاوت کرتے ہیں، پھر واپس چلے جاتے ہیں۔

"یہ کون صاحب ہیں جو روزانہ صبح کو یہاں آتے ہیں"؟ کئی روز تک یہ منظر دیکھنے کے بعد میں نے صاحب خانہ سے پوچھا۔ میرا سوال سن کر پہلے وہ ہنسے۔ اس کے بعد جواب دیا: "بات یہ ہے کہ میں روزہ نہیں رکھ پاتا۔ اس لئے میں نے حافظ صاحب کو مقرر کر دیا ہے کہ وہ رمضان کے پورے مہینے میں میرے یہاں آکر قرآن پاک کی تلاوت کر دیا کریں۔ مہینہ کے ختم پر ان کی کچھ خدمت کر دوں گا"

یہ ایک "بے روزہ دار" کا قصہ تھا۔ اب روزہ داروں کو دیکھئے۔ ایک بار میں نے اذان کی آواز آنے سے پہلے گھڑی دیکھ کر افطار کر لیا۔ کئی لوگ سنجیدگی سے اس شبہ میں پڑ گئے کہ میرا روزہ نہیں ہوا۔ آج کل کے روزہ داروں کا حال یہ ہے کہ وہ اس کا سخت اہتمام کریں گے کہ طلوع سحر سے کچھ منٹ پہلے کھانا پینا بند کر دیں اور غروب آفتاب کے کچھ منٹ بعد افطار شروع کریں۔ اس کا نام انھوں نے "احتیاط" رکھا ہے۔ ایک طرف اوقات روزہ میں احتیاط کا یہ عالم کہ سحری میں تعجیل اور افطار میں تاخیر کی حد تک اس کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ صریح طور پر سنت کے خلاف ہے۔ کیونکہ حدیث میں آیا ہے کہ میری امت اس وقت تک خیر پر رہے گی جب تک وہ افطار میں تعجیل (جلدی) کرتی رہے گی۔ دوسری طرف مقاصد روزہ میں بے احتیاطی کا یہ حال ہے کہ وہ اس کو ضروری نہیں سمجھتے کہ روزہ رکھ کر کسی کی برائی نہ کریں، کسی سے جھگڑا نہ کریں، منھ سے جھوٹ بات نہ نکالیں۔ حالانکہ حدیث میں آیا ہے کہ ایک شخص روزہ رکھ کر جھوٹ بات کرے تو اس کا روزہ روزہ نہیں۔ اسی طرح دوسری حدیث میں ہے کہ کوئی روزہ دار کسی مسلمان کی غیبت کرے تو گویا اس نے خدا کی حلال کی ہوئی چیز سے روزہ رکھا اور اس کی حرام کی ہوئی چیز سے افطار کر لیا۔

یہ دونوں واقعات بظاہر ایک دوسرے سے الگ الگ ہیں۔ ایک جگہ روزہ داری ہے، دوسری جگہ بے روزہ داری۔ لیکن گہرائی کے ساتھ دیکھئے تو دونوں کی شعوری سطح ایک نظر آئے گی۔ دونوں عبادت یا روزہ کو ایک قسم کا رسمی عمل سمجھ رہے ہیں نہ کہ ایک ایسا عمل جو انسان کی اندرونی گہرائیوں سے نکلتا ہے، جو اس کے پورے وجود کا نمائندہ ہوتا ہے۔

عبادت کا ایک مطلب یہ ہے کہ وہ ایک زندہ عمل ہو۔ دوسرا یہ کہ وہ محض ایک رسم ہو۔ زندہ عمل آدمی کے پورے وجود سے نکلتا ہے۔ وہ اس کی مکمل ہستی کا ایک اظہار ہوتا ہے۔ اس کے برعکس رسم کی حیثیت محض ایک بے روح خارجی عمل کی ہوتی ہے۔ آدمی قلب و روح کو اس میں شامل کئے بغیر اوپری طور پر اسے انجام دے دیتا ہے۔ مثال کے طور پر تنہائیوں میں اللہ کو یاد کر کے رونا ایک عبادت ہے جب کہ اپنے دنیوی دھندوں میں مشغول رہتے ہوئے تسبیح کے دانوں پر "اللہ اللہ" شمار کرنا محض ایک رسم ہے۔ تنہائی میں مومن کی آنکھ سے جو آنسو نکلتے ہیں وہ اس کی پوری ہستی کا نچوڑ ہوتے ہیں۔ جب کہ لفظ "اللہ" کو شمار کرنے والا صرف یہ کرتا ہے کہ پلاسٹک کے دانوں کو مقررہ تعداد میں دھاگے میں پرو لیتا ہے اور اپنے مشاغل میں مصروف رہتے ہوئے محض انگلیوں کی حرکت کے ذریعہ بس ان کو گنتا رہتا ہے۔ زندہ عمل میں آدمی اور اس کے عمل کے درمیان گہرا نفسیاتی ربط ہوتا ہے جب کہ رسم میں دونوں کے درمیان اس قسم کا کوئی ربط نہیں ہوتا۔

موجودہ زمانہ میں روزہ کی حیثیت ایک قسم کی سالانہ رسم کی ہوگئی ہے۔ لوگوں کی اصل زندگی بدستور اپنے ڈھرے پر چلتی رہتی ہے۔ روزہ کا زمانہ آتا ہے تو وہ بس ہجری کیلنڈر کے نویں ماہ میں داخل ہوتا ہے۔ لوگوں کی زندگیوں میں داخل نہیں ہوتا۔ روزہ رکھ کر نہ لوگوں کے دل نرم پڑتے۔ نہ ان کے اندر عجز پیدا ہوتا، نہ جائز اور ناجائز کے معاملہ میں ان کی قوت حساسیت میں کوئی اضافہ ہوتا۔ ان کے نزدیک روزہ کے معنی صرف یہ ہیں کہ ایک خاص وقت سے خاص وقت تک کھانا پینا بند رکھا جائے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے اس طرح بھوکے رہنے سے خدا خوش ہو جائے گا ——— ایسی حالت میں ایک بے روزہ دار کیوں نہ سوچے کہ جب خدا کو خوش کرنے کے لئے کچھ رسم ہی ادا کرنی ہے تو جیسا روزہ کی رسم ویسا تلاوت کی رسم ——— ایک رسم نہ کی، دوسری رسم کرلی۔ خدا جیسے اس رسم سے خوش ہوتا ہے، اسی طرح وہ دوسری رسم سے بھی خوش ہو جائے گا۔

اصل یہ ہے کہ روزہ محض ایک خارجی رسم نہیں۔ بلکہ وہ ایک باطنی عمل ہے۔ وہ مومن کی نفسیاتی حالت کا ایک جسمانی اظہار ہے۔ مومن کا مطلب ہے ایک ایسا شخص جو دنیا کی زندگی میں برائیوں سے بچ کر رہے۔ "جو کرنے اور نہ کرنے" کے بارے میں خدا کی مقرر کی ہوئی حدوں کی پابندی کرے۔ روزہ اسی قسم کی پابند زندگی کی مشق ہے۔ روزہ میں کھانا پینا چھڑانے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کو روزمرہ زندگی میں "یہ کرو اور وہ نہ کرو" کے ایک لازمی کورس سے گزار کر اس کو سبق دیا جائے کہ اسی طرح تم کو پوری زندگی گزارنی ہے۔ اسی طرح ساری عمر کے لئے تم کو "روزہ دار" بن جانا ہے جب کہ تم خود اپنے ارادہ سے ایک طرح کی زندگی کو چھوڑ دو اور دوسری طرح کی زندگی کو بالقصد اختیار کرلو۔ روزہ کے مہینے کی پابند زندگی دراصل پورے سال اور ساری عمر کے لئے پابند زندگی کی ایک علامت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بندہ اپنے سارے معاملات میں "روزہ داری" کے اسی طریقے پر عمل کرے جو اس نے رمضان کے مہینے میں کھانے پینے کے معاملہ میں کیا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو حدیث کے الفاظ میں "اللہ کو اس کی حاجت نہیں کہ کوئی شخص محض اپنا کھانا پینا چھوڑ دے۔"

اگر روزہ دار لوگ اپنے عمل سے حقیقی روزہ داری کا نمونہ پیش کریں تو غیر روزہ داروں کو ہمت ہی نہیں پڑے گی کہ وہ سوچیں کہ اپنے روزہ کی تلافی کے لئے کسی حافظ صاحب کی خدمات بالمعاوضہ حاصل کی جاسکتی ہیں۔ اس کے بعد انھیں یہ عمل بالکل مضحکہ خیز دکھائی دے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ روزہ کی یہ بے قدری روزہ داروں نے پیدا کی ہے نہ کہ بے روزہ داروں نے۔ بے روزہ دار تو اسی کو روزہ سمجھیں گے جس کا نمونہ روزہ دار دکھا رہے ہوں۔

خاتونِ اسلام (نیا ایڈیشن)

خاتونِ اسلام کا پہلا ایڈیشن غیر معمولی طور پر مقبول ہوا اور بہت جلد ختم ہوگیا۔ اب اس کا دوسرا ایڈیشن چھپ کر تیار ہے۔ دوسرے ایڈیشن میں تقریباً ۰۰ صفحات کا اضافہ کیا گیا ہے۔ مزید معلومات کے لیے دفتر سے رابطہ قائم فرمائیں۔ منیجر مکتبہ الرسالہ

۱۔ سان فرانسسکو کی پیسفک نیوز اینڈ سروس (Pacific News and Services) کے نمائندہ مسٹر کروبر (A.R. Kroeber) نے "اسلام اور ہندستانی مسلمان" کے مسئلہ پر صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ یہ انٹرویو اسلامی مرکز میں ۲۲ فروری ۱۹۸۸ کو ریکارڈ کیا گیا۔ اس انٹرویو کا خلاصہ الرسالہ انگریزی میں انشاءاللہ شائع کر دیا جائے گا۔

۲۔ حقیقت کی تلاش نامی کتاب کا ہندی ترجمہ چھپ کر آگیا ہے۔ اس کا ہندی نام "سچائی کی تلاش" ہے اس کی زبان بالکل سادہ اور عام فہم رکھی گئی ہے تاکہ ہر آدمی اس کو سمجھ سکے۔ شائقین حضرات اس سلسلہ میں دفتر سے رابطہ قائم کریں۔

۳۔ پاکستان کے ایک کثیر الاشاعت اخبار نے یہ سلسلہ شروع کیا ہے کہ وہ ہر روز اسلامی مرکز کی کتاب "اللہ اکبر" کے ایک صفحہ کا مضمون نمایاں طور پر شائع کرتا ہے اس کیلئے اس نے ایک خصوصی بلاک بنوایا ہے جس کا نمونہ یہاں درج کیا جارہا ہے۔



۴۔ نئی دہلی کے ایک مشترک اجتماع (۱۱ فروری ۱۹۸۸) میں صدر اسلامی مرکز نے اسلام کے تصور آخرت پر تقریر کی۔ انھوں نے بتایا کہ اسلامی نقطۂ نظر سے انسانی زندگی کے دو حصّے ہیں۔ بہت چھوٹا حصہ موجودہ دنیا میں ہے اور زیادہ بڑا حصہ موت کے بعد آنے والی دنیا میں۔ موجودہ زندگی اگلی طویل تر زندگی کی تعمیر کا ابتدائی مرحلہ ہے۔

۵۔ دہلی کے ایک ہندو بزرگ جو الرسالہ پابندی کے ساتھ پڑھتے ہیں، انھوں نے "حیات طیبہ" کے ۵۰ نسخے خرید کر اپنے حلقہ کے درمیان تقسیم کئے۔ حیاتِ طیبہ قرآن کی منتخب آیتوں کا مجموعہ ہے جو اردو اور انگریزی میں مرکز سے شائع کیا گیا ہے۔

۶۔ نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا نے کتابوں کی قومی نمائش (National Exhibit) کا اہتمام کیا ہے۔ اس کے تحت ملک میں چھپنے والی مختلف زبانوں کی کتابوں میں سے ۲۰۰۰ ممتاز کتابوں (Outstanding Books) کا انتخاب کیا گیا۔ یہ منتخب کتابیں مذکورہ مرکزی ادارہ کے تحت دہلی کی عالمی نمائش (فروری ۱۹۸۸) میں رکھی گئیں اور اس کے بعد ملک کے مختلف حصوں میں ان کی نمائش کا انتظام کیا گیا۔ اس قومی نمائش کے لئے اسلامی مرکز کی متعدد انگریزی اور اردو کتابوں کا انتخاب کیا گیا ہے ان کتابوں کا ذکر نیشنل بک ٹرسٹ مطبوعہ کیٹلاگ میں حسب ذیل صفحات پر موجود ہے: ۳۳، ۵۱، ۱۵۰، ۱۷۰، ۱۷۲۔

۷۔ ایک صاحب اپنے خط (۱۹ فروری ۱۹۸۸) میں لکھتے ہیں: میرے ایک دوست نے الرسالہ کی بہت تعریف کی۔ پڑھا تو واقعی اس کے تمام مضامین پسند آئے۔ الرسالہ کا ایک ایک پرچہ ایک بیش بہا خزانہ کے مشابہ ہے۔ اس لئے میں تو الرسالہ کو ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالتا ہوں۔ اور جس وقت الرسالہ میرے ہاتھوں میں ہوتا ہے تو میں گردوپیش سے بے خبر اس میں کھو جاتا ہوں۔ اس کو پڑھتے وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم اندھیرے سے اجالے میں آگئے۔ سطحیت سے سوچنے کے بجائے گہرائی سے سوچنے کی طرف منتقل ہو گئے۔ ایک صفحہ پڑھتے وقت یہ محسوس ہوتا ہے کہ کب یہ پورا ہو جائے اور دوسرے صفحہ پر ہم کوئی دوسرا پیغام پڑھیں مجھے افسوس ہے کہ پہلے میں ایک عرصہ تک الرسالہ کے بارے میں کیوں تعصب کا شکار رہا (ابرار احمد رفعت، سورت)

۸۔ اسلامی مرکز ۱۹۷۰ میں قائم ہوا۔ اس وقت سے اب تک وہ دعوتی اور تعمیری سرگرمیوں میں مسلسل مشغول ہے۔ اسلامی مرکز کی تعمیری مہم کو مؤثر طور پر جاری رکھنے کے لئے آپ کے مالی تعاون کی شدید ضرورت ہے۔ اسی طرح انگریزی الرسالہ کے خسارہ کی تلافی بہت ضروری ہے۔ امید کہ ہمارے ہمدرد اس پہلو پر توجہ فرمائیں گے۔ رقم روانہ کرتے ہوئے مد کی صراحت ضرور فرما دیں۔

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴۔ صاحب استطاعت افراد کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کردیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط و کتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

زرِ تعاون الرسالہ

زرِ تعاون سالانہ	۴۸ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	۲۵۰ روپیہ
بیرونی ممالک سے	
ہوائی ڈاک	۲۰ ڈالر امریکی
بحری ڈاک	۱۰ ڈالر امریکی

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے جے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی۔۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

تذکیر القرآن

جلد اول : سورۃ فاتحہ۔ سورۃ بنی اسرائیل

جلد دوم : سورۃ الکہف۔ سورۃ الناس

قرآن کی بے شمار تفسیریں ہر زبان میں لکھی گئی ہیں۔ مگر تذکیر القرآن اپنی نوعیت کی پہلی تفسیر ہے۔ تذکیر القرآن میں قرآن کے اساسی مضمون اور اس کے بنیادی مقصد کو مرکز توجہ بنایا گیا ہے۔ جزئی مسائل اور معلوماتی تفصیلات کو چھوڑتے ہوئے اس میں قرآن کے اصل پیغام کو کھولا گیا ہے اور عصری اسلوب میں اس کے دعوتی اور تذکیری پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے۔ تذکیر القرآن عوام و خواص دونوں کے لیے یکساں طور پر مفید ہے۔ وہ طالبینِ قرآن کے لیے فہم قرآن کی کنجی ہے۔

ہدیہ جلد اول ۱۰۰ روپیہ

جلد دوم ۱۰۰ روپیہ

مکتبہ الرسالہ، نئی دہلی

	Rs
تذکیر القرآن جلد اول	100/-
" " جلد دوم	100/-
اللہ اکبر	40/-
پیغمبر انقلاب	30/-
مذہب اور جدید چیلنج	35/-
عظمت قرآن	25/-
الاسلام	25/-
ظہور اسلام	25/-
اسلامی زندگی	20/-
احیاء اسلام	20/-
راز حیات (مجلد)	45/-
صراط مستقیم	25/-
خاتون اسلام	35/-
سوشلزم اور اسلام	25/-
اسلام اور عصر حاضر	20/-
حقیقت حج	25/-
اسلامی تعلیمات	20/-
تبلیغی تحریک	15/-
تعبیر کی غلطی	35/-
دین کی سیاسی تعبیر	10/-

دین کیا ہے	3/-
قرآن کا مطلوب انسان	6/-
تجدید دین	4/-
اسلام دین فطرت	4/-
تعمیر ملت	4/-
تاریخ کا سبق	4/-
مذہب اور سائنس	8/-
عقلیات اسلام	4/-
فسادات کا مسئلہ	3/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	3/-
تعارف اسلام	4/-
اسلام پندرھویں صدی میں	4/-
راہیں بند نہیں	4/-
ایمانی طاقت	4/-
اتحاد ملت	4/-
سبق آموز واقعات	4/-
زلزلۂ قیامت	6/-
حقیقت کی تلاش	4/-
پیغمبر اسلام	4/-
آخری سفر	4/-

اسلامی دعوت	4/-
خدا اور انسان	4/-
حل یہاں ہے	6/-
سچا راستہ	2/-
دینی تعلیم	4/-
حیات طیبہ	4/-
باغ جنت	4/-
نار جہنم	4/-
میوات کا سفر	25/-

God Arises	Rs. 45/-
Muhammad The Prophet of Revolution	50/-
Religion and Science	25/-
Tabligh Movement	20/-
The Way to Find God	4/-
The Teachings of Islam	5/-
The Good Life	5/-
The Garden of Paradise	5/-
The Fire of Hell	5/-
Muhammad The Ideal Character	4/-
Man Know Thyself !	4/-
इंसान अपने आपको पहचान	2/-
सच्चाई की तलाश	4/-

30 MAY 1988

الرسالہ

ISSN 0970-180X

زیر سرپرستی
مولانا وحیدالدین خان
صدر اسلامی مرکز

منفی نفسیات میں جینے والا انسان تاریخ کا معمول ہوتا ہے
اور ایجابی نفسیات میں جینے والا انسان تاریخ کا عامل

جون ۱۹۸۸ شمارہ ۱۳۹

God Arises

By Maulana Wahiduddin Khan

This is the translation with some additions of *Mazhab Aur Jadeed Challenge,* translated into Arabic as *Al-Islam Yatahaddah,* which became a best-seller throughout the Arab world. It has also been translated into a number of other languages including Turkish, Malay, Serbo-Croatian (Yugoslavian), Sindhi, etc., and has come to be accepted as a standard work on the Islamic position vis-à-vis modern thought.

"... *in the fourteen hundred years of Islamic history, innumerable books on Islam have appeared. There are just a few books calling mankind to God which are clearly distinguishable from the rest because of the clarity and force with which they make their appeal. Without doubt, this book is one of that kind".*

— *Daily AL-AHRAM (Cairo)*

Pages 265 ISBN 81-85063-14-1 (Pbk) Price Rs. 45
81-85063-17-6 (Hbd)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اردو، انگریزی میں شائع ہونے والا

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

شمارہ ۱۳۹ جون ۱۹۸۸

ماہنامہ الرسالہ، سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳، فون: 697333, 611128

تنقید اور عملی کارروائی

ایک صاحب نے کہا کہ آپ دوسروں پر تنقید کرتے ہیں۔ اس سے امت میں تفریق پیدا ہوتی ہے۔ حالاں کہ آپ خود لکھ چکے ہیں کہ حضرت موسیٰ کی غیر موجودگی میں جب بنی اسرائیل بچھڑے کو پوجنے لگے تو حضرت ہارون نے خاموشی اختیار کرلی۔ تذکیر القرآن میں آپ نے لکھا ہے کہ بہت سے مواقع پر دین کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ باہمی لڑائی سے بچنے کے لیے خاموشی کا طریقہ اختیار کرلیا جائے، حتیٰ کہ شرک جیسے معاملہ میں بھی (حصہ دوم صفحہ ۸۷)

میں نے کہا کہ آپ نے میری بات کو غلط صورت میں نقل کیا۔ میں نے جو بات لکھی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت ہارون نے بنی اسرائیل کی گمراہی پر لسانی اظہار تو پوری طرح کیا، مگر جب وہ اصلاح قبول کرنے پر راضی نہ ہوئے تو ان کے خلاف عملی کارروائی نہیں کی۔ گویا فکری تنقید تو ہر حال میں ضروری ہے۔ البتہ عملی اقدام حالات کے لحاظ سے کیا جائے گا۔ متعلقہ آیات کے سلسلہ میں یہاں صفوۃ التفاسیر (محمد علی الصابونی) سے دو حوالے نقل کیے جاتے ہیں:

(قال ابنَ امّ ان القوم استضعفونی وکادوا یقتلوننی) ای ان القوم استذلونی وقهرونی وقاربوا قتلی حین نهیتهم عن ذالك فانا لم اقصّر فی نصحهم
(المجلد الاول، صفحہ ۴۷۳)

"ہارون نے کہا کہ اے میری ماں کے بیٹے، قوم نے مجھ کو دبالیا اور قریب تھا کہ مجھ کو مار ڈالیں" یعنی قوم نے مجھ کو کمزور سمجھا اور مجھ پر غالب آگئی اور میرے قتل کے قریب ہوگئی جب کہ میں نے ان کو اس سے روکا۔ پس میں نے نصیحت میں کوتاہی نہیں کی۔

(انی خشیت ان تقول فرقت بین بنی اسرائیل) ای انی خفت ان زجرتهم بالقوة ان یقع قتال بینهم
المجلد الثانی، صفحہ ۲۴۵

"مجھے ڈر تھا کہ تم کہوگے کہ تم نے بنی اسرائیل کے درمیان پھوٹ ڈال دی" یعنی مجھے اندیشہ ہوا کہ اگر میں انھیں طاقت سے روکوں تو ان کے درمیان جنگ برپا ہو جائے گی

تفریق امت سے بچنا ضروری ہے، مگر اس کا اعتبار عملی احتساب میں کیا جائے گا نہ کہ نظری احتساب میں۔

یہ حاملینِ اسلام

صلح حدیبیہ کا واقعہ ۶ھ میں پیش آیا۔ اسی سال کے آخر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اطرافِ عرب کے حاکموں اور بادشاہوں کو دعوتی خطوط روانہ کیے۔ انھیں میں سے ایک خط وہ تھا جو دحیہ کلبی کے ذریعہ شاہِ روم ہرقل (Heraclius) کے نام بھیجا گیا۔ یہ مسیحی تھا اور نہایت ذہین اور حقیقت پسند آدمی تھا ہرقل اُس وقت فلسطین میں تھا۔ اس زمانہ میں عرب کے لوگ تجارت کی غرض سے اس علاقہ میں جایا کرتے تھے۔ چنانچہ ہرقل نے تحقیق حال کے لیے کچھ عربوں کو بلوایا جن میں ابوسفیان بن حرب بھی شامل تھے۔ ہرقل نے ترجمان کے ذریعہ ان سے گفتگو کی۔ ایک روایت کے مطابق، گفتگو کا ایک حصہ یہ تھا:

قال اخبرنی یا اباسفیان۔ فقال ھو ساحر کذاب ولیس بنبی۔ فقال ھرقل انی لا ارید شتمہ ولکن کیف نسبہ فیکم ... کیف عقلہ ورأیہ

(سیرۃ ابن کثیر، المجلد الثالث، صفحہ ۵۰۳)

ہرقل نے کہا کہ اے ابوسفیان مجھے محمد کے بارے میں بتاؤ۔ ابوسفیان نے کہا کہ وہ جادوگر اور جھوٹے ہیں، وہ پیغمبر نہیں۔ ہرقل نے کہا میں تم سے ان کی سب وشتم سننا نہیں چاہتا۔ بلکہ مجھے یہ بتاؤ کہ ان کا حسب نسب کیا ہے، ان کی سمجھ کیسی ہے اور ان کی رائے کیسی ہے۔

ہرقل ایک "کافر" تھا۔ وہ کافر ہی رہا اور کافر ہی مرا۔ مگر اُس کو اِس سے دلچسپی نہیں تھی کہ کوئی شخص اُس کے حریف کے بارہ میں برے الفاظ بولے اور وہ اس کو سن کر خوش ہو۔ بلکہ اُس کی دلچسپی اس میں تھی کہ وہ جانے کہ جو شخص اس کا حریف بن کر ابھرا ہے، وہ خاندانی شرافت اور ذہنی صلاحیت کے اعتبار سے کیسا ہے، وہ صاحب رائے ہے یا نہیں۔ وغیرہ۔

اس کے مقابلہ میں موجودہ حاملین اسلام کو دیکھئے۔ ان کا حال یہ ہے کہ وہ اپنے حریف کے خلاف کوئی بھی لغویات سننے کے لیے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ کوئی کمینہ آدمی اگر ان کے مفروضہ حریف کے خلاف جھوٹے مضامین شائع کرے تو اس کو روکنا تو درکنار، وہ اس کو لطف لے کر پڑھیں گے اور ان کے معتقدین اُس کو ہر طرف پھیلائیں گے ـــــ کیسے عجیب ہیں وہ حاملینِ اسلام جو حاملینِ کفر کے اخلاقی معیار پر بھی پورے نہ اتریں۔

حد کو پار نہ کیجئے

نیتین والیا ایک ۳ سالہ بچہ ہے۔ وہ اپنے والدین (وجے پال والیا اور سونیتا) کے ساتھ شاہدرہ میں رہتا ہے۔ بچہ کو چڑیا گھر دیکھنے کا شوق تھا۔ اس کے والدین اس کو دہلی کا چڑیا گھر دکھانے کے لیے لے گیے۔ مختلف جانوروں کو دیکھتے ہوئے یہ لوگ وہاں پہونچے جہاں سفید شیر کا پنجرہ ہے۔ وہ شیر اور اس کے بچے کو دیکھنے کے لیے رکے۔ یہاں نیتین ریلنگ کے اندر داخل ہوگیا اور پنجرہ میں اپنا ہاتھ ڈال دیا۔ شیرنی (نیما) نے جھپٹ کر اس کا ہاتھ اپنے منھ میں لے لیا۔ لوگوں نے اس کو لکڑی سے مار کر ہٹایا، مگر اس دوران وہ بچے کا ہاتھ کندھے تک چبا چکی تھی۔ آپریشن کے بعد بچہ زندہ ہے مگر وہ ساری عمر کے لیے اپنے دائیں ہاتھ سے محروم ہو چکا ہے۔

ٹائمس آف انڈیا (۲۱ مارچ ۱۹۸۸) کے رپورٹر کے مطابق، بچہ کے والدین نے اس حادثہ کی ذمہ داری چڑیا گھر کے کارکنوں پر ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ اس وقت پنجرہ کے پاس کوئی چوکیدار موجود نہ تھا:

The parents claim that there were gaurds around.

اکثر لوگوں کا یہ حال ہے کہ جب ان کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آتا ہے تو وہ فوراً اپنے سے باہر کسی کو تلاش کرتے ہیں جس پر حادثہ کی ذمہ داری ڈال سکیں۔ مگر موجودہ دنیا میں اس قسم کی کوشش سراسر بے فائدہ ہے۔ یہاں حادثات سے صرف وہ شخص بچ سکتا ہے جو اپنے آپ کو قابو میں رکھے۔ جو شخص خود بے قابو ہو جائے وہ لازماً حادثہ سے دوچار ہوگا، خواہ دوسروں کو ذمہ دار ٹھہرانے کے لیے اس نے ڈکشنری کے تمام الفاظ دہرا ڈالے ہوں۔

چڑیا گھر میں خونخوار جانور کے کٹہرے سے چار فٹ کے فاصلہ پر ریلنگ (Railing) لگی ہوئی ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ جانور کے مقابلہ میں آدمی کو ایک محفوظ فاصلہ پر رکھا جائے۔ اسی طرح زندگی کے ہر موڑ پر ایک ریلنگ کھڑی ہوتی ہے۔ جو شخص ریلنگ کو حد سمجھ کر وہاں ٹھہر جائے وہ محفوظ رہے گا۔ اور جو شخص ریلنگ کو پار کر جائے، وہ اپنے آپ کو حادثات سے نہیں بچا سکتا، نہ چڑیا گھر کے اندر اور نہ چڑیا گھر کے باہر۔

جوش بغیر ہوش

میکی ٹامسن (Mickey Thompson) امریکہ میں پیدا ہوا۔ اس نے کار کی ریس میں عالمی شہرت حاصل کی۔ حتی کہ وہ شاہ رفتار (Speed King) کہا جانے لگا۔ مگر مارچ ۱۹۸۸ میں اس کو گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ بوقت وفات اس کی عمر ۵۹ سال تھی۔ میکی ٹامسن بے حد جرأت مند آدمی تھا۔ نومبر ۱۹۸۷ میں اس نے اپنے دوستوں کو لاس اینجلیز میں بتایا تھا کہ کچھ بے ہودہ لوگ اس کو ٹیلی فون پر مار ڈالنے کی دھمکی دے رہے ہیں۔ اس کے دوست ارنی الوراڈو (Ernie Alvarado) نے کہا کہ میکی نے مجھ کو بتایا تھا کہ وہ جانتا ہے کہ کون شخص اس کو قتل کرنا چاہتا ہے۔ دوست نے پوچھا کہ کیا تم نے اس کی اطلاع پولیس کو کی ہے۔ میکی نے جواب دیا: اس کی کوئی ضرورت نہیں۔

مگر میکی غلطی پر تھا۔ شروع مارچ ۱۹۸۸ کی ایک صبح کو اپنی ۴۱ سالہ بیوی ٹروڈی (Trudy) کے ساتھ وہ بریڈبری (کیلی فورنیا) میں گھر سے اپنے آفس کے لیے جا رہا تھا کہ دو آدمی بائیسکل پر آئے اور اس پر بندوق سے حملہ کر دیا۔ ٹروڈی مایوسانہ طور پر کہتی رہی کہ ——— نہ مارو، نہ مارو (Don't shoot, don't shoot) مگر گولیوں کی بوچھار نے چند منٹ کے اندر دونوں کا خاتمہ کر دیا۔ میکی نے ۱۹۶۰ میں ۴۰۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے کار چلا کر پہلے امریکی کا ٹائٹل حاصل کیا تھا یہ سفر اس نے ایک خاص موٹر کار کے ذریعہ طے کیا تھا جس میں چار انجن لگے ہوئے تھے۔ ہفت روزہ ٹائم (۲۸ مارچ ۱۹۸۸) نے اس حادثہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ خطرہ کی پروا نہ کرنا جس نے میکی ٹامسن کو تیز رفتاری کا بادشاہ بنایا خود وہی اس کے لیے موت کا ذریعہ بن گیا:

The disregard for danger that marked Thompson's driving career may have led to his death in his own front yard (12).

بہادری اور بے خوفی بہت اچھی چیز ہے۔ مگر انسان بہر حال کمزور ہے، وہ مطلق بہادری یا لامحدود بے خوفی کا تحمل نہیں کر سکتا۔ اس لیے بہادری اور بے خوفی کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ آدمی محتاط ہو۔ وہ حکمت اور مصلحت کا لحاظ کرنا بھی جانے۔ غیر حکیمانہ چھلانگ بھی اتنا ہی غلط ہے جتنا کہ بزدلانہ پسپائی۔

الٹا سفر

کسان نے ایک دانہ زمین میں ڈالا۔ وہ دانہ مٹی میں مل گیا۔ چند روز بعد ایک سرسبز پودا زمین سے نکلا۔ اس نے خاموش زبان میں اعلان کیا کہ دانہ کا خاتمہ اس کے لیے ایک نئی زندگی کا آغاز تھا۔ اس کا زمین کے نیچے جانا دوبارہ نئی شان کے ساتھ زمین پر نمایاں ہونے کی طرف پہلا قدم تھا۔ یہ خدا کا قانون ہے اور کائنات میں ہر طرف خاموش زبان میں اس قانون الٰہی کا اعلان کیا جا رہا ہے۔

کھیت سے فصل لینے کے لیے پہلے اپنے دانہ کو زمین میں دفن کرنا پڑتا ہے۔ دکان سے فائدہ حاصل کرنے کے لیے پہلے اپنے سرمایہ کو دکان میں لگا دینا پڑتا ہے۔ ایک رہائشی مکان کا مالک بننے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ پہلے اپنی اینٹوں کو بنیاد میں دفن کر دیا جائے۔

موجودہ زمانہ کے مسلمان جس طرح عمل کر رہے ہیں، اس کا مطلب بظاہر یہ ہے کہ وہ خدا کے اس قانون پر راضی نہیں۔ مسلمان اس قانون الٰہی کو الٹی طرف سے چلانا چاہتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ کھوئے بغیر پائیں اور دیے بغیر حاصل کریں۔ مگر مسلمانوں کو جاننا چاہیے کہ ایسا کبھی ہونے والا نہیں۔ مسلمان اپنی اس الٹی جدوجہد میں ایک صدی ضائع کر چکے ہیں۔ اگر وہ مزید ایک ہزار سال تک اپنی یہ الٹی کوشش جاری رکھیں تب بھی انھیں کچھ ملنے والا نہیں۔ جتنے محروم وہ آج ہیں، اتنے ہی محروم وہ ایک ہزار سال بعد بھی رہیں گے۔

یہی موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا اصل المیہ ہے۔ ایک لفظ میں، وہ پانے سے آغاز کرنا چاہتے ہیں، جب کہ اس دنیا میں زندگی کا راز یہ ہے کہ کھونے سے آغاز کیا جائے۔ مسلمانوں کے موجودہ شور وغل کا مطلب صرف یہ ہے کہ انھوں نے اب تک آغاز بھی نہیں کیا۔ اور جو لوگ آغاز نہ کریں، وہ اختتام پر کس طرح پہونچ سکتے ہیں۔

کسی شخص کو پورب کی طرف جانا ہو اور وہ پچھم کی طرف جانے والی ٹرین پر بیٹھ جائے تو اس کو گارڈ اور ڈرائیور کی شکایت نہیں کرنا چاہیے اگر اگلے اسٹیشن پر پہونچ کر اسے معلوم ہو کہ وہ اپنی منزل سے جتنا دور پہلے تھا، اب وہ اس سے بھی زیادہ دور ہو چکا ہے۔ اس کی نارسائی اس کی اپنی بدتدبیری کا نتیجہ ہے نہ کہ کسی اور کی سازش کا نتیجہ۔

ہر قسم کے مواقع

۲۶ فروری ۱۹۸۸ کی صبح کو دہلی کے تمام اخبارات کے پہلے صفحہ کی نمایاں سرخی یہ تھی: ہندستان کے پہلے میزائل کا کامیاب تجربہ۔ ۲۵ فروری کو پارلیمنٹ میں تالیوں کی گونج کے درمیان وزیر اعظم راجیو گاندھی نے اعلان کیا کہ ہندستان نے زمین سے زمین پر مار کرنے والا میزائل (پرتھوی) تیار کر لیا ہے اور اس کا کامیاب تجربہ بھی کیا جا چکا ہے۔ یہ میزائل مکمل طور پر ہندستانی ٹکنالوجی سے تیار کیا گیا ہے۔ وہ خالص دفاعی نوعیت کا ہے اور اس کا رینج ۲۵۰ کیلو میٹر ہے۔ اس طرح اب ہندستان ان چار ملکوں (امریکہ، روس، فرانس، چین) میں شامل ہو گیا ہے جو خشکی پر مار کرنے والے میزائل بنانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

اس میزائل کے بارہ میں جو خبریں آئی ہیں، ان میں سے ایک خبر ہندستان ٹائمس (۲۶ فروری ۱۹۸۸) کے مطابق یہ ہے کہ پرتھوی میزائل حیدرآباد کے دفاعی تحقیقی ادارہ (DRDO) کی لیبارٹری میں تیار کیا گیا ہے۔ یہ کام سائنس دانوں کی ایک ٹیم نے انجام دیا ہے جو ڈاکٹر ابوالکلام کی ماتحتی میں کام کر رہی تھی:

The 'Prithvi' missile was fabricated at the Defence Research and Development Laboratory at Hyderabad under a team of scientists headed by Dr Abul Kalam.

دفاعی ریسرچ کا کام بے حد نازک کام ہے۔ اس شعبہ میں کام کرنے کے لیے ایسے افراد کا انتخاب کیا جاتا ہے جو بیک وقت دو صلاحیتیں رکھتے ہوں۔ اعلیٰ فنی مہارت، اور قابل اعتماد شخصیت۔ اس قسم کے ایک ممتاز عہدہ کے لیے "ڈاکٹر ابوالکلام" کا انتخاب بہت بڑا سبق دیتا ہے۔ یہ واقعہ بتاتا ہے کہ ہندستان میں مسلمانوں کے لیے ہر قسم کی ترقی کے مواقع پوری طرح کھلے ہوئے ہیں۔ اگر وہ اپنے اندر لیاقت پیدا کریں تو وہ ملک کے انتہائی اعلیٰ شعبوں میں بھی اونچے مناصب حاصل کر سکتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں اصل قیمت لیاقت کی ہے۔ لیاقت کا ثبوت دینے کے بعد آدمی ہر جگہ عزت پا لیتا ہے اور لیاقت کا ثبوت نہ دینے کی صورت میں ہر جگہ بے عزت ہو کر رہ جاتا ہے۔

مقصد کی اہمیت

ضلع حسن (کرناٹک) میں ایک گاؤں ہے جس کا نام ستپیر گھٹہ ہے۔ یہاں ایک شخص لچھ نائک نامی تھا جو ایک جھونپڑے میں رہتا تھا، اور چوکیداری کا کام کرتا تھا۔ اس کے چار بچے تھے۔ اس نے طے کیا کہ وہ اپنی تین لڑکیوں کو دیوی چمندیشوری پر بھینٹ چڑھا دے۔ ۲۴ اپریل ۱۹۸۸ کو وہ دیوی کی مورت لے کر آیا۔ اس کی پوجا کی اور اس کے بعد اپنی تین لڑکیوں (ڈیڑھ سال، تین سال، تیرہ سال) کو درانتی سے ذبح کر دیا۔ اس کے لڑکے راج کمار (۸ سال) نے مزاحمت کرنی چاہی تو اس پر بھی حملہ کر دیا جس کے نتیجہ میں اس کا دایاں ہاتھ کٹ گیا۔ اس مجنونانہ حرکت کے بعد وہ بھاگ کر باہر چلا گیا۔ چار دن بعد اس کی لاش آم کے ایک اکیلے درخت سے لٹکی ہوئی پائی گئی۔

مذکورہ خبطی کی بیوی للی تھما (۳۵ سال) کو چیف منسٹر ریلیف فنڈ سے ۵ ہزار روپیہ دیا گیا ہے۔ انڈین ریڈ کراس سوسائٹی نے اس کو ایک ہزار روپیہ دیا ہے۔ اب وہ اپنے لڑکے کے مستقبل کے بارہ میں منصوبہ بنا رہی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ اس کے بچے کو تعلیم حاصل کرنا چاہیے۔ وہ اس کے لیے تیار ہے کہ بیٹے کی تعلیم کے لیے اگر اس کو ساری زندگی کام کرنا پڑے تو وہ ساری زندگی اس کے لیے کام کرے گی۔ اس کو بیوہ کی حیثیت سے ۵۰ روپیہ ماہوار پنشن ملنے کی امید ہے۔ تقریباً اتنی ہی ماہانہ رقم اس کے بیٹے کو معذوری کے وظیفہ کے طور پر ملے گی۔ راج کمار جس کے دائیں ہاتھ کی پانچوں انگلیاں کٹ چکی ہیں، اب اپنے بائیں ہاتھ سے لکھنا سیکھ رہا ہے (ٹائمس آف انڈیا ۲۸ اپریل ۱۹۸۸)

للی تھما کا سب کچھ لٹ چکا تھا۔ اب بظاہر یہ ہونا چاہیے تھا کہ وہ بھی خودکشی کر لے، یا اپنے بیٹے کو لے کر رونے اور ماتم کرنے میں مشغول ہو جائے۔ مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس نے سب کچھ بھلا کر مثبت عمل کا منصوبہ بنایا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اپنے معذور بیٹے کے مستقبل کی تعمیر کی صورت میں اس نے اپنے لیے ایک مقصد پا لیا۔

بامقصد آدمی کبھی محروم نہیں ہوتا، اس دنیا میں محروم وہ ہے جو مقصد سے محروم ہو جائے۔

پیغمبرانہ طریقہ

سیرت کی کتابوں میں جن واقعات کا ذکر ہے، ان میں سے ایک وہ ہے جس کو حلف الفضول کہا جاتا ہے۔ یہ واقعہ اس وقت پیش آیا جب کہ آپ کو ابھی پیغمبری نہیں ملی تھی۔ مکہ میں عبداللہ بن جدعان کے مکان میں کچھ لوگ جمع ہوئے۔ انھوں نے مل کر یہ عہد کیا کہ وہ مظلوم کی حمایت کریں گے اور حقدار کو اس کا حق دلائیں گے۔ جو افراد اس اجتماع میں شریک ہوئے، ان میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم بھی تھے۔ ابن اسحاق کی روایت ہے کہ پیغمبری کے بعد مذکورہ اجتماع (حلف الفضول) کا ذکر ہوا تو آپ نے فرمایا کہ اس وقت میں بھی اس میں شریک تھا۔ اور اب اسلام کے بعد بھی اگر مجھے اس کے لیے بلایا جائے تو میں لبیک کہوں گا (وَلَو اُدْعیٰ بہ فی الاسلام لَاَجَبْتُ۔ سیرۃ ابن ہشام، الجزء الاول، صفحہ ۱۴۵)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد حلف الفضول والے کام کے بارے میں تھا۔ دوسری طرف دعوت توحید کے بارہ میں آپ نے فرمایا کہ یہ میرا راستہ ہے۔ میں لوگوں کو پوری بصیرت کے ساتھ اللہ کی طرف بلاتا ہوں، میں اور میری پیروی کرنے والے بھی (ھٰذہ سبیلی ادعوا الی اللہ علیٰ بصیرۃ انا ومن اتبعنی، یوسف ۱۰۸)

ان دونوں باتوں پر تقابلی اعتبار سے غور کیجئے۔ اس سے واضح طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ "حلف الفضول" والے کام میں آپ صرف مدعو کی حیثیت اپنے لیے پسند فرماتے تھے۔ جب کہ "دعوت توحید" والے کام میں آپ داعی کی حیثیت اختیار کیے ہوئے تھے۔ معلوم ہوا کہ ایسا ماحول جہاں شرک کا غلبہ ہو، وہاں دعوت توحید ہی اہل ایمان کا اصل ایجابی کام ہوگا۔ وہ داعی الی اللہ بن کر اٹھیں گے۔ جہاں تک سماجی امن اور اخلاقی سدھار کی بات ہے، اس میں وہ خیر طلب عناصر کے بلاوے پر وقتی طور پر ان کے ساتھ شریک ہو سکتے ہیں، مگر اسی کو اپنی دعوت وتحریک کی بنیاد نہیں بنا سکتے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ انسانی بگاڑ کی اصل جڑ ہمیشہ خدا فراموشی ہوتی ہے۔ اور پیغمبر اسلام کی اتباع میں اہل ایمان ہمیشہ جڑ پر محنت کرتے ہیں نہ کہ شاخوں اور پتیوں پر۔

اصحاب رسول

ایک روایت کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے اصحاب کو برا نہ کہو۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے، اگر تم میں سے کوئی شخص احد پہاڑ کے برابر سونا صدقہ کرے تو وہ ان کے ایک مُد یا اس کے نصف کے صدقہ کے برابر بھی نہیں پہونچے گا (لاتسبوا اصحابی فوالذی نفسی بیدہ لو ان احدکم انفق مثل احد ذھبا مابلغ مدّ احدھم ولانصیفہ، متفق علیہ)

اصحاب رسول کی یہ عظمت کسی پُراسرار تقدس کی بنا پر نہیں ہے۔ اس کی ایک معلوم اور معقول وجہ ہے، اور وہ وہی ہے جو قرآن میں واضح طور پر بتائی گئی ہے۔ یہ وجہ ہے "فتح" سے پہلے ایمان لانا اور قربانیاں دینا۔ (الحدید ۱۰)

غلبہ اور فتح سے پہلے رسول کی حیثیت بس ایک عام انسان کی تھی۔ اس وقت تک آپ کی حیثیتِ رسالت ثابت شدہ نہیں بنی تھی، وہ تاریخی طور پر معتبر اور مسلّم نہیں ہوئی تھی۔ اس وقت رسول کو پہچاننے اور اس پر فدا ہونے کے لیے وہ خاص نظر درکار تھی جو کسی چیز کو محض جوہر کی سطح پر پہچان لیتی ہے۔ اس وقت آپ کا ساتھ دینے کے لیے وہ انوکھا حوصلہ درکار تھا جو ایسے وقت میں ایک صاحب حق کا ساتھ دے جس کا ساتھ دینا پورے سماج میں نکّو بن جانے کے ہم معنی ہو۔ جو اس وقت قربانی پیش کرے جب کہ قربانی پیش کرنے کا کوئی کریڈٹ اس کو نہ مل رہا ہو۔

سورہ ہود میں ہے کہ پیغمبر کا انکار کرنے والوں نے کہا کہ ہم تمہارے اندر کوئی "فضل" نہیں دیکھتے۔ پیغمبر نے جواب دیا، کیا تم کو "بیّنہ" دکھائی نہیں دیتا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کیا چیز ہے جو ہر دور میں داعیان حق کو پہچاننے میں رکاوٹ بنتی رہی ہے۔ وہ یہ کہ لوگ اپنی ظاہر بینی کی وجہ سے داعی حق کو دنیوی بڑائی کی زمین پر دیکھنا چاہتے ہیں، جب کہ حق کا داعی ہمیشہ دلیل کی زمین پر کھڑا ہوتا ہے۔ صحابہ تاریخ کے وہ نادر گروہ ہیں جنھوں نے پیغمبر کو اس وقت پہچانا جب کہ اس کی صداقت کو ثابت کرنے کے لیے نظری دلیل کے سوا اور کوئی چیز موجود نہ تھی۔ ان کی یہی امتیازی صفت ہے جس نے ان کو تاریخ میں امتیازی درجہ دے دیا۔

حقیقی شخصیت

حضرت عمر فاروق سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عمل کا دار و مدار نیت پر ہے۔ اور ہر آدمی کے لیے وہی ہے جس کی اس نے نیت کی۔ پس جس شخص کی ہجرت اللہ اور رسول کی طرف ہو، تو اس کی ہجرت اللہ اور رسول کے لیے ہے۔ اور جس شخص کی ہجرت دنیا حاصل کرنے کے لیے ہو، یا کسی عورت سے نکاح کرنے کے لیے ہو تو اس کی ہجرت اسی چیز کے لیے ہے جس کی طرف اس نے ہجرت کی۔

ایک شخص ہجرت کے سفر پر مکہ سے مدینہ کے لیے روانہ ہوتا ہے۔ بظاہر اس کا جسم ایک مقدس سفر میں ہے۔ مگر اس کا ذہن ایک اور خیال میں لگا ہوا ہے۔ وہ سوچ رہا ہے کہ اس کو مدینہ پہونچ کر فلاں دنیوی فائدہ حاصل کرنا ہے۔ ایسے شخص نے اپنے ظاہر کے اعتبار سے ہجرت کی، مگر اس نے اندر کے اعتبار سے ہجرت نہیں کی۔ اس کا جسم تو مہاجر ہے، مگر اس کی روح بدستور غیر مہاجر۔

ایسا شخص آخرت میں اپنے جسم کے اعتبار سے نہیں اٹھے گا، بلکہ اپنی روح کے اعتبار سے اٹھے گا۔ اس کے ساتھ اس کی اندرونی حقیقت کے مطابق معاملہ کیا جائے گا نہ کہ اس کے ظاہری حلیہ کے مطابق۔ اس کی ظاہری شخصیت اسی موجودہ دنیا میں رہ جائے گی، آخرت میں اس کی صرف وہ شخصیت پہونچے گی جو اس نے داخلی طور پر اپنے جسم کے اندر بنائی تھی۔

موجودہ دنیا میں ہر آدمی ایک قسم کا مکھوٹا (Mask) لگائے ہوئے ہے۔ کوئی مہاجر کا مکھوٹا، کوئی مجاہد کا مکھوٹا، کوئی اور دینی مکھوٹا۔ اس قسم کے مکھوٹوں سے انسان دھوکا کھا سکتے ہیں، مگر خدا ان سے دھوکا کھانے والا نہیں۔ آخرت میں خدا ہر ایک کا مکھوٹا اس کے چہرے سے اتار دے گا۔ اس وقت لوگ دیکھیں گے کہ وہ شخص جو بظاہر علمبردار اسلام کا مکھوٹا لگائے ہوئے تھا، وہ اندر سے صرف علم بردار مفاد تھا اس کے سوا اور کچھ نہیں۔

جو شخص اندرونی طور پر کچھ اور ہو، اور بیرونی طور پر اپنے آپ کو کچھ اور بنا کر پیش کرے، وہ خدا کو دھوکا دے رہا ہے۔ ایسا آدمی آخرت میں فریب کار کی حیثیت سے اٹھایا جائے گا نہ کہ دیندار کی حیثیت سے۔

اعتراف

فتح مکہ کے بعد جب عرب پر اسلام کا غلبہ قائم ہوگیا اور اکثر قبائل اسلام میں داخل ہوگیے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتوں کے خاتمہ کی مہم شروع کی۔ اس سلسلہ میں ایک مہم وہ تھی جو سُواع کی طرف سے بھیجی گئی۔

ہُذیل بن مُدرکہ بن الیاس بن مُضر نے زمانۂ جاہلیت میں ایک بت بنایا تھا جو سُواع کہا جاتا تھا، اس بت کو انھوں نے رِیاط (ینبوع) میں رکھا تھا۔ رمضان ۸ھ میں حضرت عمرو بن العاص سواع کو منہدم کرنے کے لیے بھیجے گیے۔

یہ مقام مکہ سے تین میل کے فاصلہ پر تھا۔ عمرو بن العاصؓ جب وہاں پہنچے تو اس بت کے مجاور نے ان سے پوچھا کہ تم کس ارادہ سے یہاں آئے ہو۔ عمرو بن العاص نے جواب دیا کہ میں خدا کے رسول کے حکم سے یہاں آیا ہوں تاکہ اس بُت کو منہدم کر دوں۔ مجاور کے ذہن پر سواع کی عظمت اتنی زیادہ چھائی ہوئی تھی کہ اس نے کہا کہ تم کبھی ایسا نہ کر سکو گے۔ سواع تم کو ضرور اس سے روک دے گا۔ عمرو بن العاص نے کہا کہ افسوس ہے تمہارے اوپر، تم اب تک اسی وہم میں پڑے ہوئے ہو۔ کیا یہ بت سنتا ہے اور دیکھتا ہے جو وہ مجھ کو روک دے گا۔ یہ کہہ کر انھوں نے سواع پر ایک ضرب لگائی اور بت ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا۔

یہ منظر مجاور کے لیے بالکل خلاف توقع تھا۔ بت کے ٹوٹنے کے ساتھ اس کے خیالات کا طلسم بھی ٹوٹ گیا۔ وہ پکار اٹھا: اَسْلَمْتُ لِلّٰہ۔ اور اسی وقت شرک کو چھوڑ کر دینِ توحید (اسلام) میں داخل ہوگیا۔

حق کو نہ ماننے والے دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو تعصب اور نفسانیت کی وجہ سے حق کو نہ مانیں۔ دوسرے وہ جو غلط فہمی کی وجہ سے حق کو نہ مانیں۔ پہلی قسم کے لوگوں کو کبھی حق کا اعتراف کرنے کی توفیق نہیں ملتی۔ مگر دوسری قسم کے لوگوں کا نہ ماننا وقتی ہوتا ہے۔ وہ نہ سمجھنے کی وجہ سے انکار کر رہے تھے۔ اس لیے جب بات کو دلیل سے واضح کر دیا جائے تو وہ فوراً حق کو پا لیتے ہیں اور اپنی پچھلی روش کو چھوڑ کر اس کے آگے جھک جاتے ہیں۔

دنیا سے آخرت لینا

قرآن میں قارون کا قصہ بیان ہوا ہے۔ ارشاد ہوا ہے کہ وہ حضرت موسیٰ کی قوم سے تعلق رکھتا تھا۔ پھر فرعون سے مل کر اس نے کافی دولت کمائی۔ اس کے خزانوں کا یہ حال تھا کہ ان کی کنجیاں طاقت ور آدمیوں کی ایک جماعت مشکل سے اٹھا سکتی۔ اس دولت سے قارون کے اندر فخر اور گھمنڈ پیدا ہو گیا۔ اس وقت کچھ صالح بندوں نے اس کو نصیحت کی کہ دولت پر فخر نہ کر۔ اللہ نے تجھ کو جو کچھ دیا ہے اس سے آخرت کا طالب بن اور دنیا سے اپنا حصہ نہ بھول (وابتغ فیما آتاک اللہ الدار الآخرۃ ولا تنس نصیبک من الدنیا، القصص ۷۷)

اس کی تفسیر کے سلسلہ میں مفسرین کے کچھ اقوال یہ ہیں:

وقیل معناه واطلب بدنیاك آخرتك فان ذالك حظ المومن منها (تفسیر النسفی)

اور کہا گیا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنی دنیا کے ذریعہ آخرت چاہو۔ کیونکہ یہی اس سے مومن کا حصہ ہے۔

یعنی ما تحصل بها آخرتك فان حقیقة نصیب الانسان من الدنیا ان یعمل للآخرة فان الدنیا مزرعة الآخرة۔ كذا قال مجاهد وابن زید۔ وقال السدی نصیبك من الدنیا الصدقة وصلة الرحم وقال علی رضی الله عنه لا تنس صحتك وقوتك وشبابك وغناك ان تطلب الآخرة۔ فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم اغتنم خمسا قبل خمس، حیاتك قبل موتك وصحتك قبل سقمك وفراغك

یعنی دنیا سے وہ چیز لینا نہ بھولو جس سے تم اپنی آخرت حاصل کر سکو۔ دنیا سے انسان کا اصل حصہ یہ ہے کہ وہ آخرت کے لیے عمل کرے۔ کیوں کہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔ مجاہد اور ابن زید کا قول یہی ہے۔ اور سدی نے کہا کہ دنیا سے تمہارا حصہ صدقہ اور صلہ رحمی ہے۔ اور علی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ تم اپنی صحت اور اپنی قوت اور اپنی جوانی اور اپنی دولت کے معاملہ میں یہ نہ بھولو کہ تم اس کے ذریعہ سے آخرت چاہو۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پانچ چیز

قبل شغلك وشبابك قبل هرمك وغناك قبل فقرك۔ وقال الحسن امران يقدم الفضل ويمسك ما يغنيه يعني ما يكفيه۔

(التفسیری المظہری)

سے پہلے پانچ چیز کو غنیمت جانو۔ اپنی موت سے پہلے اپنی زندگی کو۔ اپنی بیماری سے پہلے اپنی صحت کو۔ اپنی مشغولیت سے پہلے اپنی فراغت کو۔ اپنے بڑھاپے سے پہلے اپنی جوانی کو۔ اور اپنی محتاجی سے پہلے اپنی دولت مندی کو۔ اور حسن بصری نے کہا کہ یہاں یہ حکم دیا گیا ہے کہ حقیقی ضرورت کے بقدر مال روک کر ضرورت سے زیادہ کو آگے بھیجو۔

موجودہ دنیا جو انسان کو دی گئی ہے، وہ آخرت کی کمائی کرنے کے لیے دی گئی ہے۔ جس شخص نے دنیا میں آخرت کے فائدہ والا کام کیا، اس نے دنیا سے آخرت کا حصہ لیا۔ اس کے برعکس جو شخص دنیا میں صرف دنیا کے فائدہ والا کام کرتا رہا۔ اس نے دنیا سے آخرت کا حصہ نہیں لیا۔ وہ موت کے بعد دوسری دنیا میں اس طرح پہونچے گا کہ وہاں اس کے لیے کچھ نہ ہوگا۔

یہ انجام صرف عام دنیا داروں کا نہیں ہوگا۔ یہی انجام ان لوگوں کا بھی ہوگا جو بظاہر دین والے کام کرتے ہیں۔ مگر اس سے ان کا مقصد دنیوی فائدہ حاصل کرنا ہوتا ہے۔ دین کا کام کرکے اگر کوئی شخص مال، قیادت، شہرت، عزت، بڑائی چاہے تو اس نے بھی گویا دنیا سے اپنی آخرت کا حصہ نہیں لیا۔ وہ بھی آخرت میں اتنا ہی نامراد ہوگا جتنا بدنام قسم کے دنیا دار، بلکہ شاید اس سے بھی زیادہ۔

خاتونِ اسلام (نیا ایڈیشن)

خاتونِ اسلام کا پہلا ایڈیشن غیر معمولی طور پر مقبول ہوا اور بہت جلد ختم ہوگیا۔ اب اس کا دوسرا ایڈیشن چھپ کر تیار ہے۔ دوسرے ایڈیشن میں تقریباً ۱۰۰ صفحات کا اضافہ کیا گیا ہے۔ مزید معلومات کے لیے دفتر سے رابطہ قائم فرمائیں۔ منیجر مکتبہ الرسالہ

مومنانہ طریقہ

ابن عبدالبر اندلسی (م ۴۶۳ ھ) نے ایک واقعہ ان الفاظ میں نقل کیا ہے:

رویـنا ان طاؤسا و وهب بن منبه التقيا۔ فـقال طاؤس لوهب يا اباعبدالله، بلغنی عنـك امـر عظيم۔ فـقال ماهو۔ قال تقول ان الله حـمل قوم لوط بعضهم علی بعض۔ قـال اعوذ بالله۔ ثـم سكتا۔ قال فقلت هل اختصما، قال لا۔

(جامع بیان العلم وفضلہ، الجزء الثانی، صفحہ ۹۵)

ہم سے بیان کیا گیا ہے کہ طاؤس اور وہب بن منبہ ایک دوسرے سے ملے۔ طاؤس نے وہب سے کہا کہ اے ابوعبداللہ، آپ کے بارہ میں مجھے ایک سنگین بات پہنچی ہے۔ انھوں نے پوچھا کہ وہ کیا۔ طاؤس نے کہا یہ کہ آپ کہتے ہیں کہ اللہ ہی نے تو قوم لوط کے بعض کو بعض کے اوپر چڑھایا۔ وہب بن منبہ نے کہا کہ اللہ کی پناہ۔ پھر دونوں چپ ہو گئے۔ میں نے راوی سے پوچھا، کیا دونوں میں بحث ہوئی۔ راوی نے جواب دیا کہ نہیں۔

سوال دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک سچا سوال، دوسرے جھوٹا سوال۔ سچا سوال کرنے والا واقعی سائل ہوتا ہے۔ وہ ایک بات کی حقیقت جاننا چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے آدمی کو چپ کرنا آسان ہے۔ اس کو اپنے سوال کا جواب مطلوب تھا، اور جب اس کو اپنے سوال کا جواب مل گیا تو وہ خاموش ہو گیا۔

جھوٹے سائل کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ اس کا مقصد حقیقت کو جاننا نہیں ہوتا بلکہ شخصِ ثانی کو غلط ثابت کرنا ہوتا ہے۔ اگر وہ اپنے سوال کا جواب پا کر چپ ہو جائے تو اس کا اصل مقصد حاصل نہیں ہوتا۔ اس لیے وہ ہر جواب کے بعد نئے شوشے نکال لیتا ہے ——— کبھی غیر متعلق باتیں چھیڑتا ہے۔ کبھی دلیل سے ہٹ کر عیب جوئی کا طریقہ اختیار کرتا ہے۔ کبھی تلخ کلامی سے مخاطب کو زیر کرنا چاہتا ہے۔ کبھی دھاندلی اور تمسخر کا انداز اختیار کرتا ہے۔

جو لوگ اس طرح دوسرے کو غلط ثابت کرنا چاہیں، وہ خود اپنے آپ کو غلط ثابت کرتے ہیں نہ کہ کسی دوسرے شخص کو۔

برا فیصلہ

قرآن میں مشرکین کے بارہ میں کہا گیا ہے کہ اللہ نے جو کھیتی اور چوپائے پیدا کیے ہیں، ان میں سے انھوں نے اللہ کا کچھ حصہ مقرر کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ حصہ اللہ کا ہے، ان کے گمان کے مطابق۔ اور یہ حصہ ہمارے شریکوں کا ہے۔ پھر جو حصہ ان کے شریکوں کا ہوتا ہے وہ تو اللہ کو نہیں پہونچتا اور جو حصہ اللہ کے لیے ہے وہ ان کے شریکوں کو پہونچ جاتا ہے۔ کیسا برا فیصلہ ہے جو یہ لوگ کرتے ہیں (الانعام ۱۳۷)

آدمی زبان سے کہتا ہے کہ میں اللہ کو مانتا ہوں۔ مگر اس کے دل میں حقیقی اہمیت اور عظمت دوسری چیزوں کی بیٹھی ہوئی ہوتی ہے۔ اس کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب کہ اللہ اور غیر اللہ میں ٹکراؤ پیش آتا ہے۔

قدیم عرب کے مشرکین بظاہر اللہ کا اقرار کرتے تھے۔ مگر ان کے دلوں میں سب سے زیادہ بڑائی اپنے بتوں کی بیٹھی ہوئی تھی۔ چنانچہ وہ ایسا کرتے تھے کہ مویشی یا پیداوار یا نذر و نیاز کی تقسیم میں کچھ حصہ خدا کا نکالتے اور کچھ حصہ بتوں کا۔ اس تقسیم میں اگر کسی وجہ سے خدا کی طرف زیادہ آجاتا اور بتوں کی طرف کم تو اس کو لے کر فوراً بتوں کی طرف ڈال دیتے۔ لیکن اگر معاملہ اس کے برعکس ہو۔ یعنی خدا کا حصہ گھٹ جائے اور بتوں کا حصہ بڑھ جائے۔ تو وہ ایسا نہ کرتے کہ بتوں کی طرف سے نکال کر اس کو خدا کے حصہ میں ڈالیں۔

یہ صرف قدیم مشرکوں کا قصہ نہیں، یہی معاملہ ہر شخص کے ساتھ پیش آتا ہے، اس فرق کے ساتھ کہ قدیم مشرکین یہ معاملہ پتھروں کے ساتھ کرتے تھے، آج کا انسان یہی معاملہ دوسرے دوسرے "بتوں" کے ساتھ کرتا ہے۔

آج کے انسان کا یہ حال ہے کہ دیانت داری اور دنیوی مفاد میں ٹکراؤ ہو تو وہ دیانت داری کو دنیوی مفاد کے خانہ میں ڈال دیتا ہے۔ وہ ایسا نہیں کرتا کہ دنیوی مفاد کو دیانت داری کے خانہ میں ڈالے۔ اس کی وجہ دوبارہ ان کا وہی "برا فیصلہ" ہے جو پہلی صورت میں تھا۔ وہ خدا کے حق میں کمی سے بے خوف ہیں۔ اور غیر خدا کے حق میں کمی کرنے سے ڈرتے ہیں کہ وہ ہلاک ہو جائیں گے۔

امتحان

احد کی جنگ (۳ھ) میں اہل ایمان کو سخت نقصان اٹھانا پڑا۔ ۷۰ مسلمان شہید ہوگیے۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو شدید زخم آئے۔ ان واقعات پر مدینہ کے مسلمان غم زدہ تھے۔ قرآن میں اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا گیا کہ دو جماعتوں کی مڈبھیڑ کے وقت تم کو جو مصیبت پیش آئی وہ اللہ کے حکم سے تھی۔ اور اس لیے تھی تاکہ اللہ ایمان والوں کو جان لے اور تاکہ وہ ان لوگوں کو جان لے جو منافق ہیں (آل عمران ۶۷-۱۶۶)

یہ اللہ تعالیٰ کی ایک خاص سنت ہے جو مختلف الفاظ میں مختلف مقامات پر بیان ہوئی ہے۔ سورہ نمبر ۵۷ میں مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ کوئی بھی مصیبت جو آتی ہے، خواہ وہ جس صورت میں بھی آئے، وہ پہلے سے کتاب خداوندی میں لکھی ہوئی ہے (الحدید ۲۲) اس سلسلہ میں آگے ارشاد ہوا ہے کہ ـــــ اور تاکہ اللہ معلوم کرے کہ کون مدد کرتا ہے اس کی اور اس کے رسول کی بن دیکھے (ولیعلم اللہ من ینصرہ ورسلہ بالغیب، الحدید ۲۵)

احد کا حادثہ اسی قسم کا ایک امتحان تھا۔ مدینہ کے مسلمانوں میں دو قسم کے لوگ تھے۔ ایک طاقتور ایمان والے، دوسرے کمزور ایمان والے۔ طاقت ور ایمان والے "غیب" کی سطح پر سچائی کو پائے ہوئے تھے۔ وہ چیزوں کو حق اور ناحق کی روشنی میں دیکھتے تھے نہ کہ ظاہری فتح اور شکست کی روشنی میں۔

کمزور ایمان والے معاملات کو صرف ظاہری سطح پر دیکھنے والی نگاہ رکھتے تھے۔ چنانچہ اُحد کے حادثہ کے بعد وہ مسلمانوں کو حقیر سمجھنے لگے۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی دعوت کی صداقت پر شک کرنے لگے۔ انھوں نے اپنی روش سے یہ ثابت کیا کہ وہ صرف اس حق کے ساتھی ہیں جو انھیں ساحل پر مل جائے۔ جس حق کی خاطر دریا کی موجوں کے تھپیڑے کھانے پڑیں، اس سے انھیں کوئی دل چسپی نہیں۔

اس دنیا میں حق کو "غیب" کی سطح پر پانا پڑتا ہے۔ جو لوگ حق کو "شہود" کی سطح پر پانا چاہیں، وہ حق کو پانے میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔

کتمانِ شہادت

قدیم عرب میں یہود بڑی تعداد میں آباد تھے۔ ماضی کی روایات کی بنا پر ان کو اپنے ماحول میں سرداری حاصل تھی۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے جب قرآن اور اسلام کی دعوت پیش کی تو یہود آپ کے مخالف ہو گیے۔ انھوں نے یہ ثابت کرنا شروع کیا کہ ہم دین پر ہیں اور محمد دین سے دور ہو گیے ہیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہود کے نزدیک دین نام تھا دینِ اکابر کا۔ اس کے برعکس رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم دینِ خدا کو دین کی حیثیت سے پیش کرتے تھے۔ اس فرق کی بنا پر وہ لوگ آپ کے دشمن ہو گیے۔

تاہم یہ دشمنی ظاہری تھی۔ یہود اپنے علم کے مطابق اچھی طرح جانتے تھے کہ ان کے اکابر اس دنیا کے خدا نہیں ہیں بلکہ خدا اس دنیا کا خدا ہے۔ سچا دین وہی ہے جو آدمی کو خدا سے جوڑے نہ کہ وہ جو آدمی کو انسانی اکابر سے وابستہ کرے۔ یہود کا دل رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پیغام کی صداقت پر گواہی دیتا تھا مگر دنیا کے فائدے اور قیادت کی مصلحتیں انھیں روکتی تھیں کہ وہ اپنے دل کی بات کو زبان پر لائیں۔ وہ سچائی کو سچائی جانتے ہوئے اس کے اعلان و اظہار سے باز رہے۔

یہود کی اس مجرمانہ خاموشی پر تنبیہہ کرتے ہوئے قرآن میں کہا گیا ہے:

ومن اظلم ممن کتم شھادۃ عندہ من اللہ (البقرہ ۱۴۰)	اور اس سے بڑا ظالم اور کون ہوگا جو اس گواہی کو چھپائے جو اللہ کی طرف سے اس کے پاس ہے۔

جب آدمی کا دل ایک بات کی سچائی کا اقرار کرے تو گویا اس کے پاس خدا کی گواہی آگئی۔ یہ گواہی خدا کی ایک مقدس امانت ہے۔ آدمی کے اوپر لازم ہے کہ وہ اس گواہی کا اعلان کرے۔ جو شخص اس خدائی گواہی کے لیے نہ اٹھے وہ ظالم ہے۔ ایسے ظالموں سے خدا کبھی راضی نہیں ہو سکتا۔ وہ خدا کے معاملہ میں غیر جانبدار ہو گیے، اس لیے خدا بھی ان کے معاملہ میں غیر جانبدار ہو جائے گا، اور جس کے معاملہ میں خدا غیر جانبدار ہو جائے اس کا زمین و آسمان میں کوئی ٹھکانہ نہیں۔

سچائی موجودہ دنیا میں خدا کی نمائندہ ہے۔ جو لوگ سچائی کا ساتھ نہ دیں، انھوں نے خدا کا ساتھ نہیں دیا، انھوں نے خدا کو نظر انداز کر دیا۔

شعور اور عمل

قرآن میں بنی اسرائیل کے بارہ میں بتایا گیا ہے کہ انھوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ ہم کو جنگ کا حکم دیجئے۔ مگر جب ان کو جنگ کا حکم دیا گیا تو تھوڑے لوگوں کو چھوڑ کر ان کی اکثریت جنگ کرنے کے لیے تیار نہ ہوئی (البقرہ ۲۴۶)

اس کے برعکس پیغمبر اسلام صلے اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کے بارہ میں ارشاد ہوا ہے کہ جب ان کو جنگ کا سامنا ہوا اور ان سے لڑنے کے لیے کہا گیا تو وہ فوراً مقابلہ کے لیے تیار ہوگیے۔ انھوں نے کہا کہ یہ تو وہی چیز ہے جس کا خدا اور رسول نے ہم سے وعدہ کیا تھا (الاحزاب ۲۲)

اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ کے ساتھ جو لوگ تھے وہ پیدائشی مومن تھے۔ جب کہ پیغمبر اسلامؐ کا ساتھ دینے والے وہ لوگ تھے جو شعوری انقلاب کے بعد مومن بنے تھے۔ یہی وہ فرق ہے جس نے دونوں کے کردار میں اتنا بڑا فرق پیدا کر دیا۔ عمل کا معاملہ لازمی طور پر شعور کے ساتھ وابستہ ہے۔ آدمی کا شعور جتنا گہرا ہوگا اس کا عمل بھی اتنا ہی گہرا ہوگا۔ اور اس کا شعور جتنا سطحی ہوگا اس کے عمل میں بھی اتنی ہی سطحیت آتی چلی جائے گی۔

اس فرق کو دوسرے لفظوں میں اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ عمل کے لیے صرف حکم کافی نہیں۔ کسی حکم کو قبول کرنے کے لیے اسی درجہ کا شعور بھی لازمی طور پر درکار ہے۔ جس شخص کو حکم دیا جا رہا ہے، اس کا شعوری ارتقاء اگر حکم سے کم تر درجہ کا ہو تو وہ حکم کی معنویت کو پوری طرح سمجھ نہ سکے گا۔ وہ اس کو اپنے دماغ میں وہ اہمیت دینے سے قاصر رہے گا جو باعتبار حقیقت اسے دینا چاہیے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ نفسیاتی طور پر اس کی تعمیل کے لیے بھی تیار نہ ہو سکے گا۔

ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ ابتدائی دور میں جو لوگ ایمان قبول کرتے ہیں وہ شعور اور ارادہ کے تحت ایمان قبول کرتے ہیں ان کی بعد کی نسلوں میں یہ شعور مدھم پڑ جاتا ہے یا ختم ہو جاتا ہے۔ اب ضرورت ہوتی ہے کہ دوبارہ ان کے شعور کو جگایا جائے، ان کے تقلیدی ایمان کو ارادی فیصلہ کے تحت اختیار کرنے والا ایمان بنا دیا جائے ــــــ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی اصلاح کا پہلا قدم یہی ہے کہ ان کے اندر شعوری ایمان کو جگانے کی کوشش کی جائے۔

لفظ یا حقیقت

رابندر ناتھ ٹیگور (۱۹۴۱ - ۱۸۶۱) کو حکومت برطانیہ نے ۱۹۱۵ میں سر کا خطاب دیا تھا۔ ۱۹۱۹ میں جب انگریزی حکومت نے امرت سر میں نہتے ہندستانیوں پر بے رحمانہ گولی چلوائی تو ٹیگور نے سر کا خطاب واپس کر دیا۔

ڈاکٹر محمد اقبال (۱۹۳۸ - ۱۸۷۷) کو حکومت برطانیہ نے ۱۹۲۲ میں سر کا خطاب عطا کیا۔ اقبال نے اس کو قبول کر لیا اور پھر کبھی اس کو واپس نہیں کیا۔

راقم الحروف ذاتی طور پر سر کا خطاب لینے کو غلط نہیں سمجھتا۔ مگر اقبال نے اپنی شاعری میں جس قسم کی باتیں کیں، اس کے لحاظ سے انگریزی حکومت کا دیا ہوا سر کا خطاب ان کے لیے بالکل غیر مناسب تھا۔ مثال کے طور پر ان کا شعر ہے:

نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر　　تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

اقبال کے اپنے معیار کے مطابق، سر کا خطاب قصرِ سلطانی کے گنبد پر نشیمن بنانے کے ہم معنی تھا، مگر دوسروں کو تو وہ اس قسم کی نشیمن سازی سے باز رہنے کا اُپدیش دیتے رہے۔ لیکن خود ان کا اپنا حال یہ تھا کہ وہ آخر وقت تک قصرِ سلطانی کے گنبد پر اپنا نشیمن بنائے رہے۔

یہ ایک مثال ہے جو بتاتی ہے کہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے درمیان جو رہنما اٹھے ان کا حال کیا تھا۔ موجودہ زمانہ کے تقریباً تمام مسلم رہنما اصلاً یا تو شاعر تھے، مثلاً اقبال۔ یا خطیب تھے، مثلاً محمد علی۔ یا انشا پرداز تھے، مثلاً ابو الاعلیٰ مودودی۔ وہ مفکر اور بالغ نظر نہ تھے، جیسا کہ ایک رہنما کو ہونا چاہیے۔ شاعری اور خطابت اور انشا پردازی در اصل لفّاظی کا دوسرا نام ہے۔ چنانچہ یہ تمام رہنما لفظی بلند پروازی کے کرشمے دکھاتے رہے، حقائقِ حیات کے اعتبار سے وہ مسلمانوں کو ٹھوس رہنمائی نہ دے سکے۔

اس تخیلاتی رہنمائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ رہنما حضرات کی اپنی شخصیت تو بن گئی مگر ملّت کا تمام معاملہ برباد ہو کر رہ گیا۔ ہوائی کرشمے دکھلانے والا ایک شخص بذات خود اخبار کی سرخیوں میں جگہ پا سکتا ہے، مگر ہوائی کرشمے دکھانے سے کسی قوم کے مستقبل کی تعمیر نہیں ہوتی۔

ایک تجربہ

ایک ہندو خاتون شوبھا دے (Shobha De) کا مضمون ٹائمس آف انڈیا (۱۲ جولائی ۱۹۸۷ میں شائع ہوا ہے۔ وہ ایک مندر میں داخل ہونا چاہتی تھیں۔ دروازہ پر پہونچیں تو ایک پجاری نے ان کو سخت نظروں سے دیکھا اور کہا: "اندر نہیں جا سکتے"۔ خاتون نے ابتداءً معاملہ کو نہیں سمجھا اور پارڈن (Pardon) کہہ کر آگے بڑھنا چاہا۔ مگر انگریزی لفظ بولنا ان کے معاملہ کو اور نازک بنانے کا سبب بن گیا۔ اس نے ٹوٹی ہوئی انگریزی میں کہا:

No enter for you.

یہ پوری کا مشہور جگن ناتھ مندر تھا۔ خاتون حیرانی کے ساتھ دروازہ پر کھڑی رہیں۔ کچھ دیر کے بعد وہ پجاری دوبارہ ان کی طرف مخاطب ہوا اور کہا کہ "اب کیا ہے"۔ خاتون نے پوچھا کہ آخر کس وجہ سے مجھ کو مندر میں جانے سے روکا جا رہا ہے۔ اس نے کہا کہ یہ صرف ہندوؤں کے لیے ہے۔ بات بڑھی تو وہ ایک پنڈا کو بلا کر لے آیا۔ اس نے کہا کہ "بہن جی، آپ سمجھتے کیوں نہیں"۔ خاتون بگڑ گئیں۔ آخر پنڈا نے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ "جاؤ، جاؤ"۔ بعد کو مندر کے ایک آدمی نے خاتون سے کہا کہ آپ ہندو دکھائی نہیں دیتیں۔ انھوں نے کہا کہ "کیوں نہیں"۔ آدمی نے کہا: اس لیے کہ آپ بندی پہنے ہوئے نہیں ہیں۔ اس طرح بات ہوتی رہی یہاں تک کہ مندر کے آدمی نے پوچھا: "آپ کا شبھ نام"۔ خاتون نے جھنجھلا کر نام بتایا تو ایک "ماہر" بلایا گیا۔ اس نے غور کرنے کے بعد کہا: یہ ہندو نام تو ہے، مگر یہ پچھمی نام ہے۔ خاتون اس قسم کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

The whole sham game was reinforcing all my prejudices against the fraud of organised religion.

یہ تمام مصنوعی کھیل میرے اس مخالفانہ رجحان کو اور پختہ کر رہا تھا جو منظم مذہب کے فریب کے بارہ میں میرے اندر موجود تھا (ٹائمس آف انڈیا ۱۲ جولائی ۱۹۸۷)

ہندو خاتون آخر میں کہتی ہیں کہ اس تجربہ سے مجھے بہت دکھ پہونچا۔ مشہور ہندو رواداری

کے بجائے میرا سابقہ تنگ نظری اور تعصب کے ساتھ پیش آیا۔ وہ اپنے مضمون کو اس جملہ پر ختم کرتی ہیں :

I suddenly felt ashamed of having born a Hindu.

اچانک مجھے اپنے ہندو پیدا ہونے پر شرم محسوس ہونے لگی۔

مذہب اصلاً خدا اور بندے کے درمیان تعلق کا نام ہے۔ تمام پیغمبروں نے یہ کیا کہ انھوں نے اس تعلق کی صحیح نوعیت کو بتایا۔ خدا کیا ہے اور بندہ کیا ہے۔ خدا اور بندہ کے درمیان کس طرح تعلق قائم ہو سکتا ہے۔ اس تعلق کے حدود اور نتائج کیا ہیں، یہ سب باتیں پیغمبروں نے واضح طور پر بتائیں۔ ہر پیغمبر کا یہی مشن تھا، اور اس مشن کو ہر ایک نے کامل طور پر انجام دیا۔

مگر اب اسلام اور دوسرے مذہبوں میں ایک فرق واقع ہو گیا ہے۔ دوسرے تمام مذاہب نے بعد کو وہ صورت اختیار کر لی جس کو "منظم مذہب" کہا جاتا ہے۔ پیغمبر کے بعد آنے والے لوگوں نے خود سے ایک ڈھانچہ بنایا اور اس کو مقدس قرار دے کر لوگوں سے مطالبہ کیا کہ وہ اس کی پیروی کریں۔ مزید یہ کہ ان مذاہب کی اصل ابتدائی تعلیمات محفوظ نہیں رہیں، اس لیے اب کوئی ایسی کسوٹی باقی نہیں جس پر جانچ کر اس ڈھانچہ کے صحیح یا غلط ہونے کا فیصلہ کیا جائے۔

اس معاملہ میں اسلام کا کیس بنیادی طور پر مختلف ہے۔ اسلام میں بھی اگرچہ ایسا ہوا کہ بعد کے لوگوں نے بہت سے اضافے کیے۔ مگر اہم بات یہ ہے کہ اسلام کی اصل کتاب اور اس کی ابتدائی تعلیمات اپنی سابقہ شکل میں پوری طرح محفوظ ہیں۔ اس لیے ہر شخص کے لیے ممکن ہے کہ وہ اس کی روشنی میں جانچ کر معلوم کر سکے کہ کون سی بات خدا اور پیغمبر کی بات ہے، اور کون سی بات وہ ہے جو بعد کے انسانوں نے خود سے اضافہ کر کے خدا کے دین میں شامل کر دیا۔

اسی فرق کا یہ نتیجہ ہے کہ اسلام میں خدا اور بندے کے درمیان کوئی اور حائل نہیں۔ جب کہ دوسرے تمام مذاہب میں بگاڑ کے نتیجہ میں ایسا ہوا کہ خدا اور بندے کے درمیان ایک اور طبقہ حائل ہو گیا۔ وہ چیز جس کو موجودہ زمانہ میں "منظم مذہب" کہا جاتا ہے، وہ دراصل محرّف مذہب کا دوسرا نام ہے۔ اس اعتبار سے اب صرف اسلام ہی ایک ایسا دین ہے جو منظم مذہب نہیں۔ بقیہ تمام ادیان منظم مذہب کی صورت اختیار کر چکے ہیں۔

غلط فہمی

لندن یونیورسٹی کے ڈاکٹر پیٹر ہارڈی (Peter Hardy) کی ایک کتاب ہے جس کا نام ہے برطانوی ہند کے مسلمان *The Muslims of British India* اس کتاب کے ایک باب میں مصنف نے کہا ہے کہ ملک کی تقسیم نے مسلمانوں کے مسئلہ کو حل نہیں کیا۔ یہ بتاتے ہوئے کہ مسلمانوں کے نزدیک اسلام ایک مکمل نظام ہے، انھوں نے موجودہ ہندستان کے مسلمانوں سے ایک سوال کیا ہے جو ان کے الفاظ میں یہ ہے :

> Whether in wanting to be accepted as a fellow-citizen on equal terms with his non-Muslim compatriots he is obeying or disobeying Divine Commands.

مسلمانوں کا یہ چاہنا کہ وہ اپنے غیر مسلم ہم وطنوں کے ساتھ برابر کی شرائط پر یکساں درجہ کے شہری تسلیم کیے جائیں، یہ خدا کے حکم کی فرماں برداری ہے یا اس کی نافرمانی (ٹائمس آف انڈیا ۹ اپریل ۱۹۸۸)

جو لوگ اسلام کی تعبیر "مکمل نظام" کے الفاظ میں کرتے ہیں۔ اور یہ کہتے ہیں کہ یہ مکمل نظام ایک ناقابل تقسیم وحدت ہے، ان کے لحاظ سے یہ سوال بے حد اہم ہے۔ ان حضرات کے بیانات کے مطابق وہ شخص اسلام کا ناقص پیرو قرار پاتا ہے جو اعتقادی اسلام کو اختیار کرے مگر سیاسی اسلام کو اختیار نہ کرے۔ ٹھیک اسی طرح جیسے وہ شخص ناقص عبادت گزار ہے جو نماز پڑھے اور روزہ نہ رکھے۔ اب اگر واقعۃً اسلام یہی ہو تو "ہندو انڈیا یا سیکولر ہندستان" میں مسلمانوں کے لیے برابری کا دستوری اور قانونی حق مانگنا کسی طرح جائز نہیں ہو سکتا۔ کیوں کہ مذکورہ تعبیر کے مطابق یہ "باطل نظام" میں حصہ داری کا مطالبہ کرنا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے ہندستان کے مسلمان یہ مانگ کرنے لگیں کہ ہم کو ملک کے بت خانوں کے اندرونی نظام میں برابر کا شریک بنایا جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ نام نہاد مفکرین کی مذکورہ اسلامی تعبیر کا لازمی نتیجہ وہی نکلتا ہے جس کی طرف ڈاکٹر ہارڈی نے طنزیہ طور پر اشارہ کیا ہے۔ کیوں کہ اس تعبیر کے مطابق، مسلمان کسی دوسرے نظام میں صرف باغی کی حیثیت سے رہ سکتے ہیں۔ وہ ایسے کسی نظام میں وفادار یا شریک کار بن کر نہیں رہ سکتے۔ مگر اسلام کی یہ تعبیر سراسر خود ساختہ ہے جس سے اسلام بری ہے۔

یہ نام نہاد "کامل تعبیر" کچھ شاعروں اور انشاپردازوں کے ذہن کی پیداوار ہے۔ اس کا قرآن وحدیث سے کوئی تعلق نہیں۔

اس موضوع پر راقم الحروف نے اپنی کتاب "تعبیر کی غلطی" میں تفصیلی گفتگو کی ہے۔ اور علمی دلائل سے اسے رد کر دیا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلام کامل سپردگی (Total Submission) کا نام ہے نہ کہ کامل نظام (Total system) کا۔ ایک شخص جو اللہ پر ایمان لائے اس کو اپنی سوچ، اپنے جذبات، اپنے کردار اور اپنی عبادت گزاری میں کامل طور پر خدا کا فرمانبردار ہونا چاہیے۔ بحیثیت ایک فرد کے اس کو پوری طرح خدا کا بندہ بن کر رہنا چاہیے۔ حتیٰ کہ جو شخص سیاسی اقتدار کی کرسی پر ہو، وہ بھی اپنی انفرادی حیثیت ہی میں اللہ کے یہاں جواب دہ ہے نہ کہ اجتماعی حیثیت میں۔

جہاں تک اجتماعی نظام کا تعلق ہے، اس کا معاملہ اس سے بالکل الگ ہے۔ انفرادی احکام علی الاطلاق مطلوب ہیں۔ جب کہ اجتماعی احکام حالات کی نسبت سے مطلوب ہوتے ہیں۔ ایک شخص اگر اپنے انفرادی اختیار کے دائرہ میں اسلامی احکام کو اختیار کرلے تو وہ کامل مسلم ہوگیا۔ اس کے اسلام کی تکمیل اس پر منحصر نہیں کہ وہ انفرادی اختیار کے دائرہ سے باہر اجتماعی اختیار کے دائرہ میں بھی لازماً اسلام کی پیروی کرے۔

اس معاملہ کو زکواۃ کی مثال سے سمجھا جاسکتا ہے۔ زکواۃ مسلمان کے اوپر اسی طرح فرض ہے جس طرح نماز فرض ہے۔ مگر دونوں کے درمیان ایک بنیادی فرق ہے۔ نماز ایک ایسا حکم ہے جس کی ادائیگی ہر حال میں لازم ہے۔ نماز ایک مسلمان سے کسی حال میں ساقط نہیں ہوتی۔ مگر زکواۃ کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ ایک شخص اگر صاحب نصاب ہو تو اس کے لیے زکواۃ کی ادائیگی ضروری ہوگی۔ مگر جو شخص صاحب نصاب نہ ہو اس پر نہ زکواۃ کی ادائیگی واجب ہے، اور نہ یہ واجب ہے کہ وہ کمائی کرکے صاحب نصاب بنے تاکہ وہ قرآنی حکم کے مطابق زکواۃ ادا کرسکے۔

مذکورہ ذہن کے لوگ ہندستان کو غلبۂ کفر کا ملک سمجھتے ہیں۔ مگر یہ سراسر جہالت ہے۔ ہندستان ایک سیکولر ملک ہے۔ دستور کے مطابق یہاں ہر مذہب کو یکساں طور پر آزادی حاصل ہے۔ یہاں کی حکومت مذہبی امور میں عدم مداخلت کی پابند ہے۔ اس لیے صحیح بات یہ ہے کہ ہندستان سیاسی اعتبار سے، غلبۂ ناطرفداری کا ملک ہے نہ کہ غلبۂ کفر کا ملک۔

عبرت ناک

ٹائمس آف انڈیا (۲۱ اپریل ۱۹۸۸) میں ایک خبر اورنگ آباد کے میونسپل کارپوریشن کے الکشن (اپریل ۱۹۸۸) سے متعلق ہے جہاں شیوسینا نے ۶۰ سیٹوں میں سے ۲۷ سیٹوں پر قبضہ کرلیا ہے۔ شیوسینا تین سال پہلے ختم شدہ طاقت (Spent force) کی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔ نیز یہ کہ اس سے پہلے وہ زیادہ تر بمبئی کی ایک جماعت سمجھی جاتی تھی۔ مگر اورنگ آباد کے الکشن میں کامیابی سے نے ظاہر کیا ہے کہ وہ نہ صرف از سر نو زندہ ہوگئی ہے بلکہ اس نے پورے مہاراشٹر میں اپنے اثرات پھیلا لیے ہیں۔ شیوسینا نے یہ کامیابی ہندو ایکتا کا نعرہ لگا کر حاصل کی ہے۔ اس کا ایک خاص نعرہ یہ تھا "گورو سے کہو ہم ہندو ہیں":

Be proud to say you are a Hindu.

اورنگ آباد میں ۲۵ فی صد سے زیادہ مسلمان ہیں۔ بعض حلقۂ انتخاب ایسے ہیں جہاں مسلم ووٹ اکثریت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مگر شیوسینا نے ایک خالص مسلم حلقہ میں بھی کامیابی حاصل کرلی یہاں تین مسلم امیدوار تھے جس کی وجہ سے ان کے ووٹ بٹ گیے:

The Sena was also reported to have won a Muslim-dominated constituency because there were three Muslim candidates and (Muslim) votes were divided.

یہ واقعہ مسلمانوں کی دہرا نادانی کو بتا رہا ہے۔ یہ درحقیقت مسلمان ہیں جنھوں نے شیوسینا کے خلاف شور وغل کر کے اس کو زندہ کیا۔ مسلمان اگر اس کے معاملہ میں اعراض کا طریقہ اختیار کرتے تو اب تک وہ اپنے آپ ختم ہو جاتی۔ مزید یہ کہ جس جماعت کو وہ اپنے لیے سب سے بڑا خطرہ بتاتے ہیں، اس کے خلاف بھی وہ متحد نہیں ہو سکتے۔ حتی کہ اپنے عدم اتحاد کی وجہ سے بالواسطہ طور پر اس کی کامیابی کا سبب بن جاتے ہیں۔

جن لوگوں کا یہ حال ہو، ان کے بارے میں کم سے کم جو بات کہی جا سکتی ہے وہ یہ کہ —— سچا عمل تو درکنار، جھوٹا عمل کرنے کی صلاحیت بھی ان کے اندر باقی نہیں۔ بولنا تو درکنار، نہ بولنے کا فن بھی انھیں نہیں آتا۔

ایک سفر

حلقہ الرسالہ کی دعوت پر ستنا اور ریوا کا سفر ہوا۔ یہ دونوں مدھیہ پردیش کے شہر ہیں۔ ستنا اس سے پہلے بگھیل کھنڈ کے لئے برطانیہ کے پولیٹکل ایجنٹ کا صدر مقام (۱۹۲۱ - ۱۸۷۱) تھا۔

ستنا ضلع میں، شہر سے قریب ایک تاریخی گاؤں بھرہت (Bharhut) ہے۔ یہاں بدھوں کے ایک استوپا کے کھنڈرات ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ ابتداءً اشوک کے زمانہ میں ۲۵۰ ق م میں تعمیر کیا گیا۔ اس کے بعد دوسری صدی عیسوی میں اس کی مزید توسیع ہوئی۔ یہاں بہت سے کتبات ہیں۔ یہاں بڑی تعداد میں تاریخی مورتیاں اور سنگ تراشی کے نمونے پائے گئے ہیں جن میں سے کچھ الٰہ آباد کے میوزیم میں ہیں اور کچھ کلکتہ کے میوزیم میں محفوظ کر دئے گئے ہیں۔

یہ تاریخی استوپا صدیوں سے لامعلوم پڑا ہوا تھا، پہلی بار اس کو میجر جنرل الکزینڈر کننگھم (Alexander Cunningham) نے ۱۸۷۳ میں دریافت کیا۔ موجودہ زمانہ میں ایشیائی قوموں کے تاریخی آثار اور علمی نوادر کا پتہ لگانے اور انھیں محفوظ کرنے کا کام زیادہ تر مغربی لوگوں نے کیا ہے۔ موجودہ زمانہ میں مغربی قوموں کے غلبہ کا راز ان کی یہی افادیت ہے نہ کہ محض ظلم۔ ظلم محض کی بنیاد پر کبھی کوئی قوم غلبہ اور ترقی کا مقام حاصل نہیں کر سکتی۔

ریوا تعلیم کے اعتبار سے، ستنا سے آگے ہے۔ سابق راجہ نے ۱۵۹۷ میں ریوا کو اپنی راجدھانی قرار دیا تھا۔ اس وقت سے ریوا کی اہمیت کافی بڑھ گئی۔ ۱۹۶۸ میں یہاں پرتاپ سنگھ یونیورسٹی قائم ہوئی۔ بندھوگڑھ میں ۴۰۰ - ۲۰۰ء کے زمانہ کے کتبات موجود ہیں۔ بگھیل راجپوتوں نے یہاں ۱۴۰۰ء میں اپنی اسٹیٹ قائم کی تھی جو آزادی کے بعد ختم ہوگئی۔

۲۷ مارچ ۱۹۸۸ کی شام کو ۱۵۰ اُپ سے روانگی ہوئی۔ یہ ٹرین نظام الدین اور جبلپور کے درمیان چلتی ہے۔ پہلے اس کا نام قطب اکسپرس تھا۔ حال میں اس کا نام بدل دیا گیا ہے۔ گاڑی وہی ہے، مگر اب اس کا نام مہا کوشل اکسپرس ہے۔ دوسرے ملکوں کے لوگ جانتے ہیں کہ اگر حقیقت کو بدلنا ہے تو انھیں خود حقیقت کو بدلنا پڑے گا۔ مگر ہندستان اور پاکستان کو یہ

انوکھی خوش قسمتی حاصل ہے کہ یہاں حقیقت کو بدلنے کے لئے یہ کافی ہے کہ الفاظ بدل دئے جائیں۔ ہندستان میں ایک لفظ کے بدلنے سے "قطب اکپرس" "مہاکوشل اکسپرس" ہوجاتی ہے۔ اور پاکستان میں معمولی لفظی تبدیلی سے "کرشن نگر" اچانک "اسلام نگر" بن جاتا ہے۔

تاہم زمانہ شاید اپنی سست رفتاری کی بنا پر ان ملکوں کی بلند پروازی کا ساتھ نہ دے سکا۔ ہندستان اور پاکستان الفاظ کے اعتبار سے اپنے ترقیاتی سفر کے آخری زینہ پر پہنچ چکے ہیں، مگر واقعہ کے اعتبار سے دیکھئے تو ابھی وہ پہلے زینہ پر بھی اپنا قدم جمانے میں کامیاب نہ ہوسکے۔

مانک پور سے ٹرین آگے بڑھی تو ۲۸ مارچ کا سورج نکل رہا تھا۔ صبح اور شام کی تقسیم زمین کی گردش سے پیدا ہوتی ہے۔ مگر بظاہر وہ سورج کی گردش سے پیدا ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔ چنانچہ بطلیموس (Ptolemy) سے لے کر کوپرنیکس (Copernicus) تک تقریباً دو ہزار سال ایسے گزرے ہیں کہ انسان اسی غلط فہمی میں مبتلا رہا کہ صبح و شام کا فرق سورج کی گردش کا کرشمہ ہے۔ اس مثال کے ذریعہ شاید انسان کو یہ سبق دیا جارہا ہے کہ چیزوں کو ظاہری صورت (Face value) پر نہ لو بلکہ گہرائی تک جاکر اصل حقیقت معلوم کرو۔ کیوں کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ حقیقت کچھ اور ہوتی ہے اور ظاہر میں کچھ اور دکھائی دیتی ہے۔

یہاں ریلوے لائن کے دونوں طرف دور تک کھلے ہوئے جنگل تھے۔ ان جنگلات میں کثرت سے ڈھاک کے درخت نظر آئے۔ ڈھاک ایک معمولی درخت ہے۔ مگر اس کے پھول نہایت حسین ہوتے ہیں۔ لکڑی کے ٹھنٹھ جیسے تنہ پر لال رنگ کے عدد درجہ خوشنما پھول لدے ہوئے تھے۔ یہ منظر گویا تقسیم خداوندی کی بے نیازی کو بتا رہا تھا۔ خدا چاہے تو لکڑی کے ایک ٹھنٹھ کو حسین پھولوں سے ڈھک دے، اور ایک بظاہر شاداب درخت کو بے پھول کر کے چھوڑ دے۔ خدا کے یہاں انعامات کی تقسیم کا معیار اس سے مختلف ہے جو انسانوں نے اپنے درمیان رائج کر رکھا ہے۔

میں نے جس روٹ پر سفر کیا، اس کی صورت کچھ اس طرح ہے کہ مانک پور تک ٹرین ایک رخ پر چلتی ہے، اس کے بعد انجن آگے سے نکال کر پیچھے کی طرف جوڑ دیا جاتا ہے، اور ٹرین انگریزی کے حرف وی (V) کی شکل میں الٹے رخ پر دوڑنے لگتی ہے۔

مانک پور کے بعد جب ہماری گاڑی "پیچھے کی طرف" چلنے لگی تو اس کو دیکھ کر مجھے خیال

آیا کہ زندگی کے سفر کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ ہر آدمی آگے کی طرف جانا چاہتا ہے۔ مگر اس دنیا کا نظام کچھ اس ڈھنگ پر بنا ہے کہ یہاں کبھی آگے بڑھنے کے لئے پیچھے ہٹنا پڑتا ہے، جیت کو حاصل کرنے کے لئے ہار کو قبول کرنا پڑتا ہے۔ کوئی ممتاز کام کرنے کے لئے گم نامی کی حیثیت پر راضی ہونا پڑتا ہے۔ یہی اس دنیا کا قانون ہے۔ اس دنیا میں جو لوگ "پسپائی" پر راضی نہ ہوں وہ کبھی "اقدام" کی سعادت حاصل نہیں کر سکتے۔

پہلی بار میں غالباً ۱۹۶۱ میں ستنا آیا تھا۔ اس وقت میرے چھوٹے بھائی اے۔ ایم خاں انجینئر یہاں ٹکنکل انسٹی ٹیوٹ میں پرنسپل تھے، میری والدہ ان کے ساتھ مقیم تھیں۔ والدہ سے ملاقات کے لئے میں نے رام پور سے ستنا کا سفر کیا تھا۔

مجھے یاد ہے کہ روزانہ شام کو میں تنہا ٹہلنے کے لئے نکلتا تھا اور ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ دور تک چلا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ میرے چاروں طرف صرف قدرت کا ماحول میری ہمنوائی کے لئے باقی رہتا تھا۔ شہر کے باسیوں سے میں صرف الفاظ کی زبان میں بات کر سکتا تھا۔ مگر یہاں میرے قریب ایک ایسی دنیا ہوتی تھی جس سے الفاظ کے بغیر کلام ہوتا ہے۔ اور جب مخاطب اور متکلم غیر ملفوظ کلام میں مشغول ہوں تو لذت کلام بے حساب گنا حد تک بڑھ جاتی ہے، کیوں کہ ملفوظ کلام محدود ہوتا ہے اور غیر ملفوظ کلام غیر محدود۔

اس علاقہ کا اس سے پہلے میں ایک اور سفر کر چکا ہوں۔ یہ سفر اصلاً سیونی کے جلسۂ سیرت میں شرکت کے لئے تھا۔ اس سلسلہ میں ایک روز کے لئے جبل پور بھی ٹھہرا تھا۔ سیونی شہر ۱۷۷۴ میں آباد ہوا۔ جبل پور مدھیہ پردیش کا دوسرا سب سے بڑا شہر ہے۔ ۱۷۸۱ میں مرہٹوں نے جبل پور کو اپنا صدر مقام بنایا تھا۔ یہاں پانچویں صدی کے بدھسٹ، ہندو اور جین مذہب کے تاریخی آثار ہیں۔

اس سفر کا کوئی سفرنامہ لکھا نہیں جا سکا تھا۔ اب مجھے تاریخ کی تلاش ہوئی۔ مگر اس کی تاریخ مجھے یاد نہیں تھی۔ پرانے کاغذات کو دیکھا تو اس میں اتفاق سے وہ پوسٹر مل گیا جس میں سیونی کے جلسۂ سیرت کے منتظمین نے میرے نام کے ساتھ جلسہ کا اعلان شائع کیا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ سیرت کا یہ جلسہ ۱۴-۱۶ فروری ۱۹۸۱ کو ہوا تھا۔ اس تجربہ کے بعد اس پرانے مقولہ کی حکمت سمجھ میں آئی

کہ ـــــــ داشتہ آید بکار ۔

تحریر بھی اللہ تعالیٰ کی بڑی عجیب نعمت ہے۔ تحریر کے ذریعہ یہ ممکن ہوا ہے کہ واقعات کو اس طرح منضبط کیا جاسکے کہ لمبی مدت گزرنے کے بعد بھی وہ عین اپنی سابقہ صورت میں محفوظ رہیں۔ قرآن میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تعلیم بالقلم کو انسانوں کی ہدایت کا ذریعہ بنایا۔ موجودہ زمانہ میں قلم یا تحریر کے اس فن میں بے شمار ترقیاں ہو چکی ہیں، مگر عجیب بات ہے کہ قلم کے اعلیٰ استعمال میں سب سے پیچھے وہ لوگ ہیں جنھوں نے سب سے پہلے دنیا کو قلم کی قوت کا راز بتایا تھا۔

سفر عام طور پر دو قسم کے ہوتے ہیں، تفریح یا تجارت۔ مگر تیسری زیادہ اہم قسم اس میں چھوٹ گئی ہے۔ اور وہ ہے عبرت۔ اسلامی سفر وہ ہے جو عبرت کا سفر ہو۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آدمی اسی اعلان کے ساتھ اپنے گھر سے نکلے کہ وہ عبرت حاصل کرنے کے لئے باہر جارہا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی عبرت پذیری کے ذہن کے تحت سفر کرے تاکہ ہر سفر اس کے لئے سبق کا ذریعہ بن جائے۔

اصل یہ ہے کہ سفر انسانی شخصیت کی توسیع ہے۔ ایک شخص جو اپنے گھر پر نظر عبرت کے ساتھ رہ رہا ہو، جب وہ باہر نکلے گا تو اس کا سابقہ ذہن وہاں بھی کام کرتا رہے گا۔ اسی طرح جو شخص مفاد پرست ہو، اس کا سفر بھی اس کے لئے مفادات کی تلاش کے ہم معنی ہو جائے گا۔

ایک بیرونی سفر میں میں نے ایک صاحب کو دیکھا کہ وہ اخبار والوں کو تلاش کرتے پھر رہے تھے تاکہ وہاں پہنچنے کے ساتھ اپنی آمد کی خبر اور اپنا انٹرویو چھپوا کر مقامی طور پر متعارف ہوسکیں۔ یہی موجودہ زمانہ میں بیشتر لوگوں کا حال ہے، کچھ لوگ نام ونمود کے اس ذاتی شوق کی تسکین برہنہ انداز میں کرتے ہیں اور کچھ لوگ پردہ داری کے ساتھ اسے انجام دیتے ہیں۔

عام طور پر سفر میں میں اس طرح نکلتا ہوں کہ میرے ساتھ ایک چھوٹے سے بیگ کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا، حتی کہ ایک گلاس بھی نہیں۔ ایک بار میں کسی سفر پر نکلا تو اتفاق سے میرے ساتھ ایک چھوٹا لوٹا بھی تھا۔ مزید اتفاق یہ کہ یہ لوٹا بغیر ٹونٹی والا تھا۔ ایک مسلمان بزرگ نے اس کو دیکھ کر کہا: اس قسم کا لوٹا ہندو تہذیب کی علامت ہے، آپ مسلمان ہیں، آپ کو ٹونٹی دار لوٹا اپنے ساتھ رکھنا چاہئے۔

مسلمان پچھلے سو برس سے اسی قسم کے جھگڑوں میں مشغول ہیں۔ اور اس کو تہذیبی شناخت (Cultural identity) کا خوبصورت نام دئے ہوئے ہیں۔ مسلم قائدین اس معاملہ میں اس انتہا ہنچ گئے ہیں کہ وہ تہذیبی شناخت کے نام پر حکومت کے خلاف مطالباتی مہم چلا رہے ہیں۔ حالاں کہ یبی شناخت کسی گروہ کی اندرونی حالت کا اظہار ہے، وہ خارجی مطالبہ سے حاصل کی جانے والی نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ مسلمان کی پہچان اس قسم کی تہذیبی پہچان نہیں۔ مسلمان کی اصل پہچان اخلاقی ل ہے۔ مسلمان اپنے کردار سے پہچانا جاتا ہے نہ کہ خارجی علامتوں سے۔ قدیم مکہ میں پیغمبر لام اور آپ کے اصحاب داڑھی رکھتے تھے اور پگڑی اور تہمد پہنتے تھے۔ عین یہی طریقہ وہاں ملوں کا بھی تھا۔ رسول اللہ نے ایسا نہیں کیا کہ غیر مسلموں سے الگ اپنی "تہذیب" مقرر کریں۔ آپ مسلمانوں کے لئے جس امتیازی شناخت کی تلقین کی وہ یہ تھی کہ وہ ایک خدا کے پرستار بنیں۔ خوشی رناراضگی دونوں حالتوں میں حق پر قائم رہیں۔ جو کچھ اپنے لئے پسند کرتے ہیں وہی دوسروں کے بھی پسند کریں۔ دوسروں کے لئے ان کے دل میں سلامتی اور خیر خواہی کا جذبہ ہو نہ کہ بغض حسد اور انتقام کا۔ مسلمان اگر یہ "پہچان" کھودیں تو دوسری کسی پہچان کا چیمپین بننا انھیں خدا نظر میں محبوب نہیں بنا سکتا۔

شام کو ۴ بجے ٹرین مجھ کو لے کر دہلی سے روانہ ہوئی۔ رات بھر چلنے کے بعد اگلے دن بجے ستنا کا اسٹیشن سامنے تھا۔ اب سفر کی مدت پوری ہو چکی تھی۔ دروازہ کھلا اور میں ٹرین باہر نکل کر "دوسری دنیا" میں آگیا۔

تکمیل سفر کا یہ تجربہ میرے ذہن میں تکمیل عمر کا تجربہ بن گیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرا فر حیات آخری مرحلہ میں پہنچ گیا ہو اور میں دنیا سے نکل کر آخرت کے عالم میں داخل ہو رہا ہوں ـــــ یہ لمحہ ہر آدمی پر آنے والا ہے۔ دنیا کا سفر شاید اسی لئے کرایا جاتا ہے کہ آدمی آخرت ے اصل سفر کو یاد کرے، وہ عارضی واقعہ میں مستقل واقعہ کی تصویر دیکھ لے، اور آخرت سے دوچار ونے سے پہلے آخرت کی تیاری کر لے۔

ستنا میں میرا قیام جناب اقبال احمد صاحب ایم اے کے یہاں تھا۔

ستنا سے مجھے ریوا جانا تھا۔ یہ سفر روڈ کے ذریعہ طے ہوا۔ ہمارے ایک نوجوان ساتھی گاڑی چلا رہے تھے۔ میں نے دیکھا کہ سڑک پر جب سامنے سے کوئی گاڑی آتی ہے تو وہ اپنی گاڑی سائڈ میں کر دیتے ہیں۔ ایک طرف سے سامنے والی گاڑی گزر جاتی ہے اور دوسری طرف سے ہماری گاڑی۔ یہ واقعہ ملک کی سڑکوں پر ہر روز کروروں بار پیش آتا ہے اور بے شمار لوگ اس کو دیکھتے ہیں۔ مگر ہر آدمی اس کو " ٹریفک " کا ایک واقعہ سمجھتا ہے۔ کوئی شخص اس کو وسیع تر زندگی سے نہیں جوڑتا۔ حالاں کہ اس دنیا میں جو ٹریفک کا اصول ہے وہی زندگی کا اصول بھی ہے۔ اس دنیا میں دوسرے کو راستہ دینا پڑتا ہے اس کے بعد ہی اپنے لئے راستہ ملتا ہے۔ جو لوگ دوسروں کو راستہ دینے پر راضی نہ ہوں، ان کے لئے اپنا راستہ پانا بھی مقدر نہیں۔

ریوا میں میرا قیام جناب نعیم الدین صاحب نیہار کے یہاں تھا۔ گاڑی قیام گاہ پر رکی۔ میں باہر نکلا تو عین اسی وقت سڑک پر دو ہندو نوجوان سائیکل سوار وہاں آگئے۔ انھوں نے فوراً اپنی سائیکل روک دی، اور نرمی سے کہا " سر، تھوڑا سائڈ " یہ ریوا کے انسان سے میرا پہلا تعارف تھا۔ یہاں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تعلقات نہایت اچھے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کا احترام کرتے ہیں۔ یہاں وہ فرقہ وارانہ مسائل نہیں جو یوپی جیسے علاقوں میں پائے جاتے ہیں۔

اس فرق پر غور کرتے ہوئے میری سمجھ میں آیا کہ اس کی اصل جڑ مسلم بادشاہوں کی تاریخ ہے۔ جو علاقے مسلم بادشاہت کے مرکز تھے، جہاں ان کی یادگاریں ہیں، جہاں ان کے دور کی روایتیں موجود ہیں، وہاں کے مسلمانوں کے ذہن ابھی تک اسی " شاندار ماضی " میں اٹکے ہوئے ہیں۔ ان علاقوں کے حالات مسلمانوں کے اندر " پدرم سلطان بود " کی نفسیات کو زندہ رکھتے ہیں۔ اور یہی اس علاقہ کے مسلمانوں کا اصل مسئلہ ہے۔ چنانچہ جن علاقوں میں اس نفسیات کے اسباب نہیں ہیں، وہاں کے مسلمانوں کے لئے کوئی مسئلہ بھی نہیں۔

ریوا کے جنگلات کسی زمانہ میں شیر کے لئے مشہور تھے۔ دہلی کے چڑیا گھر کا سفید شیر اسی ریوا کے جنگل سے حاصل کیا گیا تھا۔ ۱۹۵۱ میں ریوا کے جنگل میں ایک سفید شیر پکڑا گیا۔ یہ ۹ ماہ کا بچہ تھا۔ اس کا نام " موہن " رکھا گیا۔ اور راجہ کے محل میں اس کی پرورش ہوئی۔ بڑا ہونے کے بعد ۱۹۵۵ میں ایک عام رنگ کی شیرنی سے اس کا جوڑا ملایا گیا۔ اس کے نتیجے میں چار بچے پیدا ہوئے مگر وہ

سب عام شیروں جیسے تھے۔ اس کے بعد دوبارہ ان میں سے ایک شیرنی کا اور موہن کا جوڑا ملایا گیا۔ اس تعلق کے بعد ۱۹۵۸ میں چار بچے پیدا ہوئے اور یہ چاروں سفید تھے ——— یہ گویا قدرت کا سبق ہے کہ پہلی کوشش میں اگر تمہیں کامیابی نہ ہو تب بھی تم کو ناامید نہ ہونا چاہئے۔

سفید شیر بہت نادر قسم ہے۔ ساری دنیا میں اس وقت تقریباً ۰۷ سفید شیر پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے ۲۵ شیر صرف ہندستان میں ہیں۔ سفید شیر عادات وخصائل کے اعتبار سے دوسرے شیروں جیسا ہی ہوتا ہے۔

شیر دودھ والے جانوروں کا شکار کرکے کھاتا ہے۔ وہ بھیڑیا اور سانپ جیسے جانوروں کو نہیں کھاتا۔ تاہم اس معاملے میں بھی وہ ایک فرق کو ہمیشہ ملحوظ رکھتا ہے۔ اگر آپ شیر کے بارہ میں کوئی کتاب پڑھیں تو شیر کا عالم آپ کو بتائے گا کہ شیر انھیں جانوروں پر حملہ کرتا ہے جن کے متعلق وہ جانتا ہے کہ وہ آسانی کے ساتھ ان پر قابو پاسکتا ہے۔ بڑے جانور، جیسے ہاتھی، جنگلی بھینسا وغیرہ پر حملہ کرنے سے وہ عام طور پر احتراز کرتا ہے:

Healthy large mammals are generally avoided (IX/1004).

یہ شیر کا طریقہ ہے جو خدا کی فطرت گاہ میں تربیت پاکر نکلتا ہے۔ انسان کو خدا نے آزاد کرکے اسے عقل دیدی کہ وہ خود اپنے فیصلے سے صحیح طرز عمل اختیار کرے۔ مگر انسان کمزور ہونے کے باوجود، اپنے سے طاقت ور پر حملہ کرتا ہے۔ اور پھر جب لازمی نتیجہ کے طور پر برباد ہوتا ہے تو دوسرا جرم یہ کرتا ہے کہ اپنی حماقت کا اعلان کرنے کے بجائے دوسروں کے ظلم اور سازش کا انکشاف کرنے میں مشغول ہوجاتا ہے۔

ریوا میں جن لوگوں سے ملاقات ہوئی ان میں سے ایک پرفیسر اختر حسین نظامی ہیں۔ انھوں نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے تاریخ میں ایم اے کیا ہے۔ اس سلسلہ میں وہ ۱۹۲۷ سے ۱۹۳۵ تک علی گڑھ میں رہے ہیں۔ یہ سرسید کے پوتے راس مسعود کا زمانہ تھا۔ انھوں نے بتایا کہ راس مسعود جس زمانہ میں پیدا ہوئے اس وقت علی گڑھ میں ایک انگریز کلکٹر مسٹر راس (Ross) تھا۔ مسٹر راس کا نام مسعود میں جوڑ کر راس مسعود بنایا گیا۔ راس انگریز سے راس مسعود کے والد (سید محمود) کی دوستی تھی۔ اس انگریز افسر نے سید محمود سے کہا کہ تم اپنے لڑکے کے نام کے ساتھ میرا نام

"راس" جوڑ دو تو یہ ہماری دوستی کا مستقل نشان ہوگا۔ چنانچہ مسود کو راس مسعود کہا جانے لگا۔

دور جدید کی تاریخ میں صرف ایک ہی قابل ذکر مسلمان ہیں جنھوں نے جب یہ مغرب کی اہمیت کو محسوس کیا اور مسلمانوں کو اس طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی۔ اور وہ سرسید ہیں۔ مگر سرسید گروپ کی پہنچ صرف مغرب کی تہذیبی تقلید تک ہوسکی، وہ مغرب کی سائنسی تقلید کی اہمیت کو نہ سمجھ سکے۔ تاہم پہلے شخص کی حیثیت سے سرسید کا گروہ قابل معافی ہوسکتا ہے۔ اگر ان کے بعد کوئی دوسرا شخص مسلمانوں میں اٹھتا جو مغربی سائنس کی اہمیت کی طرف مسلمانوں کو متوجہ کرتا تو ابتدائی کمی کی تلافی ہوجاتی۔ مگر بدقسمتی سے ایسا نہ ہوسکا۔ اور مسلمان دور جدید میں دوسری قوموں سے کم از کم سو سال پیچھے ہوگئے۔

ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے قانون میں اعلیٰ ڈگری لی ہے۔ اس کے بعد وہ پریکٹس کرنے والے تھے۔ اس درمیان میں انھیں الرسالہ اور دوسری کتابیں مل گئیں۔ انھوں نے ان کا مطالعہ کیا تو وہ بالکل بدل گئے۔ انھوں نے طے کیا کہ اب وہ پریکٹس کرنے کے بجائے "اسلامی قانون اور انسانی قانون" پر ریسرچ کریں گے۔ اور قانون میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری لے کر اس میدان میں دین کی خدمت کریں گے۔ چنانچہ وہ اس میدان میں سرگرم ہیں۔

ایک تعلیم یافتہ بزرگ میرے قیام کے دوران بار بار آتے رہے اور ہر مجلس میں شریک رہے انھوں نے کہا کہ میرا مسلک یہ ہے کہ میں ہر عالم کی عزت کرتا ہوں اور اسی جذبہ کے تحت آپ کی مجلسوں میں بھی شرکت کرتا رہا ہوں۔ میرا قول ہے کہ لانفرق بین احد من العلما (ہم ایک عالم اور دوسرے عالم کے درمیان فرق نہیں کرتے)

۲۸ مارچ کو نماز ظہر کے بعد بھیا کی مسجد میں اجتماع تھا۔ اس موقع پر میں نے "اللہ اکبر" کی تشریح کی۔ میں نے کہا کہ یہ لفظ جو روزانہ نمازوں میں بار بار دہرایا جاتا ہے، اس کو آجکل کے مسلمانوں نے ایک قسم کا نعرہ بنالیا ہے جس کو وہ اپنے قومی جھگڑوں اور لڑائیوں میں دوسروں کے خلاف استعمال کرتے ہیں۔ حالاں کہ "اللہ اکبر" نعرۂ احتساب ہے نہ کہ نعرۂ جنگ۔ اللہ اکبر کا پیغام یہ ہے کہ خدا بڑا ہے، اس لئے مجھے چھوٹا بن کر دنیا میں رہنا ہے۔ مگر مسلمانوں نے اس کا مطلب یہ سمجھ رکھا ہے کہ خدا بڑا ہے، اس لئے مجھے دوسروں کو چھوٹا بنانا ہے۔ جو لفظ حقیقۃً احتساب خویش کا عنوان تھا اس کو مسلمانوں نے احتساب غیر کا عنوان بنادیا۔ اس قسم کی تبدیلی صرف فساد پیدا کرتی ہے، وہ کسی بھی درجہ میں کوئی

اصلاح پیدا نہیں کرتی۔ اس بات کو میں نے مختلف مثالوں کے ذریعہ واضح کیا۔

۲۸ مارچ کی شام کو وینکٹ بھون میں پروگرام تھا۔ اس میں مسلم اور غیر مسلم تعلیم یافتہ لوگ شریک تھے یہ ہال راجہ وینکٹ رمن سنگھ کا بنوایا ہوا ہے جو موجودہ راجہ مارتنڈ سنگھ (ایم پی) کے والد تھے۔ اس ہال کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں چار شیر بھس بھرے ہوتے (Stuffed) رکھے ہوئے ہیں۔

یہاں میری تقریر کا موضوع "اسلام اور انسانی برابری" تھا۔ اس میں قرآن و حدیث کی تعلیمات بتائی گئیں اور ان کو مختلف مثالوں سے واضح کیا گیا۔ ایک بنیادی بات میں نے یہ کہی کہ انسانوں کے درمیان ہمیشہ فرق ہوتا ہے، کوئی بڑا ہوتا ہے اور کوئی چھوٹا، کوئی طاقتور ہوتا ہے اور کوئی کمزور۔ اسی سے نابرابری کا ماحول پیدا ہوتا ہے۔ اس نوعیت کی نابرابری سماج میں ہمیشہ باقی رہے گی۔ انسانوں کی کاٹ چھانٹ کر کے آپ انھیں برابر نہیں کر سکتے، جیسا کہ کمیونزم نے ناکام طور پر کرنے کی کوشش کی۔

انسانوں کے درمیان برابری قائم کرنے کی عملی صورت صرف یہ ہے کہ ان کے درمیان ایسی ہستی کو کھڑا کر دیا جائے جس کے آگے سب اپنے کو چھوٹا محسوس کرنے لگیں۔ خدائے برتر کا عقیدہ یہی کام کرتا ہے۔ کسی سماج میں اگر خدا کی بڑائی زندہ عقیدہ کے طور پر آجائے تو وہاں اپنے آپ برابری اور مساوات کا ماحول قائم ہو جائے گا۔ کیوں کہ انسان آپس میں ایک دوسرے سے بڑے ہیں، مگر خدا کے مقابلہ میں کوئی بڑا نہیں۔

میں نے کہا کہ اس ہال میں چار مردہ شیر موجود ہیں۔ مگر موجودہ حالت میں وہ ہمارے اندر ہلچل پیدا نہیں کرتے۔ لیکن اگر ایسا ہو کہ چار زندہ شیر یہاں داخل ہو کر دھاڑنے لگیں تو معاملہ بالکل دوسرا ہو۔ آپس میں لوگ نابرابر ہیں، مگر زندہ شیر کے مقابلہ میں تمام لوگ برابر۔ ایک لطیفہ ہے کہ کچھ اونٹ آپس میں بحث کر رہے تھے کہ کون زیادہ اونچا ہے۔ چوں کہ ہر ایک میں تھوڑا تھوڑا فرق تھا۔ اس لئے فیصلہ نہیں ہو رہا تھا۔ کسی نے ان اونٹوں کو لے جا کر پہاڑ کے سامنے کھڑا کر دیا۔ اب سب اونٹ چپ ہو گئے۔ کیوں کہ جہاں پہاڑ آجائے وہاں کوئی اونٹ بڑا نہیں رہ جاتا۔

جب شیر اور پہاڑ لوگوں کے اونچ نیچ کو ختم کر دیتے ہیں تو وہ خدا جو تمام شیروں کا اور تمام پہاڑوں کا خالق ہے، اس کی موجودگی کا احساس لوگوں کو کتنا زیادہ متاثر کرے گا۔ حقیقت یہ

نابرابری کو ختم کرنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ انسانوں کو ان کے خدا کے سامنے کھڑا کر دیا جائے۔

ریوا سے ستنا کے لئے واپسی بذریعہ روڈ ہوئی۔ ہماری گاڑی کے ڈرائیور گلاب خاں (پیدائش ۱۹۲۶) تھے۔ وہ ستنا کے رہنے والے ہیں۔ اور پچھلے ۴۵ سال سے ڈرائیوری کا کام کرتے رہے ہیں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آپ اپنے تجربہ کی روشنی میں بتائیے کہ گاڑی میں ایکسیڈنٹ سے بچنے کی ترکیب کیا ہے۔ انھوں نے کہا:

"آگے کی پوزیشن کو دیکھ کر اپنے کو کنٹرول کرنا چاہئے"۔

اس میں شک نہیں کہ سڑک کی سواری کے لئے محفوظ سفر کا واحد راز یہی ہے۔ مگر اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ زندگی کے وسیع تر سفر کو محفوظ اور کامیاب سفر بنانے کا راز بھی یہی ہے۔ کوئی شخص دنیا میں اکیلا نہیں ہے۔ جس طرح وہ خود زندگی کی دوڑ میں ہے، اسی طرح دوسرے لوگ بھی زندگی کی دوڑ لگا رہے ہیں۔ ایسی حالت میں دوسروں کی دوڑ سے سابقہ پیش آنا لازمی ہے۔ اس دو طرفہ دوڑ میں وہی شخص حادثہ سے بچ سکتا ہے جو سامنے والے کو دیکھ کر اپنے آپ کو قابو میں رکھے۔

ستنا کا ایک بڑا محلہ نذیر آباد کہا جاتا ہے۔ اس محلے کے ساتھ ایک تاریخ وابستہ ہے جس میں بہت بڑا سبق ہے۔

محلہ کا یہ نام حاجی نذیر احمد مرحوم (۱۸۷۵ - ۱۹۶۰) کے نام پر ہے۔ وہ یہاں کے بڑے زمیندار تھے۔ انھوں نے اسٹیشن کے قریب تقریباً پندرہ ایکڑ زمین لوگوں کو مکان بنانے کے لئے مفت دے دی۔ چنانچہ بہت سے لوگوں نے یہاں مکانات بنائے، جن میں ہندو بھی ہیں اور مسلمان بھی۔ تاہم اکثریت مسلمانوں کی ہے۔ ان بسنے والوں نے معطی کے اعتراف کے طور پر محلہ کا نام نذیر آباد رکھ دیا۔

ستنا کی توسیع و ترقی کے ساتھ یہ جگہ اہم ہوتی گئی۔ چنانچہ کچھ فرقہ پرست ہندوؤں نے یہ تحریک چلائی کہ اس بستی کا نام نذیر آباد کے بجائے مالویہ نگر رکھ دیا جائے۔ انھوں نے اپنے گھروں اور دکانوں پر مالویہ نگر کے بورڈ لگائے۔ خطوط کے پتہ میں مالویہ نگر لکھنا شروع کیا۔ حتی کہ مالویہ نگر کے نام سے یہاں ایک چھوٹا سا ڈاک خانہ کھلوا دیا۔ مگر ان کی ساری کوششوں کے باوجود یہ نام مشہور نہ ہو سکا۔

ایک صاحب نے بتایا کہ ایک بار وہ ستنا کے دھرم شالہ میں گئے۔ وہاں ایک شخص باہر سے آیا تھا۔ اس کے پاس "مالویہ نگر" کا پتہ تھا۔ مگر دھرم شالہ میں کوئی شخص اس کو یہ بتانے والا نہیں ملا کہ "مالویہ

نگر" کہاں ہے۔ یہی حال اکثر ان خطوط کا ہوتا تھا جس پر مالویہ نگر لکھا ہوا ہوتا تھا۔ غرض فرقہ پرست افراد کی ساری کوششوں کے باوجود مالویہ نگر کا نام رائج نہ ہوسکا۔ اور نذیر آباد بدستور نذیر آباد ہی بنا رہا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ" مالویہ نگر" کے حامیوں کے پاس صرف تعصب تھا۔ اس کے مقابلہ میں" نذیر آباد" کے حامیوں کے پاس حقیقت تھی۔ اور جب تعصب اور حقیقت میں ٹکراؤ ہو تو حقیقت باقی رہتی ہے نہ کہ تعصب۔

ستنا کا نام ریونیو ریکارڈ میں رگھو راج نگر لکھا ہوا ہے۔ رگھو راج سنگھ یہاں کے راجہ تھے ان کے نام پر راجگان نے اس کا نام رگھو راج نگر رکھا تھا۔ مگر ستنا ریلوے اسٹیشن کا نام چونکہ ستنا تھا اس لئے عوام میں " ستنا " کا لفظ ہی جاری رہا، اور رگھو راج نگر جاری نہ ہوسکا۔

دوسری برعکس مثال مذکورہ بالا محلہ نذیر آباد کی ہے۔ بسانے والے مسلمان کے نام پر اس کا نام نذیر آباد ہے۔ یہاں کے فرقہ پرست عناصر نے اس کا نام " مالویہ نگر " رکھا اور ہر قسم کی کوشش کی کہ اس کا نام مالویہ نگر مشہور ہوجائے۔ مگر ساری کوشش کے باوجود نذیر آباد نذیر آباد ہی رہا، وہ مالویہ نگر نہ ہوسکا۔

زندگی میں جو چیز فیصلہ کن بنتی ہے وہ تعصب نہیں، حقیقت ہے۔ حقیقت باقی رہتی ہے، اور تعصب گرد و غبار بن کر فضا میں اڑ جاتا ہے۔ حقائق اگر " رگھو راج نگر " کے حق میں نہ ہوں بلکہ " ستنا " کے حق میں ہوں تو ستنا چل جائے گا، رگھو راج نگر نہیں چلے گا۔ اسی طرح حقائق اگر" نذیر آباد" کے حق میں ہوں، " مالویہ نگر " کے حق میں نہ ہوں، تو نذیر آباد چل جائے گا اور مالویہ نگر فضا میں گم ہوکر رہ جائے گا۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ حقائق کو اپنے موافق بنائے، کیوں کہ بالآخر جو چیز باقی رہتی ہے وہ حقائق ہیں نہ کہ تعصب اور ظلم۔

ایک صاحب نے بتایا کہ وہ ستنا سے جبل پور کے لئے بذریعہ کار روانہ ہوئے۔ ان کے پاس چار " الرسالہ کیسٹ " تھے۔ راستہ میں وہ ایک کے بعد ایک کیسٹ لگاتے گئے۔ اور راستہ چلتے ہوئے تمام کیسٹ سن لیا۔ ان کے ساتھ ایک وکیل صاحب بھی سفر کر رہے تھے۔ انھوں نے پہلی بار یہ کیسٹ سنا۔ انھوں نے کہا کہ یہ کیسٹ تو اتنے اثر انگیز تھے کہ پورا راستہ طے ہوگیا اور سفر کا اندازہ ہی نہیں

ہوا۔ وہ اس کی فکر سے غیر معمولی طور پر متاثر ہوئے اور الرسالہ کے مستقل قاری بن گئے۔

آجکل کے مشغول انسان کے لئے آڈیو کیسٹ دعوت کا نہایت کارآمد ذریعہ ہے۔ میری مشغولیت کی وجہ سے الرسالہ کیسٹ کا سلسلہ ایک عرصہ سے بند تھا۔ اب خیال ہو رہا ہے کہ اس کو دوبارہ جاری کر دینا چاہئے۔

ملک کے دوسرے علاقوں کی طرح یہاں بھی خدا کے فضل سے الرسالہ کافی پھیلا ہے۔ جو شخص ایک بار الرسالہ پڑھ لیتا ہے، وہ خود ہی اس کا مبلغ بن جاتا ہے اور اس کو اپنے ماحول میں پھیلانا شروع کر دیتا ہے۔ ستنا کی ایک مسجد میں تذکیر القرآن مسلسل پڑھ کر سنائی جا رہی ہے۔ یہاں بہت سے غیر مسلم حضرات بھی الرسالہ اور کتابیں پڑھ رہے ہیں۔ مثلاً ٹھاکر لال بکرم جیت سنگھ کے متعلق معلوم ہوا کہ وہ دلچسپی کے ساتھ "پیغمبر انقلاب" کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ پروفیسر کلیم احمد خاں صاحب نے اسلامی مرکز کی تمام چھوٹی بڑی کتابیں منگوا کر مجلد کرا لی ہیں اور منتظم طریقے سے انہیں دوسروں کو پڑھا رہے ہیں۔ وغیرہ، وغیرہ۔

ستنا میں ایک صاحب نے میری گفتگو سننے کے بعد کہا کہ آپ صبر اور اعراض کی تلقین کرتے ہیں۔ حالاں کہ لقمان حکیم کا قول ہے کہ "اتنے میٹھے نہ بنو کہ لوگ تم کو ہڑپ کر جائیں اور نہ اتنے کڑوے بنو کہ لوگ تمہیں تھوک دیں۔" اسی طرح ایک اور صاحب نے کہا کہ آپ ایڈجسٹمنٹ کی باتیں کرتے ہیں حالاں کہ اقبال نے کہا ہے:

زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ ستیز

میں نے کہا کہ میں جو کچھ کہتا ہوں، قرآن و حدیث کے حوالہ سے کہتا ہوں، اور آپ لوگ اس کے جواب میں مقولہ اور شعر پیش کر رہے ہیں۔ جب کوئی بات قرآن و حدیث کے حوالے سے کہی جائے تو آدمی کو چاہئے کہ اس کے جواب میں قرآن و حدیث پیش کرے۔ اور اگر اس کے پاس قرآن و حدیث نہ ہو تو چپ رہے۔

حضرت عبد اللہ بن عباس نے بعد کے زمانہ میں ایک بار کسی مسئلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول لوگوں کو سنایا۔ انھوں نے اس کے جواب میں کہا کہ ابوبکر و عمر نے تو ایسا اور ایسا کہا ہے۔ اس پر حضرت عبد اللہ بن عباس غضب ناک ہو گئے۔ انھوں نے فرمایا: قریب ہے کہ تمہارے اوپر

آسمان سے پتھر برسیں۔ میں کہتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا، اور تم کہتے ہو کہ ابوبکر و عمر نے کہا (قال ابن عباس، یوشک ان تنزل علیکم حجارۃ من السماء۔ اقول قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وتقولون قال ابوبکر و عمر)

ایک صاحب نے کہا کہ آجکل اردو اخباروں اور رسالوں میں آپ کے خلاف لکھا جا رہا ہے، مگر آپ ان کا جواب نہیں دیتے۔ میں نے کہا کہ اگر کوئی شخص واقعی معنوں میں دینی یا علمی تنقید پیش کرے تو ہم ضرور اس کے بارہ میں لکھیں گے۔ مگر آجکل جو تحریریں ہمارے خلاف چھپ رہی ہیں ان میں کوئی دینی یا علمی دلیل نہیں۔ قرآن کی اصطلاح میں یہ سب لغو تحریریں ہیں۔ اور لغو بات کے سلسلہ میں ہمیں اعراض کرنے اور درگذر کرنے کا حکم دیا گیا ہے (المؤمنون ۳، الفرقان ۷۲)

سورہ القصص (۵۵) میں اہل ایمان کی ایک جماعت کا ذکر ہے۔ کچھ لوگوں نے ان کے دین کا مذاق اڑایا، اور ان کے ساتھ جہالت کی۔ انھوں نے اس کا براہ راست جواب نہیں دیا۔ بلکہ یہ کہہ کر ان سے الگ ہو گئے کہ ہمارے لئے ہمارے اعمال ہیں اور تمہارے لئے تمہارے اعمال ہیں۔ تم کو سلام، ہم بے سمجھ لوگوں سے الجھنا نہیں چاہتے۔

میں نے ان مخالفانہ تحریروں کو پڑھا تاکہ ان میں اگر واقعی کوئی بات ہو تو اس کی وضاحت کی جائے۔ مگر میں نے پایا کہ یہ تمام تحریریں بالکل غیر سنجیدہ ہیں۔ ان میں استہزاء، بے بنیاد الزام اور لفظی سب وشتم کے سوا اور کچھ نہیں۔ پھر ایسی لغو باتوں کا کیا جواب دیا جائے۔ اس قسم کے لغو کلام سے تو صرف اعراض ہی کیا جا سکتا ہے۔

مدھیہ پردیش ایک ہندی ریاست ہے۔ یہاں ۹۵ فی صد لوگ ہندی ہی میں لکھتے پڑھتے ہیں۔ اس بنا پر یہاں کے لوگوں نے شدت سے مطالبہ کیا کہ الرسالہ کا ہندی اڈیشن جاری کیا جائے۔ اس سلسلہ میں مزید بات یہ سامنے آئی کہ الرسالہ کا ہندی ترجمہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ صرف یہ کیا جائے کہ اردو الرسالہ ہی کو ہندی رسم الخط میں شائع کیا جائے۔

یہ بات مجھے بہت درست معلوم ہوتی ہے۔ میں نے ہندوؤں اور مسلمانوں سے ملاقاتوں کے دوران محسوس کیا کہ یہ لوگ خواہ اردو کو پڑھ نہ سکیں مگر وہ کم از کم آسان اردو کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔ مثلاً بار ایسوسی ایشن کے اجتماع (۲۹ مارچ) میں ۹۹ فی صد ہندو صاحبان تھے اور سارا ہال

پوری طرح بھرا ہوا تھا۔ مگر میری اردو تقریر کو ہر آدمی نے پوری طرح سمجھا۔ اسی طرح دوسرے اجتماعات میں بھی ہندو صاحبان اور ہندی داں لوگ تھے، مگر کسی ایک شخص نے بھی یہ شکایت نہیں کی کہ آپ کی زبان سمجھ میں نہیں آئی۔

ان حالات کی روشنی میں ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ موجودہ اردو الرسالہ ہی کو رسم الخط بدل کر ہندی میں شائع کیا جائے۔ انشاء اللہ اس پر جلد عمل کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

ایک صاحب سے ملاقات ہوئی جو اسلام کی سیاسی تعبیر سے متاثر ہیں۔ انھوں نے کہا کہ مسلمانوں کو سیاسی اور اجتماعی اعتبار سے غالب کرنے کے لئے آپ کے پاس کیا پروگرام ہے۔ کیوں کہ آج سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ مسلمان غلبۂ کفر کے تحت زندگی گزار رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ یہ مفروضہ بجائے خود غلط ہے۔ اس ملک میں "کفر" کا اقتدار نہیں ہے بلکہ "سیکولرزم" کا اقتدار ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ یہاں غلبۂ کفر کی حالت نہیں ہے بلکہ غلبۂ ناطرفداری کی حالت ہے۔ یہ صورت حال عین ہمارے حق میں ہے۔ اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے اس کو ہمیں بھرپور طور پر استعمال کرنا چاہئے۔

۲۹ مارچ کی دوپہر کو محمدیہ احسانیہ ہائر سکنڈری اسکول (ستنا) میں پروگرام تھا۔ شہر کے مسلم اہل فکر اور اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات اکٹھا ہوئے۔ اس موقع پر علم کی اہمیت پر گفتگو کی گئی۔ میں نے بتایا کہ علم کا تعلق سروس سے محض ثانوی ہے۔ علم بذات خود مطلوب ہے۔ علم سے ذہن وسیع ہوتا ہے۔ آدمی دین کا اور تاریخ کا مطالعہ کرتا ہے اور اس طرح اس قابل بنتا ہے کہ زیادہ گہری واقفیت کے ساتھ زندگی کی منصوبہ بندی کر سکے۔ اس بات کو تاریخ کی مثالوں سے واضح کیا گیا۔

نذیر آباد (ستنا) کی مسجد میں ۳۰ مارچ کو نماز فجر کے بعد درس تھا۔ قرآنی آیات اور احادیث کی روشنی میں دین میں شکر کی اہمیت بتائی گئی اور یہ بتایا گیا کہ دوزخ اور جنت کیا ہے، اور کس قدر ضروری ہے کہ آدمی دوزخ سے بھاگے اور جنت کا حریص بنے۔

۲۹ مارچ کو دن میں ۲ بجے ستنا کے ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشن میں پروگرام تھا۔ پورا ہال وکیل صاحبان سے بھرا ہوا تھا۔ ڈسٹرکٹ جج اور مجسٹریٹ صاحبان بھی موجود تھے۔

میں نے تقریر شروع کرتے ہوئے ایک واقعہ بیان کیا۔ دہلی میں میری ملاقات ایک وکیل صاحب سے ہوئی۔ وہ فوجداری میں وکالت کرتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہم لوگ پورا مقدمہ ایف

آئی آر (F.I.R) پر چلاتے ہیں۔ ہم اس کھوج میں نہیں پڑتے کہ واقعہ کی اصلیت کیا ہے۔ اگر وکیل واقعہ کی اصلیت کو دیکھے تو پھر اس کا ٹائر پنکچر ہو جائے گا۔

میں نے کہا کہ آپ لوگ قانون داں ہیں۔ آپ معاملہ کے لیگل پہلو کو دیکھتے ہیں۔ مگر اسلام معاملہ کے اسپریچول پہلو کو دیکھتا ہے۔ وہ آدمی کے اندر کو متاثر کرتا ہے۔ وہ آدمی کے ٹائر کو پنکچر کر دینا چاہتا ہے۔

پھر میں نے کہا کہ ہر آدمی کے اندر بیک وقت دو قوتیں ہیں۔ ایک وہ جس کو قرآن میں نفس امارہ کہا گیا ہے۔ اور دوسرا وہ جس کو نفس لوامہ کہا گیا ہے۔ نفس امارہ دراصل وہی چیز ہے جس کو آج کل انا (Ego) کہا جاتا ہے اور نفس لوامہ سے مراد ضمیر (Conscience) ہے۔ اب یہ آپ کا امتحان ہے کہ آپ دونوں میں سے کس صفت کو جگاتے ہیں۔ اگر آپ نے آدمی کی انا کو جگایا تو اس کی سرکشی آپ کے حصہ میں آئے گی۔ اور اگر آپ نے اس کے ضمیر کو جگایا تو اس کے ضمیر کا فیصلہ آپ کے حصہ میں آئے گا۔

۲۷ مارچ کی شام کو مہاویر بھون (ستنا) میں پروگرام تھا۔ ہندو اور مسلمان دونوں بہت بڑی تعداد میں شریک ہوئے۔ تقریر کا موضوع "اسلام اور قیام امن" رکھا گیا تھا۔ میں نے کہا کہ دہلی کے ایک انگریزی اخبار میں حال میں ایک آرٹیکل چھپا تھا، جس کا عنوان تھا:

Bilateralism is Best

یعنی دوطرفہ طریقہ بہترین طریقہ ہے۔ دو فریق کے درمیان اختلاف اور شکایت ہو تو دونوں کو نصف نصف ذمہ داری لے کر معاملہ کو ختم کر دینا چاہئے۔ میں نے کہا کہ یہ بالکل غیر عملی بات ہے۔ اس دنیا میں "ففٹی ففٹی" کی بنیاد پر کبھی کوئی اختلافی مسئلہ ختم نہیں ہوتا۔ میں نے کہا کہ صحیح طریقہ اس کے برعکس ہے۔ صحیح طریقہ یک طرفہ طریقہ ہے:

Unilateralism is Best

مگر یک طرفہ طریقہ پر عمل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ آدمی کے دل میں انسانوں کے لئے محبت اور خیر خواہی کا دریا بہہ رہا ہو۔ چوں کہ لوگ نفرت میں اور ردعمل میں جیتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ وہ یکطرفہ طریقہ پر عمل نہیں کر پاتے۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعات سے بتایا کہ آپ نے قدیم عرب

میں اسی یکطرفہ طریقہ پر عمل کیا اور زبردست کامیابی حاصل کی۔

تقریر کے بعد ایک مسلمان بھائی ملے۔ انھوں نے کہا کہ میں فیض آباد کا رہنے والا ہوں۔ یہاں بزنس کے سلسلے میں آیا تھا۔ پروگرام کی خبر سن کر یہاں آگیا۔ میں آپ کی بات سے بہت متاثر ہوا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کی ایک تقریر فیض آباد میں رکھی جائے۔ وہاں آپ جیسے رہنماؤں کی سخت ضرورت ہے۔

اس جلسہ کے صدر مسٹر شیام سندر شرما (اڈیٹر دیش بندھو) تھے۔ انھوں نے آخر میں اپنی صدارتی تقریر کی اور کہا کہ میں نے اپنی زندگی میں پہلی بار اسلام پر اتنی اعلیٰ تقریر سنی ہے۔ انھوں نے اپنے غیر معمولی تاثر کا اظہار کیا۔

ستنا سے قریب پنا ہے جہاں ہیرے کی کانیں ہیں۔ یہاں بھی الرسالہ جارہا ہے۔ پنا سے آٹھ آدمی ستنا آئے اور پروگرام میں شریک رہے۔ وہ لوگ مجھ کو پنا لے جانا چاہتے تھے مگر وقت کی کمی کے باعث میں وہاں نہ جاسکا۔ انھوں نے بتایا کہ پنا میں باشعور طبقہ برابر الرسالہ کا مطالعہ کر رہا ہے اور اس سے اثر قبول کر رہا ہے۔ وہاں کی ایجنسی کے تحت انگریزی الرسالہ بھی جارہا ہے۔ ایک ہندو تعلیم یافتہ استاد نے انگریزی الرسالہ پڑھ کر کہا کہ الرسالہ ایک ایشوری دین ہے، اس کے ذریعے خدا نے اپنے بندوں کی رہنمائی کا انتظام کیا ہے۔

خطاب عام کے علاوہ، قیام گاہ پر لوگ جمع ہوتے رہے اور مختلف دینی اور ملی موضوعات پر اظہار خیال کا موقع ملا۔ ستنا کی ایک مجلس میں ایک صاحب نے جماعت تبلیغ پر کچھ شخصی اور جزئی نوعیت کے اعتراضات کئے۔ میں نے کہا کہ اعتراض کا یہ طریقہ صحیح نہیں۔ یہ ایک قسم کی سائڈ ٹریکنگ ہے۔ اور سائڈ ٹریکنگ کبھی کسی آدمی کے لئے مفید نہیں ہوتی۔ کسی مشن کے سلسلہ میں ہمیشہ یہ دیکھنا چاہئے کہ اس کا اصل مقصد کیا ہے، اور اصل مقصد کی روشنی میں اس پر رائے قائم کرنا چاہئے۔ جزئی شوشوں اور شخصی قصوں کے پیچھے دوڑنا ایک غیر اسلامی فعل ہے، یہ طالب حق کا طریقہ نہیں۔

پھر میں نے کہا کہ اس وقت ملت میں دو قسم کی کوششیں چل رہی ہیں۔ ایک کو میں اپنے الفاظ میں خارج اورینٹڈ کہوں گا، اور دوسری کو داخل اورینٹڈ۔ میرے مطالعہ کے مطابق تبلیغی جماعت واحد جماعت ہے جس کو داخل اورینٹڈ تحریک کہا جاسکتا ہے۔ اس ایک کے سوا جتنی بھی تحریکیں ملت

کے اندر چل رہی ہیں ، وہ تقریباً بلا استثناء خارج اورینٹڈ ہیں۔ اس کے بعد میں نے وہ حدیث سنائی جس میں بتایا گیا ہے کہ "قلب" کی اصلاح پورے "جسم" کی اصلاح کا ذریعہ ہے۔ اور قلب کا بگاڑ پورے جسم کے بگاڑ کا ذریعہ۔

یہ ہے وہ اصلی فرق جو تبلیغی جماعت اور دوسری جماعتوں میں پایا جاتا ہے۔ نہ کہ وہ شخصی اور جزئی باتیں جو آپ نے فرمائیں۔ پھر میں نے کہا کہ میں نے قرآن و حدیث کا جو مطالعہ کیا ہے، اس کے مطابق میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ داخل اورینٹڈ طریقہ ہی پیغمبرانہ طریقہ ہے۔ اس کے برعکس خارج اورینٹڈ سرگرمیاں جن میں لوگ مشغول ہیں وہ سراسر غیر پیغمبرانہ ہیں۔ اس قسم کی خارجی سرگرمیوں سے نہ اب تک کوئی حقیقی دینی کام ہوا ہے اور نہ آئندہ ہو سکتا ہے۔ جو لوگ ان خارجی سرگرمیوں سے اعلیٰ نتائج کی امید کر رہے ہیں وہ ببول کے درخت سے آم کی فصل کی امید کئے ہوئے ہیں۔ ایسی امید خدا کی اس دنیا میں کبھی پوری ہونے والی نہیں۔

ستنا میں ایک اندوہناک تجربہ سامنے آیا۔ ایک مسلمان بزرگ مجھ سے ملے۔ وہ ساٹھ سال کی عمر میں ۸۰ سال کے معلوم ہو رہے تھے۔ بدن پر معمولی کپڑا تھا۔ اور سوکھے چہرے پر ہڈیاں نمایاں ہو رہی تھیں۔ انھوں نے کہا: "حضرت، میرے لئے دعا فرمائیں"۔ میں نے کہا، اللہ آپ کی مدد فرمائے۔ انھوں نے بتایا کہ میرے یہاں دو بچیاں ہیں۔ ان کی شادی کا مسئلہ سر پر ہے۔ آجکل شادی پیسہ سے ہوتی ہے۔ مگر میرے پاس پیسہ نہیں۔ چار بڑے لڑکے ہیں۔ وہ اچھی کمائی کر رہے ہیں۔ لیکن سب کے سب مجھ سے الگ ہیں۔ ان سے کسی مدد کی امید نہیں۔ مجھے ان کے حالات سن کر بہت دکھ ہوا۔ اور اپنے دل میں دیر تک ان کے لئے دعا کرتا رہا۔

یہ مسلمان درحقیقت موجودہ مسلم سماج کی تصویر تھا۔ موجودہ مسلم سماج اپنوں کے ظلم اور خود غرضی اور غیر شرعی رسم و رواج کے نیچے پس رہا ہے۔ مگر کوئی مسلمان اپنے ان ستم رسیدہ بھائیوں کا ساتھ دینے والا نہیں۔ البتہ غیروں کی طرف سے اگر شریعت میں مداخلت کا کوئی شوشہ مل جائے تو ساری قوم جوش و خروش سے بھر جاتی ہے۔ اپنوں کی ہزاروں گنا بڑی مداخلت سے شریعت اسلامی کی دھجیاں اڑائی جا رہی ہیں مگر اس قسم کی باتوں پر مسلمانوں کے درمیان کوئی حرکت پیدا نہیں ہوتی۔

قوم کے سطحی لیڈروں نے بھی قوم کے مزاج کے ساتھ سمجھوتہ کر رکھا ہے۔ وہ مسلم سماج کے داخلی

مسائل کے لئے نہیں اٹھتے۔ کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ اس قسم کے مسائل پر انھیں کبھی لیڈری نہیں ملے گی۔ البتہ غیر قوم کی طرف سے مداخلت فی الدین کا کوئی قصہ ہاتھ آجائے تو فوراً اس کو لے کر اٹھ جاتے ہیں۔ اور جاہل مسلمانوں کی بھیڑ جمع کر کے اپنی شان قیادت میں اضافہ کرتے ہیں۔ مگر لوگوں کو جاننا چاہئے کہ یہ عین وہی چیز ہے جس کو قرآن میں افتؤمنون ببعض الکتاب وتکفرون ببعض (البقرہ ۸۵) کہا گیا ہے۔ اس قسم کی سرگرمیاں صرف خدا کے غضب کا مستحق بنانے والی ہیں، وہ خدا کے انعام کو کھینچنے والی نہیں۔

۳۰ مارچ ۱۹۸۸ کی شام ستنا سے دہلی کے لئے روانگی ہوئی۔ ڈبہ میں داخل ہوا تو معلوم ہوا کہ میری برتھ اوپر ہے۔ اشارۃً میری زبان سے نکلا کہ" لوربرتھ" ہوتی تو زیادہ اچھا تھا۔ رزرویشن کے مطابق یہ لوربرتھ ایک ہندو افسر کے پاس تھی۔ ان سے میں نے کچھ نہیں کہا تھا۔ یہ بات میں نے ان لوگوں سے کہی تھی جو مجھے پہنچانے کے لئے ریلوے اسٹیشن تک آئے تھے۔ ہندو افسر کو میرے احساس کا علم ہو گیا انھوں نے فوراً کہا کہ آپ نیچے کی برتھ لے لیں، میں اوپر چلا جاتا ہوں ـــــــ حقیقت یہ ہے کہ ہر آدمی" انسان" ہے۔ وہ صرف اس وقت" غیر انسان" بن جاتا ہے جب کہ اس کی انا کو چھیڑ دیا جائے۔

میری واپسی دوبارہ قطب ایکسپریس سے ہوئی۔ ۳۰ اور ۳۱ مارچ کی درمیانی رات کو ٹرین میں ایک انوکھا حادثہ پیش آیا۔ سفر کے دوران میں ضرورت کے تحت ٹوائلٹ میں گیا۔ اس وقت میں چپل پہنے ہوئے تھا۔ اتفاق سے میرے بائیں پاؤں کا چپل پاؤں سے نکل گیا۔ وہ پھسل کر قدمچہ کے درمیان سوراخ تک پہنچا اور ایک لمحہ میں اس کے اندر داخل ہو کر نیچے گر گیا۔ یہ واقعہ چلتی ہوئی ٹرین میں پیش آیا، اس لئے چپل کو دوبارہ حاصل کرنا ممکن نہ ہو سکا۔

اچانک خیال آیا کہ یہ حادثہ زمین کی کشش کی وجہ سے ہوا۔ اگر زمین میں کشش نہ ہوتی تو چپل جہاں تھا وہیں پڑا رہتا، وہ گر کر نیچے نہ جاتا۔ پھر فوراً ہی میں نے سوچا کہ اگر زمین میں کشش نہ ہوتی تو ٹرین بھی نہ دوڑتی۔ حتی کہ وہ نیکٹری بھی قائم نہ ہو سکتی جہاں جوتے اور چپل بنیں اور کوئی شخص ان کو پہن کر سفر کرے۔ خدا کی دنیا میں (اور اسی طرح خدا کے دین میں بھی) مختلف پہلوؤں کے درمیان ایک نازک توازن قائم رکھا گیا ہے۔ جو لوگ توازن کی اس حقیقت کو نہیں سمجھتے وہ عجیب عجیب غلط فہمیوں میں پڑ جاتے ہیں، دنیا کے بارہ میں بھی اور خود دین کے بارہ میں بھی۔

غلط ذہن

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطبین آپ سے "آیت" مانگتے تھے۔ اس کے جواب میں فرمایا گیا کہ کیا تمہیں "بینہ" نہیں دے دیا گیا۔ آیت سے مراد حسی معجزہ ہے اور بینہ سے مراد آپ کی پیغمبرانہ صداقت کی وہ دلیل ہے جو لفظی طور پر سابق کتب سماوی میں ملتی ہے۔ لفظی دلیل میں چونکہ توجیہہ و تعبیر کی گنجائش رہتی ہے۔ اس لیے انھوں نے کہا کہ ہمارے سامنے ایسی حسی دلیل پیش کرو جس سے انکار کی گنجائش ہی نہ ہو (طٰہٰ ۲۵ - ۱۳۳)

فرمایا کہ اصل مسئلہ دلیل کا نہیں، اصل مسئلہ تمہاری ذہنیت کا ہے۔ تم چونکہ حق ناحق کے بارہ میں سنجیدہ نہیں ہو اس لئے دلیل کا دلیل ہونا تمہیں دکھائی نہیں دیتا۔

صداقت جب بھی ظاہر ہوتی ہے، وہ اپنی دلیل آپ بن کر ظاہر ہوتی ہے۔ مگر اس کی دلیل کو پانا اور اس کا اقرار کرنا صرف اس وقت ممکن ہے جب کہ آدمی اس کے بارہ میں سنجیدہ ہو، لوگوں کی سطحیت اور مفاد پرستی انھیں حق کے بارہ میں سنجیدہ ہونے نہیں دیتی۔ وہ اپنے دماغ کو حق اور ناحق کی بحث میں زیادہ مشغول نہیں کرتے۔ وہ اس موضوع پر زیادہ سنجیدگی کے ساتھ غور نہیں کرتے۔ اس بنا پر وہ دلیل کے وزن کو بھی محسوس نہیں کر پاتے۔ وہ دلیل پیش کئے جانے کے باوجود اس طرح بولتے رہتے ہیں جیسے کہ ابھی ان کے سامنے دلیل پیش ہی نہیں کی گئی۔

ظالم انسان اس وقت تک اقرار نہیں کرے گا جب تک وہ اقرار کے لئے مجبور نہ کر دیا جائے۔ قیامت کے ظہور کے بعد ایسا ہی ہوگا۔ مگر اس وقت کے اقرار کا کیا فائدہ۔ وہ تو انجام بھگتنے کا وقت ہوگا نہ کہ ماننے یا عمل کرنے کا۔

انسان کا حال یہ ہے کہ اگر خدا کی طرف سے کوئی پیغام دینے والا آئے تو وہ اس سے جھوٹی بحثیں کرتا ہے۔ اور اگر خدا کوئی پیغام دینے والا نہ بھیجے اور بتائے بغیر لوگوں کو ان کی غلط روش پر پکڑ لے تو وہ کہیں گے کہ آپ نے ہم کو خبردار کیوں نہیں کیا۔ اگر ہم کو پہلے بتا دیا گیا ہوتا تو ہم ہرگز اس کے خلاف نہ کرتے۔ وہ دونوں حالتوں میں غلط روش اختیار کرتا ہے۔

ہدایت اگرچہ داعی کی طرف سے سامنے آتی ہے، مگر اس کو قبول کرنے کا انحصار تمام تر مدعو کے اوپر ہوتا ہے۔ مدعو کے اندر اگر طلب ہوگی تو وہ ہدایت کو پائے گا، ورنہ وہ اس سے محروم رہے گا۔

۱۔ ایک بیرونی ملک کے ایک بڑے ادارہ نے اسلامی مرکز کی انگریزی کتابوں کو دیکھنے کے بعد اس سے دلچسپی کا اظہار کیا ہے اور پہلی قسط کے طور پر ہر انگریزی کتاب ۲۰۰ کی تعداد میں منگائی ہے۔ ۲۴ مارچ ۱۹۸۸ کو تمام کتابیں دو دو سو کی تعداد میں بذریعہ ہوائی جہاز روانہ کر دی گئی ہیں۔ اس ادارہ کے ذریعہ یہ کتابیں بین اقوامی سطح پر تعلیم یافتہ غیر مسلم حضرات تک پہنچیں گی۔

۲۔ ہندستان کے زندہ مذاہب (Living religions in modern India) پر ایک جاپانی خاتون ریسرچ کر رہی ہیں۔ اس موضوع پر وہ جاپانی زبان میں ایک کتاب تیار کریں گی۔ انھوں نے بتایا کہ ان کی کتاب کے ۱۰ ہزار نسخوں کے آڈر ابھی سے پیشگی طور پر بک ہو چکے ہیں۔ ان کی ریسرچ میں اسلام بھی شامل ہے۔ اس سلسلہ میں اسلام کو سمجھنے کے لیے وہ ۱۰ مارچ ۱۹۸۸ کو اسلامی مرکز میں آئیں اور صدر اسلامی مرکز سے اسلام کی تعلیمات کے بارہ میں تفصیلی معلومات حاصل کیں۔ ان کا نام و پتہ یہ ہے:

Yuko Nishimura, Faculty of Religious Studies
University of Tokyo, Tokyo 113, Japan (03-4064776)

۳۔ مسٹر کروبر (A.R. Kroeber) کا ذکر اس سے پہلے خبرنامہ (مئی ۱۹۸۸) میں آچکا ہے۔ دوسری بار وہ ۴ اپریل ۱۹۸۸ کو مرکز میں آئے اور دو گھنٹہ تک صدر اسلامی مرکز سے اسلام کے بارہ میں گفتگو کی۔ ان کے پاس قرآن کا انگریزی ترجمہ (پکتھال اور آربری) تھا۔ قرآن کو انگریزی ترجمہ کے ذریعہ پڑھ کر ان کے ذہن میں بہت سے سوالات تھے۔ ان سوالات پر انھوں نے صدر اسلامی مرکز سے وضاحت طلب کی۔ آخر میں انھوں نے کہا کہ میرے اکثر سوالات کا جواب مجھے مل گیا۔ مزید مطالعہ کے بعد میں پھر ملاقات کروں گا۔ اسلامی مرکز کی انگریزی مطبوعات وہ اپنے ساتھ لے گیے ہیں۔

۴ ساؤتھ افریقہ کے ایک صاحب نے گاڈ ارائزز (God Arises) پڑھی۔ اپنے خط مورخہ ۲۴ مارچ ۱۹۸۸ میں انھوں نے لکھا ہے کہ وہ اس کتاب کو اپنے یہاں سے چھاپ کر افریقہ اور مغربی

ممالک میں پھیلائیں گے۔ اس کتاب کے بارہ میں انھوں نے اپنا تاثر حسب ذیل الفاظ میں بیان کیا ہے:

Very enlightening indeed, scholarly work no doubt.

۵۔ کلکتہ یونیورسٹی کے سابق پروفیسر ڈاکٹر ہیرالال چوپڑا آج کل الرسالہ کا مطالعہ کر رہے ہیں اور مرکز کی کئی کتابیں پڑھی ہیں۔ اسی تاثر کے تحت وہ ۴ اپریل کو مرکز میں آئے اور صدر اسلامی مرکز سے ملاقات کی۔ انھوں نے اپنا ایک تحریری تاثر دیا جس میں انھوں نے لکھا ہے کہ "مولانا وحید الدین خاں صاحب نے کتاب (ظہور اسلام) لکھ کر بنی نوع انسان پر بڑا بھاری احسان کیا ہے"۔ ان سے ملاقات کا تفصیلی تذکرہ انشاء اللہ ایک علٰحدہ مضمون میں شائع کیا جائے گا۔ مرکز کی مطبوعات کا وہ گہری دل چسپی کے ساتھ مطالعہ کر رہے ہیں۔

۶۔ آج کل کچھ لوگ اپنے حقیر مقاصد کے لیے الرسالہ کے تعمیری مشن کے خلاف جھوٹی الزام بازی کی مہم چلا رہے ہیں۔ دوسری طرف اللہ کے فضل سے الرسالہ کا فکر عالمی سطح پر پھیلتا چلا جا رہا ہے جس کی شہادتیں بار بار مختلف صورتوں میں سامنے آ رہی ہیں۔ سعودی عرب کے سب سے زیادہ کثیر الاشاعت جریدۃ الدعوۃ (۱۰ شعبان ۱۴۰۸ھ مطابق ۲۸ مارچ ۱۹۸۸) نے صفحہ ۵۰ پر "الشوط الاخیر" کے مستقل عنوان کے تحت ایک مضمون شائع کیا ہے جس میں الرسالہ کے نقطہ نظر کی واضح تائید ہے۔ اس مضمون میں کہا گیا ہے کہ اولاً ہمیں تحتی مستوی پر کام کرنا چاہیے تاکہ اگلے مرحلہ میں ہم سیاسی مستوی کو متاثر کر سکیں۔ مضمون کے آخری الفاظ یہ ہیں: فلنبدأ بما نملك حتى يحقق الله لنا ما لا نملك ولنصلح القاعدة حتى يصلح الله القمة۔ یہ الفاظ الرسالہ کی فکر سے اتنا زیادہ مطابق ہیں کہ وہ اس کا ترجمہ معلوم ہوتے ہیں۔

۷۔ جناب ایم۔ بی۔ پیرزادہ جو سعودی عرب میں رہتے ہیں، انھوں نے اپنے خط ۲۵ مارچ ۸۸ کے مطابق، اپنی طرف سے زرتعاون ادا کر کے اپنے دس دوستوں اور رشتہ داروں کے نام الرسالہ اردو اور انگریزی جاری کرایا ہے۔ اسی طرح اور بھی بہت سے لوگ کر رہے ہیں۔ اس سلسلہ کو مزید آگے بڑھانے کی ضرورت ہے۔ دعوت دین اور تعمیر ملت کے مشن کی توسیع

کے لیے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اس طریقہ پر عمل کرنا چاہیے ۔

۸۔ کل ہند صنعتی نمائش حیدرآباد (مارچ ۔ اپریل ۱۹۸۸) میں الرسالہ بک اسٹال لگایا گیا جس کے ذریعہ اسلامی مرکز کی کتابوں کی کافی تشہیر ہوئی اور تقریباً نئے ۴۰ افراد نے الرسالہ کی خریداری قبول کی ۔ جس میں اکثر اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں ۔ لوگوں نے الرسالہ کے ساتھ کتابیں بھی حاصل کیں اور اچھے تاثرات کا اظہار کیا ۔ ایک قاری جو عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد میں پروفیسر ہیں ، انھوں نے کہا " مولانا کی تحریروں کی آئندہ زمانہ میں بہت ضرورت محسوس کرکے اس کو پھیلایا جائے گا ۔ اس وقت لوگ مولانا کی فکر کو سمجھ نہیں پا رہے ہیں " الرسالہ فری بک لائبریری سے بھی کافی حضرات استفادہ کر رہے ہیں اور الرسالہ اکیڈمی حیدرآباد کی جانب سے بھرپور کوشش کی جارہی ہے کہ مولانا کی فکر کو زیادہ سے زیادہ عوام وخواص میں پھیلایا جائے ۔ حیدرآباد میں چھوٹے بڑے ہر اجتماعات میں الرسالہ بک اسٹال لگایا جاتا ہے ۔ اس سے بھی کافی لوگ متعارف ہو رہے ہیں ، اضلاع پر بھی اسٹال لگانے کا اہتمام کیا جاتا ہے ۔ اس طرح مولانا کی فکر کا کام دن بدن ترقی کی طرف گامزن ہے ۔ (الرسالہ اکیڈمی ، حیدرآباد)

۹۔ کالی باڑی مارگ (نئی دہلی) میں ۱۲ مارچ ۱۹۸۸ کو ایک اجتماع ہوا ۔ تعلیم یافتہ مسلمان اور غیر مسلم صاحبان شریک ہوئے ۔ صدر اسلامی مرکز نے تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ خطاب کیا ۔ موضوع تھا : نظریہ شہادت قرآن و حدیث کی روشنی میں ۔ تقریر کا انداز اگرچہ رواجی ذہن سے الگ تھا ۔ تاہم لوگوں نے بہت توجہ کے ساتھ سنا اور گہرے تاثر کا اظہار کیا ۔ اس تقریر کا ٹیپ بعض صاحبان کے پاس موجود ہے ۔

۱۰۔ ایک دعوتی پروگرام کے تحت صدر اسلامی مرکز نے مدھیہ پردیش کے بعض مقامات (ستنا ، ریوا) کا سفر کیا ۔ یہ سفر مارچ ۱۹۸۸ میں ہوا ۔ اس کی روداد انشاء اللہ سفرنامہ کے ذیل میں تفصیل کے ساتھ شائع کر دی جائے گی ۔ الرسالہ کے ہمدرد حضرات اس علاقہ میں الرسالہ کے فکر کو پھیلانے میں پوری طرح مشغول ہیں ۔

۱۱۔ الرسالہ کے دفتر کے لیے چند محنتی کلرک اور ایک لائق مینجر کی ضرورت ہے ۔ صاحب صلاحیت افراد اپنی درخواست بذریعہ ڈاک روانہ فرمائیں ۔

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کار نبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴۔ صاحب استطاعت افراد کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کردیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط وکتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

زر تعاون الرسالہ

زر تعاون سالانہ	۴۸ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	۲۵۰ روپیہ

بیرونی ممالک سے

ہوائی ڈاک	۲۰ ڈالر امریکی
بحری ڈاک	۱۰ ڈالر امریکی

تذکیر القرآن

جلد اول : سورۃ فاتحہ۔ سورۃ بنی اسرائیل

جلد دوم : سورۃ الکہف۔ سورۃ الناس

قرآن کی بے شمار تفسیریں ہر زبان میں لکھی گئی ہیں۔ مگر تذکیر القرآن اپنی نوعیت کی پہلی تفسیر ہے۔ تذکیر القرآن میں قرآن کے اساسی مضمون اور اس کے بنیادی مقصد کو مرکز توجہ بنایا گیا ہے۔ جزئی مسائل اور معلوماتی تفصیلات کو چھوڑتے ہوئے اس میں قرآن کے اصل پیغام کو کھولا گیا ہے اور عصری اسلوب میں اس کے دعوتی اور تذکیری پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے۔ تذکیر القرآن عوام و خواص دونوں کے لیے یکساں طور پر مفید ہے۔ وہ طالبینِ قرآن کے لیے فہم قرآن کی کنجی ہے۔

ہدیہ جلد اول ۱۰۰ روپیہ

جلد دوم ۱۰۰ روپیہ

[illegible]

RN 28822/76 D(SE) 243

June 1988 No 139

[illegible]

تذکیر القرآن جلد اول	Rs 100/-
〃 〃 جلد دوم	100/-
اللہ اکبر	40/-
پیغمبر انقلاب	30/-
مذہب اور جدید چیلنج	35/-
عظمت قرآن	25/-
الاسلام	25/-
ظہور اسلام	25/-
اسلامی زندگی	20/-
احیاء اسلام	20/-
راز حیات (مجلد)	45/-
صراط مستقیم	25/-
خاتون اسلام	35/-
سوشلزم اور اسلام	25/-
اسلام اور عصر حاضر	20/-
حقیقت حج	25/-
اسلامی تعلیمات	20/-
تبلیغی تحریک	15/-
تعبیر کی غلطی	35/-
دین کی سیاسی تعبیر	10/-

دین کیا ہے	3/-
قرآن کا مطلوب انسان	6/-
تجدید دین	4/-
اسلام دین فطرت	4/-
تعمیر ملت	4/-
تاریخ کا سبق	4/-
مذہب اور سائنس	8/-
عقلیات اسلام	4/-
فسادات کا مسئلہ	3/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	3/-
تعارف اسلام	4/-
اسلام پندرھویں صدی میں	4/-
راہیں بند نہیں	4/-
ایمانی طاقت	4/-
اتحاد ملت	4/-
سبق آموز واقعات	4/-
زلزلۂ قیامت	6/-
حقیقت کی تلاش	4/-
پیغمبر اسلام	4/-
آخری سفر	4/-

اسلامی دعوت	4/-
خدا اور انسان	4/-
حل یہاں ہے	6/-
سچا راستہ	2/-
دینی تعلیم	4/-
حیات طیبہ	4/-
باغ جنت	4/-
نار جہنم	4/-
میوات کا سفر	25/-

God Arises	Rs. 45/-
Muhammad The Prophet of Revolution	50/-
Religion and Science	25/-
Tabligh Movement	20/-
The Way to Find God	4/-
The Teachings of Islam	5/-
The Good Life	5/-
The Garden of Paradise	5/-
The Fire of Hell	5/-
Muhammad The Ideal Character	4/-
Man Know Thyself!	4/-
इन्सान अपने आपको पहचान	2/-
सच्चाई की तलाश	4/-

الرسالہ

ISSN 0970-180X

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

DR. ZAKIR HUSAIN LIBRARY
JAMIA
NAGAR

جہاں بریک لگانا ہو وہاں گاڑی کو تیز کرنا
منزل کی طرف سفر کرنے کے بجائے
قبرستان کی طرف اپنی گاڑی کو دوڑانا ہے

جولائی ۱۹۸۸ — شمارہ ۱۴۰

God Arises

By Maulana Wahiduddin Khan

This is the translation with some additions of *Mazhab Aur Jadeed Challenge,* translated into Arabic as *Al-Islam Yatahaddah,* which became a best-seller throughout the Arab world. It has also been translated into a number of other languages including Turkish, Malay, Serbo-Croatian (Yugoslavian), Sindhi, etc,, and has come to be accepted as a standard work on the Islamic position vis-à-vis modern thought.

"... *in the fourteen hundred years of Islamic history, innumerable books on Islam have appeared. There are just a few books calling mankind to God which are clearly distinguishable from the rest because of the clarity and force with which they make their appeal. Without doubt, this book is one of that kind".*

— *Daily AL-AHRAM (Cairo)*

Pages 265 ISBN 81-85063-14-1 (Pbk) Price Rs. 45
81-85063-17-6 (Hbd)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اردو، انگریزی میں شائع ہونے والا

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

شمارہ ۱۴۰ جولائی ۱۹۸۸

فہرست

ماہنامہ الرسالہ، سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳، فون: 697333, 611128

مومنانہ مزاج

حضرت عثمان بن عفان اور حضرت عبداللہ بن مسعود کے درمیان ایک معاملہ میں اختلاف تھا۔ حضرت عثمان حج کے دوران منیٰ میں رباعی (چار رکعت والی) نماز کو قصر کے بجائے مکمل پڑھتے تھے۔ جب کہ حضرت عبداللہ بن مسعود ان میں قصر کرنے کے قائل تھے۔ حضرت عثمان نے بحیثیت خلیفہ حج کیا تو منیٰ میں رباعی نماز کو مکمل صورت میں پڑھا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود بھی اس وقت مقتدیوں میں شامل تھے۔ انھوں نے قصر کے قائل ہونے کے باوجود خلیفہ ثالث کی اقتدا میں مکمل نماز ادا کی۔

حضرت عبداللہ بن مسعود سے کسی نے پوچھا کہ آپ نے اپنے مسلک کے خلاف ایسا کیوں کیا۔ انھوں نے جواب دیا کہ اختلاف کرنا برا ہے (الخِلَافُ شَرٌّ) اسی کے ساتھ انھوں نے ایک اور بات کہی جو مومن کی نفسیات کو نہایت عمدہ طور پر بتاتی ہے۔ انھوں نے کہا:

فَلَيْتَ حَظِّي مِنْ أَرْبَعِ رَكَعَاتٍ رَكْعَتَانِ مُتَقَبَّلَتَانِ کاش میرا حصہ یہ ہو کہ چار رکعت میں سے میری دو رکعت ہی قبول ہو جائے۔

(صحیح بخاری)

عام لوگوں کا حال یہ ہے کہ جب انھیں کسی انسان کی طرف سے معاملہ پیش آتا ہے تو وہ اسی انسان کو نشانہ بنا کر اس سے زور آزمائی کرنے لگتے ہیں۔ جس سے معاملہ پیش آتا ہے اسی انسان سے وہ صحیح اور غلط کی لامتناہی بحث چھیڑ دیتے ہیں۔ مومن کا طریقہ اس سے جدا ہے۔

مومن اس کے برعکس یہ کرتا ہے کہ وہ ہر معاملہ میں خدا کی طرف رجوع کرتا ہے۔ اس کو انسان کی طرف سے معاملہ پیش آتا ہے تب بھی اس کا دل خدا کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ جس چیز کو لوگ انسانوں کے خانہ میں ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں، اس کو وہ خدا کے خانہ میں ڈال دیتا ہے۔ جہاں لوگ انسان کی نسبت سے کلام کرتے ہیں وہاں وہ خدا کی نسبت سے کلام کرنا شروع کر دیتا ہے۔ جن مواقع پر لوگ انسانوں کی طرف دوڑتے ہیں، وہاں وہ خدا کی طرف دوڑنے لگتا ہے۔ جن مواقع پر لوگ رکعتوں کی تعداد پر بحث کر رہے ہوتے ہیں، اس کا ذہن اس فکر میں ڈوب جاتا ہے کاش میری چند رکعتیں ہی قبول ہو جائیں۔

مومن کا مزاج ہر معاملہ میں خدا رخی ہوتا ہے اور غیر مومن کا مزاج انسان رخی۔

آسمانی معائنہ

ماسکو کے جنوب مغرب میں تقریباً ۸۰۰ کیلومیٹر کے فاصلہ پر روس کا ایک فوجی کارخانہ تھا۔ اس کا نام پاولوگراڈ پلانٹ (Pavlograd plant) تھا۔ اس کارخانہ میں بین براعظمی میزائل (انٹر کانٹیننٹل بالسٹک میزائل) کے لیے انجن (Rocket Motors) بنائے جاتے تھے۔ نیوکلیر میزائل سے متعلق یہ کارخانہ روس میں اپنی نوعیت کا واحد کارخانہ تھا۔ وہ ایک خفیہ مقام پر واقع تھا۔ ۱۲ مئی ۱۹۸۸ کو کسی وجہ سے اس میں زبردست دھماکہ ہوا اور کارخانہ کا بڑا حصہ برباد ہوگیا۔

روسی ذرائع نے اس فوجی حادثہ کے بارہ میں دنیا کو کوئی اطلاع نہ دی۔ روس کے اخبارات اور روس کا ریڈیو اس معاملہ میں بالکل خاموش رہا۔ مگر اس کے بعد ہی اس واقعہ کی پوری خبر واشنگٹن (امریکہ) سے نشر کر دی گئی۔ روسی حادثہ کے بارے میں خود روس تو مکمل طور پر راز داری برتتے ہوئے تھا مگر امریکہ کے ذریعہ اس کا علم پوری دنیا کو ہوگیا۔ بعد کو روسی ذرائع نے بھی اس کی تصدیق کر دی۔

ایسا کیوں کر ہوا۔ اس کا راز خلائی جاسوسی ہے جو موجودہ زمانہ میں بہت بڑے پیمانہ پر جاری ہے ٹائمس آف انڈیا (۱۹ مئی ۱۹۸۸) نے واشنگٹن کی ڈیٹ لائن کے ساتھ جو خبر شائع کی ہے اس کا ایک جملہ یہ ہے کہ امریکہ کے جاسوسی سیاروں نے اس دھماکہ کو ۱۲ مئی کی رات ہی کو معلوم کر لیا:

U.S. spy satellites detected the explosion
on the night of May 12.

یہ واقعہ گویا چھوٹے پیمانہ پر اس معاملہ کا مظاہرہ ہے جو زیادہ بڑے پیمانہ پر اس دنیا میں قائم ہے۔ انسان کے بنائے ہوئے مصنوعی سیارہ کا "آسمانی معائنہ" خداوند عالم کے زیادہ وسیع اور زیادہ کامل آسمانی معائنہ کو بتارہا ہے۔ یہ بتاتا ہے کہ آدمی اپنے اعمال کو خواہ کتنا ہی چھپائے، مگر خدا کی نگاہیں اس کو بالکل بے حجاب حالت میں دیکھ رہی ہیں۔ دنیا میں آدمی اپنی سرکشی کا اعتراف نہیں کرتا، مگر آخرت میں جب خدا انسان کے سامنے اس کا ریکارڈ رکھ دے گا تو انسان کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ ہوگا کہ وہ اس کا اعتراف کر لے۔

آدمی کو اگر اس آسمانی معائنہ کا احساس ہو تو اس کی پوری زندگی بدل جائے۔

قرآن: ایک تاریخی معجزہ

قدیم یونان میں جو کتابیں یونانی زبان میں لکھی گئیں، ان میں دو کتابیں بہت مشہور ہیں۔ ایک ایلیڈ
(Illiad) اور دوسرے اوڈیسی (Odyssey) ایلیڈ ایک مفروضہ جنگ کی کہانی بیان کرتی ہے اور اوڈیسی
ب مفروضہ سفر کی داستان ہے۔ لٹریری اہمیت کی بنا پر ان کتابوں کے ان گنت ترجمے کیے گیے ہیں۔ مگر
ونوں کتابوں کے بارے میں عجیب بات یہ ہے کہ ان کے مصنف کا نام قطعیت کے ساتھ معلوم نہیں۔
ام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ ان کتابوں کا مصنف ہومر (Homer) ہے جس کا زمانہ غالباً نویں صدی یا
ٹھویں صدی قبل مسیح تھا۔ تاہم ہومر کے بارہ میں تاریخی معلومات تقریباً نہیں کے برابر ہیں:

Virtually nothing is known about the life of Homer (Vol. V, p. 103).

محققین نے اس مفروضہ پر بھی زبردست اعتراضات کیے ہیں کہ یہ کتابیں فی الواقع ہومر
ی تصنیف ہیں۔ مثلاً سموئل بٹلر (۱۸۳۵ - ۱۹۰۲) کا خیال ہے کہ اوڈیسی ایک عورت کی لکھی ہوئی ہے۔
ی طرح ایلیڈ کے بارہ میں کہا گیا ہے کہ وہ کئی مرحلوں میں مختلف افراد کی کوششوں سے مرتب ہوئی (EB-8/1017)
دیم زمانہ کی کتابوں کا عام طور پر یہی حال ہے۔ ان کے بارے میں معلومات اتنی کم ہیں کہ ان کے ذریعہ
ن کی کوئی واضح تاریخی تصویر نہیں بنتی۔

دورِ قدیم کی کتابوں میں قرآن واحد کتاب ہے جس کی ہر بات معلوم اور مسلّم ہے۔ جس کی واقعیت
اریخ کے ہر معیار پر پوری اترتی ہے۔ جو مکمل طور پر ایک تاریخی کتاب ہے —— قرآن کب
زنا شروع ہوا، ۶۱۰ء میں۔ کس کے اوپر اترا، محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب کے اوپر۔ وہ کہاں
یدا ہوئے اور کہاں وفات پائی، ۵۷۱ء میں مکہ میں پیدا ہوئے اور ۶۳۲ء میں مدینہ میں وفات
ئی۔ قرآن کی زبان کیا تھی، عربی زبان۔ شروع میں قرآن کے کاتب کون لوگ تھے، ابوبکر بن ابی قحافہ،
مر بن الخطاب، عثمان بن عفان، علی بن ابی طالب، زبیر بن العوام، زید بن ثابت، عامر بن فہیرہ، ابوایوب
صاری، ابی بن کعب، معاویہ بن ابی سفیان، عبداللہ بن مسعود، وغیرہ۔

اسی طرح قرآن اور صاحب قرآن کے بارہ میں جو بھی تاریخی سوال کیا جائے، اس کا واضح جواب یقینی
ور پر موجود ہوگا۔ جب کہ دورِ قدیم کی کسی دوسری کتاب کو یہ خصوصیت حاصل نہیں۔

ردوقبول کامعیار

ہر آدمی کے سامنے ردو قبول کا ایک معیار ہوتا ہے۔ اسی کے مطابق کبھی وہ ایک چیز کو لیتا ہے، اور اسی کے مطابق وہ دوسری چیز کو چھوڑ دیتا ہے۔ مثلاً ایک تاجر کا معیار تجارتی فائدہ ہے۔ وہ اس معاملہ کی طرف جھک جائے گا جس میں تجارتی فائدہ ہو، اور جس میں تجارتی فائدہ نظر نہ آئے، اس سے وہ دور ہو جائے گا۔ ایک وکیل کا معیار "کاغذ" ہے، اگر وہ دیکھے کہ اس کا کاغذ قانونی اعتبار سے پورا ہے تو وہ مطمئن رہے گا، اور اگر کاغذ قانونی اعتبار سے پورا نہ ہو تو وہ بے چین ہو جائے گا۔ اسی طرح کچھ لوگوں کا معیار ان کا ذاتی وقار ہے۔ وہ ہر چیز کو اس معیار پر جانچتے ہیں کہ اس کا اثر ان کی ذات پر کیا پڑتا ہے۔ جو بات ان کے ذاتی وقار کو ٹھیس پہنچانے والی ہو، اس کو وہ رد کر دیں گے۔ اور جس بات سے ان کا ذاتی وقار محفوظ رہے اس کو اختیار کر لیں گے۔

ردو قبول کے یہ تمام معیار جاہلیت کے معیار ہیں۔ یہ ان لوگوں کے معیار ہیں جنھوں نے حقیقت کو نہیں جانا۔ جو ابھی تک اپنے ذہنی خول میں جی رہے ہیں۔ ان کے ذہنی خول سے باہر جو حقائق ہیں ان کی انھیں خبر نہیں۔ مومن وہ ہے جو اپنے ذہنی خول سے باہر آجائے۔ جو تمام چیزوں کو حقیقتِ واقعہ کی نسبت سے دیکھنے لگے نہ کہ اپنے ذاتی رجحان کی نسبت سے۔

مومن کی زندگی کا معیار رجوع الی اللہ ہوتا ہے۔ وہ ہر چیز کو اس نسبت سے جانچتا ہے کہ اس سے اس کے اندر اللہ کی طرف رجوع پیدا ہوا یا اللہ کی طرف رجوع پیدا نہیں ہوا۔ اس کی کامیابی اگر اس کے اندر شکرِ خداوندی کا جذبہ ابھارے تو وہ کامیابی ہے ورنہ ناکامی۔ اس کا نقصان اگر اس کو خدا کے مقابلہ میں اپنے عجز کا احساس دلائے تو وہ فائدہ ہے ورنہ سراسر نقصان ہے۔ غلطی کر کے اگر اس کے اندر اعترافِ خطا کا احساس ابھرے اور وہ اپنے رب کی طرف دوڑ پڑے تو ایسی غلطی اِس سے بہتر ہے کہ وہ غلطی نہ کرے اور اُس کے نتیجہ میں اس کے اندر جھوٹا پندار پیدا ہو جائے۔

کچھ لوگ نفسانی غذا پر جیتے ہیں اور کچھ لوگ ربانی غذا پر۔ غیر مومن کی خوراک نفسانی غذا ہوتی ہے۔ مومن وہ ہے جو ربانی غذا پر جینے لگے، جس کے لیے زندگی کا ہر تجربہ اس کو اپنے رب سے جوڑنے کا ذریعہ بن جائے۔

رازِ حیات

سمندر میں موجوں کے تھپیڑے ہیں ۔ جو شخص سمندر میں اپنی کشتی چلانا چاہے وہ مجبور ہے کہ موج اور طوفان کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنی کشتی مطلوبہ منزل کی طرف لے جائے ۔ جنگل میں جھاڑیاں اور درندے ہیں، جو جانور جنگل میں رہتے ہیں، ان کے لیے اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں کہ وہ کانٹے دار جھاڑیوں اور اپنے دشمن جانوروں کے درمیان اپنے لیے زندگی کا طریقہ نکالیں ۔

ایسا ہی کچھ معاملہ انسانی سماج کا بھی ہے ۔ انسانوں کے اندر بھی طرح طرح کے لوگ ہیں۔ ان کے مفادات ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں۔ مختلف اسباب سے ایک اور دوسرے کے بیچ میں ناخوش گواریاں پیدا ہوتی ہیں۔ یہ اونچ نیچ اور یہ فرق سماجی زندگی میں ہمیشہ سے ہیں اور ہمیشہ باقی رہیں گے ۔ کسی حال میں انھیں ختم نہیں کیا جا سکتا ۔

ایسی حالت میں انسان کے لیے زندگی اور کامیابی کا صرف ایک ہی ممکن راستہ ہے —— وہ "باوجود" کے اصول کو اپنی پالیسی بنائے ۔ وہ مخالفتوں کے باوجود لوگوں کو اپنا موافق بنانے کی کوشش کرے ۔ وہ ناخوش گواریوں کے باوجود اپنے لیے خوشگوار زندگی کا راز دریافت کرے۔ اس کے خلاف عداوتیں اور سازشیں کی جائیں تب بھی وہ اس یقین کے ساتھ آگے بڑھے کہ وہ اپنے مثبت عمل سے تمام منفی باتوں کا خاتمہ کر سکتا ہے ۔

اس دنیا میں آدمی کو کانٹے کے باوجود پھول تک اپنا ہاتھ پہونچانا ہوتا ہے ۔ یہاں بیماریوں کے بے شمار جراثیم کے باوجود اپنے آپ کو تندرست اور صحت مند بنانا پڑتا ہے ۔ اسی طرح اس دنیا میں آدمی کو یہ کرنا ہے کہ وہ ناموافق حالات کو دیکھ کر مایوس نہ ہو ۔ اور نہ شکایت اور احتجاج میں اپنا وقت ضائع کرے ۔ وہ ان حقائق سے موافقت کر کے جیئے جن کو وہ بدل نہیں سکتا۔ وہ راستہ کے ان پتھروں سے کترا کر نکل جائے جو اس کے سفر میں حائل ہو رہے ہوں۔ لوگوں کی مخالفانہ باتوں پر مشتعل ہونے کے بجائے وہ تدبیری حکمت کے ذریعہ ان سے نپٹنے کی کوشش کرے ۔ وہ کم ملنے پر راضی ہو تاکہ آئندہ اس کو زیادہ دیا جائے ۔ وہ دشمنی پر صبر کرے تاکہ آج جو اس کے دشمن ہیں کل وہ اس کے دوست بن جائیں ۔

نظریاتی جنون

دہلی کا انگریزی اخبار ہندستان ٹائمس (۱۸ مئی ۱۹۸۸) آپ دیکھیں تو اس کے آخری صفحہ پر آپ کو ماسکو کی ڈیٹ لائن کے ساتھ ایک خبر ملے گی جس کی سرخی یہ ہے :

Stalin uprooted 15 million people

اس سرخی کے نیچے جو مفصل خبر درج ہے ، اس میں بتایا گیا ہے کہ سوویت روس میں سرکاری ٹیلی وژن پر ایک ڈاکومنٹری فلم دکھائی جا رہی ہے جس میں روس کے سابق اشتراکی حکمراں جوزف اسٹالن کے بھیانک مظالم کو واقعاتی شکل میں دکھایا گیا ہے ۔ اسٹالن نے اپنے زمانۂ اقتدار (۱۹۲۴-۱۹۵۳) میں ملک کے بے شمار باشندوں کو بے رحمی کے ساتھ ہلاک کر دیا تھا ۔ انھیں میں سے ایک سابق اشتراکی لیڈر بخارن (Nikolai Bukharin) بھی تھا جس کو ۱۹۳۸ میں گولی مار کر ہلاک کیا گیا ۔ آج چالیس سال بعد اس کی بیوی لارینا (Anna Bukharin-Larina) اسٹیج پر آکر لوگوں کو بتا رہی ہے کہ اس کے شوہر کو بے قصور مارا گیا ۔ اسٹالن نے بخارن کو مروا دیا ، مگر حقیقت یہ ہے کہ خود اسٹالن ایک مسلّمہ مجرم تھا :

I consider him a criminal.

مذکورہ ڈاکومنٹری وہ مناظر دکھاتی ہے جب کہ روس کی زرعی زندگی کو مکمل طور پر برباد کر دیا گیا ۔ یہ اس وقت ہوا جب کہ اسٹالن نے اجتماعی کھیتی کے منصوبہ کو بجبر عملی جامہ پہنایا ۔ تین ملین سے زیادہ کسان گھرانے یا بالفاظ دیگر ، پندرہ ملین زرعی باشندوں کو اس ڈکٹیٹر نے جڑ سے اکھاڑ دیا ۔ ایک مبصر بتاتا ہے کہ روس کے زرعی نظام میں اس تبدیلی کا نتیجہ یہ ہوا کہ سوویت روس غلہ کو درآمد کرنے والا ایک ملک بن گیا ، جب کہ اس سے پہلے وہ غلہ کو برآمد کرنے والا ملک تھا :

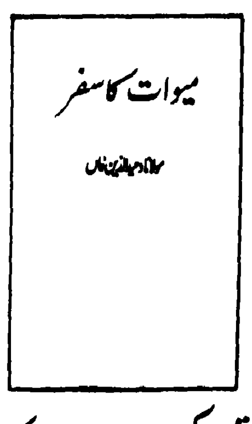
The documentary shows scenes of wholesale destruction of rural life with the beginning of collectivisation. More than three million peasant households or 15 million people were uprooted by the dictator, and a commentator says this transformed the Soviet Union from an exporter of grains to an importer (p. 20).

اسٹالن جس وقت یہ ظالمانہ کارروائی کر رہا تھا، اس وقت روس غلہ کے معاملہ میں نہ صرف خودکفیل تھا، بلکہ وہ اپنے فاضل غلہ کو بیرونی ملکوں کے ہاتھ فروخت کرتا تھا۔ دوسری طرف سودی عرب اس وقت ایک صحرائی ملک شمار ہوتا تھا۔ اور اپنی ضرورت کا تقریباً تمام غلہ باہر کے ملکوں سے خریدتا تھا مگر آج صورت حال اس کے برعکس ہے۔ روس غلّہ خریدنے والا ملک بن گیا۔ دوسری طرف سودی عرب میں ملکی ضرورت سے زیادہ غلہ پیدا ہونے لگا۔ ۱۹۸۸ میں سودی عرب میں غلہ کی پیداوار دو ملین سے زیادہ ہوئی ہے۔ اس میں سے پچاس ہزار ٹن گیہوں اس نے سوویت روس کے ہاتھ فروخت کیا ہے۔

سوال یہ ہے کہ اسٹالن نے ایسا فعل کیوں کیا جو بیک وقت بدترین ظلم بھی تھا اور بدترین حماقت بھی۔ اس کا سبب، ایک لفظ میں، نظریاتی انتہا پسندی ہے۔ تاریخ میں بہت سی مثالیں ملتی ہیں کہ کچھ لوگوں نے بطور خود ایک نظریہ بنایا اور اس کو جبراً لوگوں کے اوپر نافذ کر دیا۔ مگر تجربہ کے بعد معلوم ہوا کہ ان کا کیس نظریاتی جنون کا کیس تھا نہ کہ نظریاتی صداقت کا کیس۔

بہت سے لوگوں کا یقین محض نظریاتی جنون ہوتا ہے نہ کہ حقیقۃً یقین۔ بہت سے لوگوں کی قربانیاں محض اندھے جوش کے تحت ظاہر ہوتی ہیں نہ کہ فی الواقع سچائی کی طلب کے تحت۔ یہ دنیا امتحان گاہ ہے۔ اور اس امتحان گاہ کا سب سے زیادہ نازک پہلو یہ ہے کہ یہاں یقین بھی جھوٹی بنیادوں پر پیدا ہو سکتا ہے، اور عمل اور قربانی بھی۔

میوات کا سفر



میوات کے تاریخی علاقہ پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ مگر میوات کا سفر اپنی نوعیت کی منفرد کتاب ہے۔ وہ سادہ معنوں میں صرف ایک علاقہ کا تذکرہ نہیں، وہ ۲۰ سالہ مشاہدہ کا ایک تحریری ریکارڈ ہے۔ براہ راست طور پر اگرچہ وہ علاقۂ میوات کی ایک تصویر ہے۔ مگر بالواسطہ طور پر وہ پوری ملت اسلامیہ سے تعلق رکھتی ہے۔ وہ سفرنامہ کی زبان میں ملت کے حال کا جائزہ اور اس کے مستقبل کی تعمیر کا نقشہ ہے۔

صفحات ۲۱۸ ہدیہ ۲۵ روپیہ

مسئلہ نہیں حقیقت

ہندستانی مسلمانوں کے مسئلہ کا حل کیا ہے۔ ایک لفظ میں یہ کہ وہ جس چیز کو "مسئلہ" سمجھے ہوئے ہیں، اس کو وہ "حقیقت" سمجھنے لگیں۔ جب ایک چیز کو مسئلہ سمجھا جائے تو اس کے خلاف غصہ اور جھنجلاہٹ کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ اور جب اس کو حقیقت سمجھ لیا جائے تو آدمی کے اندر موافقت کا اور جدوجہد کا ذہن ابھرنے لگتا ہے۔

ایک سادہ سی مثال لیجئے۔ زمین میں جو کشش ہے، اس کی وجہ سے آدمی کے لیے بوجھ اٹھانا مشکل ہوتا ہے۔ اگر زمین کی قوت کشش کم ہو جائے تو بھاری بوجھ لے کر چلنا بھی بالکل آسان ہو جائے گا۔ مگر کوئی شخص اس کی شکایت نہیں کرتا۔ کیوں کہ وہ اس کو مسئلہ نہیں بلکہ حقیقت سمجھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ شکایت اور احتجاج کرنے کے بجائے اس کے حل کی تدبیر ڈھونڈتا ہے مثلاً وہ اپنا بوجھ جانور پر لادتا ہے، یا وہ پہیہ دار گاڑی بنا کر اس کے ذریعہ بوجھ کو ادھر سے ادھر لے جانے کا انتظام کرتا ہے۔ وغیرہ۔

یہی صورت حال سماجی مسائل کی بھی ہے۔ سماجی مسائل بھی دراصل مسائل نہیں بلکہ حقیقت ہیں۔ جس طرح زمین کی موجودہ کشش خدا کی پیدا کردہ ہے، اس پر ہم کو کوئی اختیار نہیں، اسی طرح سماجی مسائل بھی خدا کے منصوبہ کے تحت ہیں، وہ بہر حال باقی رہیں گے، ہم ان کو ختم نہیں کر سکتے۔ یہاں بھی ہم کو حکمت اور تدبیر کا وہی طریقہ اختیار کرنا چاہیے جو زمین کی کشش کے معاملہ میں ہم عملاً اختیار کیے ہوئے ہیں۔

یہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ یہاں ہمیشہ ایک اور دوسرے کے درمیان مقابلہ جاری رہتا ہے۔ مقابلہ کا یہ ماحول خود خدا کا قائم کردہ ہے، اس لیے ہم اس کو ختم نہیں کر سکتے۔ ہم صرف اس کے حل کی تدبیر کر سکتے ہیں۔ اعراض، صبر، حکمت، جدوجہد اس قسم کے تمام الفاظ دراصل اسی تدبیر کے مختلف نام ہیں۔

مسائل کو مسائل سمجھنے سے شکایت اور احتجاج کا ذہن پیدا ہوتا ہے، مسائل کو چیلنج سمجھنے سے تدبیر اور مقابلہ کا ذہن۔

Soviets ban probe on anonymous complaints

By William J. Eaton

MOSCOW: After generations of tragic experience under Czars and Commissars, the Soviet Union has decided to bar the police and other official bodies from conducting investigations on the basis of anonymous complaints.

The Communist Party daily *Pravda* reported Wednesday that the Presidium of the Supreme Soviet has decreed a halt to the practice, effective immediately. In the future, according to the decree, a citizen's complaint must be signed and must include the signer's full name and address — home address and working address. Any complaint "lacking this data shall be deemed anonymous and not be subject for consideration," the decree says.

If this policy is adhered to strictly, Western observers said, it would be a major step forward in an area of human rights that affects millions of Soviet citizens. Countless innocent victims have been sent to prison or marched before a firing squad in the Soviet Union on the word of some faceless accuser. Yet the law has continued to require the police to investigate anonymous charges, and this has given unscrupulous and ambitious individuals a powerful weapon to use against their enemies or rivals.

The police, acting on the theory that where there is smoke there must be fire, often required the targets of such charges to prove their innocence rather than require the accusers to furnish proof of guilt.

It was this kind of thinking, more than likely, that gave rise to the cynical saying "Never drink with two other people. You won't know who the informed was."

In recent years an anonymous accusation rarely led to a criminal charge, Soviet sources said, but it could affect a person's chances of travelling abroad and influence decisions concerning his work or his personal life.

According to a Muscovite who asked not to be identified by name, a policeman questioning a person who has been accused anonymously will customarily say he has received a "Signal" about him. "Now," he said, "I have a right to ask who sent that signal before I have to answer."

Soviet leader Mikhail Gorbachev's advocacy of greater "democratisation" was no doubt responsible, at least in part, for Wednesday's decree.

Krokodl, the satirical magazine, said that there was a time when anonymous accusations were regarded as useful tools for preserving ideological purity. But the attitude toward anonymous informers has changed, the magazine said, and added, "one simply cannot be an ideological stalwart and a foul caricature of a man at the same time."

Krokodil said that its staff would no longer read unsigned letters. The latest issue of the magazine reported that 138 anonymous complaints had been ceremoniously burned to underscore its new policy.

Another sign of the new attitude was a satirical movie cartoon that is being shown this week in Moscow movie houses. It depicts a jealous worker making his boss' life miserable by writing false accusations in an anonymous letter. As police inspectors appear menacingly to check out the charges, the boss becomes increasingly upset, then suffers a heart attack and dies. At his funeral he is hailed as a good man. A wreath bears a poignant reminder of his torment: "Charges not proven." (*Los Angeles Times*, Washington Post News Service)

بلا تحقیق الزام

ہندستان ٹائمس (۸ فروری ۱۹۸۸) میں اشتراکی روس سے متعلق ایک رپورٹ شائع ہوئی ہے مذکورہ اخبار نے اس کو لاس اینجلس ٹائمز اور واشنگٹن پوسٹ نیوز سروس کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ رپورٹ کے مرتب کرنے والے مسٹر ولیم ایٹن ہیں جو اخباری نمائندہ کے طور پر ماسکو میں مقیم ہیں۔ انھوں نے براہ راست روسی ماخذ سے لے کر اسے تیار کیا ہے۔ ہندستان ٹائمس نے اس رپورٹ کو اپنے صفحہ ۲۴ پر حسب ذیل عنوان کے ساتھ شائع کیا ہے:

روسی گم نام شکایتوں کی تحقیق پر پابندی لگاتے ہیں۔

خبر میں بتایا گیا ہے کہ روس میں زار کے زمانہ سے یہ دستور رائج تھا کہ اگر کسی شخص کے خلاف ایک شکایت پولیس میں یا اور کسی سرکاری دفتر میں پہنچ جائے تو فوراً اس کی تفتیش شروع ہو جاتی تھی۔ خواہ شکایت کرنے والے نے اپنا نام اور اپنا پتہ بھی نہ لکھا ہو۔ ۱۹۱۷ میں روس میں کمیونسٹ انقلاب آیا تو اس کے بعد بھی یہ الم ناک دستور نہ صرف رائج رہا بلکہ تیز تر ہو گیا۔ اب روس کے سرکاری اخبار پراودا نے اپنے شمارہ ۲ فروری ۱۹۸۸ میں یہ خبر دی ہے کہ سپریم سوویت کی پریسیڈیم نے متفقہ طور پر یہ فیصلہ کیا ہے کہ بے نام شکایتوں پر کسی کے خلاف چھان بین کا باب کھولنے کے رواج کو فوری طور پر بند کر دیا جائے۔ ایسی ہر شکایت کو ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا جائے جس پر شکایت کرنے والے نے اپنا نام اور پتہ تحریر نہ کیا ہو۔

روسی پولیس کا نظریہ اب تک یہ تھا کہ جہاں دھواں ہے وہاں آگ ضرور ہوگی۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ کسی کے خلاف گم نام شکایت موصول ہوتے ہی اس شخص کی تفتیش شروع ہو جاتی تھی۔ اب اس کے ذمہ یہ تھا کہ وہ ثابت کرے کہ وہ قصور وار نہیں ہے۔ اس رواج کی بنا پر لاکھوں انسان ناقابل بیان مصیبتوں کا شکار ہوئے۔ وہ جیلوں میں بند کر دئے گئے، انھیں گولی مار دی گئی۔ حالانکہ ان کے خلاف خبر دینے والے نے اپنی خبر کی کوئی دلیل بھی نہیں دی تھی۔

اس رواج کی بنا پر ہر آدمی کو لامحدود موقع مل گیا تھا کہ جس کو چاہے اندوہناک پریشانی میں مبتلا کر دے۔ مثلاً کسی دفتر کا ایک ملازم اپنے افسر اعلیٰ سے خفا ہو تو وہ اپنا نام ظاہر کئے بغیر اس کے

خلاف الزام مرتب کرے گا اور اس کو پولیس کے دفتر میں بھیج دے گا۔ اسی طرح جس شخص کو بھی کسی سے شکایت ہو وہ بغیر نام کی ایک تحریر پولیس دفتر کو بھیج دے گا اور فوراً اس کی پوچھ گچھ شروع ہو جائے گی۔ ایسے لوگ اگر خبر کی تفصیل پوچھتے تو پولیس کی طرف سے یہ مختصر جواب ملتا "ہم کو اوپر سے سگنل ملا ہے۔" مذکورہ قانون کے تحت پہلی بار روسی شہریوں کو یہ حق حاصل ہوا ہے کہ وہ پولیس سے پوچھ سکیں کہ "کس نے تم کو یہ سگنل دیا ہے، اس کا نام بتاؤ۔"

روسی شہریوں کو جو حق اشتراکی انقلاب کے ۷۰ سال بعد ۱۹۸۸ میں ملا ہے، وہ اسلام نے ۱۴ سو سال پہلے اپنے قائم کردہ نظام میں اول روز ہی لوگوں کو دے دیا تھا۔

اسلام کی تعلیم

الحجرات قرآن کی ۴۹ ویں سورہ ہے۔ اس کو سورۃ الاخلاق والآداب بھی کہا جاتا ہے۔ کیونکہ اس میں اسلام کی اخلاقی تعلیمات اور معاشرتی آداب بتائے گئے ہیں۔ انھیں میں سے ایک وہ ہے جو ان الفاظ میں مذکور ہے:

یا ایھا الذین آمنوا إن جاءکم فاسق بنبأ فتبینوا ان تصیبوا قوماً بجھالۃ فتصبحوا علیٰ ما فعلتم نادمین (الحجرات ۶)	اے ایمان والو، اگر کوئی فاسق تمہارے پاس خبر لائے تو تم اچھی طرح اس کی تحقیق کر لیا کرو، ایسا نہ ہو کہ تم کسی گروہ کو نادانی سے کوئی نقصان پہنچا دو، پھر تم کو اپنے کیے پر پچھتانا پڑے۔

علامہ ابو البرکات عبد اللہ بن محمود النسفی نے اس کی تفسیر ان الفاظ میں کی ہے:

کأنہ قال أیّ فاسق جاءکم بأیّ نبأ (فتبینوا) فتوقفوا فیہ وتطلبوا بیان الامر وانکشاف الحقیقۃ ولا تعتمدوا قول الفاسق (صفحہ ۱۶۸)	گویا کہ یہ فرمایا کہ کوئی بھی فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو اس کے معاملہ میں ٹھہرو اور واقعہ کی تفصیل معلوم کرو اور حقیقت حال کا پتہ لگاؤ۔ محض فاسق کے قول پر اعتماد نہ کرلو۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ جس شخص کے بارہ میں خبر دی گئی ہے، اس کے پیچھے پڑنے سے پہلے خود خبر دینے والے کی تحقیق کرو کہ وہ قابل اعتماد ہے یا ناقابل اعتماد۔ اور اگر شکایت کرنے والے نے اپنا نام بھی نہ بتایا ہو تو یہ صرف ایک بے بنیاد گمان ہے، اور گمان کی تحقیق کرنا اسلام میں منع ہے۔

جیسا کہ حدیث میں آیا ہے : اذا ظننت فلا تحقق (گمان کی تحقیق نہ کرو) حضرت عبد اللہ بن عمر نے فرمایا کہ ہم کو ٹوہ لگانے سے منع کر دیا گیا ہے (انا قد نُھینا عن التجسس)

اسی بنا پر ایسا ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جب آپ سے متعلق روایات جمع کرنے کا کام شروع ہوا تو محدثین نے علم حدیث میں وہ اصول مقرر کیا جس کو "جرح و تعدیل" کہا جاتا ہے، اور اس کے تحت ہر راوی کے ذاتی حالات کی تحقیق کی گئی۔ جب تک راوی کی ثقاہت ثابت نہ ہو جائے، اس وقت تک اس کی روایت کو معتبر تسلیم نہیں کیا گیا۔

پھر اسی بنا پر فقہ میں یہ مستقل اصول مقرر کیا گیا کہ البینۃ علی المدعی (ثبوت کا بار مدعی کے اوپر ہے) جو شخص دعوی کرے، اسی کے اوپر یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے دعوے کے حق میں ثبوت فراہم کرے، نہ یہ کہ جس کے خلاف دعوی کیا گیا ہے، اس سے یہ مطالبہ کیا جائے کہ تم اپنے بے قصور ہونے کو ثابت کرو۔

اشتراکی روس میں ۷۰ سال تک مذکورہ جابرانہ قانون کے اجرا کو اگر ارادی ظلم سمجھا جائے تو اشتراکیت کا معاشرہ سرخ جنت کے بجائے سرخ جہنم ثابت ہوتا ہے۔ اور اگر بالفرض اس کو ارادی ظلم نہ سمجھا جائے تو یہ ماننا ہوگا کہ مذہبی قانون وضعی قانون کے مقابلہ میں چودہ سو سال آگے ہے۔ ایسی حالت میں مذہب کو دور قدیم کی چیز قرار دے کر اس کو دور جدید کے لئے قابل ترک بتانا ایک ایسی بات ہے جو ثابت شدہ حقیقت کے سراسر خلاف ہے۔ ایسی حالت میں وضعی قانون کو فرسودہ قرار دیا جانا چاہئے نہ کہ الہامی قانون کو۔

تذکیر القرآن

تذکیر القرآن کے پانچ پارے (سورہ یونس تا سورہ بنی اسرائیل) علیحدہ سے مجلد کرائے گئے ہیں۔ جن لوگوں کے پاس تذکیر القرآن کی ابتدائی جلد دس پاروں والی ہے وہ مذکورہ جلد کے لیے اپنی فرمائش روانہ فرمائیں۔

منیجر مکتبہ الرسالہ

اخلاق کا معیار

قرآن میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ کسی سے تمہاری دشمنی ہو جائے تو تم ایسا مت کرو کہ اس کے ساتھ بے انصافی کرنے لگو، بلکہ تم ہر حال میں انصاف کرو۔ یہی بات تقویٰ کے مطابق ہے (لایجرمنکم شنآن قوم علیٰ ان لا تعدلوا اعدلوا هو اقرب للتقویٰ)

مفسر ابن کثیر نے اس آیت کی تفسیر یہ کی ہے: یعنی کسی کا بغض تم کو نہ ابھارے کہ اس کے معاملہ میں تم انصاف کو چھوڑ دو۔ بلکہ ہر ایک کے معاملہ میں انصاف کرو خواہ وہ دوست ہو یا دشمن (ای لایحملنکم بغض قوم علیٰ ترک العدل فیهم بل استعملوا العدل فی کل احد صدیقاً کان او عدواً)

اس آیت میں جو بات کہی گئی ہے وہ موجودہ دنیا میں تقویٰ کا سب سے زیادہ یقینی معیار ہے۔ دو آدمیوں کے درمیان معتدل تعلقات ہوں تو دونوں بالکل ٹھیک نظر آتے ہیں۔ حتیٰ کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دونوں اعلیٰ اخلاق پر قائم ہیں۔ مگر کسی کے اخلاق کو جانچنے کا یہ صحیح معیار نہیں۔ کوئی شخص اخلاقی اعتبار سے کیسا ہے، اس کا اندازہ معتدل حالات میں نہیں ہوتا۔ اس کا صحیح اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب کہ دونوں کے درمیان تلخی اور شکایت کی فضا پیدا ہو گئی ہو۔

ایک پھل اندر سے کیسا ہے، اس کا اندازہ آپ پھل کے چھلکے کو دیکھ کر نہیں کر سکتے۔ اس کا پتہ صرف اس وقت چلتا ہے جب کہ پھل کو توڑا جائے۔ اسی طرح کوئی انسان حقیقۃً کیا ہے، اس کا اندازہ معمول کے حالات میں نہیں ہوتا، بلکہ غیر معمولی حالات میں ہوتا ہے۔ جب آدمی کے ساتھ کوئی خلاف مزاج واقعہ پیش آتا ہے، اسی وقت معلوم ہوتا ہے کہ آدمی کیا تھا اور کیا نہیں تھا۔ عام حالات میں آدمی اپنے آپ کو چھپائے رہتا ہے۔ مگر جب اس کی شخصیت کو کوئی شدید جھٹکا لگتا ہے اس وقت اس کا اندر اس کے باہر آ جاتا ہے۔ اس وقت کھل جاتا ہے کہ وہ شریف تھا یا غیر شریف۔ وہ بے اخلاق تھا یا با اخلاق۔

جس شخص سے آپ کا بگاڑ نہیں ہوا اس سے خوش اخلاقی برت کر آپ خدا کے نزدیک خوش اخلاق نہیں ہو سکتے۔ خدا کے نزدیک آپ اس وقت خوش اخلاق قرار پائیں گے جب کہ آپ اس شخص کے معاملہ میں خوش اخلاق ثابت ہوں جس سے آپ کا بگاڑ پیدا ہو چکا ہے۔

حقیقت پسند بنے

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی سب سے بڑی کمزوری ان کی منفی ذہنیت ہے۔ وہ دنیا کی تمام قوموں کو اپنا دشمن سمجھتے ہیں۔ وہ غیر اقوام کی تمام کارروائیوں کو اس نظر سے دیکھتے ہیں کہ وہ ان کے خلاف دشمنی کی بنا پر کی گئی ہیں۔ اس منفی ذہن نے ان کی پوری سوچ کو غیر حقیقت پسندانہ بنا دیا ہے۔ آپ درخت کے نیچے ہیں اور اوپر سے پکا ہوا پھل آپ کے سر پر گر پڑتا ہے، اب اگر آپ یہ سوچیں کہ درخت نے آپ کی ضد میں آپ کے سر پر اپنا پھل گرایا ہے تو کبھی آپ معاملہ کا صحیح حل تلاش کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔

مثال کے طور پر امریکا فلسطینی مسلمانوں کے مقابلہ میں اسرائیلی یہودیوں کا ساتھ دیتا ہے۔ تمام دنیا کے مسلمان اس کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ امریکا مسلمانوں کا دشمن ہے اور اس دشمنی کی وجہ سے وہ مسلمانوں کے سب سے بڑے دشمن کا ساتھ دے رہا ہے۔ مگر اصل یہ ہے کہ یہ دنیا مفادات کی دنیا ہے۔ امریکہ اس لئے اسرائیل کا ساتھ دیتا ہے کہ اس سے اس کا مفاد وابستہ ہے نہ کہ محض کسی کی ضد یا دشمنی کی وجہ سے۔

اسرائیل کی مدد سے امریکہ دو طرفہ مفاد حاصل کر رہا ہے۔ ایک یہ ہے کہ اس طرح وہ تیل پیدا کرنے والے خلیجی ممالک کو مسلسل دباؤ کی حالت میں رکھے ہوئے ہے۔ اس صورت حال کی بنا پر یہ ممالک مجبور ہیں کہ وہ امریکہ سے امریکہ کی شرائط پر معاملہ کریں نہ کہ خود اپنی شرائط پر۔

دوسرا فائدہ کاروباری فائدہ ہے۔ موجودہ زمانہ میں ترقی یافتہ ملکوں کا ایک نہایت محفوظ بزنس یہ ہے کہ وہ کمزور یا غیر ترقی یافتہ ممالک کو امداد کے نام پر قرض دیں اور اس پر ان سے سود وصول کریں۔ امداد کی رقم کی واپسی تو قسطوں میں ہوتی ہے مگر سود کی رقم ہر سال پوری کی پوری ادا کی جاتی ہے۔ یہ قرضے ترقیاتی کاموں میں بھی دئے جاتے ہیں مگر ان کی سب سے بڑی مد جدید ہتھیاروں کی خریداری ہے۔ ترقیاتی قرضے تو دوسرے ملکوں سے بھی ملتے ہیں مگر جنگی ہتھیاروں کی تجارت امریکہ کی اجارہ داری ہے۔ اسرائیل اور عربوں میں مسلسل جنگ کی حالت امریکہ کو موقع دے رہی ہے کہ وہ اسرائیل کے ہاتھ قیمتی ہتھیار قرض کی بنیاد پر فراہم کرے اور اس پر اس سے بھاری سود وصول کرے۔ چنانچہ ایک اقتصادی رپورٹ کے مطابق اسرائیل امریکی قرضوں پر سود کی جو رقم ادا کرتا ہے اس کی سالانہ مقدار ۹۱۰ ملین ڈالر ہے۔ عرب ممالک امریکہ سے مہنگے داموں جو ہتھیار خریدتے ہیں ان کی مقدار اس کے علاوہ ہے۔

۵۲

مسلمانوں کا مسئلہ

۱۵ مئی ۱۹۸۳ کو میں مرادآباد میں تھا۔ وہاں میری دو تقریریں ہوئیں۔ ایک کا موضوع تھا، دینی تقاضے۔ اور دوسری کا موضوع تھا، تعمیر ملت۔ تعمیر ملت کے موضوع پر جب تقریر ختم ہوئی تو ایک صاحب اٹھے جو نہایت سنجیدہ اور پڑھے لکھے آدمی معلوم ہوتے تھے۔ انھوں نے دو سوالات کئے۔

پہلا یہ کہ آپ نے تعمیر ملت کے موضوع پر جو کچھ کہا ہے وہ سب اسباب کی باتیں ہیں مگر مرادآباد کا تجربہ اس سے مختلف ہے۔ مرادآباد کے فساد (۱۹۸۰) کے آخری مرحلہ میں مسلمان اس طرح گھر گئے کہ ان کے سامنے کوئی راستہ باقی نہ رہا۔ انھوں نے سوچا کہ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کہ دعا کی جائے۔ چنانچہ مسلمانوں نے مل کر دعا کی اور اس کے بعد اچانک صورت حال بدل گئی اور شہر میں امن قائم ہوگیا۔ دوسرا سوال یہ کہ اگر سارا معاملہ اسباب کا ہے تو اس میں مسلمان اور غیر مسلمان سب برابر ہیں، پھر مسلمان کا وہ امتیاز کیا ہے جو خیر امت کی حیثیت سے انھیں دیا گیا ہے۔

پہلے سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ میں نے جو بات کہی اس کا تعلق قانون عام (الرعد ۱۱) سے ہے اور آپ نے جو بات کہی اس کا تعلق قانون اضطرار (النمل ۶۲) سے۔ اس میں شک نہیں کہ کوئی شخص یا کوئی گروہ جب ایسے حالات میں گھر جائے جہاں بظاہر اس کے لئے نکلنے کا کوئی راستہ نہ ہو اور وہ دل سے خدا کو پکارے تو خدا اس کی مدد کرتا ہے (یونس ۲۳-۲۲) مگر جیسا کہ قرآن میں صراحت ہے، حالت اضطرار میں مدد کا تعلق ہر ایک سے ہے، خواہ وہ مسلمان ہو یا غیر مسلمان۔ کسی اضطراری واقعہ سے عمومی قانون اخذ نہیں کیا جا سکتا۔

میں نے جو بات کہی وہ فساد سے پہلے کی ہے۔ اور آپ جو بات کہہ رہے ہیں وہ فساد کے بعد کی ہے۔ فساد کے بعد جب ہنگامی حالت پیدا ہو چکی ہو، اس وقت کیا کرنا ہے، یہ ایک الگ مسئلہ ہے۔ مگر فساد ہونے سے پہلے حالات کو معتدل رکھنے کے لئے کیا کیا جائے، یہ بالکل مختلف مسئلہ ہے۔

مسلمانوں نے موجودہ زمانہ میں برداشت کو کھو دیا ہے۔ وہ ذرا سی بات پر بھڑک اٹھتے ہیں۔ یہی عدم برداشت کا مزاج تمام فسادات کا اصل سبب ہے۔ جب تک کہ اس مزاج کو دور نہ کیا جائے، کسی بھی دوسری تدبیر سے فسادات کو ختم نہیں کیا جا سکتا۔ مسلمان پچھلے ۲۵ سال

سے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کو اقلیتی کردار دینے کی لڑائی لڑ رہے تھے۔ یہ لڑائی حکومت اور حکمراں پارٹی سے تھی۔ بالآخر ۱۹۸۲ میں ان کو نئے ایکٹ کے تحت اقلیتی کردار دے دیا گیا۔ مگر مسلمانوں کی لڑائی بدستور جاری ہے۔ فرق یہ ہے کہ پہلے اس لڑائی کا نشانہ نئی دہلی تھا، اب اس لڑائی کا نشانہ خود ان کا مسلمان وائس چانسلر ہے

اس سے پہلے ہندستان کے بیشتر مسلمانوں نے تقسیم ملک کی مانگ کی۔ اس مانگ کے لئے ان کی سب سے بڑی دلیل یہ تھی کہ مشترک ہندستان میں ملک کا اکثریتی فرقہ ان کے ساتھ امتیازی سلوک کرتا ہے۔ اس مطالبہ کے مطابق ان کو پاکستان دے دیا گیا۔ مگر ان کے شکایتی ذہن نے اپنی شکایت کے لئے نیا نشانہ تلاش کر لیا۔ اب مشرقی پاکستان کو یہ شکایت ہوگئی کہ مغربی پاکستان اس کے ساتھ امتیازی سلوک کرتا ہے۔ دوبارہ خود اپنے درمیان ایک بھیانک لڑائی ہوئی جو اس پر ختم ہوئی کہ مشرقی پاکستان نے مغربی پاکستان سے علیحدگی اختیار کر لی۔ تاہم ۱۹۸۳ کے واقعات بتاتے ہیں کہ اصل مسئلہ بدستور باقی ہے۔ اب سندھ کے مسلمانوں کو پنجاب کے مسلمانوں سے شکایت ہے کہ وہ ان کے ساتھ امتیازی سلوک کرتے ہیں۔ یہ لڑائی جاری ہے اور کچھ نہیں معلوم کہ وہ کہاں جاکر ختم ہوگی۔

حقیقت یہ ہے کہ ہندستان کے مسلمانوں کا اصل مسئلہ ہر بات میں ان کا بے برداشت ہوجانا ہے۔ جب تک وہ اپنے اس مزاج کو ختم نہ کریں، ان کے لئے زمین تنگ رہے گی، خواہ وہ ایک ملک کا معاملہ ہو یا دوسرے ملک کا۔

دوسرے سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ مسلمان اپنے تقرر کے اعتبار سے بلاشبہ خیرامت ہیں اور اس حیثیت سے ان کے ساتھ خدا کا ایک امتیازی معاملہ ہے۔ خدا نے مسلمانوں کے لئے اپنی ایک خصوصی مدد مقدر کی ہے جو اس نے دوسروں کے لئے مقدر نہیں کی۔ مگر اس خصوصی مدد کا استحقاق خیرامت کی حیثیت سے اپنی ذمہ داری انجام دینے پر ہے نہ کہ صرف نسلی مسلم نسل سے متعلق ہونے کی بنا پر۔

یہ ذمہ داری دعوت و تبلیغ کی ذمہ داری ہے۔ دعوت و تبلیغ سے مراد مسلمانوں کے درمیان اصلاحی کام نہیں ہے۔ بلکہ غیر مسلموں تک خدا کا سچا دین پہنچانا ہے۔ مسلمانوں کی اصلاح بھی ایک کرنے کا کام ہے اور اس کو ضرور کیا جانا چاہئے۔ مگر غیر مسلموں کے مقابلہ میں مسلمانوں کی مدد کا وعدہ کبھی بھی مسلمانوں کے درمیان اصلاحی کام کرنے سے پورا نہیں ہوسکتا۔ یہ وعدہ صرف اس وقت پورا ہوگا جب کہ غیر مسلموں کے درمیان دعوت الی اللہ کا کام کیا جائے اور اس کو اس کے تمام آداب و شرائط کے ساتھ انجام دیتے ہوئے اتمام حجت کی حد تک پہنچایا جائے۔

قیادت کا دیوالیہ پن

ضبط کروں میں کب تک آہ   چل رے خامہ بسم اللہ

بابری مسجد اور رام جنم بھومی (اجودھیا) کا جھگڑا سو سال سے بھی زیادہ پرانا ہے۔ تاہم اپنی موجودہ شکل میں یہ جھگڑا یکم فروری ۱۹۸۶ کو شروع ہوا جب کہ فیض آباد کے ڈسٹرکٹ جج، کرشن موہن پانڈے، کے عدالتی حکم کے تحت مقامی پولیس نے بابری مسجد کے دروازہ کا تالا کھول دیا جو ۱۹۴۹ سے بند چلا آرہا تھا۔ اس کے نتیجہ میں یہ عمارت عملاً ہندوؤں کے قبضہ میں چلی گئی۔

یہ واقعہ بلاشبہ غلط تھا۔ مگر اس کے بعد مسلمانوں نے جو کچھ کیا وہ یقینی طور پر اس سے بھی زیادہ غلط تھا۔ کیوں کہ وہ سنتِ رسولؐ کے خلاف تھا۔ قدیم مکہ میں کعبہ کے مقدس ترین خداخانہ کو بت خانہ میں تبدیل کر دیا گیا۔ یہ اسی نوعیت کا سخت تر مسئلہ تھا۔ مگر اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں نے ان طریقوں میں سے کوئی طریقہ اختیار نہیں کیا جو موجودہ زمانہ کے مسلمانوں نے سیاست پسند لیڈروں کی پیروی میں اختیار کیا ہے۔ کعبہ کے مذکورہ مسئلہ کو رسول اللہؐ نے قومی لڑائی کا عنوان نہیں بنایا، بلکہ اپنی ساری توجہ انسانی ضمیر کو جگانے پر لگا دی۔

بابری مسجد کا مسئلہ پیدا ہونے کے بعد مسلمانوں نے یہ کیا کہ انھوں نے بند، گرفتاری، دھرنا، ریلی، ایجی ٹیشن، جلسوں اور تقریروں کے ہنگامے جاری کر دیئے۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ یہ تھا کہ جب کہ مشرکین نے خانۂ خدا میں بُت داخل کر رکھے تھے، آپ نے ان مشرکین کے دلوں میں توحید کو داخل کرنے کی مہم شروع کر دی۔ یہ طریقہ خدا کی صراطِ مستقیم کے مطابق تھا۔ چنانچہ اس کو صد فی صد کامیابی حاصل ہوئی۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی دعوتی کوششوں سے لوگوں کے سینے توحید خانے بن گیے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسجد بھی آخر کار بُت خانہ کے بجائے توحید خانہ میں تبدیل ہو گئی۔

بابری مسجد کے معاملہ میں مسلمانوں نے جو ہنگامہ برپا کیا ہے وہ سراسر ایک قومی ہنگامہ ہے اس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ استحصال پسند لیڈروں کی پیروی میں ہے نہ کہ خدا کے پیغمبر کی پیروی میں۔ یہی وجہ ہے کہ اس معاملہ میں مسلمانوں کو خدا کی مدد نہ مل سکی۔ ان کے ان ہنگاموں

معاملہ صرف نازک تر ہوتا چلا گیا، وہ کسی بھی درجہ میں حل نہ کیا جا سکا۔

اس معاملہ میں مسلمانوں کو کم سے کم جو کرنا تھا وہ یہ تھا کہ یکم فروری ۱۹۸۶ کے بعد بھی وہ اسی طریقہ پر قائم رہتے جس پر وہ اس سے پہلے قائم تھے۔ یا دوسری سیکڑوں مسجدوں کے بارے میں آج بھی جس طریقہ کو وہ عملاً اختیار کیے ہوئے ہیں۔ یعنی مذکورہ غلط فیصلہ کو قانون اور گفت وشنید کے ذریعہ حل کرنے کی کوشش کرنا۔ اور بالفرض اگر اس طرح کوئی حل سامنے نہ آئے تب بھی لازماً اسی پر قائم رہنا۔ کیوں کہ یہ ہرگز عقل مندی نہیں ہے کہ کوئی شخص آپ کی ایک چیز پر قبضہ کر لے اور آپ عدالت سے انصاف نہ پا رہے ہوں، تو آپ اپنے گلے میں پھندا ڈال کر خودکشی کر لیں۔

مسلمانوں کے استحصال پسند لیڈروں نے اس مسئلہ کو اس طرح ابھارا جیسے کہ وہ اسی کے منتظر ہوں، انھوں نے انتہائی جذباتی تقریریں کر کے مسلمانوں کا خون گرما دیا۔ وہ اس مسئلہ کو سڑک پر لے آئے۔ انھوں نے اس کو اتنا زیادہ بڑھایا کہ وہ پورے ملک میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان شدید ترین قومی تناؤ کا سبب بن گیا۔ اس طرح انھوں نے نہ صرف اجودھیا کو بلکہ پورے ملک کو اشتعال کی بھٹی کے کنارے کھڑا کر دیا۔ اسی کا براہ راست نتیجہ میرٹھ اور ملیانہ کا دردناک فساد تھا۔ ان فسادات میں لیڈر صاحبان کا تو کچھ نہیں بگڑا، البتہ بے شمار مسلم خاندان برباد ہو کر رہ گیے۔

مرکزی رابطہ بابری مسجد کمیٹی (بابری مسجد موومنٹ کوآرڈی نیشن کمیٹی) کے چیرمین کا ایک انٹرویو انکار (۱۳ مئی ۱۹۸۸) میں چھپا ہے۔ اس کا ایک سوال وجواب یہ ہے:

سوال ملک کے باشعور طبقوں کا کہنا ہے کہ دونوں قومیں بالمشافہ گفتگو سے مسئلہ کے کسی حل پر پہونچ سکتی ہیں۔ کیا اس مسئلہ کو گفتگو کے ذریعہ حل کرنے کی کوشش کی گئی۔ (صفحہ ۲۶)

جواب لگاتار ایسی کوششیں ہوئیں اور ہر سطح پر ہوئیں۔ لیکن ابھی تک کوئی واضح نتیجہ نہیں نکلا۔

میرے ذاتی تجربہ کے مطابق، یہ بات سراسر خلاف واقعہ ہے۔ کم از کم ایک بار اس قسم کی اعلیٰ سطحی میٹنگ میں میں خود شریک رہا ہوں۔ میں نے پایا ہے کہ نام نہاد مسلم لیڈروں کا رویہ ان مواقع پر انتہائی غیر معقول ہوتا ہے۔ ان میٹنگوں میں مسلم نمائندے بالکل وکیلانہ اور مناظرانہ بحث کا طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ حالاں کہ نازک اور حساس مسائل میں وکیلانہ اور مناظرانہ طریقہ صرف مسئلہ کو مزید پیچیدہ بناتا ہے، وہ کسی بھی درجہ میں اس کو حل نہیں کرتا۔

یہاں میں ایک خصوصی میٹنگ کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو نئی دہلی کے وٹھل بھائی پٹیل ہاؤس میں ۲۷ مارچ ۱۹۸۷ کو ہوئی تھی۔ یہ میٹنگ بابری مسجد (اجودھیا) کے مسئلہ پر تھی۔ ایک طرف بابری مسجد تحریک کے ذمہ داران تھے اور دوسری طرف ہندو شخصیتیں۔ ہندو جانب سے جو افراد شریک ہوئے، ان میں ایک ممتاز نام مہنت اویدناتھ کا ہے جو رام جنم بھومی مکتی یگیہ سمتی کے صدر ہیں۔ راقم الحروف بھی خصوصی دعوت کے تحت اس میٹنگ میں موجود تھا۔

اس موقع پر دونوں طرف کے لوگوں نے اپنا اپنا نقطۂ نظر بیان کیا۔ اکثر ہندو صاحبان نے مصالحت کے انداز میں تقریر کی۔ مہنت اویدناتھ نے واضح اور متعین انداز اختیار کیا۔ انھوں نے کہا کہ بابری مسجد ہمارے نزدیک رام جنم بھومی پر بنائی گئی ہے۔ مسجد تو آپ دوسری جگہ بھی بنا سکتے ہیں مگر جنم بھومی تو وہیں رہے گی جہاں کہ وہ ہے۔ اس لیے ہمارا مطالبہ ہے کہ یہ جگہ ہم کو واپس دے دی جائے۔ تاکہ ہم اس کو اس کی ابتدائی صورت میں تعمیر کر سکیں۔ مسلم نمائندے حسب معمول اس طرح تقریر کرتے رہے جیسے کہ وہ مسلمانوں کی طرف سے محض قومی وکیل بن کر اس مجلس میں شریک ہوئے ہیں۔

اجودھیا کے اس جھگڑے نے جو شدت اور نزاکت اختیار کر لی ہے، اس کے پیش نظر اس معاملہ میں کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ دونوں فریقوں کو فیصلہ کی ایسی مشترک بنیاد پر لایا جائے جس سے دونوں اتفاق کر سکیں۔ قومی وکالت اور جارحانہ مناظرہ والا انداز کسی بھی درجہ میں حل کا دروازہ کھولنے والا نہیں بن سکا۔

مذکورہ میٹنگ میں جب دوسرے لوگ بول چکے تو حاضرین کے اصرار پر میں نے ایک مختصر تقریر کی۔ سب سے پہلے میں نے یہ کہا کہ مسجد کا معاملہ اسلام میں بے حد نازک ہے۔ مسجد کا مسئلہ یہ ہے کہ جو مسجد ایک بار بن جائے وہ ہمیشہ کے لیے مسجد ہے۔ اس کو نہ اس کی جگہ سے ہٹایا جا سکتا اور کسی طرح اسے ختم کیا جا سکتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک مسجد اگر واقعی وہ مسجد ہے تو مسلمان اپنے عقیدہ کی رو سے کبھی اس کو چھوڑنے پر راضی نہیں ہو سکتے۔

مگر اسی کے ساتھ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ مسجد ایک مقدس عبادت خانہ ہے۔ اس لیے مسجد کی تعمیر لازماً جائز زمین پر ہونا چاہیے۔ اگر غصب کی ہوئی زمین پر مسجد بنائی جائے تو اسلامی فقہاء کا کہنا ہے کہ ایسی مسجد میں نماز جائز نہیں (لاتجوز فیہ الصلوٰۃ)

جہاں تک غیر مذاہب کے عبادت خانہ کو ڈھاکر اس کی جگہ مسجد بنانے کا سوال ہے، تو اصولاً یہ اسلام کے بالکل خلاف ہے۔ مذاہب کے عبادت خانوں کو ڈھانا، قرآن کے مطابق ایک ظالمانہ فعل ہے (الحج ۴۰) خلیفۂ ثانی حضرت عمر فاروقؓ کے زمانہ میں شام و فلسطین کے عیسائی علاقے اسلامی مملکت میں شامل ہوئے۔ اس وقت ان کے لیے جو عہد نامے لکھے گیے، ان میں دوسری باتوں کے ساتھ یہ بھی درج تھا کہ ان کے مذہبی امور میں کوئی دخل اندازی نہ کی جائے گی (لایحال بینهم وبین شرائعهم) اہل فلسطین کے معاہدہ میں یہ بھی درج کیا گیا کہ ان کے گرجا میں رہائش نہ کی جائے گی اور نہ ان کو ڈھایا جائے گا اور نہ ان میں کچھ کمی جائے گی (لایسکن کنائسهم ولا تهدم ولا ینتقص منها)

ان تمہیدی باتوں کے بعد میں نے کہا کہ اجودھیا کی بابری مسجد کے بارے میں ہمارے سامنے دو مطالبے ہیں۔ اور دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ مسلمان کہتے ہیں کہ یہ شروع سے مسجد ہے۔ ہندو کہتے ہیں کہ وہ پہلے رام جنم استھان تھی۔ بعد کو اسے توڑ کر مسجد بنایا گیا۔ اب سوال یہ ہے کہ دونوں فریقوں کے درمیان فیصلہ کی بنیاد کیا ہو۔

میں نے کہا کہ یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ صرف دعوی اور مطالبہ کی بنیاد پر اس کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ فیصلہ کے لیے کسی دوسری چیز کو بنیاد بنانا پڑے گا جو ان دونوں سے الگ ہو۔ یہ دوسری چیز صرف ایک ہو سکتی ہے، اور وہ تاریخ ہے۔ اس مسئلہ کو ختم کرنے کی واحد معقول صورت یہ ہے کہ دونوں فریق اس پر راضی ہو جائیں کہ تاریخ کا جو فیصلہ ہوگا اس کو دونوں فریق بلا بحث قبول کر لیں گے۔

پھر میں نے کہا کہ آپ حضرات اگر اصولی طور پر اس بات کو مان لیں تو پھر میری تجویز ہے کہ مسلّمہ تاریخ دانوں کا ایک بورڈ بنایا جائے۔ یہ بورڈ خالص تاریخی حقائق کی روشنی میں معاملہ کا جائزہ لے اور تاریخی شہادتوں کی بنیاد پر وہ جس رائے پر پہونچے اس کے مطابق وہ اس کا فیصلہ کر دے۔ دونوں فریق پیشگی اقرار نامہ کے مطابق، اس کے پابند ہوں کہ مذکورہ بورڈ کا جو فیصلہ ہوگا اس کو ہر دو فریق مزید بحث کے بغیر مان لیں گے۔

مزید میں نے کہا کہ اس بورڈ (یا تاریخی عدالت) میں حکومت کا بھی ایک باضابطہ نمائندہ موجود

ہو: تاکہ فیصلہ کے بعد اس کے عملی نفاذ کی یقینی ضمانت ہو سکے۔

میری تقریر تمام لوگ بیحد غور کے ساتھ سنتے رہے۔ جب وہ ختم ہوئی تو بہت اوپذناتھ اور ان کے ساتھیوں نے کہا کہ ہم کو یہ بات منظور ہے۔ اس انداز پر بات کو آگے بڑھایا جائے۔ انھوں نے مزید کہا کہ مولانا صاحب (راقم الحروف) سے میں تفصیلی گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ان کے بتائے ہوئے راہ عمل پر چلا گیا تو یہ مسئلہ خوش اسلوبی کے ساتھ حل ہو جائے گا۔

بات یہاں تک پہونچ چکی تھی کہ عین اس وقت بابری مسجد رابطہ کمیٹی کے چیرمین، جو کہ ایم پی بھی ہیں، مشتعل ہو کر چیخنے لگے۔ وہ اتنے زور زور سے بول رہے تھے کہ یہ سمجھنا مشکل تھا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں بمشکل میں اتنا سن سکا کہ "ہم اس تجویز پر راضی نہیں ہیں"

اس گفتگو کے موقع پر جماعت اسلامی کی طرف سے بھی اس کے ایک ذمہ دار بزرگ شریک تھے۔ مگر ناقابل فہم سبب کے تحت وہ مکمل طور پر خاموش رہے۔ یہاں تک کہ چیرمین صاحب کی چیخ پکار کے ساتھ میٹنگ برخواست ہو گئی۔

میرے لیے یہ بات ناقابل فہم ہے کہ مسلم لیڈروں نے میری مذکورہ بات سے اختلاف کیوں کیا جب کہ اپنے اعلان کے مطابق، وہ خود اسی قسم کے باعزت حل کی تلاش میں ہیں۔ بظاہر اس کی وجہ یہی سمجھ میں آتی ہے کہ "کریڈٹ" کے مسئلہ نے انھیں اس اختلاف پر مجبور کیا۔ وہ اپنے سیاسی مزاج کے تحت ایک ایسے حل پر راضی نہ ہو سکے جس کا کریڈٹ ان کے سوا کسی اور کو مل رہا ہو۔

مسٹر گووند مکھوٹی (صدر دہلی بار ایسوسی ایشن) نے بابری مسجد کے مسئلہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا ہے:

"اس قضیہ کا فیصلہ کسی بھی عدالت میں نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے آسان صورت یہ ہے کہ ہندو اور مسلمان دونوں فرقہ کے روشن خیال لوگ خلوص دل سے اس مسئلہ کا حل نکالنے کے لیے سر جوڑ کر بیٹھیں اور تاریخی حقائق کی روشنی میں اس کا فیصلہ کریں۔" افکار ملی، ۳۱ مئی ۱۹۸۸، صفحہ ۳۷

اس میں شک نہیں کہ اس معاملہ میں یہی سب سے زیادہ قابل عمل بات ہے۔ جس قضیہ سے عوامی جذبات اتنے زیادہ وابستہ ہوں یا وابستہ کر دیئے جائیں۔ اس کو محض عدالتی حکم کے ذریعہ ختم نہیں کیا جا سکتا۔ یکم فروری ۱۹۸۶ کو فیض آباد کی عدالت نے ایک حکم دیا تھا۔ مگر اس کا انجام یہ ہوا کہ ہندوؤں

نے اس کو مانا، اور مسلمانوں نے اس کو نہیں مانا۔ اسی طرح کوئی دوسری عدالت اس سے مختلف حکم دے تو مسلمان اس کو مانیں گے مگر ہندو اس کو نہیں مانیں گے۔ اور پھر مسئلہ جہاں تھا وہیں باقی رہے گا۔

ایسے ہی نازک اجتماعی معاملات کے لیے حکَم اور ثالث کا اصول مقرر کیا گیا ہے۔ یہ "عدالت" کی وہ قسم ہے جس میں دونوں فریق پیشگی اقرار کے ذریعہ اس پر راضی ہو جاتے ہیں کہ وہ اس کے فیصلہ کو مانیں گے، خواہ وہ ان کے موافق ہو یا ان کے خلاف۔ اوپر ہم نے ۲۷ مارچ ۱۹۸۷ کی مشترک میٹنگ کی جو روداد درج کی ہے، وہ بتاتی ہے کہ ڈیڑھ سال پہلے یہ مسئلہ مکمل طور پر اس قسم کے ایک باعزت حل کے قریب پہونچ گیا تھا۔ یہ گویا "تاریخ کی عدالت" کو حکَم بنانے کے ہم معنی تھا۔ مگر انھیں سیاست باز لیڈروں نے اس حل کو واقعہ بننے نہیں دیا جو اس مسئلہ کو حل کرنے کے نام پر لیڈری کے میدان میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کے لیے دوڑ لگا رہے ہیں۔

مرکزی رابطہ بابری مسجد کمیٹی کے چیئرمین صاحب کا ایک انٹرویو افکار ملی (۳۱ مئی ۱۹۸۸) میں چھپا ہے۔ اس کا ایک سوال و جواب یہ ہے:

سوال تحریک بازیابی بابری مسجد کی اب تک کی کارکردگی کے بارہ میں آپ کا کیا تبصرہ ہے۔

جواب دو سال میں سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ آج ملک کے ایجنڈے پر بابری مسجد کا مسئلہ ہے۔ حکومت آخری دم تک اس کو مقامی مسئلہ کہتی رہی ہے۔ لیکن آج حکومت تسلیم کرتی ہے کہ یہ ملکی مسئلہ ہے۔ اس طرح ہم اسے ملکی سطح پر لے آئے۔

یہ بلاشبہ صرف ایک غیر سنجیدہ لفاظی ہے کہ بابری مسجد کا مسئلہ آج ملکی ایجنڈے پر ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ بابری مسجد کا مسئلہ آج ملکی تشدد کی فہرست پر ہے۔ اس تحریک نے ایک مقامی نزاع کو ایک ملکی نزاع بنا دیا ہے۔ عام حالت میں جو چیز صرف ایک قصبہ کے ہندوؤں اور مسلمانوں میں تناؤ کا سبب بن سکتی تھی، اس کو پورے ملک کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تناؤ کا سبب بنا دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ "چیئرمین صاحب" نے جس چیز کو اپنی تحریک کی سب سے بڑی کامیابی قرار دیا ہے، وہی اس کی سب سے بڑی ناکامی ہے۔

"اجودھیا" اور "رام جنم بھومی" ہندو عقیدہ کے مطابق ان کے مقدس مقامات ہیں۔ وہ ہندو قوم کے لیے انتہائی حساس اشو کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایسے نازک اور حساس سوال کو مقامی کش مکش

کے دائرہ سے نکال کر ملکی کشمکش کے دائرہ میں لانا، مجرمانہ حد تک ایک غلط فعل ہے۔ مزید یہ کہ یہ اصل مسئلہ کے حل میں رکاوٹ بھی ہے۔ کیوں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ پورے ملک کے ہندوؤں کو اپنی مخالفت پر کھڑا کر دیا جائے۔ دورِ جمہوریت میں اس توسیع کے معنی کیا ہیں، اس کو ہر آدمی سمجھ سکتا ہے۔

میں ذاتی طور پر دہلی کی کم از کم نصف درجن مسجدوں کو جانتا ہوں جو ۱۹۴۷ کے بعد اغیار کے قبضہ میں چلی گئی تھیں۔ بعض مسلمانوں کے دل میں ان کا درد پیدا ہوا۔ خوش قسمتی سے یہ لوگ لیڈر نہیں تھے۔ چنانچہ انھوں نے خالص مقامی انداز میں اس کی بازیابی کی کوشش شروع کی۔ انھوں نے نہ جلسہ جلوس کی دھوم مچائی۔ اور نہ اخبارات میں بیانات شائع کیے۔ بس خاموش انداز میں دفتری اور قانونی کارروائی کرتے رہے۔ انھیں اس کام میں مقامی ہندوؤں کا بھی موثر تعاون ملا۔ ان میں سے کئی مسجدوں کا رقبہ بابری مسجد سے بہت زیادہ بڑا تھا۔ مگر یہ تمام مسجدیں مکمل طور پر مسلمانوں کے قبضہ میں آگئیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جذباتی تقریریں کرکے ایک مسجد کو مقامی اشو کے بجائے ملکی اشو بنانا سستی لیڈری حاصل کرنے کی کوشش تو ہو سکتی ہے، مگر وہ مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش ہرگز نہیں۔

اجودھیا کی بابری مسجد تحریک کے "چیرمین" کے جس انٹرویو کا ذکر اوپر ہوا، اس کا ایک حصہ یہ ہے:

سوال کیا مسلم قائدین اجودھیا مارچ میں شریک ہوں گے، یا مسلم قائدین گھر میں بیٹھیں گے اور عوام مارچ میں نقصان اٹھائیں گے۔

جواب ترتیب پر منحصر ہے۔ میں نے تو کوئی ایسی فوج نہیں دیکھی جس میں جنرل بھی آگے جاکر لڑتا ہے۔ کسی کا یہ کہنا احمقانہ ہے کہ صرف قائدین آگے چلے جائیں۔ یا یہ کہنا کہ محض عوام ہی آگے رہیں قائدین آگے نہ آئیں (افکار ملی، ۳۱ مئی ۱۹۸۸، صفحہ ۲۴)

بابری مسجد ریلی (۳۰ مارچ ۱۹۸۷) کے بعد سے بار بار مارچ (کوچ) کی تاریخ مقرر کرنے کے لیے نام نہاد قائدین کی میٹنگیں ہوتی تھیں، مگر ہر بار تاریخ کا تعین کیے بغیر میٹنگ برخواست ہو جاتی تھی۔ عام لوگ یہ خیال کرنے لگے تھے کہ مارچ کی تاریخ کا تعین اس لیے نہیں کیا جا رہا ہے کہ مارچ کے پُرخطر اقدام میں لیڈر کو آگے رہنا پڑے گا۔ اور لیڈر صرف ملت کے بچوں کو یتیم بنانے میں دلچسپی رکھتا ہے، وہ اپنے بچوں کو یتیم بنانا نہیں چاہتا۔

مگر مذکورہ سوال و جواب بتاتا ہے کہ لیڈر کے سیاسی ذہن نے غالباً اس مشکل کا حل دریافت کر لیا ہے۔

اور وہ یہ ہے کہ اگر مارچ ہو تو لیڈر مارچ کا "جنرل" بن جائے۔ وہ مارچ سے دور کسی محفوظ مقام پر بیٹھ کر مارچ کی رہنمائی کرے۔ مگر اس قسم کی جھوٹی ہوشیاری لیڈر صاحبان کے کام آنے والی نہیں۔ کیوں کہ ہر شخص جانتا ہے کہ جنرل ایک منظم فوج کو دوسری منظم فوج سے لڑاتا ہے۔ جب کہ مارچ (کوچ) اس قسم کی لڑائی نہیں۔ مارچ اصلاً ایک مظاہرہ ہے۔ اور مظاہرہ اس وقت تک نامکمل ہے جب تک لیڈر کی گاڑی اس کے آگے آگے نہ چل رہی ہو۔

اجودھیا مارچ کا فیصلہ نام نہاد مسلم لیڈروں نے بوٹ کلب ریلی کے موقع پر ۳۰ مارچ ۱۹۸۷ کو کیا تھا۔ اس کے بعد سے مسلسل مسلمانوں کے جذبات اس عنوان پر ابھارے جاتے رہے۔ یہاں تک کہ فیض آباد کی میٹنگ (۲۲ مئی ۱۹۸۸) میں "بابری مسجد ایکشن کمیٹی" کے ذمہ داروں نے اعلان کر دیا ہے کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ ۱۴ اکتوبر ۱۹۸۸ کو طویل مارچ کر کے اجودھیا پہونچیں گے اور ہر قیمت پر بابری مسجد میں داخل ہو کر جمعہ کی نماز ادا کریں گے۔ کل ہند بابری مسجد ایکشن کمیٹی کے کنوینر (جو کہ ایم پی بھی ہیں) نے ایک پریس کانفرنس میں اس فیصلہ کا اعلان کیا (قومی آواز، ۲۳ مئی ۱۹۸۸)

یہ فیصلہ بلاشبہ مجنونانہ حد تک غلط ہے۔ اس قسم کا فیصلہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو لیڈری کی ہوس میں اندھے ہو چکے ہوں۔ اور انھیں اپنی لیڈری کے سوا کوئی اور چیز دکھائی نہ دیتی ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کی نام نہاد قیادت نے بابری مسجد کے بارہ میں جوش دلا کر مسلمانوں کو اب ایک ایسے نازک مقام پر لا کر کھڑا کر دیا ہے جہاں ان کے ایک طرف گہری کھائی ہے اور دوسری طرف خونخوار بھیڑیا۔

اب ظاہر ہے کہ صرف دو امکان ہے۔ یا تو بابری مسجد ایکشن کمیٹی کے اعلان کے مطابق ۱۴ اکتوبر ۱۹۸۸ کو اجودھیا مارچ ہو، یا اجودھیا مارچ نہ ہو۔ تاہم دونوں میں سے جو بات بھی ہوگی وہ یقینی طور پر سنگین ترین نتائج پیدا کرے گی۔ موجودہ صورت حال میں جب کہ دونوں طرف کے لوگوں کے جذبات انتہائی حد تک بھڑکا دیے گئے ہیں، دونوں میں سے کوئی بات بھی سادہ بات نہیں ہو سکتی۔

اگر مذکورہ اعلان کے مطابق، مسلمانوں کا جتھا مارچ کرتے ہوئے اجودھیا پہونچتا ہے اور بابری مسجد میں داخل ہونے کی کوشش کرتا ہے تو اس میں شک نہیں کہ اس کو نہایت خونخوار مزاحمت

کا سامنا کرنا ہوگا۔ تقریباً یقینی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ موجودہ حالات میں اس قسم کا اقدام میرٹھ اور ملیانہ سے بھی زیادہ بُرے انجام کی طرف جان بوجھ کر چھلانگ لگانے کے ہم معنی ثابت ہوگا۔ سطحی قسم کے قائدین اس کے بعد "ظلم اور سازش" کے انکشاف میں سرگرم ہو جائیں گے۔ مگر یقینی طور پر یہ مسلم قیادت کے دیوالیہ پن کا ثبوت ہوگا نہ کہ کسی دوسرے کے ظلم اور سازش کا۔

اور اگر لیڈر کا زرخیز دماغ کوئی عذر نکال کر اجودھیا مارچ کو ملتوی یا منسوخ کر دے تو یہ بلاشبہ اس سے بھی زیادہ برا ہے۔ کیوں کہ ۳۰ مارچ ۱۹۸۷ کی ریلی میں مسلم مقررین نے جس طرح فریق ثانی کو دھمکیاں دی تھیں، اس کے بعد سے اب تک تمام چھوٹے بڑے مسلم قائدین جس طرح چیلنج کی زبان میں بات کرتے رہے ہے، جس طرح جلسوں کی بھیڑیں بابری مسجد لے کے رہیں گے جیسے "فلک شگاف" نعرے لگائے جاتے رہے ہے، اس کے بعد مارچ کا التوا محض سادہ واقعہ نہیں ہوسکتا۔ مسلمانوں نے الفاظ کے بے پناہ اسراف سے جو ملکی فضا بنائی ہے، اس کے بعد اگر وہ اقدام سے باز رہتے ہیں تو یہ فریق ثانی کی نظر میں سخت ترین بزدلی کا مظاہرہ ہوگا جس کی تلافی مستقبل بعید تک بھی ناممکن ہوگی۔ اس کے بعد وہ ذلت اور حقارت کے ایسے دور میں داخل ہو جائیں گے جس کا اب تک انھوں نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ نااہل قیادت نے ہندستانی مسلمانوں کو اب ایسے نازک مقام پر لاکر کھڑا کر دیا ہے جہاں ان کے لیے انتخاب (Choice) بربادی اور غیر بربادی میں نہیں ہے، بلکہ ایک بربادی اور دوسری بربادی میں ہے۔ شاید عربی شاعر نے اسی قسم کی نکمی قیادت کے بارہ میں یہ شعر کہا تھا کہ جب کوا کسی قوم کا سردار ہو جائے تو وہ ان کو ہلاکت کے گڑھے کی طرف لے جائے گا :

إِذَا كَانَ الْغُرَابُ رَئِيسَ قَوْمٍ

سَيَهْدِيهِمْ إِلَى دَارِ الْبَوَارِ

یہاں ہم ہفت روزہ نئی دنیا (۳-۹ جون ۱۹۸۸) کا ایک پیراگراف نقل کریں گے۔ اس نے اجودھیا مارچ کے مسئلہ پر تبصرہ کرتے ہوئے "خودکشی یا جہاد" کے عنوان کے تحت لکھا ہے :

"کیا حق ہے اور کیا ناحق، اس سے قطع نظر، آج کے ہندستان کی حقیقت یہ ہے کہ فاشسٹ اور فرقہ پرست عناصر اس مارچ کے سوال کو لے کر ہندستان کے امن و امان کو آگ لگانے کی کوشش کریں گے۔ سید شہاب الدین یا بابری مسجد رابطہ کمیٹی کے کچھ لیڈر کتنی بھی من شانتی کی بات کریں اور گاندھیائی

انداز میں مارچ کرنے کا نعرہ لگائیں، عام آدمی کے ذہن میں اس مارچ کا مطلب ہندو مسلم ٹکراؤ ہوگا، جو فاشسٹ طاقتیں ہندستان سے سیکولزم کا جنازہ نکالنا چاہتی ہیں، مارچ کو بہانہ بنا کر گاؤں گاؤں، قصبہ قصبہ فساد کرانے اور ہنگامے کرانے کی سازشیں کریں گی۔ جس طرح میرٹھ کے قتل عام کے موقع پر مسلم قیادت بے دست و پا نظر آرہی تھی، اسی طرح اس موقع پر بھی خاموش تماشائی بنی نظر آئے گی، اور کٹے گا، مرے گا، لٹے گا عام مسلمان، غریب مسلمان، بدحال، بے بس مسلمان۔ مارچ کے اس فیصلہ کے ساتھ مسلم لیڈروں کو اس بات کو سامنے رکھنا ہوگا کہ ان کا موقف کتنا بھی درست کیوں نہ ہو، ان کی حکمت عملی کے نتائج کیا ہوں گے۔ اور یہ نتائج کسے بھگتنے ہوں گے۔ اور سب سے بڑی بدنصیبی تو یہ ہوگی کہ ان سب قربانیوں کے باوجود اس راستہ کو اپنا کر مسلمانوں کو بابری مسجد نہیں مل سکے گی۔ خود بابری مسجد ایکشن کمیٹی کے قائد بھی اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں۔" صفحہ ۱

حقیقت حج

از: مولانا وحیدالدین خاں



حج کا سفر خدا کی طرف سفر ہے۔ حج حق تعالیٰ سے ملاقات ہے۔ دوسری عبادتیں اللہ تعالیٰ کی یاد ہیں۔ جب کہ حج خود اللہ تعالیٰ تک پہنچ جانا ہے۔ عام عبادت اگر غیب کی سطح پر خدا کی عبادت ہے تو حج شہود کی سطح پر خدا کی عبادت کرنا ہے۔

(صفحات ۱۱۳ قیمت ۲۵ روپیہ، مختصر: صفحات ۴۸ قیمت ۴ روپیہ)

ایک سفر

۳ اپریل ۱۹۸۸ کو سہارن پور سے کچھ صاحبان اسلامی مرکز میں آئے۔ یہ ڈاکٹر محمد اسلم صاحب اور ان کے ساتھی تھے۔ انھوں نے کہا کہ آل انڈیا اردو تعلیمی بورڈ اور فخرالدین علی احمد اکیڈمی کے مشترکہ فیصلہ سے یہ طے کیا گیا ہے کہ محمود علی خاں نیشنل انٹگریشن ایوارڈ (۱۹۸۸) آپ کو دیا جائے۔ اس مقصد کے لئے ہم سہارن پور میں ۹ اپریل ۱۹۸۸ کو ایک خصوصی تقریب منعقد کر رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ میں اس قسم کا آدمی نہیں ہوں۔ مجھ کو آپ ایوارڈ نہ دیجئے، مجھ کو آپ دعا دیجئے۔ تقریباً ایک گھنٹہ تک میں ان کے ذہن کو بدلنے کی کوشش کرتا رہا، مگر وہ کسی قیمت پر راضی نہیں ہوئے۔ یہاں تک کہ مجبوراً مجھے اس پیش کش کو منظور کرنا پڑا۔

ان معاملات میں میرا مزاج اس سے مختلف ہے جس کی کہانیاں مسلمانوں، نیز غیر مسلموں کی مذہبی شخصیتوں کے بارے میں پرفخر طور پر بیان کی جاتی ہیں۔ یعنی ان کو فلاں چیز کی پیش کش کی گئی اور انھوں نے اس کو بے نیازی کے ساتھ ٹھکرا دیا۔ ذاتی طور پر میں اس روش کو تواضع کے خلاف سمجھتا ہوں۔ میرے تمام جاننے والے جانتے ہیں کہ طبعاً میں گمنامی میں رہنا پسند کرتا ہوں۔ شہرت اور اعزاز سے مجھے بیزاری کی حد تک وحشت ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میں اس کو ذہنی پستی کی علامت سمجھتا ہوں کہ کوئی شخص دوسروں کی طرف سے ملنے والے اعزاز پر خوش ہو یا اس کا طالب بنے۔ اس قسم کے اعزازات کی طلب بلاشبہہ مومنانہ نفسیات کے خلاف ہے۔ مگر یہ بات بھی مومنانہ نفسیات کے خلاف ہے کہ آدمی اس قسم کی پیش کش کو اصرار کے باوجود ٹھکرا دے۔ کیوں کہ یہ اس تواضع کے مطابق نہیں جو اس دنیا میں مومن و مسلم کا اصل سرمایہ ہے۔

جیمس رسل لاول (James Russel Lowell) نے کہا ہے کہ وہ چیز جس کو لوگ بہت زیادہ اہمیت دیتے ہیں وہ اعزاز ہے خواہ وہ جنازہ کے ماتمی جلوس کی پیشوائی کیوں نہ ہو:

What men prize most is a privilege, even
it be that of chief mourner at a funeral.

یہ اعزاز پسندی تمام برائیوں کی جڑ ہے۔ تاہم اصل مطلوب، اعزاز والی چیز کو رد کرنا نہیں بلکہ

اعزاز پسندی کی نفسیات موجود رہتی ہے۔ اور جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے، یہ دوسری چیز ان لوگوں میں مزید اضافہ کے ساتھ موجود ہوتی ہے جو تمغۂ اعزاز کو رد کرنے کے چمپئن بنتے ہیں۔ کیوں کہ اعزاز کو رد کرنا عوام کی نظر میں انھیں مزید برتر اعزاز کا درجہ عطا کر دیتا ہے۔

سہارن پور دہلی سے ۱۶۵ کیلو میٹر کے فاصلہ پر مغربی یوپی میں واقع ہے۔ یہ شہر ۱۳۴۰ء میں آباد ہوا۔ اس وقت کے ایک مسلم بزرگ شاہ حاران چشتی کے نام پر اس کا نام "شاہ حاران پور" رکھا گیا جو بعد کے استعمال میں سہارن پور ہو گیا۔ ہندوؤں کا تیرتھ استھان ہردوار اسی ضلع میں واقع ہے۔ مشہور عربی درس گاہ دار العلوم دیوبند بھی اسی ضلع میں ہے جو ابتداءً ۱۸۶۷ء میں قائم ہوئی تھی۔ خود شہر سہارنپور میں مظاہر العلوم کے نام سے ایک بڑا تعلیمی ادارہ موجود ہے۔ چھوٹے چھوٹے دینی مدارس درجنوں کی تعداد میں اس کے علاوہ ہیں۔ سہارن پور شہر کی آبادی تقریباً ۵ لاکھ ہے جس میں مسلمانوں کی تعداد ۳۰ فی صد بتائی جاتی ہے۔ تعلیمی اور معاشی اعتبار سے یہاں کے مسلمان نسبتاً اچھی حالت میں ہیں۔

رڑکی بھی اسی ضلع میں ہے جہاں ہندستان کی پہلی انجنیرنگ یونیورسٹی قائم ہوئی۔ رڑکی کے تصور سے مجھے ایک واقعہ یاد آگیا۔ ایک صاحب ہیں جنھوں نے ۱۹۵۵ میں بی ایس سی (انجنیرنگ) کیا تھا۔ اس وقت ہندستان میں صرف رڑکی میں ایم اے (انجنیرنگ) کا کورس تھا۔ مزید یہ کہ اس وقت یہ کورس صرف ایک سال کا تھا۔ میں نے ان سے کہا کہ اب آپ رڑکی انجنیرنگ کالج میں داخلہ لے لیں اور انجنیرنگ میں ماسٹر ڈگری کا کورس کر لیں۔ مگر انھوں نے میرا مشورہ نہیں مانا اور ملازمت میں چلے گئے۔

بعد کو ان سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے کہا کہ میں نے آپ کا مشورہ نہ مان کر سخت غلطی کی۔ میں ٹیچنگ کے کام کو پسند کرتا ہوں مگر ماسٹر ڈگری نہ ہونے کی وجہ سے میں یونیورسٹی میں جگہ حاصل نہ کر سکا۔ آخر کار مجھے ایڈمنسٹریشن میں جانا پڑا۔ وہ ایک شریف آدمی ہیں۔ رشوت وغیرہ سے بہت دور رہتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ میرے جیسے آدمی کے لئے یونیورسٹی ٹیچر کی زندگی بہترین زندگی تھی۔ ایڈمنسٹریشن کے لئے، کم از کم اس ملک میں، تو میں بالکل ہی غیر موزوں ہوں۔ نتیجہ یہ ہے کہ میں مستقل طور پر ذہنی الجھن میں رہتا ہوں۔ مجھے کبھی وہ چیز نہ مل سکی جس کو اطمینان کار (Job satisfaction) کہا جاتا ہے۔

مذکورہ کہانی بیان کرنے کے بعد انھوں نے کہا: "میں نے اپنا ایک سال بچانا چاہا تھا، اس کے نتیجہ میں میری پوری زندگی کھوئی گئی، اور آپ جانتے ہیں کہ زندگی صرف ایک بار ملتی ہے۔"

دہلی سے سہارنپور تک کا سفر (۹ اپریل ۱۹۸۸) پروفیسر ایم ایس اگوانی (وائس چانسلر جواہر لال نہرو یونیورسٹی) کے ساتھ ہوا۔ وہ ایک علم پسند اور صاحب مطالعہ آدمی ہیں۔ چنانچہ پورے راستہ میں ان کے ساتھ مفید تبادلہ خیال جاری رہا۔ گفت گو کے دوران انھوں نے بتایا کہ انھوں نے اپنا ڈاکٹریٹ ہالینڈ کی واخی ننگن یونیورسٹی (Wageningen Agricultural University) سے ۱۹۵۴ میں کیا ہے۔ پی ایچ ڈی کے لئے ان کے مقالہ کا عنوان یہ تھا:

The United States and the Arab World.

انھوں نے بتایا کہ واخی ننگن میں وہ تقریباً دو ہفتہ ایک عیسائی پروفیسر ہافسٹی (Prof. Hofstee) کے یہاں مقیم رہے۔ یہ پروفیسر صاحب پروٹسٹنٹ تھے۔ ان کے یہاں کھانا پکانے کے لئے ایک خادمہ تھی جو کیتھولک چرچ سے تعلق رکھتی تھی۔ پروٹسٹنٹ اور کیتھولک میں اتنا زیادہ مذہبی اختلاف ہے کہ دونوں ایک دوسرے کو بے دین سمجھتے ہیں۔ اس مذہبی اختلاف کے باوجود دونوں ایک دوسرے کا مکمل احترام کرتے تھے۔ گھر کے مالک، ان کے بیوی بچے اور خادمہ سب ایک ساتھ میز پر بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے۔ کیتھولک لوگوں کا طریقہ یہ ہے کہ وہ کھانے سے پہلے کچھ دعائیہ کلمات پڑھتے ہیں، اس کے بعد انگلی سے اپنے سینہ پر صلیب کا نشان بناتے ہیں، پھر کھانا شروع کرتے ہیں۔ مذکورہ پروفیسر اور ان کے گھر کے لوگ کھانے کے وقت میز کے کنارے بیٹھ جاتے تھے۔ سب سے پہلے کیتھولک خادمہ اپنے مذہبی عقیدہ کے مطابق مختصر دعائیہ رسم ادا کرتی۔ اس وقفہ میں گھر کے تمام پروٹسٹنٹ افراد خاموشی کے ساتھ گردن جھکائے ہوئے اپنی کرسیوں پر بیٹھے رہتے۔ اور صرف اس وقت کھانا شروع کرتے جب کہ کیتھولک خادمہ اپنی دعائیہ رسم سے فارغ ہو جاتی۔

سہارن پور جاتے ہوئے سڑک کے دونوں طرف مسلسل ہریالی اور باغ کا منظر تھا۔ یعنی وہی منظر جس کی قرآن میں ان الفاظ میں تصویر کشی کی گئی ہے: لقد کان لِسَبَإٍ فی مَسْکَنِهِمْ آیَةٌ جَنَّتَانِ عَنْ یَمِینٍ وَّ شِمَالٍ (سبا ۱۵) قرآن میں اہل سبا کے سرسبز باغات کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ ان کو اس نعمت پر شکر کرنے کا حکم دیا گیا تھا مگر انھوں نے اعراض کیا۔ یہاں تک کہ وہ ان باغات سے محروم کر دیے گئے۔

اس معاملہ پر غور کرتے ہوئے ذہن میں آیا کہ عام طور پر لوگ شکر کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ خود

اپنی ذات کے لئے کوئی نعمت ملے تو اس پر شکر کا کلمہ کہہ دیا جائے۔ مگر یہ شکر کی بہت ناقص اور محدود شکل ہے کیوں کہ عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ موجودہ دنیا میں احسانات خداوندی کا بظاہر ایک چھوٹا سا جزء ہی کسی فرد کو ذاتی طور پر ملتا ہے۔ اب اگر صرف ذاتی عطیہ پر شکر کرنا ہو تو آدمی کے اندر شکر کی ایک چھوٹی نہر تو جاری ہو سکتی ہے مگر شکر کا اتھاہ سمندر اس کے سینہ میں موجزن نہیں ہو سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ شکر خداوندِ عالم کی بے پایاں عظمتوں کے اقرار کا نام ہے۔ شکر کا یہ درجہ کسی شخص کو اسی وقت مل سکتا ہے جب کہ وہ خدا کے عظیم تر احسانات پر جذبۂ شکر سے سرشار ہو سکتا ہو۔ محدود احسان کے تصور سے محدود شکر پیدا ہوتا ہے۔ اور لامحدود احسان کے تصور سے لامحدود شکر۔

راستہ میں ہمارا قافلہ دیوبند سے گزرا۔ یہ سہارن پور کا مشہور قصبہ ہے۔ قدیم عربی درس گاہ "دارالعلوم" یہیں واقع ہے۔ دارالعلوم کی النادی الادبی کی دعوت پر ستمبر ۱۹۷۱ کے پہلے ہفتہ میں دیوبند آیا تھا۔ النادی الادبی کے سالانہ اجتماع میں مجھے مہمان خصوصی کے طور پر بلایا گیا تھا۔

اس سفر کے موقع پر دیوبند میں میری کئی تقریریں ہوئی تھیں۔ اس کی روداد الجمعیۃ ویکلی (۱۷ ستمبر ۱۹۷۱) میں شائع ہو چکی ہے۔ ایک تقریر میں میں نے کہا تھا: "موجودہ حالات بظاہر دل شکن ہیں۔ مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ آدمی خواہ کتنا ہی زیادہ لٹ گیا ہو، پھر بھی اس کے پاس کچھ چیزیں باقی رہتی ہیں۔ اور اگر دانش مندی سے کام لے کر ان موجود چیزوں کو استعمال کیا جائے تو ہر بربادی کے بعد نئی عظیم تر تعمیر کا امکان نکل آتا ہے۔"

دیوبند کے ایک طالب علم کی فرمائش پر میں نے حسب ذیل سطریں اس کی ڈائری میں لکھی تھیں:
"زندگی اس کائنات کی سب سے قیمتی متاع ہے۔ مگر اس متاع کی قیمت بازار حیات میں اس وقت ملتی ہے جب کہ آدمی خود اس کی قیمت دے چکا ہو۔ زندگی وہ سودا ہے جو خارجی بازار میں فروخت ہونے سے پہلے خود آدمی کے اپنے اندر فروخت ہوتا ہے۔ یہ آپ کے حوصلہ کا امتحان ہے۔ آپ خود اپنی جتنی زیادہ قیمت لگائیں گے، بازار عالم میں اتنی ہی زیادہ اس کی قیمت لگے گی۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کی زندگی دوسروں کی نظر میں زیادہ قیمتی ٹھہرے تو سب سے پہلے خود اس کے خریدار بنئے۔ یہ دوسرے نہیں بلکہ خود آپ ہیں جو اس بات کا تعین کرتے ہیں کہ بازار عالم میں آپ کی قیمت کتنی مقرر ہوگی (۴ ستمبر ۱۹۷۱)

رائے پور ایک قصبہ ہے جو سہارن پور ضلع میں واقع ہے۔ یہاں مولانا عبد القادر رائپوری

(۱۹۶۲ - ۱۸۷۲) کی خانقاہ ہے۔ میں دو بار اس خانقاہ میں گیا ہوں۔ یہ سفر بھی سہارن پور کے راستہ سے ہوا۔ پہلی بار جنوری ۱۹۷۲ کے آخری ہفتہ میں رائے پور کا سفر ہوا تھا۔ اس سلسلہ میں دو گھنٹہ کے لئے سہارن پور میں بھی قیام رہا۔ اس سفر کی روداد الجمعیۃ ویکلی ۱۸ فروری ۱۹۷۲ میں شائع ہو چکی ہے۔

اس سفر میں کچھ وقت قصبہ بہیٹ میں شاہ مسعود صاحب کے یہاں گزرا۔ وہ مولانا رائے پوری کے بہت قریبی لوگوں میں سے تھے۔ انھوں نے کہا کہ "حضرت کو اس بات کا بہت خیال تھا کہ مسلمان نئے زمانہ کے تقاضوں کو نہیں سمجھتے۔ حالاں کہ جب تک نئے زمانہ کے لحاظ سے تیاری نہ کی جائے اور اس کے مطابق عمل نہ کیا جائے، نئے زمانہ میں کوئی جگہ حاصل نہیں کی جا سکتی"۔ شاہ مسعود صاحب نے بتایا کہ ایک بار میں نے حضرت رائے پوری کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ "دو سو سال سے ملّت کا ستارہ گردش میں ہے"۔

مولانا حبیب الرحمٰن صاحب ۱۹۳۵ سے مستقل طور پر رائے پور میں مقیم تھے۔ انھوں نے مولانا رائے پوری کے ملفوظات بڑی مقدار میں قلم بند کر رکھے تھے۔ انھوں نے اپنی ڈائری مجھے دیکھنے کے لئے دی۔ اس میں یکم شوال ۱۳۷۰ھ کی رائے پوری کی ایک صحبت کے تحت درج تھا کہ "حضرت نے فرمایا کہ اب مسلمانوں کو اپنی پستی سے اٹھنے کے لئے سو سال درکار ہیں، بشرطیکہ وہ صحیح راستہ پاکر اس پر عمل شروع کر دیں"۔

۲۰ جولائی ۱۹۵۱ کی تاریخ کے تحت درج تھا کہ "حضرت نے آج کی مجلس میں فرمایا کہ ہماری قوم کا عجیب قصہ ہے۔ وہ تیاری تو کرتی نہیں، شور مچاتی ہے۔ غوغائی لوگ ہیں۔ ان کو اب، بشرطیکہ جائز لے کر کام کریں، سو سال اٹھنے کو چاہئیں"۔ جب سنا کہ پاکستان میں مسٹر جناح کے نام پہ ایک نیا شہر "قائد آباد" بسایا گیا ہے تو فرمایا کہ ہماری قوم کا عجیب حال ہے۔ اگر ہم پانچ دس لاکھ آدمی قتل کرا دیتے تو ہمارے نام پر بھی شہر آباد کر دیتے۔ جو ان کو تباہ کرے، یہ اس کے ساتھ لگتے ہیں"۔

رائے پور (ضلع سہارن پور) کا دوسرا سفر جولائی ۱۹۷۲ کے دوسرے ہفتہ میں ہوا۔ اس سفر کی روداد الجمعیۃ ویکلی ۲۸ جولائی ۱۹۷۲ میں مفصل طور پر شائع ہو چکی ہے۔ یہ دونوں سفر حافظ عتیق الرحمٰن دہلوی کے ساتھ ہوئے۔ خانقاہ کے ایک صاحب نے بتایا کہ تقسیم ہند سے پہلے جب مسلم لیگ کا طوفان برپا تھا اور ہر طرف انقلاب زندباد کے نعرے لگ رہے تھے، حضرت نے فرمایا: "یہ سب نعرے تو میری سمجھ

آتے نہیں۔ مجھے تو دہریت کی گھٹائیں آتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ اس کے لئے کچھ نہیں کیا جاتا۔

مسلمانوں کی یہ غوغائی سیاست آج بھی بدستور جاری ہے۔ "دوسو سالہ گردش" کی مدت بڑھتی جارہی ہے، اور مسلم قائدین میں کوئی ایک شخص بھی نہیں جو ماضی کی غلطیوں کا اعتراف کرکے از سرِ نو صحیح سمت میں سفر شروع کرنے کے لئے تیار ہو۔

۱۹ اپریل ۱۹۸۸ کی دوپہر کو جب میں سہارن پور پہنچا تو یہ سہارن پور میں میرے باقاعدہ قیام کا پہلا واقعہ تھا۔ یہاں اندازہ ہوا کہ الرسالہ کا مشن یہاں کے تعلیم یافتہ طبقہ میں عام طور پر پہنچ چکا ہے۔ اور اسی طرح اطراف کی بستیوں میں بھی۔ خاص طور پر نوجوان طبقہ اب یہ محسوس کرنے لگا ہے کہ نام نہاد مسلم قائدین اب تک انھیں جو رہنمائی دیتے رہے وہ حقیقتہً رہنمائی نہیں تھی بلکہ قیادتی استحصال تھا۔ الرسالہ کے ذریعہ پہلی بار وہ محسوس کررہے ہیں کہ انھیں ایک ایسی راہِ عمل مل رہی ہے جس پر وہ نتیجہ خیز طور پر سرگرم عمل ہوسکیں۔ ایک صاحب نے اپنا تاثر ان لفظوں میں بیان کیا کہ اگر الرسالہ کا پیغام مجھے پہلے مل جاتا تو میں بہت سی ان حماقتوں سے بچ سکتا تھا جو میں نے مسلم قائدین کے خطیبانہ الفاظ سے متاثر ہو کر کیں۔

نوجوانوں کی بڑی تعداد اس طرح پرشوق طور پر ملاقات کرتی رہی جیسے کہ انھوں نے صاحبِ الرسالہ کی شکل میں اپنا مستقبل دریافت کرلیا ہو۔

کئی نوجوانوں نے آٹو گراف لئے۔ میں نے ایک نوجوان کی بک پر لکھنا شروع کیا: زندگی اس سے زیادہ ... " اس نے فوراً کہا، کیا آپ وہ جملہ لکھ رہے ہیں جو اس سے پہلے الرسالہ (دسمبر ۱۹۸۶ صفحہ ۳) میں چھپ چکا ہے۔ مجھے نوجوان کی یادداشت پر حیرت ہوئی۔ اس نے کہا کہ ہم الرسالہ کو پڑھتے نہیں ہیں بلکہ اس کو کاغذ سے لے کر اپنے سینہ پر لکھتے ہیں۔ میں نے سابقہ الفاظ کاٹ کر اس کی جگہ یہ جملہ لکھ دیا: کائنات رزقِ خداوندی کا دسترخوان ہے۔ جس نے موجودہ دنیا میں خدا کا رزق پایا، وہی آخرت میں خدا کا رزق پائے گا۔ جو شخص دنیا میں خدا کے رزق سے محروم رہا وہ آخرت میں بھی خدا کے رزق سے محروم رہے گا۔

ایک شخص نے آٹو گراف کے لئے اپنی بک کھولی۔ اس میں یہ سوال لکھا ہوا تھا کہ "خوشی کیا ہے" اس کے جواب میں میں نے یہ الفاظ لکھ دئے: اس دنیا میں صرف وہ آدمی خوش رہ سکتا ہے جو ناخوشی کے حالات میں خوش رہنے کا فن جانتا ہو۔

ایک ہندو نوجوان نے اپنی بک کھول کر میرے سامنے رکھی اور کہا کہ اس میں کچھ نصیحت کی بات لکھ دیجئے۔ میں نے اس کی بک میں حسب ذیل انگریزی فقرہ لکھ دیا:

If you have a good excuse, don't use it.

سہارنپور کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہاں فساد نہیں ہوتا۔ معمولی وقتی جھڑپیں تو ہوئی ہیں مگر باقاعدہ قسم کا فرقہ وارانہ فساد کبھی نہیں ہوا۔ میں نے اس کے اسباب جاننے کی کوشش کی تو یہ بات سامنے آئی کہ یہاں کے ہندو اور مسلمان برابر آپس میں ملتے جلتے رہتے ہیں۔ مثلاً ۹ اپریل ۱۹۸۸ کو نیشنل انٹگریشن کا جو اجتماع ہوا، اس میں نہ صرف سب کو شریک کیا گیا بلکہ جن لوگوں کو انعامات تقسیم کئے گئے ان میں بھی مسلمانوں کے ساتھ ہندوؤں کے نام شامل تھے۔ حتیٰ کہ "بدنام" قسم کی فرقہ پرست پارٹیوں کے افراد کو بھی فیاضی کے ساتھ تحسین و اعتراف سے نوازا گیا۔

مجھے معلوم ہوا کہ یہاں مختلف قسم کی تقریبات اور اجتماعات میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے سربرآوردہ افراد بار بار آپس میں ملتے ہیں۔ ایک دوسرے کے معاملات میں شریک ہوتے ہیں۔ یہ طریقہ ہر قسم کے فساد کے لئے بلاشبہ سب سے بڑا روک ہے۔ پچھلی نصف صدی کے دوران مسلم لیڈروں نے نمائشی دھوم پر جتنا وقت اور پیسہ برباد کیا ہے، اگر وہ اس کو ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان آپس کا میل ملاپ بڑھانے کے لئے استعمال کرتے تو یقینی ہے کہ ہندستان میں فرقہ وارانہ جھگڑے پیدا ہونے سے پہلے ختم ہو چکے ہوتے۔ ممکن ہے کہ اس غیر نمائشی تدبیر کو اختیار کرنے کی صورت میں قائدین ملت کا اپنا قیادتی مینار کھڑا نہ ہوتا، مگر یہ یقینی ہے کہ خود ملت کے مسائل پورے طور پر حل ہو جاتے۔

موجودہ زمانہ کے تمام مسلم لیڈر کسی نہ کسی طور پر ایک ہی کام میں مشغول ہیں۔ حکمرانوں سے احتجاج و مطالبہ۔ اس قسم کی سیاست سراسر نادانی کی سیاست ہے۔ یہ عوامی جمہوریت کا زمانہ ہے۔ موجودہ زمانہ میں تمام اجتماعی فیصلے عوام کی سطح پر ہوتے ہیں۔ ایسی حالت میں جدوجہد کا رخ عوام کے بجائے حکمرانوں کی طرف کرنا صرف زمانہ سے ناواقفیت کا ثبوت ہے، یہ اپنی جہالت کا اشتہار ہے نہ کہ حقیقی معنی میں کوئی قیادت۔

سہارنپور میں میرا قیام وہاں کے ڈاک بنگلہ میں تھا۔ "ڈاک بنگلہ"، نوآبادیاتی دور کی اصطلاح ہے۔ برطانی دور میں ہندستان میں جگہ جگہ رہائش گاہیں بنائی گئی تھیں۔ یہ عام طور پر ایک منز

مکانات ہوتے تھے اور ان کے گرد وسیع خالی زمین ہوتی تھی۔ یہ مکانات نوآبادیاتی افسروں (Colonial officials) کے وقتی قیام میں، نیز گھوڑوں کے ذریعہ ڈاک کی روانگی میں درمیانی اسٹیشن کے طور پر استعمال ہوتے تھے۔ ان کو اس زمانہ میں ڈاک بنگلہ کہا گیا۔ ڈاک بنگلہ کا لفظ بیک وقت دو چیزوں کی علامت ہے۔ سیاسی اعتبار سے نوآبادیاتی اقتدار، اور تمدنی اعتبار سے وہ دور جبکہ ڈاک صرف حیوانی طاقت کے ذریعہ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کی جاسکتی تھی۔

ڈاک بنگلہ کو، اس کے موجودہ استعمال کے لحاظ سے، اگر سرائے کہا جائے تو وہ زیادہ بامعنی ہوگا۔ مگر "وی آئی پی" حضرات جو اکثر ڈاک بنگلوں میں ٹھہرتے ہیں، وہ شاید اس کو پسند نہ کریں۔ کیونکہ "سرائے" کے لفظ نے استعمال کی بنا پر وہ کشش کھودی ہے جو "ڈاک بنگلہ" کے لفظ میں قدیم برطانی تاریخ کی بنا پر پائی جاتی ہے۔

۹ اپریل کی شام کو مغرب کی نماز پڑھ کر میں مسجد سے باہر نکل رہا تھا، ایک صاحب نے کہا: آپ نے تو اپنے اسلامی نقشہ میں بدر واحد کو ختم کر دیا ہے۔ ان کا یہ سوال طنزیہ لہجہ میں تھا۔ مزید یہ کہ وہ میری طرف ایک ایسی بات منسوب کر رہے تھے جو میں نے خود نہ کہی ہو۔ میں نے سوچا کہ کیسے عجیب ہیں وہ نمازی جو اپنے ظاہری جسم کے اعتبار سے تو نمازی بن گئے، مگر اپنی سوچ اور اپنی بات میں وہ نمازی نہیں بنے۔

میں نے کہا کہ اس کو میں نے ختم نہیں کیا، البتہ آپ جیسے مسلمان ضرور اس کو ختم کر رہے ہیں۔ بدر واحد وقتی اشتعال کے تحت لڑ جانے کا نام نہیں۔ اس قسم کی لڑائی خودکشی کا عمل ہے۔ جب کہ "بدر واحد" تاریخ سازی کا عمل۔ حقیقت یہ ہے کہ بدر واحد ایک لمبے منصوبہ کے تحت پیش آنے والا مقدس واقعہ ہے ـــــــ حق کی دعوت دینا۔ اس کو تمام آداب حکمت کے ساتھ مسلسل جاری رکھنا۔ یہاں تک کہ وہ اتمام حجت کے مرحلہ تک پہنچ جائے۔ پھر ہجرتِ مکانی یا ہجرتِ عملی کے ذریعہ فریق ثانی کی جارحیت کے نشانہ سے ہٹ جانا۔ یک طرفہ طور پر اپنے آپ کو غیر جارح بنا لینا۔ ان سب مراحل کے بعد بھی اگر فریق ثانی چڑھائی کر کے حملہ آور ہو جائے تو پھر اس سے مقابلہ کرنا۔ یہ ہے وہ "بدر واحد" جس کے لئے "نصر من اللہ و فتح" قریب کی بشارت دی گئی ہے۔

موجودہ مسلمانوں نے "بدر واحد" کی تمام ابتدائی شرطوں کو عملاً منسوخ کر رکھا ہے۔ اس لئے ان کے حق میں وہ بدر واحد بھی منسوخ ہو چکا ہے جس میں خدا کے فرشتے ان کی مدد کے لئے اتریں اور انھیں

غلبہ وسربلندی کی خبریں سنائیں۔ جو کسان زراعت کی ابتدائی شرطوں کو پورا نہ کرے اس کے لئے فصل کے وقت فصل کا حصہ بھی مقدر نہیں۔ اسی طرح جو مسلمان " بدر واحد " کی ابتدائی شرطوں کو پورا نہ کریں ان کے لئے یہ مقدر نہیں کہ وہ "بدر واحد" کے مجاہدین میں لکھے جائیں اور بدر واحد کے ثمرات میں حصہ دار بنیں۔

ایک صاحب نے کہا کہ "الرسالہ میرے دل کی آواز ہے"۔ میں نے پوچھا، کیا آپ نے الرسالہ کی ایجنسی لی ہے۔ انھوں نے کہا کہ نہیں۔ میں نے کہا، پھر میں یہ ماننے کے لئے تیار نہیں کہ الرسالہ آپ کے دل کی آواز ہے۔ دل تو ایسی چیز ہے کہ جو بات اس کی آواز بن جائے وہ دل کے اندر محدود نہیں رہ سکتی، وہ یقینی طور پر پھٹ کر نکلے گی۔ اور اسی کی ایک صورت الرسالہ کی ایجنسی ہے۔ ایجنسی در اصل صاحب ایجنسی کی شخصیت کی توسیع ہے۔ وہ دل کے جذبات کا کاغذی روپ اختیار کرکے باہر آنا ہے۔ ایک شخص جو حقیقی طور پر الرسالہ سے متاثر ہو، وہ اس کا تحمل نہیں کر سکتا کہ وہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو پھیلانے کے عمل میں شریک نہ ہو جائے۔

انھوں نے کہا کہ میں ایجنسی لینا چاہتا ہوں، مگر میرے پاس پیسہ نہیں۔ میں نے کہا کہ الرسالہ دنیا کا واحد پرچہ ہے جس کی ایجنسی کسی نقصان کا خطرہ مول لئے بغیر لی جا سکتی ہے اور جس کو مفت پڑھا جا سکتا ہے۔ انھوں نے پوچھا کہ وہ کیسے۔

میں نے کہا کہ آپ پانچ پرچہ کی یا دس پرچہ کی ایجنسی لے لیں اور ایک پرچہ اپنے پاس رکھ کر بقیہ پرچوں کو فروخت کرتے رہیں۔ آپ کو مفت میں ایک پرچہ ملتا رہے گا۔ اور اگر کچھ پرچے فروخت نہ ہو سکیں تو آپ کبھی بھی ان کو پوری قیمت پر واپس کر سکتے ہیں۔ حتی کہ اگر ایک شخص ایجنسی نہ لینا چاہے تب بھی وہ مفت پڑھ سکتا ہے۔ اور اس کی صورت یہ ہے کہ وہ ایک بار سالانہ چندہ (۴۸ روپئے) جمع کر دے اس کے بعد ہر ماہ کے پرچے صاف ستھری حالت میں اکٹھا کرتا رہے۔ یہاں تک کہ جب بارہ پرچے ہو جائیں تو وہ ان پرچوں کو دفتر میں واپس بھیج دے۔ اس کی بنیاد پر اس کو اگلے سال کے لئے رسالہ جاری کر دیا جائے گا۔ اسی طرح ہر سال وہ ۱۲ پرچے واپس کرکے دوبارہ خریدار بنتا رہے۔ اور آخر میں اگر چاہے تو پرچے واپس کرکے اپنی پوری رقم وصول کر لے۔

ایک صاحب نے کہا کہ آپ نے فلاں "تنقید" دیکھی ہے جو آپ کے خلاف شائع ہوئی ہے۔

میں نے کہا کہ وہ تنقید نہیں، استہزا ہے۔ تنقید وہ ہے جس میں علمی تجزیہ ہو۔ اس میں کوئی علمی تجزیہ نہیں اس میں تو صرف لفظی مذاق اڑایا گیا ہے۔

میں نے کہا کہ استہزا کرنا یا مذاق اڑانا ہمیشہ غیر سنجیدہ لوگوں کا شیوہ رہا ہے۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ پچھلے زمانوں میں جو پیغمبر آئے، ان سب کا مذاق اڑایا جاتا رہا۔ چنانچہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ ولقد استھزئ برسل من قبلك (انعام ۱۰) دوسری جگہ فرمایا گیا ہے :

یاحسرۃ علی العباد ما یاتیھم من رسول الا کانوا بہ یستھزؤن (یٰس ۳۰)

پھر میں نے کہا کہ استہزا کا میدان اتنا وسیع ہے کہ کسی بھی شخص کا مذاق اڑایا جا سکتا ہے، خواہ بذات خود وہ کتنا ہی صحیح کیوں نہ ہو۔ استہزا کرنے کے لئے زیر استہزا شخص کے اندر نقص کا ہونا ضروری نہیں۔ استہزا کرنے والے کے اپنے اندر غیر سنجیدگی اور اللہ سے بے خوفی ہونا کافی ہے۔ اگر یہ سرمایہ کسی پاس ہو تو وہ پیغمبروں تک کا حتی کہ خدا کا بھی مذاق اڑا سکتا ہے، جیسا کہ موجودہ زمانہ کے ملحدین کر رہے ہیں۔

ایک صاحب نے کہا کہ میں الرسالہ پابندی کے ساتھ پڑھتا ہوں مگر ہندستانی مسلمانوں کے مسائل کے بارہ میں آپ کا جو نقطۂ نظر ہے اس سے مجھے سخت اختلاف ہے۔ مزید دریافت کرنے پر انھوں نے کہا کہ "الرسالہ مسلمانوں کو بزدل بنا رہا ہے"۔

جن صاحب نے یہ بات کہی، ان سے میں نے پوچھا کہ آپ اپنے بیان کے مطابق الرسالہ برابر پڑھ رہے ہیں تو کیا آپ بزدل ہو گئے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ نہیں، میں تو بزدل نہیں ہوا۔ پھر میں نے پوچھا کہ آپ کے اس علاقہ میں الرسالہ پڑھنے والے سیکڑوں افراد موجود ہیں۔ کیا آپ ان میں سے کچھ لوگوں کو جانتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہاں، میں بہت سے لوگوں کو جانتا ہوں جو برابر الرسالہ پڑھتے ہیں۔ میں نے کہا کہ کیا آپ ان بہت سے قارئین میں سے کسی ایک شخص کا نام بتا سکتے ہیں جو الرسالہ پڑھ کر بزدل ہو گیا ہو۔ میرے اس سوال پر وہ خاموش ہو کر سوچنے لگے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے میرے اس سوال کے بعد ان کا پورا قلعہ دھڑام سے گر گیا ہو۔ ان کا چہرہ بتا رہا تھا کہ الرسالہ کے بارے میں وہ جس واقعہ کی خبر مجھے دے رہے تھے، اس سے وہ خود بھی متعین طور پر باخبر نہ تھے۔ میں نے بار بار ان سے پوچھا کہ آپ کسی ایک ایسے شخص کا نام بتائیں جو الرسالہ کو پڑھ کر بزدل ہو گیا ہو، مگر ایسا کوئی نام بتلانے سے وہ عاجز رہے۔ انھوں نے نہ اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور نہ الرسالہ کے کسی بزدل قاری

کا نام دیتا یا۔

پھر میں نے کہا کہ الرسالہ بزدلی نہیں سکھاتا، الرسالہ حکمت سکھاتا ہے۔ بزدل دراصل وہ لوگ ہیں جو الرسالہ پر جھوٹی تنقیدیں کرتے ہیں۔ یہ لوگ الرسالہ کی اصل بات کو رد کرنے کی طاقت نہیں رکھتے، اس لئے بزدلانہ طور پر یہ کرتے ہیں کہ الرسالہ کی طرف ایک خلاف واقعہ بات منسوب کرتے ہیں اور پھر اس خلاف واقعہ بات پر تنقید کر کے خوش ہوتے ہیں کہ انھوں نے الرسالہ کی تردید کر دی۔ حالاں کہ یہ خود اپنی بات کی تردید ہوتی ہے نہ کہ الرسالہ کی بات کی تردید۔

الرسالہ کے مخالف حضرات کا یہ حال ہے کہ وہ ہمارے لئے جائز تنقید کو بھی ناجائز بتاتے ہیں اور خود اپنے لئے ناجائز تشویہ کو جائز قرار دئے ہوئے ہیں۔ اس کی ایک عجیب مثال اس دوران سامنے آئی۔ ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ ایک مشہور عربی مدرسہ میں آخری درجہ کے طالب علم ہیں۔ انھوں نے الرسالہ کے اس مضمون کا ذکر کیا جو "تشویہ حقائق" کے عنوان سے جنوری ۱۹۸۸ میں شائع ہوا تھا۔ انھوں نے کہا کہ آپ نے عربی جریدہ کے جس مطبوعہ مضمون پر تنقید کی ہے وہ خود جریدہ کے ایڈیٹر کا نہیں تھا۔ وہ تو انھوں نے دوسرے پرچہ سے نقل کیا تھا، اور آپ جانتے ہیں کہ نقل کفر کفر نباشد۔

میں نے کہا کہ آپ نے ادھوری بات کہی۔ نقل کفر اس وقت کفر نہیں ہے جب کہ وہ تردید کے لئے نقل کیا جائے۔ جو نقل کفر تصدیق کے ہم معنی ہو وہ یقیناً کفر ہے۔ انھوں نے کہا، مگر مذکورہ جریدہ نے اس کی تصدیق نہیں کی۔ اس نے تو اپنی تصدیق شامل کئے بغیر اس کو جوں کا توں شائع کر دیا تھا۔ میں نے کہا کہ ایک غلط بات کو تردید کے بغیر شائع کرنا بالواسطہ طور پر اس کی تصدیق کرنا ہے۔

پھر میں نے کہا کہ اس معاملہ میں شریعت کی واضح ہدایت موجود ہے، اور جس معاملہ میں شریعت کی ہدایت موجود ہو اس میں ذاتی منطق لگانا ایمان کے منافی (الاحزاب ۳۶) ہے۔ آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ اس طرح اذاعتِ خبر کو قرآن میں اتباعِ شیطان (النساء ۸۳) کہا گیا ہے۔ سورہ نساء کی اس آیت کے تحت حافظ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ:

اس میں ان لوگوں کے خلاف انکار ہے جو معاملات کی طرف بغیر اس کی تحقیق کئے ہوئے دوڑتے ہیں۔ وہ اس کو پھیلاتے ہیں اور اس کو نشر کرتے ہیں، حالاں کہ یہ ممکن ہے کہ وہ خبر خود صحیح نہ ہو۔ اور امام مسلم نے اپنی صحیح کے مقدمہ میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث نقل کی ہے کہ کسی آدمی کے جھوٹا ہو

کے لئے یہ کافی ہے کہ وہ ہرسنی ہوئی بات کو بیان کرنے لگے۔ اور حدیث میں آیا ہے کہ جو شخص ایک بات بیان کرے اور وہ جانتا ہو کہ یہ جھوٹی بات ہے تو ایسا شخص دو کاذبوں میں سے ایک ہے (تفسیر ابن کثیر، الجزء الاول، صفحہ ۵۲۹ - ۳۰)

حقیقت یہ ہے کہ اسلام کے نزدیک ایسی خبر کو بلا تحقیق پھیلانا شیطان کی پیروی کرنا ہے، اور اگر آدمی خبر کو جھوٹ جانتے ہوئے اسے پھیلائے تو وہ خود بھی اسی کذب بیانی کا مرتکب ہو رہا ہے جس کا ارتکاب اس شخص نے کیا تھا جس نے ابتداءً اس جھوٹ کو گھڑا تھا۔

۹ اپریل کو ایوارڈ اور انعامات کی تقسیم کی تقریب جن منچ (گاندھی پارک) میں ہوئی۔ وہاں ڈائس پر مجھ سے ملی ہوئی کرسی پر ایک صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے سادہ لباس اور سادہ انداز سے میں سمجھ نہ سکا کہ یہ "وی آئی پی" طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ تعارف کے بعد معلوم ہوا کہ وہ مسٹر چندرا ما ؤلی (K. Chandramouli) ہیں جو سہارن پور کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ہیں۔ وہ مدراس کے رہنے والے ہیں اور ان کی مادری زبان تمل ہے۔ مگر وہ نہایت صاف اردو بول رہے تھے۔ پوچھنے پر انھوں نے بتایا کہ وہ یوپی کیڈر سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور لمبے عرصہ تک اردو کے علاقوں میں رہے ہیں۔

جب میری تقریر شروع ہوئی تو وہ اپنی کرسی پر نظر نہ آئے۔ میں نے سمجھا کہ شاید وہ کسی ضرورت سے واپس چلے گئے ہیں۔ مگر بعد کو ایک صاحب نے بتایا کہ جب آپ کی تقریر کا وقت آیا تو وہ ڈائس سے اتر کر نیچے آئے اور سامنے کی کرسی پر بیٹھ گئے تاکہ تقریر کو اچھی طرح سن سکیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ میں ڈی ایم سے متصل کرسی پر تھا۔ انھوں نے تقریر کے بارہ میں نہایت اچھے تاثر کا اظہار کیا اور اس سے پورا اتفاق کیا۔ مسٹر چندرا ما ؤلی کو اسلامی مرکز کا انگریزی لٹریچر ڈاک سے روانہ کر دیا گیا ہے۔

مسٹر چندراما ؤلی اور دوسرے ہندو صاحبان سے بات کرنے کے بعد میں نے سوچا کہ یہ حضرات اگرچہ اردو رسم خط میں لکھی ہوئی عبارت کو پڑھ نہیں سکتے مگر اردو زبان کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو الرسالہ کا پیغام پہنچانے کے لئے دو شکلیں جاری کی جانی چاہئیں۔ ایک یہ کہ الرسالہ کے ہمدرد اس قسم کے لوگوں کو الرسالہ کے مضامین پڑھ کر سنائیں۔ دوسرا طریقہ کیسٹ کا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ مرکز سے کیسٹ فراہم کئے جائیں۔ ہمارے احباب بطور خود ایسا کر سکتے ہیں کہ وہ الرسالہ کے منتخب مضامین کو کیسٹ پر ریکارڈ کر لیں اور اس کے ذریعہ ان لوگوں تک الرسالہ کا پیغام پہنچائیں جو اردو کو پڑھ نہیں سکتے۔

مگر سنکر اس کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔ یہ سلسلہ اگر بڑے پیمانے پر شروع ہوجائے تو وہ انشاء اللہ ایک نئے انقلاب کے ہم معنی ہوگا۔

سہارن پور میں میری تقریر کا موضوع قومی ایکتا (National integration) تھا۔ میں نے اپنی تقریر میں ہالینڈ کا وہ واقعہ بیان کیا جو راستہ میں پروفیسر اگوانی نے بتایا تھا۔ میں نے کہا کہ قومی ایکتا قائم کرنے کا طریقہ یہی رواداری ہے جس کی ایک مثال مذکورہ واقعہ میں ملتی ہے۔ اسلام اس رواداری کو آخری حد تک قائم رکھنا چاہتا ہے۔ ہالینڈ کے پروٹسٹنٹ پروفیسر نے کھانے کی میز پر ایک کیتھولک کو اپنی دعائیہ رسم ادا کرنے کی اجازت دی۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اس معاملے میں یہاں تک گئے کہ آپ کے زمانہ میں نجران کے عیسائیوں کا وفد مدینہ آیا۔ روایات میں آتا ہے کہ اس دوران ان کی عبادت کا وقت آگیا تو آپ نے انھیں اجازت دے دی کہ وہ مسجد نبوی میں اپنی عبادت کریں۔ چنانچہ انھوں نے مسجد نبوی کے صحن میں اپنے عقیدہ کے مطابق عبادت کے مراسم ادا کئے (سیرۃ ابن کثیر، رابع، صفحہ ۱۰۸)

عام طور پر یہ بات کہی جاتی ہے کہ اس وقت ہندستان کا مسئلہ نمبر ایک نیشنل انٹگریشن ہے۔ اس سے مجھے اصولاً اتفاق ہے۔ مگر اس کے لئے جو تدبیر بتائی جاتی ہے اس کو میں اصل مقصد کے لئے بالکل بے نتیجہ سمجھتا ہوں۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ نیشنل انٹگریشن حاصل کرنے کے لئے ہمیں کلچرل انٹگریشن لانا ہوگا۔ یعنی مختلف فرقوں کی تہذیبی شناخت کو ختم کرکے ایک مشترک کلچر بنایا جائے اور سب کو اسی ایک کلچر کا پابند کیا جائے۔ میں نے اپنی تقریر میں مختلف مثالیں دے کر بتایا کہ تہذیبی شناخت کسی بھی درجہ میں ایکتا اور یکجہتی میں مانع نہیں ہے۔ کسی ملک میں یکجہتی اس طرح آتی ہے کہ لوگوں کے اندر روادارانہ سوچ پیدا کی جائے۔ تہذیبی فرق کو مٹا کر یکجہتی پیدا نہیں کی جاسکتی۔

اس معاملہ میں اصل اہمیت ذہن کی ہے نہ کہ ظاہری آداب و رسوم کی۔ اور وہ ذہن یہ ہے کہ لوگوں کے اندر احترام انسانیت کا مزاج پیدا کیا جائے۔ اس مقصد کے لئے ہمیں فرق کی شکل کو نہیں مٹانا بلکہ فرق کی سوچ کو مٹانا ہے۔ ظاہر والے فرق کو ختم کرنا نہیں ہے بلکہ دل والے فرق کو ختم کرنا ہے۔ ہمیں لوگوں کے اندر یہ سوچ ابھارنا ہے کہ وہ مذہب کے فرق کو اخلاق کا فرق نہ بنائیں۔ خلاصہ یہ کہ ایک کیتھولک کیتھولک رہتے ہوئے پروٹسٹنٹ کی عزت کرے، اور اسی طرح ایک پروٹسٹنٹ، پروٹسٹنٹ رہتے ہوئے کیتھولک کی عزت کرے۔ یہی ایکتا اور یکجہتی پیدا کرنے کا واحد طریقہ ہے۔ اس کے سوا اس مقصد

حاصل کرنے کا کوئی اور ممکن طریقہ نہیں۔

یہ تقریر مزید اضافہ کے ساتھ مرتب کر لی گئی ہے۔ انشاء اللہ اس کو الرسالہ میں شائع کر دیا جائے گا۔ زیر عنوان "بھارت کی تعمیر"

سہارن پور کے خطاب اور گفت گوؤں میں میں نے لوگوں کے سامنے یہی نقطۂ نظر پیش کیا۔ اجتماع میں ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی سبھی موجود تھے۔ میری معلومات کے مطابق، ہر ایک نے اس نقطۂ نظر کو پسند کیا۔ تقریر کے بعد ڈاکٹر تشہیر احمد صاحب میرے پاس آئے۔ انھوں نے کہا کہ کئی ہندوؤں نے مجھ کو یہ کہلا کر بھیجا ہے کہ میں آپ کو مبارک باد دوں اور یہ پیغام پہنچاؤں کہ آپ کی بات انھیں خوب سمجھ میں آئی۔ وہ اس سے پوری طرح اتفاق کرتے ہیں کہ ایکتا پیدا کرنے کے لئے ذہن کو بدلنے کی ضرورت ہے نہ کہ کلچرل پہچانوں کو مٹانے کی۔ مجھ سے براہ راست بھی کئی غیر مسلم صاحبان نے اسی قسم کے تاثرات کا اظہار کیا۔

بعض فرقہ پرست ہندو لیڈر یہ کہتے ہیں کہ قومی ایکتا پیدا کرنے کا راز بھارتیہ کرن (انڈینائزیشن) ہے۔ یعنی تمام لوگوں کا زبان اور مذہبی شعار ایک ہو جائے، آپس میں شادی بیاہ ہوں، وغیرہ وغیرہ۔ اس پر مسلم قائدین سخت ردعمل کا اظہار کرتے ہیں اور "اسلام خطرہ میں" کی گھنٹی بجا کر زور وشور کے ساتھ تحفظ شریعت کی مہم چلانے لگتے ہیں۔ یہ طریقہ غیر مفید بھی ہے اور اصل مسئلہ کو شدید تر کرنے والا بھی۔ میرے نزدیک صحیح طریقہ یہ ہے کہ ہم یہ کہیں کہ قومی ایکتا بجائے خود ایک ضروری چیز ہے۔ مگر اس کو حاصل کرنے کا طریقہ کلچرل شناختوں کو مٹانا نہیں بلکہ عدم رواداری کے ذہن کو مٹانا ہے۔ مسلم قائدین کے مذکورہ طریقہ میں آدمی صرف منفی ردعمل پیش کرنے والے کے روپ میں سامنے آتا ہے اور دوسری صورت میں وہ رہنمائی دینے والا بن جاتا ہے۔ پہلی صورت میں آدمی صرف دفاعی پوزیشن میں رہتا ہے، مگر دوسرا طریقہ اختیار کرنے کے بعد وہ اقدامی پوزیشن میں آ جاتا ہے۔ اور دفاعی پوزیشن کے مقابلہ میں اقدامی پوزیشن بلاشبہہ زیادہ طاقت ور ہے۔

موجودہ زمانہ کے نام نہاد مسلم لیڈروں نے تقریباً ہر معاملہ میں ایسا ہی کیا ہے۔ انھوں نے خدا کے دین کو عملاً تحفظ کا دین بنا دیا جب کہ باعتبار حقیقت وہ اقدام کا دین تھا۔

واپسی کا سفر شاملی کے راستہ سے ہوا۔ شاملی ایک تاریخی قصبہ ہے جو سہارن پور اور دہلی کے تقریباً وسط میں واقع ہے۔ ۱۸۵۷ کے ہنگامہ میں علماء کی ایک جماعت نے شاملی میں انگریزی فوج پر حملہ کیا تھا۔

جس میں انھیں یک طرفہ طور پر شکست ہوئی۔

شاملی کے اس "جہاد" کی تفصیلات مولانا مناظر احسن گیلانی نے اپنی کتاب سوانح قاسمی (مطبوعہ ۱۳۷۳ھ) میں درج کی ہیں۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ شاملی میں انگریزوں کی ایک گڑھی (چھوٹا قلعہ) تھا۔ تھانہ بھون کے علما اور ان کے شاگردوں نے یہ منصوبہ بنایا کہ وہ تھانہ بھون اور شاملی سے جہاد کرتے ہوئے دہلی کی طرف بڑھیں۔ اور پھر دہلی کو انگریزی اقتدار سے آزاد کرائیں۔" یہ اقدام درحقیقت پایہ تخت دلی تک پہنچنے کے لئے کیا گیا تھا۔" مولانا طیب کے الفاظ میں " سرفروشان دین اپنے سروں کو ہتھیلیوں پر لے کر ایک منظم طاقت سے ٹکرانے کے لئے اپنے گھروں سے نکل کھڑے ہوئے اور تھانہ بھون سے شاملی کی طرف مارچ شروع کیا جس کا نصب العین دہلی تھا۔" اس فوج میں مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا حافظ محمد ضامن، مولانا محمد منیر نانوتوی وغیرہ شریک تھے۔

یہ جتھا تحصیل شاملی پر چڑھ دوڑا۔ شاملی کے میدان میں ان کا مقابلہ انگریزی فوج سے ہوا۔ شاملی کی یہ گڑھی جس میں انگریزی فوج کے سپاہی تھے ایک ایسے کھلے میدان میں واقع تھی جس کے چاروں طرف کوئی ایسی جگہ نہ تھی جسے گڑھی کے باہر والے آڑ بنا سکتے ہوں۔ مجاہدین کا گروہ جو گڑھی کے باہر والے میدان میں ٹڈیوں کی طرح پھیلا ہوا تھا ان پر انگریزی فوج نے بندوقوں سے مسلسل فائرنگ شروع کر دی۔ خود انگریزی فوج دیوار کے پیچھے محفوظ تھی۔ مگر مجاہدوں کے لئے کوئی جائے پناہ نہ تھی جہاں وہ اپنے آپ کو گولی سے بچا سکیں۔ انگریزی فوج تحصیل شاملی میں قلعہ بند ہو گئی اور ادھر سے مجاہدوں پر بندوقوں کی باڑھ مارنا شروع کیا جس سے سیکڑوں مجاہدین ہلاک ہو گئے۔ انگریزی فوج اپنے قلعہ میں محفوظ تھی اور مجاہدین ان کے سامنے کھلے میدان میں تھے۔ انگریزوں کا حملہ پوری طرح کارگر اور کامیاب تھا جب کہ مجاہدین کے حملے غیر مؤثر ہو کر رہ جاتے تھے۔ اس یک طرفہ مار کی وجہ سے مجاہدین کا بے پناہ جانی و مالی نقصان ہوا۔

مجاہدین کا ایک دستہ تحصیل شاملی پر حملہ کرنے کے لئے تھانہ بھون سے روانہ کیا گیا تھا۔ اس دستہ کے امیر الجیش مولانا حافظ محمد ضامن صاحب تھے۔ جب یہ لوگ گڑھی کے قریب پہنچے تو انگریزی فوج کے ایک سپاہی نے فصیل سے نشانہ لے کر ان پر گولی چلائی اور بقول مولانا طیب "گولی ناف پر پڑی" جس کے نتیجے میں وہ ہلاک ہو گئے۔ اس خبر یعنی حافظ ضامن صاحب کی شہادت کی خبر نے مجاہدوں کی کمر توڑ دی اور وہ امید جو مجاہدوں کی مشعل راہ تھی ٹوٹ گئی جس سے قلوب میں سرد مہری کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ ا

حافظ ضامن صاحب کی شہادت ہوئی اور ادھر دہلی سے خبر آئی کہ بادشاہ دہلی (ظفر شاہ) گرفتار ہو گئے اور دلی پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا (جلد دوم، صفحہ ۱۷۰ - ۱۲۵)

موجودہ زمانہ کے مسلم قائدین جہاد کے نام پر جو اقدامات کر رہے ہیں، اگر یہی وہ چیز ہو جس کو شریعت میں اسلامی جہاد کہا گیا ہے تو زبان وادب کے ماہرین کو ایک نیا لغت تیار کرنا ہوگا جس میں مقدس اسلامی جہاد اور نادانی کی چھلانگ دونوں کو ہم معنی الفاظ کے طور پر درج کیا گیا ہو۔

۱۰ اپریل ۱۹۸۸ کی صبح کو ۷ بجے ہم لوگ سہارن پور سے واپس روانہ ہوئے اور تین گھنٹہ کا سفر بذریعہ روڈ طے کرکے دوبارہ دہلی واپس آ گئے۔

ISLAMIC LITERATURE
In The Contemporary Idiom

By Maulana Wahiduddin Khan

God Arises
Pages 265 Price Rs 45

Muhammad
The Prophet of Revolution
Pages 220 Price Rs 50

Muhammad
The Ideal Character
Pages 20 Price Rs 4

Man! Know Thyself
Pages 20 Price Rs 4

Religion and Science
Pages 96 Price Rs 25

The Way to Find God
Pages 24 Price Rs 4

The Teachings of Islam
Pages 24 Price Rs 5

The Good Life
Pages 40 Price Rs 5

The Garden of Paradise
Pages 44 Price Rs 5

The Fire of Hell
Pages 44 Price Rs 5

Tabligh Movement
Pages 68 Rs 20

Forthcoming Publications:

Women In Islam

Islam As It Is

Islam: The Voice of Human Nature

God-oriented Life

An Introduction to Islam

ایک حدیث

عن ابی ھریرۃ، قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُمرتُ بقریۃٍ تاکلُ القُری، یقولون یثربُ وھی المدینۃُ۔ (اخرجہ البخاری ومسلم والموطا)

حضرت ابوہریرہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ مجھے ایک بستی کا حکم دیا گیا ہے، وہ بستیوں کو کھا جائے گی۔ لوگ اس کو یثرب کہتے ہیں اور وہ مدینہ ہے۔

اس حدیث کو سمجھنے کے لیے ایک اصولی بات کو سامنے رکھنا بہت ضروری ہے۔ وہ یہ کہ بہت سی باتیں ایسی ہیں جو اگرچہ ایک متعین صورت میں بیان کی جاتی ہیں۔ مگر اصلاً وہ باعتبار حقیقت مطلوب ہوتی ہیں نہ کہ باعتبار صورت۔ اس کی ایک مثال بنو قریظہ کے واقعہ میں ملتی ہے۔

غزوۂ احزاب کے بعد جب آپ نے یہودی قبیلہ بنو قریظہ کی طرف جانے کا ارادہ کیا تو آپ نے اس کا اعلان کرتے ہوئے فرمایا کہ تم میں سے کوئی شخص عصر کی نماز بنو قریظہ تک پہونچنے سے پہلے ہرگز نہ پڑھے۔ (لایُصَلّیَنَّ احدٌ العصر الا فی بنی قریظۃ) لوگ مدینہ سے نکل کر روانہ ہوئے۔ مگر جب دیر ہونے لگی تو کچھ لوگوں نے راستہ ہی میں عصر کی نماز پڑھ لی، اور کچھ لوگوں نے حکم کی لفظی تعمیل کرتے ہوئے بنو قریظہ کی بستی میں پہنچ کر نماز ادا کی۔

جن لوگوں نے راستہ میں نماز پڑھ لی۔ انھوں نے بظاہر حکم رسول کے خلاف کیا۔ مگر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان سے باز پرس نہیں کی، بلکہ دونوں کے عمل کی تصویب فرمائی۔ اس کی توجیہ کرتے ہوئے محقق علماء نے لکھا ہے کہ جن لوگوں نے وقت آنے پر راستہ میں نماز پڑھ لی وہ غلط پر نہ تھے۔ کیوں کہ انھوں نے سمجھا کہ آپ کی اصل مراد بنو قریظہ کی طرف جانے میں جلدی کرنا ہے نہ کہ نماز میں دیر کرنا (لانھم فھموا انّ المراد انما ھو تعجیل السیر الی بنی قریظۃ لا تاخیر الصلوٰۃ، السیرۃ النبویہ لابن کثیر، المجلد الثالث، صفحہ ۲۲۷)

اسلامی طریقہ یہ ہے کہ مقصد کے حصول کی ایک تدبیر اگر کارگر نہ ہو رہی ہو تو اس کو بدل کر دوسری تدبیر کے ذریعہ مقصد تک پہنچنے کی کوشش کی جائے۔ اس اصول کے تحت کبھی مقام عمل کو بدلا جاتا ہے، جیسے مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت۔ اور کبھی میدان عمل کو بدلا جاتا ہے، جیسے حدیبیہ کے معاہدہ کے ذریعہ جنگ کے میدان سے ہٹ کر دعوت کے میدان میں سرگرم

۱۔ الرسالہ اور اسلامی مرکز کے حلقہ کی جانب سے بار بار یہ تقاضا سامنے آرہا ہے کہ اسلامی مرکز کا کل ہند اجتماع کیا جانا چاہیے۔ اس سلسلہ میں اطلاع دی جاتی ہے کہ انشاء اللہ ۱۹۸۸ کے آخر میں اسلامی مرکز کا کل ہند اجتماع ہوگا۔ مقام اور تاریخ کا قطعی اعلان بعد کو کیا جائے گا۔

۲۔ نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا کے تحت لندن میں کتابوں کی بین اقوامی نمائش (International Book Fair) ہوئی۔ یہ نمائش ۲۸ — ۳۰ مارچ ۱۹۸۸ کو تھی۔ اس نمائش میں ہندستان کی منتخب مطبوعات رکھی گئی تھیں۔ ان منتخب کتابوں میں اسلامی مرکز کی کتاب مذہب اور جدید چیلنج بھی شامل تھی۔ اس کا ذکر نیشنل بک ٹرسٹ کی رپورٹ میں صفحہ ۵۴ پر کیا گیا ہے —— اس نمائش میں ہندی، بنگالی، انگریزی، پنجابی، اردو کتابیں رکھی گئی تھیں۔

۳۔ سہارن پور میں ۹ اپریل ۱۹۸۸ کو ایک مشترکہ جلسہ ہوا جس میں صدر اسلامی مرکز نے خطاب کیا۔ خطاب کا موضوع تھا: "قومی ایکتا اور انسانی ترقی میں مذہب کا رول" اس موقع پر صدر اسلامی مرکز کو ایک خصوصی ایوارڈ پیش کیا گیا۔ اس پروگرام کی تفصیل انشاء اللہ سفرنامہ میں شائع کر دی جائے گی۔

۴۔ غالب اکیڈمی (نئی دہلی) میں ۷ اپریل ۱۹۸۸ کی شام کو ایک عمومی اجتماع ہوا۔ پروفیسر ایم۔ ایس اگوانی (وائس چانسلر جواہر لال نہرو یونیورسٹی) نے صدارت کے فرائض انجام دیئے۔ صدر اسلامی مرکز نے اس موقع پر ایک مفصل تقریر کی جس کا عنوان یہ تھا: اسلام دور جدید کا خالق۔ تعلیم یافتہ اصحاب کا بڑا طبقہ شریک ہوا۔ شرکاء اجتماع میں جناب حکیم عبد الحمید صاحب، جناب بدر الدین طیب جی اور دوسرے معزز حضرات شامل تھے۔ مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلم حضرات بھی شریک ہوئے۔ لوگوں نے تقریر کو پسند کیا اور کہا کہ اس قسم کی تقریر کا سلسلہ ہر مہینہ جاری رہنا چاہیے۔ تجویز ہے کہ ہر "سکنڈ سنڈے" کو بعد نماز مغرب یہ سلسلۂ تقریر شروع کیا جائے۔

۵۔ اسلامی مرکز کا ایک مستقل شعبہ کتابوں کی اشاعت ہے۔ "عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر"

کے لیے اب اسلامی مرکز ایک معروف نام بن چکا ہے۔ اس کے تحت چھپنے والی تازہ کتابیں حسب ذیل ہیں: مذہب اور سائنس نامی کتاب کا انگریزی ترجمہ، خاتونِ اسلام، نیا ایڈیشن سو صفحات کے اضافہ کے ساتھ، میوات کا سفر نامہ، بھارت کی تعمیر۔

۶۔ تذکیر القرآن پورے قرآن کی تفسیر دو جلدوں میں ہے۔ اس کی اشاعت کے بعد ہم کو ایسے خطوط مل رہے ہیں جن میں تذکیر القرآن کے مطالعہ کے شدید شوق کا اظہار ہوتا ہے۔ اسی کے ساتھ وہ لوگ لکھتے ہیں کہ ہم اپنی ناداری کی وجہ سے تذکیر القرآن کو قیمت دے کر خرید نہیں سکتے۔ صاحب استطاعت حضرات سے ہماری اپیل ہے کہ وہ ایسے لوگوں کی طرف سے قیمت ادا کر کے انھیں تذکیر القرآن فراہم کرنے میں تعاون فرمائیں۔ تعاون کرنے والے اگر چاہیں گے تو انھیں مرسل الیہ کا نام و پتہ روانہ کر دیا جائے گا۔

۷۔ عرصہ سے یہ تقاضا کیا جاتا رہا ہے کہ الرسالہ کا ہندی ایڈیشن نکالا جائے۔ اب ایک عملی تجویز یہ سامنے آئی ہے کہ ہندی ترجمہ نہ کیا جائے بلکہ موجودہ الرسالہ ہی کو ہندی رسمِ خط (لیپی) میں منتقل کر کے ہر ماہ اسے شائع کیا جائے۔ یعنی زبان اُردو الرسالہ ہی کی ہو۔ صرف رسمِ خط بدل دیا جائے۔ اس سلسلہ میں الرسالہ مشن کے ہمدرد حضرات اپنی رائے دیں۔ نیز یہ بھی لکھیں کہ مذکورہ صورت میں وہ بطور ایجنسی ہر ماہ کتنی تعداد منگانے کی ذمہ داری لے سکیں گے۔

۸۔ جموں و کشمیر کا ایک ادارہ (مسلم انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن) جس کے تحت کئی اسکول چل رہے ہیں۔ اس نے اپنے پرائیویٹ اسکولوں کے نصاب میں اسلامی مرکز کی کچھ کتابیں داخل نصاب کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس میں باغ جنت، نارِ جہنم، حیاتِ طیبہ اور تذکیر القرآن کا تیسواں پارہ شامل ہے۔

۹۔ مشاہدات اور رپورٹوں سے معلوم ہوتا ہے کہ الرسالہ کی بات تیزی سے پھیلتی جا رہی ہے گفتگو کرنے والے اپنی گفتگو میں اور تقریر کرنے والے اپنی تقریر میں اس کو دہرانے لگے ہیں۔ بہت سے اخبار اور رسالے الرسالہ کی باتوں کو برابر نقل کر رہے ہیں، ان میں کچھ ہیں جو نام اور حوالہ کے ساتھ نقل کرتے ہیں۔ مگر زیادہ تر وہ ہیں جو نام اور حوالہ کے بغیر

کو اپنی بات کے طور پر شائع کرتے ہیں۔ ان پھیلانے والوں میں ہمارے مخالفین بھی شامل ہیں۔ الرسالہ کا پیغام الرسالہ کے ذریعہ جتنا پھیل رہا ہے، اس سے زیادہ دوسرے لوگ اس کو پھیلا رہے ہیں۔ کچھ احباب اگر براہ راست طور پر الرسالہ کی ایجنسی چلاتے ہیں تو دوسرے بہت سے وہ لوگ ہیں جو بالواسطہ طور پر الرسالہ کی ایجنسی کا کام کر رہے ہیں۔

۱۰- ایک صاحب اپنے خط مورخہ (۱۲ مارچ ۱۹۸۸) میں لکھتے ہیں: دو تین سال سے الرسالہ کا قاری ہوں۔ میں نے جب اسے پہلی بار پڑھا تو دیوانہ وار کئی بار پڑھا اور اسی وقت ٹھان لیا کہ میں الرسالہ کو اپنی زندگی میں شامل کروں گا۔ اس میں ایسی باتیں پڑھنے کو ملتی ہیں کہ اگر کم ہمتی اور بے دلی اور مایوسی کے بادل چھائے ہوئے ہوں تو عجب نہیں کہ صاحب مطالعہ تجدید زندگی کرے۔ جس کی کشتی بھنور میں ہو اس کے لیے الرسالہ ناخدا سے کم نہیں۔ نوجوانوں کے لیے اس کا مطالعہ مشعل راہ ہے۔ آدمی اس کو دوبارہ پڑھے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اور ہر مرتبہ اس کا اثر دوبالا ہو جاتا ہے۔ (محمد عبدالمجید، بھینسا)

۱۱- ایک صاحب لکھتے ہیں: الرسالہ ہر دین سے لگاؤ رکھنے والے کی ربانی اور روحانی ضرورت بن گیا ہے۔ اس کا ہر صفحہ قرآن و حدیث سے اخذ شدہ ہوتا ہے۔ آپ پر جو تنقید کبھی کبھی نظر سے گزرتی ہے وہ صرف تنقید برائے نفسانیت ہوتی ہے یا حقیقت سے انکار کی احمقانہ جرأت۔ میں آپ کے پیغمبرانہ مشن پر اپنے آپ کو لگانے پر رضامند ہوں۔ کچھ حضرات کے نام الرسالہ جاری کروانے کا ارادہ ہے۔ یہاں امام صاحب الرسالہ سے پوری طرح متفق ہیں۔ ہر جمعہ کو تقریر کرتے ہیں۔ الرسالہ سے ان کی تقریروں میں ایک نیا رنگ پیدا ہو گیا ہے جو پہلے نہ تھا (مشتاق احمد، شیو گنج)

۱۲- الرسالہ خدا کے فضل سے بے شمار لوگوں کے لیے نئی زندگی کا باعث بن رہا ہے۔ اس کا اندازہ باربار مختلف شکلوں میں ہوتا ہے۔ ۱۶ مئی ۱۹۸۸ کو ایک صاحب نے ٹیلی فون پر بتایا کہ بعض اسباب کے نتیجہ میں میں سخت مایوسی کا شکار تھا۔ عین اس وقت الرسالہ اپریل ۱۹۸۸ ملا۔ اس کے صفحہ ۲ پر "چیلنج نہ کہ ظلم" کو پڑھا تو آنکھ کھل گئی اور اچانک میں نے محسوس کیا کہ میرے اندر نئی طاقت آگئی ہے۔

خاتونِ اسلام

اسلامی شریعت میں عورت کا مقام
اسلام اور جدید تہذیب کا تقابل

از: مولانا وحید الدین خاں

عورت کا درجہ اسلام میں وہی ہے جو مرد کا درجہ ہے۔ عزت اور احترام کے جو احکام ایک صنف کے لئے ہیں وہی احکام دوسری صنف کے لئے بھی ہیں۔ دنیا کے حقوق اور آخرت کے انعامات میں دونوں کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ البتہ اسلام کے نزدیک مرد مرد ہے اور عورت عورت۔ زندگی کا نظام چلانے میں دونوں برابر کے شریک ہیں، تاہم فطری فرق کا لحاظ کرتے ہوئے اسلام نے دونوں کے درمیان تقسیمِ کار کا اصول رکھا ہے نہ کہ یکسانیتِ کار کا اصول۔

(صفحات ۲۹۲، قیمت ۳۵ روپیہ)

مکتبہ الرسالہ

سی۔۲۹، نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی۔ ۱۳ فون: 697333, 611128

تذکیر القرآن

جلد اوّل : سورۃ فاتحہ۔ سورۃ بنی اسرائیل

جلد دوم : سورۃ الکہف۔ سورۃ الناس

قرآن کی بے شمار تفسیریں ہر زبان میں لکھی گئی ہیں۔ مگر تذکیر القرآن اپنی نوعیت کی پہلی تفسیر ہے۔ تذکیر القرآن میں قرآن کے اساسی مضمون اور اس کے بنیادی مقصد کو مرکز توجہ بنایا گیا ہے۔ جزئی مسائل اور معلوماتی تفصیلات کو چھوڑتے ہوئے اس میں قرآن کے اصل پیغام کو کھولا گیا ہے اور عصری اسلوب میں اس کے دعوتی اور تذکیری پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے۔ تذکیر القرآن عوام و خواص دونوں کے لیے یکساں طور پر مفید ہے۔ وہ طالبینِ قرآن کے لیے فہم قرآن کی کنجی ہے۔

ہدیہ جلد اول ۱۰۰ روپیہ

جلد دوم ۱۰۰ روپیہ

مکتبہ الرسالہ، نئی دہلی

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

	Rs
تذکیر القرآن جلد اول	100/-
" " جلد دوم	100/-
اللہ اکبر	40/-
پیغمبر انقلاب	30/-
مذہب اور جدید چیلنج	35/-
عظمت قرآن	25/-
الاسلام	25/-
ظہور اسلام	25/-
اسلامی زندگی	20/-
احیاء اسلام	20/-
راز حیات (مجلد)	45/-
صراط مستقیم	25/-
خاتون اسلام	35/-
سوشلزم اور اسلام	25/-
اسلام اور عصر حاضر	20/-
حقیقت حج	25/-
اسلامی تعلیمات	20/-
تبلیغی تحریک	15/-
تعبیر کی غلطی	35/-
دین کی سیاسی تعبیر	10/-

دین کیا ہے	3/-
قرآن کا مطلوب انسان	[illegible]
تجدید دین	[illegible]
اسلام دین فطرت	4/-
تعمیر ملت	4/-
تاریخ کا سبق	4/-
مذہب اور سائنس	8/-
عقلیات اسلام	4/-
فسادات کا مسئلہ	3/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	3/-
تعارف اسلام	4/-
اسلام پندرھویں صدی میں	4/-
راہیں بند نہیں	4/-
ایمانی طاقت	4/-
اتحاد ملت	4/-
سبق آموز واقعات	4/-
زلزلۂ قیامت	6/-
حقیقت کی تلاش	4/-
پیغمبر اسلام	4/-
آخری سفر	4/-

اسلامی دعوت	4/-
خدا اور انسان	4/-
حل یہاں ہے	6/-
سچا راستہ	2/-
دینی تعلیم	4/-
حیات طیبہ	4/-
باغ جنت	4/-
نار جہنم	4/-
میوات کا سفر	25/-

God Arises	Rs. 45/-
Muhammad The Prophet of Revolution	50/-
Religion and Science	25/-
Tabligh Movement	20/-
The Way to Find God	4/-
The Teachings of Islam	5/-
The Good Life	5/-
The Garden of Paradise	5/-
The Fire of Hell	5/-
Muhammad The Ideal Character	4/-
Man Know Thyself!	4/-
इस्लाम अपने आपको पहचान	2/-
सच्चाई की तलाश	4/-

مکتبہ الرسالہ

DR. ... NAGAR ...

الرسالہ

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

ISSN 0970-180X

برائی کرنا برا ہے۔ مگر برائی کرنے والے سے
نفرت کرنا اس سے بھی زیادہ برا ہے

اگست ۱۹۸۸ شمارہ ۱۴۱

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اردو، انگریزی میں شائع ہونے والا

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

شمارہ ۱۴۱ اگست ۱۹۸۸

فہرست

ماہنامہ الرسالہ ، سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳ ، فون : 697333, 611128

عظیم امکان

امریکی میگزین ٹائم (۴ جولائی ۱۹۸۸) کی کور اسٹوری کا موضوع جاپان کی اقتصادی ترقی ہے۔ اس کا عنوان ہے عظیم جاپان Super Japan چار صفحہ کے اس مضمون میں بتایا گیا ہے کہ اقتصادی ترقی کے اعتبار سے اب جاپان کی صدی شروع ہورہی ہے اور امریکہ کی صدی اب خاتمہ کو پہونچ گئی ہے:

The American century is over (p.4).

مضمون میں مختلف قسم کی تفصیلات دیتے ہوئے کہا گیا ہے کہ بیسویں صدی کے آخر کا سب سے اہم واقعہ جاپان کا سب سے بڑی طاقت (Major superpower) کی حیثیت سے ابھرنا ہے۔ ۱۹۸۸ میں جاپان نے ۱۰ بلین ڈالر بیرونی قرضہ دیا ہے، جب کہ اس کے مقابلہ میں امریکہ کے بیرونی قرضہ کی مقدار ۹ بلین ڈالر ہے۔ آئندہ جاپان ۵۰ بلین ڈالر بیرونی قرضہ دینے کا منصوبہ بنارہا ہے۔ اس طرح وہ دنیا کا سب سے بڑا معطی ملک بن جائے گا۔

ورلڈ بینک کا صدر ہمیشہ صرف امریکی ہوا کرتا تھا۔ مگر اب جب کہ ورلڈ بینک میں سب سے زیادہ سرمایہ جاپان کا ہے، یہ ناگزیر ہوگیا ہے کہ ورلڈ بینک کا صدر جاپانی ہو۔ پچھلے ۴۰ سال سے امریکہ واحد سب سے بڑی اقتصادی طاقت (Economic superpower) کی حیثیت رکھتا تھا۔ اب یہ حیثیت تیزی سے جاپان کو ملتی جارہی ہے۔ جاپان اقوامِ متحدہ کے بجٹ کا گیارہ فی صد حصہ ادا کررہا ہے جو امریکہ کے بعد نمبر ۲ پر ہے۔ چنانچہ امریکہ اب اس کی حمایت کررہا ہے کہ جاپان سیکورٹی کونسل کا چھٹا مستقل ممبر بنا دیا جائے۔

تاہم ان ساری ترقیوں کے باوجود جاپان ایک سنگین مسئلہ سے دوچار ہے۔ اس کے سامنے کوئی واضح مقصد (Clear goal) نہیں۔ جاپان کے پاس ڈیموکریسی یا کمیونزم جیسا کوئی قابل برآمد نظریہ (Exportable ideology) نہیں۔ جاپان کی وزارت خارجہ کے ایک سابق افسر ہڈیاکی کاسے (Hideaki Kase) نے کہا کہ ہمارے پاس کچھ آدرش ہونا چاہیے جس میں عالم انسانی کے لیے اپیل ہو:

There must be some ideal that we have that
would appeal to mankind (p.5).

مسلمانوں کے نزدیک اب تک "جاپان" کا تصور صرف یہ ہے کہ وہ جاپان کا الکٹرانک سامان اور جاپان کی نئی ماڈل کی کار خریدیں اور اس پر فخر کریں۔ حالاں کہ جاپان میں ان کے لیے اس سے کہیں زیادہ بڑا امکان چھپا ہوا ہے۔ اب تک وہ جاپان سے صرف "لینے والے" بنے ہوئے تھے، مگر نئے حالات بتاتے ہیں کہ وہ جاپان کے لیے "دینے والے" بن سکتے ہیں۔

مسلمانوں کے پاس اسلام ہے۔ جو محفوظ دین ہے۔ اس کی تاریخ نے اس کو ایک مسلمہ حقیقت کی حیثیت دیدی ہے۔ جس خدانے انسان کو بنایا ہے، اسی خدانے اس دین کو بھی وضع کیا ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ تمام انسانی تقاضوں کے عین مطابق ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام عین وہی چیز ہے جس کو جاپان اور دوسری قومیں تلاش کر رہی ہیں ـــــ صحیح ترین آئیڈیل جو کسی انسان کو حقیقی تسکین دے، اور جس کے اوپر کوئی قوم حقیقی طور پر کھڑی ہو سکے۔

آج مسلمانوں کے کرنے کا سب سے بڑا کام یہی ہے کہ وہ اسلام کی ربانی دعوت کو لے کر اٹھیں اور اس کو جاپانیوں اور دوسری قوموں کے سامنے پیش کریں۔ موجودہ زمانہ میں اگر کوئی افرض الفرائض ہے تو بلاشبہ وہ یہی دعوت ہے۔ مسلمان اگر اس کے لیے اٹھیں تو وہ اپنے لیے ایک عظیم کام پالیں گے۔ دوسروں تک ایک عظیم خدائی تحفہ پہونچانے کا سبب بنیں گے۔

آج کی دنیا میں دعوتِ اسلامی کے جو عظیم امکانات پیدا ہوئے ہیں، ان کو جاننا اور انھیں استعمال کرنا بلاشبہ مسلمانوں کے لیے سب سے بڑا فریضہ ہے۔ اگر مسلمان ان مواقع کو استعمال کریں تو وہ دنیا و آخرت میں سب سے بڑی سرخروئی حاصل کریں گے۔ اور اگر وہ ان مواقع کو استعمال نہ کریں تو بلاشبہ یہ سب سے بڑا جرم ہے۔ اس کے بعد شدید اندیشہ ہے کہ وہ غضب الٰہی کے مستحق ہو جائیں، اور پھر کوئی بھی چیز نہ ہو جو انھیں اللہ کی پکڑ سے بچا سکے۔

جوابی غلطی نہیں

جمعہ کی نماز سے پہلے جو خطبہ دیا جاتا ہے، اس کا مقصد تذکیر و نصیحت ہے۔ اسی لیے حکم ہے کہ خطبہ کے وقت خاموش رہو اور اس کو غور سے سنو۔ اس سلسلہ میں شریعت میں جو احکام دیئے گیے ہیں، ان میں سے ایک حکم وہ ہے جو ابو ہریرہؓ کی اس روایت سے معلوم ہوتا ہے جو بخاری و مسلم میں نقل ہوئی ہے:

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ اذا قلتَ لصاحبک یوم الجمعۃ انصِت والامام یخطبُ فقد لغوتَ (متفق علیہ)	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر تم اپنے ساتھی سے جمعہ کے دن کہو کہ چپ رہو، جب کہ امام خطبہ دے رہا ہو تو تم نے لغو کام کیا۔

بظاہر اصل غلطی کرنے والا وہ ہے جو خطبہ کے وقت ابتداءً بولے۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لغو فعل کا مرتکب اس کو قرار دیا جس نے دوسری بار بول کر اس کو چپ کرانے کی کوشش کی۔ کیوں کہ اصل مطلوب تو خاموشی تھی، اور جب دوسرا شخص چپ کرانے کے لیے بول پڑا تو اس نے ایک غلطی کو دو غلطی کر دیا۔ ایسی حالت میں اس کو اشارہ سے چپ کرانا چاہیے نہ کہ بول کر۔

اس حدیث سے اجتماعی زندگی کا ایک اصول معلوم ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ اجتماعی زندگی میں وہ شخص زیادہ بڑا غلط کار ہے جو ایک غلطی کے بعد دوسری غلطی کرے۔ اگر ایک شخص کوئی قابل اعتراض کارروائی کرتا ہے تو دوسروں کو چاہیے کہ اس سے اعراض کریں یا حکمت کے ساتھ اس کو دفع کرنے کی کوشش کریں۔ دوسرے لوگ اگر ایسا کریں تو غلطی پہلے ہی مرحلہ میں دب کر ختم ہو جائے گی۔ لیکن اگر دوسرے لوگ بے صبری میں آکر اس کے خلاف جوابی کارروائی کرنے لگیں تو غلطی کا دائرہ بڑھے گا۔ وہ انفرادی نقصان سے آگے بڑھ کر اجتماعی نقصان تک پہونچ جائے گا۔

جو شخص "جوابی غلطی" کرے وہ زیادہ بڑا غلط کار ہے۔ کیوں کہ جہاں اس کو حکمت اور اعراض سے کام لینا چاہیے تھا، وہاں اس نے بدتدبیری اور بے صبری کا مظاہرہ کیا، اور اس طرح غلطی کو کئی گنا زیادہ بڑھا دیا۔ پہلا طریقہ غلطی کو دیکھ کر اس پر مشتعل ہونے کی مثال ہے، دوسرا طریقہ غلطی کو دیکھ کر اس کی اصلاح کرنے کی مثال۔

دعوتی عمل

کسی اجتماعی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے منظم عمل لازمی طور پر ضروری ہے۔ جب بھی ایک شخص کوئی اجتماعی نشانہ تجویز کرتا ہے تو اپنے مزاج کے مطابق، اپنی مطلوبہ منزل تک پہونچنے کے لیے وہ ایک عمل بھی ضرور مقرر کرتا ہے۔ اس عمل کی مختلف صورتیں ہیں۔

عمل کی ایک صورت وہ ہے جس کو متشددانہ عمل (Violent activism) کہا جاتا ہے۔ ماضی اور حال کی تاریخ میں اس کی بے شمار مثالیں ہیں۔ اس کی ایک تازہ اور قریبی مثال آزاد سکھ ریاست (خالصتان) کے حامیوں کی ہے۔ ۸۸-۱۹۸۷ میں انھوں نے پنجاب میں اسی کے مطابق عمل کیا، اگرچہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔

عمل کی دوسری صورت وہ ہے جس کو غیر متشددانہ عمل (Non-violent activism) کہا جاتا ہے۔ اس میں ہتھیار استعمال کیے بغیر عوامی مظاہرہ اور عوامی ایجی ٹیشن کے ذریعہ فریق ثانی پر دباؤ ڈالا جاتا ہے تاکہ وہ فریق اول کے مطالبات کو مان لے۔ مہاتما گاندھی نے ۱۹۴۷ سے پہلے انگریزوں کے خلاف اسی طریقہ کو استعمال کیا، اور کامیابی حاصل کی۔

عمل کی تیسری صورت وہ ہے جس کو سیاسی عمل (Political activism) کہا جا سکتا ہے۔ اس کی ایک واضح مثال الکشنی سیاست ہے۔ الکشن کے موقع پر مخالف پارٹیاں اسی طریقہ کو استعمال کر کے حکمراں پارٹی کو گراتی ہیں۔ اور حکومت کے ایوان پر قبضہ حاصل کرتی ہیں۔

عمل کے ان طریقوں میں سے کوئی بھی طریقہ اسلام کے مزاج کے مطابق نہیں۔ اسلام کا طریق عمل جو قرآن و سنت سے معلوم ہوتا ہے وہ دعوت ہے۔ آج کل کی زبان میں اس کو دعوتی عمل (Dawah activism) کہا جا سکتا ہے۔ اس طریقہ میں سارا انحصار سنجیدہ ذرائع پر کیا جاتا ہے — منوانے کے بجائے متاثر کرنا۔ ہرانے کے بجائے دل جیتنا۔ حریف اور رقیب بننے کے بجائے ہمدرد اور ناصح بن کر سامنے آنا۔ فریق ثانی سے نفرت کرنے کے بجائے اس سے محبت کرنا، یہاں تک کہ اس کے حق میں دعائیں نکلنے لگیں۔

یہ دعوتی عمل ہی صحیح اسلامی عمل ہے۔ یہی واحد طریقہ ہے جس کو اختیار کر کے مسلمان کامیاب ہو سکتے ہیں، موجودہ دنیا میں بھی اور آئندہ آنے والی ابدی جنتوں کی دنیا میں بھی۔

اسوۂ ابراہیمی

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ صبر اور اعراض کو کمتر درجہ کی چیز سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک مسلمان کی شان یہ ہے کہ وہ مجاہدانہ جوش کے تحت فوراً میدان مقابلہ میں کود پڑے۔ اس قسم کے اقدام کو وہ اسوۂ ابراہیمی قرار دیتے ہیں۔ اگر ان سے پوچھئے کہ اس جہاد یا اسوۂ ابراہیمی کا ماخذ کیا ہے تو وہ فوراً اقبال کا یہ شعر پڑھ دیں گے:

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق　　عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ شاعر کی خود ساختہ خیال آرائی ہے نہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اسوہ۔ اس شعر میں حضرت ابراہیم کی جو تصویر پیش کی گئی ہے وہ سراسر خلافِ واقعہ ہے۔ اس کا تعلق نہ قرآن وحدیث سے ہے اور نہ تاریخ سے۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ ابراہیم بن آزر علیہ الصلوٰۃ والسلام عراق میں پیدا ہوئے۔ اس وقت وہاں مکمل طور پر شرک کا غلبہ تھا۔ آپ نے ان کو توحید کی طرف بلایا۔ اور اپنی طرف سے کسی بھی قسم کا ٹکراؤ پیدا کیے بغیر خالص پرامن انداز میں اس کی دعوت دیتے رہے۔ قوم کے سردار جو بت پرستی کے اوپر اپنی سرداری قائم کیے ہوئے تھے، وہ آپ کے دشمن ہو گیے۔ انھوں نے آپس میں مشورہ کر کے یہ طے کیا کہ آپ کو جلا کر ختم کر دیں (قالوا حرقوہ، الانبیاء ۶۸)

روایات بتاتی ہیں کہ اس کے بعد انھوں نے ایک گڑھا کھودا۔ اس گڑھے میں لکڑیاں ڈال کر اس میں آگ لگا دی۔ جب آگ خوب بھڑکنے لگی، اس وقت انھوں نے حضرت ابراہیم کو پکڑ کر انھیں باندھا، باندھ کر ان کو منجنیق میں رکھا۔ اور منجنیق کے ذریعہ آپ کو آگ میں پھینک دیا (ثم اوثقوا ابراهيم وجعلوه فی منجنيق ورموه فی النار، صفوة التفاسير، المجلد الثانی، صفحہ ۲۶۸)

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت ابراہیمؑ آگ میں ڈالے گیے تھے نہ کہ آگ میں کود پڑے تھے۔ یہ جبر کا معاملہ تھا نہ کہ اختیار کا۔ مذکورہ شعر حضرت ابراہیم کی جو تصویر پیش کرتا ہے وہ نہ صرف خلاف واقعہ ہے بلکہ خلاف اسلام بھی ہے۔ یہ ہرگز اسلام یا پیغمبروں کا اسوہ نہیں کہ آدمی بے خطر آگ میں کود پڑے۔ پیغمبروں کا اسوہ لوگوں کو آگ سے نکالنے کی کوشش کرنا ہے نہ کہ خوامخواہ آگ میں کود پڑنا۔

سچی ہمدردی

ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے امریکہ میں سائنس کی تعلیم حاصل کی ہے اور اب وہیں ایک تعلیمی ادارہ میں کام کرتے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ امریکہ میں آپ کی ملاقات کیا کچھ یہودیوں سے ہوئی۔ انھوں نے کہا ہاں۔ خود ہمارے ادارہ میں کئی یہودی کام کر رہے ہیں۔ ہمارا ڈائرکٹر بھی یہودی ہے۔

میں نے پوچھا کہ کہا جاتا ہے کہ یہودی امریکہ میں بہت کامیاب ہیں جب کہ وہ وہاں کی بہت چھوٹی اقلیت ہیں۔ ان کی اس غیر معمولی کامیابی کا راز کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ایک لفظ میں اس کا راز امتیاز (Excellence) ہے۔ انھوں نے امتیازی لیاقت کو اپنا نشانہ بنایا ہے، اور جب امتیازی لیاقت کا درجہ آجائے تو کوئی بھی آپ کی کامیابی کو روک نہیں سکتا۔

انھوں نے مزید کہا کہ امریکہ میں یہودیوں نے جو تعلیمی ادارے قائم کیے ہیں، ان میں انھوں نے بڑا عجیب اصول رائج کیا ہے۔ ان کے تعلیمی اداروں میں غیر یہودی طالب علموں کو اسکالرشپ کا مستحق بننے کے لیے یہ کافی ہے کہ وہ امتحان میں ۶۰ فی صد نمبر حاصل کریں۔ مگر یہودیوں کے لیے ان کا معیار بے حد سخت ہے۔ یہودی طالب علموں کو اسکالرشپ حاصل کرنے کے لیے ۹۵ فی صد نمبر لانا ضروری ہے۔ اگر ان کے نمبر ۹۵ فی صد سے کم ہوں تو ان کو اسکالرشپ (وظیفہ) نہیں دیا جائے گا۔

یہودی خود اپنے اداروں میں ایسا کیوں کرتے ہیں۔ ان کا یہ عمل بظاہر سختی معلوم ہوتا ہے۔ مگر وہ سختی نہیں بلکہ سب سے بڑی ہمدردی ہے۔ اس طرح وہ اپنے نوجوانوں میں محنت کا جذبہ ابھارتے ہیں۔ اس طرح وہ اپنے نوجوانوں میں یہ حوصلہ پیدا کرتے ہیں کہ وہ دوسروں کو پیچھے چھوڑ کر ان سے آگے نکل جائیں۔

موجودہ دنیا مقابلہ کی دنیا ہے۔ یہاں جو لوگ رعایت کے طالب ہوں ان کو صرف پچھلی سیٹوں پر جگہ ملتی ہے، اور جو لوگ امتیازی لیاقت کا ثبوت دیں وہ اگلی سیٹوں پر جگہ پانے میں کامیاب ہوتے ہیں۔

ذمّہ دار کون

ہندستان میں ہولی کے دن ایک ہندو کچھ مسلمانوں کے اوپر رنگ ڈال دیتا ہے۔ مسلمان مشتعل ہوکر لڑنے لگتے ہیں۔ اور پھر ساری بستی میں فرقہ وارانہ فساد پھوٹ پڑتا ہے۔ پاکستان کے ایک ہوٹل میں کسی مسئلہ پر تکرار ہوتی ہے۔ ایک پٹھان کچھ مہاجرین کے اوپر گرم چائے کی پیالی پھینک دیتا ہے۔ یہ مہاجرین مشتعل ہوکر لڑ پڑتے ہیں۔ اور اس کے بعد پورے شہر میں مہاجر مسلمان اور پٹھان مسلمان کے درمیان جنگ شروع ہو جاتی ہے۔

ان واقعات میں بظاہر فساد کا آغاز کرنے والا ہندستان میں ہندو اور پاکستان میں پٹھان ہے۔ مگر قرآن کی رو سے دیکھئے تو دونوں جگہ فساد کی اصل ذمہ داری فریق ثانی پر عائد ہوتی ہے۔ ہندستان میں مسلمان کے اوپر اور پاکستان میں مہاجر کے اوپر۔ کیوں کہ دونوں جگہ فریق ثانی نے یہ کیا کہ فریق اول کے جس واقعہ پر قرآن میں عفو و درگزر کا حکم دیا تھا۔ اس کو انھوں نے انتقام اور جوابی کارروائی کا عنوان بنایا۔

موجودہ دنیا دارالامتحان ہے۔ یہاں ہر شخص کو آزادی حاصل ہے۔ اس لیے مذکورہ نوعیت کے چھوٹے چھوٹے واقعات ہر جگہ لازماً پیش آئیں گے، خواہ وہ مسلم ملک ہو یا غیر مسلم ملک۔ یہ اس تخلیقی منصوبہ کا فطری نتیجہ ہے جس کے تحت اللہ تعالیٰ نے موجودہ دنیا کو بنایا ہے۔ اسی لیے یہ حکم دیا گیا ہے کہ اس طرح کے واقعات کو اعراض کے خانہ میں ڈال دو۔ اس کو اشتعال اور انتقام کا مسئلہ نہ بناؤ ——— اب جو شخص ایسا نہ کرے وہ بلا شبہہ مفسد ہے۔ کیوں کہ وہ خدا کے نظامِ تخلیق پر راضی نہیں ہوا۔

ہندستان اور پاکستان میں جو لوگ عفو و درگذر کے اصول کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتے، وہی لوگ "پٹرو ڈالر" کے ملکوں میں جا کر مبالغہ کی حد تک عفو و درگذر کے اصول کی پابندی کرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کی نظر میں قرآن کے حکم کی اتنی اہمیت نہیں جتنی اہمیت پٹرو ڈالر کے حکم کی ہے۔ اس سے زیادہ عجیب بات ہے کہ اس کے باوجود یہ لوگ اپنے آپ کو قرآن کا مومن کامل سمجھتے ہیں۔

یہ صحیح نہیں

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) نے اپنے مقالہ کروسیڈ (Crusades) کے تحت لکھا ہے کہ تیرہویں صدی عیسوی میں مسیحی مبلغین مشرق کے مسلم ممالک میں داخل ہوئے۔ تاہم وہ مسلمانوں کو عیسائی بنانے میں کامیاب نہ ہوسکے۔ اسلامی قانون چوں کہ نہایت سختی کے ساتھ غیر مذاہب کی تبلیغ کو ممنوع قرار دیتا ہے اور اسلام سے پھر جانے والے کے لیے اس کے یہاں موت کی سزا ہے، اس لیے اسلام کو چھوڑ کر مسیحیت اختیار کرنے والوں کی تعداد بہت کم رہی:

Since Islamic law rigidly prohibited propaganda and punished apostasy with death, conversion from Islam were few (5/310).

یہ صحیح ہے کہ اسلامی دور میں غیر مذاہب کی تبلیغ موثر انداز میں جاری نہ رہ سکی۔ مگر اس کی وجہ قانونی ممانعت نہ تھی۔ اس کی وجہ تمام تر وہی تھی جو موجودہ زمانہ میں ہم نسلی بادشاہت کے معاملہ میں دیکھ رہے ہیں۔ موجودہ آزاد ممالک (مثلاً ہندستان یا فرانس میں) نسلی بادشاہت کے نظریہ کی تبلیغ پر کوئی قانونی پابندی نہیں۔ اس کے باوجود ان ملکوں میں نسلی بادشاہت کے نظریہ کی تبلیغ نہیں ہو رہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جمہوریت کے فکری انقلاب نے نسلی بادشاہت کے نظریہ کو بے بنیاد ثابت کر دیا ہے۔ نسلی بادشاہت علمی طور پر اب اس قابل نہیں کہ کوئی اس کا مبلغ بن سکے۔

اسی طرح مسلمانوں کے عیسائی نہ ہونے کا کوئی تعلق اسلام کے قانونِ ارتداد سے نہیں ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ برطانیہ نے اپنے دورِ اقتدار میں اس قسم کے اندیشہ کو مکمل طور پر ختم کر دیا۔ مگر سابقہ صورت حال میں کوئی فرق نہیں آیا۔ آج بھی تقریباً تمام دنیا میں مسلمانوں کے لیے عملاً ارتداد کا راستہ کھلا ہوا ہے، مگر مسلمانوں کے مقابلہ میں مسیحی مبلغین کو کہیں بھی کوئی قابلِ ذکر کامیابی حاصل نہیں۔

اصل یہ ہے کہ اسلام کی صداقت وہ چیز ہے جو مسلمانوں کے اوپر دوسرے مذاہب کی تبلیغ کو غیر موثر بنا رہی ہے۔ اس کا تعلق اسلام کی نظریاتی طاقت سے ہے نہ کہ تبلیغ کی قانونی ممانعت سے۔

عبرت ناک

عراق۔ایران جنگ کو اب تقریباً آٹھ سال پورے ہو رہے ہیں۔ اس تباہ کن جنگ کی خبریں اخبارات میں آتی رہتی ہیں۔ امریکی میگزین ٹائم (۴ اپریل ۱۹۸۸) نے اپنے صفحہ ۱۱ پر بعض تصویریں چھاپی ہیں۔ اس تصویر میں ایک کُرد علاقہ کو دکھایا گیا ہے جہاں ایک وحشیانہ بمباری کے نتیجہ میں عورت اور مرد اور بچے انتہائی بے کسی کی حالت میں مرے ہوئے پڑے ہیں۔

اس رپورٹ کو پڑھنے کے بعد ایک اسرائیلی شہری کیرول ڈیزنٹ (Carol Dezent) نے ٹائم کو ایک خط لکھا ہے جو اس کے شمارہ ۹ مئی ۱۹۸۸ میں چھپا ہے۔ کیرول ڈیزنٹ نے اپنے خط میں کہا ہے کہ میں نے اس سے پہلے اس قدر ہولناک جنگی تصویریں نہیں دیکھیں۔ اگر دنیا اسرائیل کی حالیہ کارروائیوں کو اتنا غیر منصفانہ سمجھتی ہے تو معصوموں کے اس اجتماعی قتل کے خلاف اس کی چیخ پکار کہاں ہے:

If the world deems Israel's recent actions so unjust, where is the thunders outcry against this mass killing of innocents?

اس میں شک نہیں کہ عراق۔ایران جنگ میں خود مسلمانوں کے ہاتھ سے مسلمان جس طرح مارے جا رہے ہیں وہ وحشت اور بربریت میں اپنی مثال نہیں رکھتی۔ مگر یہ صرف عراق اور ایران کا مسئلہ نہیں۔ یہی تمام مسلم دنیا کا مسئلہ ہے۔ آج مسلمان کو مسلمان کے ہاتھ سے جو نقصان پہونچ رہا ہے وہ اس سے بہت زیادہ ہے جو کافروں اور مشرکوں کے ذریعہ انھیں پہونچ رہا ہے۔ ہندستان کے فرقہ وارانہ فسادات میں "ہندوؤں کے ہاتھ سے مسلمانوں کو جو نقصان پہونچتا ہے اس سے ہزاروں گنا زیادہ نقصان خود مسلمان اپنے بھائیوں کو پہونچا رہے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ یہاں مسلمان دوسرے مسلمان کا ایک مکان ہڑپ کرتا ہے تو ایران اور عراق میں پوری پوری بستی کو بم سے اڑا دیا جاتا ہے۔ یہاں لوگوں کے بس میں کردار کشی ہے تو وہ کردار کشی کر رہے ہیں۔ وہاں کے حکمراں جسم کشی پر قادر ہیں، اس لیے وہ بمباری کر کے جسم کے چیتھڑے اڑا رہے ہیں۔

کمی یہاں ہے

نیتاجی سبھاش چندر بوس نے ۱۹۴۳ میں آزاد ہند فوج (Indian National Army) بنائی تھی۔ اس کا مقصد انگریزوں سے لڑکر ہندستان کو آزاد کرانا تھا۔ یہ فوج رنگون میں بنائی گئی۔ مگر قبل اس کے کہ وہ ہندستان میں داخل ہو انگریزی فوج کے بری دستہ نے اسے ختم کر دیا۔

آزاد ہند فوج کے تین خاص کمانڈر تھے ۔ ڈھلوں، سہگل اور شاہ نواز ۔ ان لوگوں پر لال قلعہ کی ایک عدالت میں غداری کا مقدمہ چلایا گیا جس کی وکالت مدعیٰ علیہ کی طرف سے جواہر لال نہرو نے کی تھی۔ اسی زمانہ میں ایک شاعر کا یہ شعر بہت مشہور ہوا تھا :

لال قلعہ سے آئی آواز ڈھلوں، سہگل، شاہ نواز

کرنل گور بخش سنگھ ڈھلوں (عمر ۷۵ سال) اب شیوپوری (مدھیہ پردیش) میں رہتے ہیں۔ اور کبھی کبھی دہلی آتے ہیں۔ پرومیلا کلہن نے ان سے ایک انٹرویو لیا جو ہندستان ٹائمس (۱۶ مئی ۱۹۸۸) میں چھپا ہے۔ اس انٹرویو میں انھوں نے جو باتیں بتائیں ان میں سے ایک بات مطبوعہ انٹرویو کے مطابق یہ تھی کہ ہندستانیوں اور ایشیائیوں نے فیاضانہ طور پر نیتاجی سبھاش چندر بوس کی مالی مدد کی۔ رنگون کے ایک مسلمان تاجر نے تنہا ان کو ایک کرور روپیہ دیا :

A cosmetic manufacturer, a Muslim in Rangoon, gave a crore of rupees (p.10).

۱۹۴۴ کا ایک کرور روپیہ آج کے لحاظ سے ۵۰ کرور روپیہ سے بھی زیادہ ہے۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں نے سیاسی اور قومی کاموں میں بہت بڑا بڑا تعاون دیا ہے۔ اور بے شمار سرمایہ خرچ کیا ہے۔ مگر دور جدید کی پوری تاریخ میں کوئی ایک مثال نہیں جب کہ مسلمانوں نے دعوت الی اللہ کے کام میں کوئی بڑا تعاون کیا ہو۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ وہ نفرتِ اقوام کے لیے اٹھے مگر وہ محبتِ اقوام کے لیے نہ اٹھ سکے۔ یہی واحد سب سے بڑا سبب ہے جس نے موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے سارے معاملات کو برباد کر رکھا ہے۔ جب تک وہ اپنے اس مزاج کو نہ بدلیں، کسی بھی دوسری تدبیر سے ان کے حالات بدلنے والے نہیں۔

قرآن و سنت کی رہنمائی

اسلام کے نزدیک تمام مسجدیں یکساں ہیں، خواہ کوئی چھوٹی مسجد ہو یا کوئی بڑی مسجد، خواہ وہ کسی معمولی آدمی کی بنوائی ہوئی ہو یا کسی بادشاہ کی بنوائی ہوئی۔ اس میں صرف تین مسجدوں کا استثناء ہے۔ بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ صرف تین مسجدیں ہیں جن کے لیے سفر کرنا درست ہے۔ مکہ کی مسجد حرام، مدینہ کی مسجد نبوی، اور فلسطین کی مسجد اقصیٰ (لاتشدّ الرحال الا الی ثلاثة مساجد : المسجد الحرام، ومسجد الرسول، ومسجد الاقصیٰ. وفی روایة : انما یُسافرُ الی ثلاثة مساجد۔ مسجد الکعبة ومسجدی ومسجد ایلیاء)

اس حدیث کی تشریح محدثین نے یہ کی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کے تقرب کی نیت سے کسی مقام کا قصد نہیں کیا جائے گا، سوا ان تین مقامات کے، ان کی عظمت اور شرف کی وجہ سے (المراد لایُقصد موضع من المواضع بنیة العبادة والتقرب الی اللہ تعالی الا الی هذه الاماکن الثلاثة تعظیما لشانها وتشریفا)

معلوم ہوا کہ مذکورہ تین مسجدوں کے علاوہ کسی اور مسجد کے لیے اسلام میں شدّ رحال کی اجازت نہیں ہے۔ یہ امتیازی حیثیت صرف تین مسجدوں کو حاصل ہے کہ خاص اس میں عبادت کرنے کے مقصد سے آدمی وہاں کا سفر اختیار کر سکتا ہے۔ دوسری تمام مسجدوں میں عبادت کا ثواب یکساں ہے، جیسا ایک مسجد میں ویسا ہی دوسری مسجد میں۔ البتہ مذکورہ تین مسجدوں میں عبادت کا ثواب استثنائی طور پر زیادہ ہے۔ ان تین مسجدوں کے سوا کسی اور مسجد کی نہ کوئی امتیازی حیثیت ہے اور نہ ان کے علاوہ کسی اور مسجد کے لیے خصوصی طور پر عبادتی سفر کرنا جائز ہے۔

مذکورہ شرعی حکم "عبادتی سفر" کے لیے ہے۔ اب اگر کچھ مسلمان ایک عام مسجد کی طرف کفن بردوش ہو کر سفر کریں۔ وہ کہیں کہ ہم جو مارچ کر رہے ہیں وہ عبادتی مارچ نہیں ہے۔ ہم تو مسجد کے غاصبوں سے مسجد کو واگذار کرنے کے لیے ان کے اوپر پر امن جمہوری چڑھائی کر رہے ہیں تو یہ اور بھی زیادہ غلط ہوگا۔ کیوں کہ ایک مسجد کے لیے عبادتی شدّ رحال اگر بدعت ہو، تو غیر مسلم

مسلمانوں کا اس کے مسلح غاصبوں سے ٹکرانے کے لیے اقدام کرنا سراسر حرام ہے۔

اگر نارمل حالات ہوں اور سفر کے ساتھ جان و مال کے نقصان کا اندیشہ وابستہ نہ ہو تب بھی تین مسجدوں کے سوا کسی مسجد کے لیے شدِ رحال جائز نہیں۔ لیکن اگر غیر معمولی حالات ہوں اور سفر کرکے مسجد تک پہونچنے میں مسلمانوں کی جان و مال کا خطرہ پیدا ہو گیا ہو تو اس وقت معاملہ مزید نازک ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت میں فضیلت والی مسجدوں کے لیے سفر کرنا بھی غیر مطلوب بن جائے گا، اور دوسری مسجدوں کی طرف پرخطر مارچ کرنے کا تو کوئی سوال ہی نہیں۔

جہاں تک اس دوسرے معاملہ کی نوعیت کا سوال ہے، اس کی مثال ہم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ملتی ہے۔ ۶ھ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے تقریباً ڈیڑھ ہزار اصحاب کے ساتھ مدینہ سے مکہ کے لیے روانہ ہوئے تاکہ وہاں پہونچ کر عمرہ ادا کریں۔ آج کل کی زبان میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ آپ نے مکہ کی طرف پرامن مارچ کیا۔ یہ مقدس قافلہ مکہ کے قریب حدیبیہ کے مقام تک پہونچا تھا کہ مکہ کے منکرین نے آپ کو آگے بڑھنے سے روکا۔ وہ آپ سے لڑنے کے لیے تیار ہو گیے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے آپ کی سواری حدیبیہ کے مقام پر روک دی (حبسہا حابس الفیل) اللہ تعالیٰ کے حکم کے تحت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ سے اعراض فرمایا اور قریش کی شرط کے مطابق، عمرہ ادا کیے بغیر درمیان ہی سے مدینہ کی طرف واپس چلے گیے۔

قدیم عرب میں "غیر تحریری دستور" یہ تھا کہ کسی کو زیارت کعبہ سے روکا نہ جائے۔ مگر قریش اس کی کھلی خلاف ورزی کرتے ہوئے آپ کو زیارتِ کعبہ سے روکنے پر تل گیے۔ اب ایک طرف صورتِ دستوری تھی جو آپ کے موافق تھی اور دوسری طرف صورتِ واقعی تھی جو آپ کے خلاف ہو گئی تھی۔ آپ نے صورتِ دستوری کا کوئی حوالہ نہیں دیا بلکہ صورتِ واقعی کو اصل سمجھتے ہوئے اس کے مطابق عمل فرمایا ——— پیغمبرانہ حکمت حقیقتِ واقعہ کو اپنے موافق بنانا ہے نہ کہ "دستور" کے نام پر بے فائدہ لفظی جنگ لڑنا۔

جس وقت مذکورہ واقعہ پیش آیا اس وقت حرم کعبہ میں ۳۶۰ بُت رکھے ہوئے تھے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے رسول اور اصحاب رسول کو یہ حکم نہیں دیا کہ تم توحید کے گھر کو بتوں سے پاک کرنے کے لیے ہر قیمت پر مکہ میں داخل ہو جاؤ۔ اگر اس وقت تم خاموش ہو گیے تو کافروں کے حوصلے

بڑھ جائیں گے۔ اس کے بعد وہ دوسری تمام مسجدوں کو بھی اپنے قبضہ میں لینے کی کوشش کریں گے اور ان کو اپنے بتوں سے بھر دیں گے۔ اس نازک موقع پر اس قسم کا " مجاہدانہ " حکم نہ آنا ثابت کرتا ہے کہ اس قسم کی مصلحت اللہ تعالیٰ کی نظر میں غیر معتبر ہے۔ وہ کوئی حقیقی اور معتبر مصلحت نہیں، اس لیے مسلمانوں کو ایسی مصلحتوں کا لحاظ کرنے کی ضرورت بھی نہیں۔

مکہ کی طرف مارچ سے روکنے کی حکمت کیا تھی، وہ واضح طور پر قرآن کی ۴۸ ویں سورۃ الفتح میں بیان کی گئی ہے۔ متعلقہ آیتوں کا ترجمہ یہ ہے:

اور اللہ ہی ہے جس نے ان کے ہاتھوں کو تم سے روک دیا اور تمہارے ہاتھوں کو ان سے روک دیا، مکہ کی وادی میں۔ بعد اس کے کہ تم کو ان پر قابو دیدیا تھا۔ اور اللہ دیکھ رہا تھا جو کچھ تم کر رہے تھے۔ وہی ہیں جنھوں نے انکار کیا اور تم کو مسجد حرام سے روکا اور قربانی کے جانوروں کو بھی کہ وہ اپنی جگہ تک نہ پہونچیں۔ اور اگر ایسے مومن مرد اور مومن عورتیں نہ ہوتیں جن کو تم لاعلمی میں روند ڈالتے، پھر ان کے باعث تم پر بے خبری میں الزام آتا (تو ہم جنگ کی اجازت دیدیتے) تاکہ اللہ جس کو چاہے اپنی رحمت میں داخل کرے۔ اور اگر وہ لوگ الگ ہوگیے ہوتے تو ان میں جو منکر تھے، ان کو ہم دردناک سزا دیتے (الفتح ۲۴-۲۵)

مولانا شبیر احمد عثمانی سورہ فتح کی مذکورہ آیت کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "یعنی ان کی شرارتیں اور تمہارا عفو و تحمل سب کچھ اللہ دیکھ رہا ہے..... کچھ مسلمان مرد و عورت جو مکہ میں مظلوم و مقہور تھے اور مسلمان ان کو پوری طرح جانتے نہ تھے، وہ لڑائی میں بے خبری سے پیس دیے جائیں گے۔ اگر یہ خطرہ نہ ہوتا تو فی الحال لڑائی کا (اور مکہ میں داخلہ کا) حکم دیدیا جاتا۔ لیکن ایسا ہوتا تو تم خود (مسلمانوں کی ہلاکت کے) اس قومی نقصان پر متاسف ہوتے۔ اس خرابی کے باعث لڑائی (اور مکہ میں داخلہ) موقوف رکھا گیا تاکہ وہ مسلمان محفوظ رہیں اور تم پر اس بے مثال صبر و تحمل کی بدولت خدا اپنی رحمت نازل فرمائے۔ نیز کافروں میں سے جن لوگوں کا اسلام لانا مقدر ہے، ان کو بھی لڑائی کی خطرناک گڑبڑ سے بچا کر اپنی رحمت میں داخل کرے" صفحہ ۶۶۷

حدیبیہ (۶ھ) کا واقعہ اور اس کے بارے میں قرآن کا مذکورہ ارشاد بتا رہا ہے کہ مسجد حرام میں بتوں کی موجودگی اور اس پر کافروں کے ناجائز قبضہ کے باوجود، اللہ تعالیٰ نے

اس کی طرف " مارچ " کرنے کا حکم نہیں دیا۔ مذکورہ آیت میں اس کی دو خاص وجہ بتائی گئی ہے۔

۱۔ مکہ کی طرف عمرہ کی ادائگی کے لیے " مارچ " کرنا اگرچہ بظاہر ایک سادہ واقعہ تھا مگر اس وقت اہل مکہ کے درمیان اشتعال کی جو فضا علاً بن گئی تھی، اس کو دیکھتے ہوئے یہ یقینی تھا کہ " مارچ " کو جاری رکھنے میں مسلمانوں کا اہل مکہ سے غیر ضروری ٹکراؤ ہوگا اور اس کے نتیجہ میں بہت سے بے قصور مسلمان ناحق مارے جائیں گے۔ مسلمان کا خون بے حد قیمتی ہے۔ اس کو بچانا ہر دوسری مصلحت پر فوقیت رکھتا ہے۔

۲۔ ٹکراؤ سے بچنے کی دوسری مصلحت یہ بتائی کہ جن لوگوں سے تمہارا جنگی ٹکراؤ ہوتا وہ اگرچہ بظاہر تمہارے اور اسلام کے دشمن تھے مگر ان میں بہت سے ایسے افراد تھے جن کے اندر قبولیت حق کی فطری استعداد موجود تھی۔ ان کے متعلق امید تھی کہ آئندہ جب ضد کی فضا ختم ہوگی تو وہ اپنے معاملہ پر نظر ثانی کریں گے اور ایمان قبول کرکے تمہارے ساتھی اور حمایتی بن جائیں گے۔ ایسے لوگوں کی اشتعال انگیزی پر ان سے لڑنا نہیں ہے بلکہ اشتعال کو نظر انداز کرکے ایسے حالات پیدا کرنا ہے کہ ان پر دعوتی عمل جاری کیا جا سکے۔ جن لوگوں کو دعوت کے ذریعہ مسخر کرنے کا موقع ہو ان کو دشمن کے خانہ میں ڈال کر ان کے خلاف لڑائی چھیڑنا اسلام میں ہرگز جائز نہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس وقت دو قسم کے مسئلے تھے۔ ایک مسئلہ یہ تھا کہ موحد اعظم حضرت ابراہیم کی بنائی ہوئی مسجد میں سیکڑوں بت رکھ دیے گئے تھے اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کے لیے اس میں داخلہ پر پابندی لگا دی گئی تھی۔ دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ اس دستوری حق کو حاصل کرنے اور مسجد کو بتوں سے پاک کرنے کی مہم چلانے میں بیک وقت دو نقصان تھا ——— مسلمانوں کا قتل و خون اور متوقع مومنین سے محرومی۔ آپ نے اس وقت یہ کیا کہ پہلے مسئلہ کو دوسرے مسئلہ کے تابع کر دیا۔ آپ نے دوسرے مسئلہ کی فوری رعایت فرمائی اور پہلے مسئلہ کو مستقبل کے خانہ میں ڈال دیا۔

یہ تدبیر نہایت موثر ثابت ہوئی۔ ۶ھ میں دوسرا مسئلہ حل ہوا، اور ۸ھ میں پہلا مسئلہ۔ آپ حال کے بھی مالک بن گیے اور مستقبل کے مالک بھی۔ یہ پیغمبر کا طریقہ ہے۔ اور پیغمبر کے طریقہ کے سوا کسی اور طریقہ میں کامیابی اور نجات نہیں۔

حق کی طاقت

ابرہہ (Abrames) قدیم یمن (جنوبی عرب) کا حبشی عیسائی حکمراں تھا۔ اس نے یمن کے دار السلطنت صنعار میں ایک بہت بڑا مسیحی کلیسا (Ekklesia) بنایا۔ چونکہ جزیرہ عرب کا سب سے زیادہ مقدس عبادت خانہ کعبہ کو سمجھا جاتا تھا اور زیادہ تر لوگ اسی کی زیارت کے لیے جایا کرتے تھے، ابرہہ نے چاہا کہ وہ کعبہ کو ڈھادے تاکہ تمام لوگ اس کے بنائے ہوئے عبادت خانہ میں آئیں، اور اس طرح عرب کا مذہبی مرکز مکہ سے صنعار کی طرف منتقل ہو جائے۔

اس منصوبہ کے مطابق، ابرہہ ۵۷۰ء میں یمن سے مکہ کے لیے روانہ ہوا۔ اس کا لشکر ۶۰ ہزار مسلح آدمیوں پر مشتمل تھا۔ اس کے ساتھ ایک درجن ہاتھی تھے جو آگے آگے چل رہے تھے۔ اس واقعہ کی تفصیلات بہت لمبی ہیں۔ خلاصہ یہ کہ مکہ کے سردار عبد المطلب کو جب معلوم ہوا کہ اس قسم کا بے پناہ لشکر کعبہ کو ڈھانے کے لیے مکہ کی طرف بڑھ رہا ہے تو انھوں نے محسوس کیا کہ وہ خود اس سے مقابلہ کی طاقت نہیں رکھتے۔ چنانچہ انھوں نے بیت اللہ میں داخل ہو کر اللہ سے دعائیں کیں۔ اس سلسلہ میں ان کے بہت سے اشعار کتابوں میں آئے ہیں، ان کا ایک شعر یہ تھا:

یاربِّ لا ارجو لھم سواکا یاربِّ فامنع منھم حماکا

(اے میرے رب، ان کے مقابلہ میں تیرے سوا میں کسی سے امید نہیں رکھتا، اے میرے رب، تو ان سے اپنے حرم کی حفاظت کر) اس طرح عبد المطلب نے کعبہ کو اللہ کے حوالے کیا اور قبیلہ کے دوسرے لوگوں کے ساتھ بستی سے نکل کر پہاڑوں میں چلے گیے اور وہاں چھپ کر بیٹھ گیے۔

ابرہہ اپنے لشکر کے ساتھ بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ جب وہ حدودِ حرم پر پہونچا تو اس کے ہاتھی نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ اس کو مار مار کر زخمی کر دیا گیا مگر وہ آگے نہ بڑھا۔ اسی دوران بے شمار چڑیوں کے جھنڈ فضا میں ظاہر ہوئے۔ ان کے چونچ اور ان کے پنجوں میں کنکریاں تھیں۔ انھوں نے یہ کنکریاں ابرہہ کے لشکر پر گرائیں تو وہ گولیوں کی بارش کی مانند ان پر برسنے لگیں۔ ابرہہ سمیت پورا لشکر بھس کی طرح چورا چورا ہو کر رہ گیا۔ یہ واقعہ مکہ کے قریب وادی محسر میں پیش آیا۔

اس واقعہ کے بعد عربوں نے قدیم رواج کے مطابق بہت سے اشعار لکھے اور ان میں اپنے

جذبات اور مشاہدات کا اظہار کیا۔ ابو قیس بن الاسلت کا ایک شعر یہ ہے :

فَلَمَّا اَتَاکُمْ نَصْرُ ذِی الْعَرْشِ رَدَّهُمْ جُنُودُ الْمَلِیکِ بَیْنَ سَافٍ وحاصِبِ

پھر جب تمہارے پاس عرش والے کی مدد آگئی تو اس بادشاہ کے لشکر (پرندوں) نے ان کو مٹی اور اور پتھر سے مار کر پسپا کر دیا (سیرۃ ابن ہشام، الجزء الاول۔ صفحہ ۶۲)

ابرہہ کا مذکورہ واقعہ ۵۷۰ء میں پیش آیا تھا۔ اس کے ٹھیک ۵۸ سال بعد ۶۲۸ء میں اسی مکہ کی سرحد پر ایک اور واقعہ اس سے مختلف صورت میں پیش آیا۔ یہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ واقعہ ہے جو اسلامی تاریخ میں صلح حدیبیہ کے نام سے مشہور ہے۔

اس وقت رسول اللہ علیہ وسلم اپنے دارِ ہجرت (مدینہ) میں تھے۔ ایک خواب کے مطابق آپ اپنے تقریباً ڈیڑھ ہزار اصحاب کے ساتھ عمرہ کے ارادہ سے مکہ کے لیے روانہ ہوئے۔ آپ مکہ کے قریب حدیبیہ کے مقام پر پہونچے تھے کہ مکہ کے قریش نے آگے بڑھ کر آپ کو روکا۔ انھوں نے کہا کہ ہم آپ کو مکہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔ آپ عمرہ کیے بغیر مدینہ واپس جائیں۔

قریش کا آپ کو عمرہ سے روکنا یقینی طور پر ظلم اور سرکشی کا واقعہ تھا۔ بظاہر دیکھئے تو یہاں قریش مکہ بدلی ہوئی صورت میں وہی کردار ادا کر رہے تھے جو ۵۸ سال پہلے ابرہہ نے ادا کیا تھا۔ اب بظاہر یہ ہونا چاہیے تھا کہ جس طرح ابرہہ کے اوپر خدا نے آسمانی سزا بھیجی اسی طرح دوبارہ قریش کے اوپر آسمانی سزا آتی اور انھیں تباہ کر دیتی تاکہ وہ رسولؐ اور اصحاب رسولؐ کی راہ میں رکاوٹ نہ بنیں۔

مگر ایسا نہیں ہوا۔ پھر اس فرق کا سبب کیا ہے۔ اس فرق کا کم از کم ایک سبب یہ ہے کہ ابرہہ کے حملہ کے وقت فریق ثانی کے پاس وہ نظریاتی ہتھیار موجود نہ تھا جو پیغمبر اسلامؐ کے ساتھ حدیبیہ کے واقعہ کے وقت موجود تھا۔

ابرہہ کے حملہ کے وقت ابھی قرآن کا نزول نہیں ہوا تھا۔ مگر اس کے ۵۸ سال بعد جب حدیبیہ کا واقعہ پیش آیا، اس وقت پیغمبر آخر الزماں مبعوث ہو چکے تھے۔ اور ان کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے اپنا سچا دین قرآن کی صورت میں بھیج دیا تھا۔

اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ ہے کہ وہ دین کی اور اہل دین کی حفاظت فرمائے گا۔ تاہم ابرہہ کے زمانہ

پس اللہ تعالیٰ نے دین کی حفاظت کا انتظام اس طرح کیا کہ حق کے دشمنوں پر آسمان سے پتھر برسائے۔ مگر پیغمبر آخرالزماںؐ کی بعثت کے بعد اب صورت حال بدل چکی تھی۔ اب اہل حق کے پاس دین فطرت کی صورت میں وہ طاقت ور ہتھیار موجود ہے جس کے آگے کوئی مخالفانہ ہتھیار کارگر نہیں ہو سکتا۔ یہ دین لوگوں کے دلوں اور دماغوں پر حملہ کرتا ہے۔ وہ دشمن کو دوست کے روپ میں بدل دیتا ہے۔ وہ انسان کو اندر سے مسخر کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔ یہ دین بلاشبہ سب سے بڑا ہتھیار ہے۔ اور جب آدمی کے پاس بڑا ہتھیار ہو تو چھوٹا ہتھیار استعمال کرنے کی ضرورت نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب حدیبیہ میں قریش سے دس سال کا ناجنگ معاہدہ کرکے لوٹے تو قرآن میں یہ آیت اتری کہ خدا نے تم کو کھلی فتح دے دی اور تم کو نصرِ عزیز سے سرفراز فرمایا (الفتح) چنانچہ اس کے صرف دو برس بعد لوگوں نے دیکھا کہ جو لوگ اسلام کے دشمن بنے ہوئے تھے، وہ اسلام کے دوست اور اس کے دست و بازو بن گیے ہیں۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن کے خلاف جو لوگ سرکشی کر رہے تھے، ان کے بارہ میں قرآن میں کہا گیا ——— بلکہ ہم حق کو باطل پر ماریں گے تو وہ اس کا سر توڑ دے گا اور دفعۃً وہ جاتا رہے گا (الانبیاء ۱۸) چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ عبدالمطلب کے زمانہ میں ابرہہ کے لشکر کو پتھروں سے مار کر ہلاک کیا گیا تھا۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں سرکشی کرنے والوں کو خود حق کی ضرب سے مفتوح اور مغلوب کر دیا گیا۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ فکری اور نظریاتی شکست، فوجی شکست سے کہیں زیادہ سخت ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت ایک جاری نبوت ہے۔ وہ قیامت تک باقی رہے گی۔ اس دوسرے دور میں حق کے مخالفین کو زیر کرنے کے لیے انھیں کنکر پتھر مارنے کی ضرورت نہیں۔ اہل حق کو چاہیے کہ وہ حق لے کر اٹھیں جس طرح پیغمبر اسلامؐ حق لے کر اٹھے۔ اور پھر تمام مخالفینِ حق ان کے سامنے سے بھاگتے ہوئے نظر آئیں گے: جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا (حق آیا اور باطل مٹ گیا، اور باطل تھا ہی مٹنے والا)

دروازہ کھلتا ہے

روس میں ۱۹۱۷ میں کیمونسٹ انقلاب آیا۔ اس کے بعد پورے سوویت روس میں مذہب کو خلاف قانون قرار دے دیا گیا۔ مذہب کے نام پر تنظیم بنانا، اجتماع کرنا، کتاب چھاپنا، ہر چیز قانونی طور پر ممنوع قرار پائی۔ تاہم نصف صدی کی مجنونانہ مذہب دشمنی کے بعد وہاں کے حالات بدلنا شروع ہوئے۔ اندازہ ہے کہ امریکی صدر مسٹر رونالڈ ریگن کا دورۂ ماسکو (۲۹ مئی۔ ۲ جون ۱۹۸۸) اس اعتبار سے روس میں نئے دور کا آغاز ہوگا۔ ریگن روسی حکمرانوں سے جو بات منوانا چاہتے ہیں۔ ان میں مذہبی آزادی بھی خصوصیت کے ساتھ شامل ہے۔

اس دورہ کے موقع پر ماسکو میں ۶۳ ملکوں کے تقریباً ساڑھے پانچ ہزار جرنلسٹ جمع ہوئے۔ ان کا کہنا ہے کہ ۱۹۷۴ میں جب نکسن۔ برزنیف ملاقات ماسکو میں ہوئی تھی تو صحافیوں پر سخت پابندیاں تھیں۔ مگر اس بار انھیں ہر قسم کی کھلی آزادی حاصل رہی۔ یہ روس میں ایک نئے انقلاب کی علامت ہے جس کا آغاز روس کے موجودہ حکمراں گورباچیف نے کیا ہے۔

اس سلسلہ میں ماسکو سے جو خوش آئند خبریں آئی ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ انٹرنیشنل پولس کے دفتر کے سامنے مختلف چیزوں کی فروخت کا انتظام کیا گیا ہے۔ ان میں سب سے زیادہ غیر معمولی چیز بائبل کا روسی ترجمہ ہے۔ یہ ترجمہ روس میں مسیحیت کی ہزار سالہ برسی کے موقع پر چھاپا گیا ہے اور اس کی قیمت ۶۵ ڈالر ہے:

The most unusual buy has to be the modern Russian version of the Bible on sale periodically in the lobby in front of the international press briefing room. Put out to commemorate this summer's 1000th anniversary of Christianity in the Soviet Union, it retails for $65.

یہ خبر ٹائمس آف انڈیا (۳۰ مئی ۱۹۸۸) میں صفحہ ۷ پر اور ہندستان ٹائمس (۳۰ مئی ۱۹۸۸) میں صفحہ ۱۶ پر شائع ہوئی ہے۔ یہ ایک بے حد اہم خبر ہے۔ وہ بظاہر مسیحیت کی ہزار سالہ برسی سے تعلق رکھتی ہے، مگر حقیقۃً وہ اشتراکی روس میں مذہب کے از سر نو احیاء کی علامت ہے۔ یہ خبر بتاتی ہے کہ عارضی وقفہ کے بعد روس میں دوبارہ مذہب کو آزادانہ عمل کے مواقع حاصل ہو گئے ہیں۔

نظریۂ ارتقاء

چارلس ڈارون (۱۸۸۲-۱۸۰۹) نے یہ نظریہ پیش کیا تھا کہ زندگی ارتقائی عمل کے ذریعے ظہور میں آئی ہے۔ یعنی ابتداءً پانی اور کیچڑ کے تعامل سے زندگی کا پہلا جرثومہ بنا۔ پھر لمبی مدت تک وہ مختلف ارتقائی مراحل سے گزرتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ نوع بن کر تیار ہوئی جس کو انسان کہا جاتا ہے۔

یہ نظریہ لوگوں کو بہت پسند آیا اور ابتدا میں اس کو غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی۔ مگر بعد کی بعض تحقیقات نے اس کو ناقابل فہم بنا دیا۔ اس میں سے ایک زمین کی عمر تھی۔ سائنسی طریقوں کو استعمال کرکے زمین کی عمر تقریباً متعین طور پر معلوم ہوگئی۔ مگر یہ عمر ارتقائی مفروضہ سے مطابقت نہیں رکھتی تھی۔ کیوں کہ سائنس نے زمین کی جو عمر بتائی وہ اتنی کم تھی کہ مفروضہ ارتقائی عمل کے لیے وہ کسی طرح کافی نہیں ہو سکتی۔

اس دریافت کے بعد ارتقا پسند علماء نے ایک اور دعوی کرنا شروع کیا۔ انھوں نے کہا کہ ارتقا کا نظریہ بذات خود صحیح ہے۔ البتہ ارتقا کا ابتدائی عمل زمین پر نہیں ہوا بلکہ بالائی خلا میں ہوا۔ بالائی خلا میں ستاروں کے اوپر زندگی کا ابتدائی جرثومہ تیار ہوا۔ پھر وہ وائرس اور بیکٹیریا کی صورت میں دمدار ستارہ (Comet) کی دم پر سوار ہو کر زمین تک پہونچا۔ اس نظریہ کے علم بردار خاص طور پر دو امریکی سائنس داں تھے، ان کے نام یہ ہیں :

1. Fred Hoyle, 2. Carl Sagan

مگر اب یہ نظریہ بھی بالکل بے بنیاد ثابت ہوا ہے۔ روس کا ایک خلائی جہاز ویگا (Vega 1) ہر قسم کے آلات سے لیس ہو کر بالائی خلا میں گیا اور وہ ہیلی دمدار ستارہ (Halley's comet) کی دم کے پاس سے گزرا۔ اس کے آلات نے جو معلومات ریکارڈ کی ہیں، ان سے معلوم ہوا ہے کہ اس کی دم کے اندر وہ ضروری اجزاء موجود نہیں جن سے زندہ خلیے (Living cells) ترکیب پاتے ہیں۔ چنانچہ ساگن (پروفیسر کارنیل یونیورسٹی، نیویارک) جنھوں نے ۳۰ سال تک بالائے خلا زندگی کے موضوع پر (Life-from-space) تحقیق کی ہے، انھوں نے اعلان کیا ہے کہ ویگا کی دریافتوں نے خلائی زندگی کے نظریہ کو بے بنیاد ثابت کر دیا ہے۔ (ٹائمس آف انڈیا ۳ مئی ۱۹۸۸)

عبرت ناک

ہندستان کی آزادی کے ذیل میں ہندستانی علمار کی تقریریں سنیئے یا ان کی تحریریں پڑھیے تو
میں ہمیشہ علمار کی زبردست قربانیوں کا تذکرہ ہوگا۔ اور پُرجوش طور پر یہ کہا جائے گا کہ ہندستان
آزادی ہم نے دلائی۔ علمار اور مسلم عوام لاکھوں کی تعداد میں قربان نہ ہوگیے ہوتے تو انگریز ہندس
کے مطالبۂ آزادی کو تسلیم نہیں کرسکتا تھا۔

یہ بات اگرچہ کلی طور پر نہیں تاہم جزئی طور پر یقیناً صحیح ہے۔ مگر عبرت ناک بات یہ ہے کہ علمار کے
کے باہر اس کا اعتراف کہیں موجود نہیں۔ ہندستان میں قومی سطح پر آزادی کی جو تاریخیں لکھی گئی ہیں
میں علمار ہند کا یہ "شاندار باب" بالکل حذف ہے۔ یہی نہیں بلکہ ہندستان سے باہر عالمی سط
ہندستان کی آزادی کی تاریخ کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے۔ اس میں بھی اس کا تذکرہ موجود نہیں۔

اس کی ایک مثال انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) کا وہ مضمون ہے جو سبھاش چندر بوس
(۱۸۹۷ – ۱۹۴۵) کے عنوان کے تحت درج کیا گیا ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ دوسری جنگ عظیم
جب جاپانیوں نے سنگاپور پر قبضہ کرلیا تو سبھاش چندر بوس جاپان پہونچے۔ وہاں انھوں نے
اکتوبر ۱۹۴۳ میں "آزاد ہند حکومت" کی بنیاد ڈالی۔ اور اس کے تحت ایک آزاد ہند
(Indian National Army) بنائی۔ اس فوج کے افراد زیادہ تر وہ ہندستانی فوجی تھے جو ا
فوج میں شامل تھے اور جنھوں نے جاپان کی فتح کے بعد ہتھیار ڈال دیئے تھے۔

سبھاش چندر بوس اس فوج کو لے کر رنگون پہونچے تاکہ وہاں سے ہندستان کی طرف ا
کرسکیں۔ یہاں ان کا مقابلہ انگریزی فوج سے ہوا جس میں انھیں شکست ہوئی۔ اس کے بعد ا
دل ٹوٹ گیا۔ ایک حادثہ کا شکار ہوکر وہ کچھ دن جاپان کے اسپتال میں رہے اور وہیں ۱۹ اگ
۱۹۴۵ کو انتقال کرگیے۔

سبھاش چندر بوس کے تذکرے کے تحت انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں لکھا گیا ہے کہ سبھ
چندر بوس نے اپنے عمل سے یہ ثابت کیا کہ برطانی فوج کے ہندستانی سپاہیوں میں بھی حب
کا جوش پیدا کیا جاسکتا ہے۔ اپنے اس عمل سے انھوں نے وہ اثرات ڈالے جو بالآخر ہند

کی آزادی تک پہونچے :

By his actions, Bose proved that Indians in the British Indian army could also be inspired by patriotic fervour, and by his work he influenced the conference that led to Indian independence (3/53).

اس اقتباس کو پڑھنے کے بعد میں نے سوچا کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ جس واقعہ کو ہندستانی علماء اپنے خانہ میں درج کیے ہوئے ہیں وہ عالمی ریکارڈ میں "سبھاش چندر بوس" کے خانہ میں لکھا ہوا نظر آتا ہے۔ اس سوال کا جواب مجھے اس وقت ملا جب کہ میں نے انسائیکلوپیڈیا میں سبھاش چندر بوس کے مذکورہ مضمون کے نیچے اس کی کتابیات (Bibliography) دیکھی۔ اس کتابیات میں انگریزی کتابوں کی ایک لمبی فہرست ہے جو سبھاش چندر بوس کی زندگی اور ان کی جدوجہد کے بارے میں لکھی گئی ہیں اور جن سے معلومات اخذ کرتے ہوئے یہ مضمون تیار کیا گیا ہے۔ ہمارے علماء دنیا کو اس قسم کی "کتابیات" نہ دے سکے۔ اس لیے دنیا نے نہ ان کو جانا اور نہ ان کا تذکرہ کیا۔

موجودہ زمانہ میں جو مسلم علماء قیادت کے لیے اٹھے ان کی سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ وہ انگریزی زبان یا اور کسی مغربی زبان سے ناواقف تھے۔ مزید یہ کہ انھوں نے انگریزی تعلیم کا مسلسل اس طرح استخفاف کیا کہ قوم کے دوسرے لوگ بھی بہت کم انگریزی تعلیم کی طرف مائل ہو سکے۔ اور جو شخص انگریزی تعلیم کی طرف گیا وہ بھی یہ سمجھ کر گیا کہ وہ علماء سے اور ان کے مذہب سے باغی ہو کر انگریزی تعلیم کی طرف جا رہا ہے۔ اس انحراف کے بعد وہ علماء کے کام نہیں آسکتا تھا اور نہ وہ ان کے کام آیا۔

انسائیکلوپیڈیا یا دوسری مغربی کتابوں کے مذکورہ بیانات کو عام مسلمان اور خود ہمارے علماء "مستشرقین کے تعصب" کے خانہ میں ڈالتے ہیں۔ مگر میں اس کو خود علماء اور مسلمانوں کی اپنی کمی کے خانہ میں ڈالتا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم اپنی کمی کو دور کر کے ہی اس تاریخی صورت حال کو بدل سکتے ہیں، تعصب اور سازش کا الزام لگانے سے نہ اب تک کوئی فائدہ ہمیں ملا ہے اور نہ آئندہ اس سے کوئی فائدہ ہمیں مل سکتا ہے۔

ایک سفر

۱۷ مئی ۱۹۸۸ کو رمضان کے مہینہ کی آخری تاریخ تھی اور ۲ بجے دن کا وقت۔ میں دہلی میں اپنے دفتر میں تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ رسیور اٹھایا تو معلوم ہوا کہ حیدرآباد سے جناب احمد بختیار الدین صاحب بول رہے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ساتھیوں کے مشورہ سے حیدرآباد کے اجتماع کے لئے ۳-۴-۵ جون ۱۹۸۸ کی تاریخ طے ہوئی ہے۔ میں نے اپنی ڈائری دیکھ کر ان تاریخوں سے اتفاق کیا، اور دو منٹ کے بعد گفتگو ختم ہو گئی۔

یہ مواصلات (Communication) کا ایک معاملہ تھا۔ موجودہ زمانہ میں مواصلات کی بعد اہمیت ہو گئی ہے۔ قدیم زمانہ میں ایک جگہ سے دوسری جگہ پیغام پہنچانے کے لئے ہفتوں اور مہینوں لگ جاتے تھے۔ جدید مواصلاتی ذرائع کی دریافت نے اس چیز کو ممکن بنا دیا ہے جس کو فوری انتقالِ خبر (Instantaneous transmission) کہا جاتا ہے۔ اور جس کے ذریعہ سے یہ ممکن ہو گیا ہے کہ لکھے یا بولے ہوئے الفاظ کو بلا تاخیر دنیا کے کسی بھی حصے میں پہنچایا جا سکے (10/655)۔

یہ اللہ تعالیٰ کی بڑی عجیب نعمت ہے۔ اس نے انسانی شخصیت کو آفاقی وسعت دیدی ہے۔ اس نعمت کا سب سے زیادہ استعمال دعوت کے لئے ہونا چاہئے تھا۔ مگر آج اس کا سب سے کم استعمال جہاں ہو رہا ہے وہ دعوت ہی ہے۔ کچھ لوگ اپنے دعوے کے مطابق جدید ذرائع کو دعوت میں استعمال کر رہے ہیں۔ مگر یہ محض غلط فہمی ہے۔ یہ لوگ جس کام میں مشغول ہیں وہ مناظرہ بازی، سیاسی جھگڑے اور دنیوی ہنگامے ہیں نہ کہ حقیقۃً دعوت الی اللہ۔ مسلمانوں کی موجودہ سرگرمیاں دراصل ان کے قومی فخر کا اظہار ہیں۔ جب کہ دعوت الی اللہ وہ مقدس عمل ہے جو ایک طرف خوف خداوندی اور دوسری طرف شفقت انسانی کے جذبہ کے تحت ظاہر ہوتا ہے۔

دہلی سے حیدرآباد کا سفر انڈین ایرلائنز کی فلائٹ نمبر ۴۳۹ کے ذریعہ ہوا۔ ۲ جون ۱۹۸۸ کی صبح کو حیدرآباد کے ہوائی اڈہ پر اترا تو وہاں ۳۱ درجہ گرمی تھی اور تیز ہوا چل رہی تھی۔ ہوائی جہاز سے ہوائی اڈہ کی عمارت تک پیدل سفر کرنا تھا۔ میں چل رہا تھا کہ میری دوپلی ٹوپی سر سے اڑ گئی اور وسیع پختہ میدان میں ہوا کے ساتھ تیزی سے بھاگنے لگی۔ میں چند قدم اس کی طرف بڑھا۔ مگر جس تیزی سے وہ

مخالف سمت میں بھاگی جارہی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ میرے جیسے کمزور آدمی کے لیے اس تک پہنچنا ممکن نہیں ہے۔ ہوائی اڈہ کے اسٹاف کا ایک آدمی جو اپنے لباس سے کوئی افسر معلوم ہو رہا تھا، اس نے یہ منظر دیکھا تو وہ اس کو پکڑنے کے لئے آگے بڑھا، اور دوڑ کر ٹوپی کو اٹھا لایا۔ میں نے پوچھا کہ آپ کا نام۔ اس نے اپنا دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا: "گوئل پٹیل"

اس واقعہ کے بعد میں نے سوچا کہ اس دنیا میں ہر آدمی اچھا آدمی ہے۔ وہ صرف اس وقت برا آدمی بن جاتا ہے جب کہ ہم اپنی نادانی سے اس کو چھیڑیں اور اس کی انا کو جگادیں۔ انا کے جاگنے کے بعد اپنی قوم کا آدمی بھی اتنا ہی خونخوار ہو جاتا ہے جتنا کوئی غیر قوم کا آدمی۔

جہاز کے اندر میں اخبار پڑھ رہا تھا۔ آج تمام اخبار میں مسٹر راج کپور کے انتقال کی خبر تھی جن کو ہندستان کا سب سے بڑا نمائشی انسان (Showman) کہا جاتا ہے۔ ایک اخبار نے حسب ذیل الفاظ میں اس کی سرخی لگائی تھی:

The end of a living legend.

میں انھیں خیالات میں تھا کہ اناؤنسر نے اعلان کیا "اب سے کچھ دیر کے بعد ہمارا بمان حیدرآباد اترے گا"۔ میں نے سوچا کہ ایک کا جہاز اتر چکا، دوسرے کا جہاز اترنے والا ہے۔ اسی طرح تمام لوگوں کے "جہاز" خدا کی دنیا میں اتر جائیں گے۔ یہ لمحہ بہر حال ہر ایک پر آنے والا ہے، کوئی اس کو ٹال نہیں سکتا۔ تاہم کسی کے لئے اس کا اترنا محفوظ اترنا (Safe landing) ہوگا، اور کسی کے لئے اس کا اترنا تباہی کا اترنا (Crash landing)۔

حیدرآباد میں میرا قیام جناب حبیب بھائی کی رہائش گاہ پر تھا۔ یہاں لوگ برابر آتے رہے اور ان سے دعوتی و تعمیری موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔ اندازہ ہوا کہ حیدرآباد میں اسلامی مرکز کے پیغام کی اشاعت کا کام کافی بڑھا ہے اور دن بدن بڑھتا جا رہا ہے۔ تعلیم یافتہ طبقہ عام طور پر اس مشن سے واقف ہو چکا ہے۔ الرسالہ اکیڈمی اور دوسرے بہت سے انفرادی اشخاص الرسالہ اور اس کے مشن کو پھیلانے میں مسلسل مصروف ہیں۔

حیدرآباد کا ذکر ہوتا ہے تو لوگ عام طور پر نظام کی دولت کا، چار مینار کا، سالار جنگ میوزیم کا اور اس طرح کی دوسری چیزوں کا ذکر کرتے ہیں۔ مگر میرا ذوق اس معاملہ میں بالکل مختلف ہے۔

حیدرآباد کے تمام معلوم واقعات میں مجھ کو سب سے زیادہ جو واقعہ پسند ہے وہ تقریباً ۸۰ سال پہلے پیش آنے والا واقعہ ہے۔ یہ ڈاکٹر نشی کانت چٹو پادھیا کے قبولِ اسلام کا واقعہ ہے۔

پچھلی صدی میں لاکھوں کی تعداد میں لوگوں نے اسلام قبول کیا ہے۔ ان میں سے بہت سے لوگوں کے حالات زندگی میں نے پڑھے ہیں۔ مگر جس گہرے شعور کے ساتھ ڈاکٹر چٹو پادھیا نے اسلام قبول کیا، اس کی مثال، میرے علم کی حد تک کسی دوسرے کے یہاں نہیں ملتی۔

اگھورناتھ چٹو پادھیا ایک بنگالی برہمن تھے۔ انھوں نے بنگال سے آکر حیدرآباد میں رہائش اختیار کی۔ یہاں وہ نظام کالج کے پرنسپل تھے۔ سروجنی نائیڈو (۱۸۷۹ - ۱۹۴۹) انھیں کی بڑی صاحبزادی تھیں جنھوں نے اپنی مختلف خصوصیات کی بنا پر کافی شہرت حاصل کی۔ بوقت انتقال وہ اترپردیش کی گورنر تھیں۔

ڈاکٹر نشی کانت چٹو پادھیا اسی خاندان کے ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ فرد تھے۔ وہ مہاراجہ کالج میسور میں تاریخ کے استاد تھے۔ اس کے بعد وہ حیدرآباد کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ وہ بیک وقت کئی زبانیں جانتے تھے۔ ان کے اندر حق کی تلاش کا جذبہ ابھرا۔ انھوں نے مختلف ممالک کا سفر کیا۔ فلسفہ اور مذہب کا نہایت تفصیلی مطالعہ کیا۔ آخر میں وہ اسلام کی صداقت پر مطمئن ہوئے اور اسلام قبول کرکے اپنا نام محمد عزیز الدین رکھا۔ ان کی دو کتابیں برٹش میوزیم (لندن) میں موجود ہیں جن کو اسی زمانہ میں لوزاک (Luzac and Sons) نے چھاپا تھا۔ ان کتابوں کو جناب حسن الدین احمد صاحب نے دوبارہ چھپوا دیا ہے۔ ان کے نام یہ ہیں:

1. *Muhammad: The Prophet of Islam*
2. *Why Have I Accepted Islam*

یہ دونوں دراصل دو لکچر ہیں جو بالترتیب ۵ نومبر ۱۹۰۴ اور ۲۶ نومبر ۱۹۰۴ کو حیدرآباد میں دئے گئے۔ ایک لکچر میں انھوں نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ حیدرآباد میں اسلامی دعوت کا ایک سنٹر قائم کیا جائے (ملاحظہ ہو عظمت قرآن، صفحہ ۳۶ - ۱۴۵)۔ یہ بلاشبہ اہم ترین بات تھی جو ایک بندۂ خدا کی زبان سے ادا ہوئی۔ مگر اس تجویز پر ۸۰ سال بیت گئے اور کسی نے اس کی طرف توجہ نہ دی۔ راقم الحروف نے ۱۹۸۳ میں اس مقصد کے لئے حیدرآباد میں ایک دعوتی مرکز قائم کرنا چاہا۔ اس کی عملی

صورتیں بھی پیدا ہوئیں ۔ مگر جلد ہی لوگوں کی بے حسی اور اخلاقی پستی نے اس قیمتی منصوبہ کو خاک میں ملا دیا۔

خلیفہ چہارم حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جب حالات میں بگاڑ پیدا ہوا تو کچھ لوگوں نے حضرت علی سے پوچھا کہ کیا وجہ ہے کہ عمر فاروق کے زمانہ میں حالات درست تھے اور آپ کے زمانہ میں حالات بگڑ گئے۔ اس کے جواب میں حضرت علی نے فرمایا کہ "عمر کے ساتھی میرے جیسے لوگ تھے، میرے ساتھی تمہارے جیسے لوگ ہیں۔" حقیقت یہ ہے کہ ہر منصوبہ سب سے پہلے قابل اعتماد افراد چاہتا ہے۔ اگر قابل اعتماد افراد حاصل نہ ہوں تو بہتر سے بہتر منصوبہ بھی زیر عمل نہیں لایا جاسکتا، حتی کہ "خلیفہ راشد" کی موجودگی میں بھی نہیں۔

۱۸۵۷ کی "جنگ آزادی" انگریزوں اور ہندستانیوں کے درمیان تھی۔ اس جنگ میں حیدر آباد کے مسلم حکمراں (نظام) نے انگریزوں کا ساتھ دیا۔ قومی اصطلاح میں یہ واضح طور پر "غداری" کا کیس تھا۔ مگر بعد کی تقریباً سو برس کی تاریخ بتاتی ہے کہ "غدار نظام" سے ملت کو بے شمار فائدے پہنچے۔ جب کہ "مجاہد نظام" سے ملت کو کسی بھی قسم کا کوئی مثبت فائدہ نہ پہنچ سکا۔

موجودہ زمانہ میں بیشتر اسلامی ادارے عربوں کے "پٹرو ڈالر" کی امداد پر چل رہے ہیں۔ تمام مشہور شخصیتوں کے پیچھے یہی پٹرو ڈالر کی طاقت ہے۔ پٹرو ڈالر کے ظہور سے پہلے یہی حیثیت نظام حیدر آباد کو حاصل تھی۔ اس زمانہ میں برصغیر کے اکثر اسلامی ادارے نظام کے مالی تعاون کی بنیاد پر چل رہے تھے۔ اسی طرح حیدر آباد کے نواب نے دوسرے بہت سے ملی مفاد والے کام کئے ہیں جن کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔

پچھلے ڈیڑھ سو برس کی تاریخ ہنگامہ خیز مسلم تحریکوں کی تاریخ ہے۔ ان تحریکوں نے مسلمانوں کے جان و مال کو برباد تو ضرور کیا جس کو بطور خود انھوں نے قربانی کا شاندار نام دیا ہے۔ مگر ان میں کوئی بھی قابل ذکر مسلم تحریک نہیں جس نے مسلمانوں کو حقیقی معنوں میں کوئی مثبت فائدہ پہنچایا ہو۔ اس کا کم از کم ایک بنیادی سبب یہ تھا کہ ان تحریکوں کے قائدین نے ممکن اور ناممکن کے فرق کو نہیں سمجھا۔ وہ ممکن کو چھوڑ کر ناممکن کے پیچھے دوڑتے رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ممکن کو حاصل کرنے میں بھی ناکام رہے۔

اس کی ایک مثال "ریاست حیدر آباد" کا معاملہ ہے جو ۱۹۴۷ کے انقلاب کے دوران طوفان

رح اٹھا اور گرد و غبار کی طرح ختم ہوگیا۔ اس کی وجہ ہمارے قائدین کی یہی غیر حقیقت پسندانہ سیاست
۔ انھوں نے اس راز کو نہیں جانا جس کو ایک مفکر نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے کہ سیاست ممکن کا
ہے:

(Politics is the art of possible).

یہاں میں سابق پاکستانی وزیر اعظم چودھری محمد علی (۵۶-۱۹۵۵) کا ایک اقتباس نقل کروں گا۔
اقتباس سے ظاہر ہے کہ خود پاکستانی لیڈر کے اپنے بیان کے مطابق ۴۰ سال پہلے حیدر آباد اور کشمیر
لہ میز پر حل ہو رہا تھا۔ مگر مسلم لیڈروں نے حقائق کو نہیں سمجھا۔ وہ بیک وقت دو خرگوشوں کے پیچھے
تے رہے، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ان میں سے ایک کو بھی نہ پکڑ سکے۔

قدیم حیدر آباد میں چھوٹی سطح پر علم کا وہی چرچا تھا جو زیادہ بڑی سطح پر قدیم بغداد میں پایا
تھا۔ مفتی محمد سعید صاحب (۱۸۹۵-۱۸۳۱) ریاست حیدر آباد میں عدالت العالیہ کے مفتی تھے۔ ان کو
وں کا اس قدر شوق تھا کہ اپنی آمدنی کا چوتھائی حصہ مستقل طور پر کتابوں کے حصول میں صرف کیا کرتے
انھوں نے مکہ، مدینہ، بغداد، دمشق، قاہرہ وغیرہ کے کتب خانوں سے نایاب علمی کتابوں کی نقلیں
ائیں۔ ہندستان میں اور عالم اسلام کے بڑے بڑے شہروں میں ان کے کاتب مقرر تھے جو نایاب کتابیں

Sardar Patel, although a bitter enemy of Pakistan, was a greater real than Nehru. In one of the discussions between the two Prime Ministers, which Patel and I were also present, Liaquat Ali Khan dwelt at length on t inconsistency of the Indian stand with regard to Junagadh and Kashmir. Junagadh, despite its Muslim ruler's accession to Pakistan belonged to Inc because of its Hindu majority, how could Kashmir, with its Muslim majori be a part of India simply by virtue of its Hindu ruler having signed a con tional instrument of accession to India? If the instrument of accession sign by the Muslim ruler of Junagarh was of no validity, the instrument of acc sion signed by the Hindu ruler of Kashmir was also invalid. If the will of t people was to prevail in Junagadh, it must prevail in Kashmir as well. Inc could not claim both Junagadh and Kashmir. When Liaquat Ali Khan ma these incontrovertible points, Patel could not contain himself and burst o "Why do you compare Junagadh with Kashmir? Talk of Hyderabad and Kas mir, and we could reach an agreement." Patel's view at this time and ev later was that India's effort to retain Muslim majority areas against the will the people was a source not of strength but of weakness to India. He felt th if India and Pakistan agreed to let Kashmir go to Pakistan and Hyderabad India, the problems of Kashmir and of Hyderabad could be solved peacefu and to the mutual advantage of India and Pakistan.

Chaudhry Muhammad Ali, *Emergence of Pakistan*, pp. 299-

نقل کرکے برابر ان کے پاس بھیجا کرتے تھے۔ یہ تمام ذخیرہ اب بھی کتب خانہ سعیدیہ کی صورت میں موجود ہے۔

اس خاندان کے ایک فرد ڈاکٹر یوسف الدین صاحب ایک بار دمشق گئے۔ پروفیسر صلاح الدین المنجد نے وہاں کا مشہور کتب خانہ ظاہریہ کا معائنہ کراتے ہوئے ان سے کہا: ہندستان کے مسلمان جب ہمارے ملک میں آتے ہیں تو وہ یہاں کی قبروں کی زیارت کے لئے جاتے ہیں، وہ ہماری کتابوں سے نہیں ملتے۔ دیکھئے، اس کتب خانہ میں دس ہزار نایاب کتابیں ہیں۔

ڈاکٹر یوسف الدین نے ان سے خاص خاص نایاب کتابوں کو دکھانے کی فرمائش کی۔ پروفیسر صلاح الدین المنجد نے ابن عساکر کی تاریخ دمشق منگوائی اور کہا کہ یہ ہمارے اس کتب خانہ کی سب سے زیادہ قدیم کتاب ہے۔ مگر یہ نامکمل ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اس کے بقیہ اجزاء کہاں مل سکتے ہیں۔ ڈاکٹر یوسف الدین نے کتاب کو دیکھ کر فوراً کہا: "حیدرآباد کے کتب خانہ سعیدیہ میں اس نایاب کتاب کے بقیہ اجزاء موجود ہیں"۔ (انجمن، از ڈاکٹر حسن الدین احمد، صفحہ ۱۱۵)

یہ قدیم حیدرآباد کا حال تھا۔ آج حیدرآباد کے مسلمانوں کے پاس پہلے سے بھی زیادہ دولت موجود ہے مگر آج ان کی دولت کا مصرف علم نہیں۔ آج وہ اپنی دولت کو ایسی بے معنی مدوں میں ضائع کر رہے ہیں جن کا نہ علم سے کوئی تعلق ہے اور نہ عقل سے۔

حیدرآباد کی سڑکوں پر چلتے ہوئے ایک جگہ آپ کو ایک اونچے مینار پر اقبال کے شاہین کی تصویر بنی ہوئی دکھائی دے گی۔ یہ مینار اقبال ہے۔ اقبال کی ۵۰ ویں برسی کے موقع پر اپریل ۱۹۸۸ میں اس کی نقاب کشائی چیف منسٹر مسٹر این ٹی راما راؤ نے کی۔ اس کے چاروں طرف اقبال کے تین شعر اردو ہندی، انگریزی اور تلگو زبان میں لکھے ہوئے ہیں۔

اقبال کو مفکر پاکستان کہا جاتا ہے۔ ایسی حالت میں ہندستان میں اقبال کی پذیرائی اس بات کا ثبوت ہے کہ ہندستان میں اختلافات کے باوجود اعتراف کا ماحول ہے۔ یہاں مسلمانوں کو مسلمان رہتے ہوئے وہ تمام مواقع حاصل ہیں جو کسی دوسرے فرقہ کو حاصل ہو سکتے ہیں۔ تاہم مواقع کو استعمال کرنے کے لئے آدمی کو خود بھی ایک قیمت دینی پڑتی ہے۔ مسلمان اگر یہ ضروری قیمت ادا نہ کریں تو ان کے لئے نہ ہندستان میں کوئی موقع ہے اور نہ پاکستان میں۔ حتی کہ مکہ مدینہ میں بھی نہیں۔

۱۱ اگست ۱۹۸۸

حیدر آباد میں جن لوگوں سے ملاقات ہوئی ان میں سے ایک مسٹر مدھوسدن ریڈی (پیدائش ۱۹۲۶) ہیں وہ ۱۹۸۳ میں ڈپٹی ڈائرکٹر (پلاننگ) کے عہدہ سے ریٹائر ہوئے۔ وہ الرسالہ کے مستقل قاری ہیں اور اکثر کتابیں بھی پڑھ چکے ہیں۔

مسٹر ریڈی نے بتایا کہ راقم الحروف کے حیدر آباد پہنچنے سے ایک دن پہلے انھوں نے خواب دیکھا کہ مسز اندرا گاندھی ان کے یہاں آئی ہیں۔ وہ مسٹر ریڈی سے کہہ رہی ہیں کہ "مجھے معلوم ہوا ہے کہ مولانا وحید الدین خاں یہاں آئے ہیں۔ میں ان سے ملنا چاہتی ہوں۔ مجھ کو لے جا کر ان سے ملا دو"۔ اس خواب کی حقیقت کے بارہ میں مزید مجھے کچھ نہیں معلوم۔ میں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ ۳ جون کو مسٹر ریڈی نے حبیب بھائی کی قیام گاہ پر کئی لوگوں کے سامنے اپنا یہ خواب بیان کیا۔

ایک صاحب نے کہا کہ آپ کی بہت سی باتوں سے مجھے اتفاق ہے۔ مگر آپ کی یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ آپ مسلمانوں کو بس صبر و اعراض ہی کا سبق دیتے رہتے ہیں۔ حالاں کہ اسلام میں سب سے بڑی چیز جہاد و قتال ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے جہاد و قتال کو منسوخ ہی کر دیا ہے۔

میں نے کہا کہ جہاد کو میں نے منسوخ نہیں کیا، بلکہ مشروط کیا ہے۔ آپ قرآن و سنت کی روشنی میں غور کیجئے تو معلوم ہوگا جہاد (بمعنی قتال) کچھ لازمی شرطوں کے ساتھ مشروط ہے۔ پہلی بات یہ کہ نزاع کو یک طرفہ طور پر اوائڈ کرتے ہوئے دعوت دینا اور اس وقت تک صرف صبر و برداشت پر قائم رہنا جب تک دعوت پوری طرح مدعو تک پہنچ نہ جائے۔ اس کے بعد مدعو سے علیحدگی جس کو ہجرت کہا گیا ہے مدعو کے ساتھ مخلوط آبادی میں جہاد نہیں۔ تیسری چیز یہ کہ قوت کی فراہمی، یہاں تک کہ وہ درجۂ ارہاب تک پہنچ جائے۔ چوتھی چیز ہے باہمی اختلاف کا خاتمہ، کیوں کہ مسلمانوں کے درمیان اگر اختلاف کی حالت ہو تو پیغمبر کی موجودگی میں بھی شکست ہو جائے گی، جیسا کہ احد کے موقع پر ہوا۔ میں نے کہا کہ یہ سب جہاد کی ناگزیر شرطیں ہیں۔ ان شرطوں کی تکمیل کے بغیر جو جہاد کیا جائے وہ محض قومی لڑائی ہے نہ کہ اسلامی جہاد۔

حیدر آباد میں مولانا محمد رضوان القاسمی سے ملاقات ہوئی۔ وہ یہاں کامیابی کے ساتھ ایک دینی ادارہ چلا رہے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ حال میں انھوں نے عرب امارات کا سفر کیا تھا۔ وہاں ان کی ملاقات ایک صاحب سے ہوئی جنھوں نے ہمارے یہاں کی کتاب "خاتون اسلام" پڑھی تھی۔

انھوں نے کہا کہ اس موضوع پر اب تک جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں، ان میں خاتون اسلام سب سے بہتر کتاب ہے۔

حیدر آباد کے قریبی مقامات سے بھی کئی لوگ آگئے تھے مثلاً رائچور، نانڈیڑ، میدک، وغیرہ۔ عبداللہ صاحب پر بھنی نے بتایا کہ ایک صاحب نے ان سے کہا کہ "مولانا ہماری جو خرابیاں بتاتے ہیں، وہ ہم سے کہیں۔ اس کو الرسالہ میں کیوں چھاپتے ہیں کہ مشرکین کو اس کی خبر ہو جائے"۔ عبداللہ صاحب نے جواب دیا کہ آپ کو مشرکین کا خوف ہے، مگر فرشتوں کا خوف نہیں۔ مشرکین تو بتانے کے بعد جانیں گے۔ مگر ہمارے دونوں کندھوں پر جو فرشتے بیٹھے ہوئے ہیں وہ تو بتائے بغیر ہر بات جانتے ہیں اور ان کو مسلسل لکھ رہے ہیں"۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ الرسالہ اپنے پڑھنے والوں کے اندر کس قسم کا ذہن بنا رہا ہے۔

اس سفر میں کچھ باتیں بہت غیر معمولی ہوئیں جو اس سے پہلے کسی سفر میں پیش نہیں آئی تھیں۔ ۳ جون کو ملے پلی کی بڑی مسجد میں جمعہ سے پہلے میرا خطاب تھا۔ میں نے اپنی تقریر اس جملہ سے شروع کی کہ "نماز انسانی زندگی کا حسن ہے"۔ اور پھر آدھ گھنٹہ تک قرآن و حدیث کی روشنی میں اس کی وضاحت کرتا رہا۔

میں اپنی بات پوری کر کے بیٹھ گیا۔ اس کے بعد دوسری اذان ہوئی اور خطیب صاحب نے منبر پر کھڑے ہو کر عربی زبان میں خطبہ دینا شروع کیا۔ اچانک آواز آئی "قال الشیخ وحید الدین" ایک سکنڈ کے لئے میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ اس کے بعد ان کا مزید خطبہ سننے کے بعد معلوم ہوا کہ وہ میری اردو تقریر کا خلاصہ اپنے عربی خطبہ میں پیش کر رہے ہیں۔ یہ میری زندگی کا پہلا تجربہ تھا۔ ایک صاحب نے کہا کہ یہ واقعہ اس بات کی علامت ہے کہ اب وہ وقت آگیا ہے کہ الرسالہ کی بات کی تائید مساجد کے منبر سے بھی ہونے لگے۔

دوسرا تجربہ اس کے برعکس ۵ جون کی دوپہر کو ہوا۔ اردو گھر میں تقریر تھی۔ عنوان تھا "ایمان کی حقیقت"۔ میں قرآن و حدیث کی روشنی میں ایمان کی حقیقت اور اس کے تقاضوں کو بیان کر رہا تھا کہ اچانک چند نوجوان اسٹیج پر آئے۔ ان کے ہاتھ میں کاغذ پر لکھا ہوا کوئی سوال تھا۔ انھوں نے زور زور سے کہنا شروع کیا کہ پہلے اس کا جواب دو۔ ہم اس وقت تک تقریر ہونے نہیں دیں گے جب تک

ہمارے سوال کا جواب نہ دے دیا جائے۔ مولانا اکبرالدین قاسمی صاحب نے اعلان کیا کہ آپ اپنا سوال صدر جلسہ کو دیدیں۔ تقریر پوری ہونے کے بعد اس کا جواب دیا جائے گا۔ مگر نوجوان مسلسل شور کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ پہلے سوال کا جواب دو، ورنہ ہم تقریر ہونے نہیں دیں گے

یہ نوجوان صرف تین یا چار تھے اور بھرے ہوئے ہال کے تمام لوگوں کو ان سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ لوگ صرف راقم الحروف کی تقریر سننے سے دلچسپی رکھتے تھے۔ چنانچہ سامعین نے چند منٹ میں ان لوگوں کو پکڑ کر باہر کر دیا۔ ایک صاحب نے بعد کو مجھے ایک پمفلٹ دکھایا اور بتایا کہ یہ ان شورش پسند نوجوانوں میں سے ایک شخص کے پاس سے ملا ہے۔ ایک سے زیادہ آدمیوں نے کہا کہ میں ان نوجوانوں کو جانتا ہوں۔ یہ ایک اسلامی تحریک کی "یوتھ ونگ" سے تعلق رکھتے ہیں۔

اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے بعض اصحاب نے کہا کہ پچھلے دن گاندھی بھون میں آپ کا جو اجتماع تھا، اس کی غیر معمولی کامیابی کو دیکھ کر آپ کے مخالفین بوکھلا اٹھے، ان کا یہ اقدام دراصل ان کے احساس شکست کا اظہار تھا جو الرسالہ کے بڑھتے ہوئے مشن کے حق میں زبردست اعتراف کی حیثیت رکھتا ہے۔

آج کل ایک بہت بڑا فتنہ پیدا ہوا ہے۔ یہ وہی ہے جس کو عام طور پر نوجوان دستہ یا یوتھ ونگ (Youth wing) کہا جاتا ہے۔ تمام سیاسی جماعتوں نے ہنگامہ پسند نوجوانوں کو اپنے گرد جمع کر رکھا ہے۔ وہ ہر طرح ان کی سرپرستی کرتی ہیں۔ اور مختلف مواقع پر اپنے مخالفین کو گرانے کے لئے انہیں استعمال کرتی ہیں۔

موجودہ زمانہ کی نام نہاد اسلامی جماعتوں کو پیغمبر کی زندگی میں کوئی اسوہ نہیں ملا۔ البتہ انھوں نے سیاسی جماعتوں کی تقلید میں خود بھی یہی کام شروع کر رکھا ہے۔ یہ جماعتیں مسلم نوجوانوں کو منظم کرتی ہیں تاکہ توڑ پھوڑ اور ہڑبونگ کا جو کام وہ خود نہیں کر سکتیں، اس کو ان نوجوانوں کے ذریعہ کرائیں۔ یہ نوجوان بظاہر اپنے آپ کو مسلم داعی کہتے ہیں، مگر حقیقۃً وہ مسلم دادا ہیں۔ وہ ہر جگہ صرف ایک کام کر رہے ہیں۔ اسلام کے نام پر تخریب کاری۔ یہ لوگ ہر مسلم ملک میں حکمرانوں کے خلاف وہی شور و غل اور تشدد کر رہے ہیں جو انھوں نے ۲۲ جون کو راقم الحروف کے اجتماع میں کیا۔ فرق صرف یہ ہے کہ میں نے اس ہنگامہ بازی پر صبر کر لیا۔ اور جن لوگوں کے پاس اقتدار ہے وہ ان کے "چہرے" کے

جواب میں ان پر تلوار چلا رہے ہیں۔ مختلف ملکوں میں آج اسلامی کام کرنے میں جو رکاوٹیں پیدا ہو گئی ہیں، اس کی ذمہ داری سب سے زیادہ انھیں مسلم نوجوانوں پر ہے جو اسلامی جماعتوں کی سرپرستی میں ہر جگہ خود ساختہ جہاد کا جھنڈا اٹھائے ہوئے ہیں۔ اس کی براہ راست ذمہ داری مسلم نوجوانوں پر ہے اور بالواسطہ ذمہ داری اسلامی جماعتوں پر۔

گاندھی بھون میں جو خطاب (۴ جون) ہوا، اس کا عنوان تھا: اسلام دورِ جدید کا خالق۔ وسیع ہال، اخباری زبان میں "کھچا کھچ" بھرا ہوا تھا۔ جناب سید مظفر شاہ صاحب اس کے صدر تھے۔ وہ نہ صرف حیدرآباد کی ممتاز شخصیت ہیں، بلکہ ساتھ ہی دینی اور اسلامی مزاج رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ میں بمبئی میں تھا۔ مگر اس عنوان کی کشش کی بنا پر جلدی کرکے حیدرآباد

پروگرام حیدرآباد ، محبوب نگر

۳ جون ۱۹۸۸	جامع مسجد معظم پورہ ، ملے پلی	عنوان : نماز زندگی کا حسن ہے
	مولانا آزاد انسٹی ٹیوٹ ، باغ عامہ	
	زیر صدارت جناب میر اکبر علی خاں صاحب سابق گورنر	دعوت کی تسخیری قوت
۴ جون ۱۹۸۸	مسجد سلطان جہاں بیگم ، مصری گنج	جنت اور جہنم قرآن وحدیث میں
	مسجد سلیم خاتون ، حمایت نگر	حمد خلاصۂ دین ہے۔
	مسجد عامرہ ، عابد روڈ	اسلام کا عقیدۂ آخرت
	پرکاشم ہال ، گاندھی بھون	
	زیر صدارت جناب سید مظفر شاہ صاحب سابق چیرمین کونسل	اسلام دور جدید کا خالق۔
۵ جون ۱۹۸۸	اردو گھر ، مغل پورہ	
	زیر صدارت جناب سید حسن الدین صاحب آئی اے ایس	ایمان باللہ کی حقیقت
	لائبریری مدرسہ سراج العلوم ، محبوب نگر	دینی مدارس کا رول۔
	کریسنٹ پبلک اسکول ، محبوب نگر	
	زیر صدارت ، شری رام چندر ریڈی	علم کی اہمیت اسلام میں

واپس آگیا تاکہ آج کی تقریر سن سکوں۔

اس موضوع پر وہاں جو باتیں کہی گئیں، ان کو مزید اضافہ کے ساتھ مرتب کیا جا رہا ہے۔ ارادہ ہے کہ انشاء اللہ اس کو الرسالہ کے خصوصی نمبر کے طور پر شائع کر دیا جائے۔

۵ جون کو "اردو گھر" میں اجتماع تھا۔ میں پہنچا تو ہال پوری طرح بھر چکا تھا۔ مجھ کو دیکھتے ہی ایک بزرگ چیخ کر اٹھے اور مجھ سے لپٹ کر رونے لگے۔ وہ کہہ رہے تھے "میرے پیارے تم آگئے، خدا تمھیں بہت دن تک اس کام کے لئے زندہ رکھے" اس طرح آج خدا کے فضل سے بے شمار لوگ ہیں جو الرسالہ میں سچائی کی روشنی پا رہے ہیں۔

جناب سید کشور شاہ صاحب (سابق چیرمین لیجسلیٹو کونسل) نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ میں برابر الرسالہ پڑھتا ہوں اور اس سے پوری طرح متفق ہوں۔ جناب عارف الدین صاحب (مدینہ ٹیکنکل کالج) نے بھی اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا۔ جناب ایم اے ستار یہاں فرنیچر کا کاروبار کرتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ میں مذہبی کتابیں بالکل نہیں پڑھتا تھا۔ مگر جب سے الرسالہ ملا ہے، میرا ذہن بدل گیا ہے۔ میں پابندی سے الرسالہ اور دوسری کتابوں کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ وغیرہ

تاہم بعض لوگ ایسے بھی ملے جن کو الرسالہ سے شکایت تھی۔ انھوں نے کہا کہ الرسالہ میں ہمیشہ مسلمانوں ہی کو نصیحت کی جاتی ہے۔ اس میں اکابر قوم پر تنقیدیں ہوتی ہیں۔

میں نے پہلے ان کو یہ بتلانے کی کوشش کی کہ الرسالہ میں جو بات کہی جاتی ہے وہ قرآن وحدیث کے حوالے سے کہی جاتی ہے۔ اس لئے آپ الرسالہ کی بات کو قرآن وحدیث کے معیار پر جانچیں نہ کہ کسی اور معیار پر۔ جب وہ اس ڈھنگ سے سوچنے کے لئے تیار نہیں ہوئے تو میں نے ان کے سامنے دوسری بات رکھی۔

میں نے کہا کہ دنیا میں دو قسم کے حیوانات ہیں۔ ایک گائے جس کی خوراک گھاس ہے۔ اور دوسرے درندہ جس کی خوراک گوشت ہے۔ آپ درندہ کو گھاس نہیں کھلا سکتے۔ اور اگر آپ گائے کے منھ میں گوشت ڈالیں تو وہ اس کو اگل دے گی۔ یہی معاملہ انسانوں کا ہے۔ انسانوں میں مختلف قسم کے لوگ ہیں اور الرسالہ بہرحال ہر ایک کی غذا نہیں بن سکتا۔

جو لوگ ذاتی فخر میں جیتے ہوں۔ جنھوں نے خدا کے بجائے انسانوں کو اپنا بڑا بنا رکھا ہو۔ جن کی روح

ں سے تسکین ملتی ہو کہ وہ اپنی غلطی کے لئے دوسروں کو ذمہ دار ٹھہرائیں۔ جن کو اعتراف کے بجائے
نی میں لذت ملتی ہو۔ جو خیالی الفاظ میں لطف لیتے ہوں اور جن کو حقائق سے کوئی دلچسپی نہ ہو ایسے
الرسالہ سے مختلف مزاج رکھتے ہیں۔ وہ الرسالہ کی باتوں میں اپنی خوراک نہیں پا سکتے۔
الرسالہ صرف سنجیدہ اور حقیقت پسند لوگوں کی غذا ہے۔ اور ہمیں اس پر کوئی شرمندگی نہیں
یر سنجیدہ اور غیر حقیقت پسند لوگ الرسالہ میں اپنی غذا نہ پائیں۔

حیدر آباد میں "باغ عامہ" کی تقریر کے بعد ایک صاحب نے تحریری سوال کیا: "دعوت
میدان کیا صرف نظریاتی وفکری میدان ہی ہے یا میدان جنگ بھی؟" میں نے کہا کہ دعوت کا
لب یہ نہیں ہے کہ آپ لوگوں کے اوپر تلوار زنی کریں۔ دعوت کا مطلب یہ ہے کہ آپ لوگوں کو اپنے
اتھ جنت کا ہم سفر بنائیں۔ اس قسم کا کام ہمیشہ محبت کے ذریعہ ہوتا ہے نہ کہ نفرت اور تشدد
کے ذریعہ۔

جناب احمد بختیار الدین صاحب نے اپنے ذاتی اہتمام کے تحت حیدر آباد کے تین پروگراموں
کا ویڈیو کیسٹ تیار کرایا۔ موجودہ زمانہ میں ویڈیو کیسٹ کا طریقہ بہت عام ہو رہا ہے۔ چنانچہ لوگ
ہم سے بھی تقاضا کر رہے ہیں کہ جس طرح اس سے پہلے آڈیو کیسٹ تیار کرائے گئے تھے، اسی طرح
ویڈیو کیسٹ بھی تیار کرائے جائیں۔

مسجد سلطان جہاں بیگم سے ملا ہوا جناب حسام الدین صاحب کا کارخانہ (پروین پرنٹنگ ورکس) ہے۔
مسجد میں خطاب کے بعد حسام الدین صاحب اپنے کارخانہ میں لے گئے۔ اس کارخانہ میں رنگین ساڑیاں
تیار کی جاتی ہیں۔ معلوم ہوا کہ بُنی ہوئی ساڑی بھیونڈی وغیرہ سے آتی ہے۔ ابتداءً وہ صاف
رنگ کی نہیں ہوتی۔ یہاں کارخانہ میں سب سے پہلے اسے سفید بنایا جاتا ہے۔ پھر مختلف مراحل
سے گزارتے ہوئے وہ رنگین چھپی ہوئی ساڑی کے مرحلہ تک پہنچتی ہے۔ یہاں تک کہ تہہ کر کے اس
کو پلاسٹک کے تھیلے میں رکھ دیا جاتا ہے تاکہ بازار میں فروخت کے لئے بھیجا جا سکے۔

میں نے پوچھا کہ ابتدا سے آخر تک اس پر کتنے مراحل گزرتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ تقریباً
بارہ مرحلے۔ اس سے پہلے کپاس کے مرحلہ سے بُنی ہوئی ساڑی کے مرحلہ تک پہنچنے کے لئے بھی تقریباً
اتنے ہی مراحل گزرتے ہیں۔ میں نے سوچا کہ کپاس سے ساڑی بنانے کے لئے اس کو "۲۴ مرحلے"

سے گزارنا ہوتا ہے۔ تب وہ اس کپڑے کی صورت اختیار کرتی ہے جو جسم کو ڈھانپنے اور انسان کی تزئین کا ذریعہ بنے۔ مگر موجودہ زمانہ میں ہمارے درمیان ایسے رہنما اٹھے جو "ملت" کو بنانے کے لئے کسی مرحلہ اور تدریج کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ ان کا خیال ہے کہ نعرہ لگاؤ اور ملت کی تعمیر کا گنبد اگلے دن کھڑا ہوا نظر آئے گا۔

۵ جون ۱۹۸۸ کو دوپہر بعد حیدر آباد سے محبوب نگر کے لئے روانگی ہوئی۔ راستہ میں ایک جگہ سڑک کے کنارے بورڈ لگا ہوا تھا کہ حفاظت پہلے اور رفتار پیچھے:

Safety first, speed next.

اس کو دیکھ کر خیال آیا کہ آدمی اگر اپنے آپ میں گم ہو جائے تو وہ "اسپیڈ" کو اہمیت دے گا۔ اور اگر وہ جانے کہ سڑک پر وہ تنہا نہیں ہے، بلکہ بہت سے دوسرے لوگ بھی یہاں اپنی اپنی دوڑ لگا رہے ہیں تو وہ "سیفٹی" کو سب سے زیادہ اہم سمجھے گا۔ یہی وسیع تر زندگی کا اصول بھی ہے سڑک کا وہی مسافر حفاظت کے ساتھ اپنی منزل پر پہنچتا ہے جو دوسروں کی رعایت کرتے ہوئے اپنا سفر جاری کرے۔ اسی طرح زندگی میں وہی شخص محفوظ رہ سکتا ہے جو دوسروں کی سرگرمیوں پر نگاہ رکھے اور دوسروں کا لحاظ کرتے ہوئے اپنی زندگی کا سفر طے کرے۔ یہاں دوسرے کو "فرسٹ" بنانا پڑتا ہے اور اپنے آپ کو "نکسٹ"۔ اس کے بعد ہی یہ ممکن ہوتا ہے کہ آدمی اس دنیا میں اپنی مطلوبہ منزل پر بحفاظت پہنچ سکے۔

محبوب نگر میں دو پروگرام ہوئے۔ یہاں مدرسہ سراج العلوم مولانا امیر اللہ خاں کی زیر نگرانی چل رہا ہے۔ مجھے اس کی لائبریری اور اسٹاف کوارٹرس کا سنگ بنیاد رکھنے کے لئے بلایا گیا تھا۔ سنگ بنیاد رکھنے سے پہلے ایک جلسہ ہوا جس میں دینی تعلیم اور مدارس عربیہ کی اہمیت پر تقریر کی گئی۔ اس موقع پر میں نے کہا کہ بعض لوگ ناسمجھی کی بنا پر عربی مدارس کا استخفاف کرتے ہیں۔ مثلاً وہ کہتے ہیں کہ ان مدارس میں تحفیظ قرآن کا شعبہ رکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ پریس کے دور میں قرآن کے لاکھوں نسخے چھپ کر ہر جگہ پھیل چکے ہیں۔ ایسی حالت میں قرآن کا حفظ غیر ضروری ہے۔

میں نے کہا کہ یہ حفاظت بالائے حفاظت کا معاملہ ہے۔ جیسے مولانا آزاد کی کتاب کے تیس صفحے بیک وقت دو جگہ محفوظ کئے گئے ہیں، کلکتہ میں اور دہلی میں۔ تاکہ ایک نسخہ اگر کسی وجہ سے ضائع ہو جائے

تو دوسرا نسخہ موجود ہے۔ قرآن کی کاغذی طباعت کے ساتھ قرآن کی صدری تحفیظ اسی قسم کی ایک تدبیر ہے۔ یہ گویا ایک حفاظت کے اوپر دوسری حفاظت کا اضافہ ہے۔ یہ اہتمام مزید کی ایک صورت ہے جو ہر اہم دستاویز کے ساتھ ہمیشہ اختیار کی جاتی ہے۔

محبوب نگر میں کچھ لوگوں نے کریسنٹ پبلک اسکول (انگلش میڈیم) کھولا ہے۔ ۵ جون کی شام کو اس کی افتتاحی تقریب تھی۔ اس کے صدر شری رام چندر ریڈی ایڈوکیٹ تھے۔ مجھ کو اس موقع پر چیف گیسٹ کے طور پر بلایا گیا تھا۔ میں نے اپنی تقریر میں خاص طور پر یہ بتانے کی کوشش کی کہ اسلام علم کے حصول کو کتنی زیادہ اہمیت دیتا ہے۔

اس سلسلہ میں میں نے تاریخ اسلام کا یہ واقعہ پیش کیا کہ بدر کے قیدیوں کے لئے یہ فدیہ مقرر کیا گیا کہ اگر وہ دس مسلم نوجوانوں کو پڑھا دیں تو انھیں چھوڑ دیا جائے گا۔ یہ قیدی بدترین قسم کے جنگی مجرم تھے۔ ان کو چھوڑنے میں واضح طور پر یہ اندیشہ تھا کہ وہ منظم ہو کر دوبارہ مدینہ پر حملہ کریں گے۔ اور فی الواقع انھوں نے غزوۂ احد کی شکل میں ایسا ہی کیا۔ تاہم اس واضح اندیشہ کے باوجود انھیں تعلیم کی خاطر چھوڑ دیا گیا۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسلام میں علم کی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ ہر خطرہ اور اندیشہ کو نظر انداز کر کے اس کو حاصل کیا جانا چاہئے۔ جب علم اور دوسری مصلحتوں کے درمیان انتخاب کا معاملہ ہو تو علم کا انتخاب کیا جائے نہ کہ دوسری مصلحتوں کا۔

محبوب نگر کے تعلیم یافتہ طبقہ میں الرسالہ کافی پھیل رہا ہے۔ اور اس کا ذریعہ ایجنسی ہے۔ اب خدا کے فضل سے ہر جگہ ایسے لوگ پیدا ہو گئے ہیں جو ذاتی دلچسپی کے تحت الرسالہ کی ایجنسی چلاتے ہیں اور مخالفین کی مخالفت کے باوجود پورے عزم کے ساتھ اس تعمیری کام پر جمے ہوئے ہیں۔ انھیں میں سے ایک محبوب نگر کے محمد عقیل احمد خاں ہیں۔ وہ ایک باہمت نوجوان ہیں اور مقصدی لگن کے تحت الرسالہ (اردو، انگریزی) کی ایجنسی نہایت باقاعدگی کے ساتھ چلا رہے ہیں۔

اس قسم کے لوگ بلاشبہ الرسالہ کا سب سے قیمتی سرمایہ ہیں۔ میں نے ایک مجلس میں کہا کہ جس شخص نے الرسالہ کو ایک بار پڑھا اس نے الرسالہ کو نہیں پڑھا، جس نے الرسالہ کو دو بار پڑھا اس نے الرسالہ کو پڑھا۔ اسی طرح جو شخص زبانی طور پر الرسالہ سے اتفاق کرے اس نے الرسالہ سے اتفاق نہیں کیا، الرسالہ سے اتفاق کرنے والا وہ ہے جو الرسالہ کی ایجنسی لے کر اس کو لوگوں کے درمیان

پھیلائے۔ الرسالہ ایک مشن ہے، اور مشن سے اتفاق کبھی جامد ہو کر نہیں رہ سکتا۔ یہ اپنی فطرت کے اعتبار سے ایک توسیعی جذبہ ہے۔ جو اتفاق توسیع نہ بنے وہ اتفاق نہیں۔ جو شخص صاحب الرسالہ ہو مگر وہ صاحب ایجنسی نہ بنے، وہ صاحب الرسالہ بھی نہیں۔

۶ جون کی صبح کو انڈین ایر لائنز کی فلائٹ نمبر ۱۲۰ کے ذریعہ حیدرآباد سے بمبئی کے لئے روانگی ہوئی۔ یہ ایک گھنٹہ اور کچھ منٹ کا سفر تھا۔ اپنے بھتیجے اظفر میاں کے ساتھ ایرپورٹ سے سیدھا ہندوجا اسپتال پہنچا جہاں میرے بڑے بھائی عبد العزیز خاں صاحب زیر علاج تھے۔ ان کو ۲۳ مئی کو برین ہیمرج کا حملہ ہوا۔ اس کے بعد وہ مسلسل بے ہوشی (کوما) میں رہے۔ یہاں تک کہ، جون ۱۹۸۸ کی شام کو ان کا انتقال ہو گیا۔

اسپتال میں آئی سی یو (ICU) کے کمرہ نمبر ۱۴ میں داخل ہوا تو وہاں وہ شخصیت اسپتال کے مخصوص بیڈ پر لیٹی تھی جس کی عیادت کے لئے میں یہاں آیا تھا۔ میں بھائی صاحب کو دیکھ رہا تھا، مگر میں ان سے ربط قائم نہیں کر سکتا تھا۔ کیوں کہ اس وقت ان کے دیکھنے اور بولنے اور سننے کی صلاحیت معطل ہو چکی تھی۔ وہ نہ مجھ کو دیکھ رہے تھے، نہ میرے سلام کا جواب دے سکتے تھے، نہ کسی قسم کی گفتگو ان کے ساتھ ممکن تھی۔ اس وقت وہ مجھ سے دور، مگر اپنے رب سے قریب تھے ——— یہ لمحہ جاننے والوں کے اوپر بھی آجاتا ہے اور نہ جاننے والوں کے اوپر اس وقت آتا ہے جب کہ وہ موت کے دروازے پر پہنچ چکے ہوں: ونحن اقرب الیہ منکم ولکن لا تبصرون (الواقعہ ۸۵)

عبد العزیز خاں صاحب اعظم گڑھ میں غالباً ۱۹۱۴ میں پیدا ہوئے۔ وہ غیر معمولی خصوصیات کے آدمی تھے اور انھوں نے معاشی میدان میں غیر معمولی کامیابی حاصل کی۔ ۱۹۴۲ میں انھوں نے اعظم گڑھ میں بزنس شروع کیا۔ ۱۹۷۲ میں لائٹ اینڈ کمپنی پرائیویٹ لمیٹڈ قائم کی جس کا صدر دفتر الٰہ آباد تھا۔ ۱۹۸۱ میں وہ خود بھی الٰہ آباد منتقل ہو گئے۔ وہ لائٹ اینڈ کمپنی کے چیرمین تھے۔ اس کمپنی نے اپنی غیر معمولی کارکردگی کی بنا پر کئی بڑے بڑے انعامات حاصل کئے ہیں۔ اس کا کام ہے زیادہ طاقت کی بجلی کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے والے بڑے بڑے کھمبوں کی تنصیب:

Erection of extra high voltage transmission lines.

میری زندگی اور میرے مشن سے بھائی صاحب مرحوم کا نہایت گہرا تعلق تھا۔ میرے والد

(فریدالدین خاں مرحوم) کا انتقال ہوا تو اس وقت میری عمر تقریباً ۵ سال تھی۔ چنانچہ میرے بڑے بھائی ہی تمام عمر میرے سرپرست رہے۔ ہر آدمی جب بڑا ہوتا ہے تو اس کو معاشی جدوجہد میں لگنا پڑتا ہے۔ اپنے مزاج کی بنا پر میں نے اس کے برعکس یہ خطرناک راستہ اختیار کیا کہ میں نے حصول معاش کے بجائے حصول علم کو اپنا نشانہ بنایا۔ تعلیم سے فراغت کے بعد لمبا عرصہ ایسا گزرا ہے جب کہ میری ساری توجہ تلاش حق، قرآن وحدیث کا مطالعہ اور دوسرے علوم کی تحقیق میں لگی رہی۔ معروف معنوں میں میں نے کمانے کا کوئی کام نہیں کیا۔

یہ طویل غیر معاشی زندگی زبردست معاشی قیمت مانگتی تھی۔ اس کو مسلسل جاری رکھنے کے لئے ضروری تھا کہ کوئی شخص ہو جو میرے معاشی بوجھ کو اٹھائے، جو میری علمی جدوجہد میں میرا عملی بدل بن جائے۔ میرے بڑے بھائی نے یہ مشکل قیمت ادا کی۔ وہ مسلسل پچاس سال تک میرے سرپرست بنے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں تلاش وتحقیق اور مطالعہ وتجربہ کی طویل اور دشوار مہم کو اس کی آخری منزل تک پہنچانے میں کامیاب ہوا۔ اگر عبدالعزیز خاں صاحب مرحوم میرا معاشی بوجھ نہ اٹھاتے تو شاید میں، بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح، صرف ایک حیوانِ کاسب بن کر رہ جاتا، میں کبھی انکشاف حق کی منزل تک نہ پہنچتا۔

موجودہ دنیا میں کامیاب بننے کے لئے ضروری ہے کہ آدمی دوسروں کے ساتھ مصالحت اور موافقت کی روش اختیار کرے۔ غیر مصالحانہ رویہ (Uncompromising attitude) کسی انسان کے لئے سب سے بڑا قاتل ہے۔ میں اپنے مخصوص مزاج کی بنا پر کسی بھی شخصیت یا کسی بھی گروہ یا حلقہ کے ساتھ مصالحانہ انداز اختیار نہ کر سکا۔ میں نے ہمیشہ سچائی کا لحاظ کیا نہ کہ شخصیتوں اور جماعتوں کا۔

بلاشبہ یہ ایک بے حد خطرناک معاملہ تھا۔ ہر ایک کے ساتھ غیر مصالحانہ روش اختیار کرنے کے بعد میرا زندہ رہنا بھی مشکل تھا، کجا کہ میں کوئی مشن کھڑا کر سکوں۔ خود بھائی صاحب مرحوم کو تمام تر برادرانہ محبت کے باوجود، اس معاملہ میں مجھ سے شکایت رہی۔ تاہم شکایت اور اختلاف کے باوجود انھوں نے کامل طور پر میری سرپرستی کی۔ اور میرا پورا بوجھ مسلسل اٹھاتے رہے۔

غیر مصالحانہ روش موجودہ امتحان کی دنیا میں اتنا بڑا جوکھم ہے جس کا تحمل کرنے کے لئے پہاڑ جیسی طاقت درشخصیت درکار ہے۔ میرے جیسا عاجز اور کمزور آدمی ایک دن کے لئے بھی اس اتحاد

کو برداشت نہیں کرسکتا۔ تاہم یہ صرف بھائی صاحب مرحوم کی مسلسل سرپرستی تھی جس کی بنا پر میں اس انتہائی مشکل اور خطرناک وادی کو پار کرنے میں کامیاب ہو سکا۔

۱۹۷۶ میں ماہنامہ الرسالہ جاری ہوا تو اس کا تمام ضروری سرمایہ بھائی صاحب مرحوم نے فراہم کیا۔ اس کے علاوہ مختلف مواقع پر وہ برابر میری مدد کرتے رہتے تھے۔ الرسالہ اور اسلامی مرکز کی صورت میں جو ڈھانچہ آج موجود ہے، وہ حقیقت کے اعتبار سے بلاشبہ اللہ تعالیٰ کا عطیہ ہے۔ مگر ظاہری اسباب کے اعتبار سے وہ سب کا سب، براہ راست یا بالواسطہ طور پر، بھائی صاحب مرحوم کی ذات سے تعلق رکھتا ہے۔ اپنی معلومات کے مطابق، ماضی یا حال میں مجھے کوئی بھی دوسرا بھائی نہیں معلوم جس نے اپنے بھائی کی اتنی زیادہ مدد کی ہو جتنی عبدالعزیز خاں صاحب نے میری کی۔ ان کی وفات ایک طرف میرے بھائی کی وفات تھی، دوسری طرف میں نے عالم اسباب میں اپنے قیمتی سرپرست کو کھو دیا۔ اللہ تعالیٰ بھائی صاحب مرحوم پر رحمتیں نازل فرمائے، اور میرا مددگار ہو۔ وہی ہر ایک کی مدد کرنے والا ہے۔

۷ جون کی صبح کو اچانک بھائی صاحب مرحوم کے دل کی حرکت بند ہو گئی۔ تاہم بجلی کا شاک دینے سے چند منٹ بعد دل کی حرکت دوبارہ جاری ہو گئی۔ اس دوران نلکی کے ذریعہ ان کے اندر آکسیجن پہنچایا جاتا رہا۔ یہ حالت تقریباً ۱۲ گھنٹے رہی۔ اس کے بعد، جون کی شام کو ساڑھے نو بجے ڈاکٹروں نے اعلان کیا کہ مریض کی وفات ہو چکی ہے۔ آخری ہچکی کے وقت ان کے صاحبزادہ جمیل احمد خاں انجنیئر ان کے پاس موجود تھے۔

موجودہ زمانہ میں ایک نئی سائنس وجود میں آئی ہے جس کو کرائیوجینکس (Cryogenics) کہتے ہیں۔ یعنی زندگی سے تعلق رکھنے والی چیزوں کو کم ٹمپریچر پر رکھ کر انھیں محفوظ کرنا۔ اس سائنس کی ابتدا ۱۸۷۷ میں ہوئی۔ اس کے ذریعہ پودے، غذائیں، اجزائے بدن مثلاً گردہ وغیرہ کو محفوظ کرنے میں کامیابی حاصل کی جا چکی ہے۔ مگر پورے انسانی جسم کو موت کے بعد ایک لمبی مدت تک محفوظ رکھنا ابھی تک ایک ناممکن چیز سمجھا جاتا ہے:

The prolonged viable preservation of whole animals, especially man, is now considered impossible, due to the complex and varied nature of the body (EB-5/322).

تاہم امریکہ میں ایسے ادارے کھل گئے ہیں جو بڑی بڑی فیس لے کر مردہ جسموں کو خاص طرح کے "کولڈ اسٹوریج" میں محفوظ رکھتے ہیں۔ جو دولت مند لوگ ایسی بیماریوں میں مرتے ہیں جن کا علاج ابھی تک دریافت نہ ہوسکا (مثلاً کینسر) ان کی وصیت کے تحت ان کے جسموں کو مذکورہ قسم کے سرد خانوں میں محفوظ کر دیا جاتا ہے، اس امید میں کہ شاید کبھی ان بیماریوں کا علاج دریافت ہو اور انھیں دوبارہ زندہ کیا جاسکے ـــــ انسان ابدی زندگی چاہتا ہے، مگر آخرت کا تصور سامنے نہ ہونے کی وجہ سے وہ غلط طور پر موجودہ فانی دنیا میں غیرفانی زندگی کی تلاش کر رہا ہے۔

جون کی آٹھ تاریخ ہے اور صبح ۹ بجے کا وقت۔ کوئنٹر اپارٹمنٹ (پالی ہل) کے نیچے بھائی صاحب کا جسم سفید کپڑوں میں لپٹا ہوا رکھا ہے۔ میں اس کو دیکھ رہا ہوں۔ میرے ذہن میں یادوں کی ریل چل رہی ہے۔ ایک زندگی جو ۱۹۱۹ میں شروع ہوئی اور ۱۹۸۸ میں ختم ہوگئی۔ یہی ہر ایک کے ساتھ پیش آنے والا ہے اور یہی خود میرے ساتھ بھی پیش آئے گا۔ موجودہ جسم انسانی روح کا دنیوی مکان ہے۔ موت وہ لمحہ ہے جب کہ روح اپنے دنیوی مکان کو چھوڑ کر ایک اور جسم میں داخل ہو جاتی ہے جو اس کا اخروی مکان ہے۔

بھائی صاحب کے مردہ جسم کو دیکھ کر مجھے خود اپنی موت یاد آگئی۔ ایک لمحہ کے لئے ایسا محسوس ہوا گویا خود میرا جسم کفن میں لپٹا ہوا پڑا ہے۔ یہ سوچ کر دل بے قرار ہوگیا۔ میں نے کہا کہ خدایا، مجھے بلاحساب بخش دیجئے۔ کیوں کہ میرا عمل بھی اتنا ہی بے عمل ہے جتنا کہ میری بے عملی۔

ڈاکٹر عبدالکریم نائک (پیدائش ۱۹۲۸) نفسیات کے ماہر ہیں۔ بمبئی کے سفر میں میرا قیام انھیں کے یہاں تھا۔ ۷ جون ۱۹۸۸ کو ہم لوگ نماز فجر سے فراغت کے بعد قریب کی مجگاؤں ہل پر ٹہلنے کے لئے گئے۔ یہ ایک پرفضا جگہ ہے۔ اس کے آس پاس زیادہ تر مسلمانوں کی آبادیاں ہیں۔ مگر وہاں جو لوگ ورزش یا چہل قدمی کرتے ہوئے نظر آئے وہ سب غیر مسلم تھے۔ ہم تین آدمیوں کے سوا وہاں اس وقت غالباً کوئی مسلمان موجود نہ تھا۔

یہ ایک پہاڑی تفریح گاہ ہے۔ سامنے دور تک سمندر کا منظر پھیلا ہوا ہے۔ یہاں ہم لوگ پارک میں کچھ دیر کے لئے بیٹھ گئے۔ ڈاکٹر نائک صاحب نے گفتگو کرتے ہوئے کہا: میرے نزدیک انسانی مسائل کا حل انصاف میں نہیں صلح میں ہے۔ کیوں کہ موجودہ دنیا میں اکثر حالات میں انصاف ممکن

نہیں ہوتا، جب کہ صلح ہر وقت ممکن ہوتی ہے۔

انھوں نے مثال دیتے ہوئے کہا کہ ہمارے آبائی وطن (رتنا گیری) میں ایک زمین پر دو آدمیوں کا جھگڑا تھا۔ ایک شخص نے زمین پر قبضہ کر رکھا تھا۔ دوسرا شخص جو اپنے آپ کو اس زمین کا مالک بتاتا تھا، اس کا مطالبہ تھا کہ قابض شخص مجھ کو آٹھ ہزار روپے دے، تب میں اپنے حق سے دستبردار ہوں گا۔ دوسرا شخص اس پر راضی نہ تھا۔ پہلے شخص کا کہنا تھا کہ میں آٹھ ہزار روپے سے ایک پیسہ کم نہیں لوں گا۔ دوسرے کا کہنا تھا کہ میں چھ ہزار سے ایک پیسہ زیادہ نہیں دوں گا۔

ڈاکٹر نائک صاحب کو معلوم ہوا تو انھوں نے کہا کہ میں چند منٹ میں اس مسئلہ کو حل کرتا ہوں۔ انھوں نے دونوں کو بلایا اور دونوں سے بات کی۔ دونوں نے وہی بات کہی جو وہ پہلے کہہ چکے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ تمہارا مطالبہ آٹھ ہزار روپے کا ہے۔ اس نے کہا کہ ہاں۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ ٹھیک ہے، تم کو آٹھ ہزار روپیہ مل جائے گا۔ اس کے بعد انھوں نے دوسرے شخص سے کہا کہ تم اپنے قول کے مطابق چھ ہزار روپے لے آؤ۔ وہ لے آیا۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی طرف سے دو ہزار روپیہ شامل کرتے ہوئے کہا کہ یہ آٹھ ہزار روپیہ لو اور جھگڑا ختم کرو۔ ڈاکٹر صاحب نے جب ایسا کیا تو مالک زمین کو شرم آگئی۔ وہ اپنا مطالبہ واپس لیتے ہوئے چھ ہزار روپیہ پر راضی ہو گیا۔

ہر مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ بشرطیکہ مسئلہ کو حل کرنے کے لئے وہ طریقہ اختیار کیا جائے جو دل کو نرم کرنے والا ہے۔ وہ طریقہ اختیار نہ کیا جائے جو دل کے اندر سوئے ہوئے منفی جذبات کو بھڑکا دیتا ہے اور عداوت کا طوفان برپا کر دیتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے الفاظ میں اس دنیا میں مسئلہ کا یقینی حل صرف ایک ہے۔ اور وہ ہے انصاف کا مطالبہ کرنے کے بجائے صلح پر راضی ہو جانا۔

مسٹر شکیل احمد خاں انجینئر سے بمبئی میں ملاقات ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ ۱۹۸۷ میں وہ الہ آباد میں تھے۔ ایک روز صبح کو اچانک انھیں معلوم ہوا کہ ان کے مکان کے پچھلے حصہ میں خنزیر کاٹ کر ڈالا ہوا ہے۔ یہ خبر تیزی سے پھیل گئی اور بستی میں اشتعال پیدا ہونے لگا۔ انھوں نے کہا کہ اس وقت اگر میں ذرا بھی ہوش مندی کے خلاف کرتا تو الہ آباد میں فساد ہو جاتا۔ مگر میں نے فوراً پولیس افسر کو ٹیلی فون کیا۔ اس کے بعد پانچ منٹ میں پولیس اپنی گاڑی لے کر آگئی۔ وہ خنزیر کو اٹھا لے گئی اور جگہ کو پوری طرح صاف کرا دیا۔ پولیس نے مجھ سے نام پوچھا۔ مگر میں نے کسی کا نام نہیں بتایا۔

میں نے کہا کہ ہر فساد ہمیشہ جوابی غلطی سے ہوتا ہے۔ اگر ایک غلطی کے بعد دوسری غلطی نہ کی جائے تو ہمیشہ کے لئے فساد کی جڑ کٹ جائے گی۔ خنزیر کاٹ کر ڈالنا پہلی غلطی تھی۔ اب اگر مسٹر شکیل احمد شور وغل کرتے تو یہ دوسری غلطی ہوتی مگر انھوں نے چوں کہ دوسری غلطی نہیں کی، اس لئے فساد کی صورت پیدا ہونے کے باوجود فساد نہیں ہوا۔

اخبار کی اطلاع سے پونہ کے احباب کو میری بمبئی آمد کی خبر ہوگئی تھی۔ چنانچہ وہاں سے کچھ لوگ بمبئی آگئے۔ ان سے ملاقات اور گفتگو رہی۔ یہ لوگ، جون کی تقریر میں شریک رہے۔ بمبئی کے بعض اخباروں کے نمائندے انٹرویو لینا چاہتے تھے۔ ایک ہندی اخبار کے نمائندے کو وقت بھی دیا جا چکا تھا۔ مگر بھائی صاحب کے انتقال کی وجہ سے پروگرام کی ترتیب باقی نہ رہ سکی۔ انٹرویو اور بعض دوسرے پروگرام منسوخ کر دینے پڑے۔

بمبئی میں عام ملاقاتوں کے علاوہ تین اجتماعی خطاب ہوئے۔ دو خطاب جیسمین اپارٹمنٹ کی مسجد میں، اور ایک ڈاکٹر عبد الکریم نائک صاحب کی رہائش گاہ پر۔ مسجد کے دونوں خطابات کا موضوع آخرت تھا، تیسرا خطاب دعوت کے موضوع پر تھا۔ تینوں تقریروں کا ٹیپ بمبئی کے احباب کے پاس موجود ہے۔

بمبئی کے آخری خطاب میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ اس اعتراض کا جواب دیا گیا کہ "الرسالہ مسلمانوں کو اقدام سے روکتا ہے اور پسپائی کا سبق دیتا ہے"۔ میں نے بتایا کہ یہ ایک خود ساختہ الزام ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم میں اور دوسروں میں جو فرق ہے وہ یہ نہیں ہے کہ دوسرے لوگ اقدام کا راستہ دکھا رہے ہیں۔ اور ہم انھیں پسپائی کی طرف لے جانا چاہتے ہیں۔ اصل فرق اقدام کے میدان کے بارہ میں ہے نہ کہ نفس اقدام کے بارہ میں۔ دوسرے لوگ ٹکراؤ کے میدان میں اقدام کا سبق دے رہے ہیں، اور ہم مسلمانوں کو دعوت کے میدان میں اقدام کی طرف بلاتے ہیں۔ قرآن وحدیث سے، نیز تاریخی واقعات سے اس کی وضاحت کی گئی۔

۸ جون ۱۹۸۸ کی شام کو انڈین ایرلائنز کی فلائٹ نمبر ۱۸۲ کے ذریعہ بمبئی سے دہلی کے لئے واپسی ہوئی۔ بھائی صاحب مرحوم تین ہفتے سے بمبئی میں تھے۔ میرے وہاں پہنچنے کے بعد اگلے ہی دن ان کی وفات ہوگئی تو ایسا معلوم ہوا جیسے اللہ تعالیٰ نے دونوں تاریخیں ایک ساتھ مقرر کر دی ہوں۔

ایک طرف بھائی صاحب اپنی آخرت کی منزل کی طرف روانہ ہوئے ، دوسری طرف میں ان کا آخری دیدار کرکے اپنی دنیوی منزل (دہلی) کے لئے روانہ ہوا۔ کیسی عجیب ہے یہ جدائی ، اور کیسی عجیب ہوگی وہ ملاقات جو دوبارہ آخرت کی دنیا میں تمام لوگوں کی ایک دوسرے کے ساتھ ہوگی۔

دہلی پہنچنے کے بعد الرسالہ اکیڈمی حیدرآباد کا خط ملا کہ اجتماعات کے موقع پر حیدرآباد میں جو اسٹال لگائے گئے تھے وہاں سے لوگوں نے بڑی تعداد میں کتابیں حاصل کیں۔ نیز الرسالہ کے خریداروں کی تعداد میں کافی اضافہ ہوا۔ چنانچہ انھوں نے کتابوں کے مزید آرڈر کے ساتھ لکھا تھا کہ تازہ الرسالہ (جون ۱۹۸۸) کے مزید ۲۵ نسخے فوراً روانہ کیے جائیں تاکہ نئے شائقین کو فراہم کیا جاسکے ـــــ جو لوگ الرسالہ کے مشن کو بدنام کرنے کی مہم چلا رہے ہیں ، انھیں جاننا چاہئے کہ الرسالہ ایک فکری سیلاب ہے ، اور جو چیز فکری سیلاب ہو اس کو جھوٹے الفاظ کے تنکوں سے روکا نہیں جاسکتا۔



خاتونِ اسلام

اسلامی شریعت میں عورت کا مقام
اسلام اور جدید تہذیب کا تقابل

از: مولانا وحید الدین خاں

(صفحات ۲۹۲ ، قیمت ۳۵ روپیہ)

مکتبہ الرسالہ

سی-۲۹، نظام الدین ویسٹ ، نئی دہلی-۱۳ فون: 697333, 611128

بیماری سے اکتا کر

امریکہ کے طبی جرنل (American Journal of Medicine) میں ایک ڈاکٹر کا خط چھپا ہے۔ ڈاکٹر نے اپنا نام ظاہر کیے بغیر اپنی ایک مریضہ کی تفصیلات درج کی ہیں جو مسلسل بیماری کے نتیجہ میں زندگی سے تنگ آچکی تھی اور علاج کی تمام کوششیں اس کو دوبارہ تندرستی عطا کرنے میں ناکام ثابت ہوئی تھیں۔ ڈاکٹر نے لکھا ہے کہ آخر کار اس نے اپنی اس خاتون مریض کو، جو کہ سرطان کی بیماری میں مبتلا تھی، ہمیشہ کی نیند سلا دیا تاکہ اس کی مصیبت کا خاتمہ کیا جاسکے:

He put a patient suffering from terminal cancer
to sleep forever to end her misery.

اس واقعہ کو مسٹر راجندر پربھو (مقیم واشنگٹن) نے اپنے ایک مضمون میں نقل کیا ہے جو ہندستان ٹائمس (۷ اپریل ۱۹۸۸) میں شائع ہوا ہے، اور اس کا عنوان ہے علمی انفجار (Knowledge explosion)۔

انسان موت کو زندگی کا خاتمہ سمجھتا ہے۔ حالاں کہ موت، حدیث کے الفاظ میں، عرض اکبر کا دن ہے۔ یہ وہ فیصلہ کن لمحہ ہے جب کہ انسان اپنے امتحان کی مدت پوری کر کے نتیجہ پانے کے مرحلہ میں داخلہ ہو جاتا ہے۔ یہ خالق و مالک کے سامنے بندے کی حاضری ہے۔ یہ عارضی زندگی سے ابدی زندگی کی طرف منتقل ہونا ہے۔

بیماری بلاشبہ ایک مصیبت کا واقعہ ہے۔ لیکن اگر زندگی کی اصل حقیقت کے اعتبار سے دیکھئے تو وہ ایک رحمت ہے۔ بیماری آدمی کو یاد دلاتی ہے کہ اس کا آخری وقت قریب آگیا ہے۔ وہ غافل آدمی کو چوکنا کرنے والی ہے۔ وہ ایک قدرتی الارم ہے جو سوتے آدمی کو جگا دیتا ہے تاکہ وہ آنے والے دن کے لیے پیشگی طور پر تیار ہو جائے۔ بیماری ایک چیتاونی ہے، مگر نادان آدمی اس کو مصیبت سمجھنے کی بنا پر عین اسی سبق سے محروم ہو جاتا ہے جس کے لیے اس کو بیماری میں مبتلا کیا گیا تھا۔

۱۔ نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا کی طرف سے ہمیں ایک کتابچہ موصول ہوا ہے جس کا نام ہے (Books from India) اس میں بتایا گیا ہے کہ صوفیا (بلغاریہ) کی ۱۸ ویں انٹرنیشنل بک فیر ۲ جون سے ۷ جون ۱۹۸۸ تک ہوئی۔ اس موقع پر نیشنل بک ٹرسٹ کی طرف سے مختلف موضوعات پر تین سو انگلش کتابیں نمائش اور تعارف کے لیے رکھی گئیں۔ ان کتابوں میں مرکز کی حسب ذیل چار کتابیں بھی شامل تھیں :

God Arises, Muhammad: The Prophet of Revolution, Religion and Science, Tabligh Movement.

۲۔ وائس آف القرآن (حیدرآباد) نے اپنے خط (۱۲ مئی ۱۹۸۸) میں اطلاع دی ہے کہ انھوں نے الرسالہ اپریل ۱۹۸۸ کے صفحہ اول کے مضمون کی جلی کتابت کروا کر اس کا اسٹیکر تیار کرایا اور اس کو شہر کے مختلف مقامات پر لگوایا۔ یہ طریقہ دوسرے لوگ بھی اختیار کر سکتے ہیں۔

۳۔ خدا کے فضل سے الرسالہ کا فکر مختلف شکلوں میں تیزی سے پھیل رہا ہے۔ مثلاً بمبئی کا ماہنامہ نقش کوکن ہر ماہ الرسالہ کے بعض مضامین کو اہتمام کے ساتھ شائع کرتا ہے۔

۴۔ بمبئی کے روزنامہ انقلاب نے ایک مستقل سلسلہ شروع کیا ہے۔ وہ اپنے "تبصرے" کے کالم میں الرسالہ کے ہر شمارہ کا تذکرہ اور تعارف شائع کرتا ہے۔ الرسالہ کے ہر شمارہ کی بعض باتوں کو لے کر لوگوں کو اس کی خصوصیات کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے۔ یہ ایک بے حد مفید سلسلہ ہے۔ انشاء اللہ اس سے الرسالہ کی توسیع اشاعت میں مزید مدد ملے گی۔

۵۔ سورت سے ایک گجراتی ماہنامہ "حیات" کے نام سے شائع ہوتا ہے۔ یہ ماہنامہ الرسالہ کے مضامین کا گجراتی ترجمہ اپنے صفحات میں شائع کر رہا ہے۔ اسی طرح دوسرے بہت سے جرائد الرسالہ کے مضامین کو بلا حوالہ اپنے کالموں میں نقل کرتے ہیں۔ یہ لوگ بھی کم از کم فکری طور پر الرسالہ کے پیغام کی اہمیت کا اعتراف کر رہے ہیں۔

۶۔ ایک صاحب لکھتے ہیں : ایک قاری الرسالہ کو جون کا الرسالہ دینے کے لیے گیا۔ وہاں ان

کے دو دوست بھی تھے وہ میرے لیے بالکل اجنبی تھے اور الرسالہ کے لیے بھی اجنبی ۔ وہ الرسالہ کو دیکھ کر بولے یہ کون سا پرچہ ہے ۔ میں نے اس کا مختصر تعارف کروایا اور یہ کہا کہ یہ عام نوعیت کا پرچہ نہیں ہے بلکہ اس پرچہ میں ایک خصوصیت ہے وہ یہ کہ اس میں تقریباً ایک ایک صفحہ کے مضامین ہوتے ہیں جس کو ہر شخص شوق سے اور جلدی پڑھ لیتا ہے۔ یہ کہتے ہوئے ان کو صفحہ نمبر ۴ کا مضمون "حد کو پار نہ کیجئے" نکال کر دیا کہ اس کو پڑھیے۔ مجھے یہ کہتے ہوئے خوشی محسوس ہوتی ہے کہ انھوں نے پڑھا اور الرسالہ کے مستقل قاریوں میں اپنا نام لکھوا دیا (محمد وحید الدین، حیدر آباد)

۷۔ الرسالہ ۱۹۷۶ سے یہ مہم چلا رہا ہے کہ مسلمان احتجاج اور مطالبہ کا طریقہ چھوڑیں اور مثبت انداز اختیار کریں ۔ خدا کے فضل سے اب اس کے اثرات ظاہر ہونا شروع ہو گیے ہیں۔ اخبار ہجوم (۲۹ اپریل ۔ ۵ مئی ۱۹۸۸) نے ایک مشہور جماعت کے اجلاس کی رپورٹ شائع کی ہے جس کا عنوان ہے "مطالباتی سیاست کے گھروندے سے نکلنے کی کوشش" رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ صدر صاحب نے "واضح طور پر کہا کہ ہماری جماعت اب تک مطالباتی سیاست پر عمل کر رہی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ انھوں نے تالیوں کی گونج میں کہا کہ اب ہم پٹری بدل رہے ہیں اور مطالباتی سیاست کے گھروندے سے نکل رہے ہیں ۔ اب ہم مانگنے کے بجائے یہ تلاش و جستجو کر رہے ہیں کہ اسلام اپنے دامن میں ملک کے انسانوں کو دینے کے لیے کیا رکھتا ہے" الرسالہ کی مہم اللہ کے فضل سے اس حد تک موثر ہوئی ہے کہ اب کچھ لوگ اعلان کے ساتھ اپنی پٹری بدل رہے ہیں اور کچھ لوگ اعلان کے بغیر ۔

۸۔ جون ۱۹۸۸ کے پہلے ہفتہ میں صدر اسلامی مرکز نے حیدر آباد ، محبوب نگر اور بمبئی کا دورہ کیا تینوں مقامات پر ملاقاتوں اور خطابات کے پروگرام ہوئے ۔ تفصیلی روداد انشاء اللہ سفرنامہ کے ساتھ شائع ہو گی ۔

۹۔ ڈاکٹر تھیوڈور رائٹ (Dr. Theodore P. Wright Jr.) امریکہ کی اسٹیٹ یونیورسٹی آف نیویارک میں پولٹیکل سائنس کے پروفیسر ہیں۔ انھوں نے مسلم اقلیت کے موضوعات پر کئی مقالے لکھے ہیں۔ صدر اسلامی مرکز کا مقالہ جو ہندستانی مسلمانوں کے بارہ میں ٹائمس آف

انڈیا میں چھپا تھا۔ اس کی نقل مساچوسٹس کی انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی لائبریری کی طرف سے ڈاکٹر رائٹ کو بھیجی گئی تھی۔ اس کو دیکھنے کے بعد ڈاکٹر رائٹ نے ایک خط (۳ مئی ۱۹۸۸) صدر اسلامی مرکز کو بھیجا ہے اور الرسالہ انگریزی اور دوسری انگریزی کتابوں کو پڑھنے کی خواہش ظاہر کی ہے۔ یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خدا کے فضل سے الرسالہ کی آواز کس طرح مختلف ذرائع سے پھیل کر دور دور تک پہونچ رہی ہے۔

۱۰۔ ایک مقام کے بارہ میں معلوم ہوا کہ وہاں فرقہ وارانہ فساد کی صورت پیدا ہوگئی۔ ایک فرقہ جلوس کی صورت میں سڑک سے گزرتا ہوا دوسرے فرقہ کے محلّہ میں پہونچا اور نامناسب نعرے لگانے لگا۔ اب دوسرے فرقہ کے لوگ مشتعل ہوکر چھتوں پر چڑھ گیے اور سنگباری کی صورت میں جواب دینا چاہتے تھے۔ اس موقع پر الرسالہ کے چند قاری سامنے آگیے۔ انھوں نے اپنے فرقہ کے لوگوں کو سمجھا بجھا کر ٹھنڈا کیا۔ انھوں نے کہا کہ اگر تم پتھر مارو گے تو مسئلہ تمہارا اور پولس کا بن جائے گا۔ لیکن اگر تم خاموش ہو جاؤ تو مسئلہ پولس کا اور جلوس والوں کا رہے گا۔ ان کی کوشش کامیاب ہوگئی اور لوگ چھتوں سے اتر گیے۔ اس کے بعد مسئلہ واقعۃً پولس کا اور جلوس کا بن گیا۔ پولس نے جلوس سے آگے بڑھنے کے لیے کہا، جب وہ آگے نہیں بڑھے تو پولس نے لاٹھی چارج کر کے جلوس والوں کو منتشر کیا —— الرسالہ کے قارئین کو اسی طرح نازک مواقع پر سامنے آنا چاہیے اور الرسالہ کے اسلامی فکر کے مطابق لوگوں کی رہنمائی کرنا چاہیے۔

۱۱۔ ایک صاحب نے کہا کہ الرسالہ کی ایک بہت انوکھی صفت ہے جو موجودہ زمانہ میں شاید ہی کسی پرچہ کو حاصل ہو۔ وہ یہ کہ الرسالہ جس کے ہاتھ میں پہونچ جاتا ہے وہ اس کو شروع سے آخر تک پڑھتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ آج کل انگریزی پرچہ India Today ٹاپ کا پرچہ سمجھا جاتا ہے۔ مگر سروے سے پتہ چلا ہے کہ انڈیا ٹوڈے کے خریدار بمشکل اس کا ۱۵ فی صد حصہ پڑھتے ہیں۔ جب کہ الرسالہ کے جتنے قاری میں نے دیکھے سب کا یہ حال ہے کہ وہ اس کو پورا کا پورا پڑھتے ہیں۔ بلکہ بہت سے تو ایک رسالہ کو ایک سے زیادہ بار پڑھتے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ اس نے الرسالہ کو یہ مقبولیت عطا فرمائی۔

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کار نبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کر دے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴۔ صاحب استطاعت افراد کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کر دیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط و کتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

زر تعاون الرسالہ

زر تعاون سالانہ	۴۸ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	۲۵۰ روپیہ
بیرونی ممالک سے	
ہوائی ڈاک	۲۰ ڈالر امریکی
بحری ڈاک	۱۰ ڈالر امریکی

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسؤل نے نازی آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی۔۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

Regd. No. D(SE) 243 RN 28822/76 August 1988 No 141

جدید اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

	Rs
تذکیر القرآن جلد اول	100/-
" جلد دوم	100/-
اللہ اکبر	40/-
پیغمبر انقلاب	30/-
مذہب اور جدید چیلنج	35/-
عظمتِ قرآن	25/-
الاسلام	25/-
ظہور اسلام	25/-
اسلامی زندگی	20/-
احیاءِ اسلام	20/-
رازِ حیات (مجلد)	45/-
صراطِ مستقیم	25/-
خاتونِ اسلام	35/-
سوشلزم اور اسلام	25/-
اسلام اور عصر حاضر	20/-
حقیقتِ حج	25/-
اسلامی تعلیمات	20/-
تبلیغی تحریک	15/-
تعبیر کی غلطی	35/-
دین کی سیاسی تعبیر	10/-

دین کیا ہے	3/-
قرآن کا مطلوب انسان	6/-
تجدید دین	4/-
اسلام دینِ فطرت	4/-
تعمیرِ ملت	4/-
تاریخ کا سبق	4/-
مذہب اور سائنس	8/-
عقلیاتِ اسلام	4/-
فسادات کا مسئلہ	3/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	3/-
تعارفِ اسلام	4/-
اسلام پندرھویں صدی میں	4/-
راہیں بند نہیں	4/-
ایمانی طاقت	4/-
اتحادِ ملت	4/-
سبق آموز واقعات	4/-
زلزلۂ قیامت	6/-
حقیقت کی تلاش	4/-
پیغمبر اسلام	4/-
آخری سفر	4/-

اسلامی دعوت	4/-
خدا اور انسان	4/-
حل یہاں ہے	6/-
سچا راستہ	2/-
دینی تعلیم	4/-
حیاتِ طیبہ	4/-
باغ جنت	4/-
نارِ جہنم	4/-
میوات کا سفر	25/-

God Arises	Rs. 45/-
Muhammad The Prophet of Revolution	50/-
Religion and Science	25/-
Tabligh Movement	20/-
The Way to Find God	4/-
The Teachings of Islam	5/-
The Good Life	5/-
The Garden of Paradise	5/-
The Fire of Hell	5/-
Muhammad The Ideal Character	4/-
Man Know Thyself!	4/-
इन्सान अपने आपको पहचान	2/-
सच्चाई की तलाश	4/-

K6/31.95

31 AUG 1988

الرسالہ

ISSN 0970-180X

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

تخریب کے لیے جمع ہونا بھیڑ ہے
تعمیر کے لیے جمع ہونا اتحاد ہے

ستمبر ۱۹۸۸ شمارہ ۱۴۲

God Arises

By Maulana Wahiduddin Khan

This is the translation with some additions of *Mazhab Aur Jadeed Challenge*, translated into Arabic as *Al-Islam Yatahaddah*, which became a best-seller throughout the Arab world. It has also been translated into a number of other languages including Turkish, Malay, Serbo-Croatian (Yugoslavian), Sindhi, etc., and has come to be accepted as a standard work on the Islamic position vis-à-vis modern thought.

"... in the fourteen hundred years of Islamic history, innumerable books on Islam have appeared. There are just a few books calling mankind to God which are clearly distinguishable from the rest because of the clarity and force with which they make their appeal. Without doubt, this book is one of that kind".

— Daily AL-AHRAM (Cairo)

Pages 265 ISBN 81-85063-14-1 (Pbk) Price Rs. 45
81-85063-17-6 (Hbd)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اردو، انگریزی میں شائع ہونے والا

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

شمارہ ۱۴۲ ستمبر ۱۹۸۸

فہرست

ماہنامہ الرسالہ ، سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳ ، فون : 697333, 611128

اسلامی عبادتیں

اسلام کی جو عبادتیں ہیں، ان کی اگرچہ ایک ظاہری شکل ہے۔ مگر اسی کے ساتھ ان کی ایک اسپرٹ (روح) ہے اور تمام عبادتیں اصلاً اپنی اسی اسپرٹ کے اعتبار سے مطلوب ہیں۔

نماز کی اسپرٹ تواضع ہے۔ نماز میں اللہ اکبر (اللہ بڑا ہے) کہنا اور پھر سجدہ میں گر کر زمین پر اپنا سر رکھ دینا، اس بات کا اقرار ہے کہ اس دنیا میں ساری بڑائی صرف ایک خدا کو حاصل ہے۔ بندہ کے لیے صحیح رویہ صرف یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو جھکا دے۔ یہ اقرار آدمی کے اندر تواضع کا مزاج پیدا کرتا ہے۔ مسجد سے نکل کر جب وہ انسانوں کے درمیان آتا ہے تو ان سے معاملہ کرنے میں اس کا انداز تواضع کا ہوتا ہے نہ کہ غرور اور گھمنڈ کا۔

روزہ کی اسپرٹ برداشت ہے۔ رمضان کے مہینہ میں ناگزیر ضروریات زندگی کے معاملہ میں برداشت کا طریقہ اختیار کر کے آدمی اپنے اندر یہ مزاج پیدا کرتا ہے کہ وہ سماج کے اندر تحمل اور برداشت کے ساتھ رہے، جذبات ابھارنے والے مواقع پر وہ بے قابو ہونے سے بچے۔

زکوٰۃ کی اسپرٹ خیر خواہی ہے۔ زکوٰۃ میں آدمی اپنی کمائی کا ایک حصہ دوسروں کو دے کر اپنے اندر یہ جذبہ ابھارتا ہے کہ وہ دوسروں کے مسئلہ کو اپنا مسئلہ سمجھے، دوسروں کی ضرورت کے وقت وہ ان کے کام آئے۔

حج کی اسپرٹ اتحاد ہے۔ حج کے موقع پر ساری دنیا کے مسلمان ایک جگہ اکٹھا ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے کی ناخوش گواریوں کو نظر انداز کرتے ہوئے متحدہ طور پر عبادتی امور انجام دیتے ہیں۔ یہ اتحاد و اتفاق کا سبق ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام مسلمان ایک دوسرے کو اپنا بھائی سمجھیں۔ وہ مل جل کر رہیں۔ اختلافات میں اُلجھنے کے بجائے وہ متحد اور متفق ہو کر زندگی گزاریں۔

انسان کا جسم باقی رہے، مگر اس کی روح نکل جائے تو ایسا انسان مردہ انسان ہے۔ اسی طرح جس عبادت کی شکل موجود ہو مگر اس کی روح اس میں نہ پائی جاتی ہو تو ایسی عبادت مُردہ عبادت ہے۔ اس سے وہ فائدہ نہیں مل سکتا جو زندہ عبادت سے عبادت کرنے والے کو ملتا ہے۔

اندھیرے میں اجالا

سید امیر علی (۱۹۲۸ - ۱۸۴۹) کی مشہور انگریزی کتاب ہے جس کا نام روح اسلام (The Spirit of Islam) ہے۔ اس کتاب کے نویں باب میں انھوں نے ایک جرمن مستشرق کا اقتباس ان الفاظ میں نقل کیا ہے:

It was the Koran--"a book by the aid of which the Arabs conquered a world greater than that of Alexander the Great, greater than that of Rome, and in as many tens of years as the latter had wanted hundreds to accomplish her conquests; by the aid of which they alone of all the Shemites came to Europe as kings, whither the Phoenicians had come as tradesmen, and the Jews as fugitives or captives; came to Europe to hold up, together with these fugitives, the light to humanity;—they alone, while darkness lay around, to raise up the wisdom and knowledge of Hellas from the dead, to teach philosophy, medicine, astronomy, and the golden art of song to the West as to the East, to stand at the cradle of modern science, and to cause us late epigoni for ever to weep over the day when Granada fell" (p.394).

قرآن ہی وہ کتاب ہے جس کی مدد سے عربوں نے ایک ایسی دنیا کو فتح کیا جو سکندر اعظم سے بھی زیادہ بڑی تھی، جو روم کی سلطنت سے بھی زیادہ وسیع تھی۔ اور وہ بھی چند دہے میں جس کو پورا کرنے میں موخر الذکر کو کئی سو سال لگ گیے۔ قرآن ہی کی مدد سے ایسا ہوا کہ تمام سامی اقوام میں وہ تنہا لوگ تھے جو یورپ میں حکمراں کی حیثیت سے داخل ہوئے۔ جہاں فینیقی تاجر کی حیثیت سے آئے تھے، اور یہودی پناہ گیر یا قیدی کی حیثیت سے۔ وہ یورپ آئے تاکہ ان پناہ گیروں کے ساتھ انسانیت کو روشنی دکھائیں۔ جب کہ چاروں طرف تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ انھوں نے یونان کے علم وحکمت کو دوبارہ زندہ کیا۔ انھوں نے مغرب کو فلسفہ، طب، فلکیات، اور موسیقی کا زریں فن سکھایا جیسا کہ انھوں نے مشرق کو سکھایا تھا۔ وہ جدید سائنس کا گھوارہ بن کر کھڑے ہوے۔ اور انھوں نے ہم بعد میں آنے والوں کو اس کا ماتم کرایا جب کہ غرناطہ ان کے قبضہ سے نکل گیا۔

پچھلے زمانہ کے مسلمانوں کے لیے قرآن ایک تسخیری طاقت ثابت ہوا تھا۔ آج کے مسلمانوں کے لیے قرآن کوئی تسخیری طاقت نہیں۔ اس کی سادہ سی وجہ یہ ہے کہ آج کے مسلمانوں نے قرآن کی طاقت کو استعمال ہی نہیں کیا۔

کامیابی کا راز

ایک مغربی مفکر کا قول ہے کہ جو چیز مجھ کو نہیں مارتی وہ مجھ کو پہلے سے زیادہ طاقتور بنا دیتی ہے :

That which does not kill me makes me stronger.

جب آدمی کسی سخت مشکل سے دوچار ہو اور اس سے دل شکستہ نہ ہو بلکہ غور و فکر کے ذریعہ اس کا حل تلاش کرے تو اس نے اپنے اندر ایک نئی طاقت پیدا کی۔ اس نے اپنے اندر اس صلاحیت کو جگایا کہ وہ ناموافق حالات کا مقابلہ کر سکے۔ وہ رکاوٹوں کے باوجود آگے بڑھتا رہے۔ مشکل نادان آدمی کو برباد کرتی ہے مگر مشکل دانش مند آدمی کے لیے ترقی کا زینہ بن جاتی ہے۔

زندگی میں کامیاب ہونے کے لیے سب سے اہم چیز بلند فکری ہے۔ ہمارے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم ان سوالات سے اوپر اٹھ جائیں جو ماضی پر یا پیش آنے والے دکھ پر مبنی ہوتے ہیں۔ "ایسا کیوں کر میرے ساتھ پیش آیا۔ اس سوال کے بجائے آدمی کو ایسی باتوں پر سوچنا چاہیے جو مستقبل کے دروازے کھولنے والے ہوں ـــــ اب جب کہ یہ پیش آچکا ہے مجھے اس کے لیے کیا کرنا چاہیے :

"We need to get over the questions that focus on the past and on the pain—'Why did this happen to me?'—and ask instead the question which opens doors to the future. "Now that this has happened, what shall I do about it?'"

Rabbi Harold Kushner, *When Bad Things Happen to Good People*

موجودہ دنیا اس ڈھنگ پر بنی ہے کہ یہاں لازمی طور پر ناخوش گوار واقعات پیش آتے ہیں۔ آدمی بار بار مشکلات میں مبتلا ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں موجودہ دنیا میں کامیاب زندگی حاصل کرنے کا راز صرف ایک ہے۔ وہ ماضی کو بھول کر مستقبل کے بارے میں سوچے۔ وہ کھوئے ہوئے امکانات پر غم نہ کرے بلکہ اپنی ساری توجہ ان امکانات پر لگا دے جو اب بھی اسے حاصل ہیں، جو ابھی تک برباد نہیں ہوئے۔

حال کو ماننا آدمی کے لیے مستقبل کے دروازے کھولتا ہے۔ اور حال کو نہ ماننا آدمی کو حال سے بھی محروم کر دیتا ہے اور آنے والے مستقبل سے بھی۔

اپنی کمزوری

رابرٹ امیان Robert Emmiyan روس کا مشہور کھلاڑی ہے۔ وہ لمبی کود کا چیمپین Top Long-jumper سمجھا جاتا ہے۔ وہ ۱۵ فروری ۱۹۶۵ کو پیدا ہوا اور عالمی مقابلوں میں گولڈ میڈل جیت کر غیر معمولی شہرت حاصل کی۔

ایک ہندستانی جرنلسٹ مسٹر وی کرشنا سوامی نے رابرٹ امیان کا مفصل انٹرویو لیا۔ یہ انٹرویو ٹائمس آف انڈیا (۵ اپریل ۱۹۸۸) میں شائع ہوا ہے۔ مسٹر کرشنا سوامی نے روسی چیمپین سے پوچھا کہ بین اقوامی کھیل میں جب آپ شرکت کرتے ہیں تو اس میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے آپ کیا کرتے ہیں۔ رابرٹ امیان نے جواب دیا :

> The most important is to get rid of the defects which prevent me from improving my performance. My coach and I know that I have reserves which we must put to use.

سب سے اہم بات اپنی کمزوریوں کو دور کرنا ہے جو کہ میری کارکردگی کو اچھا بنانے میں رکاوٹ بنتی ہیں۔ میرے استاد اور میں دونوں جانتے ہیں کہ میرے اندر محفوظ صلاحیتیں ہیں جن کو ہمیں استعمال میں لانا ہے۔

رابرٹ امیان نے کھیل میں کامیابی کا جو راز بتایا ہے وہی وسیع تر زندگی میں بھی کامیابی کا راز ہے۔ زندگی کے مقابلہ میں جب بھی کوئی شخص ناکام ہوتا ہے تو وہ خود اپنی کمزوریوں کی وجہ سے ناکام ہوتا ہے۔ اپنی داخلی کمزوریوں کو جاننا اور ان کو دور کرتے ہوئے زیادہ بہتر تیاری کے ساتھ میدانِ عمل میں داخل ہونا، یہی اس دنیا میں کامیابی کا واحد راز ہے۔ موجودہ دنیا میں جو شخص بھی کامیاب ہوتا ہے وہ اسی شرط کو پورا کرکے کامیاب ہوتا ہے۔ اور جو شخص ناکام ہوتا ہے وہ اسی لیے ناکام ہوتا ہے کہ وہ اس شرط کو پورا کرنے میں کوتاہ ثابت ہوا تھا۔

ناکام وہ ہے جو اپنی صلاحیتوں کے بھرپور استعمال میں ناکام رہے، اور کامیاب وہ ہے جو اپنی صلاحیتوں کے بھرپور استعمال میں کامیاب ثابت ہو۔

چھوٹا زیادہ بڑا ہے

ہندستان کی آزادی کی تحریک ۱۷۹۹ میں شروع ہوئی جب کہ سلطان ٹیپو انگریزوں سے جنگ کرتے ہوئے مارے گیے۔ اس کے بعد انگریزوں سے لڑنا، انگریز شخصیتوں پر بم مارنا، ان پر حملہ کرنے کے لیے بیرونی حکومتوں کو ابھارنا، جیسے ہنگامے سو سال سے زیادہ مدت تک جاری رہے۔

اس قسم کی تدبیریں اپنی نوعیت میں پر شور تھیں۔ چنانچہ ان کا نام آتے ہی انگریز فوراً چوکنا ہو جاتا تھا اور ان کو پوری طاقت سے کچل دیتا تھا۔ اس کے بعد گاندھی میدانِ سیاست میں آئے تو اچانک صورتِ حال بدل گئی۔ پچھلے لوگ ہنسا کے ذریعہ آزادی کا مطالبہ کرتے تھے، گاندھی نے اس کے برعکس اَہنسا کے طریقہ کو اختیار کیا۔ انھوں نے آزادی کی تحریک کو ایسی بنیاد پر چلانے کا اعلان کیا جو انگریزوں کو ناقابل لحاظ دکھائی دے۔

گاندھی کے اسی طریقہ کا ایک جزء وہ ہے جس کو ڈانڈی مارچ کہا جاتا ہے۔ گجرات کے ساحل پر قدیم زمانہ سے نمک بنایا جاتا تھا۔ انگریزی حکومت نے گجرات میں نمک بنانے کی صنعت کو سرکاری قبضہ میں لے لیا۔ گاندھی اس قانون کی پُر امن خلاف ورزی کے لیے سابرمتی سے پیدل روانہ ہوئے اور ۲۴ دن میں ۲۴۰ میل کا سفر طے کرکے ڈانڈی کے ساحل پر پہونچے اور نمک کا ایک ٹکڑا اپنے ہاتھ میں لے کر سرکاری قانون کی خلاف ورزی کی۔

گاندھی نے جب اپنے منصوبہ کا اعلان کیا تو انگریز عہدیداروں کی ایک میٹنگ ہوئی۔ اس موقع پر ایک انگریز افسر نے اپنی رائے دیتے ہوئے کہا تھا کہ ان کو اپنا نمک بنانے دو۔ مسٹر گاندھی کو چٹکی بھر نمک سے بہت زیادہ بڑی چیز درکار ہوگی کہ وہ برطانی شہنشاہیت کو زیر کر سکیں:

> Let him make his salt. Mr. Gandhi will have to find a great deal more than a pinch of salt to bring down the British Empire.

موجودہ دنیا میں کامیاب اقدام وہ ہے جو دیکھنے میں ناقابل لحاظ دکھائی دے، مگر حقیقۃً وہ ناقابل تسخیر ہو۔ جو حریف کو بظاہر "چٹکی بھر نمک" نظر آئے، مگر انجام کو پہونچے تو وہ "پہاڑ بھر نمک" بن جائے۔

دنیا اور آخرت

ایک دوکاندار نے کہا کہ میں ہر روز اپنی دکان کھولتا ہوں۔ حالاں کہ میں جانتا ہوں کہ ایک دن دکان کھولنے کی قیمت ایک سو روپیہ ہے۔ ملازم کی تنخواہ، بجلی کا بل اور دوسرے مختلف اخراجات۔ پھر میں کیوں دکان کھولتا ہوں اور کیوں ہر روز ایک سو روپیہ کا خرچ برداشت کرتا ہوں، اس کی وجہ یہ ہے کہ میں جانتا ہوں کہ میں ایک سو روپیہ خرچ کرکے ایک ہزار روپیہ کماؤں گا۔ اگر مجھے یہ یقین نہ ہو تو میں کبھی سو روپیہ روز خرچ کرنے کی ہمت نہ کروں۔

یہی زندگی کا اصول ہے۔ آدمی اسی وقت کسی چیز میں اپنی طاقت خرچ کرتا ہے جب کہ اس کو یقین ہوتا ہے کہ میں جتنا خرچ کروں گا اس سے زیادہ میں حاصل کروں گا۔ یہ یقین نہ ہو تو زندگی کی تمام سرگرمیاں ٹھپ ہو کر رہ جائیں۔

دنیا کے معاملہ میں جس طرح لوگ خرچ کرتے ہیں اسی طرح وہ آخرت کے معاملہ میں خرچ نہیں کرتے۔ اس کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا کے معاملہ میں نتیجہ فوراً سامنے آجاتا ہے۔ یہاں خرچ کرتے ہوئے آدمی کو یقین رہتا ہے کہ وہ "ایک سو" خرچ کرکے "ایک ہزار" پا سکتا ہے۔ مگر آخرت کے معاملہ میں نتیجہ فوراً سامنے نہیں آتا۔ اس لیے آدمی یقین نہیں کر پاتا کہ وہ جو کچھ خرچ کرے گا وہ اضافہ کے ساتھ اس کی طرف لوٹے گا۔ دنیا کے معاملہ میں خرچ کو وہ پیسہ لگانا (Investment) سمجھتا ہے اور آخرت کے معاملہ میں خرچ کو پیسہ برباد کرنا۔

آخرت کے معاملہ میں خرچ کا "ریٹرن" اگرچہ اپنی پوری شکل میں اگلی دنیا میں ملے گا مگر اس کا ایک حصہ آدمی کو اِسی دنیا میں مل جاتا ہے۔

یہ دنیوی ریٹرن وہ ہے جو آدمی کو نفسیاتی صورت میں حاصل ہوتا ہے۔ ایسے آدمی کو شکر، قناعت اور اعتماد کی دولت ملتی ہے۔ وہ اعلیٰ ربانی احساسات کا تجربہ کرتا ہے۔ وہ بندوں کو دے کر خدا سے پاتا ہے۔ وہ مادی انفاق کرکے روحانی سرمایہ حاصل کرتا ہے۔ وہ کھونے میں پانے کی لذت کا تجربہ کرتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ وہ اس آخرت کو حسّی طور پر آج ہی کے دن پالیتا ہے جس کو عملی طور پر وہ کل کے دن پائے گا۔

دولت کی بجلی

ایک شخص معمولی حیثیت کا تھا۔ پھر وہ ترقی کرکے دولت مند بن گیا۔ جب وہ معمولی حیثیت کا تھا تو زیادہ خوش رہتا تھا۔ دولت آنے کے بعد وہ پریشان رہنے لگا۔ اس کے ایک پرانے دوست نے پوچھا، یہ تمہارا کیا حال ہو گیا ہے پہلے تم ہنستے بولتے تھے۔ ہم لوگوں کے ساتھ کافی وقت گزارتے تھے۔ اب تم اداس نظر آنے لگے ہو۔ اس نے جواب دیا "میرے اوپر دولت کی بجلی گری ہے" دولت نے مجھ کو نئے نئے مسائل میں الجھا دیا ہے۔ پہلے ہمارے بچے ہمارے پاس تھے۔ ہم ان کو دیکھ کر خوش ہوتے تھے۔ آج ہر بچہ ہم سے دور ہے۔ کوئی یورپ، امریکہ پڑھنے گیا ہوا ہے۔ کوئی دور کے کسی مقام پر ملازم ہے۔ جن بچوں کو پہلے ہم میاں بیوی دیکھ کر خوش ہوتے تھے۔ آج ہم ان کے سایہ کے لیے بھی ترستے ہیں۔ بھیڑوں کا فارم ہے تو خیال لگا ہوا ہے کہ اتنی قیمتی بھیڑیں ہیں، پتہ نہیں ان کا کیا ہوا۔ ٹرک چل رہے ہیں تو اس کی فکر ہے کہ کہیں ایکسیڈنٹ نہ ہو گیا ہو۔ دکانیں ہیں تو ان کی پریشانی کہ ملازم کہیں گڑبڑ نہ کر رہے ہوں۔ غرض جتنی زیادہ دولت ہے اتنی ہی زیادہ فکر ہے۔ سیل ٹیکس، انکم ٹیکس اور طرح طرح کے قانونی جھگڑے اس کے علاوہ ہیں۔ زندگی لطف سے خالی ہو کر بس مسائل اور پیچیدگیوں کا مجموعہ بن گئی ہے۔ جو دولت آدمی کو سکون نہ دے بلکہ بے چین کر دے اس کے متعلق یہی کہا جائے گا کہ ——— وہ ایک بجلی ہے جو آدمی کے اوپر گر پڑی ہے۔

دولت کو صرف اپنی ذات پر خرچ کیا جائے تو وہ عذاب ہے مگر اللہ کے راستہ میں خرچ کیا جائے تو وہ نعمت بن جائے گی:

عن ابی ذرؓ قال انتهيتُ الى النبی صلی اللہ علیه وسلم وهو جالس فی ظلّ الکعبة فلمّا رآنی قال: هم الاخسرون ورب الکعبة. فقلتُ فداك ابی واُمّی من هم. قال هم الاکثرون اموالاً الّا من قال: هٰکذا وهٰکذا۔ من بين يديه ومن خلفه وعن يمينه وعن شماله وقليلٌ ما هم۔ (متفق علیه)

حضرت ابو ذر کہتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ آپ اس وقت کعبہ کے سایہ میں بیٹھے ہوئے تھے آپ نے جب مجھ کو دیکھا تو فرمایا کہ کعبہ کے رب کی قسم، وہ لوگ گھاٹے میں ہیں۔ میں نے کہا کہ میرے باپ اور ماں آپ پر فدا ہوں، وہ کون لوگ ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ زیادہ مال والے، سوا اس کے جس کو مال ملے تو وہ اپنے آگے اور پیچھے، اپنے دائیں اور بائیں اس کو خرچ کرے۔ اور ایسے لوگ بہت کم ہیں۔

کتنا فرق

یکم ستمبر ۱۹۸۳ کو کوریا کی ایر لائنز کا ایک مسافر جہاز (Flight 007) نیویارک سے سیول کے لیے روانہ ہوا۔ وہ کمچاٹکا (Kamchatka) کے اوپر اڑ رہا تھا کہ روسی فوج نے اس کو مار کر گرا دیا۔ اس جہاز پر عملہ سمیت ۲۶۹ مسافر تھے جو سب کے سب ہلاک ہوگیے۔ اس کے بعد روسی حکومت نے بیان دیا کہ اس جہاز کو مسافر جہاز سمجھ کر نہیں مارا گیا۔ روسی فوج نے اس کو امریکہ کا (RC-135 spy plane) (جاسوسی جہاز) سمجھا اور مدافعت میں اس پر وار کیا۔ تاہم امریکہ نے اس عذر کو قبول نہیں کیا۔ اس نے کہا کہ مذکورہ جاسوسی جہاز اور مسافر جہاز (Boeing 747) میں اتنا زیادہ فرق تھا کہ راڈر اسکرین کا مشاہدہ اس کو سمجھنے میں دھوکا نہیں کھا سکتا۔

۳ جولائی ۱۹۸۸ کو اسی قسم کا ایک اور واقعہ برعکس صورت میں پیش آیا۔ ایران ایر کا ایک مسافر بردار جہاز (Airbus A-300) تہران سے دوبئی جا رہا تھا۔ وہ خلیج فارس کے اوپر اڑ رہا تھا کہ امریکی بحریہ کے جنگی جہاز ونسینز (USS Vincennes) نے اس کو مار کر گرا دیا۔ عملہ سمیت اس کے ۲۹۰ مسافر ہلاک ہوگیے۔ امریکہ کی طرف سے دوبارہ اس کی توجیہہ یہ کی گئی کہ امریکی بحریہ نے غلط فہمی میں ایسا کیا۔ اس نے اس جہاز کو مسافر بردار نہیں سمجھا بلکہ اس کو جنگی جہاز (F-14 jet fighter) سمجھا اور بچاؤ کے طور پر اس کو اپنے میزائل کا نشانہ بنایا۔

امریکہ کے مخالفین کے لیے یہ توجیہہ قابل قبول نہ ہو سکی۔ انھوں نے کہا کہ ایربس کے مقابلہ میں مذکورہ جیٹ فائٹر بہت چھوٹا ہوتا ہے، جب کہ جیٹ فائٹر کی رفتار ایربس کے مقابلہ میں تقریباً ۲۵۰ کیلومیٹر زیادہ ہوتی ہے۔ امریکہ کے بحری جہاز کے راڈر اسکرین پر یہ فرق واضح طور پر دکھائی دے رہا ہوگا۔ اس لیے دونوں میں اشتباہ پیدا ہونے کا کوئی سوال نہیں۔ (ٹائمس آف انڈیا، ۵ جولائی ۱۹۸۸، صفحہ ۱۲، ہندستان ٹائمس، ۵ جولائی ۱۹۸۸، صفحہ ۱۳)

آدمی دوسرے کی غلطی کو جاننے کے لیے انتہائی ہوشیار ہے، مگر اپنی غلطی کو جاننے کے لیے وہ انتہائی بے وقوف بن جاتا ہے۔ یہی دہرا معیار خرابیوں کی جڑ ہے۔ اگر لوگ ایک معیار والے ہو جائیں تو تمام خرابیاں اپنے آپ ختم ہو جائیں۔

غلط فہمی

بعض اخبارات ہر روز کوئی خاص قول نقل کرتے ہیں۔ انھیں میں سے ایک ٹائمس آف انڈیا بھی ہے جو روزانہ اپنے اڈیٹوریل کے اوپر کوئی نہ کوئی قول درج کرتا ہے۔ اخبار مذکور کی اشاعت ۱۶ جولائی ۱۹۸۸ کو میں نے کھولا تو اس میں حسب ذیل فقرہ چھپا ہوا تھا:

Beware of novel affairs, for surely
all innovation is error (Muhammad)

یہ ایک حدیث رسول کا انگریزی ترجمہ ہے۔ مگر اپنی موجودہ شکل میں وہ ناقص ہے اور سخت غلط فہمی پیدا کرنے والا ہے۔ اس انگریزی فقرہ کا اردو ترجمہ کیا جائے تو وہ یہ ہوگا: نئی باتوں سے بچو، کیوں کہ ہر جدّت یقیناً غلطی ہے۔ کوئی شخص صرف اس ترجمہ کو پڑھے تو وہ سمجھے گا کہ پیغمبر اسلام نئی چیز یا نئی ایجاد کے مخالف تھے۔ حالاں کہ مذکورہ حدیث کا یہ مطلب ہرگز نہیں۔

یہ ایک لمبی حدیث کا ایک ٹکڑا ہے جو احمد، ابو داؤد، ترمذی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امّت کو یہ نصیحت فرمائی ہے کہ امورِ دین میں تم لوگ میری سنّت پر اور خلفاء راشدین کی سنّت پر قائم رہنا۔ اس سے کسی حال میں نہ ہٹنا۔ یہ نصیحت کرتے ہوئے آپ نے فرمایا:

وَاِیّاکُمْ ومُحدَثَاتِ الاُمُورِ فاِنّ کلّ مُحدثۃٍ بِدْعَۃ وکُلّ بِدْعَۃٍ ضَلَالَۃٌ — اور تم نئی بات نکالنے سے بچو، کیوں کہ ہر نئی چیز بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔

ٹائمس آف انڈیا کا فقرہ اسی حدیث کا انگریزی ترجمہ ہے۔ مگر اس حدیث میں جس بدعت سے روکا گیا ہے وہ دین میں نئی بات نکالنا ہے نہ کہ عام ضرورت کی چیزوں میں نئی بات نکالنا۔ مثلاً کوئی شخص اذان کے بدلے نقارہ بجائے تو یہ بدعت ہے۔ لیکن اذان کی آواز کو تیز کرنے کے لیے لاؤڈ اسپیکر استعمال کیا جائے تو وہ بدعت نہیں۔ حج کو قمری مہینہ کے بجائے شمسی مہینہ میں ادا کیا جائے تو یہ بدعت ہے۔ لیکن اگر حج کے سفر کے لیے اونٹ کے بجائے ہوائی جہاز استعمال کیا جائے تو یہ بدعت نہیں۔

مشین کی کہانی

۳ جون ۱۹۸۸ کو ہونے والے واقعات میں سب سے اہم اخباری واقعہ وہ حادثہ تھا جو ایران کی ہوائی کمپنی کے ساتھ پیش آیا۔ ایران ایر (Iran Air) کا ایک مسافر بردار جہاز (Airbus A-300) تہران سے اڑا۔ وہ دبئی جانے کے لیے خلیج فارس کے اوپر سے گزر رہا تھا کہ امریکہ کے جنگی جہاز (USS Vincennes) نے اس کو مار کر گرادیا۔ عملہ سمیت اس کے ۲۹۰ مسافر ہلاک ہوگئے جن میں مرد، عورتیں اور بچے سب شامل تھے۔

یہ بلاشبہ ایک وحشیانہ واقعہ تھا۔ اتنا سنگین وحشیانہ واقعہ کیوں پیش آیا۔ اس کا جواب امریکی بحریہ کے افسروں نے یہ دیا ہے کہ یہ کمپیوٹر کی غلطی (Computer error) تھی۔ ان کے کمپیوٹر نے مسافر بردار جہاز کو جنگی جہاز بتایا، اس لیے انھوں نے اس پر وار کیا۔

امریکی بحریہ کے مذکورہ جہاز پر جدید ترین قسم کے راڈر لگے ہوئے ہیں۔ اس راڈر کے ساتھ کمپیوٹر کا انتہائی جدید نظام نصب کیا گیا ہے جو مصنوعی ذہانت (Artificial intelligence) سے مسلح ہے۔ یہ سسٹم یہ صلاحیت رکھتا ہے کہ وہ فضا میں اڑنے والے جہاز کا معائنہ کرکے راڈر اسکرین پر لفظوں میں لکھ دے کہ وہ کس قسم کا جہاز ہے، دوست یا دشمن۔

۳ جون کو جب مذکورہ جہاز فضا کی بلندی میں اڑ رہا تھا تو کمپیوٹر نے اس کا معائنہ کرکے راڈر اسکرین پر جہاز کا اصل نام (ایربس اے ۳۰۰) لکھنے کے بجائے جٹ فائٹر (F-14 jet fighter) لکھ دیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ دوست جہاز نہیں ہے بلکہ دشمن کا جنگی جہاز ہے۔ اس کے فوراً بعد جہاز کے افسر (Captain Will Rogers III) نے بٹن دبایا اور دو میزائل نے اڑ کر جہاز کو اس کے تمام مسافروں سمیت قبرستان میں پہونچا دیا (ہندستان ٹائمس، ۱۳ جولائی ۱۹۸۸، صفحہ ۱۲)

جدید ملحدین کا یہ کہنا ہے کہ کائنات ایک مشین ہے۔ اگر کائنات صرف ایک مشین ہے تو یہاں مذکورہ قسم کی مشینی غلطیاں کیوں نہیں ہوتیں۔ کیا وجہ ہے کہ اتنی بڑی کائنات بالکل بے خطا انداز میں مسلسل چلی جارہی ہے۔

اسوۂ رسول

قدیم مکہ میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حق کا پیغام دینا شروع کیا تو اہل مکہ کی اکثریت نے آپ کے ساتھ بہت برا سلوک کیا۔ وہ آپ کے خلاف طعنہ زنی کرتے، آپ کا مذاق اڑاتے اور غلط صحبتیں کرتے (فجعلت قریش یهمزونه ویستهزؤن به ویغاصمونه، ۳۷۹)

اسی سلسلہ کا ایک واقعہ وہ ہے جو ابولہب کی بیوی (ام جمیل) سے متعلق ہے۔ ابن اسحاق کہتے ہیں کہ ام جمیل نے جب سورہ مَسَد کو سنا جس میں اس کا اور اس کے شوہر کا ذکر ہے تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی جب کہ آپ بیت اللہ میں تھے۔ ابوبکر صدیق بھی آپ کے پاس تھے۔ اس وقت وہ سخت غصہ میں تھی۔ اس نے کہا کہ میں شاعرہ ہوں اور پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو میں یہ شعر پڑھا:

مُذَمَّمًا عَصَيْنَا وَاَمْرَهُ اَبَيْنَا وَدِيْنَهُ قَلَيْنَا

ایک قابل مذمت شخص کی ہم نے نافرمانی کی۔ اس کی بات کا انکار کیا اور اس کے دین سے نفرت کی۔

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ قریش نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام مُذَمَّم رکھا تھا۔ اس طرح وہ آپ کے خلاف سب وشتم کرتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی یہ باتیں سن کر فرماتے:

اَلاَ تَعْجَبُوْنَ لِمَا صَرَفَ اللّٰهُ عَنِّي مِنْ اَذَى قُرَيْشٍ يَسُبُّوْنَ وَيَهْجُوْنَ مُذَمَّمًا وَانَا مُحَمَّدٌ (سیرۃ ابن ہشام، الجزء الاول صفحہ ۳۸۹)

کیا تم کو اس پر تعجب نہیں ہوتا جو اللہ نے قریش کی اذیت کو مجھ سے پھیر دیا۔ وہ مجھ کو برا کہتے ہیں اور مُذَمَّم کہہ کر ہجو کرتے ہیں۔ حالاں کہ میں محمد (تعریف کیا ہوا) ہوں۔

قدیم اہل مکہ آپ کو مُذَمَّم کہتے تھے مگر آپ کی نظر آنے والے مستقبل پر تھی جب کہ آپ عالمی سطح پر محمد بننے والے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ اہل مکہ کی باتوں پر غصہ نہیں ہوئے۔ جس شخص کی نظر مستقبل کے امکانات پر ہو وہ حال کی ناخوش گواریوں کو کوئی اہمیت نہیں دے گا۔ جس کو خدا سے ملا ہوا ہو وہ بندوں سے چھینے جانے پر برہم نہیں ہوگا۔ جس کی صحت پر آسمان گواہی دے رہا ہو، وہ زمین والوں کی تردید پر کبھی بددل نہیں ہوگا۔

ترکی کا سبق

ترکی کے عصمت انونو (۱۹۷۳-۱۸۸۴) ایک فوجی افسر تھے۔ انھوں نے کمال اتاترک کا ساتھ دیا۔ اتاترک کی وفات (۱۰ نومبر ۱۹۳۸) کے بعد وہ ترک حکومت کے صدر مقرر ہوگیے۔

کمال اتاترک کے مشہور چھ اصولوں میں سے ایک اصول سیکولرزم تھا۔ اس کا مطلب ان کے نزدیک محض مذہبی ناطرفداری نہ تھا۔ بلکہ جارحانہ لامذہبیت تھا۔ کمال اتاترک کے پورے دورِ حکومت میں اور پھر عصمت انونو کے دورِ حکومت میں یہی حکومت کی مستقل پالیسی رہی۔ مگر مذہب (اسلام) کے خلاف پوری حکومتی طاقت استعمال کرنے کے باوجود ترکی سے مذہب کا خاتمہ نہ کیا جاسکا۔ وہ بدستور پوری طاقت کے ساتھ زندہ رہا۔ یہاں تک کہ خود عصمت انونو کو اپنے آخری الکشن کے موقع پر بہت سی مذہبی پابندیوں کو ختم کرنا پڑا، کیوں کہ اس کے بغیر وہ عوامی حمایت کی امید نہیں کرسکتے تھے۔

عصمت انونو جب مرض الموت میں مبتلا ہوئے تو آخر وقت میں انھوں نے اس معاملہ میں اپنے تجربات کا خلاصہ بیان کیا۔ ان کا یہ تجرباتی تاثر عربی رپورٹ کے مطابق یہ تھا:

انني لا اكاد اُصدق ما ارى۔ لقد بذلنا كل ما نستطيع لانتزاع الاسلام من نفوس الاتراك وغرس مبادئ الحضارة الغربية مكانه۔ فإذا بنا نفاجأ بما لم نكن نتوقعه۔ فقد غرسنا العلمانية فاثمرت الاسلام۔

(الوعی الاسلامی، کویت، ذوالقعدہ ۱۴۰۸ھ صفحہ ۲۷)

میرے لیے اس کا یقین کرنا مشکل ہے جس کو میں دیکھ رہا ہوں۔ ہم نے اپنے بس بھر تمام کوشش کی کہ ترکوں کے دل سے اسلام کو نکال دیں اور اس کی جگہ مغربی تہذیب کو ان کے اندر داخل کریں۔ مگر حیرت انگیز طور پر نتیجہ ہماری توقع کے خلاف نکلا۔ ہم نے سیکولرزم کا پودا لگایا مگر اس سے جو پھل نکلا وہ اسلام تھا۔

اسلام کی جڑیں انسانی فطرت میں گہری جمی ہوئی ہیں۔ جس طرح فطرت کو ختم نہیں کیا جاسکتا اسی طرح اسلام کو بھی ختم نہیں کیا جاسکتا۔ اسلام کے خادموں کو ساری کوشش دعوت کے محاذ پر کرنا چاہیے، اسلام کی حفاظت تو اپنے آپ ہو رہی ہے۔

ایک تاثر

جنّت خدا کے محبوب بندوں کی دنیا ہے اور جہنم خدا کے مبغوض بندوں کی دنیا۔ جنت خدا کے انعام یافتہ لوگوں کی بستی ہے اور جہنم خدا کے سزا یافتہ لوگوں کی بستی۔

جنت ان لوگوں کے لیے ہے جو سچائی کا اعتراف کریں، جہنم ان لوگوں کے لیے ہے جو سچائی کی آواز سنیں اور اس کو نظر انداز کر دیں۔ مگر آج وہ روح کہیں نظر نہیں آتی جس کو اعتراف میں لذت ملے۔ ہر آدمی بے اعترافی کی شاخ پر اپنا آشیانہ بنائے ہوئے ہے۔

جنّت ان لوگوں کے لیے ہے جو ہر قسم کی ظاہری عظمتوں سے اپنے آپ کو اوپر اٹھائیں۔ اور خالص عظمتِ خداوندی میں جینے والے بن جائیں۔ اس کے برعکس جہنم ان لوگوں کے لیے ہے جو غیر خدائی عظمتوں میں جئیں۔ مگر آج کا انسان غیر خدائی عظمتوں میں گم ہے۔ خدائی عظمت میں جینے والا انسان ڈھونڈنے پر بھی کہیں نظر نہیں آتا۔

جنّت ان لوگوں کے لیے ہے جو آخرت کے لیے متحرک ہوں، اور جہنم ان لوگوں کے لیے جو دنیا کی خاطر حرکت میں آئیں۔ مگر آج لوگوں کا یہ حال ہے کہ صرف دنیا کا مفاد انھیں متحرک کرتا ہے آخرت کا مفاد انھیں متحرک کرنے والا نہیں بنتا۔

جنّت ان لوگوں کے لیے ہے جن کا یہ حال ہو کہ خدا و رسول کے حکم کا ایک حوالہ انھیں جھکنے پر مجبور کر دے۔ اور جہنم ان لوگوں کے لیے ہے جو خدا و رسول کے حکم پر جھکنے کے لیے تیار نہ ہوں مگر آج یہ حال ہے کہ انسان کے نزدیک خدا و رسول کے حکم کوئی اہمیت نہیں۔ اس کے لیے جو چیز سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے وہ اس کی شخصی یا قومی خواہشیں ہیں۔

جنّت ان لوگوں کے لیے ہے جو ربانی اخلاقیات میں جئیں۔ جنھیں سچ بولنے میں لذت ملے جن کی روح حق کی ادائیگی میں تسکین پائے۔ اس کے برعکس جہنم ان لوگوں کے لیے ہے جو جھوٹ میں لذّت پائیں، جو ناانصافی کو اپنی غذا بنائے ہوئے ہوں۔

جہنّم کے دروازہ پر لوگوں کی بھیڑ لگی ہوئی ہے، اور جنّت کی طرف جانے والا راستہ بالکل سونا پڑا ہوا ہے۔ کیسا عجیب ہے یہ غیر خدائی منظر جو آج خدا کی دنیا میں ہر طرف نظر آتا ہے

میدانِ عمل

ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ میں الرسالہ کا پرانا قاری ہوں اور اس کو پابندی کے ساتھ شروع سے آخر تک پڑھتا ہوں۔ مگر مجھے ایک معاملہ میں آپ سے اختلاف ہے۔ وہ یہ کہ آپ مسلمانوں کو پسپائی کا سبق دیتے ہیں۔ انھوں نے چند "مفکرین اسلام" کا نام لے کر کہا کہ ان کو دیکھئے، وہ ہمیشہ اقدام کی باتیں کرتے ہیں۔ مسلمان پیغمبر اعظم کی امت ہیں، وہ پسپائی کے پیغام کو کبھی قبول نہیں کر سکتے۔ اس کے بعد انھوں نے فخر کے ساتھ فارسی کا مشہور مقولہ دہرایا:

کیش مرداں نہ کہ مذہب گوسفنداں

میں نے کہا کہ میرے اور مذکورہ مفکرین کے درمیان یہ فرق نہیں ہے کہ میں پسپائی کی بات کرتا ہوں، اور وہ لوگ اقدام کی بات کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ دونوں ہی اقدام کی بات کرتے ہیں۔ جو فرق ہے وہ اس معاملہ میں ہے کہ اس اقدام کا میدان کیا ہو۔ وہ لوگ جنگ اور ٹکراؤ کے میدان میں اقدام کا نعرہ لگاتے ہیں اور میں دعوت اور تبلیغ کے میدان میں اقدام کی تجویز پیش کرتا ہوں۔ بالفاظ دیگر، دوسرے لوگ شمشیری اقدام کے مبلغ ہیں اور میں نظریاتی اقدام کا مبلغ ہوں۔ میرا اور ان کا فرق میدانِ اقدام کے بارہ میں ہے نہ کہ نفسِ اقدام کے بارہ میں۔

اقدام کسی اندھادھند کارروائی کا نام نہیں، نہ اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی خواہ مخواہ کسی چٹان پر سر پٹک کر اپنی جان دے دے۔ اقدام ایک منصوبہ بند عمل کا نام ہے۔ ایک حقیقی اقدام کے لئے وسیع علم اور زبردست ذہانت درکار ہے۔ اقدام ہمیشہ کسی فریق کے مقابلہ میں ہوتا ہے۔ اس کا اہم ترین اصول یہ ہے کہ پیشگی جائزہ لے کر معلوم کیا جائے کہ حالات کی موافقت کس کے ساتھ ہے۔ ایک صورت یہ ہے آپ فریق ثانی کے موافق میدان میں اس سے مقابلہ کریں:

To contest on another man's ground.

میدان مقابلہ اگر فریق ثانی کے حق میں ہو تو ایسی حالت میں فریق ثانی سے ٹکراؤ چھیڑنا اپنے آپ کو جان بوجھ کر شکست کی طرف لے جانا ہے۔ جب ایسا ہو تو فریق اول کو چاہئے کہ وہ حکیمانہ تدبیر سے مقابلہ کو اس میدان میں لے آئے جہاں وہ فریق ثانی کے مقابلہ میں زیادہ بہتر پوزیشن رکھتا ہو

To bring one's enemy to fight on
the ground of one's own choice.

موجودہ زمانہ میں سید احمد شہید بریلوی سے لے کر اب تک، مسلمانوں نے بے شمار چھوٹی بڑی لڑائیاں لڑی ہیں اور تقریباً ہر بار انھیں یک طرفہ ناکامی ہوئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اقدام برائے اقدام کے اصول پر عمل کرتے ہیں۔ وہ فریق ثانی کے اپنے موافق میدان میں اس سے مقابلہ کر رہے ہیں۔ حالاں کہ عقل اور اسلام دونوں کا تقاضا ہے کہ حکیمانہ تدبیر کے ذریعہ اس کو خود اپنے موافق میدان میں لایا جائے اور پھر اس سے مقابلہ کیا جائے۔

اس بات کی وضاحت کے لئے یہاں میں ایک مثال دوں گا۔

ہندستان کے مسلم لیڈر عام طور پر اس بات کی شکایت کرتے ہیں کہ ہندستان کی آزادی کے لئے انھوں نے برابر کی قربانیاں دیں۔ مگر جب ہندستان آزاد ہوا تو انھیں اس میں برابر کا حصہ نہیں ملا۔ ان سے ہر جگہ "امتیاز" کا سلوک کیا جاتا ہے۔

میرے نزدیک یہ شکایت بے معنی ہے۔ یہ مسلم لیڈروں کے فکری افلاس کو بتاتا ہے۔ انھوں نے اصل معاملہ کو نہ ماضی میں جانا، اور نہ آج وہ اس کو جانتے ہیں۔

مسلم رہنما اس بات کو نہیں جانتے کہ اصل مسئلہ آزادی کے لئے قربانی دینے کا نہیں تھا۔ اصل مسئلہ یہ تھا کہ جب آزادی آئے گی تو اس کی شکل کیا ہوگی۔ دور جدید میں یہی ہونا تھا کہ آزادی جمہوریت کے روپ میں آئے۔ مگر مسلم رہنماؤں کا ذہن ماضی میں اتنا زیادہ اٹکا ہوا تھا کہ وہ سمجھتے تھے کہ آزادی جب آئے گی تو وہ "مغل دور" کی واپسی کے ہم معنی ہوگی۔

اس بات کو ایک مثال سے اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے۔ ایک لطیفہ ہے کہ ایک سارس اور ایک لومڑی آپس میں دوست تھے۔ ایک بار دونوں نے طے کیا کہ وہ آپس میں مل کر کھیر پکائیں۔ کچھ سامان سارس لایا اور کچھ سامان لومڑی، اور دونوں نے مل کر کھیر پکائی۔ جب کھیر تیار ہوگئی اور وہ وقت آیا کہ اس کو کھایا جائے تو لومڑی نے ایک ہوشیاری کی۔ کھیر کو رکھنے کے لئے وہ ایک تشت لے آئی۔ کھیر جب تشت میں رکھی گئی تو وہ زیادہ تر لومڑی کے حصہ میں آگئی۔ لومڑی نے خوب سیر ہو کر کھایا۔ دوسری طرف سارس اپنی لمبی چونچ ادھر ادھر مارتا رہا مگر کھیر کی بہت کم مقدار اس کے حصہ میں آسکی۔ وہ کھیر پکانے میں شریک تھا، مگر وہ کھیر کھانے میں شریک نہ ہو سکا۔

اب سارس نے سوچا کہ لومڑی نے تو مجھ کو بیوقوف بنا دیا۔ اس نے سوچ کر ایک نیا منصوبہ بنایا۔ اس نے لومڑی سے کہا کہ آؤ ہم لوگ پھر ایک مرتبہ مل کر کھیر پکائیں۔ لومڑی راضی ہو گئی۔ دونوں سامان لائے اور کھیر پکا کر تیار کی گئی۔ اب جب کھیر کو برتن میں رکھنے کا مرحلہ آیا تو سارس نے فوراً ایک صراحی پیش کر دی۔ چنانچہ کھیر سب کی سب صراحی کے اندر رکھ دی گئی۔ اب سارس نے اپنی لمبی چونچ صراحی کے اندر ڈال کر کھیر کو کھانا شروع کر دیا اور لومڑی سے کہا کہ تم بھی کھاؤ۔ مگر اس بار معاملہ الٹا ہوا۔ سارس نے خوب سیر ہو کر کھیر کھالی، لومڑی کے حصہ میں کچھ نہ آیا۔

یہ لطیفہ بتاتا ہے کہ اصل مسئلہ مشترکہ کھیر پکانے کا نہیں ہے، اصل مسئلہ یہ ہے کہ کھیر تیار ہو کر کس قسم کے برتن میں رکھی جائے گی۔ اگر وہ تشت میں رکھی جانے والی ہو تو وہ لومڑی کے حصہ میں چلی جائے گی اور اگر وہ صراحی میں رکھی جائے تو وہ سارس کو ملے گی، آدمی کی عقل مندی یہ ہے کہ کھیر کو اپنے موافق برتن میں رکھنے کی کوشش کرے۔

یہ فرق کیوں

انیسویں صدی کے نصف اول میں انگریز ایک طرف سیاسی اعتبار سے ہندستان میں غلبہ حاصل کر رہے تھے۔ دوسری طرف عیسائی مشنریاں مسلمانوں کو عیسائی بنانے کے لئے اپنی ساری طاقت صرف کر رہی تھیں۔ ہمارے علما ان دونوں خطرات کے مقابلہ کے لئے اٹھے اور اس کے لئے غیر معمولی قربانیاں پیش کیں۔ مگر دونوں محاذوں کا انجام ایک دوسرے سے مختلف رہا۔ سیاسی محاذ پر بے پناہ قربانیوں کے باوجود انھیں مکمل ناکامی ہوئی۔ دوسری طرف مشنری محاذ پر نسبتاً کمتر قربانی کے باوجود انھیں مکمل کامیابی حاصل ہوئی۔

دونوں محاذوں کے اس فرق کی علامت مولانا رحمت اللہ کیرانوی (۱۳۰۸-۱۲۳۳ھ) ہیں۔ مولانا رحمت اللہ کیرانوی کے زمانہ میں یورپ سے پادری فنڈر (Funder) آیا اور اس نے ہندستان کے مسلمانوں میں نہایت طاقت کے ساتھ مسیحیت کی تبلیغ شروع کر دی۔ اس کے مقابلہ کے لئے جو لوگ اٹھے، ان میں ایک ممتاز نام مولانا رحمت اللہ کیرانوی کا تھا۔ انھوں نے "اظہار الحق" اور دوسری کتابیں لکھیں۔ اسی کے ساتھ انھوں نے ڈاکٹر وزیر خاں کی مدد سے فنڈر سے مناظرہ کیا۔ آگرہ کے مشہور مناظرہ (۱۰-۱۱ اپریل ۱۸۵۴) میں انھوں نے پادری فنڈر کو ایسی شکست دی کہ اس

کے بعد وہ ہندستان سے بھاگ کھڑا ہوا اور قسطنطنیہ (ترکی) میں جاکر پناہ لی۔

اب تصویر کا دوسرا رخ دیکھئے۔ ۱۸۵۷ میں شاملی کے میدان میں علماء نے انگریزی فوج کا مسلح مقابلہ کیا۔ اس مقابلہ میں مولانا رحمت اللہ کیرانوی بھی شریک تھے۔ اس وقت ہمارے علماء کے پاس روایتی قسم کے دستی ہتھیار تھے، اور انگریزی فوج کے پاس جدید قسم کے دور مار ہتھیار۔ اس مقابلہ میں علماء کی جماعت کو، زبردست قربانی کے باوجود، مکمل شکست ہوئی۔ اس کے بعد علماء کی گرفتاریاں شروع ہوئیں اور ان کو پھانسی پر چڑھایا جانے لگا۔ مولانا رحمت اللہ کیرانوی نے ہندستان سے مکہ چلے جانے کا فیصلہ کیا۔ وہ مہیب جنگلوں اور خطرناک راستوں پر پیدل چلتے ہوئے اور ناقابل بیان تکلیفیں اور مشقتیں برداشت کرتے ہوئے سورت کی بندرگاہ پر پہنچے۔ وہاں سے سمندری جہاز پر سوار ہو کر جدہ چلے گئے اور بقیہ زندگی وہیں مقیم رہے (معارف مئی ۱۹۸۸)

ان دونوں واقعات کو تقابلی طور پر دیکھئے۔ ایک جگہ مولانا رحمت اللہ کیرانوی کے مقابلہ میں پادری فنڈر میدان چھوڑ کر بھاگا تھا، دوسری جگہ "پادری فنڈر" کے مقابلہ میں خود مولانا رحمت اللہ کیرانوی کو میدان چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔

اس فرق کی وجہ میدانِ مقابلہ کا فرق ہے۔ آگرہ میں دونوں کے درمیان مقابلہ مناظرہ (فکری اور نظریاتی میدان میں) ہوا تھا۔ فکری اور نظریاتی میدان میں اسلام ممتاز طور پر ہر ایک کے مقابلہ میں فوقیت رکھتا ہے۔ اس لئے فریق ثانی کو مکمل ناکامی ہوئی۔ اس کے برعکس شاملی میں جو مقابلہ ہوا وہ فوج اور ہتھیار کے میدان میں تھا۔ اس میدان میں ہمارے علماء فریق ثانی کے مقابلہ میں فیصلہ کن طور پر پسماندہ تھے۔ ہمارے علماء کے پاس زیادہ تر دستی ہتھیار تھے، جب کہ فریق ثانی دور مار ہتھیاروں سے مسلح تھا، یہی فرق تھا جس کی بنا پر یہاں علماء کو مکمل ناکامی ہوئی۔

میں کہوں گا کہ آپ معاملہ پر زیادہ گہرائی کے ساتھ غور کیجئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ہم میدان مقابلہ کو بدلنا چاہتے ہیں۔ ہم فریق ثانی کو اس میدان میں لانا چاہتے ہیں جہاں وہ ناموافق پوزیشن میں ہو اور ہم موافق پوزیشن میں۔ ہمارے اور دوسرے لوگوں میں جو فرق ہے وہ یہ ہے کہ ہم مسلمانوں کو اس میدان میں متحرک کرنا چاہتے ہیں جہاں ان کا حریف بھاگے۔ اور دوسرے لوگ مسلمانوں کو وہاں ٹکرانا چاہتے ہیں جہاں بالآخر خود ان کو بھاگنا پڑے۔

مولانا رحمت اللہ کیرانوی کا واقعہ، علامتی طور پر، ہماری پوری جدید تاریخ کی تصویر ہے۔ موجودہ زمانہ میں بار بار یہی ہوا۔ اور اب بھی یہی ہو رہا ہے کہ مسلمان فریق ثانی سے اس کے موافق میدان میں ٹکراؤ کرتے ہیں اور ہر بار شدید ترین شکست سے دوچار ہو رہے ہیں۔

دین کا استحکام

قرآن میں اعلان کیا گیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے اوپر اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کو کامل کر دیا۔ اور اپنی نعمت کی تکمیل کر دی اور قیامت تک کے لئے اسلام کو مقبول دین کی حیثیت سے پسند کر لیا (المائدہ ۳) اس اعلان کے ساتھ مزید ارشاد ہوا ہے:

الیومَ یئسَ الذین کفروا مِن دینکم فلا تخشوهم واخشَونِ (المائدہ ۳)	آج انکار کرنے والے تمہارے دین کی طرف سے مایوس ہو گئے، پس تم ان سے نہ ڈرو اور صرف مجھ سے ڈرو۔

قرآن کی یہ آیت ذی الحجہ ۹ھ میں اتری۔ اس کے اترنے کے تقریباً ڈھائی مہینے بعد پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو گئی۔ اس آیت میں الیوم (آج) کا لفظ بہت بامعنی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن دو مذہبی دوروں کے درمیان حد فاصل ہے۔ قرآن کے بعد مذہب کی دنیا میں ایک نیا دور شروع ہوا ہے۔ پہلے اگر "تخشوهم" کا دور تھا، تو اب "اخشونی" کا دور ہے۔ پہلے اگر غلبۂ کفر کا دور تھا، تو اب غلبۂ دین کا دور ہے۔ قرآن کی تکمیل نے اب خدا کے دین کو آخری طور پر مستحکم کر دیا ہے۔ اس آیت سے صراحۃً یہ ثابت ہو رہا ہے کہ اب تشویش اور اندیشہ کی چیز یہ ہے کہ اہل ایمان کے اندر خشیت الٰہی (خدا کا خوف) باقی نہ رہے۔ خارجی دشمنوں کی طاقت خواہ وہ کتنی ہی زیادہ ہو، اہل ایمان کے لئے کوئی خطرہ پیدا نہیں کرتی۔

دین کے غلبہ واستحکام سے مراد اس کا سیاسی غلبہ واستحکام نہیں۔ سیاسی غلبہ اس دنیا میں کبھی ہوتا ہے اور کبھی نہیں ہوتا۔ مزید یہ کہ وہ اگر ایک مقام پر پایا جاتا ہے تو دوسرے مقام پر نہیں پایا جاتا۔ اس لئے یہاں غلبہ سے وہ غلبہ مراد لینا ہوگا جو ہر وقت اور ہر جگہ پوری طرح حاصل رہے۔ جس میں کبھی انقطاع ممکن نہ ہو۔ اس قسم کا جاری اور مستمر غلبہ صرف فکر اور نظریہ سے متعلق ہو سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہاں غلبہ سے مراد فکری غلبہ ہے۔ یہ قرآن اور دین کامل کی وہ خصوصیت ہے جو اس کو ہر حال میں حاصل رہے گی۔ حتی کہ کسی مقام پر کوئی ایک شخص قرآن ہو تو وہ بھی اس سے

خالی نہیں ہوسکتا۔

قرآن کی تکمیل کا مطلب یہ ہے کہ اس کے حق میں ایسے حالات پیدا کر دئے گئے کہ وہ قیامت تک اپنی اصل حالت میں محفوظ رہے۔ قرآن کے ذریعہ دنیا میں ایسا انقلاب لایا گیا جس کے نتیجہ میں ہمیشہ کے لئے مذہبی جبر کا ماحول ختم ہوگیا اور آدمی کو آزادانہ طور پر اظہار خیال کا حق حاصل ہوگیا۔ اسی طرح اس انقلاب کے نتیجہ میں علمی ترقیوں کا دروازہ کھلا جس نے دین خداوندی کی صداقت کو خود انسانی علم کے معیار پر مبرہن اور مدلل کر دیا۔ جب یہ سب ہوجائے تو اس کے بعد دین الٰہی کی طاقت بے پناہ ہو جاتی ہے۔ اب خدا کا دین ایک محفوظ اور قائم شدہ دین کی حیثیت حاصل کر لیتا ہے۔ اور جب خدا کا دین محفوظ اور قائم شدہ دین کی حیثیت حاصل کر لے تو اس کی طاقت اتنی زیادہ ہو جاتی ہے کہ کوئی بھی اس کو زیر نہ کر سکے۔

سید احمد شہید بریلوی

اس سلسلہ میں ایک مثال سید احمد شہید بریلوی اور ان کے ساتھیوں کی ہے۔ انھوں نے انیسویں صدی کے ربع ثانی میں پنجاب کے سکھ حکمراں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے خلاف جہاد کیا۔ اس میں انھیں مکمل شکست ہوئی۔ ۶ مئی ۱۸۳۱ کو بالاکوٹ میں سید صاحب اور ان کے اکثر ساتھیوں کو سکھ فوج نے ہلاک کر دیا۔ زبردست جانی اور مالی نقصان کے باوجود اس جنگ کا مطلق کوئی فائدہ مسلمانوں کو نہیں ملا۔ البتہ یہ نقصان ہوا کہ مغل دور میں گرو گوبند سنگھ، گرو ارجن سنگھ اور گرو تیغ بہادر سنگھ کے قتل سے سکھوں میں مسلمانوں کے خلاف جو نفرت پیدا ہوئی تھی اس میں کچھ اور اضافہ ہوگیا۔

سید احمد شہید بریلوی کا اقدام مہاراجہ رنجیت سنگھ کے خلاف ناقابل فہم حد تک غیر دانشمندانہ تھا۔ اس کی سلطنت تبت سے لے کر درہ خیبر تک پھیلی ہوئی تھی۔ دونوں کی فوجی طاقت میں ناقابل عبور حد تک فرق پایا جا رہا تھا۔ سید صاحب کے پاس غیر تربیت یافتہ مریدین کی ایک بھیڑ تھی جو کہ صرف روایتی ہتھیاروں سے مسلح تھی۔ دوسری طرف مہاراجہ رنجیت سنگھ کی فوج نہ صرف تعداد میں بہت زیادہ تھی، بلکہ وہ زیادہ جدید ہتھیاروں سے مسلح تھی۔ حتیٰ کہ اس کے پاس توپیں بھی موجود تھیں۔

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب اس واقعہ سے بے خبر تھے کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ نہایت مدبر حکمراں ہے۔ فرانس کے ایک سیاح وکٹر جاکوماں (Victor Jacquemont) نے اس کو چھوٹا

نپولین (Bonaparte in miniature) لکھا ہے۔ اسی طرح دوسرے مورخوں اور سیاحوں نے مہاراجہ رنجیت سنگھ کے تدبر اور حکمرانی کی صلاحیت کا غیر معمولی الفاظ میں اعتراف کیا ہے۔ اس کے اسی تدبر کا نتیجہ تھا کہ اس نے فوج کی تنظیم جدید کی اہمیت کو محسوس کیا۔ ۱۸۲۰ء میں اس نے اپنی فوج کو یورپ کے معیار پر منظم کرنا شروع کیا۔ اس نے یورپ کے ۵۰ فوجی افسروں کو اپنی فوج کی تربیت پر مقرر کیا، ان میں اکثریت ان فوجی افسروں کی تھی جو نپولین بونا پارٹ کی فوج میں کام کر چکے تھے۔

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) کے مقالہ نگار نے اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ رنجیت سنگھ کی اس فوج نے ۱۸۳۱ میں سرحدی قبائل کی ایک شورش کو کامیابی کے ساتھ کچل دیا جو ایک جنونی مسلمان سید احمد بریلوی، کے نعرۂ جہاد کے تحت ابھری تھی:

In 1831 it successfully quelled a rising of the Frontier tribesmen roused to a holy war (Jihad) by the Muslim fanatic Sayyed Ahmad (15/507).

سید احمد شہید بریلوی نے سکھوں کے اوپر شمشیری قوت کو استعمال کیا۔ مگر وہ مکمل طور پر ناکام رہے۔ زبردست نقصان اور قربانی کے باوجود وہ ایک فی صد کے درجہ میں بھی کوئی فائدہ حاصل نہ کر سکے۔ دوسری طرف انھیں سکھوں کو اسلام کی دعوتی طاقت مسلسل مسخر کرتی رہی ہے۔

گرونانک اسلام کی تعلیمات سے اتنا زیادہ متاثر ہوئے کہ انھوں نے توحید اور رسالت محمدی کے عقیدہ کو اپنی مذہبی کتاب (گرو گرنتھ صاحب) میں شامل کیا۔ امرتسر کے سورن مندر کی بنیاد مسلمان بزرگ میاں میر سے رکھوائی گئی۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دربار میں کچھ علما گئے تو اس نے تخت سے اتر کر اپنی لمبی داڑھی سے ان کے جوتے صاف کئے۔ اس کے علاوہ بہت سے سکھ ہیں جنھوں نے باقاعدہ کلمۂ توحید کا اقرار کرکے اسلام قبول کر لیا۔ انھیں میں سے ایک مولانا عبید اللہ سندھی (۱۹۴۴ - ۱۸۷۲) تھے۔ وہ سندھ کے ایک سکھ گھرانے میں پیدا ہوئے۔ بعد کو انھوں نے اسلامی کتابیں پڑھیں اور اسلام سے متاثر ہو کر اسلام کے دائرہ میں داخل ہو گئے۔ وغیرہ۔

حدیبیہ کی مثال

روایات میں آتا ہے کہ ایک صحابی نے بعد کے دور میں تابعین سے کہا کہ تم لوگ فتح مکہ کو فتح سمجھتے ہو، مگر ہم لوگ واقعہ حدیبیہ کو فتح قرار دیتے تھے (عن البراء قال: تعدّون الفتحَ

فتح مكة - ونحن نعد الفتح يوم الحديبية ، سيرة ابن كثير، المجلد الثالث، صفحہ ۳۲۴)

فتح مکہ (۸ھ) کھلا ہوا فتح کا واقعہ تھا۔ جب کہ حدیبیہ بظاہر شکست اور پسپائی کا واقعہ تھا۔ کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے تقریباً ڈیڑھ ہزار اصحاب عمرہ کے ارادہ سے مدینہ سے مکہ کے لئے روانہ ہوئے۔ مگر قریش نے آپ کو مکہ میں داخل ہونے نہیں دیا۔ آپ کو اپنے تمام ساتھیوں سمیت عمرہ ادا کئے بغیر راستہ ہی سے واپس آجانا پڑا۔ اس کے باوجود صحابہ کرام کے نزدیک فتح کا اصل واقعہ وہ تھا جو حدیبیہ میں پیش آیا نہ کہ وہ جب کہ مکہ میں فاتحانہ داخلہ ہوا۔

اصحاب رسول کا یہ نقطہ نظر بتاتا ہے کہ پسپائی بھی بہت بڑا اقدام ہے۔ بظاہر ایک شکست کے واقعہ میں فتح کا راز چھپا ہوتا ہے۔ واقعہ کا یہ پہلو بے حد اہم ہے، اور اس بنا پر حدیبیہ کے واقعہ کا نہایت گہرائی کے ساتھ مطالعہ کیا جانا چاہئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے تقریباً ڈیڑھ ہزار اصحاب کے ساتھ مدینہ سے مکہ کے لئے روانہ ہوئے۔ یہ یکم ذی قعدہ ۶ ھ کی تاریخ تھی اور آپ کا مقصد یہ تھا کہ مکہ پہنچ کر بیت اللہ کا عمرہ کریں۔ قریش پچھلے ۶ سال سے مسلمانوں کے لئے زیارتِ کعبہ کا راستہ بند کئے ہوئے تھے۔ اس مدت میں کوئی مسلمان نہ حج کرسکتا تھا اور نہ عمرہ۔ اس لئے جب انھوں نے سنا کہ ڈیڑھ ہزار مسلمانوں کا قافلہ آرہا ہے کہ وہ مکہ میں داخل ہوکر عمرہ کرے تو وہ سخت غضبناک ہوگئے۔ ذی قعدہ کا مہینہ اگرچہ حرام مہینوں میں سے تھا۔ یہ مہینہ سیکڑوں سال سے کعبہ کی زیارت اور حج کے لئے محترم سمجھا جاتا تھا۔ کسی کو یہ حق نہ تھا کہ باہر سے آنے والے کسی شخص کو زیارت کعبہ سے روکے۔ مگر قریش نے جاہلی عصبیت کے تحت یہ فیصلہ کیا کہ وہ رسول اللہ ؐ اور آپ کے اصحاب کو مکہ میں داخل ہونے نہیں دیں گے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دو دن کی مسافت طے کرکے عُسفان کے مقام پر پہنچے۔ یہاں آپ کی ملاقات بُسر بن سفیان الکعبی سے ہوئی جو کہ مکہ کی طرف سے آرہا تھا۔ اس نے بتایا کہ قریش کو آپ کے اس سفر کی خبر ہوگئی ہے۔ وہ مکہ سے نکل کر ذی طوی میں جمع ہوگئے ہیں۔ انھوں نے چیتے کی کھالیں پہن رکھی ہیں (یعنی سخت غضب ناک ہیں) انھوں نے عہد کر رکھا ہے کہ وہ ہرگز آپ کو مکہ میں داخل ہونے نہیں دیں گے۔ اور انھوں نے خالد بن ولید کو ۲۰۰ گھوڑے سواروں کے ساتھ کراع الغمیم کی طرف روانہ کیا ہے تاکہ آپ سے مڈبھیڑ کریں (سیرت ابن ہشام، الجزء الثالث

صفحہ ۳۵۶)

اب ایک صورت یہ تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے مقابلہ کے لئے تیار ہو جاتے اور اپنے لوگوں کو جہاد و قتال کی راہ میں لگا دیتے۔ مگر آپ نے اس کے بالکل برعکس عمل فرمایا۔ آپ نے اپنے اصحاب کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ تم میں کون شخص ہے جو ہم کو خالد کے راستہ کو چھوڑ کر دوسرے راستہ سے چلا کر آگے لے جائے (مَنْ رَجُلٌ يَخْرُجُ بِنَا عَلٰى طَرِيقٍ غَيْرِ طَرِيقِهِمُ الَّتِي هُمْ بِهَا، صفحہ ۳۵۷)

عبد اللہ بن ابی بکر کہتے ہیں کہ قبیلہ اسلم کے ایک شخص نے کہا کہ اے خدا کے رسول، یہ کام میں کروں گا۔ اس کے بعد وہ مسلمانوں کے قافلہ کو لے کر روانہ ہوا۔ اس نے اس معروف راستہ کو چھوڑ دیا جس پر خالد بن ولید بڑھے ہوئے آرہے تھے۔ اس کے بجائے وہ ایک اور سمت سے روانہ ہوئے۔ باقاعدہ راستہ نہ ہونے کی وجہ سے یہ سفر سخت دشواریوں کے ساتھ طے ہوا۔ حتی کہ اس پر مشقت سفر پر بعض مسلمانوں کی زبان سے کلمۂ شکایت نکل گیا۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے فرمایا: کہو کہ ہم اللہ سے مغفرت چاہتے ہیں اور اس کی طرف توبہ کرتے ہیں (قولوا نستغفر الله ونتوب اليه، ۳۵۷)

جس موقع پر یہ استغفار اور توبہ کرائی گئی اس کے لحاظ سے دیکھئے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ——— جب تم کو اپنے آپ پر مصیبت اٹھا کر ٹکراؤ سے بچنے کا حکم دیا گیا تو تم نے شکایت کا لفظ کیوں اپنی زبان سے نکالا۔ تم کو کامل رضامندی کے ساتھ اس خدائی منصوبہ پر چلنا چاہئے تھا۔ اب جب کہ اس معاملہ میں تم سے بے صبری کا اظہار ہوا ہے تو استغفار اور توبہ کے ذریعہ اس کی تلافی کرو۔

اصل یہ ہے کہ قریش کوئی نہ کوئی بہانہ نکال کر جنگ چھیڑنا چاہتے تھے مگر آپ نے ہر قیمت پر جنگ سے اعراض کیا۔ خالد بن ولید سواروں کا دستہ لے کر آپ کی طرف بڑھے تو آپ نے راستہ بدل دیا۔ خراش بن امیہ کو آپ نے سفیر بنا کر مکہ بھیجا۔ وہاں قریش نے ان کے اونٹ کو مار ڈالا۔ وہ خراش کو بھی قتل کر دینا چاہتے تھے تاہم وہ کسی نہ کسی طرح بھاگ کر واپس آگئے۔ قیام حدیبیہ کے زمانہ میں ایک بار مکہ کے پچاس آدمی رات کے وقت آئے اور صحابہ کے پڑاؤ پر پتھر مارنا اور تیر برسانا

شروع کیا۔ انھوں نے آپ کو عمرہ کے لئے مکہ میں داخل ہونے سے روکا۔ یہ بذات خود یہ معنی رکھتا تھا کہ آپ مشتعل ہو کر آمادۂ جنگ ہو جائیں۔ آخری مرحلہ میں جب معاہدۂ حدیبیہ کی شرطیں مقرر کی جانے لگیں تو انھوں نے یک طرفہ شرائط پر اصرار کیا جو تمام مسلمانوں کے لئے سخت اشتعال انگیز اور ناقابلِ برداشت تھا وغیرہ۔ مگر آپ برابر ٹکراؤ سے اعراض کرتے رہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حدیبیہ پہنچ کر رک گئے۔ اس مقام کا موجودہ نام شُمیسی ہے اور مکہ سے تقریباً دس میل کے فاصلہ پر ہے۔ یہیں پر قریش کے نمائندوں سے گفتگو ہوئی اور وہ صلح طے پائی جو صلح حدیبیہ کے نام سے مشہور ہے۔

حدیبیہ کے پورے واقعہ پر غور کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قریش کے درمیان ایک بلا اعلان مقابلہ جاری تھا۔ قریش کی ساری کوشش یہ تھی کہ آپ کو میدان جنگ میں لے آئیں۔ اس کے برعکس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قریش کے ہر ظلم کو سہتے ہوئے اور ان کی ہر اشتعال انگیزی کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کوشش میں لگے ہوئے تھے کہ قریش کو صلح کے میدان میں لے آئیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر ردعمل اور جوابی کارروائی کا انداز اختیار فرماتے تو قریش کا منصوبہ کامیاب ہو جاتا اور مسلمان اور قریش ایک دوسرے سے ٹکرا جاتے۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یک طرفہ صبر اور اعراض اس بات کی ضمانت بن گیا کہ قریش کا خونی منصوبہ کامیاب نہ ہو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مصالحانہ منصوبہ کامیاب ہو جائے۔

یہ دراصل وہی تدبیر تھی جس کو جنگ کی اصطلاح میں (Ground of one's own choice) کہا جاتا ہے۔ یعنی حریف کو مقابلہ کے لئے اپنے موافق میدان میں لے آنا۔ اس وقت قریش کے لئے مقابلہ کا موافق میدان جنگ تھا کیوں کہ قریش جنگی طاقت میں واضح طور پر مسلمانوں پر برتری رکھتے تھے۔ دوسری طرف فکری اور نظریاتی میدان میں مسلمانوں کو برتری حاصل تھی۔ قریش کی بت پرستی کے مقابلہ میں اسلام کی توحید ہر اعتبار سے فائق حیثیت رکھتی تھی۔ اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ساری کوشش یہ تھی کہ آپ کے اور قریش کے درمیان مقابلہ کا میدان جنگ نہ بنے بلکہ آپ کا اور قریش کا مقابلہ فکری اور نظریاتی میدان میں منتقل ہو جائے۔

تاہم اس مقصد کو حاصل کرنا آسان کام نہ تھا۔ ایک طرف اس کے لئے ضروری تھا کہ آپ

اشتعال انگیزی کے باوجود مشتعل نہ ہوں۔ حتیٰ کہ قریش کی جارحیت کو بھی خاموشی کے ساتھ برداشت کریں۔ اور دوسری چیز یہ کہ قریش کی ہر شرط کو یک طرفہ طور پر منظور کرتے چلے جائیں۔ چنانچہ آپ نے یہی کیا۔ حدیبیہ میں آپ کے اور قریش کے درمیان جو معاہدہ طے پایا اس میں تمام شرطیں یک طرفہ طور پہ قریش کے حق میں تھیں۔ اس کے باوجود آپ نے ان تمام شرطوں کو اس لئے منظور کر لیا کہ اس کی رو سے قریش اگلے دس سال کے لئے اس بات کے پابند ہو جاتے تھے کہ وہ مسلمانوں کے خلاف براہ راست یا بالواسطہ جنگ نہیں کریں گے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب حدیبیہ کا معاہدۂ صلح کر کے مدینہ کے لئے واپس ہوئے تو راستہ میں سورہ فتح نازل ہوئی جس کی پہلی آیت یہ تھی: انا فتحنا لك فتحا مبینا (ہم نے تم کو کھلی ہوئی فتح دے دی) یعنی فریق ثانی مقابلہ کو اپنے موافق میدان (جنگ) کی طرف لے جانا چاہتا تھا۔ مگر اس معاہدہ کے بعد فریق ثانی کے ساتھ تمہارا مقابلہ اس میدان (دعوت) میں آگیا جو واضح طور پر تمہارے موافق ہے۔

بعد کے حالات نے کامل طور پہ اس اندازہ کی تصدیق کر دی۔ حدیبیہ کے ناجنگ معاہدہ کے بعد مسلمانوں اور دیگر قبائل کے درمیان آزادانہ اختلاط شروع ہو گیا۔ توحید کی دعوت بلا روک ٹوک ہر طرف پھیلنے لگی۔ توحید کا پیغام جہاں بھی پہنچا اس نے شرک اور بت پرستی کے ذہن کو ہارنے پر مجبور کر دیا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ صلح حدیبیہ سے پہلے تقریباً بیس سال میں جتنے لوگ مسلمان ہوئے تھے اس سے بہت زیادہ لوگ صلح حدیبیہ کے بعد صرف دو سال میں مسلمان ہو گئے۔ اب اسلام کی عددی طاقت اتنی زیادہ ہو چکی تھی کہ قریش کے اندر مقابلہ کا حوصلہ باقی نہ رہا۔ وہی قریش جنھوں نے ۶ھ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کو مکہ میں صرف عمرہ کی غرض سے داخل ہونے پر پابندی لگادی تھی، ۸ھ میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دس ہزار اصحاب کے ساتھ مکہ کی طرف فاتحانہ کوچ کیا تو قریش کے سردار نے مکہ میں اعلان کر دیا کہ اپنے گھروں میں داخل ہو جاؤ، کیوں کہ آج ہمارے اندر محمدؐ سے مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں۔

صلح حدیبیہ، ایک لفظ میں، فریق ثانی سے مقابلہ کو جنگ کے میدان سے نکال کر دعوت کے میدان میں لانا ہے۔ یہ اسلام کی حکمتِ بالغہ کی اعلیٰ ترین مثال ہے۔ اور اس مثال کا سب سے اعلیٰ نمونہ وہ ہے جو خود پیغمبر اسلام صلی اللہ

علیہ وسلم نے اپنے عمل سے قائم فرمایا۔

وسیع تر میدان

ظاہری طور پر دیکھنے میں حدیبیہ کا واقعہ میدان مقابلہ سے واپسی کا واقعہ معلوم ہوتا ہے لیکن گہرائی کے ساتھ دیکھئے تو وہ چھوٹے مقابلہ سے ہٹ کر بڑے مقابلہ کی طرف جانا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ "حدیبیہ" محدود میدان مقابلہ کو چھوڑ کر زیادہ وسیع میدان مقابلہ کی طرف اقدام تھا۔ اس اعتبار سے وہ بلاشبہ تدبیری حکمت (Strategy) کی ایک شاہکار مثال ہے۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کوئی بے مشن آدمی نہ تھے۔ بلکہ آپ کا ایک عظیم الشان مشن تھا۔ اور صاحب مشن آدمی کے لئے پسپائی کا کوئی سوال نہیں۔ آپ کا معاملہ یہ تھا کہ آپ لوگوں کو یہ پیغام دیتے تھے کہ وہ شرک کے بجائے توحید کا طریقہ اختیار کریں۔ آپ مخلوق پرستی کے بجائے خالق پرستی، بے اصول زندگی کے بجائے بااصول زندگی، دنیا پسندی کے بجائے آخرت پسندی، مصنوعی طریقوں کے بجائے فطری طریقوں کو اختیار کرنے کے علم بردار تھے۔ آپ کے یہ افکار دنیا کے تمام افکار سے زیادہ طاقتور تھے۔ مگر مسلسل جنگی حالات نے آپ کے افکار کی اس طاقت کو ظاہر ہونے سے روک رکھا تھا۔

اس معاملہ کو ایک عام مثال کے ذریعہ یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ ایک سائنسداں اور ایک نیگرو باکسر کا مقابلہ اگر باکسنگ کے اکھاڑے میں ہو رہا ہو تو وہاں یقینی طور پر باکسر کا پلہ بھاری رہے گا لیکن اگر سائنس داں کسی حکمت سے مقابلہ کے میدان کو بدل دے اور باکسر کو باکسنگ کے اکھاڑے سے نکال کر سائنٹفک بحث کی میز پر لے آئے تو یقینی طور پر صورت حال بدل جائے گی۔ پہلے اگر باکسر کا پلہ بھاری تھا تو اب سائنس داں کی جیت یقینی ہو جائے گی۔

قدیم عرب میں، ہجرت کے بعد یہ صورت حال تھی کہ قریش کی ہٹ دھرمی نے "جنگ" کو مقابلہ کا میدان بنا دیا تھا۔ صلح حدیبیہ کی صورت میں جب دونوں فریقوں کے درمیان دس سال کا ناجنگ معاہدہ (No-war pact) ہو انو اس کے بعد مقابلہ کا میدان بدل گیا۔ اب میدانِ جنگ کے بجائے میدانِ افکار مقابلہ کا مقام قرار پایا۔ اس دوسرے میدان میں اہل اسلام واضح طور پر اپنے فریق کے مقابلہ میں فائق حیثیت رکھتے تھے۔ اس لئے نئے میدان میں آتے ہی اسلام کی فکری اور نظریاتی فتح کا سیلاب پھٹ پڑا۔ لوگ جوق درجوق مذہب توحید کے دائرے میں داخل ہوگئے۔

میز کی سطح پر آتے ہی " باکسر کے مقابلہ میں " سائنس داں " کی جیت یقینی ہوگئی۔

حدیبیہ کے وقت محمد صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کی طرف جارہے تھے تو آپ کے ساتھ ڈیڑھ ہزار سے بھی کم آدمی تھے۔ اس کے دو برس بعد آپ نے دوبارہ مکہ کی طرف سفر کیا تو آپ کے ہمراہ دس ہزار آدمی تھے۔ چنانچہ جب آپ مکہ کے قریب پہنچے اور لوگوں نے آپ کے ساتھ انسانوں کا سیلاب دیکھا تو مکہ کے سرداروں نے مکہ میں اعلان کر دیا کہ گھروں میں بیٹھ جاؤ، کیوں کہ آج ہمارے اندر محمد سے لڑنے کی طاقت نہیں ـــــ مکہ خون بہائے بغیر فتح ہوگیا اور اسی کے ساتھ ساری عرب قوم بھی۔

یہ مکمل طور پر ایک غیر خونی انقلاب تھا۔ مگر اس غیر خونی انقلاب کو وجود میں لانے کے لئے اس کے قائد کو خود خون ہونا پڑا۔ اس کے لئے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم ایسی شرائط پر راضی ہوئے جو بظاہر انتہائی طور پر یک طرفہ شرائط تھیں۔ آپ کو آگے جانے کے لئے پیچھے ہٹنا پڑا۔ آپ کو فتح حاصل کرنے کے لئے شکست پر راضی ہونا پڑا۔ حتی کہ آپ کو اپنی حیثیت اصلی (رسول اللہ) کا لفظ کاغذ سے حذف کرنا پڑا تاکہ وہ دوبارہ زیادہ کامل طور پر عالمی نقشہ پر لکھا جائے۔

ضروری شرط

حریف سے اپنے موافق میدان میں مقابلہ کرنا، اس کے اوپر فتح حاصل کرنے کی سب سے زیادہ کامیاب تدبیر ہے۔ یہ تدبیر حریف کے مقابلہ میں کامیابی کو یقینی بنا دیتی ہے۔ مگر اس تدبیر کو ستعمال کرنے کی ایک ضروری شرط ہے۔ لوگ چونکہ اس شرط کو پورا نہیں کر پاتے، اس لئے وہ س کے فائدے سے بھی محروم رہتے ہیں۔

یہ شرط، ایک لفظ میں، اپنے آپ کو ردعمل کی نفسیات سے بچانا ہے۔ جب بھی کسی سے مقابلہ پیش تا ہے تو اس کی طرف سے طرح طرح کی مخالفانہ کارروائیاں کی جاتی ہیں۔ اشتعال انگیز الفاظ سے لے کر عملی نقصانات تک ہر قسم کے تلخ تجربات سامنے آتے ہیں۔ اس وقت اگر آدمی بھڑک اٹھے تو وہ ہی جوش کے ساتھ حریف سے وہاں ٹکرا جائے گا جہاں وہ کھڑا ہوا ہے۔ لیکن اگر وہ اشتعال انگیزی ے باوجود مشتعل نہ ہو اور ٹھنڈے ذہن سے سوچ کر مقابلہ کا منصوبہ بنائے تو وہ کوشش کرے گا کہ یف کو اپنے موافق میدان میں لائے۔ اور جب ایسا ہو گا تو اس کی کامیابی یقینی ہو جائے گی۔

موجودہ زمانہ کے مسلمان جان و مال کی بے پناہ قربانی کے باوجود ہر بار اپنے حریف سے

شکست کھا رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب حریف کی طرف سے کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش آتا ہے تو وہ فوراً بھڑک کر اس سے لڑ جاتے ہیں۔ اور یہ تاریخ کا فیصلہ ہے کہ ردعمل کے تحت کی جانے والی لڑائی کا انجام ہمیشہ شکست ہو، اور ردعمل سے اوپر اٹھ کر کئے جانے والے مقابلہ کا انجام ہمیشہ فتح کی صورت میں نکلے۔

جامد گروہ، توسیعی گروہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ذوالقعدہ ۶ھ میں حدیبیہ کا معاہدہ کرکے مدینہ کے لئے واپس ہوئے۔ ابھی آپ راستہ ہی میں تھے کہ یہ آیت اتری: انا فتحنا لك فتحا مبينا (الفتح ۱) یعنی ہم نے تم کو تمہارے مخالفوں کے اوپر کھلی فتح دے دی۔ حدیبیہ کی صلح بظاہر فریق ثانی کی شرطوں پر کی گئی تھی، اس لئے جب یہ آیت اتری تو آپ کے اصحاب نے طرح طرح کے سوالات کئے۔ ان میں سے ایک یہ تھا:

قال رجل من اصحاب رسول الله صلی الله علیه وسلم ای رسول الله اوفتح هو قال صلی الله علیه وسلم ای والذی نفس محمد بیده انه لفتح

اصحاب رسول میں سے ایک شخص نے کہا کہ اے خدا کے رسول، کیا وہ فتح ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ہاں، اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں محمد کی جان ہے، بے شک وہ فتح ہے۔

(تفسیر ابن کثیر، الجزء الرابع، ۱۸۳)

متعدد صحابہ سے مروی ہے کہ انھوں نے بعد کے لوگوں سے کہا کہ تم لوگ فتح مکہ کو فتح سمجھتے ہو مگر ہم لوگ حدیبیہ کو فتح سمجھتے تھے (صفحہ ۱۸۳) اس کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حدیبیہ کے معاہدہ نے اہل اسلام کو توسیعی گروہ کی حیثیت دے دی۔ اور اہل شرک محض جامد گروہ بن کر رہ گئے۔ حدیبیہ کے معاہدہ سے پہلے دونوں گروہوں کے درمیان ٹکراؤ اور مڈبھیڑ کی فضا تھی۔ اب تک دونوں کی ملاقات صرف میدان مقابلہ میں ہوتی تھی، صلح کے بعد میدانِ دعوت میں دونوں کی ملاقات کے مواقع پیدا ہو گئے۔ شرک جہاں تھا وہیں رہا۔ مگر اسلام ایسی پوزیشن میں آگیا جہاں سے وہ لوگوں کے دلوں میں نفوذ کر سکے۔

جب ایسا ہو کہ ایک گروہ جامد گروہ ہو اور دوسرا گروہ توسیعی گروہ کی حیثیت حاصل کرلے

تو اس کے فوراً بعد جو واقعہ ہوگا وہ یہ کہ جامد گروہ گھٹنا شروع ہو جائے گا۔ اور توسیعی گروہ مسلسل بڑھنے لگے گا۔ اور جہاں اس قسم کا عمل شروع ہو جائے وہاں بالآخر جو نتیجہ نکلے گا وہ وہی ہوگا جو عرب میں ہوا ——— شرک کو ماننے والے دھیرے دھیرے اسلام میں داخل ہو گئے۔ چند سال بعد ہی دیکھنے والوں نے دیکھا کہ جہاں دو متقابل گروہ تھے وہاں اب صرف ایک گروہ باقی رہ گیا ہے۔ اور وہ اہلِ اسلام کا گروہ ہے۔

پہاڑ کے اوپر سے پانی کا ایک چشمہ جاری ہوا۔ وہ آگے کی طرف بڑھتا رہا، یہاں تک کہ اس کے راستہ میں ایک چٹان آگئی۔ اب چشمہ کیا کرے گا۔ وہ فوراً دائیں یا بائیں مڑکر اپنا راستہ بنالے گا۔ چٹان ایک جامد چیز ہے، وہ جہاں ہے وہیں کھڑی رہتی ہے۔ اب اگر چشمہ صرف اس سے ٹکراتا رہے تو اس کا سفر رک جائے گا، اس کے بعد چشمہ کا معاملہ بھی جمود کا معاملہ بن جائے گا۔ جس طرح چٹان کا معاملہ جمود کا معاملہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ چشمہ ٹکراؤ پر قائم رہنے کے بجائے اعراض کی پالیسی اختیار کرتا ہے۔ وہ چٹان کو جمود کی دنیا میں چھوڑ کر اپنے لئے توسیع کی دنیا حاصل کر لیتا ہے۔

یہ قدرت کا سبق ہے۔ اسلام ایک دعوت ہے، وہ ایک پھیلنے والی اور بڑھنے والی حقیقت ہے۔ وہ ایک توسیعی پروگرام ہے۔ اس کے مقابلہ میں غیر اسلام ایک جامد چیز ہے۔ وہ پھیلنے اور آگے بڑھنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ اب اسلام اور غیر اسلام کے ٹکراؤ کے وقت اگر اسلام یہ کرے کہ وہ وہیں ٹھہر کر مقابلہ شروع کر دے تو وہ بھی اسی طرح جامد بن جائے گا جس طرح غیر اسلام جامد ہے۔ وہ اپنی توسیعی حیثیت کو کھو دے گا جو اس کی اصل حیثیت اور اس کی اصل طاقت ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلامی دعوت میں اعراض (Avoidance) کے اصول کو بنیادی اہمیت دی گئی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ۲۳ سالہ پیغمبرانہ زندگی میں مسلسل اسی اصول اعراض پر عمل فرمایا ہے۔ مکہ کے ابتدائی ۱۳ سال میں مشرکین کے مسلسل ظلم کے باوجود آپ نے ان سے ٹکراؤ نہیں کیا، یہ یہی اعراض تھا۔ حالات زیادہ سخت ہو گئے تو آپ مکہ کو چھوڑ کر مدینہ چلے گئے، یہ بھی اعراض تھا۔ حدیبیہ کے موقع پر زیارت کعبہ میں رکاوٹ ڈالی گئی تو آپ اصرار کئے بغیر درمیان سے واپس آگئے، یہ بھی اعراض تھا۔

اسی طرح ہر ٹکراؤ کے موقع پر آپ نے آخری امکان کی حد تک اعراض کیا ہے۔ کیوں کہ اعراض نہ کرنا گویا اپنے آپ کو فریق ثانی کی طرح جامد گروہ بنالینے کے ہم معنی تھا، جب کہ اعراض کرکے آپ

نے اپنے کو توسیعی گروہ کی حیثیت دے دی۔ اور توسیعی گروہ کی حیثیت حاصل کرنے ہی کا دوسرا نام غلبہ اور کامیابی ہے۔

تاریخ کا تجربہ

اسلام دین کامل ہے۔ اس کا ایک پہلو یہ ہے کہ اسلام میں اگر ایک طرف نظری طور پر تمام ضروری باتیں بتا دی گئی ہیں، تو اسی کے ساتھ اسلام کی تاریخ میں ہر قسم کی واضح مثالیں بھی قائم کر دی گئی ہیں تاکہ لوگوں کے لئے اسلامی تعلیمات کا سمجھنا آسان ہو جائے۔

اس سلسلہ کی ایک مثال وہ ہے جو شمشیر کی طاقت اور دعوت کی طاقت کے فرق سے تعلق رکھتی ہے۔ صلاح الدین ایوبی کی ذات اسلام کی تاریخ میں "شمشیر" کی طاقت کا نشان ہے۔ انھوں نے مغرب کی عیسائی طاقتوں کو حطین (شمالی فلسطین) کے مقام پر فیصلہ کن شکست دی۔ اور دوسو سالہ صلیبی جنگ کا خاتمہ کیا۔ وہ ۲ اکتوبر ۱۱۸۷ کو دوبارہ یروشلم میں فاتحانہ داخل ہوئے۔ جو ۸۸ سال سے عیسائیوں کے قبضہ میں پڑا ہوا تھا۔

صلاح الدین ایوبی کا انتقال ۴ مارچ ۱۱۹۳ء کو ہوا۔ اس جنگی ہیرو کے انتقال کے صرف ۲۵ سال بعد تاریخ دوسرا منظر پیش کرتی ہے۔ چنگیز خاں کو یہ جرأت ہوتی ہے کہ ۱۲۱۸ء میں وہ ۲۰ ہزار وحشی قبائل کو لے کر مسلم سلطنت (خوارزم) پر حملہ کر دے۔ چنگیز خاں اگرچہ جلد ہی گھوڑے سے گر کر ہلاک ہو گیا۔ مگر اس کے جانشین تاتاریوں کی پیش قدمی مسلم دنیا میں بلا روک ٹوک جاری رہی۔ یہاں تک کہ انھوں نے سمرقند سے لے کر بغداد تک پوری مسلم دنیا کو تہس نہس کر ڈالا۔

تاتاریوں کا یہ غلبہ اتنا شدید اور اتنا ہمہ گیر تھا کہ مسلم دنیا میں یہ کہا جانے لگا کہ: اذا قیل لك ان التتر انهزموا فلا تصدق (اگر تم سے کہا جائے کہ تاتاری شکست کھا گئے تو اس کو نہ ماننا) تاتاریوں کے اس دہشت خیز طوفان کو کس چیز نے ختم کیا، اس کا جواب صرف ایک ہے، اور وہ دعوت ہے۔ پچھلے صلیبی مسئلے سے اگر مسلم دنیا نے شمشیر کی طاقت کے ذریعہ نجات پائی تھی تو تاتاریوں کے شدید تر مسئلے سے مسلمانوں نے دعوت کی طاقت کے ذریعہ فتح حاصل کی۔

تاتاریوں کے مقابلہ میں مسلمانوں کے پاس تلوار کی طاقت باقی نہیں رہی تھی، اس لئے زیادہ تر مجبورانہ طور پر نہ کہ شعوری طور پر۔ یہ ہوا کہ انھوں نے تاتاریوں کے درمیان دعوت کا خاموش اور پرامن

کام شروع کر دیا۔ تاتاریوں کے پاس اپنی کوئی طاقت ور تہذیب موجود نہ تھی، اس لئے وہ خود بخود مسلم تہذیب سے متاثر ہونے لگے۔ اسی کے ساتھ مختلف طریقوں سے انھیں براہ راست یا بالواسطہ طور پر اسلام کا پیغام پہنچنے لگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے اندر ایک نئی فکری تبدیلی شروع ہوگئی۔ چنگیز خاں کے جن تاتاری جانشینوں نے ۱۲ویں صدی عیسوی کے نصف اول میں اسلام کی سیاسی قوت کو تاراج کیا تھا، انھوں نے اسی صدی کے خاتمہ تک اسلام کی فکری قوت سے مفتوح ہوکر بہت بڑی تعداد میں اسلام قبول کرلیا۔

پروفیسر فلپ ہٹی کے الفاظ میں، مسلمانوں کے مذہب نے وہاں کامیابی حاصل کرلی جہاں ان کے ہتھیار ناکام ہوچکے تھے:

The religion of the Moslims had conquered where their arms had failed (p. 488).

یہاں مزید یہ یاد رکھنا چاہئے کہ صلیبیوں کا حملہ جس پر صلاح الدین ایوبی نے فتح پائی، وہ صرف اپنے مقدس مقام (یروشلم) پر قبضہ کرنے کے لئے تھا، جب کہ تاتاری جن پر دعوت کے ذریعہ فتح حاصل ہوئی، وہ پوری مسلم دنیا کو تاراج کرنے کے لئے اٹھے تھے اور اس میں بڑی حد تک کامیاب ہوچکے تھے۔

مغل حکمراں بابر اسی چنگیز خاں کی نسل سے تھا۔ وہ ۱۵۲۶ء میں دہلی میں داخل ہوا۔ یہ اسی کی نسل تھی جو ۱۸۵۷ تک موجودہ ہندستان (بھارت) سے بہت زیادہ بڑے ملک پر اسلام کی خادم بنی رہی اسلام کے لئے ان کی خدمات بہت زیادہ ہیں جن کی تفصیل یہاں بیان کرنے کا موقع نہیں۔

اسی زمانہ میں وہ ترکستانی قبائل اٹھے جن کو سلجوقی ترک یا ترکان غز (Oguz Turkmen) کہا جاتا ہے۔ اپنے ابتدائی زمانہ میں انھوں نے ایران اور اس کے ملحق علاقوں میں زبردست تباہی پھیلائی۔ ان سے مقابلہ کے لئے مسلمانوں کے پاس تلوار کی طاقت موجود نہ تھی۔ کیوں کہ چنگیز خاں اور اس کی نسل (تاتاری) پہلے ہی اس کو آخری حد تک توڑ چکے تھے۔

مغل تاتاریوں کی طرح، ترکان غز کے سلسلہ میں دعوت کی خاموش اور پر امن طاقت ہی مسلمانوں کے کام آئی۔ تاریخ اگرچہ اس کی تفصیل نہیں بتاتی کہ ترکان غز کے قبائل پر دعوتی کام کس طرح

کیا گیا۔ تاہم یہ یقینی ہے کہ اسلام کی دعوتی طاقت ہی نے آخر کار انھیں مسخر کیا۔ ان کا مسئلہ صرف اس طرح ختم ہوا کہ وہ اپنے آبائی دین کو چھوڑ کر مسلمانوں کے دینی بھائی بن گئے۔

پروفیسر ٹی ڈبلیو آرنلڈ نے مذکورہ بالا دونوں واقعات کا ذکر کسی قدر تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔ اس سلسلہ میں وہ اپنی کتاب "پریچنگ آف اسلام" میں لکھتے ہیں:

In the hours of its political degradation, Islam has achieved some of its most brilliant; spiritual conquests: on two great historical occasions, infidel barbarians have set their feet on the necks of the followers of the Prophet,— the Saljuq Turks in the eleventh and the Mongols in the thirteenth century,— and in each case the conquerors have accepted the religion of the conquered (p.2).

اپنے سیاسی زوال کے زمانہ میں اسلام نے اپنی بعض انتہائی شاندار روحانی فتوحات حاصل کی ہیں۔ دو بڑے تاریخی مواقع پر وحشی کافروں نے اپنے پاؤں محمد کے پیروؤں کی گردن پر رکھ دئے تھے۔ گیارھویں صدی عیسوی میں سلجوق ترکوں نے اور تیرھویں صدی عیسوی میں مغلوں نے، مگر ہر بار فاتح نے اپنے مفتوح کے مذہب کو قبول کر لیا۔

اسلام کی تاریخ میں ایک ممتاز نام عثمانی ترکوں کا آتا ہے۔ یہ انھیں ترکان غز کی اولاد تھے جن کا اوپر ذکر ہوا۔ انھوں نے ترکی میں اس عظیم خلافت کی بنیاد ڈالی جو چھ سو سال تک مسلسل قائم رہی۔ پہلی عالمی جنگ کے بعد وہ صرف ۱۹۲۲ء میں ختم ہوسکی:۔

Turkish Osman, who is regarded as the founder of the empire that spanned six centuries and came to an end only in 1922.
Encyclopaedia Britannica, vol. 13, p. 771.

یہی عثمانی ترک تھے جنھوں نے ترکی کی وہ عظیم خلافت قائم کی جس کا صدر مقام قسطنطنیہ تھا۔ یہ خلافت پہلی جنگ عظیم تک پوری طاقت کے ساتھ اسلام کی پاسبانی کرتی رہی۔ یہ مدت چھ سو سال تک پھیلی ہوئی ہے۔

گویا صلاح الدین ایوبی کی شمشیری طاقت صرف ۲۵ سال کے لئے اسلام کی پاسبان بنی تھی، مگر اسلام کی دعوتی طاقت چھ سو سال تک اسلام کی عالمی پاسبانی کرتی رہی۔ یہ واقعہ قیامت تک کے لئے اس بات کی نشانی ہے کہ تلوار کے مقابلہ میں دعوت کی طاقت بے شمار گنا حد تک

زیادہ ہے۔ اس کے باوجود جو لوگ "تلوار" کی عظمت کے قصیدے پڑھیں اور دعوت کو ناقابل لحاظ سمجھ کر چھوڑ دیں، ان سے زیادہ نادان بلاشبہ اس آسمان کے نیچے اور کوئی نہیں۔

قومی سیاست

اسلام ایک قائم شدہ مذہب اور تاریخی طور پر ایک مسلّمہ حقیقت ہے۔ جب کوئی دین یہ حیثیت حاصل کر لے تو وہ اپنے آپ پھیلنے لگتا ہے۔ چنانچہ دور اوّل کے بعد ایک ہزار سال سے بھی زیادہ مدت تک اسلام اپنے آپ پھیلتا رہا ہے۔

اسلام کے پھیلاؤ میں پہلی بار رکاوٹ موجودہ نیشنلزم کے دور میں پیدا ہوئی۔ قدیم زمانہ میں ایک فوج کا دوسری فوج سے ٹکراؤ پیش آتا تھا۔ عام انسانی آبادی پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا تھا۔ موجودہ زمانہ میں ایک قوم دوسری قوم سے ٹکراتی ہے۔ اس طرح ٹکراؤ سے بننے والی دوری اور منافرت پوری کی پوری قوم میں پھیل جاتی ہے۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں نے دعوت کے اعتبار سے جو سب سے بڑا جرم کیا ہے، وہ یہ ہے کہ انھوں نے دوسری قوموں کی تقلید میں اپنی ملی جدوجہد کے لیے "قومی سیاست" کا انداز اختیار کر لیا۔ اس طرح اسلام کی لمبی تاریخ میں پہلی بار ایسا ہوا کہ پوری کی پوری قومیں اسلام سے متنفر ہو گئیں۔

مسلمانوں پر فرض کے درجہ میں ضروری ہے کہ وہ قومی سیاست کا انداز مکمل طور پر چھوڑ دیں، تاکہ قومی سطح پر پیدا ہونے والی ضد اور نفرت کی فضا ختم ہو اور اسلام کی اشاعتِ عام کا دروازہ کھلے۔ قومی سیاست کا ترک ہماری ملی جدوجہد کا پہلا زینہ ہے، اس کے بغیر ملی جدوجہد سیکڑوں سال میں بھی کسی نتیجہ پر پہنچنے والی نہیں۔

اعـــلان

یہ تقریر (میدان عمل) آڈیو کیسٹ کی صورت میں بھی تیار ہے۔ شائقین حضرات طلب فرمائیں۔

منیجر الرسالہ

بربادی کے رہنما

ہفت روزہ نئی دنیا (۲۹ جولائی - ۴ اگست ۱۹۸۸) میں ایک رپورٹ شائع ہوئی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ بابری مسجد رابطہ کمیٹی کے "اہم قائدین" لکھنؤ کے ایک بزرگ عالم سے ملے۔ قائدین نے ا سے اجودھیا مارچ کے بارہ میں تفصیلی گفتگو کی۔ مطبوعہ رپورٹ کے مطابق، مذکورہ عالم نے واضح طور پر کہ کہ اجودھیا مارچ کوئی فقہی مسئلہ نہیں ہے جس پر کسی فتویٰ کی ضرورت ہو یا اس کی کوئی اہمیت ہو۔ "باب مسجد رابطہ کمیٹی نے مولانا موصوف سے اس سلسلہ میں ان کی رائے طلب کی تھی۔ لیکن مولانا نے صاف ک دیا کہ اس مسئلہ پر کسی فتویٰ کی ضرورت نہیں، یہ ایک غیر فقہی مسئلہ ہے۔" صفحہ ۳

۱۔ فقہ علم شریعت کا نام ہے۔ اور اجودھیا مارچ، ذمہ داروں کے اعلان کے مطابق، یہ ہے مسلمان جلوس بنا کر بڑی تعداد میں اجودھیا جائیں اور وہاں بابری مسجد کے اندر جمعہ کی نماز پڑھیں۔ اب ناقابل فہم ہے کہ ایک ایسا مسئلہ جس کا تعلق مسجد اور نماز سے ہو، اس کے متعلق یہ دعویٰ کیا جائے کہ و فقہی اور شرعی مسئلہ نہیں ہے۔ اس معاملہ میں شریعت سے رہنمائی لینے کی ضرورت نہیں۔ کیسی عجیب بات ہے کہ وہ شریعت جو چودہ سو سال سے استنجا اور طہارت تک کے معاملات میں مسلمانوں کی رہنما ہوئی تھی، اب وہ مسجد اور نماز کے معاملہ میں بھی رہنمائی دینے سے عاجز یا غیر متعلق ہوگئی ہے۔ اب مسلمانوں کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ وہ اس معاملہ کو دورِ پریس کی اُس مخلوق کے حوالے کر جس کو عام طور پر سیاسی لیڈر (صحیح تر لفظ میں سیاسی تاجر) کہا جاتا ہے۔ یہ بلاشبہ ایک انتہائی عجیب واقعہ ہے جو مسلمانوں کی لمبی تاریخ میں شاید اس سے پہلے کبھی پیش نہیں آیا۔

۲۔ قائدینِ تحریک کے اعلان کے مطابق، اجودھیا مارچ یہ ہے کہ ملک کے مختلف حصوں سے مسلمان سفر کرکے ۱۴ اکتوبر ۱۹۸۸ کو اجودھیا پہونچیں اور وہاں بابری مسجد میں داخل ہو کر نماز جمعہ ا کریں۔ یہ منصوبہ واضح طور پر اس فرمانِ رسول کے خلاف ہے جس میں کہا گیا ہے کہ دنیا کی صرف تی مسجدیں ہیں جن کے لیے شدِّ رحال جائز ہے، ان کے سوا کسی اور مسجد کے لیے جائز نہیں۔ حدیث میں ج تین استثنائی مسجدوں کا نام لیا گیا ہے، ان میں اجودھیا کی بابری مسجد یقینی طور پر شامل نہیں ہے، اس اس کے واسطے عبادتی شدِّ رحال بھی جائز نہیں ہو سکتا (ملاحظہ ہو الرسالہ اگست ۱۹۸۸)

معلوم ہوا کہ نماز کی ادائیگی کے لیے دور کے بیرونی مقامات سے کوچ کرکے اجودھیا جانا اور وہاں کی بابری مسجد میں نماز ادا کرنے کی کوشش کرنا صراحۃً حدیثِ رسول سے ٹکراتا ہے۔ اور جب کوئی عمل قرآن اور حدیث سے ٹکرائے تو یہی ٹکراؤ یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ وہ ایک شرعی نوعیت کا مسئلہ ہے۔ مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ ایسے معاملہ میں شریعت سے رہنمائی حاصل کریں، اور جو قدم اٹھائیں شریعت کی مطابقت میں اٹھائیں۔

۳۔ اجودھیا مارچ کسی خالی جزیرہ کی طرف مارچ نہیں ہے۔ وہ ایسے مقام کی طرف مارچ ہے جہاں پہلے سے ایک طاقت ور فریق موجود ہے۔ اگر یہ مارچ ہوتا ہے تو ایک طرف مسلمان ہوں گے جو جلوس کی صورت میں سفر کرکے وہاں پہونچیں گے۔ دوسری طرف وہ لوگ ہیں جو بابری مسجد پر غاصبانہ قبضہ کرکے بیٹھے ہوئے ہیں۔ مسلمانوں کے لیڈروں نے بار بار اعلان کیا ہے کہ مسلمان مکمل طور پر غیر مسلّح حالت میں اجودھیا جائیں گے۔ دوسری طرف قبضہ کرنے والے ہیں جن کا کھلا ہوا اعلان ہے کہ وہ مقررہ تاریخ کو تربیت یافتہ نوجوانوں کے دستے بہت بڑی تعداد میں اجودھیا میں اور اجودھیا کے باہر متعین کر دیں گے جو مسلمانوں کو بجبر بابری مسجد تک جانے سے روکیں گے۔ اور اگر مسلمان پھر بھی نہ مانیں تو وہ ان کو کچل کر رکھ دیں گے۔

اس قسم کے غیر مساویانہ مارچ کے لیے کسی شاعر کی شاعری یا کسی خطیب کی خطابت میں تو جواز مل سکتا ہے، مگر قرآن و سنت میں اس کے لیے کوئی جواز نہیں۔ قرآن میں حکم دیا گیا ہے کہ اپنے مخالفین سے مقابلہ کے وقت بچاؤ کا اہتمام کرو (النساء ۷۱) اسی طرح قرآن میں حکم ہے کہ ایسی قوت فراہم کرو جو تمہارے دشمنوں کو ہیبت زدہ کر دینے والی ہو (الانفال ۶۰) ان احکام کی روشنی میں دیکھئے تو مجوزہ مارچ اپنی موجودہ صورت میں خدائی ہدایات کے بالکل خلاف ہے۔ کیوں کہ وہ ضروری تیاری کے بغیر کیا جانے والا ہے، وہ عملی طور پر نہتی مسلم اقلیت کو ہتھیار بند غیر مسلم اکثریت سے ٹکرانے کے ہم معنی ہے۔

۴۔ مارچ کے ذمہ داروں کو مذکورہ نازک صورت حال کا بخوبی علم ہے۔ تاہم ان کا جواب یہ ہے کہ اس معاملہ میں مسلمانوں کو اندیشہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ کیوں کہ امن و نظم کو بحال رکھنا اور عوامی جلوس کو حفاظت مہیا کرنا حکومت اور پولس کی ذمہ داری ہے، اور اس کو اسے انجام دینا چاہیے۔

اجودھیا مارچ کے موقع پر مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان جس تصادم کا یقینی اندیشہ ہے، اس قسم کے فرقہ وارانہ تصادم ۱۹۴۷ سے اب تک بار بار مختلف شکلوں میں پیش آتے رہے ہیں۔ حتی کہ

ان کی تعداد اب دس ہزار سے بھی زیادہ ہو چکی ہے۔ مگر خود انھیں مسلم لیڈروں کے چھپے ہوئے بیانات کے مطابق، ہر ایسے تصادم میں پولس اور انتظامیہ نے ہمیشہ جانبدارانہ معاملہ کیا ہے۔ یعنی وہ غیر مسلم فرقہ کو حفاظت دے کر مسلم فرقہ کے لوگوں کو یک طرفہ طور پر اپنے ظلم کا نشانہ بناتی ہے۔ (مثال کے طور پر میرٹھ اور ملیانہ کا واقعہ، اپریل۔مئی ۱۹۸۷) ایسی حالت میں مسلم لیڈروں کا مذکورہ جواب اِس حدیثِ رسول سے ٹکرا رہا ہے کہ مومن ایک بِل سے دوبار نہیں ڈسا جاتا (المومنُ لَا یُلدَغ مِن جُحرٍ مرّتَین) جب ایک خطرناک بِل کا دوبار تجربہ کرنا بھی ایمان کے خلاف ہو تو ایسی ایک معلوم بِل کا دس ہزار بار تجربہ کرنا کیوں کر شریعت کے مطابق ہو سکتا ہے۔

۵۔ اجودھیا مارچ کے موقع پر پولیس اور انتظامیہ کا یہ متوقع کردار محض قیاس نہیں ہے۔ وہ " مرشد آباد مارچ " کی صورت میں انتہائی بھیانک طور پر پیشگی سامنے آچکا ہے۔ بنگال اور بہار کے مسلمان، مقامی مسلم لیڈروں کی رہنمائی میں، تقریباً ۵ ہزار کی تعداد میں ۲۴ جون ۱۹۸۸ کو مرشد آباد (مغربی بنگال) پہونچے تاکہ وہاں کی قدیم کٹرہ مسجد میں نماز جمعہ ادا کریں۔ مگر خود مسلم لیڈروں کا بیان ہے کہ وہاں کی پولیس اور انتظامیہ نے جانتے بوجھتے ان نہتے مسلمانوں کو غیر مسلم فرقہ کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا جنھوں نے نہایت بے دردی کے ساتھ مسلمانوں کو اپنے خونخوار عزائم کا نشانہ بنایا۔ مسلمان کٹرہ مسجد تک پہونچ کر نماز بھی ادا نہ کر سکے۔ ان میں سے کچھ لوگ راستہ ہی میں ہلاک ہو گیے، اور کچھ لوگ لٹ کر اور زخمی ہو کر اپنے گھروں کو ناکام واپس لوٹ آئے۔

جس پولس اور انتظامیہ کے نکمے پن کا یہ تجربہ ہو، اس کی حفاظت کے بھروسہ پر نہتے مسلمانوں کو تشدد پر آمادہ مجمع کے درمیان بھیجنا، شریعت تو درکنار، عقلِ عام (Common sense) کے بھی خلاف ہے۔

بعض ہوشیار لیڈر کہتے ہیں کہ ان مواقع پر اگر کچھ مسلمان مارے جائیں تو اس سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ کیوں کہ اس طرح ہمارا پروٹسٹ تو رجسٹر رہتا ہے۔ میں کہوں گا کہ اگر پروٹسٹ ہی رجسٹر کرنا مقصود ہے تو اس کے لیے عوام کو مروانا بے فائدہ ہے۔ پھر تو زیادہ بہتر یہ ہے کہ ہمارے بے ریش اور باریش لیڈر نکلیں اور زبردستی خطرہ کے مقامات میں گھس کر لاٹھیاں اور گولیاں کھائیں۔ اگر لیڈروں میں سے کچھ لوگ مریں اور ان کی لاشیں سڑکوں پر نظر آئیں تو ہمارا پروٹسٹ زیادہ جلی خط

میں رجسٹر ہوگا، عوام کے مرنے کی صورت میں تو وہ صرف خفی خط میں رجسٹر ہو رہا ہے۔ (Bold letters)

۶ - قرآن (الحج ۶۷) میں حکم دیا گیا ہے کہ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْأَمْرِ وَادْعُ إِلَىٰ رَبِّكَ إِنَّكَ لَعَلَىٰ هُدًى مُسْتَقِيمٍ (پس وہ تم سے نزاع کی راہ نہ پائیں اور اپنے رب کی طرف بلاتے رہو۔ بے شک تم سیدھے راستہ پر ہو) یہ ایک اہم تعلیم ہے جو قرآن و حدیث میں مختلف انداز سے دی گئی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ دوسروں کے مقابلہ میں نزاع اور ٹکراؤ کا طریقہ اختیار نہ کرو، بلکہ دعوت کا طریقہ اختیار کرو۔ موجودہ مسلم لیڈروں نے مسلم ملت کے مسائل کے لیے جو طریقہ اختیار کیا ہے، اس کو اگر سیاسی عمل (Political activism) کہا جائے تو اس سلسلہ میں اسلام کے بتائے ہوئے طریقہ کو دعوتی عمل (Dawah activism) کہا جا سکتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اسی طریق کار کی نہایت اعلیٰ مثال ہے۔ جیسا کہ معلوم ہے، آپ کے زمانہ میں سب سے زیادہ محترم مسجد کعبہ میں ۳۶۰ بت رکھے ہوئے تھے۔ توحید کے اس گھر میں باقاعدہ مشرکانہ عمل کیا جاتا تھا۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مسئلہ کے حل کے لیے " مارچ " کا طریقہ اختیار نہیں فرمایا۔ بلکہ دعوت کے طریقے پر چل کر اس کو حل کیا۔ خلیفۂ ثانی حضرت عمر فاروق نے اسی اسلامی حکمت کا لحاظ کرتے ہوئے فلسطین کے گرجا گھر کے اندر نماز نہیں پڑھی (ملاحظہ ہو الرسالہ مارچ ۱۹۸۶، صفحہ ۲)

بابری مسجد کی مورتی کا معاملہ بھی چھوٹے درجہ میں اسی نوعیت کا ہے۔ یہاں بھی مسلمانوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ پر چل کر اس کا حل تلاش کرنا چاہیے، اور کسی بھی وجہ سے اس کو چھوڑنا نہیں چاہیے۔ بابری مسجد کے معاملہ میں سیاسی مارچ کا طریقہ اختیار کرنا، یا یہ کہنا کہ اس کا تعلق شریعت سے نہیں ہے، سرکشی کی حد تک اسلام کے خلاف ہے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ٹھیک اسی نوعیت کا معاملہ (شدید تر شکل میں) پیش آچکا ہے تو مسلمانوں کے لیے کیوں کر جائز ہو سکتا ہے کہ وہ اس معاملہ میں اسوۂ رسول کا لحاظ نہ کریں۔ وہ مکہ کی مسجد کے مماثل مسئلہ سے اجودھیا کی مسجد کے مسئلہ کے حل کے لیے نمونہ نہ پکڑیں۔

۷ - حدیبیہ (۶ ھ) کے موقع پر بھی اسی سے ملتی جلتی صورت پیش آئی تھی۔ مسلمان عمرہ کے لیے مکہ میں داخل ہونا چاہتے تھے اور حرم مکہ کے قابض لوگ اس میں مزاحم ہو رہے تھے۔ اسی طرح آج مسلمان

اجودھیا کی مسجد میں داخل ہونا چاہتے ہیں اور اس کے قابض لوگ نہایت شدت کے ساتھ مزاحمت کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔

حدیبیہ کے موقع پر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو مکہ میں داخل ہونے سے روک دیا۔ ان کو حکم ملا کہ عمرہ ادا کیے بغیر مدینہ واپس چلے جاؤ۔ اس حکم کی مصلحت قرآن میں یہ بتائی گئی ہے کہ مسلمان اگر اقدام پر اصرار کرتے تو جنگ کی نوبت آتی اور اس میں بہت سے مسلمان ناحق مارے جاتے (الفتح ۲۴-۲۵) گویا اگر مسلمانوں کی جان کا خطرہ ہو تو حرم مکہ جیسی مقدس مسجد کی طرف "مارچ" کرنا بھی غیر مطلوب ہو جاتا ہے۔ مسلمان کی جان کی حفاظت ہر دوسری مصلحت پر مقدم ہے (ملاحظہ ہو الرسالہ اگست ۱۹۸۸، صفحہ ۱۴-۱۵)

اس مثال کی روشنی میں دیکھئے تو اجودھیا مارچ میں نہ صرف مسلمانوں کی ہلاکت کا اندیشہ ہے بلکہ اس میں پیش آنے والا جانی و مالی نقصان اس نقصان سے بہت زیادہ ہے جو حدیبیہ کے وقت متوقع تھا۔ حدیبیہ کے موقع پر پیش آنے والا نقصان تمام تر مقامی ہوتا۔ مگر آج جو حالات ہیں، ان کی روشنی میں یقینی ہے کہ اجودھیا مارچ کی صورت میں ہونے والا نقصان صرف اجودھیا تک محدود نہیں رہے گا، بلکہ یقینی طور پر وہ پھیلے گا۔ اس کے نتیجہ میں پورے ملک کی فضا خراب ہو گی۔ جگہ جگہ فرقہ وارانہ فساد ہوں گے۔ اور حسب سابق مسلمان ہی ہر بار تباہی و بربادی کا نشانہ بنیں گے۔

اس عمومی بربادی میں مسلمانوں کے صرف ایک گروہ کا استثنار ہو گا۔ اور وہ ان بے ریش اور باریش رہنماؤں کا ہے جو مسلمانوں کو آگے کر کے خود ان سے الگ ہو جائیں گے۔ ان میں سے کوئی "جنرل" بن کر اپنے دفتر میں بیٹھ رہے گا، اور کوئی کسی بیرونی ملک کی کانفرنس میں شرکت کے لیے پرواز کر جائے گا۔ اس طرح سیاسی لیڈر اور ان کے حق میں اجازت نامہ جاری کرنے والے علما یقینی طور پر محفوظ رہیں گے۔ مگر عام مسلمان اتنے سخت مصائب سے دوچار ہوں گے جن کو لفظوں میں بیان کرنا ممکن نہیں۔

۸۔ ایک بات یہ کہی جاتی ہے کہ اجودھیا مارچ اگرچہ بظاہر اجودھیا کی طرف ہو گا، مگر اس کا اصل نشانہ نئی دہلی ہے۔ یہ نماز کی ادائیگی کا مسئلہ نہیں ہے، بلکہ اپنے دستوری حق کے استقرار کا مسئلہ ہے۔ بابری مسجد کی حیثیت محض علامت کی ہے۔ ورنہ اصل لڑائی اس بات کی ہے کہ دستور ہند میں جو مذہبی حقوق دیئے گئے ہیں، ان کو تسلیم کیا جائے اور حکومت اس بات کی ضامن بنے کہ دستور میں دیئے ہوئے کسی حق کو پامال نہیں کیا جائے گا۔

یہ مصلحت بھی ایک خود ساختہ مصلحت ہے جو سنتِ رسول سے واضح طور پر ٹکراتی ہے۔ یہاں میں وبارہ حدیبیہ کی مثال دیتا ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ذوالقعدہ ۶ ھ میں مدینہ سے مکہ کے لیے روانہ دے تاکہ وہاں پہونچ کر کعبہ کی زیارت کریں اور عمرہ کے مراسم ادا کریں۔ آپ مکہ کے قریب حدیبیہ کے مقام پہونچے تو اہلِ مکہ (قریش) نے روکا اور کہا کہ ہم آپ کو مکہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔ آپ عمرہ کیے بغیر مدینہ واپس جائیں۔

قریش کا یہ فعل سراسر دستورِ عرب کے خلاف تھا۔ عرب میں یہ مسلّمہ دستور تھا کہ کوئی شخص کعبہ لی زیارت کے لیے آئے تو اس کو روکا نہ جائے۔ چنانچہ ساری قدیم تاریخ میں کبھی کسی کو زیارت کعبہ سے وکا نہیں گیا تھا۔ یہ دستوری حق اتنا زیادہ قطعی اور مسلّم تھا کہ جب سردارانِ قریش نے آپ کو روکا تو ود مشرکوں میں کچھ ایسے لوگ نکلے جنھوں نے اس کے خلاف سخت احتجاج کیا۔ مثلاً حُلَیس بن علقمہ سید الاحابیش) جو قریش کا حلیف تھا، اس نے غصہ ہو کر کہا:

امعشرَ قريش والله ما على هذا حالفناكم ,لا على هذا عاهدناكم. أيُصَدُّ عن بيت للهِ مَن جاءه معظمًا له. والذي نفسُ لحُليس بيده لتُخَلُّنَّ بين محمد وبين ,اجاء له اولَأنفِرنّ بالاحابيش نفرةَ جل واحدٍ۔

(سیرۃ ابن کثیر، المجلد الثالث، صفحہ ۳۱۶)

اے قریش کے لوگو، خدا کی قسم، ہم اس بات پر تمہارے حلیف نہیں بنے تھے اور نہ اس بات پر ہم نے تم سے معاہدہ کیا تھا۔ کیا اُس شخص کو بیت اللہ سے روکا جانے لگا جو بیت اللہ کی زیارت کے لیے اور اس کی تعظیم کے لیے آیا ہو۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں حُلیس کی جان ہے، تمہیں محمّد اور وہ جس کام کے لیے آئے ہیں، اس کے درمیان سے ہٹنا ہوگا، ورنہ میں تمام حبشیوں کو لے کر یک لخت تم سے الگ ہو جاؤں گا۔

اس قسم کی بات کچھ اور مشرکوں نے بھی کہی۔ مگر خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقع پر اپنے دستوری حق" کا سوال نہیں اٹھایا۔ اور نہ یہ کہہ کر اس کو اہم بنانے کی کوشش کی کہ یہ ایک علامتی اقعہ ہے، ہم کو "گربہ کشتن روزِ اول" کے اصول پر عمل کرنا چاہیے۔ ورنہ آج عمرہ کے بارہ میں ہمارا ستوری حق ہمیں دینے سے انکار کیا جا رہا ہے۔ کل ہم کو حج کے حق سے محروم کیا جائے گا۔ اور پھر حقوق

میں دراندازی کی فہرست معلوم نہیں کہاں کہاں تک جا پہونچے گی ۔

موجودہ نام نہاد مسلم لیڈروں کی طرح ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا نہیں کیا کہ اپنے ساتھیوں کو یہ کہہ کر اکسائیں کہ دیکھو ، یہ صرف ایک عمرہ کا معاملہ نہیں ہے ۔ بلکہ ایک دستوری حق کا معاملہ ہے ہمیں بہرحال دستوری حق کی لڑائی لڑنی ہے ، اور اس وقت تک پیچھے نہیں ہٹنا ہے جب تک ہم اپنے دستوری حق کو پوری طرح منوانے میں کامیاب نہ ہو جائیں ۔ اس کے برعکس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کے " غیر دستوری " مطالبہ کو مان لیا اور عمرہ کیے بغیر حدیبیہ سے واپس چلے آئے ۔

قرنِ اول کی یہ مثال بتاتی ہے کہ " دستوری حق " اور " علامتی واقعہ " وغیرہ اہلِ باطل کی بولیاں ہیں ، وہ پیغمبر کی بولی نہیں ہے ۔ جو لوگ اس قسم کے الفاظ بول رہے ہیں وہ پیغمبر کے نمونہ پر نہیں چل رہے ہیں ، بلکہ باطل پرست قوموں کے نمونہ پر چل رہے ہیں ۔ پیغمبر کا طریقہ " دستوری لڑائی " لڑنا نہیں ہے ، بلکہ حقیقتِ واقعہ کو بدلنا ہے ۔ پیغمبر کا طریقہ دل کو جیتنا ہوتا ہے نہ کہ الفاظ کو جیتنا ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے الفاظ کو اہلِ شرک کے حوالے کر دیا ، اور خود اپنی ساری کوشش انسانوں کو بدلنے پر لگادی ۔ آخر کار جب انسان بدلے تو انسان بھی آپ کے قبضہ میں آگیے اور الفاظ بھی ۔

۹ ۔ جو لیڈر صاحبان اجودھیا مارچ کے حامی ہیں ، ان کا کہنا ہے کہ اگر ہم اس وقت مارچ کی کارروائی نہ کریں اور اجودھیا کی مسجد کے معاملہ میں خاموش ہو جائیں تو غاصب گروہ کے حوصلے مزید بڑھ جائیں گے ۔ آج انھوں نے ایک مسجد پر قبضہ کیا ہے ، کل وہ دوسری مسجدوں پر قبضہ کریں گے ۔

یہ بالکل بے وزن بات ہے اور محض اپنی بدترین نالائقی پر پردہ ڈالنے کے لیے گھڑی گئی ہے ۔ راقم الحروف نے الرسالہ جولائی ۱۹۸۸ (قیادت کا دیوالیہ پن) میں دکھایا ہے کہ اسی ملک میں دوسری بہت سی مسجدیں جو ۱۹۴۷ کے ہنگامے میں مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گئی تھیں ۔ آج وہ مکمل طور پر مسلمانوں کے قبضہ میں ہیں ۔

مساجد کی بازیابی کے معاملہ میں یہ کامیابی تمام تر خاموش حکیمانہ تدبیر کے ذریعہ حاصل کی گئی ۔ اگر کوئی صاحب اس معاملہ میں براہِ راست واقفیت حاصل کرنا چاہتے ہوں تو دہلی کی حد تک ، میں ذاتی ذمہ داری لیتا ہوں ۔ وہ میرے پاس آئیں اور میں ان کو لے جا کر دہلی کی کئی بڑی بڑی مسجدیں دکھاؤں گا کچھ سال پہلے تک یہ مسجدیں اغیار کے قبضہ میں تھیں ۔ آج وہ پوری طرح مسلمانوں کے پاس ہیں ۔ وہاں

باقاعدہ دینی مدرسے قائم ہیں۔ اور پنج وقتہ نمازیں جماعت کے ساتھ ہو رہی ہیں۔ اس میں اتنا اور اضافہ کر لیجئے کہ یہ اعلیٰ کامیابیاں صرف اس لیے ممکن ہوئیں کہ اس جدوجہد میں پیشہ ور لیڈروں میں سے کسی لیڈر کو شامل نہیں کیا گیا تھا۔

سیاسی اشو بنانے اور قومی پرسٹیج کی حیثیت دینے سے پہلے خود بابری مسجد کے معاملہ میں بھی اس خاموش اور حکیمانہ حل کا امکان پوری طرح موجود تھا۔ اس کی ایک مثال ۲۷ مارچ ۱۹۸۷ کی وہ مشترکہ میٹنگ ہے جس کی روداد الرسالہ جولائی ۱۹۸۸ میں شائع ہو چکی ہے۔ یہ صرف نام نہاد مسلم لیڈر ہیں جنھوں نے بابری مسجد کو قیادتی استحصال کا ذریعہ بنا کر اس قیمتی امکان کو برباد کیا۔ بابری مسجد کے معاملہ کو بگاڑنے کے اصل ذمہ دار مسلمان لیڈر ہیں۔ اگرچہ انھوں نے نہایت ہوشیاری کے ساتھ اس کا رُخ دوسروں کی طرف موڑ دیا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ ابتدا میں ہندوؤں کی بیشتر تعداد اس معاملہ میں براہِ راست یا بالواسطہ طور پر مسلمانوں کی حامی تھی۔ تھوڑے سے کٹّر ہندوؤں کے سوا کسی کو اس سے دل چسپی نہ تھی۔ اس کا ایک ثبوت ہندو اہلِ علم کے وہ منصفانہ مضامین ہیں جو ملک کے اخبارات و رسائل میں کثرت سے شائع ہو رہے تھے (ملاحظہ ہو الرسالہ، دسمبر ۱۹۸۶، صفحہ ۱۷-۲۲)

نئی دہلی میں بابری مسجد ریلی (۳۰ مارچ ۱۹۸۶) کے بعد یہ فضا بدلنا شروع ہوئی۔ مسلم لیڈروں کی احمقانہ سیاست بازی معاملہ کو بگاڑتی چلی گئی۔ پہلے یہ مسئلہ سادہ طور پر معقولیت اور غیر معقولیت کے درمیان کا مسئلہ تھا۔ مگر بعد کو بڑھتے بڑھتے وہ ایک قوم اور دوسری قوم کے درمیان کا مسئلہ بن گیا۔ اس نے دونوں گروہوں کے لیے فرقہ وارانہ عصبیت یا قومی ساکھ (Prestige) کی صورت اختیار کر لی۔ اس نوبت کو پہونچنے کے بعد مسلمان اس معاملہ میں اکیلے ہو گیے۔ انھوں نے ہندوؤں کی وہ حمایت کھو دی جو ابتدا میں انھیں وسیع پیمانہ پر حاصل تھی (ملاحظہ ہو الرسالہ جولائی ۱۹۸۵، صفحہ ۳۱-۳۲)

بابری مسجد کا مسئلہ اپنی ابتدائی صورت میں ایک محدود مقامی مسئلہ تھا۔ مگر مسلمانوں کے سطحی لیڈروں نے اپنی ناقابل بیان نادانیوں کے ذریعہ انتہائی غلط طور پر اس کو ایک ملکی اور قومی مسئلہ بنا دیا۔ جب کوئی مسئلہ اس نوبت تک پہونچ جائے تو اس وقت معقولیت پس پشت چلی جاتی ہے۔ اور صرف گروہی عصبیت ہی قوموں کی رہنما کی حیثیت سے باقی رہتی ہے۔ ایسے وقت میں قوم کے کسی فرد کا

حق بات کہنا اپنے کو اپنی قوم کے اندر نکو بنانے کی قیمت پر ہوتا ہے ، اور کون ہے جو نکو بننے کی قیمت پر حق بات کا اعلان کرے ۔ ایسا حق پرست تو خود مسلمانوں میں بھی کوئی نہیں ، پھر ہندوؤں کے بارہ میں ہم کیسے امید کر سکتے ہیں کہ ان میں ایسے حق پرست جھنڈ کے جھنڈ موجود ہوں گے ۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ وہ صحافتی تاجروں اور سیاسی استحصال پسندوں کی شکارگاہ بنے ہوئے ہیں ۔ آج مسلمانوں کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ انھیں اس دلدل سے نکالا جائے ۔

۱۰ ۔ تاہم ان چیزوں سے قطع نظر ، بنیادی بات یہ ہے کہ مذکورہ قسم کے تمام اندیشے ایمانی تقاضے کے سراسر خلاف ہیں ۔ کیوں کہ کسی معاملہ میں جب خدا اور رسول کا فیصلہ معلوم ہو جائے تو وہی خیر اور مصلحت کی بات ہے ۔ اس کے بعد عقلی نکتے نکالنا اور کسی دوسری چیز کو ملی مصلحت بتانا مجرمانہ سرکشی کے ہم معنی ہے ۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ : کسی مومن مرد یا کسی مومن عورت کے لیے گنجائش نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی معاملہ کا فیصلہ کر دیں تو پھر ان کے لیے اس میں اختیار باقی رہے ۔ اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے تو وہ کھلی گمراہی میں پڑ گیا (الاحزاب ۳۶)

مسلمان اگر خدا و رسول پر ایمان رکھتے ہیں تو انھیں خدا و رسول کی رہنمائی کو بے چون و چرا مان لینا ہوگا ۔ ان کے لیے فلاح و سعادت کا اس کے سوا کوئی اور راستہ نہیں ۔ خدا و رسول نے جس مصلحت کا لحاظ کیا ہو ، وہی صحیح اور معتبر مصلحت ہے ۔ دوسری کوئی مصلحت صحیح اور معتبر مصلحت نہیں ، خواہ بظاہر وہ ہم کو کتنی ہی زیادہ اہم دکھائی دیتی ہو ۔ اس سلسلہ میں محدث کبیر حضرت امام مالک کا یہ قول یاد دلانا کافی ہوگا : لن یصلح آخر ھذہ الامۃ الا بما صلح بہ اولھا (اس امت کا آخر بھی صرف اسی سے درست ہوگا جس سے اس کا اول درست ہوا)

اوپر جو باتیں عرض کی گئیں ، وہ دو اور دو چار کی طرح یہ ثابت کرتی ہیں کہ اجودھیا مارچ یا بابری مسجد تحریک بلاشبہ ان مسائل میں سے ہے جن کا تعلق شریعت سے ہے ، اور مسلمانوں کو اس معاملہ میں لازمی طور پر شریعت کی رہنمائی میں عمل کرنا چاہیے ، اس سے آزاد ہو کر نہیں ۔ اگر انھوں نے اس معاملہ میں آزادانہ عمل کیا تو یقیناً وہ اس کے لیے خدا کے نزدیک مجرم قرار پائیں گے ۔ کسی بزرگ کو یہ حق نہیں کہ وہ اس معاملہ کو غیر شرعی معاملہ قرار دے ، اور نہ کسی بزرگ کا دیا ہوا سرٹیفکٹ اس معاملہ میں انھیں خدا کی پکڑ سے بچانے والا ثابت ہو سکتا ہے ۔

۱۱۔ مسلم لیڈروں کی لفظی ہنگامہ آرائی سے بابری مسجد اشو میں تو کسی قسم کی کوئی پیش رفت نہیں ہوئی۔ البتہ ہندو فرقہ پرست عناصر کو ضرور نئی زندگی مل گئی ہے۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ بدنام ہندو مورخ مسٹر پی این اوک نے دوبارہ نئے نئے انکشافات شروع کر دیئے ہیں۔ ان کا ایک انکشاف یہ اخبارات میں آیا ہے کہ دہلی کی جامع مسجد ایک مندر کی جگہ پر بنی ہے۔ قدیم زمانہ میں یہاں ایک ہندو مندر تھا۔ مغل دور میں اس کو ڈھاکر وہاں مسجد بنائی گئی (ٹائمس آف انڈیا ۵ اگست ۱۹۸۸) علی گڑھ میں ہندو تنظیموں کی میٹنگ میں اعلان کیا گیا کہ مسلمان اگر ۱۲ اگست کو اجودھیا مارچ کرتے ہیں تو اسی دن ہندوؤں کا جتھا مسجد میں ہنومان چالیسا کا پاٹھ کرنے کے لیے داخل ہوگا۔ اور یہ کہ "۱۲ اگست وہ تاریخی دن ہوگا جب یہ بات صاف ہو جائے گی کہ بھارت میں مسلمانوں کو کن حالات میں رہنا ہے۔" (پرتاپ ۱۲ اگست ۱۹۸۸)

اس طرح کی باتوں کی بنا پر ممکن ہے کہ ہمارے لیڈر صاحبان کوئی خوبصورت عذر نکال کر مارچ کو ملتوی کر دیں جس کا اندیشہ الرسالہ جولائی ۱۹۸۸ میں ظاہر کیا گیا تھا۔ تاہم اس غلط سیاست کے ذریعہ مسلمانوں کو تباہی کے جس کنارہ پر کھڑا کر دیا گیا ہے، اس کے نقصان کا سلسلہ مارچ کے التوا کے بعد بھی ختم نہ ہوگا۔

اس معاملہ میں مسلمان لیڈر جس طرح چیلنج کی زبان میں بات کرتے رہے ہیں، جس طرح انھوں نے مسلمانوں سے "بابری مسجد لے کے رہیں گے" کے نعرے لگوائے ہیں، اپنی پرجوش تقریروں سے جس طرح انھوں نے مسلمانوں کے جوش کو آخری حد تک ابھار دیا ہے، اس کے بعد مارچ کو روکنا کوئی سادہ واقعہ نہیں ہوگا۔ یہ مسلمانوں کو بہت بڑے پیمانہ پر اس احساس سے دوچار کرنے ہم معنی ہوگا کہ ہمارے لیے کچھ کرنے کے مواقع نہیں ہیں۔ کسی گروہ کو ایک ایسے نشانہ کے لیے ابھارنا جو پورا ہوتے والا نہ ہو، نتیجہ کے اعتبار سے انھیں مایوسی اور شکست خوردگی کے احساس میں مبتلا کرنا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اقدام وہی ہے جو سچا اقدام ہو، جھوٹا اقدام بربادی کے سوا کسی اور چیز میں اضافہ نہیں کرتا۔ تکمیل مقصد کے بغیر مارچ کا فیصلہ واپس لینے کے بعد بھی واقعہ اپنی شدید ترین صورت میں مسلمانوں کے ساتھ پیش آئے گا۔

یہی وہ المناک اندیشہ تھا جس کے بارہ میں الرسالہ ستمبر ۱۹۸۶ کے صفحہ اول پر ان الفاظ میں چیتاونی دی گئی تھی: بزدلی دکھا کر چپ ہونے سے بہتر یہ ہے کہ آدمی بزدلی دکھائے بغیر چپ ہو جائے۔

ایک انتباہ

بیسویں صدی میں مسلمانوں نے بار بار ایسا کیا ہے کہ وہ سیاسی لیڈروں کو اپنے ملی معاملات میں رہنما بنا لیتے ہیں۔ یہ مزاج اب اتنا زیادہ بڑھ چکا ہے کہ مسجد اور نماز جیسے امور میں بھی سیاسی لیڈر ہی ان کے رہنما اور نمائندے بنے ہوئے ہیں۔ مسلمانوں کا یہ فعل ان کے تمام جرموں میں سب سے زیادہ سنگین جرم کی حیثیت رکھتا ہے۔ اپنے اس مزاج کو لازمی طور پر انھیں بدلنا ہوگا ورنہ شدید اندیشہ ہے کہ وہ خدا کی نصرت سے محروم ہو جائیں، اور پھر اس دنیا میں کوئی ان کا حامی و مددگار نہ رہے۔

ایک تاجر کو اپنی دکان کے لیے سیل مین کا انتخاب کرنا ہو تو وہ کبھی کسی دادا کو اپنی دکان کا سیل مین نہیں بنائے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کامیاب سیل مین میں جو سب سے ضروری صفت درکار ہے وہ میٹھا بول ہے، جب کہ داداگیری کے پیشہ میں، اس کے برعکس، کڑوا بول سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ دادا کڑوے بول کا ماہر ہوتا ہے، اس لیے وہ ایسے منصب کے لیے قطعاً موزوں نہیں جہاں میٹھا بول سب سے زیادہ مطلوب خصوصیت کی حیثیت رکھتا ہو۔

مسلمان کی اصل حیثیت یہ ہے کہ وہ ایک داعی گروہ ہیں۔ ان پر لازم ہے کہ ان کی تمام سرگرمیاں دعوت رُخی (Dawah oriented) ہوں۔ وہ ہر دوسری مصلحت پر دعوت کی مصلحت کو غالب رکھیں۔ سیاسی لیڈر کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ اس کا پورا فکر سیاست رُخی (Politics oriented) ہوتا ہے۔ وہ سیاسی مصلحت کو ہر دوسری مصلحت پر غالب رکھنا چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان جیسے گروہ کی نمائندگی کے لیے سیاسی لیڈر کسی طرح بھی موزوں اور مناسب نہیں۔

داعی اور لیڈر دونوں ایک دوسرے سے بالکل مختلف شخصیتیں ہیں۔ داعی ایجابی نفسیات کی پیداوار ہے اور لیڈر ردعمل کی نفسیات کی پیداوار۔ داعی محبت کی زمین پر کھڑا ہوتا ہے اور لیڈر نفرت کی زمین پر۔ داعی دوسروں کو اپنے مطلوب کی نظر سے دیکھتا ہے اور لیڈر دوسروں کو اپنے حریف کی نظر سے۔ داعی کا مفاد دوسروں کے ساتھ مصالحت میں ہوتا ہے اور لیڈر کا مفاد دوسروں کے ساتھ ٹکراؤ میں۔ داعی حقائق کو مرکز توجہ بناتا ہے اور لیڈر شوشوں کے پیچھے دوڑتا ہے۔ داعی خدا کی مرضی پر چلتا ہے اور لیڈر عوامی خواہشات پر۔ داعی کا مقصد لوگوں کا دل جیتنا ہے اور لیڈر کا مقصد لوگوں کا استحصال کرنا۔ داعی کی نظر اصل کام پر ہوتی ہے اور لیڈر کی نظر شہرت اور مقبولیت پر۔ خلاصہ یہ

کہ داعی اصلاح کا نقیب ہوتا ہے اور لیڈر تخریب کا علم بردار ۔

داعی اور لیڈر کا یہ فرق لیڈر کو امت مسلمہ جیسے گروہ کی نمائندگی کے لیے اسی طرح غیر موزوں بنا دیتا ہے جس طرح کسی دادا کی دادا گیری اس کو دکان کی سیلس مین شپ کے لیے غیر موزوں بنا دیتی ہے۔ مسلمان اگر چاہتے ہیں کہ اس ملک میں ان کے لیے مواقعِ کار کھلیں اور وہ خدا کی رحمت میں اپنا حصہ پائیں تو سب سے پہلا کام انھیں یہ کرنا ہے کہ وہ سیاسی لیڈروں کو اپنے ملی معاملات سے نکال پھینکیں۔ اس کے بغیر ان کے معاملات کبھی درست ہونے والے نہیں ۔

اگر مسلمانوں کو آج یہ حقیقت دکھائی نہیں دیتی تو وہ دن دور نہیں جب پردہ پھٹے اور تمام حقیقتیں اپنے برہنہ روپ میں سامنے آجائیں۔ اس وقت ہر آدمی سچائی کو ماننے پر مجبور ہوگا ، اگرچہ اس وقت کا ماننا کسی کے کچھ کام نہیں آئے گا ۔

ISLAMIC LITERATURE
In the Contemporary Idiom

By Maulana Wahiduddin Khan

God Arises
Pages 265 Price Rs 45

Muhammad
The Prophet of Revolution
Pages 220 Price Rs 50

Muhammad
The Ideal Character
Pages 20 Pnce Rs 4

Man! Know Thyself
Pages 20 Price Rs 4

Religion and Science
Pages 96 Pnce Rs 25

The Way to Find God
Pages 24 Price Rs 4

The Teachings of Islam

The Good Life
Pages 40 Price Rs 5

The Garden of Paradise
Pages 44 Price Rs 5

The Fire of Hell
Pages 44 price Rs 5

Tabligh Movement
Pages 68 Rs 20

Forthcoming Publications:

Women In Islam

Islam As It Is

Islam: The Voice of Human Nature

God Oriented Life

خبرنامہ اسلامی مرکز ۴۳

۱۔ انگریزی اخبار ٹائمس آف انڈیا (۱۲ جولائی ۱۹۸۸) نے صدر اسلامی مرکز کا ایک مفصل مضمون شائع کیا ہے۔ اس کا عنوان حسب ذیل ہے :

American Asians: A Model

اس مضمون میں مشن کے تعمیری نقطۂ نظر کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اس کے ذریعہ انشاء اللہ اسلامی مرکز کا تعمیری پیغام وسیع تر حلقہ تک پہونچانے میں مدد ملے گی۔

۲۔ پروفیسر موتی لال جوتوانی (نئی دہلی) نے گاڈ ارائزز کا مطالعہ کیا۔ اس کے بعد انھوں نے اس کتاب کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے ایک خط (۲۰ مئی ۱۹۸۸) لکھا ہے۔ اس کی چند سطریں یہ ہیں :

After reading the book, I wasn't the same as before: it made a thought-provoking perusal. No doubt, it is a good addition to Islamics. (Dr. Motilal Jotwani).

۳۔ حسین امام انجینیر نے جاپان سے اپنے خط (۲۳ مئی ۱۹۸۸) میں لکھا ہے کہ ان کو اسلامی مرکز کی کتاب "اللہ اکبر" ملی۔ انھوں نے اس کا مطالعہ کیا اور اس سے غیر معمولی طور پر متاثر ہوئے۔ وہ چاہتے ہیں کہ اس کتاب کو بہت جلد انگریزی زبان میں شائع کیا جائے۔ جدید انسان کو اسلام کا ربانی پیغام پہونچانے کے لیے یہ کتاب بے حد موزوں ہے۔

۴۔ صدر اسلامی مرکز کے سفرنامے مرتب کیے جارہے ہیں۔ انشاء اللہ وہ حسب ذیل ترتیب سے شائع ہوں گے :

میوات کا سفر
غیر ملکی اسفار
ملکی اسفار (مطبوعہ الرسالہ)
بقیہ اسفار (مطبوعہ الجمعیۃ ویکلی)

۵۔ عرب ملکوں سے اکثر خطوط آتے رہتے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ لوگ نہایت دلچسپی کے ساتھ مرکز کی عربی اور انگریزی مطبوعات کو پڑھ رہے ہیں اور اس سے گہرا

تاثر قبول کر رہے ہیں۔ الجزائر سے استاذ محجوب میلود اپنے خط (۲۳ شعبان ۱۴۰۸) میں اپنے مطالعہ کی تفصیلات بتاتے ہوئے لکھتے ہیں : وقد قرأت فی رسائلکم وکتبکم عن اهداف المرکز فانها والحق تعالیٰ اعجبنی واثلجت صدری۔

ایک صاحب اپنے خط (۲۶ مئی ۱۹۸۸) میں لکھتے ہیں : ایک مقام پر کچھ خواتین نے مجھ سے یہ سوال کیا کہ اسلام نے ہم کو بہت پیچھے کر دیا ہے۔ بیرونی کاموں سے ہم کو معطل رکھا جاتا ہے۔ جب کہ دوسری عورتیں آگے بڑھ رہی ہیں۔ میں نے ان کو الرسالہ اکتوبر ۱۹۸۷ کا مضمون "تہذیب جدید کے مسائل" پیش کیا۔ واقعہ یہ ہے کہ اس نے جادو کا اثر کیا۔ پھر میرے پاس جتنے رسالے تھے سب لے جاکر دیا تو ایک ہی دن میں سب پڑھ ڈالا۔ اب ان لوگوں کو الرسالہ سے بے حد دلچسپی ہو گئی ہے (جنید احمد، سیوان)

غالب اکیڈمی کی تقریر (۱۷ اپریل) کی رپورٹ دہلی کے مختلف اخبارات میں شائع ہوئی۔ ہندی روزنامہ نوبھارت ٹائمس (۱۸ اپریل ۱۹۸۸) نے تقریر کا خلاصہ دیتے ہوئے اس کا عنوان ان الفاظ میں قائم کیا : اسلام ورتمان یگ کا نرماتا۔ اخبار ہجوم نے اپنی تفصیلی رپورٹ اس عنوان کے ساتھ شائع کی "اسلام دور جدید کا خالق" وغیرہ

بعض مقامات سے اطلاع ملی ہے کہ وہاں الرسالہ کے قارئین اور اس کے ہمدرد ہفتہ میں ایک بار کسی مقام پر جمع ہوتے ہیں۔ ہر ایک اپنا کھانا اپنے ساتھ لاتا ہے، اور سب مل کر ایک ساتھ کھاتے ہیں اور پھر الرسالہ کی توسیع و ترقی کے لیے مشورہ کرتے ہیں۔ "اجتماعی کھانا" کا یہ طریقہ بہت مناسب ہے۔ دوسرے مقامات کے احباب کو بھی اس پر عمل کرنا چاہیے۔

مرکز کی اشاعتی اسکیم کے تحت حسب ذیل نئی کتابیں زیر طبع ہیں : میوات کا سفر، تعمیر کی طرف، کاروانِ اسلام، نشری تقریریں، پیغام عمل، عقلیات اسلام۔

ریاض سے ایک صاحب اپنے خط ۲۵ اپریل ۱۹۸۸ میں لکھتے ہیں : کئی سالوں سے الرسالہ پڑھ رہا ہوں۔ یہ رسالہ ہمارے لیے بہترین نسخہ ہے۔ الرسالہ ہمارے ایک انڈین مسلمان کی معرفت ملتا ہے۔ اس سے مجھے بہت فائدہ پہونچا۔ اس سے پہلے میں حق کی پگڈنڈی پر

چل رہا تھا، اب میں حق کی شاہراہ پر چلتے ہوئے مومن کی کیفیت اپنے اندر محسوس کرتا ہوں۔ اس رسالہ کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اب ہم اسلام میں صحیح طور پر داخل ہوئے ہیں اور اب ایمان لائے ہیں۔ مجھے اسلامی لٹریچر میں اس سے معیاری اور کوئی رسالہ اب تک نظر نہ آیا۔ الرسالہ کے مختصر مضامین نے مجھے سوچ سمجھ عطا کی اور میری زندگی کو پورے طور پر تعمیری کاموں کے لیے بنا دیا۔ (محمد منیر فیض)

۱۱۔ ایک صاحب اپنے خط (۲ جون ۱۹۸۸) میں لکھتے ہیں: ہمارے آفس میں ایک انجینیر ہیں ان کا نام جینت بابو راؤ شمتی ہے۔ وہ خدا پر یقین نہیں کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ جو کچھ ہے انسان ہے۔ اس سے بڑھ کر کوئی نہیں۔ ان سے بات ہوئی تو میں نے ان کو گاڈ ارائزز پڑھنے کے لیے دی۔ تیسرے دن انھوں نے آفس آتے ہی مجھ سے ملاقات کی اور کہا۔ میں نے کتاب کا مطالعہ کیا۔ یقیناً تم نے ایک بہت ہی قیمتی کتاب مجھے پڑھنے کے لیے دی ہے۔ انسان کچھ نہیں۔ اس کتاب میں بہت ہی مدلل مقالے ہیں۔ اب مجھے اپنے نظریہ پر نظر ثانی کرنی ہوگی۔ انھوں نے بتایا کہ وہ آپ سے خط کتابت کرنا چاہتے ہیں اور ساتھ ہی گاڈ ارائزز کا ترجمہ مراٹھی زبان میں کرنا چاہتے ہیں۔

۱۲۔ ایک صاحب کراچی سے اپنے خط (۱۵ مئی ۱۹۸۸) میں لکھتے ہیں: آپ کی کتابوں کی افادیت محسوس کر کے ہم نے انھیں سندھی زبان میں شائع کرنا شروع کر دیا ہے۔ اب تک آٹھ دس کتابوں کے متعدد اڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور سندھی نوجوانوں کے یہ تاثرات آئے ہیں کہ خدا کے فضل سے ان کتابوں کے مطالعہ نے ہمیں الحاد ودہریت کے سیلاب میں بہہ جانے سے بچالیا۔ (محمد موسیٰ بھٹو، حیدرآباد، سندھ)

۱۳۔ ایک صاحب اپنے خط ۱۱ جون ۱۹۸۸ میں لکھتے ہیں: میں ایک مصروف دکاندار ہوں۔ اس وجہ سے کتابوں کا مطالعہ نہیں کر پاتا۔ مگر اس کے باوجود الرسالہ کا مطالعہ باقاعدگی کے ساتھ کرتا ہوں۔ دکان پر جب بھی کچھ موقع ملتا ہے، الرسالہ کھول کر بیٹھ جاتا ہوں۔ ہر روز رات کو سونے سے پہلے گھر کے تمام افراد کو الرسالہ کے مضامین سناتا ہوں۔ الحمد للہ آپ کے مضامین کو سن کر ہمارے بچوں کا مزاج اتنا بدل گیا ہے کہ وہ دینداری کی طرف مائل ہو گیے ہیں (انور کمال، کلکتہ)

تذکیر القرآن

جلد اوّل : سورۃ فاتحہ۔ سورۃ بنی اسرائیل
جلد دوم : سورۃ الکہف۔ سورۃ الناس

قرآن کی بے شمار تفسیریں ہر زبان میں لکھی گئی ہیں۔ مگر تذکیر القرآن اپنی نوعیت کی پہلی تفسیر ہے۔ تذکیر القرآن میں قرآن کے اساسی مضمون اور اس کے بنیادی مقصد کو مرکز توجہ بنایا گیا ہے۔ جزئی مسائل اور معلوماتی تفصیلات کو چھوڑتے ہوئے اس میں قرآن کے اصل پیغام کو کھولا گیا ہے اور عصری اسلوب میں اس کے دعوتی اور تذکیری پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے۔ تذکیر القرآن عوام و خواص دونوں کے لیے یکساں طور پر مفید ہے۔ وہ طالبینِ قرآن کے لیے فہمِ قرآن کی کنجی ہے۔

ہدیہ جلد اول ۱۰۰ روپیہ
جلد دوم ۱۰۰ روپیہ

مکتبہ الرسالہ، نئی دہلی

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

	Rs
تذکیر القرآن جلد اول	100/-
" " جلد دوم	100/-
اللہ اکبر	40/-
پیغمبر انقلاب	30/-
مذہب اور جدید چیلنج	35/-
عظمتِ قرآن	25/-
الاسلام	25/-
ظہورِ اسلام	25/-
اسلامی زندگی	20/-
احیاءِ اسلام	20/-
رازِ حیات (مجلد)	45/-
صراطِ مستقیم	25/-
خاتونِ اسلام	35/-
سوشلزم اور اسلام	25/-
اسلام اور عصرِ حاضر	20/-
حقیقتِ حج	25/-
اسلامی تعلیمات	20/-
تبلیغی تحریک	15/-
تعبیر کی غلطی	35/-
دین کی سیاسی تعبیر	10/-

دین کیا ہے	3/-
قرآن کا مطلوب انسان	6/-
تجدیدِ دین	4/-
اسلام دینِ فطرت	4/-
تعمیرِ ملت	4/-
تاریخ کا سبق	4/-
مذہب اور سائنس	8/-
عقلیاتِ اسلام	4/-
فسادات کا مسئلہ	3/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	3/-
تعارفِ اسلام	4/-
اسلام پندرھویں صدی میں	4/-
راہیں بند نہیں	4/-
ایمانی طاقت	4/-
اتحادِ ملت	4/-
سبق آموز واقعات	4/-
زلزلۂ قیامت	6/-
حقیقت کی تلاش	4/-
پیغمبرِ اسلام	4/-
آخری سفر	4/-

اسلامی دعوت	4/-
خدا اور انسان	4/-
حل یہاں ہے	6/-
سچا راستہ	2/-
دینی تعلیم	4/-
حیاتِ طیبہ	4/-
باغِ جنت	4/-
نارِ جہنم	4/-
میوات کا سفر	25/-

God Arises	Rs. 45/-
Muhammad The Prophet of Revolution	50/-
Religion and Science	25/-
Tabligh Movement	20/-
The Way to Find God	4/-
The Teachings of Islam	5/-
The Good Life	5/-
The Garden of Paradise	5/-
The Fire of Hell	5/-
Muhammad The Ideal Character	4/-
Man Know Thyself !	4/-
इन्सान अपने आपको पहचान	2/-
सच्चाई की तलाश	4/-

مکتبہ الرسالہ سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی

06 OCT 1988

الرسالہ

زیر سرپرستی

مولانا وحید الدین خان

صدر اسلامی مرکز

ISSN 0970-180X



God Arises

By Maulana Wahiduddin Khan

This is the translation with some additions of *Mazhab Aur Jadeed Challenge*, translated into Arabic as *Al-Islam Yatahaddah*, which became a best-seller throughout the Arab world. It has also been translated into a number of other languages including Turkish, Malay, Serbo-Croatian (Yugoslavian), Sindhi, etc., and has come to be accepted as a standard work on the Islamic position vis-à-vis modern thought.

"... *in the fourteen hundred years of Islamic history, innumerable books on Islam have appeared. There are just a few books calling mankind to God which are clearly distinguishable from the rest because of the clarity and force with which they make their appeal. Without doubt, this book is one of that kind*".

— *Daily AL-AHRAM (Cairo)*

Pages 265 ISBN 81-85063-14-1 (Pbk) 81-85063-17-6 (Hbd) Price Rs. 45

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اردو، انگریزی میں شائع ہونے والا

Dr. Zakir Husain Library • Jamia Nagar • New Delhi • J.M.I.

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

شمارہ ۱۴۳ اکتوبر ۱۹۸۸

فہرست

ماہانہ الرسالہ ، سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳ ، فون : 697333, 611128

مطلوب بندے

عن ابی ایوب الانصاری قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا یحل لرجل ان یہجر اخاہ فوق ثلاث لیال یلتقیان فیعرض ھذا ویعرض ھذا وخیرھما الذی یبدأ بالسلام

(متفق علیہ)

حضرت ابو ایوب انصاری کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کسی آدمی کے لیے جائز نہیں کہ وہ اپنے بھائی کو تین دن تک چھوڑے رکھے۔ دونوں کا سامنا ہو تو یہ اِدھر منہ پھیر لے اور وہ اُدھر منہ پھیر لے۔ اور دونوں میں بہتر وہ ہے جو سلام میں پہل کرے۔

اللہ کے محبوب بندے وہ ہیں جنھیں نمایاں ہونے کا کوئی شوق نہ تھا۔ وہ گم نامی میں جئے اور گم نام ہی اس دنیا سے چلے گئے۔ جنھوں نے جو کچھ کیا صرف اللہ کے لیے کیا، ان کی کوئی اور غرض اس میں شامل نہ تھی، جو اتنا بے نفس تھے کہ اگر کسی بھائی سے بگاڑ کی بات ہوگئی تو انھوں نے تعلقات کو خوش گوار بنانے کے لیے پہل کی۔

اس دنیا میں بگاڑ کا پیش آنا فطری ہے۔ مگر بگاڑ پر قائم رہنا سرکشی ہے۔ جو شخص بگاڑ پر قائم رہے، وہ اپنے عمل سے ثابت کرتا ہے کہ وہ خود پرستی کا مریض ہے۔ وہ اپنی ذات کو حق سے بلند سمجھتا ہے۔ وہ اپنی خواہش کو وہ مقام دے رہا ہے جو مقام خدا کو دیا جانا چاہیے۔ حق کا مجروح ہونا اسے گوارا ہے، مگر اپنی ذات کا مجروح ہونا اسے گوارا نہیں۔

ایسے ہی لوگوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ جب کسی سے کوئی شکایت کی بات ہو جاتی ہے تو وہ غصہ ہو کر بیٹھ جاتے ہیں۔ وہ اس سے سلام و کلام بند کر دیتے ہیں۔ حتی کہ جب جذبات ٹھنڈے پڑتے ہیں اور انھیں اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے اس وقت بھی وہ دوبارہ تعلقات پیدا کرنے میں پہل نہیں کرتے۔ وہ اس کو اپنے لیے سُبکی سمجھتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اگر میں نے پہل کی تو میں چھوٹا ہو جاؤں گا۔

اس قسم کے خیالات یقیناً شیطانی وسوسہ ہیں۔ اور مومن کو چاہیے کہ وہ اس قسم کے وسوسوں سے بچے۔ وہ اللہ کی خاطر ہر دوسری چیز کو نظر انداز کر دے۔

زمین سے محروم

پاکستان کے صدر جنرل محمد ضیاء الحق ۱۷ اگست ۱۹۸۸ کو ایک ہوائی حادثہ میں ہلاک ہوگئے۔ اس واقعہ پر ٹائمس آف انڈیا (۱۸ اگست ۱۹۸۸) نے جو اڈیٹوریل شائع کیا ہے، اس کی سرخی پاکستان بغیر ضیاء (Pakistan without Zia) کے الفاظ میں قائم کی ہے۔ اس کو میں نے پڑھا تو معاً میرے ذہن میں ایک اور سرخی آگئی جس کے الفاظ یہ تھے: ضیاء بغیر پاکستان (Zia without Pakistan)

اگر اس حقیقت کو سامنے رکھا جائے کہ یہ ضیاء الحق کے لیے دنیا سے آخرت کی طرف سفر تھا، تو یہ کہنا صحیح ہوگا کہ یہ پاکستان سے زیادہ خود ضیاء الحق کا مسئلہ ہے۔ اب تک وہ ایک ایسی دنیا میں تھے جہاں وہ خود مطلق حاکم کی حیثیت رکھتے تھے۔ موت کے بعد وہ ایک ایسی دنیا میں ہیں جہاں ساری حاکمیت صرف ایک اللہ کو حاصل ہے۔ اس کے سوا کسی کو وہاں کوئی حاکمیت یا اختیار حاصل نہیں۔

صدر ضیاء الحق پاکستان کی زمین پر کھڑے ہوئے تھے، موت نے بے رحمانہ طور پر ان کو اس زمین سے جدا کر دیا۔ اسی طرح ہر آدمی "ضیاء" ہے اور ہر آدمی کسی "پاکستان" کے اوپر کھڑا ہوا ہے۔ کوئی شخص کسی ملک کے اوپر اور کوئی کسی ادارہ کے اوپر۔ کوئی کسی عہدہ کے اوپر اور کوئی مصلحت پرستی کے اوپر۔ کسی کو اگر واقعی زمین نہیں ملی تو اس نے جھوٹ اور فریب کی زمین پر اپنے آپ کو کھڑا کر رکھا ہے۔ غرض ہر آدمی کی ایک زمین ہے اور ہر آدمی اپنی زمین پر پاؤں جمائے ہوئے کھڑا ہوا ہے۔

مگر موت ہر ایک کو اس کی زمین سے جدا کر دیتی ہے۔ ضیاء الحق کے لیے یہ دن ۱۷ اگست مقرر تھا۔ اسی طرح ہر آدمی کا ایک '۱۷ اگست' ہے جو ٹھیک اپنے وقت پر آجاتا ہے اور آدمی کو اس کی زمین سے محروم کر دیتا ہے، خواہ وہ خشکی میں ہو یا سمندر میں یا ہوا میں۔ موت کا فرشتہ ہر جگہ عین وقت پر اس کو پکڑ لیتا ہے اور اس کو اس کی زمین سے جدا کر کے بے یار و مددگار حالت میں خدا کی عدالت میں پہنچا دیتا ہے۔

ایک اخبار نے موت کو الم ناک خاتمہ (Tragic end) کہا تھا۔ مگر زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ موت ایک المناک آغاز ہے۔ یہ یوم عمل سے نکل کر یوم حساب میں داخل ہونا ہے۔ کیسا عجیب ہے وہ خاتمہ جو عجیب تر آغاز میں تبدیل ہو جائے۔

نبوّت اور ختمِ نبوّت

کچھ لوگوں سے ختم نبوت کے عقیدہ پر گفتگو ہوئی۔ میں نے کہا کہ محمد بن عبد اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت کا سلسلہ ختم ہوگیا۔ اب قیامت تک کوئی اور نبی آنے والا نہیں۔ انھوں نے کہا کہ اس کی دلیل کیا ہے۔ میں نے کہا کہ اس کی نقلی اور عقلی دلیلیں علماء نے بیان کی ہیں، میں خود بھی اس پر اپنی کتابوں میں کافی لکھ چکا ہوں، اگر آپ اس موضوع کا علمی اور تفصیلی مطالعہ کرنا چاہیں تو ان کتابوں کا مطالعہ فرمائیں۔ تاہم دوسری باتوں کے علاوہ، یہ واقعہ بذات خود اس کی دلیل ہے کہ پیغمبر اسلام کے بعد دنیا میں کوئی اور پیغمبر ظاہر نہ ہوسکا۔ یہ ایک واقعاتی ثبوت ہے جو بتاتا ہے کہ پیغمبر اسلام کے بعد یہ سلسلہ عملی طور پر منقطع ہے۔

میں نے کہا کہ پیغمبر ہونا اس قسم کی کوئی سادہ سی بات نہیں جیسے ایک شخص خطیب یا شاعر بن جاتا ہے۔ کسی انسان کا پیغمبر ہونا انتہائی غیر معمولی بات ہے۔ جس طرح ساری تاریخ میں کبھی کوئی شخص یہ نہ کہہ سکا کہ میں کائنات کا خالق ہوں۔ اسی طرح کوئی غیر پیغمبر یہ کہنے کی ہمت بھی نہیں کرسکتا کہ میں خدا کا پیغمبر ہوں۔ پیغمبری کا دعویٰ یا تو کوئی پاگل شخص کرے گا، یا وہ شخص کرے گا جو واقعۃً پیغمبر ہو۔

اس سلسلہ میں میں نے اپنا ایک ذاتی تجربہ بتایا۔ میں نے کہا کہ ایک باباجی تھے جن کے پیروؤں کی تعداد لاکھوں تک پہنچتی ہے۔ ۱۹۸۰ میں ان کا انتقال ہوگیا۔ ان کے کچھ پیروؤں سے ایک بار میری ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ ہمارے باباجی (Prophet of the time) (وقت کے پیغمبر) ہیں۔ میں نے بلا بحث ان سے کہا کہ آپ مجھے اپنے باباجی کے پاس لے چلئے اور ان سے کہئے کہ میرے سامنے وہ اپنی زبان سے یہ جملہ دہرائیں کہ "میں وقت کا پیغمبر ہوں"۔

اپائنٹمنٹ کے ذریعہ وقت طے ہوا۔ وہ لوگ مجھے باباجی کے ہیڈ کوارٹر پر لے گئے۔ وہاں کئی لوگوں کی موجودگی میں باباجی سے ملاقات ہوئی۔ میں تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ تک ان کی مجلس میں شریک رہا۔ مگر باباجی اپنی زبان سے یہ الفاظ دہرانے کی ہمت نہ کرسکے کہ "میں وقت کا پیغمبر ہوں"۔ وہ صرف دوسری دوسری باتیں کرتے رہے۔ میں نے باباجی سے کہا کہ آپ کے پیروؤں نے مجھے

بتایا ہے کہ آپ یہ کہتے ہیں کہ میں وقت کا پیغمبر ہوں، مگر باباجی نے اس کا کوئی براہ راست جواب نہیں دیا۔ یہاں تک کہ میں وہاں سے واپس چلا آیا۔

جن لوگوں سے یہ گفتگو ہو رہی تھی، انھوں نے دوبارہ کہا کہ مگر مرزا غلام احمد قادیانی (۱۸۳۹-۱۹۰۸) نے تو اپنے بارہ میں پیغمبر ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ میں نے کہا کہ مرزا غلام احمد قادیانی کے حالات بتاتے ہیں کہ وہ خلل ذہنی کا شکار تھے، وہ کوئی صحیح الدماغ آدمی نہ تھے۔ ایسا شخص کوئی بھی لغو بات کہہ سکتا ہے۔ حتیٰ کہ ان کا غیر فصیح کلام خود اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ کسی پیغمبر کا کلام نہیں۔

تاہم اس سے قطع نظر، ان کے اصل دعویٰ پر غور کیجئے۔ مرزا غلام احمد قادیانی کا دعویٰ یہ تھا کہ وہ ظلّی یا بروزی پیغمبر ہیں۔ یعنی وہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا بروز (Reappearance) ہیں۔ ان کا یہ قول اپنی تردید آپ ہے۔ جب وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بروز ہیں تو قدرتی طور پر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کی روشنی میں جانچ کر ان کے دعویٰ کی صحت یا عدم صحت کا فیصلہ کیا جانا چاہئے۔ یہ کہہ کر مرزا غلام احمد قادیانی نے خود محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے اوپر جج مان لیا۔ بالفاظ دیگر ان کی نبوت کو جانچنے کا معیار خود وہ ذات قرار پائی جو اپنے بعد کسی اور نبی کا پیشگی انکار کر چکی ہے۔ یہ کیسی عجیب تردید ہے جو مرزا غلام احمد قادیانی نے خود ہی اپنے خلاف فراہم کر دی ہے۔

اب مرزا غلام احمد قادیانی کو پیغمبر ماننے کی شرط اول یہ ہوگی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی تعلیمات سے یہ ثابت کیا جائے کہ آپ کے بعد ظلّی یا بروزی پیغمبر آئیں گے۔ مگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کے پورے ذخیرہ (نیز قرآن) میں اس کے حق میں کوئی دلیل موجود نہیں۔ قرآن میں آپ کو خاتم النبیین بتایا گیا ہے (الاحزاب ۴۰) اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے صراحۃً یہ فرما دیا ہے کہ میرے بعد کوئی اور نبی آنے والا نہیں۔ میرے بعد نبوت کے ایسے دعویدار تو اٹھ سکتے ہیں جن کا جھوٹا ہونا عیاناً ثابت ہو، مگر میرے بعد کسی سچے نبی کی آمد ممکن نہیں:

عن ثوبان، قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم .... وانہ سیکون فی امتی کذابون ثلاثون، کلہم

حضرت ثوبان بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ..... اور یہ کہ میری امت میں تیس جھوٹے ہوں گے۔ ان میں سے ہر ایک

یزعم انہ نبی ، و انا خاتم النبیین لا نبیَ   گمان کرے گا کہ وہ نبی ہے۔ حالاں کہ میں آخری
بعدی   (ابوداؤد ، کتاب الفتن)   نبی ہوں۔ میرے بعد کوئی اور نبی نہیں۔

مرزا غلام احمد قادیانی کا اپنے آپ کو محمد عربی کا بروزی پیغمبر کہنا ایک خود تردیدی دعویٰ ہے۔ یہ اپنی تردید آپ کر رہا ہے۔ جب پیغمبر اسلام نے خود یہ نہ کہا ہو کہ میرے بعد میرا بروز ہوگا۔ یا آئندہ میرا بروزی پیغمبر آئے گا تو کیسے یہ مانا جاسکتا ہے کہ آپ کا بروز ہوا۔ ایسی حالت میں تو یہ دعویٰ اپنے آپ کٹ جاتا ہے۔

اسی داخلی تضاد کا یہ نتیجہ ہے کہ مرزا غلام احمد قادیانی کی موت کے بعد ان کی جماعت میں توجیہ و تعبیر کا اختلاف پیدا ہوا اور ان کا فرقہ دو حصوں میں بٹ گیا۔ ایک فرقہ (احمدی فرقہ) نے ان کو مذکورہ معنوں میں نبی کہا۔ اور دوسرے فرقہ (لاہوری فرقہ) نے کہا کہ وہ صرف مجدد تھے۔

تاریخ کی تصدیق

پیغمبر عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور پر جلد ہی ڈیڑھ ہزار سال پورے ہونے والے ہیں۔ مگر اب تک ساری دنیا میں کوئی ایک بھی قابلِ ذکر شخص پیدا نہیں ہوا جو مستقل نبوت کا دعوی کرے۔ اور اس کا دعویٰ تاریخ میں برقرار رہے۔

آپ کے زمانہ میں عرب کے مسیلمہ (م ۶۳۲ء) نے نبوت کا دعویٰ کیا۔ مگر اس کا دعویٰ صرف یہ تھا کہ میں محمدؐ کے ساتھ کارِ نبوت میں شریک کیا گیا ہوں (انی قد اشرکتُ فی الامر معہ) آپ نے اس کے شریکِ نبوت ہونے کا انکار کیا، اس لیے اس کا دعویٰ بے بنیاد ہو کر رہ گیا۔ عراق کے المتنبی (۹۶۵ - ۹۱۵ء) نے جزئی نبوت کا دعویٰ کیا۔ مگر اپنی زندگی ہی میں وہ اپنے دعویٰ سے دست بردار ہوگیا۔ پنجاب کے گرو نانک (۱۵۳۹ - ۱۴۶۹ء) کو ان کے کچھ معتقدین اپنے طور پر پیغمبر کہہ دیتے ہیں۔ مگر خود انھوں نے کبھی اپنے آپ کو پیغمبر کی حیثیت سے پیش نہیں کیا۔ ان کے اپنے کلام کے مطابق، انھیں صرف ایک مذہبی یا روحانی پیشوا کہا جاسکتا ہے۔ ایران کے بہاء اللہ (۱۸۹۲ - ۱۸۱۷) کا معاملہ بھی یہی ہے۔ انھوں نے پیغمبر خدا ہونے کا دعویٰ نہیں کیا، بلکہ مہدی ہونے کا دعویٰ کیا۔ یعنی شیعہ عقیدہ کے مطابق، بارھواں امام جو رسول کی جگہ آئے گا۔ گویا ان کا دعویٰ جانشین رسول ہونے کا تھا نہ کہ رسول ہونے کا۔ اسی طرح ہندستان کے غلام احمد قادیانی (۱۹۰۸ - ۱۸۳۹) نے اپنے آپ کو ذیلی پیغمبر کی حیثیت سے پیش کیا۔

مستقل پیغمبر کی حیثیت سے وہ اپنے آپ کو پیش کرنے کی ہمت نہ کر سکے ۔

پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا تھا کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ اب ایک مورخ مزید آگے بڑھ کر یہ کہنے پر مجبور ہے کہ آپ کے بعد کوئی نبی نہیں آیا۔ آپ کے زمانہ میں جو چیز پیشین گوئی کی حیثیت رکھتی تھی، آج وہ ایک تاریخی واقعہ بن چکی ہے۔ کیا اس کے بعد بھی یہ گنجائش ہے کہ آپ کے خاتم الرسل ہونے پر شبہہ کیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ اہل ایمان کے لیے آپ عقیدہ کے اعتبار سے خاتم الرسل ہیں، اور دوسرے لوگوں کے لیے تاریخی واقعہ کے اعتبار سے خاتم الرسل ۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن میں خاتم النبیین (Seal of the prophets) کہا گیا ہے۔ یعنی نبیوں کی مہر۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے نبوت کے سلسلہ پر آخری مہر لگا دی۔ اب اس فہرست میں کسی نئے نام کا اضافہ ہونے والا نہیں۔ اسی بات کو آپ نے ان لفظوں میں بیان فرمایا کہ اِنّی آخر الانبیاء (میں آخری نبی ہوں)

نزول قرآن سے لے کر اب تک کے زمانہ کو دیکھئے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قرآن اور پیغمبر اسلامؐ کے یہ الفاظ تاریخ کا فیصلہ بن گئے۔ اس طویل مدت میں کوئی ایک شخص بھی نہیں جو بحیثیت نبی کے اٹھا ہو یا واقعی معنوں میں اس نے اپنی نبوت کا دعوی کیا ہو۔ آپ کے بعد کی تاریخ کا پورا ذخیرہ ایسے کسی شخص کے تذکرے سے خالی ہے ۔

اصل یہ ہے کہ ہر مذہب میں بعض مصلح قسم کے افراد کے اٹھنے کی خبر دی گئی ہے ۔ اسی امکان کو کچھ افراد نے اپنی شخصی حوصلہ مندی کے لیے استعمال کیا ۔ مثلاً حدیث میں ایک "مہدی" کا ذکر ہے جس کو سنی مسلمان سادہ معنوں میں اور شیعہ حضرات مبالغہ آمیز معنی میں لیتے ہیں۔ اس کے حوالے سے کچھ لوگ مہدی ہونے کے دعویدار بن گئے ۔ مسیحیت میں نیز اسلام میں حضرت مسیح کی آمد ثانی کا ذکر ہے۔ اس بنا پر کچھ لوگ کہنے لگے کہ میں مسیح موعود ہوں ۔ اسی طرح ہندو دھرم میں بھگوان کے اوتار لینے کا تصور پایا جاتا ہے ۔ چنانچہ کچھ لوگوں نے اپنے آپ کو اوتار کے روپ میں پیش کرنا شروع کر دیا۔ پیغمبر اسلامؐ کے بعد اٹھنے والے تمام مدعیوں کا معاملہ ، ایک یا دوسری صورت میں یہی ہے ۔

پیغمبر اسلامؐ کے بعد جن مدعیانِ نبوت کا نام لیا جاتا ہے، وہ غلط طور پر لیا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ نبوت کی زمین پر نہیں اٹھے بلکہ دوسری زمینوں پر اٹھے ۔ نبوت کی زمین آپ کے بعد

ایک ممنوعہ زمین بن گئی ، اور عملاً وہ آج تک ممنوعہ زمین بنی ہوئی ہے۔

نبوت ، کارِ نبوت

اس معاملہ میں صحیح بات یہ ہے کہ نبوت کا تسلسل ختم ہوگیا ، مگر کارِ نبوت کا تسلسل جاری ہے۔ ایک انسان کا نبی کی حیثیت سے منتخب کیا جانا اور فرشتہ کے ذریعہ اس کا باقاعدہ ربط خدا سے قائم ہونا ، یہ ایک انتہائی غیر معمولی اور استثنائی واقعہ ہے۔ اس قسم کا واقعہ صرف اس وقت ظہور میں لایا جاتا ہے جب کہ خدا کی ہدایت محفوظ صورت میں موجود نہ ہو۔ یہی واحد فیصلہ کن سبب ہے جو نبی کی پیدائش کو ضروری قرار دیتا ہے۔ مگر اب قرآن کی صورت میں خدا کی کتاب مکمل طور پر محفوظ ہو چکی ہے ، اس لیے اب کسی نئے نبی کی آمد کا سبب بھی باقی نہیں رہا۔ اب طالبانِ حق کو کسی نئے پیغمبر کا انتظار نہیں کرنا ہے بلکہ پیغمبرِ آخر الزماں کے اسوہ کی روشنی میں خدا پرستی کے تقاضے پورے کرنا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ زندگی کوئی ٹھہری ہوئی چیز نہیں ، وہ ہمیشہ بدلتی رہتی ہے۔ اس بنا پر بار بار ضرورت ہوتی ہے کہ بدلے ہوئے حالات کی روشنی میں ازسرِ نو خدا کا حکم معلوم کیا جائے۔ مگر حالات کی تبدیلی کے مسئلہ کا حل اجتہاد ہے نہ کہ نئی نبوت۔ قرآن اور حدیث میں تمام ضروری اور بنیادی احکام بتا دیے گئے ہیں۔ اب ہمارا کام یہ ہے کہ حالات کو قرآن وحدیث کی تعلیمات کی روشنی میں جانچیں۔ اور اصل کے ذریعہ فرع کا اور کل کے ذریعہ جزء کا حکم معلوم کریں۔ اب ہمیں نئی نبوت کی ضرورت نہیں۔ اب ہمیں صرف اس عالمانہ بصیرت کی ضرورت ہے جو "قدیم" احکام کو سمجھے اور "نئے" حالات پر ان کا انطباق (Application) دریافت کر سکے۔

میوات کا سفر

صفحات ۲۲۰ ھدیہ ۲۵ روپیہ

سب سے بڑا مسئلہ

ملک کی تقسیم (۱۹۴۷) سے پہلے ہندستانی مسلمانوں کے درمیان دو قسم کی قیادتیں ابھریں۔ ایک باریش قیادت اور دوسری بے ریش قیادت۔ بظاہر دونوں کے درمیان زبردست اختلافات تھے۔ ایک متحدہ ہندستان کی حامی تھی، اور دوسری منقسم ہندستان کی حامی۔ مگر اس اعتبار سے دونوں یکساں تھے کہ دونوں نفرت کی زمین پر کھڑے ہوئے تھے۔ ایک کا سرمایہ نفرتِ انگریز تھا، اور دوسرے کا سرمایہ نفرتِ ہندو۔

باریش قیادت کی نفرت کا نشانہ انگریز تھا۔ اگر مسلمانوں نے باریش قیادت کا ساتھ دیا ہوتا تو انگریز کے ہندستان سے چلے جانے کے بعد شاید نفرت کی آگ ٹھنڈی پڑ جاتی اور مسلمان دوبارہ معتدل زندگی گزارنا شروع کر دیتے۔ مگر مخصوص اسباب کے تحت بے ریش قیادت کو کامیابی حاصل ہوئی۔ مسلمانوں کی بیشتر تعداد بے ریش قیادت کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو گئی۔ چونکہ بے ریش قیادت کی نفرت کا نشانہ ہندو تھا، اور ہندو تقسیم کے بعد بدستور اپنی حالت پر باقی رہا، ہندستانی مسلمانوں کے لیے اندرونی حریف کے طور پر، اور پاکستانی مسلمانوں کے لیے سرحدی حریف کے طور پر، نتیجہ یہ ہوا کہ نفرت والی سیاست کا تسلسل بدستور سرحد کے دونوں طرف جاری رہا۔

یہ بات خواہ کتنی ہی زیادہ تلخ ہو، مگر یہ حقیقت ہے کہ موجودہ مسلمانوں کا واحد سرمایہ جس پر وہ جی رہے ہیں وہ محبت نہیں بلکہ نفرت ہے۔ اس کا کھلا ہوا ثبوت یہ ہے کہ ان کے درمیان وہی اخبارات سب سے زیادہ پڑھے جاتے ہیں جو انھیں نفرت کی شراب پلائیں۔ ان کے درمیان وہی افراد قائد بن کر ابھرتے ہیں جو نفرت کے لہجہ میں بات کریں۔ وہ انھیں نعروں پر سب سے زیادہ متحرک ہوتے ہیں جن کے اندر نفرت کی چاشنی موجود ہو۔

مسلمانوں کی نجات کی واحد صورت یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو نفرت کے اس گڑھے سے نکالیں اور محبت کی زمین پر کھڑے ہونے کی کوشش کریں۔ ورنہ یقینی ہے کہ وہ خدا کی پکڑ میں آجائیں گے، اور انھیں کے ساتھ ان کے وہ اکابر بھی جو مسلمانوں کو اس خلافِ اسلام مشغلہ میں دیکھتے ہیں، پھر بھی وہ انھیں نہیں ٹوکتے۔

اپنی طرف مارچ

۱۹۴۵ سے پہلے جاپانی ایک لڑاکا قوم کی حیثیت رکھتے تھے۔ دوسری جنگ عظیم میں انھوں نے وحشیانہ بہادری کی حد تک اپنے جنگی جنون کا ثبوت دیا۔ مگر ۶ اگست ۱۹۴۵ کو جب ایٹم بم نے ان کے دو صنعتی شہروں کو تباہ و برباد کر دیا تو اس کے بعد جاپان میں ایک نیا ذہن ابھرا جس کو انھوں نے عمل معکوس (Reverse course) کا نام دیا۔ یعنی جنگ کے طریقہ کو چھوڑ کر امن کے طریقہ سے اپنی زندگی کی تعمیر کرنا۔ عمل معکوس کی یہ تدبیر نہایت کامیاب رہی۔ جاپان جنگ کے ذریعہ جو کچھ حاصل کرنے میں ناکام رہا تھا۔ اس کو اس نے امن کے ذریعہ زیادہ شاندار طور پر حاصل کر لیا۔

یہ عمل معکوس (ریورس کورس) اپنی تدبیری نوعیت کے اعتبار سے عین وہی چیز ہے جو اسلام کی تاریخ میں "صلح حدیبیہ" کی صورت میں پائی جاتی ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ حکمت مومن کا گم شدہ مال ہے۔ جہاں وہ اس کو پائے تو وہی سب سے زیادہ اس کا حقدار ہے (الحکمۃ ضالۃ المومن فاین وجدھا فھو احق بھا) اس اعتبار سے یہ جاپانی حکمت عین اسلامی حکمت ہے۔ اور اہل اسلام سب سے زیادہ یہ حق رکھتے ہیں کہ وہ اس کو اپنی تعمیر نو کے لیے استعمال کریں۔

مسلمان سو سال سے بھی زیادہ عرصہ سے دوسروں کی طرف مارچ کا تجربہ کر رہے ہیں — مرہٹوں اور سکھوں کی طرف مارچ، انگریزوں کی طرف مارچ، ہندوؤں کی طرف مارچ، حکمرانوں کی طرف مارچ نئی دہلی اور اجودھیا کی طرف مارچ۔ دوسروں کی طرف مارچ کی اس سیاست میں مسلمانوں نے کھویا تو بہت ہے، مگر پایا کچھ نہیں ہے۔ اب میں مسلمانوں کے سامنے یہ تجویز پیش کرتا ہوں کہ وہ "ریورس کورس" کے اصول پر عمل کریں۔ وہ دوسروں کی طرف مارچ کے طریقہ کو چھوڑ دیں اور اپنی طرف مارچ کے طریقہ کو اختیار کر لیں۔ دوسروں کی طرف مارچ میں انھوں نے اگر دو سو سال ضائع کیے ہیں، تو اپنی طرف مارچ میں صرف ۱۰ سال لگا دیں، اور اس کے بعد دیکھیں کہ کون سا طریقہ زیادہ مفید ہے۔ دوسروں کی طرف مارچ کا یا اپنی طرف مارچ کا۔

دوسروں کی طرف مارچ میں مسلمانوں کا قافلہ ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا۔ مگر اپنی طرف مارچ؛ ہر قدم اگلا قدم ہے، اس میں ناکامی کا کوئی سوال نہیں۔

زندگی کا راز

۱۹۴۷ میں برصغیر ہند کو آزادی ملی تو ایک طرف اہل پاکستان تھے جن کی نمائندگی کرتے ہوئے مسٹر محمد جناح نے کہا کہ ہم کو کٹا پٹا اور کرم خوردہ پاکستان (Truncated and moth-eaten Pakistan) ملا ہے۔ ان کے خوابوں کے پاکستان میں پنجاب اور بنگال کا پورا صوبہ شامل تھا۔ وہ پورے کشمیر کو اپنے ملک کا حصہ دیکھنا چاہتے تھے۔ اس لیے موجودہ پاکستان انھیں اپنی امیدوں سے کم نظر آیا۔

دوسری طرف اہل ہند کا حال بھی یہی ہوا۔ یہاں کے لوگوں کے ذہن میں آزاد ہندستان یا سوتنتر بھارت کا جو تصور تھا، موجودہ ملک اس سے کم تھا۔ چنانچہ آزادی کے بعد بھی کروروں لوگ اسی احساس کا شکار رہے ہے کہ ان کا محبوب بھارت انھیں ٹکڑے ہو کر ملا ہے۔ انھوں نے جو کچھ چاہا تھا، اس سے بہت کم ہے وہ جو عملاً انھیں حاصل ہوا ہے۔

آزادی بظاہر پانے کے انجام پر ختم ہوئی تھی۔ مگر مذکورہ اسباب کی بنا پر اس نے نہ پانے کے احساس کی صورت اختیار کرلی۔ سرحد کے دونوں طرف سیاسی محرومی کا جذبہ بھڑک اٹھا۔ دونوں ایک دوسرے کو اپنا دشمن سمجھ کر ایک دوسرے کی کاٹ میں لگ گیے۔ دونوں اس کوشش میں مصروف ہو گیے کہ یا تو ماضی کی سیاسی امنگوں کو دوبارہ واقعہ بنائیں یا کم از کم ایک دوسرے کے خلاف کارروائیاں کرکے اپنے سینہ میں جلتی ہوئی احساس محرومی کی آگ کو ٹھنڈا کریں۔

اس سے مختلف مثال جاپان کی ہے۔ دوسری جنگ عظیم نے اس کا جغرافی رقبہ بھی گھٹا دیا اور اس کی سیاسی اور فوجی آزادی بھی اس سے چھین لی۔ مگر اہل جاپان نے کھوئی ہوئی چیز کو بھلا دیا۔ اور جو چیز اب بھی انھیں حاصل تھی، اس پر قناعت کرتے ہوئے عملی جدوجہد شروع کر دی ——— چالیس سال بعد آج جاپان ترقی کی چوٹی پر پہونچ گیا ہے، اور ہندستان اور پاکستان کے حصہ میں صرف یہ آیا ہے کہ وہ ایک دوسرے کو اپنی بربادی کا ذمہ دار ٹھہرانے کے لیے الفاظ کا جھوٹا طوفان برپا کرتے رہیں۔

زندگی کم تر پر راضی ہونے کا نام ہے۔ اس دنیا میں جو کم پر راضی ہو جائے وہ زیادہ پاتا ہے۔ اور جو کم پر راضی نہ ہو، وہ کم سے بھی محروم رہتا ہے اور زیادہ سے بھی۔

دعوت کے حدود

قرآن میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ تم لوگوں کو نصیحت کرو، کیوں کہ تم صرف نصیحت کرنے والے ہو، تم لوگوں کے اوپر داروغہ نہیں ہو (الغاشیہ ۲۲) اسی طرح دوسرے مقام پر کہا گیا ہے کہ تم لوگوں کے اوپر جبر کرنے والے نہیں ہو، پس تم قرآن کے ذریعہ اس شخص کو نصیحت کرو جو میرے ڈرانے سے ڈرے (ق ۴۵) حدیث میں ارشاد ہوا ہے :

عن ابی موسیٰ قال : کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا بعث احداً من اصحابہ فی بعض امرہ قال "بشروا ولاتنفروا، ویسّروا ولا تعسّروا" (متفق علیہ)

حضرت ابو موسیٰ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اپنے اصحاب میں سے کسی کو کسی کام پر بھیجتے تو فرماتے کہ خوش خبری دو اور متنفر نہ کرو، آسانی پیدا کرو اور لوگوں کو مشکل میں نہ ڈالو۔

اس طرح کی آیتیں اور حدیثیں گویا دعوت کے عمل کی حد بندی کر رہی ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ داعی کو ابلاغ کے دائرہ میں رہ کر کام کرنا ہے، اس کو اِجبار کے دائرہ میں داخل نہیں ہونا ہے۔ اس کو یہ حق ہے کہ وہ سمجھانے بجھانے کے تمام ذرائع کو استعمال کرے۔ مگر اس کو یہ حق نہیں کہ وہ تخریبی طریقہ اختیار کر کے لوگوں کو مجبور کرنے لگے۔ مثال کے طور پر فیملی پلاننگ کو لیجئے۔ فیملی پلاننگ کا موجودہ نظریہ اسلامی تعلیمات کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتا۔ یہاں ایک داعی کو یہ کرنا ہے کہ وہ دلائل کے ذریعہ اسلامی نقطۂ نظر کو ثابت کرے۔ اور اس طرح اس کے بارے میں لوگوں کو مطمئن کرنے کی کوشش کرے۔ اس طریقہ کی ایک مثال راقم الحروف کی کتاب عظمت قرآن (صفحہ ۲۳ - ۲۶) میں دیکھی جا سکتی ہے۔

لیکن اگر کچھ لوگ "اینٹی فیملی پلاننگ مہم" چلائیں۔ وہ فیملی پلاننگ کے پوسٹر پھاڑیں، اخباروں کو جلائیں اور دکانوں کو بند کرائیں، تو اس قسم کی مہم درست نہ ہوگی۔ کیوں کہ یہ دعوت نہیں ایجی ٹیشن ہے۔ یہ ابلاغ کی حد کو پار کر کے اِجبار کی حد میں داخل ہونا ہے، اور اس قسم کا تجاوز داعی کے لیے جائز نہیں۔ ایسا طریق کار لوگوں کو اسلام سے متنفر کرنے کا سبب بنتا ہے، جب کہ ہمارا کام یہ ہے کہ ہم لوگوں کو اسلام کی طرف راغب کریں۔ اس قسم کی "اینٹی" مہم چلانا گویا دعوتی مواقع کو قتل کرنا ہے۔ اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہ تخریب کاری ہے نہ کہ دعوت الی اللہ۔

۴۵ سال بعد

فرینک بورگن (Frank P. Bourgin) نے امریکہ کی شکاگو یونیورسٹی سے اقتصادی تاریخ کے موضوع پر ریسرچ کیا۔ انھوں نے اپنا ۶۱۷ صفحات کا مقالہ تیار کر کے یونیورسٹی کے حوالہ کر دیا۔ یہ ۱۹۴۲ کا واقعہ ہے۔ مگر یونیورسٹی کے پولیٹکل سائنس کے شعبہ نے ان کے مقالہ کو اس قابل نہیں سمجھا کہ اس پر انھیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری عطا کی جائے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ آدم اسمتھ (Adam Smith) کے فکری غلبہ کا زمانہ تھا۔ امریکی دانشور اس وقت آدم اسمتھ کے زیر اثر آزاد معیشت (Laissez-faire) کو مقدس عقیدہ کا درجہ دیئے ہوئے تھے۔ مسٹر بورگن کا مقالہ اس رواجی فکر اور اس روایتی تعقل (Conventional wisdom) سے ٹکراتا تھا کیوں کہ انھوں نے اپنے مقالہ میں یہ لکھا تھا کہ آزاد معیشت بے قید معیشت کا نام نہیں ہے۔ امریکی دستور کے مطابق، حکومت کو یہ حق ہے کہ وہ منصوبہ بند اقتصادیات (Planned economy) کا طریقہ اپنائے۔ اور حسب ضرورت نجی اقتصادی سرگرمیوں پر پابندی لگائے۔

مسٹر بورگن نے ڈاکٹریٹ سے مایوس ہو کر بزنس شروع کر دی۔ انھوں نے اپنے مقالہ کو لوہے کے ایک بکس میں بند کر دیا جو ایک تلخ وراثت (Bitter legacy) کے طور پر ان کے گھر میں پڑا رہا۔ یہاں تک کہ مسٹر بورگن کی عمر ۷۷ سال ہو گئی۔ وہ جسمانی اعتبار سے معذور ہو گیے۔

بالآخر حالات بدلے۔ امریکی دستور کے بارے میں نئی تعبیر عام طور پر تسلیم کی جانے لگی۔ چنانچہ امریکہ کے ایک ممتاز پروفیسر شیلی سنگر (Arthur Schlesinger Jr.) نے خاص اسی موضوع پر ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام امریکی تاریخ کا اتار چڑھاؤ (Cycles of American History) ہے۔ مسٹر بورگن نے یہ کتاب پڑھی تو انھوں نے محسوس کیا کہ اس کتاب میں بھی وہی خیالات پیش کیے گیے ہیں جو انھوں نے تقریباً آدھی صدی قبل تحریر کیے تھے۔ اس کتاب کو دیکھنے کے بعد انھوں نے پروفیسر شیلی سنگر کو اپنے مقالہ کا ... روانہ کیا اور اس کے ساتھ جو کچھ پیش آیا تھا وہ بھی انھیں تحریر کیا۔

پروفیسر شیلی سنگر (سٹی یونیورسٹی آف نیویارک) نے مقالہ کو پڑھ کر اس کی زبردست تحسین

کی۔ انھوں نے لکھا کہ مسٹر بورگن جدید اقتصادی تنظیم کے حقیقی پانیر (True pioneer) ہیں۔ مسٹر بورگن کے علاوہ انھوں نے شکاگو یونیورسٹی کے پولیٹکل سائنس ڈپارٹمنٹ کو بھی خط لکھا اور اس میں پر زور طور پر یہ اپیل کی کہ مسٹر بورگن کے معاملہ پر از سر نو غور کیا جائے۔ کیوں کہ مسٹر بورگن نے ممتاز طور پر ایک تحقیقی کام کیا تھا اور انھیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری نہ دے کر ان کے ساتھ زبردست ناانصافی ہوئی ہے۔

امریکہ میں اب آدم اسمتھ کے فکری غلبہ کا سابقہ دور ختم ہو چکا تھا۔ چنانچہ شیل سنگر کی اپیل کارگر ہوئی۔ یونیورسٹی کے ذمہ داروں نے معاملہ پر از سر نو غور کرنے کے بعد اقرار کیا کہ اس معاملہ میں ان سے غلطی ہوئی ہے۔ مسٹر پریشٹ (Mr. Pritchett) نے کہا کہ میرا خیال ہے کہ مسٹر بورگن کا کام ایک عظیم کام تھا :

I thought it was a tremendous job.

چنانچہ یونیورسٹی نے فیصلہ کیا کہ جون ۱۹۸۸ میں ایک خصوصی تقریب کی جائے اور اس میں فرینک بورگن کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری دے دی جائے۔ مزید یہ کہ شکاگو یونیورسٹی نے مسٹر بورگن کے پورے خاندان کے لیے ہوائی سفر کا انتظام اپنے ذمہ لیا تاکہ مسٹر بورگن کے ساتھ ان کی بیوی، بچے اور پوتے پوتیاں بھی شکاگو آئیں اور جون کے کانوکیشن میں شرکت کر سکیں (ٹائمس آف انڈیا ۲۷ اپریل ۱۹۸۸)

جو واقعہ مسٹر فرینک بورگن کے ساتھ پیش آیا، وہی زیادہ بڑے پیمانہ پر اس دنیا میں ان افراد کے ساتھ پیش آتا ہے جو خالص حق پر قائم ہونے کی کوشش کریں اور لوگوں کے سامنے بے آمیز سچائی کو پیش کرنا چاہتے ہوں۔ دنیا کے وہ لوگ جن کا دین ذاتی مفاد ہے، جو مصلحتوں میں ڈوبے ہوئے ہیں، وہ انھیں رد کر دیتے ہیں۔ وہ ان کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ یہی پچھلے پیغمبروں کے ساتھ پیش آیا اور یہی موجودہ زمانہ کے علمبرداران حق کے ساتھ پیش آئے گا۔

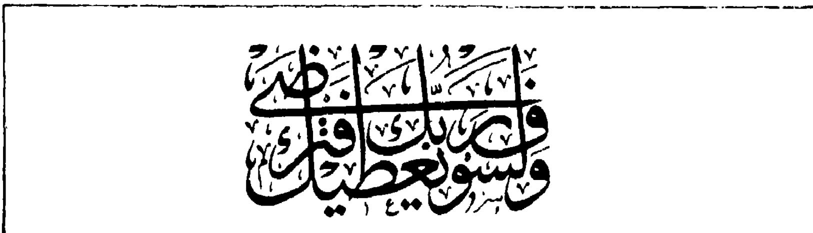
مگر ناقدری اور بے اعترافی کا یہ ماحول "۴۵ سال" سے زیادہ باقی رہنے والا نہیں۔ یہ صورت حال عارضی ہے نہ کہ مستقل۔ وہ وقت لازماً آنے والا ہے جب کہ حالات مکمل طور پر بدل جائیں۔ جب مالک کائنات براہ راست ظاہر ہو کر یہ اعلان کرے کہ میرے جس بندے کو انسانوں

نے رد کر دیا تھا، اس کو میں قبولیت کا شرف عطا کرتا ہوں۔ میرا یہی بندہ میرا مطلوب بندہ تھا۔ دوسرے لوگ اگر چھلکا ہیں تو یہ مغز تھا۔ دوسرے لوگ اگر کوڑا ہیں تو یہ اثاثہ تھا۔

لوگوں کے اس مردود بندے کو آج میں اپنے مقبول بندے کے طور پر سرفراز کرتا ہوں۔ آج میں اس کے لیے ابدی انعامات کے تمام دروازے کھولتا ہوں، وہ جس دروازے سے چاہے میری رحمتوں کی دنیا میں داخل ہو جائے ـــــــ اس آنے والے دن کا آنا یقینی ہے۔ اس دن مایوسی اور ناکامی رد کرنے والوں کے لیے ہوگی، اور عزت اور کامیابی ان کے لیے جنھیں رد کردیا گیا تھا۔

یہی بات حضرت مسیح نے ان لفظوں میں کہی ہے کہ "بہت سے اول آخر ہو جائیں گے اور آخر اول" (مرقس ۱۰ : ۳۱) دوسری جگہ حضرت مسیح کا ارشاد اس طرح نقل کیا گیا ہے :

پھر اس نے اپنے شاگردوں کی طرف نظر کر کے کہا مبارک ہو تم جو غریب ہو، کیوں کہ خدا کی بادشاہی تمہاری ہے۔ مبارک ہو تم جو اب بھوکے ہو، کیوں کہ آسودہ ہوگے۔ مبارک ہو تم جو اب روتے ہو، کیوں کہ ہنسوگے۔ جب ابن آدم کے سبب سے لوگ تم سے عداوت رکھیں گے اور تمہیں خارج کر دیں گے اور لعن طعن کریں گے اور تمہارا نام برا جان کر کاٹ دیں گے تو تم مبارک ہوگے۔ اس دن خوش ہونا اور خوشی کے مارے اچھلنا۔ اس لیے کہ دیکھو، آسمان پر تمہارا اجر بڑا ہے۔ کیوں کہ ان کے باپ دادا نبیوں کے ساتھ بھی ایسا ہی کیا کرتے تھے۔ مگر افسوس تم پر جو دولت مند ہو، کیونکہ تم اپنی تسلی پا چکے۔ افسوس تم پر جو اب سیر ہو، کیوں کہ بھوکے ہوگے۔ افسوس تم پر جو اب ہنستے ہو کیوں کہ ماتم کروگے اور روؤگے۔ افسوس تم پر جب سب لوگ تمہیں بھلا کہیں، کیوں کہ ان کے باپ دادا جھوٹے نبیوں کے ساتھ بھی ایسا ہی کیا کرتے تھے۔ (لوقا ۶ : ۲۰-۲۶)



عمارت ڈھ گئی

۳ مئی ۱۹۸۸ کو دہلی کے اخبارات کے صفحہ اول پر ایک دردناک تصویر چھپی ہوئی تھی۔ ایک عمارت زمین پر گر کر کھنڈر ہوگئی۔ تصویر کے ساتھ جلی الفاظ میں لکھا ہوا تھا ——
جموں اسپتال کی عمارت منہدم :

Jammu hospital collapsed

قصہ یہ ہے کہ جموں میں سرکاری فنڈ سے بچوں کا ایک اسپتال بنایا گیا۔ اس کی تین منزلہ عمارت صرف تین سال پہلے ۱۹۸۵ میں بن کر تیار ہوئی تھی۔ اب اس میں باضابطہ کام شروع ہوگیا تھا۔ اچانک اس کے ایک حصہ میں شگاف ظاہر ہوا۔ اس کے بعد رات بھر تیز بارش ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ ۲ مئی کو صبح ساڑھے چھ بجے یہ پختہ عمارت دھڑام سے گر پڑی۔ ایک اندازہ کے مطابق تقریباً ایک سو کی تعداد میں عملہ کے افراد، مریض اور ان کی دیکھ بھال کرنے والے لوگ دب کر مر گئے۔ انڈین اکسپریس (۳ مئی ۱۹۸۸) کے مطابق خیال کیا جاتا ہے کہ انہدام کا سبب یہ تھا کہ اس میں گھٹیا قسم کا تعمیری سامان لگایا گیا تھا :

It is believed to have collapsed due to the use of inferior quality construction material.

پختہ عمارت کا یہ انہدام، اس طرح کے دوسرے واقعات کی طرح، محض ایک معمولی حادثہ نہیں۔ یہ خدا کا الارم ہے۔ یہ دنیوی واقعہ کی زبان میں آخرت میں ہونے والے واقعہ کی پیشگی اطلاع ہے۔

موجودہ دنیا میں بہت سے لوگوں کی مصلحت پرستی اور ان کی استحصالی ذہنیت انھیں یہ موقع دے رہی ہے کہ وہ اپنی شخصیت کی شاندار عمارتیں کھڑی کریں۔ وہ اپنے چاروں طرف عظمت کی پُر بہار فصل اگائیں۔ مگر آخرت کے اعتبار سے یہ "ناقص سامان" کے اوپر اپنی تعمیر کھڑی کرنا ہے۔ موجودہ دنیا کی عمارتیں قیامت کے آتے ہی ڈھ پڑیں گی۔ لوگ دیکھیں گے کہ جہاں پہلے اونچا محل کھڑا ہوا تھا وہاں اب برباد کھنڈر کے سوا اور کچھ نہیں۔

ایک آیت

قرآن کی ایک آیت ہے : یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّۃً (البقرہ ۲۰۸) ایک صاحب نے اس آیت کی تشریح اس طرح کی ہے گویا کہ اس میں مسلمانوں کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ انقلابی جھنڈا لے کر کھڑے ہو جائیں اور تمام دنیا میں اسلام کی مکمل حکومت قائم کر دیں۔ مگر اس قسم کے "انقلابی مشن" کا اس آیت سے کوئی تعلق نہیں۔ اس آیت کا خطاب فرد مسلم سے ہے۔ ایک ایک مسلمان سے کہا جا رہا ہے کہ تم اپنی زندگی کو خدا کے حکم پر ڈھال لو، تم پوری طرح اسلام کے رنگ میں رنگ جاؤ۔ اس آیت میں فرد کے داخلِ اطاعت ہونے کا ذکر ہے نہ کہ نظام حکومت کو داخلِ اطاعت کرنے کا۔

عربی میں ایک لفظ اُدخلوا (پیش کے ساتھ) ہے۔ دوسرا لفظ اَدخِلوا (زبر کے ساتھ) ہے۔ سورۃ البقرہ (۲۰۸) میں پہلا لفظ ہے، اور سورۃ المومن (۴۶) میں دوسرا لفظ۔ اُدخلوا کے معنی ہیں داخل ہو جاؤ۔ اور اَدخِلوا کے معنی ہیں داخل کرو۔ بالفاظ دیگر، پہلے لفظ کا خطاب اپنے آپ سے ہے، اور دوسرے لفظ کا خطاب دوسروں سے۔ سورۃ البقرہ کی مذکورہ آیت میں اُدخلوا (پیش کے ساتھ، نہ کہ زبر کے ساتھ) ہے۔ یعنی اس آیت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ لوگوں کو مکمل اسلام میں داخل کرو۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم خود بحیثیت ایک فرد کے پوری طرح اسلام کے اندر آجاؤ۔

شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب نے اس آیت کا ترجمہ اس طرح کیا ہے: "اے ایمان والو، داخل ہو جاؤ اسلام میں پورے" اور اس کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے: "اسلام کو پورا پورا قبول کرو۔ یعنی ظاہر و باطن اور عقیدہ و عمل میں صرف احکام اسلام کا اتباع کرو۔ یہ نہ ہو کہ اپنی عقل یا کسی دوسرے کے کہنے سے کوئی حکم تسلیم کر لو، یا کوئی عمل کرنے لگو۔ سو اس سے بدعت کا قلع قمع مقصود ہے۔ کیوں کہ بدعت کی حقیقت یہی ہے کہ کسی عقیدہ یا کسی عمل کو کسی وجہ سے مستحسن سمجھ کر اپنی طرف سے دین میں شمار کر لیا جائے۔ مثلاً نماز اور روزہ جو کہ افضل عبادات ہیں، اگر بدون حکمِ شریعت کوئی اپنی طرف سے مقرر کرنے لگے، جیسے عید کے دن عیدگاہ میں نوافل کا پڑھنا یا ہزارہ روزہ رکھنا، یہ بدعت ہوگا۔ خلاصہ ان آیات کا یہ ہوا کہ اخلاص کے ساتھ ایمان لاؤ اور بدعات سے بچتے رہو" صفحہ ۴۰

حل رخی پالیسی

موجودہ سال کا غالباً سب سے زیادہ اہم واقعہ سوویت روس اور امریکہ کی وہ مفاہمت ہے جس کو ٹائم (۳۰ مئی ۱۹۸۸) نے بجا طور پر عظیم اتحاد (Grand compromise) کا نام دیا ہے۔ سوویت روس اور امریکہ دونوں دنیا کی سب سے بڑی طاقت (Superpowers) شمار ہوتے ہیں۔ پچھلے ۴۰ سال سے دونوں کے درمیان سخت رقابت جاری تھی۔ دونوں ایک دوسرے کے خلاف ٹکراؤ کی پالیسی پر قائم تھے۔ دونوں ملکوں کے پریس اور میڈیا کا کام یہ تھا کہ ایک دوسرے پر الزام لگائیں اور ایک دوسرے کی مذمت کرتے رہیں۔ مگر لمبے تجربہ کے بعد، اب دونوں ٹکراؤ کے بجائے صلح کی باتیں کر رہے ہیں۔ وہ ہتھیاروں کی دوڑ کے بجائے بات چیت کی دوڑ پر اپنی توجہ لگائے ہوئے ہیں۔ وہ رقابت کے طریقہ کو چھوڑ کر مفاہمت کے طریقہ کو اپنا رہے ہیں۔

سوویت روس کے ایک ذمہ دار نے اس نئی پالیسی کو حل رُخی (Solution-oriented) پالیسی کا نام دیا ہے۔ اس سے پہلے دونوں کی تمام توجہ اگر اس پر جمی ہوئی تھی کہ وہ ایک دوسرے کو غلط ثابت کریں تو اب انھوں نے اس قسم کی باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی تمام توجہ اس پر لگا دی ہے کہ مسئلہ کا حل کیا ہے۔ یہ واقعہ جو سوویت روس اور امریکہ کے درمیان پیش آیا ہے، اس میں دوسری قوموں کے لیے بہت بڑا سبق ہے۔ موجودہ زمانہ میں اختلاف اور ٹکراؤ کی پالیسی اتنا مہنگا سودا بن چکی ہے کہ بڑی طاقتیں بھی اس کا تحمل نہ کر سکیں۔ پھر چھوٹی قومیں کیوں کر اس تباہ کن مشغلہ کا تحمل کر سکتی ہیں۔

حقیقت پسندی کی طرف

نکیتا خروشچوف ۱۹۵۸ سے ۱۹۶۴ تک سوویت روس کے وزیر اعظم تھے۔ انھوں نے سرمایہ دار دنیا کو خطاب کرتے ہوئے اپنا مشہور جملہ (ہندستان ٹائمس ۲۸ جون ۱۹۸۸) کہا تھا کہ ہم تم کو دفن کر دیں گے:

We will bury you.

اسی طرح امریکہ کے پریذیڈنٹ رونالڈ ریگن نے ۱۹۸۳ میں سوویت روس کو شیطانی سلطنت (The evil empire) قرار دیا تھا۔ امریکی افسروں کا کہنا تھا کہ ہم اشتراکی روس کو سمندر میں دھکیل

دیں گے۔ مگر اشتراکی انقلاب کے ستر سال بعد ۱۹۸۸ میں آخر کار دونوں ملکوں کو اپنا ذہن بدلنا پڑا۔ روس کے لیڈروں نے گفت وشنید کے لیے امریکہ جانا شروع کیا۔ رونالڈ ریگن نے خود ماسکو کا دورہ (۲۸ جون تا ۲ جولائی ۱۹۸۸) کیا جس کو وہ اس سے پہلے خارج از امکان سمجھتے تھے۔ دورے سے پہلے واشنگٹن (ہندستان ٹائمس ۲۶ مئی ۱۹۸۸) میں انھوں نے کہا کہ ماسکو کے ساتھ امریکہ کا تعلق حقیقت پسندی کے تحت قائم ہونا چاہیے :

U.S. relations with Moscow must be guided by realism.

چالیس سال سے دونوں ملکوں کے درمیان ہتھیاروں کی دوڑ (Arms race) جاری تھی۔ دونوں ملک ایک دوسرے کو برباد کرنے کے لیے تاریخ کے خطرناک ترین ہتھیار بنانے میں مشغول تھے، مگر آج وہ اپنے بنائے ہوئے ہتھیاروں پر خود ہی پابندی لگا رہے ہیں، حتی کہ اس کو ضائع کر رہے ہیں۔ ٹائمس آف انڈیا (۳ اگست ۱۹۸۸) سکشن ۲ صفحہ ۱ پر ایک خبر ہے جس کی سرخی یہ ہے :

USSR destroys 4 missiles

(سوویت روس اپنے چار میزائل کو برباد کرتا ہے) خبر میں بتایا گیا ہے کہ ۲ اگست ۱۹۸۸ کو سوویت روس نے سریوزیک (Saryozek) میں چار چھوٹی رینج کے میزائل (OTR-22) برباد کر دیے۔ یہ واقعہ مختلف ملکوں کے مشاہدین کی موجودگی میں ہوا جن میں ہندستان اور امریکہ کے مشاہدین بھی شامل تھے۔ میزائل کے خاتمہ کا یہ عمل اس معاہدہ کے تحت کیا گیا ہے جو ریگن اور گورباچوف کے درمیان ہوا ہے۔

معاہدہ کے تحت سوویت روس اگلے تین سال میں اپنے ۱۷۵۲ میزائل کو ضائع کرے گا جن کا رینج ۵۰۰ کیلومیٹر سے لے کر ۵۵۰۰ کیلومیٹر تک ہے۔ امریکہ، حسب معاہدہ اپنے اسی قسم کے ۸۵۹ میزائل کو ضائع کرے گا۔

روس اور امریکہ کی پالیسی میں اس ڈرامائی تبدیلی کا راز یہ ہے کہ ہتھیار سازی اور عسکری فوقیت حاصل کرنے کی کوشش میں دونوں ملکوں کی ترقی رک گئی۔ ایک دوسرے کے خلاف ہتھیاروں کی دوڑ (Arms race) اور ایک دوسرے کے خلاف مذمت رخی (Blame-oriented) پالیسی میں نصف صدی کی مدت گزارنے کے بعد ان پر کھلا کہ اس منفی طریق کار سے وہ کسی بھی قسم کا کوئی فائدہ

حاصل نہ کرسکے ۔ جب کہ دوسرے کی کاٹ کی کوشش میں دونوں نے خود اپنے آپ کو تباہی کے کنارے پر پہنچا دیا۔ چنانچہ اب انھوں نے سابقہ پالیسی کو ترک کرکے حل رخی (Solution-oriented) پالیسی کو اختیار کرنے کا فیصلہ کیا ہے ۔

امریکہ اور روس

امریکہ نے اپنی ساری طاقت جنگی مشین تیار کرنے میں لگا دی ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اقتصادی میدان میں خود اپنے مفتوحہ ملک جاپان سے بھی پیچھے ہو گیا۔ امریکہ آج سب سے بڑا قرض دار ملک ہے۔ اس کے اوپر ۴۰۰ بلین ڈالر کا خارجی قرضہ ہے ، جب کہ جاپان آج سب سے بڑا دائن ملک ہے۔ اُس نے دنیا کو ۲۴۰ بلین ڈالر قرض دے رکھا ہے ۔ امریکی ڈالر جو پچھلی نصف صدی سے اقتصادی دنیا کا شہنشاہ بنا ہوا تھا ، اس کی یہ حیثیت بری طرح مجروح ہو گئی۔ حتی کہ یہ سوال اٹھایا جانے لگا کہ کیا امریکہ اپنی بڑی طاقت کی حیثیت (Superpower status) کو برقرار رکھ سکتا ہے (تفصیل کے لیے : ٹائم ۴ جولائی ۱۹۸۸)

ڈاکٹر ہنری کسنجر نے ایک انٹرویو (ٹائمس آف انڈیا ۹ اگست ۱۹۸۸) میں کہا کہ نئی بنیادی حقیقت یہ ہے کہ عالمی سطح پر کچھ نئی طاقتیں ابھری ہیں۔ مثلاً چین اور ہندستان۔ جاپان دن بدن زیادہ سے زیادہ طاقت ور ہوتا جارہا ہے ۔ ایسی حالت میں امریکہ کو دوسرے ملکوں کو نظر انداز کرنے کی پالیسی کو چھوڑنا پڑے گا۔ امریکہ کے لیے ضروری ہے کہ وہ نئے طاقتی مراکز کے ساتھ موافقت کرے :

US will have to adjust with new power centres.

۱۹ویں آل سوویٹ پارٹی کانفرنس جون ۱۹۸۸ کے آخری ہفتہ میں ماسکو میں ہوئی جس میں پورے ملک سے پانچ ہزار ڈیلی گیٹ شریک ہوئے ۔ اس موقع پر روسی وزیر اعظم گورباچوف نے ساڑھے تین گھنٹے کی تقریر کی ۔ اس طویل تقریر میں انھوں نے نہایت شدت کے ساتھ خود تنقیدی (Self-criticism) کی وکالت کی ۔ ان کی اس تقریر کا ملخص متن ٹائمس آف انڈیا (۲۹ جون ۱۹۸۸) صفحہ ۱۱ پر دیکھا جاسکتا ہے ۔

مسٹر کوئنٹن پیل (Quentin Peel) ایک اخبار نویس کی حیثیت سے خود ماسکو کی اس کانفرنس میں شریک تھے ۔ انھوں نے روسی لیڈروں کی تقریریں سنیں اور ان سے ملاقاتیں کیں۔

انھوں نے روسی وزیر اعظم مسٹر گورباچوف کی ساڑھے تین گھنٹہ کی تقریر کا خلاصہ ان لفظوں میں بیان کیا ہے :

The message seemed plain enough: the party would have to renounce its stifling role in the administration and economy of the country. Power and privilege would have to be curbed, science and initiative given their head, if the Soviet Union were to compete with the rest of the world, let alone be a superpower.

پیغام بظاہر بالکل سادہ تھا۔ کمیونسٹ پارٹی کو انتظامیہ اور اقتصادیات اور ملک کے اوپر اپنے سخت کنٹرول کو چھوڑنا ہوگا۔ طاقت اور استحقاق پر پابندی لگانی ہوگی۔ سائنس اور محرک کو آگے بڑھانا ہوگا، اگر سوویت یونین کو بقیہ دنیا کا مقابلہ کرنا ہے، سپر پاور کی حیثیت کو باقی رکھنا تو درکنار۔

پرسترائیکا

ان حالات نے روسی وزیر اعظم مسٹر میخائیل گورباچوف کو مجبور کیا کہ وہ حقیقت کا اعتراف کریں۔ انھوں نے اشتراکی برتری کا مزاج ترک کرتے ہوئے روس میں تبدیلیاں لانے کی ایک نئی مہم شروع کر دی جس کو وہ دو لفظ میں بیان کرتے ہیں۔ ایک گلاس ناسٹ (Glasnost) یہ ایک روسی لفظ ہے جس کے معنی کشادگی (Openness) کے ہیں۔ دوسرے، پرسترائیکا (Perestroika) اس کا مطلب روسی زبان میں تنظیم نو (Re-structuring) ہوتا ہے۔ پرسترائیکا کے نام سے مسٹر گورباچوف کی ایک کتاب بھی شائع ہوئی ہے۔ جس کا نام انگریزی میں اس طرح ہے :

Perestroika: New Thinking for our Country and the World. ___

اس تحریک کے تحت روس کے سابق اشتراکی ڈھانچہ میں انقلابی تبدیلیاں لائی جارہی ہیں۔ اس میں مذہبی آزادی سے لے کر اپنے روایتی دشمن امریکہ کے ساتھ دوستانہ تعلقات تک شامل ہیں۔ اس سلسلہ میں نہایت سبق آموز رپورٹیں اخبارات میں شائع ہوئی ہیں۔ ان میں سے ایک رپورٹ وہ ہے جو لاس اینجلس اور واشنگٹن پوسٹ نیوز سروس کے تحت اخبارات میں آئی ہے۔ ہندستان ٹائمس (۱۶ جنوری ۱۹۸۸) نے اس کو مسٹر رائے گٹ مین (Roy Gutman) کے نام سے شائع کیا ہے۔ اس کا عنوان حسب ذیل ہے :

Kremlin, White House now realistic (p. 20).

رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ حالیہ واقعات کے بعد روس اور امریکہ کے تعلقات میں ایک

Kremlin, White House Now Realistic

By Roy Gutman

MOSCOW: A high Soviet official, ascribing a dramatic change in ap proach to the Reagan Administration, says US policy-makers now constitute a pragmatic "team" that is "solution-oriented" and can work well with Mr Mikhail S. Gorbachev's new foreign policy.

"You have realistically-minded people on both sides at the moment, in the Kremlin and in the White House. That team and our team ... are solution-oriented," said Mr. Bessmertnykh, who oversees Soviet relations with the United States.

Mr. Bessmertnykh, a veteran diplomat who served 12 years in the United States and is known as a leading exponent of pragmatism, emphasised that the summit affirmed a historic shift in US-Soviet relations.

He asserted that an agreement on a treaty sharply cutting offensive nuclear arms is still possible this year, despite a number of unresolved issues

Mr Bessmertnykh also claimed that Mr Gorbachev's new offer on conventional forces was "the most practical offer ever made." Under the offer, NATO and the Warsaw Pact would exchange data on each over's forces, verify the data on-site and reduce deployments where one side had superiority. He said M Reagan was non-committal, but Mr. Bessmertnykh urged the United States to give the idea serious consideration.

Mr Bessmertnykh said changed attitudes on both sides had facilitated progress toward settling, regional disputes where the United States and Soviet Union had been an influence. These disputes involve such places as Afghanistan, the Middle East, the Persian Gulf, Southern Africa and Kampuchea. In the Soviet Union, the attitude change encompasses Mr Gorbachev's "new thinking" in foreign policy, which calls for political solutions based on a "balance of interests" of all the involved parties, and in the United States, a readiness by the Reagan Administration to discuss issues on this basis.

When Mr Reagan came to office, the Administration used phrases such as "we shall draw the line, we shall go to the source,we shall stop the advance of communism..."

But eight years later, "look at the situation", he said,"the fleet was concentrated in the Persian Gulf. What was the result?" Mr Bessmertnykh said "Practical minded people" in the administration "realise the world has changed. You can't do it any more that way. "It's impossible."

Just three years ago, when Mr Reagan and Mr. Gorbachev met in Geneva at their first summit, the US aim in the Middle East was "pushing the Soviet Union into the sea from the Middle East," he said. The Administration has dropped this "arrogant but very unrealistic policy," Bessmertnykh said.

(The Los Angeles Times Washington Post News Service)

تاریخی تغیر (Historic shift) آیا ہے۔ دونوں ملکوں میں نئی سوچ (New thinking) پیدا ہوئی ہے۔ کریملن اور وہائٹ ہاؤس دونوں ایک دوسرے کے معاملہ میں حقیقت پسند بن رہے ہیں۔ یہ رپورٹ ہم یہاں علاحدہ صفحہ پر نقل کر رہے ہیں۔

روس کے ڈپٹی وزیر خارجہ (Alexander Bessmertnykh) جو اپنے ملک کے سفیر کی حیثیت سے ۱۲ سال تک امریکہ میں رہ چکے ہیں۔ انھوں نے نیوز ڈے کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ دونوں ملکوں میں نئی سوچ (New thinking) پیدا ہوئی ہے۔ دونوں کے تعلقات میں ڈرامائی تبدیلی (Dramatic change) اور تاریخی فرق (Historic shift) آرہا ہے۔ امریکی ذمہ دار اس سے پہلے کہا کرتے تھے کہ ہم کیونزم کے پھیلاؤ کو روک دیں گے، ہم ان کو سمندر میں غرق کر دیں گے۔ مگر اب انھوں نے جان لیا ہے کہ یہ ناممکن ہے۔ اس سے پہلے دونوں ملک ایک دوسرے کی مذمت کرنے اور ایک دوسرے کی کاٹ کرنے میں لگے رہتے تھے۔ مگر یہ پالیسی سراسر بے فائدہ رہی۔ اب دونوں طرف کے لوگ حقیقت پسند بن رہے ہیں۔ اب ہماری ٹیم اور ان کی ٹیم دونوں حل رخی ذہن رکھنے والے ہیں:

That team and our team are solution-oriented..

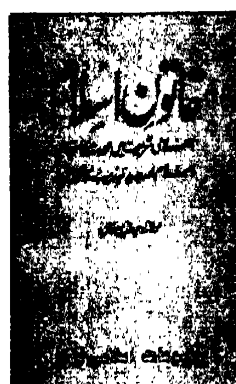
پرسترئیکا کے مقاصد اور نشانے کیا ہیں، اس کی وضاحت مسٹر گورباچوف نے مخصوص اشتراکی زبان میں اس طرح کی ہے: "اور زیادہ جمہوریت، اور زیادہ سوشلزم، محنت کش انسان کے لیے اور زیادہ بہتر زندگی، قوم کے لیے اور زیادہ عظمت ورفعت اور ثروت"۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ "پرسترئیکا" سوشلزم سے واپسی ہے نہ کہ سوشلزم کی طرف "اگلا قدم"۔ کیوں کہ مارکس اور لینن کی تشریح کے مطابق، سوشلزم کی ترقی سرمایہ داری کی موت پر ہونے والی تھی۔ سوشلزم کی ہر پیش قدمی سرمایہ دارانہ نظام کی پسپائی کے ہم معنی تھی۔ مگر آج سوویت روس، گورباچوف کی قیادت میں، سرمایہ دارانہ نظام سے مفاہمت کر رہا ہے، بلکہ وہ اس کی قدروں کو اپنے یہاں رائج کرنے میں ترقی اور خوش حالی کا خواب دیکھ رہا ہے۔

پرسترئیکا سوشلزم کے اصولوں کی صداقت کا ثبوت نہیں ہے۔ وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اس دنیا میں کامیابی حقیقتوں کے اعتراف کے بغیر ممکن نہیں۔ ریگن کے الفاظ میں، اس زمین پر ہمیں تمام اچھے اور برے لوگوں کے ساتھ رہنا ہے۔ حقیقت پسندی اور مفاہمت ہی اس دنیا میں ترقی اور کامیابی کا راز ہے۔

نتیجۂ بحث

روس اور امریکہ کے تعلقات میں یہ تبدیلی بلاشبہ ایک نہایت اہم واقعہ ہے۔ جدید تاریخ کے اس واقعہ میں بہت بڑا سبق ہے۔ یہ واقعہ واضح طور پر بتاتا ہے کہ موجودہ زمانہ میں ٹکراؤ کی پالیسی آخری حد تک اپنی اہمیت کھو چکی ہے۔ اپنے حریف پر الزام لگانا، اس کی کاٹ میں لگے رہنا، اس کے ساتھ مقابلہ آرائی کرنا، روس اور امریکہ جیسی طاقتوں کے لیے بھی سراسر بے فائدہ ہے، کجاکہ دوسری کمزور قومیں اس قسم کی منفی پالیسی اختیار کرکے کسی واقعی نتیجہ کی امید کر سکیں۔

خواہ فرد کا معاملہ ہو یا قوم کا معاملہ، دونوں کے لیے مسئلہ کا حل اسی طریق کار میں ہے۔ اس دنیا میں عقل مندی یہ ہے کہ آدمی دوسرے کی تخریب کرنے کے بجائے اپنی تعمیر میں لگ جائے۔ مسئلہ کو لے کر اس کے نام پر چیخ پکار کرنا یا حریف کے مقابلہ میں لڑائی چھیڑنا، صرف اپنے وقت اور قوت کو ضائع کرنا ہے۔ اس کے سوا اس کا اور کوئی انجام نہیں۔ ایک لفظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ترقی اور کامیابی کا راز حل رُخی (Solution-oriented) پالیسی میں ہے نہ کہ مذمت رخی (Blame-oriented) پالیسی میں۔



خاتونِ اسلام

اسلامی شریعت میں عورت کا مقام
اسلام اور جدید تہذیب کا تقابل

از: مولانا وحید الدین خاں

(صفحات ۲۹۲، قیمت ۳۵ روپیہ)

مکتبہ الرسالہ

سی-۲۹، نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی-۱۳ فون: 697333, 611128

حاکم نہیں داعی

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا کیس، ایک قسم کے جنونِ عظمت (Paranoia) کا کیس ہے۔ جنونِ عظمت (پیرانوئیا) کا مطلب بڑائی کا فریب (Delusions of grandeur) ہے۔ یہ ایک نفسیاتی بیماری ہے جس میں وہ شخص مبتلا ہو جاتا ہے جو بطور خود اپنے کو بڑا سمجھے، جب کہ دوسرے لوگ اس کی بڑائی کو نہ مانتے ہوں۔ ایسا آدمی جھنجلاہٹ کا شکار ہو جاتا ہے۔ وہ دوسروں سے نفرت کرتا ہے اور ان سے لڑتا رہتا ہے، کیوں کہ اس کو دوسروں سے یہ شکایت ہوتی ہے کہ انھوں نے اس کی برتر حیثیت کا اعتراف نہیں کیا۔

"جنونِ عظمت" کے معاملہ کو ایک سادہ مثال کے ذریعہ سمجھا جا سکتا ہے۔ یہ مثال اس عام منظر کی ہے جو ساس اور بہو کے مسئلہ کی صورت میں ہر گھر میں پایا جاتا ہے۔ ایک عورت کے یہاں ایک لڑکا پیدا ہوتا ہے وہ اس کو محبت کے ساتھ پالتی ہے۔ ہر قسم کی تکلیفیں اٹھا کر اس کو بڑا کرتی ہے۔ اس کے بعد نہایت شوق کے ساتھ اس کی شادی کرتی ہے۔ مگر جب ایک لڑکی بہو بن کر اس کے گھر میں رہنے لگتی ہے تو دھیرے دھیرے وہ اس سے متنفر ہو جاتی ہے۔ وہ بات بات میں اس سے لڑتی ہے۔ حتیٰ کہ گھر کی فضا اتنی خراب ہو جاتی ہے کہ نہ ساس کو چین رہتا ہے اور نہ بیٹے اور بہو کو۔

اس کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بہو کے آنے سے پہلے یہ "ساس" گھر کی مالک اور حاکم بنی ہوئی تھی۔ ہر کام اس کی مرضی سے ہوتا تھا۔ مگر بہو کی آمد کے بعد فطری طور پر ایسا ہوتا ہے کہ گھر کے اندر بہو کا عمل دخل شروع ہو جاتا ہے۔ بیٹا پہلے اپنی تنخواہ ماں کو دیتا تھا، اب نئے انتظام کار کی حیثیت سے وہ اپنی تنخواہ "بہو" کے ہاتھ میں دینے لگتا ہے۔ پہلے ہر کام میں صرف ماں سے مشورہ لیا جاتا تھا۔ اب بدلے ہوئے حالات کے تحت بہو سے مشورہ لیا جانے لگتا ہے۔ وغیرہ

"ساس" اس تبدیلی کے ساتھ اپنے آپ کو ہم آہنگ (Adjust) نہیں کر پاتی۔ ساس کو اگرچہ کوئی حقیقی تکلیف نہیں ہوتی، بلکہ اکثر اوقات اس کو پہلے سے زیادہ آرام حاصل رہتا ہے۔ مگر نفسیاتی طور پر وہ سمجھنے لگتی ہے کہ جس گھر میں اب تک میں حاکم کی حیثیت رکھتی تھی، وہاں بہو نے آکر مجھ کو محکوم بنا دیا ہے —— وہ چیز جس کو عام طور پر "ساس بہو کا جھگڑا" کہا جاتا ہے، وہ ساس کی نسبت

سے اسی بدلی ہوئی صورت حال سے اپنے آپ کو ہم آہنگ نہ کر سکنے کا دوسرا نام ہے۔

یہی معاملہ موجودہ زمانے کے مسلمانوں کے ساتھ زیادہ بڑے پیمانہ پر پیش آیا ہے۔ جس دنیا میں وہ " ماں " بن کر رہ رہے تھے، اچانک انھیں محسوس ہوا کہ وہ اس دنیا میں " ساس " بنا دیئے گیے ہیں۔ یہ تبدیلی بذات خود کوئی برائی نہیں تھی۔ وہ ایک فطری صورت حال تھی جو خود خداوند عالم کے قانون کے تحت پیش آئی۔ مگر مسلمان چوں کہ اس تبدیلی کے ساتھ ذہنی موافقت نہ کر سکے اس لیے نئے نظام میں وہ " اپوزیشن " کا کردار ادا کرنے والے، یا صحیح تر لفظ میں پیرانونک کیرکٹر (Paranoic character) بن کر رہ گیے۔

جس زمانہ میں بابری مسجد تحریک کی دھوم تھی، میں نے ایک مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھی۔ وسیع مسجد نمازیوں سے بھری ہوئی تھی۔ امام صاحب نے حسب معمول عربی خطبہ سے پہلے اردو میں ایک تقریر کی۔ اس تقریر میں انھوں نے " شاعر اسلام " کے بلند بانگ اشعار سنائے، اور " اکابر ملت " کے شاندار فرمودات نقل کیے۔ اور پھر پُر جوش طور پر کہا :

یہ بُت پرست ہمارا کیا بگاڑ سکتے ہیں، ہم نے ایک ہزار سال تک ان کے اوپر حکومت کی ہے

اس طرح کے واقعات بتاتے ہیں کہ مسلمانوں کا اصل مسئلہ کیا ہے۔ ان کا مسئلہ کسی دوسرے کے ظلم کا مسئلہ نہیں، ان کا مسئلہ دراصل وہ غلط ذہن ہے جو ان کے اپنے رہناؤں نے ان کے اندر پیدا کیا ہے۔ مسلمان داعی الی اللہ ہیں۔ مسلمانوں کے لیے کرنے کا کام یہ ہے کہ ان کے اندر داعیانہ نفسیات کو ابھارا جائے۔ مگر ہمارے رہناؤں نے انتہائی مجرمانہ طور پر یہ کیا کہ انھوں نے مسلمانوں کے اندر حاکمانہ نفسیات کو ابھارا۔ اسی غلط رہنمائی کا نتیجہ وہ سب چیزیں ہیں جن کو آج ہم مسلمانوں کی بربادی کی صورت میں دیکھ رہے ہیں۔

موجودہ زمانہ میں ایک طرف مغل سلطنت ٹوٹی۔ دوسری طرف عثمانی خلافت کا خاتمہ ہوا۔ اس کے بعد بے شمار لوگ مسلمانوں کو رہنمائی دینے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ مگر ان تمام لوگوں نے ایک ہی مشترک غلطی کی۔ ان میں سے کسی شخص نے بھی ایسا نہیں کیا کہ وہ قرآن وسنت کی روشنی میں صورت حال کا گہرا مطالعہ کرے اور اس کے مطابق مسلمانوں کو صحیح رہنمائی دے۔ ہر ایک نے بس یہ کیا کہ ایک یا دوسرے انداز میں ماضی کی سیاسی کہانیاں سنانے لگا۔ ہر ایک کے پیغام کا خلاصہ وہی تھا جو ان کی تقلید میں

مسجد کے امام نے دہرایا : ہم ہزار سال تک دنیا کے حکمراں رہے ہیں ۔ اور ہم ہی ہیں جس کو دوبارہ دنیا کے سیاسی تخت پر بیٹھنا ہے ۔

بات یہیں تک نہیں رہی ۔ کچھ شاعر اور خطیب قسم کے لوگوں نے مزید آگے بڑھ کر یہ اعلان کر دیا کہ ——— " ہم محتسب کائنات ہیں ، ہمارا منصب ساری کائنات کا احتساب کرنا ہے " یہ بات بلاشبہ مضحکہ خیز حد تک غلط ہے ۔ کیوں کہ " محتسب کائنات " اگر کوئی منصب ہے تو وہ صرف خالق ومالک کے لیے سزاوار ہے ۔ یہ صرف اللہ عزوجل ہے جو اگر چاہے تو کائنات ارض وسما کا احتساب کرے ۔ اس کے سوا کسی کے پاس نہ اس کی طاقت ہے اور نہ کسی کے لیے ممکن ہے کہ وہ ایسا کر سکے ۔

اس بنا پر اس غیر عقلی اور غیر اسلامی نظریہ کے لیے خدا کی کتاب میں کوئی دلیل نہیں مل سکتی تھی ۔ یہاں رہناؤں کی شاعرانہ تخیل نے کام کیا ۔ چنانچہ ابلیس کی ایک خیالی مجلس شوریٰ منعقد کی گئی اور اس کی فرضی روداد مرتب کرکے ابلیس کی زبان سے اس " حقیقت " کا اعلان کر دیا گیا کہ :

ہے حقیقت جس کے دیں کی احتساب کائنات

یہ ایک حقیقت ہے کہ مذکورہ " حقیقت " کا ماخذ خدا و رسول کے کلام میں کہیں موجود نہیں ۔ اور اگر کسی صاحب کے نزدیک موجود ہو تو وہ مجھے ایسی آیت یا حدیث لکھ کر بھیج دیں جس میں یہ " حقیقت " بیان کی گئی ہے کہ مسلمان محتسب کائنات ہیں ۔

مزید یہ کہ اس کو خود ابلیس کا کلام بھی نہیں کہا جا سکتا ۔ فن روایت کے مطابق اس میں یہ نقص ہے کہ ابلیس سے راوی کی ملاقات ثابت نہیں ۔ اس بنا پر دینی معاملہ میں اس کا حوالہ قطعی غیر معتبر ہے ۔ ان تمام کمزوریوں کے باوجود یہ غیر ثابت شدہ کلام ابلیس اتنا پھیلا کہ بڑے بڑے بزرگ اور اکابر اس کو حقیقتِ واقعہ سمجھ کر دہرانے لگے ۔ بلکہ مسلمانوں کے " مقام ومنصب اور ان کی صحیح حیثیت " کو بتانے کے لیے اس کا حوالہ اس طرح دیا جانے لگا گویا اس کو آخری سند کا درجہ حاصل ہو (تعمیر حیات، ۱۰ اگست ۱۹۸۸)

کیسا عجیب ہوگا امت مسلمہ کا وہ اسلامی منصب جو قرآن وحدیث میں تو نہ بتایا گیا ہو ، البتہ ابلیس کے مفروضہ کلام سے حیرت انگیز طور پر اس کو برآمد کر لیا جائے ۔

موجودہ زمانہ کے مسلمان انھیں غلط رہنمائیوں کے وارث ہیں ۔ ان کا ذہن اپنے نام نہاد رہناؤں کے شاعرانہ اور خطیبانہ اور انشا پردازانہ کلام سے بنا ہے نہ کہ حقیقۃً خدا ورسول کے سچے کلام سے ۔ اس

چیز نے ان کے ذہن و فکر کو لغویت کی حد تک غیر حقیقی بنا دیا ہے جس کا خلاصہ ایک لفظ میں یہ ہے کہ وہ حاکمانہ نفسیات میں جینے والی ایک قوم بن کر رہ گئے ہیں، جب کہ صحیح بات یہ تھی کہ وہ داعیانہ نفسیات میں جینے والی قوم بنتے۔

اب پہلا کام یہ ہے کہ مسلمانوں کے اس غلط اور غیر حقیقی ذہن کی اصلاح کی جائے۔ جب تک مزاجی اصلاح کا یہ کام نہ ہو، نہ کوئی دوسرا اعلیٰ کام صحیح طور پر کیا جا سکتا اور نہ مسلمانوں کے مستقبل کو بدلا جا سکتا۔ کوئی شخص عام پسند نعرہ دے کر وقتی طور پر مسلمانوں کی بھیڑ جمع کر سکتا ہے۔ مگر فکری اصلاح سے پہلے کوئی حقیقی انقلاب اتنا ہی ناممکن ہے جتنا کہ بیج کے بغیر درخت کا وجود میں آنا۔ بلا تشبیہ اس کی مثال یہ ہے کہ ایک تاجر کے اندر اگر داداگیری کا مزاج پیدا ہو جائے تو سب سے پہلے اس کے اس مزاج کی اصلاح کی جائے گی۔ کیوں کہ تجارت کا کام تاجرانہ مزاج کے ساتھ کیا جا سکتا ہے نہ کہ داداگیری کے مزاج کے ساتھ۔

مسلمان، قرآن کے الفاظ میں، مذکِّر (نصیحت کرنے والے) ہیں۔ وہ دوسری قوموں کے اوپر مُصیطِر (داروغہ) نہیں ہیں (۸۸: ۲۲) مسلمان اس دنیا میں حاکم نہیں ہیں بلکہ داعی ہیں۔ وہ سلطان نہیں بلکہ سفیر ہیں۔ وہ دنیا کے جج نہیں ہیں بلکہ دنیا کے ناصح ہیں۔ انھیں دو لفظوں پر غور کر کے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ قرآنی ذہن کیا ہے اور مسلم رہنماؤں کا پیدا کردہ ذہن کیا۔

اس میں شک نہیں کہ ماضی میں مسلمانوں کو بہت سی چیزیں دی گئیں۔ جن میں غلبہ و اقتدار بھی شامل تھا۔ مگر وہ خدا کا عطا کردہ تھا نہ کہ مسلمانوں کا اپنا حاصل کردہ۔ اسلامی نقطہ نظر سے ان چیزوں کی حیثیت انعام کی ہے نہ کہ نشانہ کی۔ مسلمان کا اصل کام یہ ہے کہ وہ اللہ کے دین کی پیغام رسانی کرے اور اس کے سوا تمام چیزوں کو اللہ کے خانہ میں ڈال دے۔ کیوں کہ وہی جس کو چاہے جو چیز دے اور جس سے چاہے جو چیز چھین لے۔

مسلمانوں نے جب اپنی برتر حیثیت کو کھویا، اس وقت اگر وہ اس کے سبب پر غور کرتے تو انھیں معلوم ہوتا کہ اپنا داعیانہ کردار کھونے کی وجہ سے ان پر یہ افتاد پڑی ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ اپنی ساری کوشش داعیانہ ذمہ داری کو ادا کرنے میں لگا دیتے اور اس طرح دوبارہ انعام خداوندی کے مستحق قرار پاتے۔ مگر اس کے برعکس یہ ہوا کہ مسلمانوں کی نگاہیں صرف ظاہری واقعہ پر اٹک کر رہ گئیں۔ انھیں واقعہ نظر آیا مگر سببِ واقعہ انھیں دکھائی نہیں دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ان قوموں کے خلاف شکایت

اور احتجاج اور ٹکراؤ میں مشغول ہو گیے جن کو وہ غلط طور پر اپنے المیہ کا ذمہ دار سمجھتے تھے۔ وہ خدا کی طرف متوجہ ہونے کے بجائے انسان کی طرف متوجہ ہو گیے ——— انھیں دو لفظوں میں موجودہ دور کے مسلمانوں کے المیہ کی پوری کہانی چھپی ہوئی ہے۔

موجودہ زمانہ کے مسلم رہنما ایک انتہائی خطرناک غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ وہ یہ کہ وہ صرف ——— دو اصطلاحوں میں سوچنا جانتے ہیں ——— حاکم اور محکوم۔ ان دو کے علاوہ کوئی تیسری اصطلاح انھیں شعوری طور پر معلوم ہی نہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کو اگر "حاکم" کا درجہ نہ دیا گیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ انھیں "محکوم" کا درجہ دیا جا رہا ہے۔ اسی غلط فکری کا یہ نتیجہ ہے کہ اگر کوئی شخص مسلمانوں کے دینی منصب کو حاکم کی اصطلاح میں بیان نہ کرے تو وہ فوراً اس پر الزام لگانے لگتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کو محکوم اور مغلوب بنا دینا چاہتا ہے۔

مگر یہ سراسر کوتاہ فہمی کی بات ہے۔ ان کے پاس صرف دو پیمانے ہیں، تیسرا زیادہ اہم پیمانہ ان کے پاس موجود ہی نہیں، اور وہ دعوت الی اللہ کا پیمانہ ہے۔ ان لوگوں کو چاہیے کہ حاکم کا تقابل محکوم سے کرنے کے بجائے حاکم کا تقابل داعی سے کریں۔ یہ مشورہ یقیناً لغو ہوگا کہ مسلمان مغلوب اور محکوم بن کر زندگی گزاریں۔ مگر یہ کہنا بھی اتنا ہی بے بنیاد اور لغو ہے کہ مسلمان حاکم اقوام اور محتسب کائنات بن کر رہنے کے لیے پیدا کیے گیے ہیں۔

صحیح بات ان دونوں کے علاوہ ہے۔ اور وہ یہ کہ مسلمان داعی ہیں۔ ان کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اللہ کے سچے دین کی طرف لوگوں کو بلائیں۔ یہ ایک خالص خدائی مشن ہے۔ مسلمان اگر ایسا کریں تو آخرت میں وہ خدا کے انعامات کے مستحق ہوں گے۔ اور اگر خدا نے چاہا تو دنیا میں بھی وہ انھیں اپنے انعام سے سرفراز فرمائے گا، خواہ وہ سیاسی انعام ہو یا اور کوئی انعام۔

تعمیر کی طرف

صفحات ۶۴ ھدیہ ۶ روپیہ

کرنے کا کام

مسلمانوں کو دوبارہ اٹھانے کے لیے اس وقت جو کام کرنا ہے، اس کو تین عنوانات کے تحت بیان کیا جاسکتا ہے —— تزکیہ افراد، احیاء دعوت، اور تعمیر ملت۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ طول امد کے بعد قساوت پیدا ہو جاتی ہے (الحدید ۱۶) یعنی بعد کی نسلوں میں اسلام زندہ شعور کی سطح پر باقی نہیں رہتا بلکہ بے حسی کی سطح پر پہونچ کر ٹھہر جاتا ہے جس کا دوسرا نام جمود ہے۔ اس وقت ضرورت ہوتی ہے کہ ایمان و اسلام کو دوبارہ ان کے زندہ شعور کا حصہ بنایا جائے۔ ایمان کی بجھی ہوئی راکھ کو دوبارہ بھڑکتا ہوا شعلہ بنا دیا جائے۔ اسی کو تزکیہ کہا گیا ہے۔

دوسری چیز دعوت ہے جو قرآن کے مطابق (الحج ۷۸) امت مسلمہ کا نصب العین ہے اور جس کے اوپر اس کے عزت وغلبہ کا انحصار ہے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمان اس فریضہ کو فراموش کر چکے ہیں۔ آج کی اہم ترین ضرورت یہ ہے کہ مسلمانوں میں دعوت کا شعور پیدا کیا جائے اور ان کے درمیان دعوت الی اللہ کے کام کو زندہ کیا جائے۔ اس کے بغیر وہ خدا کی مدد کے مستحق نہیں ہو سکتے۔

تیسری چیز تعمیر ملت ہے جس کو قرآن میں قیام (النساء ۵) اور قوت (الانفال ۶۰) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یعنی مادی اسباب کی فراہمی۔ دنیوی اعتبار سے مسلمانوں کا اس قابل ہونا کہ وہ دوسری قوموں کے مقابلہ میں خود کفیل اور باعزت زندگی گزار سکیں۔

بدقسمتی سے ہمارے لیڈروں نے مذکورہ تینوں کاموں میں سے کوئی ایک کام بھی نہیں کیا۔ موجودہ زمانہ کے مسلم قائدین نے بظاہر بہت سی تحریکیں چلائی ہیں اور چلا رہے ہیں مگر یہ تمام تحریکیں قیادت کی تعمیر کرنے والی ہیں نہ کہ ملت کی تعمیر کرنے والی۔ الرسالہ مشن اسی خلا کو پُر کرنے کے لیے جاری کیا گیا ہے۔ جن لوگوں کا دل یہ گواہی دے کہ الرسالہ کا مشن ہی موجودہ زمانہ میں صحیح مشن ہے، ان پر فرض کے درجہ میں ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ الرسالہ کو پھیلائیں۔ ایجنسی یا دوسرے طریقوں سے وہ اس کے پیغام کو زیادہ سے زیادہ عام کرنے کی کوشش کریں۔

میوات کا سفر

۱۹۶۷ میں جب میں دہلی آیا تو "میوات" کا ایک افسانوی تصور میرے ذہن میں تھا۔ یہ خواہش تھی کہ وہاں چل کر خود اپنی آنکھ سے دیکھا جائے کہ میوات کیا ہے۔ پہلی بار میں ۱۹۶۹ء میں میوات گیا اور وہاں ۲۴ گھنٹے گزارے۔ اس کے بعد اگلے دس سال کے عرصہ میں بار بار میوات کا سفر ہوتا رہا۔

اب کچھ لوگوں کا مشورہ ہوا کہ ان پچھلے سفرناموں کو اکٹھا کر کے انھیں ایک کتاب کی صورت میں شائع کر دیا جائے۔ ان سفرناموں کو دوبارہ مرتب کرتے ہوئے خیال آیا کہ یہ اسفار پندرہ سال پہلے کے زمانہ میں پیش آئے تھے۔ ضرورت محسوس ہوئی کہ ایک بار اور میوات کے علاقہ کا سفر کر لیا جائے تاکہ میرا مشاہدہ مطابق حال ہو جائے۔ اس کے مطابق میوات کا زیر تذکرہ سفر ہوا۔ یہ سفر میں نے بالقصد بذریعہ بس کیا تاکہ میں عام میواتیوں کو ان کے اپنے ماحول میں دیکھ سکوں اور زیادہ قریب سے میوات کا مشاہدہ کر سکوں۔

اس سفر میں مولانا عبدالرحیم بڈیڈوی میرے ساتھ تھے۔ ان سے میں نے مقصدِ سفر کا ذکر کیا تو انھوں نے مسکرا کر کہا: "میوات میں ابھی تک کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ پندرہ سال پہلے آپ نے میوؤں کو جس حال میں دیکھا تھا، وہیں آج بھی وہ پڑے ہوئے ہیں"۔ سفر کے بعد میں نے محسوس کیا کہ واقعی ان کا بیان صحیح تھا۔ میوات کے دوسرے فرقوں کے لیے زمین حرکت میں ہے مگر میوؤں کے لیے زمین بدستور رکی ہوئی ہے، میوؤں کے لیے وہ حرکت نہیں کرتی۔

ایک صاحب نے بس کا تازہ لطیفہ بتایا۔ ایک عمر رسیدہ میونی بس میں داخل ہوئی۔ وہ بس کے اندر اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی کہ کہاں بیٹھے۔ ایک مسافر نے ازراہ تفریح ڈرائیور کی سیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ دیکھ وہ سیٹ خالی ہے، اس پر بیٹھ جا۔ میونی اپنی گٹھری لیے ہوئے وہاں پہنچی اور "خالی سیٹ" پر بیٹھ گئی۔ کچھ دیر میں ڈرائیور اندر داخل ہوا۔ "عورت تو یہاں کہاں بیٹھ گئی۔ یہاں سے تو میں بیٹھ کر گاڑی چلاؤں گا۔" ڈرائیور نے کہا۔ میونی نے نہایت اطمینان کے ساتھ اپنی گٹھری سنبھالتے ہوئے جواب دیا: میں تو چوکی بیٹھی ہوں، تو کہیں اور سے چلالے۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ میواتی مرد یا عورتیں خدانخواستہ پیدائشی طور پر کم سمجھ ہوتے ہیں۔ وہ بھی یقیناً وہی صلاحیتیں لے کر پیدا ہوتے ہیں جو دوسرے انسان لے کر پیدا ہوتے ہیں۔ یہ در اصل تعلیم کی کمی ہے جس کی بنا پر میوؤں کا شعور ارتقاء نہیں کر پاتا۔

اس سلسلے میں ایک واقعہ قابل ذکر ہے۔ ایک بوڑھی میونی بازار گئی۔ اور پچاس روپے میں ایک زنانہ جوتا خرید کر لے آئی۔ گاؤں کی عورتوں نے دیکھ کر پوچھا کہ یہ جوتا تم نے کتنے میں خریدا۔ میونی نے کہا کہ "آٹھ آنے میں" عورتوں نے کہا کہ کیوں مذاق کر رہی ہو، صحیح دام بتاؤ۔ میونی نے کہا کہ میں مذاق نہیں کر رہی ہوں۔ بات یہی ہے۔ عورتوں کو یقین نہیں آیا کہ ایسا جوتا آٹھ آنے میں مل سکتا ہے، چنانچہ وہ اصل قیمت جاننے کے لیے اصرار کرتی رہیں۔ آخر میونی نے کہا کہ بات یہ ہے کہ پہلے میں ایک سیر گھی بازار لے جاتی تھی اور آٹھ آنے میں بیچتی تھی۔ پھر آٹھ آنے کا جوتا خرید کر لاتی تھی۔ اب میں ایک سیر گھی لے کر بازار گئی تو میرا گھی پچاس روپے میں بکا اور جوتا بھی پچاس روپے میں ملا۔ تو میرے لیے تو جیسا پچاس روپیہ ویسا آٹھ آنہ۔

مذکورہ میونی نے اقتصادیات کے ایک اصول کو نہایت کامیابی کے ساتھ سادہ لفظوں میں بیان کر دیا ہے۔ یعنی قیمت کے تعین کے اصول کو۔

۱۸ اکتوبر ۱۹۸۷ کی صبح کو ساڑھے چھ بجے دہلی سے بذریعہ بس روانگی ہوئی۔ شاہ جہاں آباد کی فصیلوں اور لال قلعہ کی دیواروں کو پیچھے چھوڑتے ہوتے ہماری بس آگے بڑھتی رہی۔ فریدآباد، بلب گڑھ، پلول، ہوڈل، کوسی ہوتے ہوئے ہم کاما (ضلع بھرت پور) پہونچے۔ کاما ایک تاریخی قصبہ ہے۔ قدیم راجہ کے محل اب بھی یہاں ٹوٹی ہوئی حالت میں موجود ہیں۔

۱۹۴۷ سے پہلے محلہ قاضی پاڑہ میں مسلمانوں کی آبادی تھی۔ تقسیم کے بعد صاحب حیثیت لوگ زیادہ تر پاکستان چلے گیے۔ اس وقت یہاں ایک جامع مسجد زیر تعمیر تھی۔ عین اسی زمانہ میں تقسیم کا ہنگامہ پیش آیا اور مسجد اس حال میں پڑی رہ گئی کہ دیواریں کھڑی ہوئی تھیں مگر چھت غائب تھی۔ صحن اور فرش کی جگہ گڑھے تھے۔ ویران مسجد جانوروں کی آماج گاہ بن گئی۔

۳۰ سال سے زیادہ عرصے کے بعد حاجی رحیم بخش کو خیال آیا کہ اس کی تعمیر کریں اور اس کو باقاعدہ آباد کریں۔ انھوں نے "آسمان کے سایہ کے نیچے" اور صرف اللہ کے بھروسہ پر کام شروع

کر دیا۔ انھوں نے مسجد کی تعمیر مکمل کی اور یہاں حفظِ قرآن کا مدرسہ قائم کیا۔ اب ماشاء اللہ یہ ایک آباد مسجد ہے۔ یہاں تقریباً ۵۰ طلبہ تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ حافظ کے علاوہ دوسرے علوم بھی بقدر ضرورت پڑھائے جا رہے ہیں۔ قاری عبد الرحمٰن ہزاروی اس کے روحِ رواں ہیں۔

میری فرمائش پر چند بچوں نے قرآن کے کچھ حصے پڑھ کر سنائے۔ بچے جب قرأت کے ساتھ قرآن کی آیتیں پڑھ رہے تھے تو مجھے یاد آیا کہ نزول قرآن سے لے کر اب تک مسلسل ہر دور میں اور رات دن کے ہر لمحہ میں امت اسی طرح قرآن کو پڑھتی اور سناتی رہی ہے۔ اچانک ایسا محسوس ہوا جیسے حال کا رشتہ ماضی سے مل گیا ہے، جیسے آج کے قاری قرآن کے الفاظ دوراول کے قاری قرآن سے ہم آہنگ ہو گئے ہیں۔ جیسے کہ یہ وہی پیغمبر عربی کی بلند کی ہوئی قدیم آواز ہے جو مجھ کو جدید نسل کی زبان سے سنائی دے رہی ہے۔

یہ وہ علاقہ ہے جہاں ۱۹۴۷ میں کافی مارکاٹ ہوئی تھی۔ یہاں کے مسلمان سب اِدھر اُدھر چلے گئے تھے۔ مسجد کو آباد کرنے کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ مسلمان دوبارہ آکر بسنا شروع ہو گئے چنانچہ اب کافی مسلمان دوبارہ واپس آکر یہاں آباد ہو گئے ہیں۔ اسی طرح دوسری قوموں کے لوگوں کی آبادی میں بھی اضافہ ہوا ہے۔

کاماکی اس مسجد کے قریب ایک گوردوارہ ہے اور اس سے بالکل ملا ہوا مندر بھی ہے۔ یہاں جو باباجی ہیں وہ روزانہ صبح کو فجر سے پہلے اپنی مذہبی ریکارڈنگ کرتے ہیں۔ مگر مسجد والوں نے بتایا کہ باباجی ہماری عبادت کا اتنا احترام کرتے ہیں کہ جیسے ہی ہمارا موذن فجر کی اذان شروع کرتا ہے، وہ فوراً اپنی ریکارڈنگ بند کر دیتے ہیں۔

باباجی ایسا کسی مطالبہ یا احتجاج کی بنا پر نہیں کرتے۔ بلکہ محض اپنے مذہبی جذبہ کے تحت کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک دوسرے کی اچھی بات کا احترام کرنا ایک فطری جذبہ ہے جو خود خدا نے ہر آدمی کے اندر پیدا کر رکھا ہے۔ اگر انسان کو چھیڑا نہ جائے تو یہ فطری جذبہ کام کرے گا اور اپنے آپ دوسروں کے اچھے کام کے احترام کی صورت میں ظاہر ہوگا۔ مگر جب ایک فریق دوسرے فریق کی انا کو جگا دے تو یہ پیدائشی جذبہ دب جاتا ہے۔ اس کے بعد انسان کی بھڑکی ہوئی انا کام کرنے لگتی ہے نہ کہ خدا کا پیدا کیا ہوا فطری جذبہ ـــــــــ حقیقت یہ ہے کہ

ہر آدمی کے حصہ میں اس کے اپنے عمل کا انجام آتا ہے ۔ اگرچہ وہ اس کو نادانی کی بنا پر فریق ثانی کی طرف منسوب کر دیتا ہے ۔

اس مسجد اور مدرسہ کو خوش قسمتی سے ایسے کارکن ملے ہیں جو نہایت سیدھے ہیں۔ جھگڑا لڑائی تو درکنار ، وہ احتجاج کی زبانی مہم بھی چلانا نہیں جانتے ۔ وہ ماحول کے ہر خوش گوار یا ناخوش گوار واقعہ سے بے خبر رہ کر بس " قرآن کی خدمت " میں مشغول رہتے ہیں ۔ اس سادہ مزاجی کا انھیں زبردست فائدہ ملا ہے ۔

مجھے یہاں بیت الخلاء جانے کا اتفاق ہوا ۔ خلاف توقع میں نے دیکھا کہ دو نہایت صاف ستھرے بیت الخلاء " فلش " کے اصول پر بنے ہوئے ہیں ۔ یہ میوات میں میرے لیے نئی چیز تھی ۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہ دونوں حکومت کی مدد سے بنے ہیں ۔ حکومت کی طرف سے دیہات کے سرکاری اسکولوں کے لیے اس قسم کی سہولت کا اعلان کیا گیا تھا ۔ مدرسہ والوں نے بھی اپنے لیے دو بیت الخلاء کی درخواست دے دی ۔ درخواست منظور ہو گئی ، اور یہ مسئلہ نہایت عمدہ طریقہ پر حل ہو گیا ۔ اسی طرح مدرسہ والوں کی درخواست پر حکومت کے محکمہ نے یہاں بجلی اور پانی بھی پہونچا دیا ہے ۔

مسجد اور مدرسہ کے کارکنوں کو دیکھئے تو وہ تقریباً بے زبان معلوم ہوں گے ۔ مگر بعض حالات میں بے زبانی اس سے بھی زیادہ بڑی طاقت بن جاتی ہے جتنی کہ زبان دانی ۔

کاما سے دوبارہ بذریعہ بس روانہ ہوئے ۔ اور پہاڑی ، گوپال گڑھ ، سیکری وغیرہ ہوتے ہوئے گلپاڑہ پہنچے ۔ راستہ میں بس چند منٹ کے لیے میل کھیڑلا کے مدرسہ پر رکی ۔ یہاں میں نے دیکھا کہ سڑک کے کنارے ایک شاندار مسجد اور مدرسہ وسیع رقبہ میں بنایا گیا ہے اور اس پر اسلامی مدرسہ کا بورڈ لگا ہوا ہے ۔ میں نے سوچا کہ جو لوگ " تعمیر " کے ان امکانات کو نہیں دیکھتے ، اور صرف " تخریب " کی خبریں سناتے رہتے ہیں وہ خود سب سے بڑے تخریب کار ہیں ۔ خواہ بطور خود وہ اپنے آپ کو معمار قوم کیوں نہ سمجھ رہے ہوں ۔

گلپاڑہ میں بھی سڑک کے کنارے ایک بڑی جامع مسجد کھڑی ہوئی نظر آئی ۔ یہ مسجد بالکل نئی جگہ پر بنائی گئی ہے ۔ اسی کے ساتھ یہاں ایک مدرسہ بھی زیر تعمیر ہے ۔ اس مسجد میں ہم

نے ظہر کی نماز ادا کی۔ میں نے سوچا کہ اس ملک میں اگر مسلمانوں نے کچھ کھویا ہے تو اس سے بہت زیادہ اب بھی ان کے لیے یہاں موجود ہے۔ مگر اس ملک میں مسلمانوں کی قیادت ماضی کے قائدین سے لے کر حال کے قائدین تک ایک ہی غلطی کر رہی ہے۔ اور وہ ہے بعض ناموافق حالات کی تعمیم (جنرلائزیشن)۔ ہماری قیادت کا حال یہ ہے کہ ۹۹ اچھی باتیں اس کو نظر نہیں آتیں۔ البتہ ایک خراب بات اس کو انتہائی باریک بینی کے ساتھ نظر آجاتی ہے۔ اور اس کے نام پر دھوم مچا کر عام مسلمانوں کا ذہن اس طرح خراب کر دیتی ہے کہ اب مسلمانوں میں شاید وہ لوگ باقی ہی نہیں رہے جو مثبت اور حقیقت پسندانہ انداز پر سوچ سکیں۔

گلپاڑہ میں مفتی عبدالشکور مظاہری (پیدائش ۱۹۴۷) سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ ۱۳۹۰ھ میں وہ ایک جماعت کے ساتھ پٹن (گجرات) گیے۔ یہاں مولانا محمد طاہر پٹنی (مصنف مجمع بحار الانوار) کے خاندان کے ایک صاحب ان کو اپنے گھر لے گیے۔ ان کے پاس مخطوطات (ہاتھ سے لکھی ہوئی کتابوں) کا ایک بڑا ذخیرہ تھا۔ وہ اس کو فروخت کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے اپنا یہ ذخیرہ مختلف لوگوں کو دکھایا۔ مگر کوئی شخص اس کو خریدنے پر آمادہ نہ ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اکثر کتابوں کے سرورق غائب تھے اور بظاہر یہ اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ یہ کون سی کتاب ہے۔

مفتی عبدالشکور صاحب نے ایک کتاب اٹھائی۔ یہ کتاب چار ضخیم جلدوں میں تھی۔ مگر کسی جلد پر بھی سرورق موجود نہ تھا۔ میں نے دیکھا تو چاروں نہایت عمدہ خط میں اس طرح یکساں انداز میں لکھی ہوئی تھیں جیسے کہ وہ ٹائپ میں چھاپی گئی ہوں۔

مفتی عبدالشکور صاحب نے ایک جلد اٹھائی اور کھول کر اس کا ابتدائی صفحہ پڑھنا شروع کیا۔ اس میں چند سطروں کے بعد مصنف نے اپنے اس مجموعۂ کتب کے بارے میں یہ الفاظ لکھے تھے:

وسَمَّيتُها فتح الله المعين على شرح العلامة مُلّا مسكين

وہ چوں کہ "ملا مسکین" سے واقف تھے، انھوں نے اس جملہ سے پوری بات پالی — "کنز الدقائق کی شرح ملا مسکین، اور ملا مسکین کی شرح فتح اللہ المعین"۔ یہ کتاب اب

بھی نہایت عمدہ حالت میں ہے اور اس کے مصنف سید محمد ابو السعود ہیں۔ اسی طرح انھوں نے دوسری کتابوں کے بارہ میں پتہ کر لیا اور خریدنے کے لیے آمادگی ظاہر کردی۔ مالک نے اولاً سب کی قیمت تین ہزار روپے بتائی۔ مگر مفتی عبدالشکور صاحب کے الفاظ میں " اس وقت تین ہزار میرے لیے کالا پہاڑ کی طرح تھا " آخر کار مالک نے صرف ۲۵۰ روپے میں سارا قیمتی ذخیرہ انھیں دیدیا۔ یہ کل ۶۰۰ کتابیں ہیں۔ ان میں فتاویٰ تاتارخانیہ جیسی تاریخی کتابیں بھی شامل ہیں۔

کسی حقیقت کو پانے کے لیے پیشگی طور پر اس سے آشنا ہونا ضروری ہے۔ جو لوگ پیشگی طور پر آشنا نہ ہوں، وہ حقیقت کو اپنے سامنے بے نقاب دیکھیں گے مگر وہ اس کو پہچان نہ سکیں گے۔

گلپاڑہ کی ملاقاتوں میں ایک یادگار ملاقات حاجی دراب خاں (عمر ۸۰ سال) کی تھی۔ وہ بالکل ان پڑھ ہیں۔ اپنا نام بھی نہیں لکھ سکتے۔ مگر ان کے اندر ایک ایسی خصوصیت ہے جو ابھی معلومات کے مطابق اب تک میں نے کسی عالم کے اندر بھی نہیں پائی، وہ ہے —————— اختلاف کے باوجود قدردانی۔

مولانا عبدالرحیم صاحب (بڈیڈ، ضلع گوڑگاؤں) اس سے پہلے گلپاڑہ کے مدرسہ میں استاد تھے۔ وہ یہاں ساڑھے تین سال تک امام اور مدرس کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ ۱۹۶۹ء میں وہ یہاں سے چھوڑ کر چلے گیے۔ دیہات کے لوگوں کو اکثر چھوٹی چھوٹی باتوں میں اماموں اور مدرسوں سے شکایت ہو جاتی ہے۔ چنانچہ گلپاڑہ کے لوگوں کو بھی ہوئی۔ انھیں میں سے ایک حاجی دراب خاں بھی تھے۔ ان کے الفاظ میں ان کی " اس مولوی سے لڑائی رہنے لگی "

لڑائی کس بات پر ہوتی تھی۔ معمولی معمولی باتوں پر۔ مثلاً حاجی دراب خاں نے اپنا ایک درخت کٹوایا اور اس کی لکڑی مسجد کے صحن میں رکھوادی۔ اس کی وجہ سے مسجد کا صحن تنگ ہوگیا۔ مولانا عبدالرحیم صاحب نے اس پر اعتراض کیا اور کہا کہ اس لکڑی کو یہاں سے ہٹاؤ۔ مگر حاجی دراب خاں نے نہیں ہٹوایا۔ آخر مولانا عبدالرحیم صاحب نے ایک روز اپنے مدرسہ کے لڑکوں کے ذریعہ تمام لکڑی کو وہاں سے نکلوا کر باہر رکھوادیا۔ اس پر حاجی دراب خاں کافی غصہ ہوئے۔ وغیرہ

یہ مسجد حاجی دراب خاں کے خاندان نے بنوائی تھی۔ مدرسہ بھی ان ہی لوگوں نے قائم کیا تھا۔ مولانا عبدالرحیم صاحب وہاں گویا ان کے ایک "ملازم" تھے۔ ایسی حالت میں ان کی یہ جسارت بالکل ناقابل برداشت تھی۔ اس قسم کی اور بہت سی باتیں تھیں جن کی وجہ سے حاجی دراب کی "اس مولوی سے لڑائی رہتی تھی" مگر مولانا عبدالرحیم نے بتایا کہ اس کے باوجود کبھی ایسا نہیں ہوا کہ حاجی دراب ان کے بارہ میں مخالفانہ رول ادا کریں۔

مولانا عبدالرحیم ایک با اصول آدمی ہیں اور اسی کے ساتھ صاف گو ہیں۔ چنانچہ گاؤں کے لوگوں سے کسی نہ کسی بات پر ان کی تکرار ہو جاتی تھی۔ مثلاً وہ یہاں مسجد کے امام بھی تھے۔ مقرروقت پر وہ ٹھیک گھڑی کے لحاظ سے جماعت شروع کر دیتے تھے، خواہ کوئی آیا ہو یا نہ آیا ہو۔ بعض لوگوں کو یہ بات بہت ناگوار ہوتی تھی۔ اس طرح کی باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ کئی لوگ ان کے خلاف ہو گیے۔ حتی کہ انھوں نے گاؤں کی اکثریت کو اپنے موافق بنالیا اور عام رائے یہ ہو گئی کہ ان کو مدرسہ سے نکال دیا جائے اور ان کی جگہ دوسرے آدمی کو لایا جائے۔

مگر حاجی دراب اس تحریک کے سخت مخالف ہو گیے۔ انھوں نے کہا کہ "اگرچہ اس مولوی سے میری ذاتی لڑائی ہے۔ مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ مدرسہ کے کام کے لیے وہ نہایت موزوں ہے، اس کو ہٹانے کے بعد ایسا لائق معلم ہم کو نہیں مل سکتا۔ اس لیے انھوں نے اختلاف کو نظر انداز کرتے ہوئے مولوی عبدالرحیم صاحب کی بھرپور حمایت کی ——— ذاتی شکایت کے باوجود اعتراف اور قدر دانی کی یہ صفت اتنی کم یاب ہے کہ کم از کم میں نے اپنے تجربہ میں اب تک کوئی دوسرا حاجی دراب نہیں دیکھا۔

"حاجی دراب خاں" بظاہر ایک معمولی آدمی ہیں مگر میرے نزدیک وہ آنے والے عظیم میوات کی علامت ہیں۔ وہ میوؤں کے تاریک حال میں اس کے روشن مستقبل کو بتا رہے ہیں۔

میو قوم اگرچہ اپنی جہالت اور اپنی بے شعوری کی وجہ سے ہندستان کی ایک پچھڑی ہوئی قوم بنی ہوئی ہے۔ مگر فطری امکانات کے اعتبار سے وہ ایک جاندار قوم ہے۔ باعتبار واقعہ اگرچہ یہ دوسروں سے پیچھے ہیں۔ مگر باعتبار امکان آج بھی وہ دوسروں سے آگے ہیں۔ ذاتی شکایتوں کو نظر انداز کر کے کسی کی خوبیوں کا اعتراف کرنا، اعلیٰ ترین انسانی صفت ہے۔ حاجی دراب کی مثال

بتاتی ہے کہ یہ اعلیٰ انسانی صفت میووں کے اندر موجود ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں میوؤں کے لیے ایک عظیم مستقبل کا امکان چھپا ہوا ہے۔

حاجی دراب خاں نے بتایا کہ انھوں نے مولانا محمد الیاس صاحبؒ کو کئی بار دیکھا ہے اور ان کی تقریریں اور گفتگوئیں سنی ہیں۔ میں نے کہا کہ مولانا الیاس صاحب کی کوئی بات جو آپ کو یاد ہو بتائیے۔ انھوں نے کہا کہ مولانا جب یہاں آئے تو انھوں نے میووں سے کہا کہ —— سلوک سے رہو، نماز پڑھو اور جماعتوں میں جاؤ۔

میں مسجد میں تھا کہ ایک میو نے دوسرے میو سے سوال کے انداز میں کہا: کرلیے اُجو (کرلیا وضو) میواتی زبان دراصل بگڑی ہوئی اردو کا دوسرا نام ہے۔ دنیا کی تقریباً تمام زبانوں کا حال یہی ہے۔ ہر ایک کی ایک ادبی اور تحریری زبان ہوتی ہے اور دوسری وہ ہے جس کو عوامی بولی کہا جاتا ہے۔ اسی فرق کی وجہ سے ایک زبان جانتے ہوئے بھی آدمی اس ملک کے باشندوں کی باہمی گفتگو کو سمجھ نہیں پاتا۔ کیوں کہ غیر شخص کتابی زبان جانتا ہے اور مقامی لوگ عوامی بولی میں باہم گفتگو کرتے ہیں۔ یہ ثنویت عربی اور انگریزی جیسی زبانوں میں بھی ہے اور اردو اور ہندی جیسی زبانوں میں بھی۔

ایک نوجوان میو سے ملاقات ہوئی۔ اس کا ایک ہاتھ کہنی کے پاس سے کٹا ہوا تھا۔ معلوم ہوا کہ تھریشر (Thresher) میں کٹ گیا ہے۔ جب سے تھریشر (دانہ کو بھوسہ سے الگ کرنے والی مشین) کا رواج ہوا ہے، اس طرح کے حادثے زرعی علاقوں میں بہت زیادہ پیش آرہے ہیں۔ بیل کا رواج کم ہو جانے کی وجہ سے لوگ تھریشر کا استعمال کرنے پر مجبور ہیں، اور موجودہ تھریشر کا حال یہ ہے کہ ذرا سی غفلت سے وہ ہاتھ پکڑ لیتا ہے اور پھر اس کو کچلے بغیر نہیں رہتا۔

ترقی یافتہ ملکوں میں اب تھریشر کی جگہ کمبائن (Combine) مشین رائج ہو گئی ہے۔ یہ دوسری مشین بیک وقت دو کام کرتی ہے۔ وہ فصل کاٹتے ہوئے عین اسی وقت اس کا دانہ بھی الگ کر دیتی ہے۔

تاہم تھریشر بجائے خود کوئی مہلک چیز نہیں، یہ ہندستانی صنعت ہے جس نے اس کو مہلک بنا دیا ہے۔ ہندستان میں جو تھریشر بنائے جاتے ہیں وہ ایسی وضع کے ہوتے ہیں کہ ان

میں ڈالنے والی چیز کنارے سے ڈالی جاتی ہے اور اس کو ہاتھ سے دھکیلنا پڑتا ہے۔ اس بنا پر یہ خطرہ رہتا ہے کہ ہاتھ اس کے اندر چلا جائے۔ مگر یہ پرانا طریقہ ہے۔ باہر کے ملکوں میں اب ایسے تھریشر بنائے گئے ہیں جن میں کٹی ہوئی فصل کے گھٹے بنا کر اوپر سے ڈال دیتے ہیں، ٹھیک ویسے ہی جیسے آٹا پیسنے والی مشین میں غلہ اوپر سے ڈال دیا جاتا ہے۔ اس دوسری قسم کے تھریشر میں یہ امکان ہی نہیں کہ ہاتھ کو مشین پکڑ لے۔

ہر سال اخباروں میں تھریشر سے ہاتھ کٹنے کی خبریں چھپتی ہیں۔ مگر تعجب ہے کہ ہندستانی مشینوں کا طرز ابھی تک بدلا نہیں گیا۔

ہم لوگ بستی میں چل رہے تھے کہ ایک عورت گود میں ایک بچہ لیے ہوئے سامنے آئی۔ اس نے مولانا عبدالرحیم صاحب بڈیڈوی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: میری بہن کو خون کٹ رہو ہے، اس کو نکس بنا دے (میری لڑکی کو خون کی پیچش ہو رہی ہے، اس کے لیے تعویذ لکھ دو)

میوات کا سب سے بڑا مسئلہ اس کی جہالت ہے۔ یہاں کے بیشتر لوگ ناخواندہ یا نیم خواندہ ہیں۔ اس کی وجہ سے یہاں کی زندگی میں رسوم اور توہمات کا اتنا غلبہ ہے کہ اس کے نیچے میوؤں کی پوری زندگی دب کر رہ گئی ہے۔ خاص طور پر عورتیں تو بالکل ہی ان پڑھ ہیں۔ شاذ و نادر ہی ایسی عورتیں ملیں گی جو ایک خط بھی لکھ سکتی ہوں۔ علم کی اہمیت زندگی میں جتنی زیادہ ہے، میوؤں کے یہاں اس کی اہمیت اتنی ہی کم نظر آتی ہے۔

گلپاڑہ قصبہ کی تقریباً تمام دوکانیں دوسری اقوام کی ہیں۔ مسلمانوں کی کوئی ایک بھی قابل ذکر دوکان نہیں۔ صبح کے وقت میں قصبہ کے اندر سے گزرا تو میں نے دیکھا کہ دکاندار اپنی دکان کے سامنے بیٹھے ہوئے ہندی اخبار پڑھ رہے ہیں۔ جب کہ میوؤں کے لیے اخبار پڑھنا ابھی تک ایسا ہی ہے جیسے چاند پر سفر کرنا۔ اسی بے علمی کی وجہ سے میو تجارتوں میں داخل نہ ہو سکے اور زراعت (زمیندارہ) جس میں ان کے تمام مرد و عورت اور چھوٹے بڑے لگے رہتے ہیں، ان میں بھی وہ زیادہ ترقی نہ کر سکے۔ تاہم پچھلے اسفار کے مقابلہ میں اس بار مجھے کئی میو زمیندار کے یہاں ٹریکٹر اور ٹیوب ویل نظر آیا جو کہ پہلے نایاب تھا۔ میو ترقی کر رہے ہیں۔ مگر اس کی رفتار اتنی کم ہے کہ خورد بینی مشاہدہ کے ذریعہ ہی اس کو

دیکھا جاسکتا ہے۔

پورے میوات میں سڑک اور بجلی کی وجہ سے کام کی نئی صورتیں پیدا ہوئی ہیں۔ بہت سے مقامات جہاں پہلے ویرانہ تھا۔ لوگ ان کو بھوت کی جگہ سمجھتے تھے، وہاں اب پر رونق بازار بن گیے ہیں۔ مگر ان میں میووں کا کوئی قابل مشاہدہ حصہ نہیں۔

میوات کے دیہاتوں کا نقشہ اب بھی تقریباً وہی ہے جو ۲۰ سال پہلے تھا۔ اونچے نیچے راستے، مٹی کی دیواروں کے اوپر چھپر۔ ہم ایک میو کے گھر میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ ایک طرف سرسوں کے ڈنٹھل سے کھانا پک رہا ہے۔ دوسری طرف بیل بندھے ہوئے بول وبراز کر رہے ہیں۔ ایک کنارے دو عورتیں "مشین" چلاکر چارہ کاٹ رہی ہیں۔ غرض رہائش سے لے کر گھرہستی تک جتنے لوازم ہیں، سب ایک غیر منصوبہ بند احاطہ کے اندر موجود تھے۔ اور اس کا نام مکان تھا۔ آپ کو ایسے میو ملیں گے جن کے گھروں میں بجلی کے بلب لٹک رہے ہوں گے۔ مگر بلب روشن ہو کر جب چاروں طرف کے ماحول کو دکھائے گا تو آپ سوچیں گے کہ وہ یہاں شاید اس لیے روشن ہوا ہے کہ آپ کو بتائے کہ میو لوگ دور جدید کے عین وسط میں بھی دور قدیم کی زندگی گزار رہے ہیں۔

میوات میں آپ سنیں گے کہ فلاں مسلمان عورت کا نام "بسکر" ہے۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ کسی میو کے یہاں جب مسلسل کئی لڑکیاں پیدا ہوتی ہیں تو وہ اپنی آخری لڑکی کا نام بسکر رکھ دیتا ہے۔ یعنی اے خدا، اب بس کر، اور مزید لڑکی نہ پیدا کر۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اگر لڑکی کا نام "بس کر" رکھ دیا تو اس کے بعد یہ سلسلہ بس ہو جائے گا اور پھر جو اولاد پیدا ہوگی وہ نرینہ اولاد ہوگی ــــــ یہ وہی ذہن ہے جس کے تحت مہذب قسم کے لوگ اپنی لڑکی کا نام بشریٰ رکھ دیتے ہیں۔

قریبی مسجد سے اذان کی آواز آئی۔ ایک شخص نے پوچھا: کون صاحب اذان دے رہے ہیں۔ جواب دینے والے نے کہا "بلٹو"۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہاں کثرت سے اس طرح کے عجیب وغریب نام ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ تسمیہ مجھے یہ بتائی گئی کہ میووں میں یہ رواج ہے کہ ایک لڑکا مر جائے، اس کے بعد ولادت ہو اور دوبارہ لڑکا پیدا ہو تو ایسے لڑکے کا نام

پلٹا یا پلٹو رکھ دیتے ہیں۔ یعنی بدلہ۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ خدا نے دوسرا لڑکا بدلہ میں دیدیا۔ اسی طرح اور بھی بہت سے عجیب عجیب نام سنائی دیئے۔ مثلاً یہاں تین بھائی ہیں جن کے نام یہ ہیں : سکاری، لنکاری، پیکاری۔ وغیرہ

ایک مقام پر ہماری بس میں میواتی عورتوں کا ایک جھنڈ سوار ہوا۔ بتانے والے نے بتایا کہ یہ لوگ " فاتحہ خوانی " میں شرکت کرکے آرہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ میوات میں رسموں کا رواج بہت ہے، اور اب اس میں ایک مادی پہلو بھی شامل ہو گیا ہے۔ اس نے پرانی رسموں میں نئی طاقت عطا کر دی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ مثلاً موت کے بعد فاتحہ کرنا۔ کچھ " دیوبندی " حضرات نے فاتحہ کو ختم کرنے کی کوشش کی مگر وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ میو لوگ کہتے ہیں کہ ہم کیا کریں۔ ہم خود ان رسوم کو پسند نہیں کرتے۔ مگر ہوتا یہ ہے کہ جب ایک موت ہو جاتی ہے تو مہینوں تک رشتہ دار لوگ تعزیت کے لیے آتے رہتے ہیں اور مہمان داری اور خاطر تواضع کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ فاتحہ کرنے میں یہ فائدہ ہے کہ ایک تاریخ کو سب لوگ جمع ہو جاتے ہیں اور ایک ہی دن دے کر یا کھلا پلا کر چھٹی ہو جاتی ہے۔

تعزیت اور پرسہ کی موجودہ رسم خود قابلِ ترک ہے۔ مگر ایک قابلِ ترک کو ترک نہ کرنے کے لیے ایک اور قابلِ ترک کو اختیار کرنا پڑا۔

میوات میں کافی ذہین لوگ پیدا ہوئے ہیں، اگرچہ بے علمی کی وجہ سے ان کی ذہانت اپنے لیے کوئی بڑا استعمال نہ پا سکی۔ اس کا اندازہ یہاں کی کہاوتوں اور اشعاروں سے ہوتا ہے جو کسی نے کہے تھے اور اب وہ عوام میں رائج ہیں۔ مثلاً کسی قدیم میو شاعر کا ایک شعر یہ ہے :

دھنمت کے کانٹو لگے سبھی لگاواں ہات نردھن کے کانٹو لگے کوئی نہ پوچھے بات

یعنی دولت مند کو کانٹا چبھ جائے تو ہر ایک اس کا حال پوچھتا ہے، غریب آدمی کو کانٹا چبھ جائے تو کوئی اس کا حال دریافت نہیں کرتا۔ ایک صاحب نے یہ شعر بتاتے ہوئے کہا : آج یہ حال ہے کہ بڑا آدمی ہے تو اس کے کھلانے پلانے میں زبردست اہتمام ہوگا، اور غریب آدمی کو صرف معمولی کھانا کھلایا جائے گا۔ لڑکی امیر کے گھر جا رہی ہے تو بہت زیادہ جہیز دیا جائے گا۔ اور اگر لڑکی غریب کے گھر جا رہی ہے تو معمولی جہیز دے کر رخصت کر دیا جائے گا۔ حتیٰ کہ کسی مدرسہ میں شاندار

عمارتیں کھڑی ہوئی ہیں تو اس کو خوب چندہ ملے گا، اور کوئی مدرسہ چھپروں میں ہو تو اس کو کوئی چندہ دینے والا نہیں۔ یہی حال زندگی کے تمام معاملات کا ہے۔

میوات میں ایک مثل ہے کہ دو آدمیوں نے طے کیا کہ وہ مل کر گنا بوئیں گے اور جب گنا تیار ہو جائے گا تو اس کو توڑیں گے۔ اب ایک شخص نے کہا کہ "میں گنا توڑوں گا کڑاک سے۔" دوسرے شخص نے کہا: "میں بھی توڑوں گا کڑم کڑاک سے۔" یہ سن کر پہلے شخص نے کہا کہ میں نے تو ایک گنا توڑا تھا، تم نے دو توڑ لیے۔ اس پر تکرار ہوئی، یہاں تک کہ دونوں آپس میں لڑ گئے۔

یہ مثل میووں کی کہانی بھی ہے اور عام مسلمانوں کی کہانی بھی۔ اس وقت تمام مسلمانوں کا حال یہی ہے کہ کرنے کا کام تو کوئی نہیں کرتا۔ البتہ کیا کام کرنا ہے، اس پر خوب بحثیں ہو رہی ہیں۔ گویا گنے کی فصل تو اگائی نہیں گئی، اور گنے کی حصہ داری پر لڑائیاں جاری ہیں۔ بحث میں ہر آدمی آگے ہے، مگر عمل میں ہر آدمی پیچھے۔

گلپاڑہ میں ایک میو حاجی گل خاں نام کے تھے۔ ۱۹۸۷ میں ان کا انتقال ہو گیا۔ اس سے پہلے ان سے میری ملاقات ہو چکی ہے۔ وہ نہایت سنجیدہ اور نیک آدمی تھے۔ موجودہ سفر میں ان کے صاحبزادے فیروز خاں سے ملاقات ہوئی۔ اسی کے ساتھ حاجی صاحب مرحوم کے بھتیجے (ملھو) کے لڑکے فخر الدین عرف فجرو بھی ملے۔ یہ لوگ اپنی سادگی، خاموش طبعی اور دینی مزاج کے معاملہ میں حاجی گل خاں مرحوم کی تصویر ہیں۔

گلپاڑہ سے رسول پور تقریباً تین کیلو میٹر کے فاصلہ پر اندر کی طرف ہے۔ یہاں سڑک نہیں۔ میں اندرون میوات کا نقشہ دیکھنے کے لیے یہاں جانا چاہتا تھا۔ یہ فاصلہ ٹریکٹر کے ذریعہ طے کیا۔ چونکہ اس موسم میں بارشیں بہت کم ہوتی ہیں۔ اس لیے سارا راستہ گرد کی دلدل بنا ہوا تھا۔ ٹریکٹر کو فیروز خاں اور فخر الدین چلا رہے تھے۔ وہ ایک پرشور مشین کے خاموش ڈرائیور تھے۔ یہ سفر اس طرح طے ہوا کہ کپڑے گرد میں اَٹ رہے تھے۔ گدّی کے بجائے لوہے پر نشست تھی اور مسلسل ہچکولے اس کے علاوہ تھے۔

میرا خیال ہے کہ ہر وہ شخص جس نے کار کی سواری کی ہے اس کو ٹریکٹر کی سواری بھی کرنا چاہیے۔ اسی طرح ہر شخص جو ٹریکٹر پر بیٹھا ہے اس کو کار پر بیٹھنا چاہیے۔ ان دونوں سفروں کا

قابل ایک عظیم دینی حقیقت کو سمجھنے کے لیے اتنا موثر ہے کہ اس سے زیادہ موثر میرے علم میں کوئی دوسری چیز نہیں۔

جس آدمی نے بھی دونوں چیزوں کی سواری کی ہے، وہ جانتا ہے کہ ٹریکٹر کے ذریعہ اگر سفر کیا جائے تو منزل پر آدمی اس طرح پہونچتا ہے کہ وہ تھک چکا ہوتا ہے۔ اس کے برعکس آدمی جب ایک اچھی کار پر سفر کرتا ہے تو وہ اپنی منزل پر بالکل تر وتازہ اترتا ہے۔ اس فرق کا سبب یہ ہے کہ کار کے پہیوں کے ساتھ جھٹکے کو سہنے والا پرزہ (Shock absorber) لگا ہوا ہوتا ہے، جب کہ ٹریکٹر کے اندر ایسا پرزہ نہیں ہوتا۔ گویا ٹریکٹر وہ سواری ہے جو اپنے اوپر آنے والے جھٹکوں کو مسافر تک پہنچاتی رہتی ہے، جب کہ کار وہ سواری ہے جو جھٹکوں کو خود اپنے آپ پر سہہ لیتی ہے، وہ ان کو مسافر تک پہنچنے نہیں دیتی۔

لوگوں کے درمیان زندگی گزارتے ہوئے اکثر غصہ اور انتقام کے جذبات دل کے اندر پیدا ہو جاتے ہیں۔ ایسی حالت میں مومن کو کیا کرنا چاہیے۔ مومن کو یہ کرنا چاہیے کہ وہ اس قسم کے تمام نفسیاتی جھٹکوں کو خود اپنے اوپر سہے، وہ ان کو دوسرے شخص تک نہ جانے دے۔ وہ لوگوں کے درمیان کار کی طرح رہے نہ کہ ٹریکٹر کی طرح۔

رسول پور میں مختلف لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ عبدالرشید عرف دھنو تالی اور عبدالرحیم عرف خردل سیدھے سادے میواتیوں کا مکمل نمونہ نظر آئے۔ کار اور ٹریکٹر کے مذکورہ فرق کو شاید وہ شعوری طور پر نہ جانتے ہوں۔ مگر فطرت کے زور پر عملاً وہ اسی قسم کی زندگی گزار رہے ہیں۔ حدیث کے الفاظ میں، ان کے طریق زندگی کا خلاصہ یہ ہے کہ دوسروں کو نفع پہنچاؤ اور اگر نفع نہ پہنچا سکو تو ان کو اپنے نقصان سے بچاؤ۔

دہلی جیسے شہر میں مشکل ہی سے کبھی آسمان اپنے قدرتی نیلے رنگ میں دکھائی دیتا ہے۔ یہاں کی کھلی فضا میں آسمان اپنے اصل نیلے رنگ میں دکھائی دیا۔ آسمان کا یہ رنگ جو مختلف طبیعی اسباب سے پیدا ہوتا ہے، اتنا زیادہ جاذب نظر ہے کہ آسمان کے لیے اس سے زیادہ جاذب نظر رنگ کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ کائنات کی ہر چیز اپنے آخری معیاری نمونہ پر ہے۔ خواہ ایک گھاس ہو یا ایک شیر یا اور کوئی چیز۔ کسی بھی چیز کا کوئی دوسرا اس

سے بہتر ماڈل تجویز نہیں کیا جاسکتا۔ مخلوقات کا معیار کمال پر ہونا یہ ثابت کرتا ہے کہ اس کا خالق بھی آخری معیار کمال پر ہے۔ کامل خالق کے بغیر کامل تخلیق کا وجود ممکن نہیں۔

نیلے آسمان کے نیچے ابھری ہوئی پہاڑیاں، ہرے بھرے درخت، آکسیجن سے بھری ہوئی خالص ہوا فطرت کے اس حسین ماحول میں انسان اپنے آپ کو خدا کے بالمقابل محسوس کرنے لگتا ہے آج کل شہروں کے لوگ اپنے فرصت کے اوقات کو سینما اور ٹیلی ویژن کے ماحول میں گزارتے ہیں۔ اس کے برعکس انھیں اپنے فرصت کے اوقات کو شہر سے باہر فطرت کے ماحول میں گزارنا چاہیے۔ "ٹیلی وژن" آدمی کو دوبارہ مصنوعاتِ انسانی کی اسی دنیا میں گم کر دیتا ہے جس میں وہ اس سے پہلے گم تھا۔ اس کے برعکس کھلے ہوئے جغرافیہ کا ماحول آدمی کو مصنوعاتِ خداوندی کی دنیا میں پہنچا دیتا ہے، وہ دنیا جہاں انسان اور خدا آمنے سامنے ہو جاتے ہیں۔ جہاں آدمی اپنے رب سے ملاقات کرتا ہے۔ جہاں آدمی اپنے رب سے سرگوشیاں کرتا ہے۔ جہاں وہ ظواہر سے گزر کر حقیقت اعلیٰ کو پالیتا ہے۔

۱۹ اکتوبر ۱۹۸۷ کی صبح کو واپسی ہوئی۔ گلپاڑہ سے دوبارہ میں بذریعہ بس روانہ ہوا اور پہاڑی، بیواں، فیروزپور، نوح، سوہنا، گوڑگاؤں ہوتے ہوئے ۱۲ بجے دن میں دہلی واپس پہونچا۔

زیرِ طبع کتابیں

۱۔ کاروانِ اسلام
۲۔ نشری تقریریں
۳۔ پیغام عمل
۴۔ عقلیاتِ اسلام
۵۔ تجدید دین

۔ ڈاک پتھر (دہرہ دون) میں ۲۵ جون ۱۹۸۸ کو سیرۃ النبی کا جلسہ تھا۔ منتظمین کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی۔ ۲۵ جون کی شام کو سیرت کے اخلاقی پہلو پر خطاب کیا۔ اس سفر کے دوران سہارن پور اور ڈاک پتھر میں انفرادی مجلسیں ہوئیں۔ اور سوال وجواب کی صورت میں اظہار خیال کیا گیا۔ یہ سفر اس طرح ہوا کہ ۲۴ جون کی شام کو دہلی سے سہارن پور پہنچے۔ رات کو سہارن پور میں قیام کیا۔ ۲۵ جون کو ڈاک پتھر کا سفر ہوا۔ ڈاک پتھر سے روانہ ہوکر دہرہ دون آئے۔ اور پھر وہاں سے روانہ ہوکر ۲۶ جون کو دہلی واپس آگیے۔

۲۔ احمد آباد (گجرات) سے چھیپا برادری کا ایک ماہنامہ گجراتی زبان میں نکلتا ہے۔ اس کا نام چھیپا بلیٹن ہے۔ اس ماہنامہ میں ہر ماہ الرسالہ کے مضامین گجراتی میں ترجمہ کرکے شائع کیے جاتے ہیں۔ اس طرح گجراتی داں حلقہ میں الرسالہ کا پیغام مسلسل پہنچ رہا ہے۔

۳۔ ایک خاتون لکھتی ہیں: الرسالہ میرے خوابوں کی تعبیر ہے۔ مذہب پر جان دینے کی باتیں تو سب کرتے ہیں۔ لیکن انسانیت کے ساتھ جینے کا ڈھنگ سکھاتا ہے الرسالہ۔ (مسز ناہید ایم اے، بنگلور)

۴۔ ٹائمس آف انڈیا (۱۲ جولائی ۱۹۸۸) میں صدر اسلامی مرکز کا ایک انگریزی آرٹیکل چھپا تھا۔ آل انڈیا ریڈیو نے اپنے "جہاں نما" پروگرام کے تحت اس آرٹیکل کا خلاصہ اردو میں نشر کیا۔ اس طرح اسلامی مرکز کا تعمیری پیغام بیک وقت لاکھوں لوگوں تک پہونچ گیا۔ آل انڈیا ریڈیو سے اس طرح کی نشریات کئی بار آچکی ہیں۔ مثلاً صدر اسلامی مرکز کا طویل انٹرویو شائع شدہ اخبار اردو (۲۹ جنوری ۱۹۸۸) کو آل انڈیا ریڈیو نے مکمل طور پر نشر کیا تھا۔ وغیرہ۔

۵۔ ایک صاحب لکھتے ہیں: الرسالہ جولائی ۱۹۸۸ کا مضمون "قیادت کا دیوالیہ پن" بہت ہی زیادہ پسند آیا۔ خداوند کریم آپ کی حیات دراز کرے اور ہم لوگوں کو ان معاملات میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت عطا فرمائے۔ آپ کے متعلق اخبارات میں پڑھتا ہوں۔ میں خود ایک جماعت سے متاثر ہوں۔ ان حضرات سے بھی گفتگو ہوتی رہتی ہے۔ خوش قسمتی یا بدقسمتی سے تقسیم ہند کے وقت کا کچھ ہوش مجھے

ہے۔ اس زمانہ میں بالکل یہی باتیں مولانا ابوالکلام آزاد کے متعلق بھی عام تھیں۔ جس کا نتیجہ اب بھگت رہے ہیں۔ اور مزید بھگتیں گے۔ (احسان احمد۔ رام نگر چوک، گوندیہ)

۶۔ الرسالہ نومبر ۱۹۸۷ صفحہ ۴۵ پر ایک بدھسٹ پروفیسر کا تاثر الرسالہ کے بارہ میں شائع ہوا تھا۔ اس کو پڑھ کر جناب اسلم احمد (بتیا، بہار) نے اپنی طرف سے سالانہ زرتعاون ادا کرکے ان کے نام الرسالہ انگریزی جاری کرایا ہے۔ یہ نہایت مناسب طریقہ ہے، خدا کے فضل سے بہت سے ساتھی ایسا کر رہے ہیں۔ دوسرے لوگوں کو بھی اپنی طرف سے غیر مسلم صاحبان کے نام انگریزی الرسالہ جاری کرانا چاہیے۔ یہ دعوتی ذمہ داری کو ادا کرنے کا سب سے زیادہ آسان طریقہ ہے۔

۷۔ الرسالہ کی مقبولیت اب خدا کے فضل سے اتنی بڑھ چکی ہے کہ اس کے مخالفین بھی اس کو بطور واقعہ تسلیم کرتے ہیں۔ ایک صاحب نے اپنے چار صفحہ کے خط (۱۱ جون ۱۹۸۸) میں الرسالہ پر سخت تنقید کی ہے۔ اسی کے ساتھ وہ آخر میں لکھتے ہیں: آپ کا پرچہ (الرسالہ) تو اب سنلائٹ صابن کی طرح چل چکا ہے۔ آپ اس میں کچھ بھی لکھیں، کیا ہوتا ہے (لوگ بہرحال اس کو پڑھیں گے) عبدالصبور، اجین۔

۸۔ ایک صاحب لکھتے ہیں: میں نے تذکیر القرآن کی دونوں جلدیں حاصل کیں۔ ان کو پڑھ رہا ہوں۔ مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ حقیقت میں ایک ایسی تفسیر مجھے ملی ہے جو قرآن کے اصلی مقصد کو واضح کر رہی ہے۔ (الطاف حسین شاہ انجینیر، مٹن، کشمیر)

۹۔ ایک صاحب اپنے خط (۲۶ جولائی ۱۹۸۸) میں لکھتے ہیں: میں بحمداللہ شروع سے آپ کی تحریروں کو بغور پڑھ رہا ہوں۔ اس مطالعہ سے مجھے نہ صرف دین کی بابت معلومات ہوئی بلکہ اس سے میرے اندر ایک نیا دینی مزاج بنا ہے۔ میرے اندر ایک یقین کامل پیدا ہوا ہے۔ پہلے میں ہر معاملہ میں اندیشوں میں گھرا رہتا تھا۔ مطالعہ کے بعد میں اپنے آپ کو قناعت سے واقف، صبر کرنے والا اور ایک یقین والا انسان پاتا ہوں جس میں نہ گھبراہٹ ہے اور نہ پریشانی۔ (اقبال احمد، مراد آباد)

۱۰۔ ایک صاحب اپنے خط ۲۵ جون میں لکھتے ہیں: بندہ بڑے شوق سے ہر ماہ الرسالہ پڑھتا ہے۔ میں ایک مسجد میں پیش امام ہوں اور آپ کے مضامین اپنے وعظ میں بیان کرتا رہتا

ہوں۔ نوجوانوں کے ذریعہ ایک موقع پر مجھے یہ رپورٹ سن کر بہت خوشی ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ اگر آپ اپنا بیان صبر واعراض کے عنوان پر نہ دیتے تو ہم نے طے کیا تھا کہ "ہم نوجوان لوگ پولیس چوکی کو جلائیں گے۔ آپ کا بیان سن کر ہم اس سے رک گیے" یہ تمام فائدے الرسالہ کی تحریروں کا نتیجہ ہیں۔ (سید انور، پونہ)

۱۱۔ صدر اسلامی مرکز کی آواز میں ایک نیا کیسٹ تیار کیا گیا ہے۔ اس کا نام ہے "میدانِ عمل" اس میں دعوت کی اہمیت کو ایک گھنٹہ کی تقریر میں بتایا گیا ہے۔

۱۲۔ جب سے تذکیر القرآن کی دونوں جلدیں شائع ہوئی ہیں، اس کے انگریزی ترجمہ کی مانگ بڑھ گئی ہے۔ مثلاً زینب شیخ محمد حبیب اللہ نے نیوزی لینڈ سے لکھا ہے کہ کیا تذکیر القرآن کا ترجمہ انگریزی زبان میں ہو چکا ہے۔ اس کی شدید ضرورت محسوس کی جارہی ہے (۲۹ جون ۱۹۸۸) اس سلسلہ میں اطلاع دی جاتی ہے کہ تذکیر القرآن کے انگریزی ترجمہ کا کام برابر جاری ہے۔ تاہم ابھی اس کا اندازہ نہیں ہے کہ اس کو کتابی صورت میں لانے کے لیے کتنی دیر لگے گی۔

۱۳۔ ایک صاحب اپنے خط ۲۰ جون ۱۹۸۸ میں لکھتے ہیں: ہم تمام بہن بھائی آپ کی تصنیفات اور الرسالہ کا بصد شوق مطالعہ کرتے ہیں۔ ہم آپ کے خیالات سے پوری طرح متفق ہیں۔ اس بات کی کوشش پوری طرح جاری ہے کہ آپ کی ہر بات پر عمل ہو۔ آپ کی تصنیفات کے مطالعہ کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ کے خیالات جس کی زندگی میں نہیں ہیں وہ خدا کی اس زمین پر جینے اور زندہ رہنے کے لائق نہیں۔ (نیر ربانی، بنگلور)

۱۴۔ ایک صاحب کراچی سے لکھتے ہیں: پہلے مجھے سوشلسٹ مفکرین اور غیر مسلم مفکرین کی کتابیں پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ ایک روز اردو بازار میں اسی قسم کی کتابیں خرید رہا تھا کہ میرے دوست نے کہا کہ تم ان کتابوں پر اپنی رقم کیوں ضائع کرتے ہو۔ چلو مولانا وحید الدین صاحب کی کتابیں خریدو۔ میں مولانا لوگوں سے بہت الرجک تھا۔ مگر دوست کے اصرار پر آپ کی دو کتابیں، اللہ اکبر، اور رازِ حیات خرید لیا۔ جب میں نے یہ کتابیں پڑھیں تو مجھے اپنے بھائیوں سے شکوہ پیدا ہوا کہ کسی نے مجھے نہیں بتایا کہ اسلام کیا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ مجھے راہ بتانے والا مل گیا۔ اب میں اس کو سنہری اصول بنا کر اس پر عمل کروں گا، انشاء اللہ (مصطفیٰ کمال، کراچی)

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کار نبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم ازکم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴۔ صاحب استطاعت افراد کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کردیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط وکتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

زر تعاون الرسالہ

زر تعاون سالانہ	۴۸ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	۲۵۰ روپیہ
بیرونی ممالک سے	
ہوائی ڈاک	۲۰ ڈالر امریکی
بحری ڈاک	۱۰ ڈالر امریکی

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلیشر مسئول نے ماہل آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

تذکیر القرآن

جلد اوّل : سورۃ فاتحہ ۔ سورۃ بنی اسرائیل
جلد دوم : سورۃ الکہف ۔ سورۃ الناس

قرآن کی بے شمار تفسیریں ہر زبان میں لکھی گئی ہیں۔ مگر تذکیر القرآن اپنی نوعیت کی پہلی تفسیر ہے۔ تذکیر القرآن میں قرآن کے اساسی مضمون اور اس کے بنیادی مقصد کو مرکز توجہ بنایا گیا ہے۔ جزئی مسائل اور معلوماتی تفصیلات کو چھوڑتے ہوئے اس میں قرآن کے اصل پیغام کو کھولا گیا ہے اور عصری اسلوب میں اس کے دعوتی اور تذکیری پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے۔ تذکیر القرآن عوام و خواص دونوں کے لیے یکساں طور پر مفید ہے۔ وہ طالبینِ قرآن کے لیے فہمِ قرآن کی کنجی ہے۔

ہدیہ جلد اول ۱۰۰ روپیہ
جلد دوم ۱۰۰ روپیہ

مکتبہ الرسالہ ، نئی دہلی

[illegible]

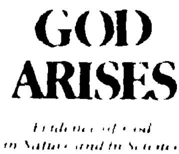
Jamia Nagar
J. M. I. New Delhi

الرسالہ

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

ISSN 0970-180X

مواقع کو استعمال کرنے کا نام دانائی ہے
اور مواقع کو برباد کرنے کا نام نادانی



God Arises

By Maulana Wahiduddin Khan

This is the translation with some additions of *Mazhab Aur Jadeed Challenge*, translated into Arabic as *Al-Islam Yatahaddah*, which became a best-seller throughout the Arab world. It has also been translated into a number of other languages including Turkish, Malay, Serbo-Croatian (Yugoslavian), Sindhi, etc., and has come to be accepted as a standard work on the Islamic position vis-à-vis modern thought.

"*... in the fourteen hundred years of Islamic history, innumerable books on Islam have appeared. There are just a few books calling mankind to God which are clearly distinguishable from the rest because of the clarity and force with which they make their appeal. Without doubt, this book is one of that kind*".

— *Daily AL-AHRAM (Cairo)*

Pages 265 ISBN 81-85063-14-1 (Pbk)
81-85063-17-6 (Hbd) Price Rs. 45

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اردو، انگریزی میں شائع ہونے والا

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

شمارہ ۱۴۴ — نومبر ۱۹۸۸

Dr. Zakir Husain Library

فہرست

ماہنامہ الرسالہ، سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳، فون: 697333, 611128

اپنا نقصان

اس دنیا میں سب سے بڑی چیز کیا ہے جس کو آدمی پائے ۔ اور جس کو پانے کا خصوصی طالب بنے ۔ یہ سب سے بڑی چیز یہ ہے کہ آدمی خدائی تجلیات کا آخذ (Recipient) بن سکے ۔ خدا کی رحمت کا فیضان ہر آن دنیا میں برستا ہے ، مگر اس کو پانے والا وہی شخص ہے جس نے اپنے اندر پانے کا استحقاق پیدا کیا ہو ۔

جب ایک شخص پر تنقید کی جائے اور وہ تنقید کو سن کر بگڑ اٹھے تو اس نے اپنے آپ کو فیضان الٰہی سے محروم کر لیا ، کیوں کہ تنقید کو سن کر بگڑنا کبر ہے ، اور جس سینہ میں کبر ہو وہ سینہ کبھی فیضانِ الٰہی کا مہبط نہیں بن سکتا ۔

یہی معاملہ تمام دوسری چیزوں کا ہے ۔ ایک شخص کے سامنے حق بات واضح دلائل کے ساتھ پیش کی جائے مگر وہ اس کو نہ ماننے اور دھاندلی کا انداز اختیار کرے ، ایسا شخص کبھی خدا کی قربت کا تجربہ نہیں کر سکتا ۔ کیوں کہ خدا اعتراف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے ، دھاندلی کرنے والے لوگ اُسے پسند نہیں ۔

آسمان سے بارش ہو تو زرخیز زمین اس کو قبول کرتی ہے ۔ پانی اس کے اندر داخل ہو کر اس کو اس قابل بنا دیتا ہے کہ اس سے فصل اگے ، اس میں پھول اور پھل پیدا ہوں ۔ مگر یہی بارش پتھر کی چٹان پر پڑتی ہے تو وہ اوپر اوپر بہہ جاتی ہے ۔ وہ اس کو کچھ فائدہ نہیں پہونچاتی ۔

یہی مثال خدائی فیضان کے معاملہ میں انسان کی ہے ۔ خدا کا فیضان ہر لمحہ دنیا میں برس رہا ہے ۔ تاہم اس کو وہی شخص پاتا ہے جس نے اپنے اندر اس کو پانے کی استعداد پیدا کی ہو ۔ جس شخص کے اندر استعداد نہ ہو ، اس کے اوپر خدا کا فیضان برسے گا مگر وہ پتھر کی چٹان کی طرح اوپر ہی اوپر سے گزر جائے گا ۔ وہ اس کے سینہ کے اندر داخل نہیں ہو گا ۔ وہ اس کی روح میں شامل ہو کر اس کو روشن نہیں کرے گا ۔

اپنے سینہ کے پتھریلے پن کو ختم کیجئے ، اس کو نرم مٹی کی طرح بنا دیجئے ۔ اور پھر آپ دیکھیں گے کہ آپ کا سینہ ربانی فصل کا چمنستان بن گیا ہے ۔

عطیہ کارڈ

۲۴ اگست ۱۹۸۸ کو مسٹر بی ڈی ملہوترا (پیدائش ۱۹۳۵) سے ملاقات ہوئی۔ وہ ساہتیہ اکیڈمی (نئی دہلی) میں تقریباً ۳۰ سال سے پبلی کیشنز منیجر ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ایک روز مجھے دفتر میں دیر ہوگئی۔ گھر جانے کے لیے باہر نکلا تو رات کے بارہ بج چکے تھے۔ میں اپنے اسکوٹر پر چلتے ہوئے ایک سڑک پر پہنچا تو وہاں پولس کے آدمی نے مجھے روک دیا۔ اس نے کہا کہ اپنا ڈرائیونگ لائسنس دکھاؤ۔

مسٹر ملہوترا نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو ڈرائیونگ کارڈ کے ساتھ ایک اور کارڈ نکل آیا۔ اس نے اپنے ہاتھ میں دونوں کارڈ لیتے ہوئے پوچھا کہ یہ دوسرا کارڈ کیا ہے۔ یہ دراصل آنکھ کے عطیہ کا کارڈ (Eye Donor Card) تھا۔ اس کارڈ پر آدمی کے دستخط کے ساتھ اس کی طرف سے یہ الفاظ درج ہوتے ہیں کہ میں نے اپنی آنکھیں قوم کو عطیہ دی ہیں۔ براہ کرم میری موت پر سب سے قریب کے آنکھ کے اسپتال کو فوراً اطلاع کر دیں۔ اور میری خواہش کو پورا کرنے میں ان کی مدد کریں۔ شکریہ:

I have gifted my eyes to the nation. Kindly inform the nearest Eye Bank immediately on my demise and help them to fulfil my desire. Thanks.

پولس کا آدمی پہلے بہت رکھائی کے ساتھ بات کر رہا تھا۔ مگر آنکھ کے عطیہ کا کارڈ دیکھتے ہی اس کا لہجہ بدل گیا۔ اس نے مزید جانچ کیے بغیر کہا کہ "جائیے، جائیے"۔

آنکھ کا عطیہ موجودہ زمانہ میں ایک شریفانہ فعل سمجھا جاتا ہے۔ ٹی وی پر اس کی اپیل ان جذباتی لفظوں میں آتی ہے: "دنیا میں ایک ہی چیز ہے جو صرف آپ کسی کو دے سکتے ہیں"۔ پولس والے نے جب مسٹر ملہوترا کے پاس آنکھ کے عطیہ کا کارڈ دیکھا تو وہ سمجھا کہ یہ ایک شریف اور ہمدرد انسان ہیں۔ آنکھ کے عطیہ کا کارڈ مسٹر ملہوترا کے لیے اس بات کی پہچان بن گیا کہ وہ دوسروں کو دینے والے آدمی ہیں۔ اس چیز نے پولس کے دل کو ان کے حق میں نرم کر دیا۔

اس دنیا میں دینے والے کو دیا جاتا ہے جو دوسروں کو دے وہ دوسروں سے پاتا ہے۔ حتی کہ وہ اس وقت بھی پانے کا مستحق بن جاتا ہے جب کہ اس نے ابھی عملاً دیا نہ ہو، اس نے ابھی صرف دینے کا ارادہ کیا ہو۔

تخریب نہیں

کوریں ایر کی فلائٹ ۸۵۸ نومبر ۱۹۸۷ کی ۲۹ تاریخ کو بغداد سے اڑی۔ اسے سی اول پہنچنا تھا۔ وہ بحر انڈمان کے اوپر ۳۷ ہزار فٹ کی بلندی پر اڑ رہی تھی کہ اچانک دھماکا ہوا، اور اس کے ۱۱۵ مسافر فضا ہی میں ہلاک ہو گئے۔ دھماکا اتنا شدید تھا کہ پائلٹ ایرپورٹ کو سگنل (Distress signal) بھی نہ بھیج سکا۔ جب کہ اس کے لیے صرف ایک سکنڈ کا وقت درکار تھا۔ جہاز کی تباہی کا یہ منصوبہ شمالی کوریا کی طرف سے بنایا گیا تھا۔ منصوبہ کے تحت شمالی کوریا کی ایک ۲۴ سالہ عورت کو تربیت دے کر جہاز کا سفر کرایا گیا۔ وہ بغداد سے اس جہاز پر سوار ہوئی اور جہاز کے اوپر کے خانہ میں ٹرانسسٹر بم رکھ کر ابوظبی میں اتر گئی۔ یہ ایک طاقت ور ٹائم بم تھا۔ وہ اپنے وقت پر پھٹا اور پورا جہاز اچانک تباہ ہو گیا۔

اس منصوبہ کا مقصد اولمپک ۱۹۸۸ کو ناکام بنانا تھا جو جنوبی کوریا کے دار السلطنت سی اول میں ہو رہا تھا۔ شمالی کوریا کی اشتراکی حکومت کو جنوبی کوریا کا یہ اعزاز پسند نہ تھا۔ شمالی کوریا کے اسٹالینی ڈکٹیٹر کم ال سنگ (Kim Il Sung) نے اپنی خفیہ ایجنسی کو حکم دیا کہ جنوبی کوریا کے جہاز کو بم سے اڑا دو تاکہ جنوبی کوریا کا سفر لوگوں کو غیر محفوظ معلوم ہونے لگے اور لوگ اولمپک میں شرکت کا ارادہ چھوڑ دیں۔ اس تخریبی مقصد کے تحت مذکورہ جہاز کو برباد کیا گیا۔

جنوبی کوریا کے جہاز کو برباد کرنا نہایت بے ہودہ جرم تھا۔ مگر دہشت گردی کے اعتبار سے وہ مکمل طور پر ناکام ہو گیا۔ کوئی بھی ملک اس سے ڈر کر اولمپک کی شرکت سے نہیں رکا۔ اس کے برعکس، ۱۶۱ ملکوں نے اعلان کیا کہ وہ سب اس میں شریک ہوں گے۔ یہ تعداد کسی بھی پچھلے اولمپک سے زیادہ ہے:

> The destruction of KAL 858 was a monstrous crime, but as an act of terrorism it proved to be monumental failure. No country was frightened away from the Olympics. On the contrary, 161 countries have announced they will attend, more than at any previous Games.
>
> (*Reader's Digest*, August 1988

کسی کے خلاف تخریب کاری خود اپنے خلاف تخریب کاری ہے۔ ایسا آدمی صرف اپنا نقصان کرتا ہے، وہ کسی دوسرے شخص کو کوئی نقصان نہیں پہونچاتا۔

پختہ انسان

این لینڈرس (Ann Landers) نے پختگی کے بارہ میں ایک مضمون لکھا ہے۔ اس کا ایک حصہ یہ ہے: پختگی یہ ہے کہ آدمی غصہ پر قابو پالے، اور اختلافات کو تشدد اور تخریب کے بغیر حل کرسکے۔ پختگی برداشت کا نام ہے، یہ آمادگی کہ دیر طلب فائدہ کے لیے وقتی خوشی کو ترک کر دیا جائے۔ پختگی دراصل ثابت قدمی ہے، رکاوٹوں کے باوجود منصوبہ کی تکمیل کے لیے اپنی محنت جاری رکھنا۔ پختگی بے غرضی ہے، دوسروں کی ضرورتوں میں ان کے کام آنا۔ پختگی اس استعداد کا نام ہے کہ ناخوش گواری اور مایوسی کا سامنا کسی تلخی کے بغیر کیا جائے۔ پختگی انکساری ہے۔ ایک پختہ انسان یہ کہنے کے قابل ہوتا ہے کہ "میں غلطی پر تھا"۔ اور جب وہ صحیح ثابت ہوتا ہے تو وہ یہ نہیں کہتا کہ یہ بات میں نے تمہیں بتا دی تھی۔ پختگی کا مطلب ہے قابل اعتماد اور ایماندار ہونا، اپنے وعدہ کو ہر حال میں پورا کرنا۔ پختگی اس صلاحیت کا نام ہے کہ ہم ان چیزوں کے ساتھ پُرامن طور پر رہ سکیں جن کو ہم بدل نہیں سکتے:

Maturity is the ability to control anger, and settle differences without violence or destruction. Maturity is patience, the willingness to give up immediate pleasure in favour of the long-term gain. Maturity is perseverance, sweating out a project despite setbacks. Maturity is unselfishness, responding to the needs of others. Maturity is the capacity to face unpleasantness and disappointment without becoming bitter. Maturity is humility. A mature person is able to say, "I was wrong." And when he is proved right, he does not have to say, "I told you so." Maturity means dependability, integrity, keeping one's word. Maturity is the ability to live in peace with things we cannot change.

پختہ انسان وہ ہے جس میں مردانہ اوصاف پائے جائیں۔ جو حقیقتِ واقعہ کا اعتراف کرے۔ جو ردعمل سے اوپر اٹھ کر معاملہ کرے۔ جو اپنے جذبات کو قابو میں رکھ سکے۔ جس کے اندر ناخوش گواری کو تحمل کے ساتھ عبور کرنے کی صلاحیت ہو۔ جو لوہے کی طرح قابل اعتماد کردار کا حامل ہو۔

یہی پختگی انسانیت کا کمال ہے۔ جس انسان کے اندر یہ خصوصیات ہوں، وہی کامل انسان ہے۔ وہی انسانیت کے اعلیٰ درجہ تک پہونچا ہے۔ ایسے ہی افراد زندگی میں کوئی حقیقی کارنامہ انجام دیتے ہیں۔ اور یہی افراد ہیں جو کسی قوم کو ترقی اور کامیابی کی طرف لے جاتے ہیں۔

لفظ کا فرق

ہوائی جہاز چلانے کا کام بہت زیادہ تربیت کا طالب ہے۔ مگر اکثر پائلٹ مطلوبہ معیار سے کم ہوتے ہیں۔ حتی کہ امریکہ جیسے ترقی یافتہ ملک میں بھی۔ امریکی میگزین ٹائم (یکم اگست ۱۹۸۸) نے ایک رپورٹ شائع کی ہے جس کی سرخی یہ ہے ـــــــ کیا امریکی ہواباز کوالیفائڈ ہیں :

Are U.S. pilots qualified (p. 39).

اس رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ امریکہ کی ہوائی کمپنیاں اکثر فیڈرل اویئیشن ایڈمنسٹریشن (FAA) کے سرٹیفکٹ پر بھروسہ کرکے پائلٹ کو بھرتی کرلیتی ہیں، خود زیادہ تحقیق نہیں کرتیں۔ مگر یہ بھروسہ کافی نہیں۔ ایک ریسرچ ٹیم نے ۱۱۲ ہوابازوں کا جائزہ لیا تو ان میں ۵۰ فیصد ہواباز معیار سے کم تر تھے۔

مثلاً ایک پائلٹ نے ۱۹۸۵ میں ایک ہوائی حادثہ کیا۔ اس کے ریکارڈ کا گہرا جائزہ لیا گیا تو معلوم ہوا کہ اس سے پہلے وہ تین مزید حادثات کرچکا تھا، اس کے باوجود اس کو بھرتی کرلیا گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ پچھلے تینوں حادثات اس کی فائل میں حادثات (Accidents) کے بجائے محض واقعات (Incidents) لکھے ہوئے تھے۔

الفاظ کا معاملہ بڑا عجیب ہے۔ ایک ہی واقعہ کو گھٹا کر بھی بیان کیا جاسکتا ہے اور بڑھا کر بھی۔ ایک قسم کا لفظ بولا جائے تو وہ معمولی نظر آئے گا، اور دوسرے قسم کا لفظ بولا جائے تو بے حد سنگین معلوم ہونے لگے گا۔ الفاظ کا معاملہ ربر جیسا ہے۔ اس میں کمی بیشی کا انحصار اس پر ہے کہ آپ نے اس کو کتنا کھینچا اور کتنا نہیں کھینچا۔

اس معاملہ میں مومن کے قول کو قولِ سدید ہونا چاہیے۔ قولِ سدید کا مطلب یہ ہے کہ بالکل نپی تلی ہوئی بات کہی جائے۔ ایسے الفاظ بولے جائیں جو اصل واقعہ کے ٹھیک ٹھیک مطابق ہوں، نہ اس سے کم اور نہ اس سے زیادہ۔ خاص طور پر جہاں دو شخص یا دو گروہ کے درمیان کا نزاعی معاملہ ہو وہاں تو عین مطابق واقعہ لفظ بولنا فرض کے درجہ میں مطلوب ہو جاتا ہے، اور غیر واقعی لفظ بولنا حرام کے درجہ میں غیر مطلوب۔

الٹا کام

ایک شخص اپنے بیٹے کو ڈاکٹر بنانا چاہتا ہو اور اس سے کہے کہ تم پہلے بازار میں ایک دکان لے کر مطب کھول لو۔ اس کے بعد ڈاکٹری پڑھتے رہنا۔ اگر کوئی باپ اپنے بیٹے کو اس قسم کا مشورہ دے تو لوگ اس کو پاگل یا کم از کم غیر سنجیدہ انسان سمجھیں گے۔ کیوں کہ ڈاکٹری پہلے سیکھی جاتی ہے اور مطب اس کے بعد کھولا جاتا ہے۔ مگر عجیب بات ہے کہ یہی الٹا کام ہمارے تمام لیڈر کر رہے ہیں۔ اس کے باوجود کوئی انھیں غیر سنجیدہ نہیں کہتا۔ بلکہ انھیں مفکر اور رہنما کا خطاب دیدیا جاتا ہے۔

موجودہ زمانہ میں جو مسلم لیڈر اٹھے وہ تقریباً سب کے سب قوم کو اسی قسم کی لاحاصل رہنمائی دیتے رہے —— پہلے سیاسی آزادی حاصل کرلو، اس کے بعد قومی تعمیر کا کام کرنا۔ پہلے ایک زمینی خطہ حاصل کرلو، اس کے بعد وہاں اسلامی نظام جاری کرانا۔ پہلے حکومت کا تختہ الٹ دو، اس کے بعد اصلاحِ معاشرہ کا کام انجام دینا، پہلے پارلیمنٹ سے قانون پاس کرالو اس کے بعد لوگوں کی ذہنی اصلاح کرنا۔ وغیرہ۔

اس قسم کی تمام باتیں اتنی ہی بے معنی ہیں جتنا ڈاکٹری سیکھنے سے پہلے ڈاکٹری دکان کھولنا۔ یہی وجہ ہے کہ ایک سو سال سے بھی زیادہ لمبی مدت تک ہنگامہ آرائی کرنے کے باوجود مسلمانوں کے حصہ میں بربادی اور ناکامی کے سوا اور کچھ نہیں آیا۔

انسان کوئی لوہا یا لکڑی نہیں ہے جس کو مرحلہ وار گڑھا جاسکے۔ انسان ایک ہی بار بنتا ہے اور پہلی بار جیسا بن جائے اسی پر وہ ہمیشہ قائم رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خارجی انداز کی تحریکیں اپنے دوسرے مرحلہ کے منصوبہ میں ہمیشہ ناکام رہتی ہیں۔ خارجی نشانہ پورا کرنے کے بعد ان کے لیڈر افراد کی داخلی اصلاح پر تقریریں شروع کرتے ہیں۔ مگر اس قسم کی تقریروں کا ایک فی صد بھی فائدہ نہیں ہوتا۔ اس قسم کا تجربہ انسانی نفسیات سے بے خبری ہے۔ اور بدقسمتی سے موجودہ زمانہ کے تمام مسلم لیڈر نفسیاتِ انسانی سے اسی بے خبری کی مثال بنے ہوئے ہیں۔

تعمیر قوم حقیقۃً تعمیر شعور کا دوسرا نام ہے۔ شعور کی تعمیر کے بعد ہر چیز اپنے آپ حاصل ہو جاتی ہے، شعور کی تعمیر کے بغیر کوئی بھی چیز حاصل نہیں ہوتی۔

سب سے بڑا ظالم

فمن اظلم ممن کذب علی اللّٰہ وکذب بالصدق اذ جاءہ الیس فی جہنم مثوی للکافرین ۔ والذی جاء بالصدق وصدق بہ اولئک ہم المتقون ۔ لہم ما یشاءون عند ربہم ذلک جزاء المحسنین ۔

(الزمر ۳۲-۳۴)

اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہوگا جس نے اللہ پر جھوٹ باندھا۔ اور سچائی کو جھٹلا دیا جب کہ وہ اس کے پاس آئی۔ کیا ایسے منکروں کا ٹھکانا جہنم میں نہ ہوگا۔ اور جو شخص سچائی لے کر آیا اور جس نے اس کی تصدیق کی، یہی لوگ اللہ سے ڈرنے والے ہیں۔ ان کے لیے ان کے رب کے پاس وہ سب ہے جو وہ چاہیں گے۔ یہ بدلہ ہے نیکی کرنے والوں کا۔

اس دنیا میں سب سے بڑی نیکی حق کا اعتراف ہے، اور سب سے بڑا جرم حق کا انکار کرنا ہے۔ آخرت میں جنت اور جہنم کا فیصلہ جس معیار پر ہوگا وہ یہی ہوگا کہ ایک شخص کے سامنے جب حق آیا تو اس نے اس کو مانا یا اس کو نظر انداز کر دیا۔ حق کو نظر انداز کرنا اتنا بڑا جرم ہے کہ اس کے بعد کوئی بھی دوسرا عمل اللہ تعالیٰ کے یہاں قابل اعتبار نہیں ۔

آدمی کا اصلی اور حقیقی امتحان جہاں ہو رہا ہے، وہ یہ ہے کہ اس نے اللہ کی خاطر اپنی انا کو توڑا یا نہیں ۔ اس نے اللہ کے آگے اپنے عجز کا اقرار کیا یا نہیں۔ حق کا ظہور در اصل اسی امتحان کا لمحہ ہوتا ہے، اس دنیا میں حق کا ظہور چونکہ براہ راست خدا کی طرف سے نہیں ہوتا بلکہ کسی انسان کے ذریعہ ہوتا ہے، اس لیے عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ سننے والا اس کو اپنے لیے ساکھ کا مسئلہ بنا لیتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اگر میں حق کے آگے جھکا تو وہ ایک انسان کے سامنے جھکنے کے ہم معنی بن جائے گا۔ یہ احساس اس کے لیے رکاوٹ بن جاتا ہے ۔

مگر ایسے مواقع پر جب آدمی جھکتا ہے تو وہ درحقیقت انسان کے آگے نہیں جھکتا۔ وہ خدا کے آگے جھکتا ہے۔ کیوں کہ وہ حق کی خاطر جھکا تھا نہ کہ کسی انسان کی خاطر۔ یہی وہ لوگ ہیں جو سب سے پہلے جنتوں میں داخل کیے جائیں گے ۔

دینِ اکابر

حدیث میں بتایا گیا ہے کہ پچھلے اہل کتاب ۷۲ فرقوں میں بٹ گیے، اور امت مسلمہ ۷۳ فرقوں میں بٹ جائے گی۔ ان میں سے ۷۲ فرقے آگ والے ہیں، صرف ایک جنت والا ہے۔ یہ ایک فرقہ "الجماعت" ہے (ابوداؤد) "الجماعت" سے کیا مراد ہے، اس کی تشریح ترمذی کی روایت سے ہوتی ہے۔ صحابہ کرام نے پوچھا کہ اے خدا کے رسول، یہ الجماعت کون لوگ ہیں۔ آپ نے جواب دیا: جو اس پر ہو جس پر میں اور میرے اصحاب ہیں (مَنْ کَانَ عَلٰی مَا اَنَا علیہِ وَاَصْحَابِیْ)

فرقوں کی یہ کثرت کیسے ہوتی ہے، اس کا جواب قرآن کی اس آیت میں ملتا ہے: انھوں نے اپنے علماء اور اپنے مشائخ کو اللہ کے سوا اپنا رب بنالیا اور مسیح ابن مریم کو بھی، حالاں کہ ان کو صرف یہ حکم دیا گیا تھا کہ وہ ایک معبود کی عبادت کریں (اِتَّخَذُوا اَحْبَارَھم وَرُھْبَانَھم اَرْبَابًا مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ وَالمسیحَ ابْنَ مَرْیَم وَمَا اُمِرُوا اِلَّا لِیَعْبُدُوا اِلٰھًا وَّاحِدًا، التوبہ ۳۱)

جب لوگ دینِ خدا پر ہوں تو دین ایک رہتا ہے۔ تمام لوگوں کے لیے دین کا ایک ہی ماخذ ہوتا ہے اور وہ قرآن ہے۔ لوگ ہر معاملہ میں قرآن کی طرف دیکھتے ہیں اور اس میں جو ہدایت ملے اس کو بے چون وچرا قبول کر لیتے ہیں۔ قرآن کا فیصلہ معلوم ہوجانے کے بعد وہ دوبارہ کوئی بحث نہیں نکالتے۔ جن لوگوں میں یہ مزاج ہو ان کا دین ایک رہے گا۔

مگر جب قوم میں زوال آتا ہے تو اس کے اکابر اس کے لیے دین کا ماخذ بن جاتے ہیں۔ اب قرآن کو یا تو ثواب اور تبرک کے طور پر پڑھا جاتا ہے یا اپنے اکابر کے دین کو صحیح ثابت کرنے کے لیے۔ خدا کی کتاب اصل رہنما کی حیثیت سے اپنا مقام کھو دیتی ہے۔

خدا ایک ہے مگر اکابر ایک نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قوم جب دین اکابر پر ہوتی ہے تو اس کے یہاں فرقوں کی کثرت ہوجاتی ہے۔ ملت کا "۷۳ فرقوں" میں بٹنا دراصل "۷۳ اکابر" کے حلقوں میں تقسیم ہونے کا دوسرا نام ہے۔ مسلمان آج اسی دین اکابر پر ہیں۔ ان کے یہاں اکابر کے نام پر سرگرمیاں ہیں مگر خدا کے نام پر کوئی سرگرمی نہیں۔ اکابر کی بڑائی بیان کرنے سے ان کے زبان وقلم نہیں تھکتے مگر خدا کی بڑائی بیان کرنے والا ان کے درمیان کوئی نہیں۔

موت کے بعد

غزوہ بدر میں ابوجہل جب مہلک زخم کھا کر گرا اور مرنے کے قریب ہوا تو اس نے پوچھا کہ مجھ کو مارنے والا کون ہے۔ کسی نے بتایا کہ انصار کے ایک نوجوان نے اس کو قتل کیا ہے۔ ابوجہل یہ سن کر بولا: لو غیر اکّار قتلنی (کاش کسان کے علاوہ کسی اور نے مجھ کو مارا ہوتا)

ستمبر ۱۹۸۰ کا واقعہ ہے۔ ڈنکرک (فرانس) کے ایک شخص نے خودکشی کرلی۔ اس کا نام جوزف ریڈفورڈ (Joseph Redford) تھا۔ اس وقت اس کی عمر ۶۲ سال تھی۔ اس نے مہلک زہر کی خوراک کھالی۔ اس کے بعد وہ مقامی کرکیٹ کلب میں گیا تاکہ مرنے سے پہلے اپنے کلب کے ساتھیوں سے آخری مصافحہ کرسکے۔ اس نے کلب کے ممبروں سے کہا:

Give me a whisky, I shall be dead in half an hour.

مجھ کو شراب کا ایک گلاس دو۔ آدھ گھنٹہ کے بعد میں مر جاؤں گا (ہندستان ٹائمس، نئی دہلی ۱۹ ستمبر ۱۹۸۰)

اس طرح کے واقعات بتاتے ہیں کہ انسان موت کو بس "خاتمہ" کا ایک معاملہ خیال کرتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ کچھ دن دنیا میں رہ کر ہمیشہ کے لیے مٹ جانے کا نام موت ہے۔ اس لیے وہ چاہتا ہے کہ جب وہ مرے تو عزت اور سکون کے ساتھ مرے۔ اس کے مردہ جسم کے اوپر مقبرہ کی صورت میں ایک شاندار یادگار قائم ہو جو موجود لوگوں کو ختم ہونے والے انسان کی عظمت یاد دلاتی رہے۔

مگر یہ سخت ترین قسم کی غلط فہمی ہے۔ موت، آدمی کی زندگی کا خاتمہ نہیں، وہ آدمی کی زندگی کے ایک نئے اور طویل تر دور کا آغاز ہے۔ آدمی اگر اس حقیقت کو جانے تو "قاتل" کا حسب نسب معلوم کرنے کے بجائے وہ خود اپنے اعمال نامہ کو پڑھنے کی کوشش کرے، وہ بےخودی کی خوراک کھا کر بےخبر ہونے کے بجائے یہ چاہے کہ وہ آخری حد تک باہوش ہو جائے تاکہ کم از کم اپنے آخری لمحات کو ضائع ہونے سے بچا سکے۔

کتنا زیادہ فرق ہے بےخبر انسان اور باخبر انسان میں۔

نیا مذہب

دہلی یونیورسٹی کے یونیسکو کلب کے تحت ایک میٹنگ ہوئی۔ ٹائمس آف انڈیا (۳ اگست ۱۹۸۸) کی رپورٹ کے مطابق، اس موقع پر مسٹر خوشونت سنگھ نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ضرورت ہے کہ ملک میں ایک نیا مذہب بنایا جائے جو کہ عمل کی اخلاقیات، عدم تشدد اور قدرتی ماحول کی حفاظت کی تبلیغ کرے۔ یہ بہت ضروری ہو گیا ہے، کیوں کہ لوگوں کے رجحان اور اقدار میں کچھ غلطی ہے جو کہ موجودہ مذاہب کے ذریعہ ان کے اندر آئی ہے:

> There was need to form a new religion in the country which would propagate work ethics, non-violence and preservation of the environment. This has become imperative because there is something wrong with the attitudes and values of the people imbibed from the existing religions.

مسٹر خوشونت سنگھ نے موجودہ مذہبی لوگوں کی جو شکایت کی ہے، وہ بجائے خود درست ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کے مذہبی لوگ انسانی ترقی کا سبب بننے کے بجائے انسانی ترقی میں رکاوٹ بن گئے ہیں۔ وہ انسانی قافلہ کو آگے لے جانے کی خدمت انجام نہیں دے رہے ہیں۔ یہی حال آج ہر مذہب کے ماننے والوں کا ہے۔

مگر جہاں تک اصلاح کا تعلق ہے، اصل ضرورت نئے مذہب کی نہیں، بلکہ نئے مذہبی انقلاب کی ہے۔ مذہب کی تعلیم آج بھی صحیح ہے۔ مگر مذہب کی بنیاد پر لوگوں کے اندر ذہنی انقلاب نہیں لایا گیا ہے۔ آج جو لوگ مذہب کی نمائندگی کر رہے ہیں وہ جمود اور تقلید کی پیداوار ہیں نہ کہ حقیقۃً مذہبی انقلاب کی پیداوار۔

موجودہ زمانہ میں جو لوگ مذہب کا نعرہ لے کر اٹھے، انھوں نے صرف مذہب کو استعمال کیا۔ انھوں نے مذہب کے مطابق لوگوں کا ذہن بنانے کی کوشش نہیں کی۔ یہی خرابی کا اصل سبب ہے۔ اب جن لوگوں کو اصلاح کا درد ہو۔ انھیں مذہبی تعلیمات کی روشنی میں لوگوں کا ذہن بدلنے کی کوشش کرنا چاہیے، نہ یہ کہ نیا مذہب پیدا کرنے کی بے فائدہ کوشش میں اپنا وقت ضائع کریں۔

مصلحت کی دو قسمیں

شریعت انسان کی بھلائی کے لیے مقرر کی گئی ہے۔ اس لحاظ سے پوری شریعت مصلحت انسانی پر مبنی ہے۔ تاہم شریعت کے نزدیک بعض مصلحتیں قابل لحاظ ہیں اور بعض مصلحتیں ناقابل لحاظ۔ اس بنا پر فقہاء اسلام نے مصلحت کی دو قسمیں قرار دی ہیں۔ مصالح معتبرہ، یعنی وہ مصلحت جس کا شریعت میں اعتبار کیا گیا ہو۔ اور مصالح ملغاۃ، یعنی وہ مصلحت جس کو شریعت نے لغو قرار دیا ہو۔

۱۔ جان کی حفاظت کے لیے شریعت نے قصاص کا حکم دیا ہے۔ اسی طرح مال کی حفاظت کے لیے چوری کی حد مقرر کی ہے۔ یہ مصالح معتبرہ کی مثالیں ہیں۔ مصالح کی اس فہرست میں قیاس واستنباط کے ذریعہ اضافے کیے جاسکتے ہیں۔ مثلاً خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروقؓ نے تقسیم وظائف کے لیے رجسٹر کا طریقہ رائج کیا جو پہلے موجود نہ تھا۔ یہ بھی استنباطی طور پر مصالح معتبرہ میں شمار کیا جائے گا۔

۲۔ میراث میں قرآن نے یہ قاعدہ مقرر کیا ہے کہ مرد کو عورت سے دگنا حصہ دیا جائے (النساء ۱۱) اب اگر کوئی شخص بطور خود ایک وجہ نکال کر کہے کہ عورت اور مرد دونوں کو برابر برابر حصہ دینا چاہیے تو یہ مصالح ملغاۃ کی مثال ہوگی۔ یہ ایک لغو مصلحت ہوگی جس کا اعتبار کرنے کی ضرورت نہیں۔ کیوں کہ وہ حکم شریعت سے براہِ راست ٹکراتی ہے۔

مصالح معتبرہ اور مصالح ملغاۃ کا تعلق صرف روایتی قسم کے مسائل سے نہیں ہے۔ اس کا تعلق زندگی کے تمام مسائل سے ہے۔ مثلاً ہندستان میں جب مسلمانوں سے کہا جاتا ہے کہ دوسرے فرقہ کے ساتھ ٹکراؤ نہ کرو۔ بلکہ قرآنی تعلیم کے مطابق، اعراض کا طریقہ اختیار کرو، تو وہ جواب دیتے ہیں کہ اگر ہم اعراض کریں تو وہ جری ہو جائیں گے اور ہمارے خلاف مزید کارروائیاں کریں گے۔ مسلمانوں کی یہ مصلحت بھی مصالح ملغاۃ میں شامل ہے، کیوں کہ وہ ان کے اپنے دماغ کی ایجاد ہے، وہ قرآن کی کسی تعلیم یا پیغمبر کی کسی سنت پر مبنی نہیں

وہی مصلحت معتبر مصلحت ہے جو قرآن وسنت کے مطابق ہو، جو مصلحت قرآن وسنت کے مطابق نہ ہو وہ ایک لغو مصلحت ہے، جس کا لحاظ کرنے کی ضرورت نہیں۔ ایسی مصلحت مسلمانوں کو کبھی فلاح وسعادت کی طرف نہیں لے جاسکتی۔

انصاف زندہ ہے

ہندستان کی سابق وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کو ان کی نئی دہلی کی رہائش گاہ میں ۳۱ اکتوبر ۱۹۸۴ کو قتل کر دیا گیا تھا۔ اس قتل میں چار آدمی ملوث تھے۔ حفاظتی دستہ کے بیانت سنگھ اور ستونت سنگھ۔ ان دونوں نے وزیر اعظم پر گولیاں چلائیں۔ بیانت سنگھ کو حفاظتی پولیس نے اسی وقت گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ اور ستونت سنگھ گرفتار ہو گیا۔ دوسرے دو شخص کیہر سنگھ اور بلبیر سنگھ تھے جن کو قتل کی سازش کرنے اور اس کا منصوبہ بنانے کا مجرم قرار دیا گیا تھا۔

ان تینوں پر مقدمہ چلا۔ دہلی کے ایڈیشنل جج مہیش چندر نے ۲۲ جنوری ۱۹۸۶ کو اپنا فیصلہ سنایا جس میں ستونت سنگھ، کیہر سنگھ اور بلبیر سنگھ کو موت کی سزا دی گئی۔ اس کے بعد مقدمہ ہائی کورٹ میں گیا۔ دہلی ہائی کورٹ نے ۳ دسمبر ۱۹۸۶ کے فیصلہ میں تینوں کے لیے سزائے موت کی توثیق کر دی۔ اس کے بعد ملزمین اس مقدمہ کو سپریم کورٹ میں لے گئے۔ سپریم کورٹ نے ۳ اگست ۱۹۸۸ کو اپنا متفقہ فیصلہ سنایا۔ یہ فیصلہ مسٹر جسٹس جی ایل اوزا، مسٹر جسٹس سیٹی، مسٹر جسٹس بی سی رائے پر مشتمل ایک ڈویژنل بنچ نے سنایا۔

سپریم کورٹ نے اپنے فیصلہ میں ستونت سنگھ اور کیہر سنگھ کی سزائے موت بحال رکھی۔ مگر بلبیر سنگھ کو اس نے مکمل طور پر بری قرار دیا۔ بلبیر سنگھ کے خلاف قتل میں ملوث ہونے کی براہِ راست شہادت نہیں ملی۔ مثلاً استغاثہ کی طرف سے ایک بات یہ کہی گئی تھی کہ مسز اندرا گاندھی کا قتل اس لیے ہوا کہ آپریشن بلیو اسٹار کی وجہ سے سکھ ان سے بگڑ گئے اور خود بلبیر سنگھ کی زبان سے انتقام کی بات سنی گئی۔ اس دلیل کا ذکر کرتے ہوئے جسٹس اوزا نے لکھا ہے کہ اگر بلیو اسٹار آپریشن پر غصہ یا احتجاج کے اظہار کو ملزم کے خلاف شہادت یا قرینہ کے طور پر استعمال کیا جائے تو سکھ فرقہ کے تمام افراد جو بلیو اسٹار آپریشن پر برہم ہو گئے تھے، ان سب کو قتل کی سازش میں شریک کرنا پڑے گا۔ مسٹر جسٹس اوزا نے مزید کہا کہ بلبیر سنگھ کو چھوڑنے میں غلطی کرنا اس سے بہتر ہے کہ اس کو سزا دینے میں غلطی کی جائے :

It is safe: to err in acquitting than in convicting him.

اس واقعہ پر صرف وہ تبصرہ نقل کرنا کافی ہے جو بلبیر سنگھ نے کیا، اس نے کہا : مجھے انصاف کی ذرا بھی امید نہیں تھی۔ مگر اب مجھے یقین ہو گیا کہ اس ملک میں انصاف زندہ ہے۔

سورج پر خاک

سلمان رشدی بمبئی میں پیدا ہوئے۔ اب وہ اپنی برطانی بیوی میریانے وگنس (Marianne Wiggins) کے ساتھ لندن میں رہتے ہیں۔ ان کی کئی انگریزی کتابیں (ناولیں) اس سے پہلے شائع ہو چکی ہیں۔ ان میں سے ایک مشہور کتاب آدھی رات کے بچے (Midnight's Children) ہے جو ۱۹۸۱ میں شائع ہوئی ہے۔ حال میں ان کی ۵۴۷ صفحات کی ایک کتاب ایک برطانوی پبلشر وائکنگ پریس (Viking Press) نے شائع کی ہے جو لندن سے ۲۶ ستمبر ۱۹۸۸ کو ریلیز کی گئی ہے۔ اس کتاب کا نام "شیطانی کلام" (The Satanic Verses) ہے۔

مصنف نے کتاب کا نام (شیطانی کلام) بطور خود اس کے اساسی کردار "مہاونڈ" (Mahound) کی نسبت سے استعمال کیا ہے جو کہ نعوذ باللہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ کتاب کا یہ نام کتاب کے مفروضہ کردار کے بجائے خود کتاب کے مصنف کے اوپر زیادہ صحیح طور پر چسپاں ہوتا ہے۔

سلمان رشدی نے اپنے ایک بیان (ٹائمس آف انڈیا ۸ اکتوبر ۱۹۸۸) میں کہا ہے کہ یہ کتاب مذہب اور الہام کے بارے میں ایک سیکولر آدمی کا نقطۂ نظر بیان کرنے کی ایک کوشش ہے:

> Its's an attempt to write about religion and revelation from the point of view of a secular person.

مگر زیادہ صحیح بات یہ ہوگی کہ یہ کہا جائے کہ وہ ایک سیٹانک پرسن (Satanic person) کے نقطۂ نظر کو بیان کرنے کی کوشش ہے۔ کیوں کہ سیکولرزم، یا سیکولر انسان کا یہ مطلب کسی بھی سنجیدہ صاحب علم نے کبھی نہیں بتایا جس کا نمونہ سلمان رشدی نے اپنی مذکورہ کتاب میں پیش کیا ہے۔

یہ کتاب اسلام اور پیغمبر اسلام کے خلاف ایک انتہائی بیہودہ اور فحش قسم کا ناول ہے۔ جیسا کہ خود اس کے نام سے ظاہر ہے۔ اس میں حمزہؓ اور عائشہؓ وغیرہ کے نام تو بالکل اصل حالت میں درج کئے گئے ہیں، البتہ پیغمبر کا نام محمدؐ کے بجائے مہاونڈ (Mahound) لکھا گیا ہے۔ یورپ کے مسیحی علما اور مستشرقین نے قدیم زمانہ میں اپنے جذبۂ عناد کی تسکین کے لئے آپ کے نام کو طرح طرح

سے بگاڑا تھا۔ انھیں میں سے ایک بگڑا ہوا نام وہ ہے جس کو سلمان رشدی نے انتہائی مجرمانہ طور پر اپنی کتاب میں استعمال کیا ہے۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نسل انسانی کی بزرگ ترین شخصیت ہیں۔ آپ کی ذات گرامی بلاشبہہ پوری انسانیت کے لئے فخر کی حیثیت رکھتی ہے۔ آپ کی عظمت اور آپ کا تقدس اتنا زیادہ مسلّم ہے کہ دنیا کے تمام سنجیدہ لوگوں نے متفقہ طور پر اس کا اقرار کیا ہے۔

آپ کا ایک خصوصی امتیاز یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ابدی طور پر فتح و غلبہ کی نسبت عطا فرمائی ہے۔ چنانچہ قدیم عرب میں ہر قسم کی شدید ترین مخالفت کے باوجود آپ تمام قبائل کے اوپر مکمل طور پر غالب رہے۔ آپ کے زمانہ کی دو طاقت ور ترین سلطنتیں (روم اور ایران) آپ سے ٹکرائیں مگر وہ خود پاش پاش ہو کر رہ گئیں۔ آپ کے ظہور کے بعد یہودی اور عیسائی ساری دنیا میں آپ کے دشمن ہو گئے، مگر وہ آپ کا کچھ بھی بگاڑ نہ سکے۔

صلیبی جنگوں کے بعد یوروپ کی مسیحی اقوام نے متحدہ طور پر یہ کوشش کی کہ وہ آپ کی تصویر کو بگاڑیں اور آپ کی تاریخ کو بالکل مسخ کر ڈالیں۔ مگر ہزار برس تک اپنی ساری طاقت خرچ کرنے کے باوجود ان کی کوششیں صد فی صد ناکام ہو گئیں۔ یہاں تک کہ سائنس کے زیر اثر خود علم انسانی میں وہ انقلاب آیا جس نے آپ کے معاندین کے پیدا کردہ لٹریچر کو غیر حقیقی قرار دے کر رد کر دیا۔ خود مسیحی طبقہ کی بعد کی نسلوں میں ایسے لوگ پیدا ہوئے جنھوں نے اپنی ابتدائی نسلوں کی بات کو ماننے سے انکار کر دیا۔ ان میں ٹامس کارلائل پیدا ہوا جس نے آپ کو تمام پیغمبروں کا ہیرو قرار دیا (۱۸۴۰) ان کے درمیان سے مائیکل ہارٹ اٹھا جس نے یہ اعلان کیا کہ محمدؐ تاریخ کے واحد سب سے بڑے انسان تھے (۱۹۷۸) وغیرہ۔

جو ہستی اتنی عظیم ہو اور جس کی بڑائی ایسا مسلّمہ واقعہ بن چکی ہو، اس کے خلاف کتاب لکھنا یا اس کی شان میں برے کلمات اپنی زبان سے نکالنا یقیناً ایسا ہی ہے جیسا سورج کے اوپر خاک ڈالنا۔ جو شخص سورج کے اوپر خاک ڈالنے کی کوشش کرے وہ خود اپنے منہ میں خاک ڈال رہا ہے، وہ خود اپنے آپ کو باطل ثابت کر رہا ہے۔

کتا اگر ہاتھی کے اوپر بھونکے تو ہاتھی کو اس کی ضرورت نہیں کہ وہ کتے کی بھونک کی

تردید کرے۔ ہاتھی اپنے باعظمت وجود کے ساتھ اپنے آپ کتے کی بھونک کی تردید ہے۔ پیغمبر اسلام کی عظمت اس سے زیادہ ہے کہ کسی کے قلم کی سیاہی اس کو داغدار کر سکے۔ ساری تاریخ، تمام انسانی علوم، حتی کہ پوری کائنات ایسی ہر کوشش کی تردید ہے۔ جس ہستی کے ظہور نے خود انسانی تاریخ کو بدل ڈالا ہو، کون ہے جو اس کی تصویر کو بدلے، کون ہے جو اس کی تاریخ کو مٹا سکے۔

خاتونِ اسلام

اسلامی شریعت میں عورت کا مقام
اسلام اور جدید تہذیب کا تقابل

از: مولانا وحید الدین خاں

(صفحات ۲۹۲، قیمت ۳۵ روپیہ)

مکتبہ الرسالہ

سی-۲۹، نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی-۱۳ فون: 697333, 611128

میوات کا سفر

صفحات ۲۲۰ ہدیہ ۲۵ روپیہ

میرٹھ کا سفر

جہاں تک یاد آتا ہے، "میرٹھ" کا لفظ پہلی بار میرے کان میں اس وقت آیا جب کہ میری عمر ابھی دس سال سے کم تھی۔ اقبال احمد سہیل (۱۹۵۵-۱۸۸۷) کے بڑے صاحبزادے اسلام احمد خاں صاحب کی شادی مسٹر عبدالغنی انصاری (سابق کمشنر انکم ٹیکس) کی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔ یہ خاتون اپنے والد کے ساتھ میرٹھ میں تھیں۔ ۱۹۳۱ میں ان کے یہاں اکرام احمد خاں صاحب کی پیدائش ہوئی جو اقبال احمد سہیل کے پہلے پوتے ہیں۔ اس پیدائش کی خبر اعظم گڈھ پہونچی تو اقبال احمد سہیل صاحب نے برجستہ یہ شعر کہا:

نہ ہے نصیب یہ دن بعد انتظار آیا پیام عیش کا میرٹھ سے آج تار آیا

میرا تعلق اس نسل سے ہے جس نے ابتدائی تعلیم کے زمانہ میں اسماعیل میرٹھی (۱۹۱۷-۱۸۴۴) کی ریڈریں پڑھی ہیں۔ ایک زمانہ میں ابتدائی مدارس میں سب سے زیادہ اسی "اردو ریڈر" کا رواج تھا۔ اس کے بعد ابتدائی اردو نصاب کے لیے بے شمار کتابیں لکھی اور چھاپی گئی ہیں جو آج کل عام طور پر رائج ہیں۔ مگر میرا خیال ہے کہ میرٹھ کے مولانا محمد اسماعیل کی ریڈر سے بہتر کتاب اس موضوع پر اب تک نہ لکھی جا سکی۔ میں اپنی ابتدائی زندگی میں جن چیزوں سے متاثر ہوا ان میں مولانا اسماعیل میرٹھی کے مضامین اور اشعار بھی تھے۔ ان کے جو اشعار مجھ کو ابھی تک یاد ہیں ان میں سے ایک شعر یہ ہے:

جو پتھر پہ پانی پڑے متصل تو گھس جائے بے شبہہ پتھر کی سل

میرٹھ کے لیے میرا پہلا سفر جنوری ۱۹۶۸ میں ہوا۔ اس سفر کی روداد اسی زمانہ میں الجمعیۃ ویکلی ۹ فروری ۱۹۶۸ میں شائع ہوئی تھی۔ ۲۸-۲۹ جنوری ۱۹۶۸ کو میرٹھ میں ایک مسلم کانفرنس ہوئی۔ میں اس میں "مشاہد" کے طور پر شریک ہوا تھا۔ اس موقع پر عین جلسہ کے دوران فرقہ وارانہ فساد ہو گیا اور شہر میں کرفیو لگ گیا۔ اس بنا پر کانفرنس صرف ۲۸ جنوری کو ہو سکی۔ کرفیو کی وجہ سے اگلے دن (۲۹ جنوری) کا اجلاس منسوخ کرنا پڑا۔

اس فساد کا سبب سابق کشمیری لیڈر شیخ محمد عبداللہ (۱۹۸۲-۱۹۰۵) کی اس میں شرکت

تھی۔ یہ شیخ عبداللہ کا وہ دور ہے جب کہ ان کا کہنا تھا کہ کشمیر کا ہندستان سے الحاق مکمل نہیں ہے، اس کے لیے کشمیری عوام سے استصواب رائے کیا جانا چاہیے۔ اپنے اس موقف کی وجہ سے وہ ہندستان کے اکثریتی فرقہ کی نظر میں ایک غیر مطلوب شخصیت بنے ہوئے تھے۔ چنانچہ جب اعلان ہوا کہ وہ میرٹھ آرہے ہیں تاکہ مسلمانوں کے اجلاس کو خطاب کریں تو اکثریتی فرقہ کے انتہا پسند طبقہ میں اشتعال پیدا ہوگیا جو بالآخر فرقہ وارانہ فساد اور پولیس فائرنگ تک جا پہونچا۔

شیخ عبداللہ کو مسلم کانفرنس میں بلانے کا مقصد غالباً یہ تھا کہ ان کے نام پر بڑا مجمع اکٹھا ہوسکتا ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ شیخ عبداللہ کا نام سن کر بے شمار مسلمان جلسہ گاہ میں جمع ہوگیے۔ بھیڑ جمع کرنے کی یہ تدبیر آج مسلمانوں میں بہت زیادہ مقبول ہے۔ مزید یہ کہ اب اس فہرست میں بیرونی شخصیتوں کا بھی اضافہ ہوگیا ہے۔ تاہم اس قسم کی بھیڑ موجودہ حالات میں مسلمانوں کے لیے زہر ہے۔ یہ شخصی یا جماعتی مفاد کی خاطر پوری ملت کے مفاد کو قربان کرنے کے ہم معنی ہے۔ اس دنیا میں اُس سے زیادہ نادان کوئی شخص نہیں جو چُپ رہنے کے موقع پر بولے اور اخفار کے موقع پر اعلان کرے۔

میرٹھ کے لیے میرا دوسرا سفر جون ۱۹۷۹ میں ہوا۔ اس موقع پر وہاں میری چند تقریریں ہوئیں اور مختلف اہل علم سے ملاقاتیں ہوئیں۔

اس سفر کا ایک واقعہ اللہ اکبر (صفحہ ۹۰) میں درج ہے۔ ۳ جون ۱۹۷۹ کو میں اور مولانا شکیل احمد قاسمی (صدر مدرس مدرسہ امدادالاسلام) ایک رکشہ پر بیٹھے ہوئے جارہے تھے۔ ہم صدر بازار کی سڑک سے گزر رہے تھے کہ اچانک ہمارے سامنے کے مکان کا اگلا حصہ دھماکے کے ساتھ سڑک پر گر پڑا۔ ہمارا رکشہ اس مقام سے بمشکل چند گز کے فاصلہ پر تھا۔ یہ مکان اگر چند سکنڈ بعد گرتا تو یقیناً اس کا پورا ملبہ ہمارے اوپر آجاتا اور ہم دونوں کا سفرِ حیات اچانک اسی سڑک پر ختم ہوجاتا۔

یہ دنیا حادثات کی دنیا ہے۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو ہر آدمی کسی نہ کسی حادثہ کے عین کنارے کھڑا ہوا ہے۔ آدمی اور اس کی موت کے درمیان صرف چند سکنڈ کا فاصلہ ہے ـــــ انسان کی زندگی کتنی کم ہے، مگر بے خبر انسان اس کو کتنا زیادہ سمجھ لیتا ہے۔

میرٹھ کے لیے میرا تیسرا سفر جون ۱۹۸۷ میں ہوا۔ یہ سفر خاص طور پر میرٹھ کے فساد

کا جائزہ لینے کے لیے کیا گیا تھا۔ میرٹھ کا فساد محض ایک فساد نہیں، وہ ایک علامتی واقعہ ہے۔ اس کی روشنی میں ملک کی موجودہ صورت حال کو سمجھا جا سکتا ہے اور اس کا تجزیہ کرکے ہندستانی مسلمانوں کے لئے راہ عمل کی نشاندہی کی جا سکتی ہے۔

میرٹھ ہندستان کا ایک قدیم شہر ہے جو دہلی سے ۷۰ کیلومیٹر کے فاصلہ پر واقع ہے۔ میرٹھ میں انگریزوں کے زمانے سے بہت بڑی فوجی چھاؤنی ہے۔ میرٹھ کو سب سے زیادہ شہرت ۱۸۵۷ میں ہوئی جب کہ یہاں کی ہندستانی فوج کے کچھ سپاہیوں نے اپنے انگریز افسروں کے خلاف بغاوت کر دی اور اس کے بعد وہ واقعہ پیش آیا جس کو عام طور پر غدر (۵۹-۱۸۵۷) کہا جاتا ہے۔

انگریزوں نے اسی سال فوج میں نئے قسم کی رائفل کا استعمال شروع کیا تھا جس کو انفلیڈ رائفل (Enfield rifle) کہا جاتا ہے۔ اس رائفل میں کارتوس استعمال کیے جاتے تھے۔ ۲۴ اپریل ۱۸۵۷ کو جنرل اسمائتھ نے حکم دیا کہ میرٹھ کے سپاہیوں کو نئی رائفل کے استعمال کی تربیت دی جائے۔ مگر اسی زمانہ میں ان کارتوسوں کے بارہ میں ایک افواہ پھیل گئی۔ چنانچہ پانچ سپاہیوں کے سوا سب نے یہ کارتوس لینے سے انکار کر دیا۔ ان باغی سپاہیوں کی تعداد ۸۵ تھی جن میں ۴۹ مسلم تھے اور ۳۶ غیر مسلم۔ فوجی عدالت نے ان سپاہیوں کو قید بامشقت کی سزا دے کر جیل میں بند کر دیا۔

اس واقعہ کے بعد دیسی سپاہیوں کے درمیان شدید نفرت پھیل گئی۔ ۱۰ مئی ۱۸۵۷ کی شام کو جب گرجا گھر کا گھنٹہ بجا اور عیسائی افسران گرجا چلے گیے تو ہندستانی رسالے نے جیل کا دروازہ توڑ کر تمام قیدیوں کو آزاد کر دیا اور اعلان جنگ کرتے ہوئے دہلی کی طرف روانہ ہو گیے۔ میرٹھ میں بعض انگریز افسروں کے بنگلوں کو لوٹ لیا گیا اور بعض انگریزوں کو قتل کر دیا گیا۔

میرٹھ کے انقلابی سپاہی جب دہلی پہونچے تو یہاں بھی شورش پیدا ہو گئی۔ انھوں نے شہر پر "قبضہ" کر لیا۔ بہادر شاہ کے شہنشاہ ہندستان ہونے کا اعلان کر دیا گیا۔ اسی کے ساتھ بادشاہ کے ایک بیٹے کو انقلابی فوج کا سربراہ بنایا گیا۔ مگر بغاوت کو منظم کرنے کی صلاحیت نہ باپ میں تھی اور نہ بیٹے میں۔ مزید یہ کہ انقلابی فوج کے پاس وسائل کے نام سے کوئی چیز موجود نہ تھی۔ بھنے ہوئے چنے بھی میسر نہ تھے جن کو کھا کر سپاہی اپنی بھوک مٹا سکیں۔ نہ بہادر شاہ کے پاس کوئی

خزانہ تھا اور نہ ہی دہلی کے دولت مند لوگ ان کو قرض دینے کے لیے تیار تھے۔ ایسی حالت میں اس کا کوئی امکان ہی نہ تھا کہ یہ بغاوت کامیاب ہو۔

دوسری طرف انگریز کے پاس تنظیم بھی تھی اور وسائل بھی۔ اسی کے ساتھ انگریزوں نے جنید، پٹیالہ اور آس پاس کی سکھ ریاستوں سے امداد کی اپیل کی۔ سکھ چونکہ اورنگ زیب (۱۶۱۸ - ۱۷۰۷) کے زمانہ سے مسلمانوں سے بیزار تھے، وہ فوراً انگریزوں کا ساتھ دینے پر راضی ہو گئے۔ یہ دراصل سکھ ہی تھے جنھوں نے انگریزوں کے ساتھ دہلی پر حملہ آور ہو کر لال قلعہ پر انگریزوں کو قبضہ دلوایا۔

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) نے لکھا ہے کہ جب ہندستان میں ۱۸۵۷ کی بغاوت ہوئی تو پنجاب کا صوبہ انگریزوں کا وفادار رہا۔ سکھوں نے اس بغاوت کو فرو کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ اس وفاداری کی بھاری قیمت سکھوں کو ملی۔

اس کے بعد انگریزی حکومت نے سکھوں کو زمینیں دیں۔ انگریزی فوج میں سکھوں کا تناسب بڑھا دیا گیا۔ ایک ضابطہ منظور کیا گیا جس کے تحت سکھ فوجیوں کو یہ آزادی تھی کہ وہ خالصہ روایات پر عمل کر سکیں۔ پنجاب میں نہروں کا وسیع نظام قائم کیا گیا جس کے نتیجہ میں سکھوں کی ریاست پنجاب میں ایسی خوش حالی آئی جو اب تک اس علاقہ میں دیکھی نہیں گئی تھی۔ سکھوں کے ساتھ انگریزوں کا معاملہ نہایت فیاضانہ رہا۔ پنجاب میں یہ حال ہوا کہ انیسویں صدی کے خاتمہ پر اگرچہ سکھوں کی تعداد صرف ۱۲ فی صد تھی مگر وہ صوبہ کی مال گزاری کا ۲۵ فی صد حصہ ادا کر رہے تھے۔ اور مال گزاری اور پانی کا ٹیکس ملا کر سرکاری مالیہ میں ان کا حصہ ۴۰ فی صد تھا۔ پہلی جنگ عظیم کے وقت برطانی فوج میں سکھوں کی تعداد ۲۰ فی صد تھی (جلد ۱۶، صفحہ 745)

۱۸۵۷ میں جو واقعہ میرٹھ میں پیش آیا اس میں ایک پہلو شوشہ کا تھا، اور دوسرا پہلو وہ تھا جو حقیقی تھا۔ مسلمان واقعہ کے اصل پہلو پر دھیان نہ دے سکے، وہ شوشہ والی بات میں الجھ کر رہ گئے۔

ابتدائی زمانہ میں بندوقیں اور رائفلیں غیر توڑے دار ہوتی تھیں۔ ان کو منھ کی طرف سے بھری جانے والی (Muzzle-loader) رائفل کہا جاتا تھا۔ اس طریقہ میں گولی کو رائفل کی نالی کے آخری سرے سے ڈال کر گز کے ذریعہ اندر داخل کیا جاتا تھا۔ یہ طریقہ دشوار طلب تھا اور اس میں

تیز رفتار فائرنگ ممکن نہ تھی۔ انیسویں صدی عیسوی کے وسط میں پہلی بار وہ بندوقیں اور رائفلیں بنائی گئیں جن کو توڑے دار (Breech-loader) رائفل کہا جاتا ہے۔ ان رائفلوں میں کارتوس استعمال ہوتے تھے جو کندا اور نالی کے درمیان رائفل کو توڑ کر بھرے جاتے تھے۔ ان رائفلوں کو عام طور پر انفیلڈ رائفل (Enfield rifle) کہا جاتا ہے۔

یہ رائفل کی دنیا میں ایک انقلابی واقعہ تھا۔ اس وقت دہلی کی سلطنت قائم تھی۔ ملک میں متعدد مسلم ریاستیں موجود تھیں۔ مگر کسی نے بھی یہ غور کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی کہ اس نئی دریافت کو سمجھا جائے جو مشرق اور مغرب کے درمیان فوجی توازن کو توڑ دینے کے ہم معنی ہے۔ البتہ ایک معمولی سی بات پر ایک ایسا ہنگامہ کھڑا کر دیا گیا جس کا بدترین خمیازہ سب سے زیادہ خود مسلمانوں کے حصہ میں آیا۔

انفیلڈ رائفل میں ابتداءً جو کارتوس استعمال ہوتے تھے ان میں برائے ضرورت گریز (Grease) لگی ہوئی ہوتی تھی۔ یہ گریز حیوانی چربی سے تیار کی گئی تھی۔ ان کارتوسوں کو استعمال کرنے سے پہلے انھیں کھولنا پڑتا تھا۔ اس کی ایک آسان صورت (نہ کہ واحد صورت) یہ تھی کہ ان کو دانت سے کاٹ کر کھولا جائے۔ اس طرح لوگوں کو ایک شوشہ مل گیا۔ یہ مشہور کیا گیا کہ یہ گریز سور اور گائے کی چربی سے بنائی گئی ہے اور ان کو فوج میں اس لیے رائج کیا گیا ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کو بے دین (ادھرم) بنا دیا جائے۔ اب فوجیوں کے لیے ضروری ہو گیا کہ وہ اپنے دھرم اور مذہب کو بچانے کے لیے بغاوت کر دیں۔

کارتوس کے بارہ میں مذکورہ افواہ کتنی سخت ثابت ہوئی، اس کا ذکر مسٹر اچیسن (Atchison) نے ان الفاظ میں کیا ہے کہ اس آتش گیر مادہ پر کارتوس کی مبالغہ آمیز کہانی اس طرح گری جیسے سوکھی لکڑی پر آگ کی چنگاری گرے، اور پورا ملک ستلج سے لے کر نرمدا تک جل اٹھا:

> On this inflammable material, the too true story of the cartridges fell as a spark on dry timber, and the whole country from the Sutlej to the Narmada was ablaze.

غور کیجیے تو اسی ایک واقعہ میں ملت کی پچھلے ڈیڑھ سو سال کی کہانی چھپی ہوئی ہے۔ اس مدت میں مسلمانوں نے لاتعداد طوفانی تحریکیں چلائیں۔ مگر سب کا خلاصہ یہ تھا کہ لوگوں کو شوشہ والا

پہلو تو مبالغہ کے ساتھ نظر آیا۔ مگر واقعہ کا جو اصلی اور حقیقی پہلو تھا اس کو دیکھنے سے وہ مدنی صد قاصر رہے۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی بربادی کی واحد وجہ ان کے اصاغر و اکابر کی یہی غفلت ہے نہ کہ سازش کی وہ کہانیاں جو ہم نے بطور خود گھڑ رکھی ہیں تاکہ اپنی بربادی کی ذمہ داری دوسروں کے اوپر ڈال سکیں۔

میرٹھ کے فسادات کے بارہ میں اردو اور انگریزی اخبارات میں بہت کچھ پڑھ چکا تھا۔اب میں نے فیصلہ کیا کہ میں خود وہاں جاؤں، واقعات کو اپنی آنکھ سے دیکھوں اور لوگوں سے براہ راست معلومات حاصل کروں۔

۲۸ جون ۱۹۸۷ کی صبح کو میں ساڑھے تین بجے بستر سے اٹھ گیا۔ وضو کر کے دو رکعت نماز پڑھی۔ پہلی رکعت میں سورہ والضحیٰ اور دوسری رکعت میں سورہ الم نشرح کی تلاوت کی۔ نماز کے بعد دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے تو میری زبان سے نکلا : خدایا، میرے اس سفر کو اپنی مرضی کا سفر بنا دیجئے۔ یہی احساس لے کر میرٹھ کے لئے روانہ ہوا۔ راستہ میں بھی یہی دعائیں نکلتی رہیں کہ میرا یہ سفر میرے لئے سفر حق بن جائے۔ ۲۸ جون کی صبح کو میں دہلی سے روانہ ہوا۔ میرے ساتھ مزید حسب ذیل افراد تھے:

رئیس الاسلام میرٹھی، ایم اے، ایل ایل بی (پیدائش ۱۹۴۸)

محفوظ علی خاں، ایم اے (پیدائش ۱۹۵۴)

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں (پیدائش ۱۹۵۹)

ڈیڑھ گھنٹہ جی ٹی روڈ پر سفر کرنے کے بعد ہم منزل پر پہنچے۔ "یہ میرٹھ ہے" میرے ساتھی نے کہا اب دونوں طرف عمارتیں نظر آنے لگیں۔ ہم کئی میل تک میرٹھ کے اندر چلتے رہے۔ مگر وہ فساد زدہ میرٹھ نظر نہیں آیا جس کی تصویریں اخباروں میں دیکھی تھیں۔ یہاں تک کہ ہم ان علاقوں میں پہنچے جو فساد کے دوران جلائے اور پھونکے گئے تھے۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ کیا وجہ ہے کہ بڑی بڑی سرکاری شخصیتیں میرٹھ آتی ہیں مگر وہ اس سے حقیقی تاثر لئے بغیر واپس چلی جاتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فساد زدہ حصہ کمیت کے اعتبار سے کل میرٹھ کا بہت تھوڑا حصہ ہے۔ اب ایک شخص اگر دہلی کا پڑھے آئے اور مجموعی میرٹھ پر طائرانہ نظر ڈال کر چلا جائے تو وہ اپنے مشاہدہ کی نسبت سے اصل واقعہ کا اتنا کم تاثر لے گا کہ واپس پہنچتے پہنچتے وہ اس کے ذہن میں ایک دھندلی یاد سے زیادہ باقی نہ رہے ——

اخباری میرٹھ اور رحیلی کا پڑھوالے میرٹھ میں کتنا زیادہ فرق ہے۔

میرٹھ پہنچ کر میں نے ان مقامات کو دیکھا جو اپریل اور مئی کے فسادات میں متاثر ہوئے ہیں۔ شہر کے بہت سے لوگوں سے ملاقاتیں کیں، جن میں ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی۔ عوام بھی تھے اور اعلیٰ مناصب کے لوگ بھی۔ میں نے ان لوگوں سے کہا کہ میرٹھ میں جو کچھ ہوا اس کی روداد میں اردو اور انگریزی اخبارات میں کافی تفصیل سے پڑھ چکا ہوں۔ یہاں میں نے اپنی آنکھوں سے بھی ان کو دیکھ لیا ہے۔ اسی طرح "کیا ہوا" کے بارہ میں میں کافی جان چکا ہوں۔ اب میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھے "کیوں ہوا" کے بارہ میں بتائیں۔ مگر تجربہ سے معلوم ہوا کہ تمام جاننے والے یہی بات نہیں جانتے۔ یہاں کے لوگ بس "کیا ہوا" کو جانتے ہیں اور باہر سے آنے والے لوگ بھی کیا ہوا کو دیکھ کر چلے جاتے ہیں۔ "کیوں ہوا" سے نہ مقامی لوگوں کو دلچسپی ہے اور نہ باہر سے آنے والوں کو۔

میرٹھ کی کہانی اجودھیا کی بابری مسجد کی کہانی سے شروع ہوتی ہے۔ بابری مسجد۔ رام جنم بھومی جھگڑا آزادی (۱۹۴۷) کے پہلے سے چلا آرہا تھا۔ عدالت نے ایک حکم کے تحت ۱۹۴۹ میں اس میں تالا لگا دیا گیا۔ ابھی مقدمہ چل رہا تھا کہ ضلع جج فیض آباد کے حکم سے پولیس نے یکم فروری ۱۹۸۶ کو بابری مسجد کا تالا کھول دیا۔ اس کے بعد مسجد عملاً ہندو فرقہ کے قبضہ میں چلی گئی۔

اب ایک صورت یہ تھی کہ مسلمان اس معاملہ کو عدالت اور گفت وشنید کے دائرہ میں رکھ کر اپنی مہم جاری رکھیں۔ مگر مسلمانوں کے نام نہاد لیڈر نہایت بے تابانہ طور پر اس کو سڑک پر لے آئے۔ مسلم اخبارات نے دھواں دھار مضامین شائع کرنا شروع کر دیا۔ سارے ملک میں پرجوش تقریریں کر کے مسلمانوں کے خون کو اس مسئلہ پر گرما دیا گیا۔ اس کے بعد "بابری مسجد ایکشن کمیٹی" کے فیصلہ کے مطابق اولاً ۲۶ جنوری ۱۹۸۷ کا بائیکاٹ کرنے کا اعلان کیا گیا۔ بعد کو اسے واپس لے لیا گیا اور اس کے بجائے ۳۰ مارچ ۱۹۸۷ کو دہلی میں بابری مسجد کے نام پر مسلمانوں کی احتجاجی ریلی نکالی گئی۔ کہا جاتا ہے کہ دہلی اور اطراف دہلی کے تقریباً ۵ لاکھ مسلمان بوٹ کلب (نئی دہلی) میں جمع ہوئے۔ وہاں مسلم لیڈروں نے ان کے سامنے دھواں دھار تقریریں کیں۔ اس کے بعد مسلمانوں میں جوش وخروش کا ایک لاوا ابل پڑا۔ وہ ریلی سے اس طرح لوٹے جیسے انھوں نے ہندستان کو دوبارہ فتح کر ڈالا ہو۔

یہ ریلی یقینی طور پر محض ایک وقتی بھیڑ تھی۔ مگر نادان مسلمانوں نے اس کو "بے نظیر اتحاد" کے

ہم معنی سمجھ لیا۔ اس کے لئے حد درجہ مبالغہ آمیز الفاظ بولے جانے لگے۔ ریلی کے موقع پر مسلم لیڈروں نے جو باتیں کہیں یا اس کے بعد مسلم اخباروں نے جو سرخیاں لگائیں، ان میں سے چند یہ ہیں:

مسلمانوں کے بے مثال مظاہرے سے انڈیا گیٹ لرز اٹھا۔

۵ لاکھ فرزندان توحید کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر: مسلمانوں کی تاریخ کا نیا موڑ

اللہ اکبر کے فلک شگاف نعروں سے پارلیمنٹ کے درودیوار تھرا اٹھے

بابری مسجد اشو نے مسلمانوں کو متحد کرکے انھیں ناقابل تسخیر بنا دیا ہے

اب ہمیں طاقت کے بل پر اپنے مطالبات کو منوانا ہے

ہندستان کا مسلمان جاگ اٹھا، اب وہ کسی سے دبنے والا نہیں

انصاف نہ ہوا تو ہم دشمنان اسلام کے قلعہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے۔

حکومت کے رویہ نے سوئے ہوئے شیروں کو جگا دیا

"بابری مسجد واپس کرو" کے نعروں کی زد میں آکر فضا کے ہیلی کاپٹر اپنا توازن کھو بیٹھے

مسلمانوں نے اپنی طاقت کو ازسرنو دریافت کرلیا ہے۔

نام نہاد مسلم لیڈروں نے بابری مسجد کے نام پر فضا میں جو اشتعال پیدا کیا اسی کا براہ راست نتیجہ میرٹھ کا فساد تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس فساد کی مکمل ذمہ داری مسلم لیڈروں پر ہے، مگر انھوں نے نہایت ہوشیاری کے ساتھ اس کو ہندو فرقہ پرستوں یا انتظامیہ کے سر پر ڈال دیا ہے۔

بابری مسجد کی ریلی میں زیادہ تر یوپی کے لوگ تھے۔ خاص طور پر میرٹھ کے لوگ اس میں بڑی تعداد میں شریک ہوئے۔ اور ذہنی طور پر تو میرٹھ کے تقریباً تمام مسلمان اس مہم میں شریک تھے۔ میرٹھ کے ایک مسلمان نے کہا کہ اگر سواری کی رکاوٹیں نہ ہوتیں تو میرٹھ سے کم ازکم پچاس ہزار مسلمان اس ریلی میں جاتے۔ ایک ہندو نے کہا کہ "میرٹھ کا مسلمان بابری مسجد کے معاملے میں بہت زیادہ سہوگ دیتا ہے"۔

ان مسلمانوں نے ریلی کو دیکھ کر اپنی طاقت کا احمقانہ حد تک غلط اندازہ لگایا۔ بوٹ کلب پر مسلمانوں کی بھیڑ اور مسلم مقررین کی پرجوش تقریروں اور مسلم اخبارات کی مبالغہ آمیز سرخیوں سے وہ بھڑک اٹھے۔ ریلی کے بعد مسلمان اس احساس کے ساتھ اپنے گھروں کو لوٹے کہ اب انھیں

دب کر نہیں رہنا ہے بلکہ طاقت کے زور پر اپنے حقوق کو منوانا ہے۔ اس کے بعد مسلمان کھلم کھلا سکھوں والا طریقہ اختیار کرنے کی بات کرنے لگے۔ حتی کہ میرٹھ میں ایک شخص پیدا ہو گیا جو فخر کے ساتھ کہتا تھا کہ میں مسلمانوں کا بھنڈراں والا ہوں۔

ایم جے اکبر (ٹیلی گراف) نے لکھا ہے کہ میرٹھ میں ایک ۳۰ سالہ مسلمان نے اپنے بارہ میں یہ مشہور کیا کہ وہ مسلمانوں کا بھنڈراں والا ہے۔ اسی نام سے پکارنے میں اس کو ذہنی تسکین ملتی ہے۔ جب بابری مسجد کا تنازعہ شروع ہوا تو اس شخص نے مسلم نوجوانوں کو "مارنا ہے یا مرجانا ہے" کے نعروں پر منظم کرنا شروع کیا۔ اکثر اوقات وہ اپنی تقریروں میں یہ اعلان کرتا رہتا تھا کہ "ایک کرور سردار ہیں اور ان کو سنبھالنا مشکل ہو رہا ہے، پھر راجیو گاندھی ۲۰ کرور مسلمانوں کو کس طرح سنبھالیں گے۔"

اشتعال انگیزی کی یہ سیاست بوٹ کلب نئی دہلی پر بابری مسجد کی ریلی سے شروع ہوئی۔ اس ریلی میں یہاں تک کہا گیا کہ فریق ثانی کو ہندستانی مسلمانوں کے غصہ کے نتائج سے باخبر رہنا ہوگا۔

میرٹھ میں مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ پیش آیا اس کو مسلمانوں کے لیڈر پولیس اور حکومت کے خانہ میں ڈالنا چاہتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ وحشیانہ معاملہ تمام کا تمام خود مسلم لیڈروں کے خانہ میں جاتا ہے۔ کیوں کہ انھیں کی بدتدبیری کا یہ نتیجہ تھا جو مسلمانوں کو بھگتنا پڑا۔ بابری مسجد کے نام پر انھوں نے اشتعال انگیز سیاست کا جو طریقہ اختیار کیا، یہ صرف اس کا ردعمل تھا اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ مسلم لیڈروں نے فریق ثانی کو بھڑکا کر مسلم عوام کے اوپر گولی چلوا دی۔ اور جب خود گولی کھانے کا وقت آیا تو وہ خاموش ہو کر بیٹھ گئے۔

میرٹھ کے مصیبت زدگان میں بڑی تعداد ان مزدوروں کی تھی جو بہار سے تعلق رکھتے تھے۔ بہار کے بہت سے مزدور جن کو محلہ الملیان سے پکڑ کر فتح گڑھ جیل لے جایا گیا تھا، ان کے بیان کے مطابق پولیس نے تھانہ میں ان لوگوں پر لاٹھیاں برسائیں۔ جیل کے اندر قیدیوں سے بھی انھیں پٹوایا گیا۔ اس وحشیانہ مار پیٹ میں کئی آدمیوں کی موت واقع ہو گئی۔ ان بہاری حضرات نے بتایا کہ پولیس انھیں مارتے ہوئے یہ کہتی تھی:

لو بابری مسجد، بلاؤ اپنے لیڈروں کو، دیکھیں تمیں کون بچاتا ہے۔

یہ الفاظ بتاتے ہیں کہ وہ کیا چیز تھی جس نے انھیں غضب ناک بنایا اور وہ وحشیانہ انتقام پر اتر آئے (نقیب ۲۰ جولائی ۱۹۸۷)

ان اسباب کے نتیجہ میں شمالی ہند، خاص طور سے یوپی میں سخت فرقہ وارانہ تناؤ کی فضا پیدا ہوگئی۔ مسلمانوں نے (اور اسی طرح ہندوؤں نے بھی) باقاعدہ "تیاریاں" شروع کر دیں۔ تاکہ موقع آنے پر ایک فریق دوسرے فریق کے خلاف کارروائی کرسکے۔ اس بارود میں چنگاری لگنے کا پہلا واقعہ ۱۴ اپریل ۱۹۸۷ کو میرٹھ میں پیش آیا۔

ڈاکٹر ہرپال سنگھ سے ایک انٹرویو میں سوال کیا گیا کہ فساد کی اصل ذمہ داری کس پر ہے۔ انھوں نے جواب دیا "اصل ذمہ دار رام جنم بھومی۔ بابری مسجد تنازعہ ہے۔ ایک جانب بابری مسجد ایکشن کمیٹی کے پلیٹ فارم سے بھڑکیلی تقریریں کی جاتی ہیں۔ دوسری طرف اخبارات میں مسلسل ایسے مضامین چھاپے جاتے ہیں جن میں ماضی میں مسلمانوں کے ذریعہ ہندوؤں پر ظلم وستم کارونا رویا جاتا ہے۔ اس سے تناؤ بڑھتا ہے۔ لیکن حکومت روک تھام کے لئے کچھ بھی نہیں کرتی" (افکار ملی یکم جون ۱۹۸۷ صفحہ ۲۲-۲۱)

مشتاق احمد رامپوری (عمر ۷۰ سال) سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ ۱۴ اپریل ۱۹۸۷ کو میں میرٹھ کے اس جلسہ میں موجود تھا جہاں سے فساد کے پہلے مرحلہ کا آغاز ہوا۔

ان کے بیان کے مطابق جو صورت واقعہ ہے وہ یہ ہے کہ ۱۴ اپریل کو شاہ پیر گیٹ کی سڑک پر مسلمانوں کا جلسہ تھا۔ یہ جلسہ شب برات کے سلسلہ میں منعقد کیا گیا تھا۔ جلسہ گاہ کے سامنے مین سڑک ہے اور اس سڑک کے دوسری طرف ایک چھوٹا سا مندر ہے۔ یہ مندر لودھوں والی گلی میں ہے۔ لودھے لوگ اس دن مندر میں اپنی کوئی تقریب منا رہے تھے اور ریکارڈنگ کر رہے تھے۔ اس کی تیز آواز مسلمانوں کے جلسہ تک پہنچ رہی تھی۔

مسلمانوں کو محسوس ہوا کہ اس ریکارڈنگ سے ان کے جلسہ میں خلل پڑ رہا ہے۔ چنانچہ کچھ مسلم نوجوان وہاں گئے اور ان سے کہا کہ تم اپنا لاؤڈ اسپیکر بند کر دو یا اس کی آواز کم کر دو۔ انھوں نے کہا کہ تم ہی کرلو، ہم کیوں کریں۔ اس پر بات بڑھی۔ مسلمان غصہ میں آگئے۔ انھوں نے لودھوں کے لاؤڈ اسپیکر کو توڑ ڈالا اور انھیں مارنے پیٹنے لگے۔ شور سن کر جلسہ کے اور لوگ بھی وہاں پہنچ گئے۔ انھوں نے بھی مار پیٹ

میں حصہ لیا۔ انھوں نے لودھیوں کی ایک قریب کی ٹال میں آگ لگادی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ کے سفر میں لوگوں کو نعرۂ تکبیر بلند آواز کے ساتھ کہنے سے منع فرمادیا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پیغمبر اسلام نے نازک مواقع پر "اللہ اکبر" کی دھوم بھی نہیں مچائی جو ایک ثابت شدہ اسلامی عمل ہے۔ اور موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ انتہائی نازک موقع پر شب برات کی دھوم مچاتے ہیں، حالاں کہ دین میں شب برات کی سرے سے کوئی اہمیت نہیں۔ اس کے بعد اگر فساد ہوتا ہے تو مسلمانوں کو دوسروں کی نہیں خود اپنی شکایت کرنا چاہئے۔

میرٹھ میں جو فساد ہوا اس کے دو مرحلے تھے۔ ایک وہ جو ۱۴ اپریل ۱۹۸۷ کو پیش آیا۔ دوسرا وہ جو ۱۸ مئی ۱۹۸۷ کو شروع ہوا۔ پہلا فساد شاہ پیر گیٹ سے شروع ہوا تھا، چنانچہ میرٹھ میں داخل ہونے کے بعد سب سے پہلے ہم اس مقام پر گئے۔ یہاں ہم مندر والوں سے بھی ملے تاکہ معلوم کریں کہ اس بارہ میں ان کا نقطہ نظر کیا ہے۔ جب ہم وہاں پہنچے تو اس وقت مندر کا دروازہ بند تھا۔ اس کے سامنے کے چبوترہ پر چند ہندو صاحبان بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم نے ان سے مذکورہ واقعہ کے بارے میں سوالات کئے۔ مگر انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ انھوں نے کہا کہ اس کے بارے میں آپ کو ڈاکٹر جین بتائیں گے۔

ڈاکٹر جین کا مطب سڑک پر شاہ پیر گیٹ کے سامنے ہے۔ مگر اس وقت ان کا مطب بند تھا۔ دن میں کئی بار ہم وہاں گئے تاکہ ان سے گفتگو کریں مگر ہر بار ان کا مطب بند پایا۔

مندر والوں سے یا ڈاکٹر جین سے اگرچہ براہ راست معلومات نہ ہو سکی تاہم اس واقعہ میں ہمارے لئے ایک بہت بڑا سبق تھا۔ "مندر والوں" نے اپنا ایک ترجمان بنالیا ہے۔ خود جواب دینے کے بجائے وہ ہر ایک سے یہ کہتے ہیں کہ جاکر ان سے پوچھو۔ اس کے برعکس آپ مسجد میں چلے جائیں تو ہر "مسجد والا" یہ چاہے گا کہ سب سے پہلے وہی بولے۔

۱۴ اپریل کو جو فساد شروع ہوا اس کو مقامی انتظامیہ نے چند دن کے اندر کنٹرول کرلیا۔ تاہم دونوں فریقوں کی طرف تناؤ باقی رہا۔ میرٹھ میں پرنسپل نایاب زیدی نے بتایا کہ رمضان کے مہینہ میں ہماری ملاقات جس ہندو یا مسلمان سے ہوئی وہ یہ کہتا ہوا سنائی دیا کہ "پھر جھگڑا ہونے والا ہے" لوگوں کے بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالباً ہر کمیونٹی کو احساس تھا کہ پچھلے فساد میں اس کا نقصان زیادہ

نقصان ہوا ہے، اس لئے دوبارہ اس کا بدلہ لینا ہے۔

افواہیں اور لیڈروں کی تقریریں اور اخبارات کے سنسنی خیز مضامین جذبات کو بھڑکاتے رہے۔ مئی کے تیسرے ہفتہ میں چند اشتعال انگیز واقعات ہوئے۔ یہاں تک کہ ۱۸ مئی کو دوسری بار شدید تر انداز میں فساد کا طوفان ابل پڑا۔

دہلی روڈ کے مسٹر سلیم بھارتی (عمر ۵۰ سال) نے دوسرے مرحلہ میں شروع ہونے والے فساد کے بارہ میں بتایا کہ ۱۶ مئی ۱۹۸۷ کو چھیپی واڑہ میں ایک پٹاخہ (بقول بعض دستی بم) پھٹا۔ یہ پٹاخہ (یا بم) شیعہ امام باڑہ میں پھٹا تھا۔ مسلمانوں نے کہا کہ یہ پٹاخہ (یا بم) ہندو کی طرف سے پھینکا گیا ہے۔ ہندوؤں نے کہا کہ یہ خود مسلمانوں کی کارروائی ہے۔ اگلے دن پھر یہی واقعہ ہوا۔ یعنی پٹاخہ (یا دستی بم) دوبارہ اسی مقام پر پھٹا۔

انھوں نے بتایا کہ اسی چھیپی واڑہ میں ایک پراپرٹی ہے جس کا مالک مسلمان ہے اور ہندو اس کا کرایہ دار ہے۔ دونوں میں کرایہ دار اور مالک کا جھگڑا چل رہا تھا۔ کرایہ دار کا چھوٹا بھائی اجے شرما اگلے دن اپنے بھائی سے ملنے کے لئے آیا۔ جب وہ واپس ہوا تو کسی نے اس کو گولی مار دی (ایک روایت ہے کہ یہ گولی مالک مکان نے ماری)، اجے شرما اپنے اسکوٹر پر بھاگا۔ وہ قینچی والان میں پہنچا جو مسلمانوں کا محلہ ہے۔ مسلمانوں نے اس کو خون آلود حالت میں دیکھا تو انھوں نے سمجھا کہ یہی وہ شخص ہے جس نے امام باڑہ میں دو دن پٹاخہ (یا بم) پھینکا ہے۔ آج بھی وہ اسی طرح پھینک رہا تھا مگر وہ خود زخمی ہو گیا۔

یہ ایک نازک موقع تھا۔ اس وقت اگر مسلمان اجے شرما کو فرسٹ ایڈ پہنچاتے تو یقیناً میرٹھ کی تاریخ دوسری ہوتی۔ مگر انھوں نے اس کے برعکس عمل کیا۔ انھوں نے زخمی اجے شرما کو پکڑ کر مارنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ پولیس آگئی اور وہ اجے شرما کو اپنے ساتھ لے گئی۔ مگر اجے شرما اسپتال پہنچ کر مر گیا۔

اجے شرما کو فرسٹ ایڈ پہنچانے کی صورت میں یہ ہوتا کہ شہر میں مسلمانوں کی شرافت اور انسانیت کی خبر گونجتی۔ مگر دوسری صورت میں شہر کے اندر مسلمانوں کے ظلم کی خبر گونجی۔ اس کے لازمی نتیجہ کے طور پر شہر میں سخت تناؤ پھیل گیا۔ اسپتال کے پاس مسلمانوں کے کچھ کھوکھے تھے، ان کو ہندوؤں کے ایک

مشتعل مجمع نے جلادیا۔ اس کے بعد مسلمانوں نے ہندوؤں کی دکانوں پر حملہ کیا۔ آخر میں پولیس آئی اور اس نے وہ سب کچھ کیا جس کی خبریں تفصیل کے ساتھ اخبارات میں آچکی ہیں۔ یہ ناخوشگوار واقعہ ۱۸ امئی ۱۹۸۷ کو پیش آیا۔

مسٹر بھارتی نے بتایا کہ اس کے بعد گذری بازار میں ایک میٹنگ تھی جس میں مجسٹریٹ اور پولیس افسران شریک تھے۔ مسلمانوں نے اس موقع پر کہا کہ ہمارا محلہ جھگڑالو محلہ نہیں ہے۔ یہاں کبھی کچھ نہیں ہوا۔ ہم تو امن کے ساتھ مل جل کر رہتے ہیں۔ اس پر ایک پولیس افسر نے کہا: "اجے شرما کا قتل کرکے سو ئچ کو آن تو آپ ہی لوگوں نے کیا ہے"۔ واضح ہو کہ گذری بازار اور قینچی والان دونوں بالکل ملے ہوئے محلے ہیں۔

اسی روز رات کو سحری کے وقت پولیس محلہ ہاشم پورہ میں داخل ہوگئی۔ وہ گھروں کی تلاشی لے کر ہتھیار برآمد کرنا چاہتی تھی۔ جب یہ خبر پھیلی کہ ہاشم پورہ اور الماس (مسلم محلہ) میں پولیس داخل ہوگئی ہے اور سختیاں کر رہی ہے تو محلہ کے امام نے مسجد کے لاؤڈ اسپیکر پر "جہاد" کی تقریر شروع کردی۔ "حضرات، پی اے سی نے ہم پر حملہ کر دیا ہے۔ آپ لوگ مقابلہ کے لئے اپنے گھروں سے باہر آجائیں"۔ اس قسم کی تقریروں کے نتیجہ میں آس پاس کی آبادیوں سے بہت سے مسلمان نکل آئے۔ انھوں نے ہندو علاقوں پر حملہ کر دیا۔ امام نے پولیس سے "دفاع" کے لئے پکارا تھا، انھوں نے غیر متعلق ہندوؤں پر "ہجوم" کر دیا۔

یہاں انھوں نے ہندوؤں کی گاڑیاں جلائیں۔ ان کی دکانوں اور شوروموں پر حملے کئے۔ ہاپوڑ روڈ اور ریلو کھڑی پر ہندوؤں کی بہت سی فیکٹریاں تباہ کر دیں۔ اس جنون کے وقت انھوں نے شہر کے ایک نہایت قیمتی شخص ڈاکٹر پربھات سنگھ پر تیل چھڑک کر آگ لگادی۔ وہ وہیں سڑک پر مرگئے۔ اس دوران افواہ پھیلی کہ مسلمانوں نے اسٹیٹ بنک کالونی (ایک ہندو آبادی) کو تباہ کر دیا ہے۔ اس سے ہندوؤں میں مزید اشتعال پیدا ہوا۔ انھوں نے شاستری نگر وغیرہ میں مسلمانوں کے ساتھ وہی کام شدید تر انداز میں کرنا شروع کیا جو مسلمانوں نے ہندو علاقہ میں کیا تھا۔

مسٹر پدم روشا (سابق ڈائرکٹر جنرل آف پولیس) کا ایک مضمون انگریزی اخبار

انڈین اکسپریس (۳۰ جون ۱۹۸۷) میں شائع ہوا ہے۔ یہ ایک بہت منصفانہ مضمون ہے۔ انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اس میں سے ایک بات یہ ہے کہ فرقہ وارانہ جھگڑوں میں عملی طور پر سب سے زیادہ دخل دو چیزوں کا رہا ہے۔ ایک جلوس اور دوسرے لاؤڈ اسپیکر۔ جلوس کے بارہ میں انھوں نے لکھا ہے کہ انسانوں کے متحرک ہجوم کو دونوں فریق نہایت آسانی سے مظاہرۂ طاقت (Show of strength) کے ہم معنی سمجھ لیتے ہیں۔ یہی معاملہ لاؤڈ اسپیکر کا ہے۔ ایک پُرجوش مقرر کی آواز عام حالات میں صرف اس کے قریبی افراد تک پہنچ سکتی تھی، مگر لاؤڈ اسپیکر کے ذریعہ اس کی گونج پوری بستی کے لئے چیلنج بن جاتی ہے۔

راقم الحروف کو مسٹر پدم روشا کی بات سے صد فی صد اتفاق ہے۔ میں مسلمانوں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ جلوس اور لاؤڈ اسپیکر دونوں کو یک طرفہ طور پر اور رضاکارانہ طور پر بالکل ترک کر دیں۔ اور اگر فریق ثانی جلوس نکالتا ہے تو اس سے تعرض نہ کریں۔ عرب ممالک میں آج یہ دونوں چیزیں مکمل طور پر ممنوع ہو چکی ہیں۔ اور وہاں کے مسلمان، مقامی اور غیر مقامی دونوں، اس ممانعت کو پوری طرح تسلیم کئے ہوئے ہیں۔ یہی طریقہ وہ ہندستان میں بھی اختیار کر لیں۔ اس کے بعد سارے جھگڑے اپنے آپ ختم ہو جائیں گے۔ اور ہمیں وہ وقفۂ تعمیر مل جائے گا جس کی آج کے مسلمانوں کو سب سے زیادہ ضرورت ہے۔

میرٹھ کے فساد پر جن اخبارات نے براہ راست اور غیر جانبدار رپورٹیں شائع کیں، ان میں سے ایک ممتاز نام ہندی ہفت روزہ "چوتھی دنیا" کا ہے۔ چوتھی دنیا (۳۱ مئی ۱۹۸۷) کی ایک رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ ۲۲ مئی کو ہاشم پورہ محلہ میں دو بجے دن میں پی اے سی کے پانچ چھ ٹرک پہنچے۔ ان کے ساتھ کچھ ٹرکوں میں فوجی جوان بھی تھے۔ انھوں نے محلہ کی تلاشی لے کر تقریباً ڈیڑھ سو جوانوں کو ٹرک میں بھرا اور پھر لے کر روانہ ہو گئے۔ یہ ٹرک تیزی سے چل کر مراد نگر کے کنارے بہنے والی گنگا نہر کے پل پر رکے۔ تب تک رات کے تقریباً آٹھ بج چکے تھے۔ یہیں ایک ٹرک میں بھرے دو درجن نوجوانوں کو کھڑا کر کے سامنے سے گولی ماردی گئی اور ان کی لاشیں نہر میں پھینک دی گئیں۔ اس کے بعد ٹرک پھر تیز رفتاری کے ساتھ چلے۔ تقریباً ساڑھے نو بجے رات کو مکن پور کے پاس ہنڈن نہر کے پل کے پاس باقی نوجوانوں کو لائن میں کھڑا کر کے گولی ماری گئی اور انھیں نہر

میں ڈال دیا گیا۔ یہ سب ہاشم پورہ کے مزدور مسلمان تھے۔

یہ قتل عام کیوں ہوا۔ اس کے بارہ میں چوتھی دنیا کے نامہ نگار نے میرٹھ جاکر تحقیقات کی تو قتل عام کی وجہ بھی سامنے آگئی۔ ہوا یہ کہ ۲۱ مئی کو مسلم اکثریتی علاقہ ہاشم پورہ کی ایک گلی سے چلی گولی سے سورج کنڈ کے ایک نوجوان پربھات کوشک (۲۴ سال) کی موت ہوگئی۔ پربھات کوشک شہر کے بااثر شہری اور بھارتیہ جنتا پارٹی کی ریاستی یونٹ کی سکریٹری شکنتلا کوشک کا بھانجا تھا۔ گولی چلنے کے اس واقعہ میں شکنتلا کوشک کا بیٹا اتیج بھی زخمی ہوا تھا۔ مرنے والے پربھات کا ایک بھائی ستیش چندر میرٹھ چھاؤنی میں ہی فوج میں میجر کے عہدے پر ہے۔ جب اسے بھائی کی موت کی اطلاع ملی تو وہ بوکھلا گیا۔ یہاں تک کہ ۲۲ مئی کو میڈیکل کالج میں پوسٹ مارٹم کے لئے رکھی پربھات کوشک کی لاش کو وہ ملازمین کو ڈرا دھمکا کر بغیر پوسٹ مارٹم کے ہی لے آیا۔ اس کے ساتھ کئی فوجی بھی تھے۔ اسی شام جب مسلمان نوجوانوں کو ٹرکوں میں بھرا گیا تو لوگوں نے میجر ستیش چندر کو بھی وہاں دیکھا تھا۔ اس بات کا شک ہے کہ اس میجر کی اسکیم پر ہی یہ قتل عام کیا گیا (بحوالہ نئی دنیا ۱۵ جون ۱۹۸۷)

میرٹھ کے المیہ میں سب سے بڑا انسانی کردار ڈاکٹر ہرپال سنگھ کا ہے جس کی مثال میرے علم کی حد تک نہ ہندوؤں میں پائی جاتی ہے اور نہ مسلمانوں میں۔ ڈاکٹر ہرپال سنگھ میرٹھ کے این ایس کالج میں پولٹیکل سائنس کے استاد ہیں۔

۱۹ مئی ۱۹۸۷ کو صبح سحری کے وقت مسلح پولیس محلہ الیان (میرٹھ) میں داخل ہوگئی۔ اس نے محلہ والوں پر کافی ظلم کیا۔ اس کی خبر پھیلی تو اس محلہ سے چار فرلانگ دور ہاپوڑ روڈ پر بھرے ہوئے مسلمان نکل آئے۔ انھوں نے انتقامی جذبہ کے تحت وہاں کے ہندوؤں کے مکانوں اور دکانوں کو آگ لگانا شروع کر دیا۔ ہاپوڑ روڈ پر ہندوؤں کے تین پٹرول پمپ جلا دئے۔ اور بہت سے دوسرے نقصانات کئے۔

یہ دن کا وقت تھا۔ ڈاکٹر ہرپال سنگھ کے صاحب زادہ ڈاکٹر پربھات سنگھ اپنی گاڑی میں بیٹھے ہوئے ہاپوڑ روڈ سے گزرے۔ غصہ میں بھرے ہوئے مسلمانوں نے ڈاکٹر پربھات سنگھ کو پکڑا۔ ان کی گاڑی کو جلایا اور ان کے اوپر تیل چھڑک کر آگ لگا دی۔ ڈاکٹر پربھات اس وقت

ایک مریض کے آپریشن کے لئے اسپتال جا رہے تھے، مگر اس حادثہ کے بعد خود ان کی لاش پوسٹ مارٹم کے لئے اسپتال لے جائی گئی۔

ڈاکٹر ہرپال سنگھ اور ان کے بیٹے دونوں حد درجہ شریف اور انسان دوست آدمی تھے۔ وہ ہمیشہ مسلمانوں کی حمایت کرتے تھے۔ ان کی اعلیٰ شرافت کا مزید ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے اپنے عزیز بیٹے کی اس دردانگیز ہلاکت پر مسلمانوں کے خلاف کوئی بھی سخت بات نہیں کہی۔ جب وہ اپنے جوان اور اکلوتے بیٹے کی جلی ہوئی ہڈیاں لئے ہوئے گھر واپس آرہے تھے تو راستہ میں انھوں نے ہندوؤں کی بھیڑ دیکھی جو مسلمانوں کے خلاف شدید طور پر بپھری ہوئی تھی اور مسلمانوں کو جلانے مارنے پر آمادہ تھی۔ انھوں نے بھیڑ کو منع کیا۔ کسی نے کہا کہ تم ان لوگوں کی طرفداری کر رہے ہو جنھوں نے تمہارے جوان بیٹے کو بلا سبب مار ڈالا۔ ڈاکٹر ہرپال سنگھ نے جواب دیا: "اگر پربھات میرا بیٹا تھا تو تم جس کو جلانے مارنے جا رہے ہو وہ بھی تو کسی کا بیٹا ہوگا"

ڈاکٹر ہرپال سنگھ کا ایک بیان بے حد قابل غور ہے۔ انھوں نے ایک انٹرویو کے دوران کہا: "میرا اب تک مسلمانوں کے بارہ میں یہ خیال تھا کہ وہ صرف اپنے دفاع کی لڑائی لڑتے ہیں۔ وہ کسی پر حملہ نہیں کرتے۔ لیکن میرٹھ شہر میں پہلی بار ایسا ہوا کہ مسلمان نہ جانے کیوں بھڑک اٹھا۔ انھیں کس نے بھڑکایا ہے کہ وہ اس طرح سڑکوں پر نکل آئے اور آگ زنی شروع کر دی؟ یہ ایک اہم سوال ہے۔ حالاں کہ اس کام میں پیش پیش غنڈہ اور جرائم پیشہ عناصر ہی تھے۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ شریف اور مہذب و معزز لوگ بھی تماشائی بنے رہے۔ انھوں نے روکا نہیں۔ وہ روکتے تو شاید میرا بیٹا بچ جاتا"

میرٹھ کے ڈاکٹر اتول بھٹناگر (اکمل نرسنگ ہوم) نہایت شریف اور انسان دوست آدمی ہیں۔ انھوں نے اپنی جان خطرہ میں ڈال کر ۵۰ مسلمانوں کو بچایا جو ۱۸ مئی کو ان کے نرسنگ ہوم میں موجود تھے۔ اس کی قیمت انھیں یہ ملی کہ ان کے ہم قوم انھیں غدار کہہ رہے ہیں اور ان کو جان سے مار ڈالنے کی دھمکی دے رہے ہیں۔

ڈاکٹر اتول بھٹناگر نے کہا کہ ۱۸ مئی کی رات کو تقریباً ½ ۱۰ بجے سکھ بیر سنگھ اور اس کا بہنوئی زخمی حالت میں ان کے نرسنگ ہوم میں آئے۔ دونوں کے جسم پر تیزاب اور شیشے کے زخم تھے۔

انھوں نے بتایا کہ ہم آرہے تھے کہ محلہ الیان پر لوگوں کی بھیڑ اکھٹا تھی جس نے ہم پر کانچ کی بوتلوں اور پتھروں سے حملہ کیا اور ہمارے اوپر تیزاب پھینکا۔ ہم بڑی مشکل سے اپنی جان بچا کر یہاں آئے ہیں (افکار جون ۱۹۸۷)

میرٹھ میں اور دوسرے مقامات پر بہت سے ہندوؤں نے اپنی جان خطرہ میں ڈال کر مسلمانوں کو بچایا۔ اس قسم کے تجربات مسلمانوں کے ساتھ بار بار پیش آتے ہیں۔ مگر مسلمان یہ کرتے ہیں کہ جو ہندو ان سے اچھا سلوک کرتا ہے اس کو وہ "فرد" کے طور پر لیتے ہیں اور جو ہندو برا سلوک کرتا ہے اس کو وہ پوری کمیونٹی پر پھیلا دیتے ہیں۔

ہم لوگ میاں محمد نگر (کھنہ روڈ) پر گئے۔ یہاں کا منظر اتنا بھیانک تھا کہ اس کو نہ قلم بیان کر سکتا ہے اور نہ کیمرہ۔ میاں محمد نگر گاؤں کی مانند ایک بستی تھی۔ تنگ گلیوں کے دونوں طرف لوگوں نے پچاس گز یا اس سے کم یا زیادہ زمینیں خرید کر چھوٹے چھوٹے پختہ مکان بنائے تھے۔ ان مکانات کی تعداد تقریباً ۲۸۰ تھی۔ یہ لوگ محنت مزدوری کر کے ان میں زندگی گزار رہے تھے۔ اچانک ایک روز پی اے سی کے ساتھ ایک غول آیا جس میں زیادہ تر ہریجن تھے۔ ان کے پاس خاص طرح کے کیمیکل تھے۔ وہ گھروں کو لوٹتے اور کیمیکل چھڑک کر آگ لگا دیتے۔

جب ہم وہاں پہنچے تو یہ منظر تھا کہ مکانات کی دیواریں تو کھڑی ہوئی تھیں مگر چھت سب کی گر چکی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے شدید بمباری سے تمام مکانات ڈھ پڑے ہوں۔ میں نے دیکھا مرد، عورتیں اور بچے اپنے مکان کے کھنڈروں پر بیٹھے ہوئے ہیں جہاں ان کے پاس نہ سایہ کی کوئی جگہ ہے اور نہ کھانے پینے کا یا زندگی کا اور کوئی سامان۔

میاں محمد نگر کے اس کھنڈر کو دیکھ کر ہم باہر سڑک پر آئے تو ایک پولیس پارٹی اس کے اندر داخل ہو رہی تھی۔ آگے آگے ایک پولیس افسر تھا۔ پیچھے چار سپاہی رائفلیں لئے ہوئے اس کے ساتھ چلے جا رہے تھے۔ ان کے داخلہ کا انداز ایسا تھا جیسے فاتح اپنے مفتوح کے علاقہ میں داخل ہو رہا ہو۔ وہ معاوضہ کی فہرست تیار کرنے کے لئے یہاں آئے تھے۔

میرٹھ سے واپسی کے بعد اگلے دن میں نے ہندستان ٹائمس (۲۹ جون ۱۹۸۷) میں مسٹر رومیش بھنڈاری کا مضمون پڑھا۔ مسٹر بھنڈاری فارن سکریٹری کے عہدہ سے ابھی حال میں ریٹائر ہوئے ہیں۔

یہ مضمون سری لنکا کے موجودہ حالات کے بارہ میں ہے۔ اس میں انھوں نے ہندستان کی طرف سے کسی فوجی مداخلت کو خارج از بحث قرار دیا ہے اور تصفیہ بذریعہ ترغیب (Settlement by persuasion) کی وکالت کی ہے۔ میں نے سوچا کہ ہندستانی سیاست کا یہی تضاد ہے جو ہندستان کی ترقی میں رکاوٹ بنا ہوا ہے۔ یہ ملک "میاں محمد نگر" کے غریبوں پر گولی چلاتا ہے اور جس کو طاقت ور دیکھتا ہے اس کے مقابلہ میں فوراً ترغیب (Persuasion) کا طریقہ اختیار کر لیتا ہے۔ اگر ہمیں اس ملک کو ترقی کی طرف لے جانا ہے تو ہمیں اپنی قومی زندگی کے اس تضاد کو ختم کرنا ہوگا۔

میرٹھ کی کہانی کا سب سے زیادہ وحشتناک باب وہ ہے جو ملیانہ سے تعلق رکھتا ہے۔ ملیانہ گویا وسیع تر میرٹھ کا ایک محلہ ہے جو شہر کی بیرونی سمت میں واقع ہے۔ یہاں کی آبادی تقریباً ۲۵ ہزار ہے جس میں مسلمانوں کی تعداد ۴ ہزار بتائی جاتی ہے۔ ۲۳ مئی ۱۹۸۷ کو دو ٹرک مسلح پولیس آئی اور چھتوں پر چڑھ کر مسلم علاقہ میں اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی۔ اس کے نتیجہ میں ۳۷ مسلمان ہلاک ہو گئے۔ واقعات بتاتے ہیں کہ یہاں کے ہندو اور مسلمان باہم مل جل کر رہتے تھے۔ ۱۹۴۷ سے لے کر اب تک یہاں ایک بار بھی کوئی فرقہ وارانہ فساد نہیں ہوا۔

ایسی حالت میں ۲۳ مئی کا واقعہ کیوں ہوا۔ ۱۳ مارچ ۱۹۸۸ کو ملیانہ کے تین آدمی ہمارے دفتر میں آئے۔ نعیم احمد صاحب، افتخار علی صاحب اور آصف اختر صاحب۔ یہ لوگ مذکورہ حادثہ کے دن ملیانہ میں موجود تھے۔ ان سے گفتگو کے دوران جو بات سامنے آئی وہ یہ تھی کہ میرٹھ فساد کے موقع پر اسلام آباد محلہ کے مسلمانوں نے جم کر پولیس کا مقابلہ کیا اور علاقہ کے ہندوؤں کو نقصان پہنچایا۔ پولیس یہاں کے مسلمانوں کو دبانے میں اپنے آپ کو بے بس محسوس کر رہی تھی۔ چنانچہ اس نے یہ اسکیم بنائی کہ قریب کے علاقہ (ملیانہ) میں انتقامی کارروائی کرے تاکہ میرٹھ (اسلام آباد) کے مسلمانوں کی حوصلہ شکنی ہو سکے۔ حالاں کہ خود ملیانہ کے مسلمانوں نے کسی قسم کی کوئی اشتعال انگیز کارروائی نہیں کی تھی۔

جس وقت ملیانہ میں مسلمانوں کو مارا جا رہا تھا اور ان کے گھروں کو جلایا جا رہا تھا، وہاں کے ایک باشندہ اعجاز علی صدیقی نے ایک پولیس افسر سے کہا جو وہاں موجود تھا، آپ ان فسادیوں سے مسلمانوں کو بچانے کے لئے کوئی کارروائی کیوں نہیں کرتے۔ پولیس افسر نے جواب دیا: ہم یہاں مسلمانوں کو بچانے کے لئے نہیں آئے ہیں، ہم ان کو سبق دینے کے لئے آئے ہیں۔

ملیانہ میں جس بے دردی کے ساتھ پولیس نے مسلسل دو گھنٹہ تک گولی چلائی، اس نے عالمی سطح پر ضمیر کو بیدار کیا۔ ایمنسٹی انٹرنیشنل (لندن) کی مفصل رپورٹ اس سلسلہ میں اخبارات میں آچکی ہے۔ اس رپورٹ (ٹائمس آف انڈیا ۲۰ نومبر ۱۹۸۷) میں بتایا گیا تھا کہ ایمنسٹی انٹرنیشنل کے ذمہ داروں نے اس سلسلہ میں لندن کے ہندستانی سفارت خانہ سے رابطہ قائم کیا۔ سفارت خانہ نے جواب دیا کہ ——— یہ یقین کرنے کا معقول سبب موجود ہے کہ سماج دشمن عناصر نے پولیس کے یونیفارم چرالئے اور ان کو پہن کر گولیاں چلائیں :

There is reason to believe that police uniforms were stolen and used as a disguise by anti-social elements.

سفیر ہند کی یہ توجیہہ نہایت عجیب ہے۔ مگر آج کل ہر آدمی کا یہ حال ہے کہ جہاں اس کی اپنی ذات زد میں آئے وہاں ہر آدمی "سفیر ہند" بن جاتا ہے۔ انسان کو اگر اس کی غلطی یاد دلائی جائے تو اس کو اخذ کرنے کے لئے اس کی عقل عاجز ثابت ہوگی۔ مگر جب اپنی غلطی کی جھوٹی توجیہہ تلاش کرنا ہو تو ہر آدمی آخری حد تک ذہین بن جاتا ہے۔ وہ بھول جاتا ہے کہ اس کی یہ ذہانت صرف اس کے جرم میں اضافہ کر رہی ہے۔ ایسا آدمی یہ خطرہ مول لے رہا ہے کہ خدا کی عدالت میں اس سے یہ کہا جائے کہ جب تم اپنی غلطی کی تردید کرنے میں اتنے ہوشیار تھے تو اپنی غلطی کا اعتراف کرنے میں اتنے بے وقوف کیوں بن گئے۔

میرٹھ کے فساد کی رپورٹوں میں جو الفاظ بار بار اخبارات میں آئے ان میں سے ایک نام "زیدی فارم" کا تھا۔ یہ سید محمد علی زیدی کے نام پر مشہور ہے۔ ہم ان کے مکان پر گئے۔ اتفاق سے موصوف اس وقت موجود نہ تھے۔ ان کی بہن نایاب زیدی سے ملاقات ہوئی۔ یہ ایک معمر خاتون ہیں اور ایم ایس سی اور بی ایڈ کئے ہوئی ہیں۔

خاتون نے بتایا کہ خود زیدی فارم میں کوئی واقعہ نہیں ہوا۔ البتہ آس پاس میں کچھ واقعات ہوئے۔ محترمہ نایاب زیدی سے میں نے پوچھا کہ اس کا حل کیا ہے۔ ان کا جواب یہ تھا "اس کا حل صرف محبت ہے، اور کچھ نہیں۔" انھوں نے اپنے مالی رام داس سے ملایا۔ ان کی عمر تقریباً ۶۵ سال ہے۔ وہ زیدی ہاؤس میں بارہ سال سے مالی کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ رام داس

مالی بے حد سیدھے سادے آدمی ہیں۔ ان سے میں نے پوچھا کہ جو کچھ میرٹھ میں ہوا تو اب کیا کیا جائے کہ پھر ایسا نہ ہو۔ انھوں نے جواب دیا: کہیں ہندوؤں کا زور ہے تو ان کو محبت سے پیار سے رکھیں: یہ سب سے زیادہ صحیح بات ہے جو میرٹھ میں مجھے ایک مالی کی زبان سے سننے کو ملی، مگر یہی وہ بات ہے جو ہمارے بڑے بڑے عالموں تک کو نہیں معلوم۔

ایک صاحب نے کہا کہ میرٹھ کا فساد پلاننگ کے تحت ہوا۔ یعنی ہندوؤں نے پہلے سے پلان بنا کر مسلمانوں کو مارا۔ انھیں صاحب نے مسلمانوں کی بہادری ثابت کرنے کے لئے یہ بھی کہا کہ پہلے دن جب تک پولیس نہیں آئی تھی مسلمانوں نے زیادہ مارا۔ مگر جب مسلح پولیس (پی اے سی) آگئی تو مسلمان زیادہ مارے جانے لگے۔ میں نے کہا کہ اگر پلاننگ یک طرفہ تھی تو مسلمان کیسے اس قابل ہوسکے کہ وہ پہلے دن زیادہ ماریں۔ انھوں نے کہا کہ مسلمانوں کو جواب میں تو کچھ نہ کچھ کرنا ہی تھا۔

میں نے کہا کہ یہ طریقہ سراسر غلط ہے۔ فریق ثانی اگر بالفرض فساد کی پلاننگ کر رہا ہے تو اس کا مقابلہ جوابی فساد کے ذریعہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا جواب صرف ایک ہے۔ وہ یہ کہ حکیمانہ تدبیر سے آپ ان کی پلاننگ کو فیل کر دیں۔ جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مثال کے طور پر غزوۂ خندق کے موقع پر عمل فرمایا۔ فریق ثانی بہت بڑی تعداد میں تیار ہو کر لڑنے کے لئے آرہا تھا، مگر آپ نے ایک ایسی آڑ قائم کر دی کہ دونوں کے درمیان ٹکراؤ کی عملی صورت ہی ختم ہوگئی۔

حالیہ فسادات کے زمانہ میں مختلف لوگوں نے نہایت طاقتور الفاظ میں فساد کو برا کہا ہے اور امن کے ساتھ رہنے کی وکالت کی ہے۔ مگر میرے نزدیک یہ باتیں عملی طور پر بالکل بے کار ہیں۔ اس لئے کہ وہ متعین انداز میں نہیں کہی گئی ہیں۔ وہ "فساد" کے خلاف ہیں نہ کہ "مفسد" کے خلاف۔

مثلاً انڈین ایکسپریس (۳۰ جون ۱۹۸۷) نے اپنے صفحہ ۶ پر ایک شخص کا یہ قول نقل کیا:

> Man's liberty ends, and it ought to end, when that liberty becomes the curse of his neighbours.

آدمی کے لئے آزادی کا حق ختم ہو جاتا ہے اور اس کو ختم ہو جانا چاہئے۔ جب کہ یہ آزادی اس کے پڑوسی کے لئے لعنت بن جائے۔

موجودہ شکل میں جو شخص اس قول کو پڑھے گا وہ اس کو دوسروں پر چسپاں کرے گا اور اپنے

آپ کو اس سے الگ کرلے گا۔ اس لئے صرف وہ تنقید مفید ہے جو متعین انداز میں کی جائے۔ اس کی موزوں ترین صورت یہ ہے کہ ہندو اپنے فرقہ کی زیادتی پر انھیں ٹوکے اور مسلمان اپنے فرقہ کی زیادتی پر بولیں۔

ایک مسلمان نے کہا کہ "مقامی ہندی اخبارات نے میرٹھ کے فساد کو بھڑکانے میں بہت بڑا حصہ لیا۔ انھوں نے ہندوؤں کے نقصانات کا ذکر کیا۔ نام بھی دئے۔ فوٹو بھی دئے۔ مگر مسلمانوں کے نقصانات کا کوئی بھی ذکر نہیں کیا"۔

یہ تنقید بھی کس قدر عجیب ہے۔ مسلمانوں کے تمام اخبارات یک طرفہ طور پر صرف مسلمانوں کے نقصانات کا ذکر کرتے ہیں۔ وہ ہندوؤں کے نقصان کا کوئی تذکرہ نہیں کرتے۔ یہ بات کسی مسلمان کو غلط نظر نہیں آتی۔ مگر یہی بات جب ہندو اخبار کرے تو وہ فوراً غلط ہو جاتی ہے۔ گویا اپنے لئے ایک اصول ہے اور غیر کے لئے دوسرا اصول۔ جو لوگ اس قسم کا غیر منصفانہ ذہن رکھتے ہوں ان کے لئے خدا کی اس دنیا میں کوئی جگہ نہیں۔

مسٹر ایس کے چھابڑا نے اپنے ایک مطبوعہ خط (ہندستان ٹائمس ۶ جولائی ۱۹۸۷) میں لکھا ہے کہ یہ صرف ملا، پنڈت اور ریاست داں ہیں جنھوں نے ماحول کو خراب کیا ہے:

It is only the Mullahs, Pandits and politicians who have spoiled the atmosphere.

مجھے مسٹر چھابڑا کی اس بات سے صد فی صد اتفاق ہے۔ مسلم عوام اور ہندو عوام اگر تنہا ہوتے تو یقینی طور پر ان کے درمیان کوئی فرقہ وارانہ لڑائی نہ پیدا ہوتی۔ لیکن مذہبی اور سیاسی لیڈروں نے سارا معاملہ بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔

میرٹھ میں ہر سال جگناتھ کی رتھ یاترا کا جلوس نکالا جاتا ہے۔ اس بار یہ جلوس ۲ جولائی ۱۹۸۷ کو نکالا گیا۔ ٹائمس آف انڈیا کے نامہ نگار مسٹر رمن نند انے اس کی رپورٹ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ اس سالانہ رتھ یاترا میں پہلے بمشکل ایک ہزار آدمی شریک ہوتے تھے۔ اس بار نہایت کثرت سے لوگ اس میں شریک ہوئے جن کی تعداد کا اندازہ ۵۰ ہزار سے ایک لاکھ تک کیا گیا ہے۔ رتھ یاترا کمیٹی کے ایک رکن مسٹر ستیہ پرکاش اہلووالیا نے پرفخر طور پر کہا کہ اس بار ہماری رتھ یاترا میں لاکھوں

آدمی شریک ہوئے۔

جلوس میں تعداد کا یہ اضافہ یقینی طور پر میرٹھ میں موجودہ حالات کی بنا پر ہوا ہے۔ یہ مسلمانوں کے جلسہ جلوس کا جواب ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جلسہ اور جلوس کا طریقہ کس طرح مسلمانوں کے لئے بے فائدہ بلکہ الٹا نتیجہ پیدا کرنے والا (Counter productive) ہے۔ مسلمان اگر جلسہ اور جلوس کا مظاہرہ کریں تو یہ ہندو کے اندر قومی ساکھ کے جذبہ کو ابھارے گا۔ وہ بڑھ چڑھ کر اپنا مظاہرہ کرنا چاہیں گے۔ سوئے ہوئے فتنے بیدار ہوں گے۔ حالات کی نزاکت میں اضافہ ہوگا ہندوؤں کا جلوس بند کرنے کی سب سے آسان تدبیر یہ ہے کہ مسلمان اپنا جلوس بند کردیں۔

میرٹھ کی کل آبادی تقریباً دس لاکھ ہے۔ اس میں مسلمان ۴۰ یا ۴۵ فی صد تعداد میں آباد ہیں۔ بتایا جاتا ہے کہ پچھلے پچاس سال کے اندر میرٹھ میں ۷۱ فرقہ وارانہ فسادات ہو چکے ہیں۔ آخری برسوں میں حسب ذیل سال میرٹھ میں فساد کے سال رہے ہیں۔ ۱۹۶۲، ۱۹۶۳، ۱۹۶۷، ۱۹۶۸، ۱۹۶۹، ۱۹۷۳، ۱۹۸۲، ۱۹۸۶، ۱۹۸۷۔ ۱۹۸۲ کے فساد میں ۳۲ موتیں واقع ہوئی تھیں۔

یہ فسادات ہمیشہ معمولی نادانی سے شروع ہوتے ہیں۔ نیز یہ کہ یہ ہمیشہ چند افراد کی کسی غلط کارروائی سے شروع ہوتے ہیں۔ تاہم پورا معاشرہ اس کا مجرم قرار پاتا ہے کیوں کہ بقیہ لوگ ہمیشہ اپنے فرقہ کے شرپسند افراد کی حمایت کرتے ہیں۔ وہ ان کی مذمت نہیں کرتے۔ اس طرح چند لوگ اگر فساد انگیزی کے براہ راست مجرم ہیں تو بقیہ لوگ اس کے بالواسطہ مجرم۔ یہ فساد کس طرح معمولی نادانیوں سے شروع ہوتے ہیں، اس کو ۱۹۸۲ کے فساد کی روشنی میں سمجھا جا سکتا ہے۔

محلہ شاہ گھاٹ میں ایک چبوترہ کا جھگڑا تھا۔ وہاں ایک قبر اور ایک پیپل کا درخت تھا۔ ہندوؤں نے پیپل کو بنیاد بنا کر اس کو مندر کی حیثیت دینے کی کوشش کی۔ اور مسلمانوں نے قبر کو بنیاد بنا کر یہ دعوی کیا کہ یہ کسی بزرگ کا مزار ہے اور وہاں چادر چڑھانے کا مطالبہ کیا۔

یہ جھگڑا بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ ۶ ستمبر اور ۷ ستمبر ۱۹۸۲ کی درمیانی رات کو کسی مسلمان نے وہاں کے پجاری کو قتل کر دیا۔ ۷ ستمبر کو جب پجاری کے قتل کی خبر مشہور ہوئی تو شہر میں فرقہ وارانہ فساد کی آگ بھڑک اٹھی اور سارا شہر اس کی لپیٹ میں آگیا۔

بیسیوں مسلمان قتل ہوئے۔ ہزاروں گھر لوٹے اور جلائے گئے۔ کروڑوں روپئے کا مالی

نقصان ہوا (الجمعیۃ ڈیلی ۲۱ اکتوبر ۱۹۸۲)

سردھنا کے الکٹریشین انعام الحق صاحب (پیدائش ۱۹۵۸) سے ۲۵ مارچ ۱۹۸۸ کو ملاقات ہوئی۔ میں نے پوچھا کہ آپ میرٹھ کے علاقہ میں رہتے ہیں۔ یہ بتائیے کہ میرٹھ میں اتنا زیادہ فساد کیوں ہوتا ہے۔ ۱۹۴۷ سے ۱۹۸۷ تک میرٹھ میں ۷۰ فرقہ وارانہ فساد ہو چکے ہیں۔ ایسا کہیں اور نہیں ہوا۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے۔

انھوں نے کہا: میرٹھ کا آدمی دبّو نہیں ہے۔ یعنی ایک کی بات دوسرے کو برداشت نہیں۔ یہاں تک کہ اگر ہم کسی کو سمجھائیں تو وہ لڑنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے اور کہتا ہے کہ ہم کیوں دبیں۔ چنانچہ وہاں اگر ایک مسلمان اور ایک ہندو میں کسی بات پر لڑائی ہو جائے تو وہ دو آدمی کی لڑائی نہیں رہتی۔ وہ فوراً ہندو مسلم لڑائی بن جاتی ہے۔ اسی لئے میرٹھ تباہ ہے۔

میرٹھ میں ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ بار بار کمیونسٹ کا لفظ بولتے تھے۔ "کمیونسٹوں نے یہ سب کرایا ہے" انھوں نے کہا۔ میں نے جاننا چاہا کہ کیا یہاں کمیونزم کا زور ہے۔ معلوم ہوا کہ یہاں کمیونزم کا یا کمیونسٹوں کا کوئی اثر نہیں۔ آخر کار کافی دیر کے بعد سمجھ میں آیا کہ وہ صاحب کمیونسٹ کا لفظ کمیونلسٹ (فرقہ پرست) کے معنی میں بول رہے تھے۔

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں کے مسلمان تعلیم میں کتنا پیچھے ہیں۔ ہم نے یہاں بہت سے مسلمانوں سے ملاقات کی اور ان سے گفتگو کی مگر بہت کم ایسے افراد ملے جو باشعور ہوں اور واقعی طور پر معاملات کو سمجھتے ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہاں کا اصل مسئلہ ہندو تعصب یا ہندو فرقہ پرستی نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کا تعلیم میں پیچھے ہونا ہے۔ یہاں کے مسلمانوں کی بہت بڑی اکثریت جاہل یا نیم خواندہ ہے۔ وہ کسی معاملہ میں گہرائی کے ساتھ رائے قائم کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ حتی کہ یہاں کے لیڈر بھی اتنے ہی بے شعور ہیں جتنا کہ یہاں کے عوام۔ جب کسی قوم کی اکثریت جاہل ہو تو اس کے تعلیم یافتہ افراد بھی نیم تعلیم یافتہ ہو کر رہ جاتے ہیں۔

میرٹھ کے ریلیف کی اپیلوں پر مسلمانوں نے کروڑوں روپے دئے ہیں۔ لیکن اگر میرٹھ کے مسلمانوں کو باشعور اور تعلیم یافتہ بنانے کا منصوبہ لے کر اٹھئے، تو نہ ریلیف فنڈ کھولنے والوں کو اس سے کوئی دلچسپی ہوگی اور نہ ریلیف میں بڑی بڑی رقمیں دینے والوں کو۔ قومی مصیبت کے لئے متحرک

ہونا اور قومی تعمیر کے لئے متحرک نہ ہونا زوال کی خاص علامتوں میں سے ہے۔ اور زوال کی اس قسم میں مسلمان پوری طرح مبتلا ہو چکے ہیں۔

علاء الدین صاحب (۴۲ سال) میرٹھ کے محلہ کوٹلہ میں رہتے ہیں۔ ان کی وہاں پان کی دکان ہے۔ انھوں نے بتایا کہ فساد کے بعد جب شہر میں کرفیو نافذ ہوا تو لوگوں کا گھر سے نکلنا بند ہوگیا۔ ہم لوگ اپنی گلی میں بھی باہر نہیں آسکتے تھے۔ مگر ایک معمولی خوش تدبیری نے ہمارے لئے کرفیو کو آسان بنا دیا۔

انھوں نے بتایا کہ ایک روز پی اے سی والے ہماری گلی کے اندر داخل ہوئے۔ اس وقت بہت سے لوگ گھروں سے باہر نکل کر گلی میں بیٹھے ہوئے تھے۔ پی اے سی والوں نے کہا کہ تم لوگ باہر کیوں بیٹھے ہو۔ کیا تم کو معلوم نہیں کہ یہاں سخت کرفیو لگا ہوا ہے۔ محلہ والوں نے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا، بلکہ نرمی کے ساتھ انھیں جواب دیتے ہوئے کہا کہ آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ ہم لوگ ابھی گھروں کے اندر چلے جاتے ہیں۔ مگر جب آپ ہمارے محلہ میں آگئے ہیں تو ہماری طرف سے کچھ چائے پانی تو قبول کر لیجئے۔ اس کے بعد محلہ والوں نے ان کی تواضع کی۔ تواضع سے فارغ ہو کر جب پی اے سی والے باہر جانے لگے تو انھوں نے کہا: آپ لوگ باہر رہنا چاہتے ہو تو رہو، البتہ دیکھو دنگا فساد مت کرنا۔ محلہ کوٹلہ کے لوگوں نے اس طرح کئی بار پی اے سی والوں کی تواضع کی اور ان کے محلہ میں پی اے سی کا رویہ بہت نرم رہا۔

عین فساد کے زمانہ میں اس طرح کے اور بھی کئی واقعات میرٹھ میں ہوئے۔ مثال کے طور پر متین صدیقی صاحب کا تجربہ بھی اسی قسم کا تھا۔ وہ خیر نگر (ٹیلیفون ۲۵۳۱) میں رہتے ہیں۔ ان کے سامنے کی سڑک پر پی اے سی کا کیمپ تھا۔ یہ گرمی کا زمانہ تھا۔ ایک روز پی اے سی والوں نے متین صدیقی صاحب کا دروازہ کھٹکھٹایا اور پانی مانگا۔ انھوں نے فوراً ٹھنڈے پانی کی بوتل اور گلاس بھیج دیا۔ اس طرح بار بار وہ لوگ ان کے یہاں سے ٹھنڈا پانی لیتے رہے۔ اس کے بعد جب کرفیو زیادہ سخت ہوا تو اب پی اے سی والوں کی باری تھی۔ ایک روز دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز آئی۔ انھوں نے دروازہ کھولا تو پولیس کا آدمی ایک بنٹ (بالٹی)، دودھ لئے ہوئے کھڑا تھا۔ اسی طرح وہ انھیں سبزی وغیرہ پہنچاتا رہا۔ متین صدیقی صاحب نے قیمت دینا چاہا تو انھوں نے قیمت لینے سے انکار کر دیا۔

یہ اسی میرٹھ کے واقعات ہیں جہاں کے بارہ میں مسلم لیڈر اور مسلم اخبارات نے صرف پولیس کے ظلم اور تشدد

کی خبریں دنیا کو سنائی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ پولیس والے بھی انسان ہیں۔ ان کے سینہ میں بھی دل ہے۔ آپ غیر حکیمانہ سلوک سے انھیں اپنا دشمن بنا سکتے ہیں۔ اور اگر آپ حکیمانہ سلوک کریں تو یقیناً آپ ان کو اپنا دوست پائیں گے۔

امید افزا رجحان

موجودہ فسادات کے بعد عام طور پر ایک ایسے رجحان کا اظہار ہوا ہے جس کو "فطرت انسانی کا احتجاج" کہا جا سکتا ہے۔ جو لوگ ہندی اور انگریزی اخبارات پڑھتے ہیں، انھوں نے کثرت سے اس کا مشاہدہ کیا ہے۔ یہاں ہم صرف چند مثالیں نقل کریں گے۔

مسٹر نکھیل چکرورتی فرقہ وارانہ دنگے پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ہم اب غیر انسانی ہوتے جا رہے ہیں۔ ایک فرقہ وارانہ فساد اب ہمارے ضمیر میں ہلچل پیدا نہیں کرتا۔ اس کے متعلق ہم اخباروں میں پڑھتے ہیں۔ ریڈیو اور ٹیلی وژن میں سنتے ہیں۔ مگر انسانی مصیبت کی اصطلاحوں میں نہیں، بلکہ شماریات کی زبان میں، اتنے آدمی ہلاک ہوئے، اتنے آدمیوں کو چھرا مارا گیا، اتنی دکانیں لوٹی گئیں، اتنے مکان جلائے گئے، بس اس سے زیادہ اور کچھ نہیں:

> We are getting dehumanised. A communal riot no longer seems to stir our conscience. We read about it in newspapers or hear about it over the radio and television—not in terms of human suffering, but in terms of bare statistics—so many killed, so many stabbed, so many shops looted or houses gutted. Nothing more.

ایک اور مثال مسٹر کے آر ملکانی کی ہے۔ ماضی میں وہ آرگنائزر کے اڈیٹر کی حیثیت سے کافی بدنام رہ چکے ہیں۔ مگر حالیہ واقعات نے غالباً ان کے ضمیر کو جگا دیا ہے۔ ان کا ایک مفصل مضمون اخبار اسٹیٹسمین (۳۰ مئی ۱۹۸۷) میں شائع ہوا ہے۔ یہ نہایت معتدل اور متوازن مضمون ہے۔ اس میں کسی بھی اعتبار سے مسلمانان ہند کے خلاف کوئی بات نہیں کہی گئی ہے۔ بلکہ ہر اعتبار سے ان کا دفاع کیا گیا ہے۔ اس میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو بھائی بھائی (Blood brothers) کہا گیا ہے۔ یہ مضمون انشاء اللہ انگریزی الرسالہ میں شائع کر دیا جائے گا۔ یہاں ہم صرف اس کا آخری پیراگراف نقل کرتے ہیں:

> If Hindus and Muslims ponder over these matters dispassionately and respond to suggestions positively, the ground could be prepared for a great reconciliation in the subcontinent. That will be a great day for all mankind.

اگر ہندو اور مسلمان ان باتوں پر جذبات سے الگ ہو کر غور کریں اور ان تجویزوں کو مثبت طور پر لیں تو برصغیر میں ایک عظیم اتحاد کی زمین تیار ہو سکتی ہے۔ یہ تمام انسانیت کے لئے ایک عظیم دن ہوگا۔

اخبار پرتاپ (دہلی) اپنی جارحانہ فرقہ پرستی کے لئے کافی بدنام رہا ہے۔ مگر حالیہ فسادات کے بعد وہ بھی تڑپ اٹھا ہے۔ اڈیٹر پرتاپ مسٹر انل نریندر نے اپنے ایک مفصل اداریہ میں ابتداءً بابری مسجد کے تین حل پیش کئے ہیں۔ (۱) مسجد اور مندر دونوں ساتھ ساتھ رہیں (۲) تاریخی ریکارڈ دیکھ کر فیصلہ کیا جائے (۳) بابری مسجد کی عمارت کو اٹھا کر دوسری جگہ رکھ دیا جائے۔ اس کے بعد وہ اپنے اداریہ میں لکھتے ہیں :

" اگر مندرجہ بالا تینوں راستوں میں سے ایک بھی راستہ دونوں کو قبول نہ ہو تو میں ہاتھ جوڑ کر اپنے ہندو بھائیوں سے درخواست کروں گا کہ اپنی خاطر، اپنے دیش کی خاطر آپ یہ قبول کرلیں کہ اس جگہ پر پھر سے تالا لگا دیا جائے اور اسے اسی حالت میں پہنچا دیا جائے جہاں وہ یکم فروری ۱۹۸۶ کو جج پانڈے کے فیصلے سے پہلے تھی۔ میں جانتا ہوں کہ میرے اس سجھاؤ سے میرے کئی ہندو بھائی متفق نہ ہوں گے لیکن انھیں یہ بھی سمجھنا چاہئے کہ دیش کی خاطر ایکتا کی خاطر، آخر کچھ قربانی دینی ہی پڑے گی۔ کب تک ہم اپنے ہندو بھائیوں کو دنگوں کی آگ میں تباہ برباد ہوتے دیکھتے رہیں گے۔ کیا تین سو کروڑ کا نقصان کافی نہیں ؟ کتنی جانیں گنوانی پڑیں گی ؟ کتنے کروڑ کا مزید نقصان برداشت کرنا ہوگا اس ایک جگہ کے لئے " (پرتاپ یکم جون ۱۹۸۷)

انڈین اکسپریس (یکم جون ۱۹۸۷) نے دہلی کے فساد کے بارہ میں ایک رپورٹ شائع کی ہے جس کا عنوان ہے :

Cost of a riot

اس رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ دہلی میں ۲۲ مئی ۱۹۸۷ کو جو فساد شروع ہوا، اس میں جو انسانی جانیں ضائع ہوئیں، ان کے نقصان کا تو کوئی اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ اس سلسلہ میں ہونے والے مالی نقصان کا اندازہ ایک حد تک کیا جا سکتا ہے۔ رپورٹر کا کہنا ہے کہ وہ پرانی دہلی کے بڑے بڑے تاجروں سے ملا اور یہ اندازہ کرنے کی کوشش کی کہ اس فساد کے نتیجہ میں جب کرفیو نافذ ہوا اور تقریباً تین ہفتے کے لئے ہول سیل مارکیٹ بند رہا تو اس سے انھیں کیا نقصان

پہنچا۔

دہلی ٹریڈ ایسوسی ایشن کے وائس پریسیڈنٹ مسٹر منوہر لال کمار نے رپورٹر کو بتایا کہ کرفیو کے دنوں میں پرانی دہلی کی ۳۰ ہزار سے زیادہ دکانیں بند رہیں۔ اس کے نتیجہ میں بجلی کا غذ، سونا چاندی، لوہے کا سامان، رنگ، بساط، غلہ، کپڑا وغیرہ کے تھوک کاروبار پر اثر پڑا۔ اور مجموعی طور پر تقریباً ۵۰ کروڑ روپیہ روزانہ کے کاروبار کا نقصان ہوا۔

مسٹر پی راج گوپال نے اس تجارتی نقصان کو ایک جزیرۂ امید (Island of hope) قرار دیا ہے۔ انھوں نے ایک مضمون (انڈین اکسپریس یکم جون ۱۹۸۷) میں کہا ہے کہ بہت سے مقامات پر کاروبار میں ہندوؤں اور مسلمانوں کا ایک دوسرے پر انحصار (Interdependence) فساد کے خلاف ایک روک کا کام کرے گا ـــــــ حالیہ فساد کے بعد ہندو صاحبان کے نقطۂ نظر میں "تبدیلی" کا سبب غالباً یہی واقعہ ہے۔

مسٹر پی آر راج گوپال سنٹرل رزرو پولیس فورس (CRPF) میں تھے۔ وہ اس سے ڈائرکٹر جنرل (D.G.) کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ انھوں نے ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے:

Communal Violence in India (1987)

مسٹر راج گوپال نے اپنے طویل تجربات کی روشنی میں فرقہ وارانہ فسادات پر ایک مضمون شائع کیا ہے جو انڈین اکسپریس (۲۳ مئی ۱۹۸۷) میں چھپا ہے۔ اس مضمون میں وہ لکھتے ہیں کہ میں اس ملک کے فرقہ وارانہ فسادات کا براہ راست مشاہد ہوں۔ میرا یقین ہے کہ ہر بار جب کوئی فرقہ وارانہ فساد ہوتا ہے تو وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو اتنا نقصان نہیں پہنچاتا جتنا ہمارے امیدوں اور خوابوں والے ہندستان کو:

Every successive communal riot deals a body blow not so much to the Hindus or the Muslims but to the India of our hopes and dreams.

مسٹر راج گوپال کی یہ بات صد فی صد درست ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندستان کے فرقہ وارانہ فسادات جو ۱۹۴۷ سے لے کر آج تک مسلسل جاری ہیں، ہندستان کی ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔ میرٹھ اور دہلی کے حالیہ فساد کے بارہ میں بیان دیتے ہوئے وزیر اعظم راجیو گاندھی

نے کہا :

Nothing—I repeat, nothing—is more damaging to our nationhood and our future than the cancer of communalism. India will survive as a secular India or not at all.

کوئی چیز، میں بتکرار کہتا ہوں کہ کوئی چیز ہماری قومیت اور ہمارے مستقبل کے لئے اتنا نقصان دہ نہیں ہے جتنا کہ فرقہ واریت کا سرطان۔ ہندستان یا تو سیکولر ہندستان کے طور پر زندہ رہے گا یا وہ سرے سے مٹ جائے گا (ٹائمس آف انڈیا، ۲۳ مئی ۱۹۸۷)

یہ فسادات بتاتے ہیں کہ اس ملک کے ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں نے حقیقت پسندی کو کھو دیا ہے، اور جو لوگ حقیقت پسندی کو کھو دیں ان کا انجام اس دنیا میں بربادی کے سوا اور کچھ نہیں۔

میرا یہ مطلب نہیں کہ تمام کے تمام ہندو یا تمام کے تمام مسلمان فسادی ہو گئے ہیں۔ اس قسم کا فساد کرنے والے ہمیشہ کم تعداد میں ہوتے ہیں اور یقینی طور پر ہندوؤں اور مسلمانوں میں بھی وہ کم تعداد ہی میں ہیں۔ مگر اصل المیہ یہ ہے کہ فسادی لوگ جب فساد کرتے ہیں تو بقیہ لوگ ان کا ہاتھ نہیں پکڑتے۔ بلکہ فوراً اس کو قومی مسئلہ بنا کر اپنی قوم کے فسادیوں کے ساتھ ہو جاتے ہیں۔ یورپ کے لوگوں نے وطن پرستی کا یہ کلمہ وضع کیا تھا کہ میرا ملک، خواہ وہ حق پر ہو یا ناحق پر ہو :

My Country, right or wrong

ہندستان کے ہندوؤں اور مسلمانوں نے معمولی ترمیم کے ساتھ اس کو اس طرح اپنا لیا ہے کہ میرا فرقہ خواہ وہ صحیح ہو یا غلط :

My community, right or wrong

چنانچہ ہر فساد کے بعد یہ ہوتا ہے کہ مسلم رہنما یک طرفہ طور پر ہندوؤں کو برا بھلا کہنا شروع کرتے ہیں اور ہندو رہنما یک طرفہ پر مسلمانوں کو۔ ان میں کوئی بھی نہیں جو خود اپنی قوم کا محاسبہ کرے۔ اسی کا نام فرقہ پرستی ہے اور اس فرقہ پرستی نے ملک کو تباہی کے کنارے پہنچا دیا ہے۔

میرٹھ ایک چتاونی ہے۔ مسلمانوں کے لئے، ہندوؤں کے لئے اور سارے ملک کے لئے

۱۔ دین دیال ریسرچ انسٹی ٹیوٹ (نئی دہلی) کے زیر اہتمام ۱۵ اگست ۱۹۸۸ کو اہل علم کی ایک میٹنگ ہوئی۔ اس موقع پر لوگوں نے حسب ذیل عنوان پر اظہار خیال کیا:

Building bridges with the people of Pakistan

منتظمین کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس موقع پر شرکت کی اور مذکورہ موضوع پر اپنے خیالات پیش کیے۔

۲۔ کالی کٹ (کیرلا) سے ایک ہفتہ وار پرچہ ملیالم میں نکلتا ہے۔ اس کا نام شباب ہے۔ اس پرچہ میں ہر ہفتہ الرسالہ یا مطبوعات الرسالہ سے کسی مضمون کو ملیالم میں ترجمہ کر کے شائع کیا جاتا ہے۔ اسی طرح اور کئی پرچے ہیں جو مختلف زبانوں میں الرسالہ کے مضامین شائع کر رہے ہیں۔

۳۔ دہلی کے ایک جرنلسٹ مسٹر آر بی ایل نگم نے صدر اسلامی مرکز کا مفصل انٹرویو لیا تھا۔ یہ انٹرویو گوالیار کے ہندی روزنامہ سُوو دیش نے اپنے شمارہ ۲۷ جولائی ۱۹۸۸ میں شائع کیا ہے۔ سوالات زیادہ تر ہندستانی مسلمانوں کے مسائل سے متعلق ہیں۔

۴۔ ایک ہندی اسٹیٹ سے تعلق رکھنے والے ایک صاحب نے بتایا کہ وہ وہاں کے ہندو صاحبان کو الرسالہ پڑھا رہے ہیں۔ ایک ہندو نوجوان نے دو سال الرسالہ پڑھنے کے بعد کہا کہ "میں کٹر آر ایس ایس کا آدمی تھا۔ مگر آپ کے رسالہ نے مجھ کو بالکل بدل دیا" اس طرح کے واقعات بتاتے ہیں کہ اس ملک میں جارحانہ فرقہ پرستی کا جو مسئلہ ہے، اس کو حل کرنے کی تدبیر کیا ہے۔ اس کا حل یہ نہیں ہے کہ ان کے خلاف شکایت اور احتجاج کی مہم چلائی جائے۔ بلکہ ان کا حل یہ ہے کہ اسلام کا مثبت تعارف ان کے سامنے لایا جائے۔ یہی کام الرسالہ کے ذریعہ کیا جا رہا ہے۔

۵۔ ایک صاحب اپنے خط ۲۵ اگست ۱۹۸۸ میں لکھتے ہیں تقریباً ۵۰ عدد الرسالہ اطراف کے لوگوں تک فرداً فرداً پہنچاتا ہوں۔ یہ کام تین دن میں ختم ہوتا ہے۔ فرداً فرداً دینے میں عظیم فائدہ ہے۔ شکوک کا ازالہ وغیرہ۔ مرکز کی تمام کتابیں مع تذکیر القرآن مختلف حضرات تک برائے مطالعہ پہنچانا، پھر کتابوں کا واپس لانا تاکہ دوسروں تک پہنچائی جاسکیں۔ اس طرح صبح و شام گزر رہے ہیں۔ مزید کوشش کی جائے تو ہمارے علاقہ میں الرسالہ ہزاروں کی تعداد میں نکل سکتا ہے۔ (ڈاکٹر انوار الحق، امباری)

۶۔ گول مارکیٹ (نئی دہلی) میں ۲۰ اگست ۱۹۸۸ کو اعلیٰ تعلیم یافتہ اصحاب کا ایک اجتماع ہوا۔ صدر اسلامی مرکز نے اس موقع پر ایک مفصل خطاب کیا جس کا عنوان تھا : عقیدۂ آخرت کا عقلی ثبوت۔ قرآنی آیات کی روشنی میں مذکورہ موضوع کی تفصیل بیان کی گئی۔ اس تقریر کا ٹیپ مرکز میں موجود ہے۔

۷۔ ساہتیہ اکیڈمی کی طرف سے نئی دہلی میں ایک تین روزہ سیمنار ہوا۔ یہ سیمنار، مولانا ابوالکلام آزاد کے بارہ میں تھا اور اس کا افتتاح ڈاکٹر شنکر دیال شرما (وائس پریسیڈنٹ) نے کیا۔ ۲۱ اگست ۱۹۸۸ کی نشست کا چیرمین صدر اسلامی مرکز کو بنایا گیا تھا۔ اس موقع پر صدر اسلامی مرکز نے شرکت کی اور صدارتی تقریر کے تحت اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ مذکورہ نشست کا موضوع بحث تھا : مولانا آزاد کی الٰہیاتی تخلیقیت (Theological creativity) یہ سیمنار رابندر بھون (نئی دہلی) میں ہوا۔

۸۔ الرسالہ انگریزی خدا کے فضل سے مغربی ملکوں میں پھیل رہا ہے۔ کچھ لوگ انفرادی طور پر اور کچھ لوگ ایجنسی کے طور پر منگا رہے ہیں۔ حال میں روم (اٹلی) کے ایک ادارہ نے انگریزی الرسالہ کی کاپیاں بطور ایجنسی منگانا شروع کیا ہے۔ الرسالہ کے ہمدردوں کو چاہیے کہ اپنے اپنے حلقۂ تعارف میں لوگوں کو اس طرف زیادہ سے زیادہ متوجہ کریں۔ یا تو ایجنسی لے کر اس کو پھیلائیں یا اپنی طرف سے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کے نام اس کو جاری کروائیں۔

۹۔ نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا کی طرف سے صوفیا (بلغاریہ) میں ایک کلچرل نمائش منعقد کی گئی۔ یہ نمائش ۲۵ جون سے ۲ جولائی ۱۹۸۸ تک جاری رہی۔ اس نمائش میں دوسری چیزوں کے علاوہ ہندستان کی چھپی ہوئی منتخب کتابیں بھی رکھی گئیں۔ ان میں اسلامی مرکز کی چار انگریزی کتابیں بھی شامل تھیں۔ ان کے نام یہ ہیں :

God Arises, Mohammad: The Prophet of Revolution, Religion and Science, Tabligh Movement

اس کے علاوہ بلغاریہ کی بین اقوامی نمائش میں بھی یہ کتابیں رکھی گئیں جس کی خبر پہلے آچکی ہے۔

۱۰۔ صدر اسلامی مرکز کی ایک تقریر ۲۵ جولائی ۱۹۸۸ کو آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے نشر کی گئی

اس کا عنوان تھا : قربانی کا تصور اسلام میں ۔

۱۱۔ اردو اکادمی دہلی نے کچھ اردو کتابوں پر انعام دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ ان میں صدر اسلامی مرکز کی کتاب " خاتونِ اسلام " بھی شامل ہے ۔ اردو اکادمی نے اس کتاب پر تین ہزار روپیہ انعام کا فیصلہ کیا ہے ۔ واضح ہو کہ اس کتاب کا پہلا اڈیشن ختم ہو چکا ہے اور دوسرا ایڈیشن تقریباً سو صفحات کے اضافہ کے ساتھ شائع ہو گیا ہے ۔ مذکورہ کتاب پر یہ انعام ۱۳ ستمبر ۱۹۸۸ کو ایک خصوصی تقریب میں اردو اکادمی کے چیرمین مسٹر رومیش بھنڈاری (لفٹننٹ گورنر دہلی) نے پیش کیا ۔ یہ تقریب کمانی آڈیٹوریم (نئی دہلی) میں منعقد کی گئی ۔

۱۲۔ الرسالہ کا تعمیری اور حقیقت پسندانہ مشن خدا کے فضل سے عمومی مقبولیت حاصل کرتا جا رہا ہے ۔ اس سے ان لوگوں کی صفوں میں کھلبلی پیدا ہو گئی ہے جو خطابت اور لفّاظی کے ذریعہ قوم کے اندر قیادت کا مقام حاصل کیے ہوئے تھے ۔ چنانچہ انھوں نے الرسالہ کے مشن کو ناکام کرنے کے لیے بے بنیاد پروپیگنڈے شروع کر دیئے ہیں ۔ اس کی ایک مثال ایک حلقہ قیادت کا پندرہ روزہ پرچہ ہے ۔ اس نے ہمارے بارہ میں ان الفاظ کے ساتھ ایک جوابی مضمون شائع کیا ہے کہ " بعض اہل قلم ہندستانی مسلمانوں کو یہ مشورہ دے رہے ہیں کہ وہ پچھلی نشست پر بیٹھنے کے لیے راضی ہو جائیں ۔ دوسرے درجہ کا شہری ہونے پر قناعت کریں ۔ پارسیوں اور مارواڑیوں کی طرح زندگی گزاریں " (۱۰ اگست ۱۹۸۸) بوکھلاہٹ میں مضمون نگار کو یاد نہ رہا کہ وہ اپنی تردید آپ کر رہے ہیں ۔ پارسی اور مارواڑی ، بالفاظ دیگر ٹاٹا اور برلا ، کیا اس ملک میں دوسرے درجہ کے شہری ہیں اور وہ پچھلی نشست پر بیٹھے ہوئے ہیں ۔ حتیٰ کہ وزیر اعظم راجیو گاندھی باپ کی طرف سے پارسی ہیں ، کیا وہ اس ملک میں دوسرے درجہ کے شہری ہیں اور کیا ان کو بھی پچھلی نشست پر جگہ ملی ہے ۔ اس قسم کی جھوٹی تنقیدیں خود نام نہاد قائدین کے علمی اور فکری افلاس کا پردہ کھول رہی ہیں ۔ وہ کسی بھی درجہ میں الرسالہ کے مشن کی صداقت کی تردید نہیں کرتیں ۔

۳ "خاتون اسلام" کا نیا اڈیشن ۲۰۰ صفحات پر چھپ کر آگیا ہے ۔ ڈیڑھ سو سال سے یہ کہا جا رہا تھا کہ اسلام عورت کا رتبہ گراتا ہے ۔ اس کتاب میں پہلی بار جدید علمی اور استدلالی معیار پر اس کا جواب دیا گیا ہے ۔ جدید اسلامی لٹریچر میں یہ اپنے موضوع پر بالکل منفرد کتاب ہے ۔

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کر دے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴۔ صاحب استطاعت افراد کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کر دیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط و کتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

زر تعاون الرسالہ

زر تعاون سالانہ	۴۸ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	۲۵۰ روپیہ

بیرونی ممالک سے

ہوائی ڈاک	۲۰ ڈالر امریکی
بحری ڈاک	۱۰ ڈالر امریکی

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلیشر مسئول نے راہل آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

تذکیر القرآن

جلد اول : سورۃ فاتحہ۔ سورۃ بنی اسرائیل

جلد دوم : سورۃ الکہف ۔ سورۃ الناس

قرآن کی بے شمار تفسیریں ہر زبان میں لکھی گئی ہیں۔ مگر تذکیر القرآن اپنی نوعیت کی پہلی تفسیر ہے۔ تذکیر القرآن میں قرآن کے اساسی مضمون اور اس کے بنیادی مقصد کو مرکز توجہ بنایا گیا ہے۔ جزئی مسائل اور معلوماتی تفصیلات کو چھوڑتے ہوئے اس میں قرآن کے اصل پیغام کو کھولا گیا ہے اور عصری اسلوب میں اس کے دعوتی اور تذکیری پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے۔ تذکیر القرآن عوام و خواص دونوں کے لیے یکساں طور پر مفید ہے۔ وہ طالبینِ قرآن کے لیے فہم قرآن کی کنجی ہے۔

ہدیہ جلد اول ۱۰۰ روپیہ

جلد دوم ۱۰۰ روپیہ

مکتبہ الرسالہ، نئی دہلی

	Rs
تذکیر القرآن جلد اول	100/-
" " جلد دوم	100/-
اللہ اکبر	40/-
پیغمبر انقلاب	30/-
مذہب اور جدید چیلنج	[illegible]
عظمت [illegible]	25/-
الاسلام	25/-
ظہور اسلام	[illegible]
اسلامی زندگی	20/-
احیاء اسلام	20/-
راز حیات (مجلد)	45/-
صراط مستقیم	25/-
خاتون اسلام	35/-
سوشلزم اور اسلام	25/-
اسلام اور عصر حاضر	20/-
حقیقت حج	25/-
اسلامی تعلیمات	20/-
تبلیغی تحریک	15/-
تعبیر کی غلطی	35/-
دین کی سیاسی تعبیر	10/-

دین کیا ہے	3/-
قرآن کا مطلوب انسان	6/-
تجدید دین	4/-
اسلام دین فطرت	4/-
تعمیر ملت	4/-
تاریخ کا سبق	4/-
مذہب اور سائنس	8/-
عقلیات اسلام	4/-
فسادات کا مسئلہ	3/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	3/-
تعارف اسلام	4/-
اسلام پندرھویں صدی میں	4/-
راہیں بند نہیں	4/-
ایمانی طاقت	4/-
اتحاد ملت	4/-
سبق آموز واقعات	4/-
زلزلۂ قیامت	6/-
حقیقت کی تلاش	4/-
پیغمبر اسلام	4/-
آخری سفر	4/-

اسلامی دعوت	4/-
خدا اور انسان	4/-
حل یہاں ہے	6/-
سچا راستہ	2/-
دینی تعلیم	4/-
حیات طیبہ	4/-
باغ جنت	4/-
نار جہنم	4/-
میوات کا سفر	25/-

God Arises	Rs. 45/-
Muhammad The Prophet of Revolution	50/-
Religion and Science	25/-
Tabligh Movement	20/-
The Way to Find God	4/-
The Teachings of Islam	5/-
The Good Life	5/-
The Garden of Paradise	5/-
The Fire of Hell	5/-
Muhammad The Ideal Character	4/-
[illegible]	4/-
[illegible]	2/-
[illegible]	[illegible]

6 DEC 1988

الرسالہ

ISSN 0970-180X

زیرسرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

دوسروں کی طرف مارچ کرنے کا نام فساد ہے
اور اپنی طرف مارچ کرنے کا نام جہاد

دسمبر ۱۹۸۸
شمارہ ۱۴۵

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

	Rs.
تذکیر القرآن جلد اول	100/-
" " جلد دوم	100/-
اللہ اکبر	40/-
پیغمبر انقلاب	30/-
مذہب اور جدید چیلنج	35/-
عظمت قرآن	25/-
الاسلام	25/-
ظہور اسلام	25/-
اسلامی زندگی	20/-
احیاء اسلام	20/-
رازِ حیات (مجلد)	45/-
صراط مستقیم	25/-
خاتون اسلام	35/-
سوشلزم اور اسلام	25/-
اسلام اور عصر حاضر	20/-
حقیقت حج	25/-
اسلامی تعلیمات	20/-
تبلیغی تحریک	15/-
تعبیر کی غلطی	35/-
دین کی سیاسی تعبیر	10/-

دین کیا ہے	3/-
قرآن کا مطلوب انسان	6/-
تجدید دین	4/-
اسلام دین فطرت	4/-
تعمیر ملت	4/-
تاریخ کا سبق	4/-
مذہب اور سائنس	8/-
عقلیات اسلام	4/-
فسادات کا مسئلہ	3/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	3/-
تعارف اسلام	4/-
اسلام پندرھویں صدی میں	4/-
راہیں بند نہیں	4/-
ایمانی طاقت	4/-
اتحاد ملت	4/-
سبق آموز واقعات	4/-
زلزلۂ قیامت	6/-
حقیقت کی تلاش	4/-
پیغمبر اسلام	4/-
آخری سفر	4/-

اسلامی دعوت	4/-
خدا اور انسان	4/-
حل یہاں ہے	6/-
سچا راستہ	2/-
دینی تعلیم	4/-
حیات طیبہ	4/-
باغ جنت	4/-
نار جہنم	4/-
میوات کا سفر	25/-

God Arises	Rs. 45/-
Muhammad The Prophet of Revolution	50/-
Religion and Science	25/-
Tabligh Movement	20/-
The Way to Find God	4/-
The Teachings of Islam	5/-
The Good Life	5/-
The Garden of Paradise	5/-
The Fire of Hell	5/-
Muhammad The Ideal Character	4/-
Man Know Thyself!	4/-
इन्सान अपने आपको पहचान	2/-
सच्चाई की तलाश	4/-

مکتبہ الرسالہ سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اردو، انگریزی میں شائع ہونے والا

Dr. Zakir Husain Library
Jamia Nagar
J. M. I. New Delhi

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

شمارہ ۱۴۵ دسمبر ۱۹۸۸

فہرست

ماہانہ الرسالہ، سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳، فون: 697333, 611128

دو طریقے

ایک دیہاتی آدمی مدینہ آیا۔ وہ مسجد نبوی میں داخل ہوا جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب کے ساتھ موجود تھے۔ وہ مسجد کے اندر کھڑا ہو کر پیشاب کرنے لگا۔ لوگوں نے اس کو تنبیہہ کرنا چاہا مگر آپ نے منع فرما دیا۔ آپ نے کہا کہ دیہاتی کو چھوڑ دو اور ایک ڈول پانی لاکر وہاں بہادو۔ چنانچہ لوگوں نے ایسا ہی کیا۔ (بخاری، مسلم، نسائی، ترمذی، ابو داؤد، مؤطا)

دیہاتی پر اس واقعہ کا بہت اثر پڑا۔ اپنے قبیلہ میں واپس جاکر اس نے لوگوں سے پورا قصہ بیان کیا۔ اس نے کہا کہ میں نے یہ حرکت کی کہ عبادت خانہ میں پیشاب کر دیا۔ مگر خدا کی قسم، محمد نے مجھ پر غصہ نہیں کیا۔ انھوں نے مجھے نہیں جھڑکا (واللہ ما قہرنی محمد واللہ ما زجرنی محمد) قبیلہ کے لوگ یہ بات سن کر بہت متاثر ہوئے۔ حتی کہ سارا قبیلہ دین اسلام میں داخل ہو گیا۔

اب موجودہ زمانہ کا واقعہ لیجئے۔ ہولی کا دن تھا۔ ہندو نوجوانوں کی ایک پارٹی ہولی کھیلتی ہوئی شہر کی ایک سڑک سے گزر رہی تھی۔ راستہ میں ایک مسجد آگئی۔ ایک نوجوان نے جوش میں آکر مسجد کی طرف پچکاری ماری۔ مسجد کی ایک دیوار پر ہولی کے رنگ کے چھینٹے پڑگیے۔ مسجد کی دیوار پر ہولی کا رنگ دیکھ کر وہاں کے مسلمانوں کو غصہ آگیا۔ وہ ہندو نوجوانوں سے لڑگیے۔ مار پیٹ کی یہ خبر پورے شہر میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ ہر طرف فساد بھڑک اٹھا۔ مسلمانوں نے دیوار پر رنگ کو برداشت نہیں کیا تھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شہر کی سڑکیں ان کے خون سے رنگین کر دی گئیں۔ اور ان کے گھروں اور دکانوں کو نذر آتش کر دیا گیا۔

دو واقعہ میں یہ فرق کیوں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خدائی دین پر تھے۔ اور موجودہ زمانہ کے مسلمان قومی دین پر ہیں۔ جو لوگ خدائی دین پر چلیں، ان کو فرشتوں کی مدد حاصل ہوتی ہے۔ ان کے لیے دلوں کے بند دروازے کھولے جاتے ہیں۔ اس کے برعکس معاملہ ان لوگوں کا ہے جو قومی دین پر چلیں۔ ایسے لوگوں کا ساتھی صرف ان کا نفس ہوتا ہے۔ ان کا عمل ضد اور نفسانیت کی آگ بھڑکاتا ہے۔ وہ دوسروں کو نفرت کا تحفہ دیتے ہیں، اس لیے دوسروں کی طرف سے بھی انھیں نفرت اور انتقام کا تحفہ دیا جاتا ہے۔

فتح بغیر جنگ

امریکی ہفتہ وار ٹائم (۴ جولائی ۱۹۸۸) کی کور اسٹوری جاپان سے متعلق ہے۔ اس کا عنوان بامعنی طور پر یہ ہے کہ کیا ایک اقتصادی دیو ایک عالمی طاقت بن سکتا ہے:

Super Japan: Can an economic giant become a global power?

۱۹۴۵ میں امریکہ نے جاپان کے اوپر فتح کی خوشی منائی تھی۔ آج مفتوح جاپان خود امریکہ کے اوپر فتح حاصل کر رہا ہے۔ ابتداءً یہ فتح صرف اقتصادی معنی میں تھی، مگر اب وہ دوسرے دائروں میں وسیع ہوتی جارہی ہے۔ امریکہ آج سب سے بڑا قرضدار ملک ہے جس کے اوپر ۴۰۰ بلین ڈالر کا خارجی قرضہ ہے۔ اس کے برعکس جاپان سب سے بڑا دائن ملک ہے جس نے دنیا کو ۲۴۰ بلین ڈالر قرض دے رکھا ہے۔

امریکہ میں آج کل کثرت سے ایسی کتابیں چھپ رہی ہیں اور ایسے مضامین شائع ہو رہے ہیں جن میں بتایا جاتا ہے کہ امریکہ تیزی سے زوال کی طرف جارہا ہے اور اس کے مقابلہ میں جاپان تیزی سے ترقی کا سفر طے کر رہا ہے۔ ان میں سے ایک کتاب کا نام یہ ہے:

Prof. Paul Kennedy, *The Rise and Fall of the Great Powers*

ٹائم کے مذکورہ شمارہ کو پڑھنے کے بعد اس کے قارئین نے اس کو بہت سے خطوط لکھے۔ ان میں سے کچھ خط اس کی اگلی اشاعت (۲۵ جولائی ۱۹۸۸) میں شائع ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک خط پرنسٹن کے برائن مرسکی (Brian Mirsky) کا ہے۔ انھوں نے اپنے مختصر خط میں لکھا ہے کہ جاپان کی اقتصادی کامیابی پر آپ کا مضمون اس کو بالکل واضح کر رہا ہے کہ اگرچہ امریکہ نے جنگ جیتی تھی مگر جاپان نے امن کو جیت لیا:

Your article on Japan's economic success makes it obvious that although the U.S. won the war, Japan won the peace.

جاپان کا یہ واقعہ بتاتا ہے کہ خدا کی دنیا میں امکانات کا دائرہ کتنا زیادہ وسیع ہے۔ یہاں ایک مفتوح اپنے فاتح کے اوپر غالب آسکتا ہے، بغیر اس کے کہ اس نے فاتح سے جنگ کی ہو، بغیر اس کے کہ اس کا اپنے فاتح سے کبھی ٹکراؤ پیش آیا ہو۔

دشمن سے سیکھنا

۱۹۴۹ میں جاپانیوں نے اپنے یہاں ایک صنعتی سیمینار کیا۔ اس سیمینار میں انھوں نے امریکہ کے ڈاکٹر ایڈورڈ ڈیمنگ (Dr Edward Deming) کو خصوصی دعوت نامہ بھیج کر بلایا۔ ڈاکٹر ڈیمنگ نے اپنے لکچر میں اعلیٰ صنعتی پیداوار کا ایک نیا نظریہ پیش کیا۔ یہ کوالیٹی کنٹرول (Quality control) کا نظریہ تھا۔

(ہندستان ٹائمس ۲۸ دسمبر ۱۹۸۶)

جاپان کے لیے امریکہ کے لوگ دشمن قوم کی حیثیت رکھتے تھے۔ دوسری جنگ عظیم میں امریکہ نے جاپان کو بدترین شکست اور ذلت سے دوچار کیا تھا۔ اس اعتبار سے ہونا یہ چاہیے تھا کہ جاپانیوں کے دل میں امریکہ کے خلاف نفرت کی آگ بھڑکے۔ مگر جاپانیوں نے اپنے آپ کو اس قسم کے منفی جذبات سے اوپر اٹھا لیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے لیے یہ ممکن ہوا کہ وہ امریکی پروفیسر کو اپنے سیمینار میں بلائیں۔ اور اس کے بتائے ہوئے نسخہ پر ٹھنڈے دل سے غور کر کے اس کو دل و جان سے قبول کر لیں۔

جاپانیوں نے امریکی پروفیسر کی بات کو پوری طرح پکڑ لیا۔ انھوں نے اپنے پورے صنعتی نظام کو کوالیٹی کنٹرول کے رخ پر چلانا شروع کیا۔ انھوں نے اپنے صنعت کاروں کے سامنے بے نقص (Zero-defect) کا نشانہ رکھا۔ یعنی ایسی پیداوار مارکیٹ میں لانا جس میں کسی بھی قسم کا کوئی نقص نہ پایا جائے۔ جاپانیوں کی سنجیدگی اور ان کا ڈیڈیکیشن (Dedication) اس بات کا ضامن بن گیا کہ یہ مقصد پوری طرح حاصل ہو۔

جلد ہی ایسا ہوا کہ جاپانیوں کے کارخانے بے نقص سامان تیار کرنے لگے۔ یہاں تک کہ یہ حال ہوا کہ برطانیہ کے ایک دکاندار نے کہا کہ جاپان سے اگر میں ایک ملین کی تعداد میں کوئی سامان منگاؤں تو مجھ کو یقین ہوتا ہے کہ ان میں کوئی ایک چیز بھی نقص والی نہیں ہوگی۔ چنانچہ تمام دنیا میں جاپان کی پیداوار پر صد فی صد بھروسہ کیا جانے لگا۔

اب جاپان کی تجارت بہت زیادہ بڑھ گئی۔ حتیٰ کہ وہ خود امریکہ کے بازار پر چھا گیا جس کے ایک ماہر کی تحقیق سے اس نے کوالیٹی کنٹرول کا مذکورہ نسخہ حاصل کیا تھا۔

اس دنیا میں بڑی کامیابی وہ لوگ حاصل کرتے ہیں جو ہر ایک سے سبق سیکھنے کی کوشش کریں، خواہ وہ ان کا دوست ہو یا ان کا دشمن۔

ناکامی میں کامیابی

سموئل بٹلر (Samuel Butler) انیسویں صدی کا مشہور انگریز مصنف ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ زندگی اس فن کا نام ہے کہ ناکافی مقدمات سے کافی نتائج اخذ کیے جائیں :

Life is the art of drawing sufficient conclusions from insufficient premises.

سموئل بٹلر نے یہ بات فطری تعقل کے تحت کہی ہے۔ مگر زندگی کے بارہ میں شریعت نے جو تصور دیا ہے وہ بھی عین یہی ہے۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اس دنیا میں خدا نے جو نظام بنایا ہے، اس میں آسانی کے ساتھ مشکل لگی ہوئی ہے (اِنَّ مَعَ العُسۡرِ یُسۡرًا) رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک بار ایک پہاڑی راستہ کو دیکھا جس کا نام لوگوں نے الضَّیِّقَۃ (دشوار) رکھ دیا تھا۔ آپ نے فرمایا کہ نہیں۔ اس کا نام تو الیُسۡرٰی (آسان) ہے۔ گویا اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ آدمی عُسر میں یُسر کو دریافت کرے۔ وہ دشوار گزار راستہ کو آسان راستہ کے روپ میں دیکھ سکے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اس تعلیم کی اعلیٰ ترین مثال ہے۔ آپ کو سخت ترین مشکلات پیش آئیں، مگر آپ نے حکیمانہ تدبیر سے ان کو اپنے حق میں آسان بنالیا۔ آپ نے ڈس ایڈوانٹج کو ایڈوانٹج میں تبدیل کرلیا۔ ایک مستشرق مسٹر کیلٹ (E.E. Kellet) نے آپ کی اس صفت کمال کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انھوں نے مشکلات کا سامنا اس عزم کے ساتھ کیا کہ ناکامی سے کامیابی کو نچوڑ یں :

He faced adversity with the determination to wring success out of failure.

دنیا میں ایک طرف انسان ہے جو دوسرے انسان کے لیے مشکلات پیدا کرتا ہے۔ دوسری طرف خدا کا نظام ہے جس نے ہر مشکل کے ساتھ اس کا حل بھی رکھ دیا ہے۔ ایسی حالت میں انسانی مشکلات پر شور کرنا یہ معنی رکھتا ہے کہ آدمی نے انسان کے عمل کو دیکھا مگر وہ خدا کے عمل کو نہ دیکھ سکا۔ کیوں کہ اگر وہ خدا کے عمل کو دیکھتا تو شکایت کرنے کے بجائے وہ اس کو استعمال کرنے میں لگ جاتا۔

ضمیر کی آواز

کوریا ۱۹۰۵ سے جاپان کے تحت تھا۔ دوسری عالمی جنگ میں جاپان کی شکست کے بعد کوریا کی تقسیم عمل میں آئی۔ نارتھ کوریا روس کے زیر اثر آگیا اور ساؤتھ کوریا امریکہ کے زیر اثر۔

اسی وقت سے ملک کے دونوں حصوں میں رقابت جاری ہے اور دونوں برابر ایک دوسرے کو گرانے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ ۱۹۸۷ میں ساؤتھ کوریا میں اولمپک تھا۔ اولمپک کی میزبانی موجودہ زمانہ میں ایک باعزت چیز سمجھی جاتی ہے۔ چنانچہ نارتھ کوریا نے اس کو ناکام کرنے کا ایک خفیہ منصوبہ بنایا۔ اس منصوبہ کا مقصد یہ تھا کہ ساؤتھ کوریا کے سفر کو پُرخطر بنا دیا جائے تاکہ اولمپک کے موقع پر باہر کے ملکوں سے ساؤتھ کوریا جانے والوں کی حوصلہ شکنی ہو:

to discourage foreign countries from participating in the Seoul Olympics.

اس مقصد کے لیے ایک ۲۲ سالہ کوریائی عورت کم ہیان ہی (Kim Hyon-Hee) اور ۶۹ سالہ مرد کم سنگ (Kim Sung Il) کو تیار کیا گیا۔ منصوبہ کے مطابق دونوں بیٹی اور باپ کے روپ میں ۲۹ نومبر ۱۹۸۷ کو ساؤتھ کوریا کی ایرلائنز فلائٹ ۸۵۸ پر سوار ہوئے۔ یہ جہاز بغداد سے سیول جارہا تھا۔ عورت کے پاس ایک پرس تھا جس کو اس نے "اوور ہیڈ لاکر" میں رکھ دیا۔ جہاز درمیان میں ابوظبی کے ہوائی اڈہ پر اترا تو وہ پرس کو جہاز کے خانہ میں چھوڑ کر اتر گئی۔

مذکورہ پرس میں بظاہر ایک ٹرانسسٹر تھا، مگر حقیقۃً وہ ٹائم بم تھا۔ جہاز جب ابوظبی سے اڑ کر دوبارہ فضا میں پہونچا تو بم پھٹ گیا۔ جہاز تباہ ہو گیا۔ اس وقت جہاز میں ۱۱۵ مسافر تھے جو سب کے سب ہلاک ہو گئے۔

ابوظبی میں اترنے والے مسافروں کا ریکارڈ دیکھ کر فوراً ان کی تلاش ہوئی۔ وائرلیس کے ذریعہ مختلف مقامات پر پیغام بھیج دیا گیا۔ آخر کار عورت اور مرد دونوں روم کے ہوائی اڈہ پر پکڑ لیے گئے۔ دونوں کے پاس سائنائڈ کیپسول (Cyanide capsule) تھا جس کو انھوں نے گرفتار ہوتے ہی فوراً نگل لیا۔ مرد اسی وقت مر گیا تاہم عورت بچ گئی۔

کچھ روز اسپتال میں رہنے کے بعد اس کو سیول لے جایا گیا۔ وہاں ۱۵ جنوری ۱۹۸۸ کو
پریس کانفرنس ہوئی۔ اس میں مختلف ملکوں کے اخباری نمائندے بڑی تعداد میں جمع تھے۔ عورت
اس پریس کانفرنس میں پیش کیا گیا۔ اس کی تصویر انڈین اکسپریس (۱۷ جنوری ۱۹۸۸) میں چھپی ہے
میں وہ سخت جواس باختہ حالت میں دکھائی دے رہی ہے۔

ٹائم (۲۵ جنوری ۱۹۸۸) کی رپورٹ کے مطابق، عورت نے روتے ہوئے اور سسکیاں لے
ہوئے اخباری نمائندوں کے سامنے کہا کہ جو گناہ میں نے کیا ہے وہ اتنا برا ہے کہ اس کے لیے
سخت ترین سزا دی جائے اور مجھے ایک سو بار قتل کیا جائے:

I should be punished and killed a hundred times for my sin.

یہ واقعہ ظاہر کرتا ہے کہ انسان کے اندر پیدائشی طور پر ایک نہایت طاقت ور استعداد
ہے۔ یہ وہی ہے جس کو عام طور پر ضمیر کہا جاتا ہے۔ کسی لالچ میں یا کسی وقتی اشتعال کے تحت
شخص ایک برا فعل انجام دے سکتا ہے۔ مگر جیسے ہی وقتی جذبہ کا طوفان ہٹتا ہے۔ اس کا ا
ضمیر اس کو ملامت کرنے لگتا ہے۔ ضمیر کو چھوتے ہی اس کا ٹائر پنکچر ہو جاتا ہے۔ وہ اس
نہیں رہتا کہ اپنے جرم کو مزید جاری رکھ سکے۔

بعض سیاہ قلب یا پیشہ ور افراد کا اس میں استثناء ہو سکتا ہے۔ مگر عام انسانی فطرت
ہے۔ عام انسان اپنے ضمیر کی آواز کو دبا نہیں سکتا۔ کسی انسان کو اس کے جرم سے روکنے کی س
آسان تدبیر یہ ہے کہ اس کے اندر چھپے ہوئے ضمیر کو مخاطب بنایا جائے۔ ضمیر گویا خدا کی عدا
ہے۔ اور اگر مقدمہ ضمیر کے سامنے رکھ دیا جائے تو اس کے لیے ممکن نہیں کہ وہ سچائی کے سوا ک
اور بات کا فیصلہ کرے۔

تجربہ کے بعد

ایک امریکی خاتون لنڈا برٹن (Linda Burton) نے اپنے خاندانی تجربات پر ایک کتاب لکھ کر شائع کی ہے جس کا نام ہے ــــــ تمہارے جیسی ایک تیز عورت گھر پر رہ کر کیا کام کرتی ہے :

What's a Smart Women Like You Doing at Home?

مذکورہ خاتون کی کہانی کا خلاصہ ، ان کے لفظوں میں یہ ہے کہ میرا گھر پر رہنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ میں ایک کمپنی میں پورے وقت کی ملازم تھی۔ ۳۳ سال کی عمر میں میرے یہاں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ اس کو سنبھالنے میں مجبورانہ طور پر مجھے اپنی ملازمت چھوڑنی پڑی۔ یہاں تک کہ میرے لیے معاشی مسائل پیدا ہوگیے۔ اور میں نے دوبارہ باہر کا کام کرنا شروع کر دیا۔

میں اپنے بچے کے لیے شام کا وقت اور ہفتہ کی چھٹی کا دن دے سکتی تھی۔ مگر وہ ناکافی تھا۔ اب میں نے اس کے لیے تحفظ اطفال کا ایک ادارہ تلاش کیا۔ مگر ایک مہینہ کے بعد ہی اس کو ناقص سمجھ کر مجھے چھوڑ دینا پڑا۔ میں ملازمت ترک کر کے دوبارہ گھر پر رہنے لگی تاکہ بچے کی دیکھ بھال کر سکوں۔ میں دو سال تک کسی زیادہ بہتر ادارہ کی تلاش میں رہی۔ یہاں تک کہ میرے یہاں دوسرا بچہ پیدا ہوگیا۔

میں نے دوبارہ ایک ملازمت کر لی اور اپنے دونوں بچوں کو گھریلو قسم کے تحفظ اطفال کے ادارہ میں ڈال دیا۔ مگر اس کی کارکردگی پر مجھے اطمینان نہ ہوسکا۔ آخر کار میں نے خود اپنے گھر پر انفرادی خدمات حاصل کیں۔ میں نے پایا کہ آپ خواہ کتنا ہی قاعدہ قانون بنائیں۔ کتنا ہی زیادہ رقم خرچ کریں مگر یہ ناممکن ہے کہ ایک شخص کسی دوسرے کے لیے محبت کر سکے :

> In time, my search for child care taught me a critical lesson: no matter how many licences we issue, how many guidelines we establish or how much money we pay, it is impossible to have quality controls over the capacity of one human being to love and care for another (p. 94).

میں ایک ایسا شخص چاہتی تھی جو نرم مزاج اور محبت کرنے والا ہو۔ جو مستعد اور کسی قدر پُر مزاح ہو۔ ایک زندہ شخص جو میرے بچوں کی تخلیقیت کو بڑھائے ، وہ ان کو تفریح کے لیے باہر بھی لے جائے۔ وہ ان کے تمام چھوٹے چھوٹے سوالوں کا جواب دے۔ وہ ان کو میٹھی نیند سلائے۔ آہستہ آہستہ اور تکلیف دہ

طور پر میں اس حیرت ناک واقفیت تک پہونچی کہ جس شخصیت کو میں برسوں سے تلاش کر رہی تھی وہ میری اپنی ناک کے نیچے موجود ہے، یعنی میں خود۔ یہ ہے وہ کام جو میرے جیسی تیز عورت اپنے گھر کے اندر کر رہی ہے:

> I had wanted someone who was loving and tender, with a sense of humour and an alert, lively manner — somebody who would encourage my children's creativity, take them on interesting outings, answer all their little questions, and rock them to sleep. Slowly, painfully, I came to a stunning realization: the person I was looking for was right under my nose. I had desperately been trying to hire me. And that's what a smart woman like me is doing at home.
>
> (*Reader's Digest*, August, 1988

مذہب کی تعلیم کے تحت معاشرت کا یہ اصول مقرر کیا گیا تھا کہ مرد کمائے اور عورت گھر کی دیکھ بھال کرے۔ اس طرح تقسیم کار کے اصول پر دونوں زندگی کا کاروبار چلائیں۔

یہ ایک انتظامی بندوبست تھا نہ کہ کسی کو بڑا درجہ اور کسی کو چھوٹا درجہ دینا۔ مگر جدید دور میں "آزادیٔ نسواں" کی تحریک اٹھی جس نے اس طریقہ کو عورت کی تصغیر کے ہم معنی قرار دیا۔ اور یہ نعرہ دیا کہ دونوں صنفوں کو کسی تقسیم یا حد بندی کے بغیر ہر کام کرنا چاہیے۔ یہ نظریہ اتنا پھیلا کہ عورتوں کی ایک پوری نسل گھر سے باہر نکل پڑی۔

نام نہاد مساوات کے اس تجربہ پر اب تقریباً سو سال بیت چکا ہے۔ خاص طور پر مغربی دنیا میں اس کا تجربہ آخری ممکن حد تک کیا گیا ہے۔ مگر ان تجربات نے اس کی افادیت ثابت کرنے کے بجائے صرف اس کا نقصان ثابت کیا ہے۔ موجودہ مغربی معاشرہ میں مختلف انداز سے مسلسل اس کی مثالیں سامنے آرہی ہیں۔ انھیں میں سے ایک مثال وہ ہے جس کو اوپر نقل کیا گیا۔

مذہب نے مرد اور عورت کے عمل کے درمیان یہ تقسیم رکھی تھی کہ مرد معاش فراہم کرے، اور عورت نئی نسل کی اخلاقی تعمیر کرے:

Man the bread-earner, woman the character-builder

جدید تہذیب نے اس مذہبی تعلیم سے انحراف کیا۔ مگر جدید تہذیب کے تجربات نے صرف یہ کیا ہے کہ اس نے مذہب کی تعلیمات کی صداقت کو از سر نو مزید قوت کے ساتھ ثابت کر دیا ہے۔

دین کے بدلے دنیا

ڈیڑھ ہزار برس پہلے ساری دنیا میں شرک کا غلبہ تھا۔ حتی کہ توحید کے گھر، کعبہ کو بھی بت خانہ بنادیا گیا تھا۔ اس وقت پیغمبر اسلام صلے اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں "تحفظ کعبہ" کی مہم شروع کی۔ مگر مکہ کے لوگوں نے آپ کو حقیر بنادیا۔ یہاں تک کہ آپ کو ہلاک کرنے کے درپے ہوگیے۔ چنانچہ تقریباً ۱۳ سال کی پُرمشقت جدوجہد کے بعد آپ کو مکہ چھوڑ کر ۳۰۰ میل دور مدینہ جانا پڑا۔ مگر آج یہ حال ہے کہ کعبہ تو درکنار کوئی شخص عام مساجد کے نام پر بھی اگر "تحفظ مسجد" کی تحریک شروع کرتا ہے تو اس کے چاروں طرف انسانوں کی بھیڑ جمع ہوجاتی ہے۔ اس کے اوپر روپیہ کی بارش ہونے لگتی ہے۔ وہ صبح وشام میں عزت و لیڈری کا مقام حاصل کرلیتا ہے۔

مکی دور میں اہل مکہ مسلمانوں کو ستاتے تھے۔ چنانچہ مسلمانوں کی ایک تعداد عرب سے نکل کر حبش چلی گئی۔ یہ سب کے سب اصحاب رسول تھے۔ مگر حبش میں نہ ان عربوں کا استقبال ہوا، نہ وہاں ان کے لیے عظیم الشان کانفرنسیں کی گئیں۔ وہ کچھ عرصہ تک وہاں محنت مزدوری کرتے رہے۔ اور اس کے بعد غیراہم آدمی کی حیثیت سے دوبارہ اپنے وطن واپس آگیے۔ مگر آج یہ حال ہے کہ اسی عرب کا کوئی شیخ جب ہندستان یا کسی اور ملک میں جاتا ہے تو مسلمانوں کے تمام اصاغر واکابر ان کے استقبال کے لیے دوڑ پڑتے ہیں۔ ان کے اعزاز میں ایڈریس پیش کیے جاتے ہیں۔ اور عظیم الشان کانفرنسیں منعقد کی جاتی ہیں۔

لبید قدیم عرب کے ایک مشہور شاعر تھے۔ مکی دور میں انھوں نے قرآن کو سنا۔ اس کو سن کر انھوں نے اسلام قبول کرلیا اور شاعری چھوڑ دی۔ کسی نے پوچھا کہ تم نے شاعری کیوں چھوڑ دی۔ انھوں نے جواب دیا: اَبعدَ القرآن۔ (کیا قرآن کے بعد بھی) لبید کے اس عمل پر قدیم عرب میں انھیں کوئی اعزاز نہیں ملا۔ لیکن آج اگر کوئی مشہور شاعر ایسا کرے کہ وہ شہر کے چوراہہ پر کھڑا ہو کر اپنے کلام کو جلادے اور کہے کہ میں نے قرآن کو پڑھا تو مجھے اپنی شاعری پھیکی معلوم ہونے لگی۔ اب میں شاعری کو چھوڑ کر قرآن کو اختیار کرتا ہوں تو ایسے شاعر کی ہر طرف دھوم مچ جائے گی۔ وہ صبح وشام میں عظمت اور مقبولیت کے آسمان پر پہونچ جائے گا۔

قدیم زمانہ اور موجودہ زمانہ میں یہ فرق کیوں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قدیم زمانہ میں اسلام اجنبی تھا۔ آج اسلام ایک معروف اور غالب دین بن چکا ہے۔ قدیم زمانہ میں صرف چند بے سرو سامان لوگ اسلام کے ساتھ تھے۔ آج ساری دنیا میں ایک ارب انسان اسلام کے ساتھ ہیں۔ دولت اور اقتدار کے تمام اسباب اس کی پشت پر جمع ہیں۔ یہی وہ فرق ہے جس نے دو دوروں میں مذکورہ بالا قسم کا فرق پیدا کر دیا ہے۔

یہ معاملہ ہر دین کے ساتھ پیش آتا ہے۔ اس سے پہلے یہودیوں اور عیسائیوں کے ساتھ ایسا ہی ہوا۔ اور اب مسلمانوں کے ساتھ یہی صورت پیش آرہی ہے۔

ابتدائی دور میں خدا کی کتاب اور خدا کے دین کے ساتھ دنیوی اہمیت کی چیزیں جمع نہیں ہوتیں۔ اس بنا پر کسی کے لیے ممکن نہیں ہوتا کہ وہ کتابِ خداوندی یا دینِ خداوندی کے نام پر دھوم مچا سکے۔ مگر لمبی مدت گزر جانے کے بعد خدا کی کتاب اور خدا کے دین کے اندر دنیوی اور قیادتی قدریں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اب یہ ممکن ہو جاتا ہے کہ خدا کے دین کو اسی طرح قیادتی عنوان یا تجارتی سودا بنایا جا سکے جس طرح کوئی شخص غیر دینی اور غیر خدائی چیزوں کو بناتا ہے۔

یہ ایک زبردست فتنہ ہے جو ہمیشہ بعد کے دور میں پیدا ہوتا ہے۔ اور یہی وہ فتنہ ہے جس سے قرآن میں ان الفاظ میں منع کیا گیا ہے کہ اللہ کی آیتوں کے بدلے ثمنِ قلیل نہ لو:

ولاتشتروا بآیاتی ثمناً قلیلاً (البقرہ ۴۱)	اور میری آیتوں پر تھوڑا مول نہ لو (یعنی دین کے نام پر دنیا نہ کماؤ)

قرآن میں اس مضمون کی کئی آیتیں ہیں جن میں اللہ کے کلام کے بدلے ثمنِ قلیل لینے کو منع کیا گیا ہے۔ اس سے مراد عین وہی چیز ہے جس کو موجودہ زمانہ میں استغلال یا استحصال (Exploitation) کہا جاتا ہے۔ یعنی اسلام کو اپنی قیادت کا عنوان بنانا۔ قرآن اور اسلام کا نام لینا اور اس کے ذریعہ سے دنیا کا ساز و سامان حاصل کرنا۔

موجودہ زمانہ میں یہ فتنہ بہت بڑے پیمانہ پر پیدا ہو گیا ہے۔ لوگ اسلام کے چیمپین بن کر عزت، دولت، قیادت کا ڈھیر اپنے گرد جمع کر رہے ہیں۔ مگر قیامت میں جب پردہ ہٹے گا تو معلوم ہوگا کہ اسلام کے یہ چیمپین صرف اسلام کے سوداگر (Exploiter) تھے، اس کے سوا اور کچھ نہیں۔

اسلام کا مقصد

ایک صاحب نے کہا کہ اسلام عملاً ایک ناکام نظام ہے کیوں کہ وہ تین برس سے زیادہ نہیں چل سکا۔ میں نے کہا کہ اس اعتراض کا تعلق اسلام سے نہیں ہے بلکہ ان نام نہاد اسلامی مفکرین سے ہے جنھوں نے اسلام کی غلط تعبیر کرکے اس کو ایک نظام کی صورت میں دنیا کے سامنے پیش کیا۔

یہ لوگ کہتے ہیں کہ اسلام کا مقصد دنیا میں حکومت الٰہیہ قائم کرنا ہے۔ یہ کہہ کر وہ اسلام کو جانچنے کا ایک غلط معیار لوگوں کے ہاتھ میں دے دیتے ہیں۔ یہ بات بذات خود غلط ہے کہ اسلام کا مقصد دنیا میں حکومت الٰہیہ قائم کرنا ہے۔ اس لیے اس معیار پر اسلام کو جانچنا بھی درست نہیں ہوسکتا۔

بات کو واضح کرنے کے لیے میں نے ان کے سامنے ایک مثال دی۔ میں نے کہا کہ آپ تبلیغی جماعت کو لیجئے۔ تبلیغی جماعت کے متعلق اگر آپ یہ کہیں کہ اس کا مقصد نئی دہلی کی پارلیمنٹ ہاؤس پر قبضہ کرنا ہے تو آپ کو نظر آئے گا کہ تبلیغی جماعت ایک سراسر ناکام جماعت ہے کیوں کہ وہ پارلیمنٹ ہاؤس پر ایک فی صد بھی سیاسی قبضہ حاصل نہ کرسکی۔ لیکن اگر آپ تبلیغی جماعت کو جانچنے کا یہ معیار قائم کریں کہ اس کا مقصد لوگوں کو ایمان اور نماز کے راستہ پر ڈالنا ہے تو معلوم ہوگا کہ تبلیغی جماعت ایک بے حد کامیاب جماعت ہے، کیوں کہ اس کی محنت نے لاکھوں لوگوں کو ایمان اور نماز کے راستہ پر ڈال دیا۔

میں نے کہا کہ آپ کا اعتراض نام نہاد اسلامی مفکرین کے خود ساختہ نظریہ پر وارد ہوتا ہے نہ کہ خدا اور رسول والے اسلام پر۔

یہ بات بذات خود بالکل غلط ہے کہ اسلام کا مقصد حکومت قائم کرنا ہے۔ اصل یہ ہے کہ اسلام کا مقصد انسان کو ربّانی انسان بنانا ہے۔ اسلامی جماعت کا صحیح نام جماعت ربانی ہے نہ کہ جماعت حکمرانی۔ اسلام کا اصل مخاطب فرد ہے۔ اسلام ایک ایک فرد کی اس فطرت کو جگانا چاہتا ہے جس پر اس کے خالق نے اسے پیدا کیا ہے، تاکہ انسان اپنے رب کو پہچانے، تاکہ وہ اللہ سے خوف اور محبت کا تعلق قائم کرے، تاکہ وہ ایک آخرت پسند انسان بن جائے۔

دو قسمیں

ہر آدمی اپنی نفسیات کے مطابق عمل کرتا ہے۔ یہی معاملہ مسلمانوں کا بھی ہے۔ کسی مسلمان کے اندر جس قسم کی نفسیات بنے گی، اسی کے مطابق اس کے تمام اعمال ظاہر ہوں گے۔ یہ نفسیات دو قسم کی ہو سکتی ہیں، ان کو مختصر الفاظ میں اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے:

اسلام برحق ہے، میں برحق ہوں

ان دو جملوں میں بظاہر صرف ایک لفظ کا فرق ہے۔ ایک فقرہ میں "اسلام" ہے، اور دوسرے فقرہ میں "میں"۔ مگر اسی معمولی فرق میں مسلمانوں کے عروج وزوال کی پوری کہانی چھپی ہوئی ہے۔ مسلمان جب ایک زندہ گروہ ہوں تو وہ اسلام کو برحق سمجھتے ہیں۔ اور جب وہ تنزل کا شکار ہوں تو اپنے آپ کو برحق۔ پہلے تصور سے خوفِ خدا کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور دوسرے تصور سے جھوٹے احساس برتری کا۔

اسلام بلاشبہ سب سے زیادہ سچا دین ہے۔ جب کسی آدمی پر اس کی سچائی منکشف ہوتی ہے تو اس کے اندر زبردست انقلاب آجاتا ہے۔ وہ اعلیٰ اخلاقیات کا پیکر بن جاتا ہے۔ وہ اسلام کو تمام انسانوں تک پہونچانے کے لیے بیتاب ہو جاتا ہے۔ ارشمیدس کو صرف پانی کا ایک قانون دریافت ہوا تھا۔ اس سے وہ اتنا بے خود ہوا کہ حوض سے ننگا نکل پڑا، اور یوریکا، یوریکا (میں پاگیا، میں پاگیا) کہتا ہوا باہر بھاگا۔ پھر کائنات کی سب سے بڑی سچائی جس کو مل جائے اس کا حال کیا ہوگا۔

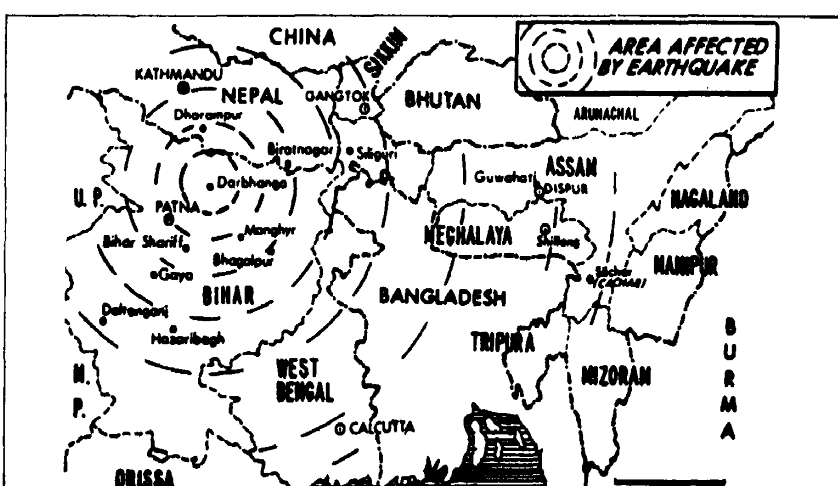
معرفت کے طور پر ملنے والا اسلام براہ راست خدا کی طرف سے ملتا ہے، اس لیے ایسے شخص کے اندر وہ صفات ابھرتی ہیں جو خدا کو دیکھنے اور اس کا تجربہ کرنے والے کسی شخص کے اندر پیدا ہونی چاہئیں۔ وہ عظمتِ خداوندی سے کانپ جاتا ہے۔ خدا کے کمالات کا احساس اس سے سرکشی کا مزاج چھین لیتا ہے۔ اس کے برعکس جس شخص کو دین خاندانی اثاثہ کے طور پر ملے، اس کو وہ قومی فخر یا خاندانی اعزاز کے ہم معنی سمجھ لے گا۔ اس کے نتیجہ میں اس کے اندر وہی چیز پیدا ہوگی جس کو ہم نے جھوٹے فخر کا نام دیا ہے۔

سمندر کا پانی اڑ جائے تو اس میں صرف نمک ہی نمک رہ جائے گا۔ ایسا ہی کچھ معاملہ مسلمانوں کا بھی ہے۔ ان کے دین سے جب خدا کا خوف نکل جائے تو اس کے بعد وہ صرف نمک بن کر رہ جاتا ہے جس کا ذائقہ لوگوں کو بدمزہ کر دے۔

بھونچال

زمین اچانک کانپنے لگی۔ مکانات ہلنے لگے۔ چار پائیاں جھولے کی طرح جھولنے لگیں۔ سوئے ہوئے لوگ اپنے بستروں پر جاگ اٹھے۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ زمین کی گڑگڑاہٹ اور انسانوں کی چیخ پکار نے ماحول کو آخری حد تک خوفناک بنا دیا۔ موت بالکل آنکھوں کے سامنے دکھائی دینے لگی۔ اس وقت کسی کو دوسرے کا ہوش نہ تھا۔ ہر آدمی اپنا گھر چھوڑ کر باہر کی طرف بھاگ رہا تھا۔ بڑی بڑی کوٹھیوں میں رہنے والے دولت مند افراد اور جھونپڑیوں میں زندگی گزارنے والے غریب مزدور، سب یکساں انداز میں ننگے پاؤں حیران و پریشان حالت میں کھلے میدان میں جمع ہو گئے۔ حواس باختہ اور دہشت زدہ چہرے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے مگر کچھ بول نہ سکتے تھے۔

یہ ۲۱ اگست ۱۹۸۸ کا زلزلہ تھا جو صبح چار بج کر ۴۰ منٹ پر آیا اور تقریباً ایک منٹ تک باقی رہا۔ اس کا مرکز دربھنگہ (بہار) تھا اور اس کے شدید جھٹکے نیپال اور آسام تک محسوس کیے گئے۔ بڑے رقبہ میں مکانات تاش کے پتوں کی طرح گر پڑے۔ شہر اجڑ گئے۔ دریا ابل پڑے اور بلندیاں زمین میں دھنس گئیں۔ تقریباً ایک ہزار افراد ہلاک ہو گئے دس ہزار سے زیادہ آدمی زخمی ہوئے۔ مکانات کی تباہی کی کوئی گنتی نہیں۔ زلزلہ کے دو ہفتہ بعد بھی دہشت کا یہ عالم تھا کہ نیپال کی راجدھانی کٹھمنڈو کے لوگ دوبارہ شہر میں جانے کے لیے تیار نہ تھے۔ ہزاروں افراد شدید بارش کے باوجود خیموں میں راتیں بسر کر رہے تھے مگر زلزلہ سے



ٹوٹی ہوئی عمارتوں میں دوبارہ داخل ہونا انھیں منظور نہ تھا لوگ اپنے گھروں کو خود ہی چھوڑ رہے تھے۔ اپنی جائدادوں کو اس طرح دیکھ رہے تھے جیسے وہ ان کی محبوب جائدادیں نہ ہوں بلکہ ڈراؤنے بھوت ہوں جو انھیں کھا جانا چاہتی ہوں۔

زلزلے عذاب نہیں، زلزلے تنبیہ ہیں۔ وہ قیامت کے اس آنے والے عذاب کو یاد دلاتے ہیں جس کے مقابلہ میں انسان مکمل طور پر بے بس ہوگا اور جب خدا کی پکڑ سے اپنے آپ کو بچانا کسی کے لیے ممکن نہ ہوگا۔ ایک عام آدمی جب زلزلہ میں مبتلا ہوتا ہے تو وہ سوچتا ہے کہ زلزلے کیوں آتے ہیں۔ مگر سائنس داں اس کے برعکس یہ سوچتا ہے کہ زلزلے کیوں نہیں آتے۔ کیوں کہ ہماری زمین کی بناوٹ اس ڈھنگ کی ہے کہ اس کو ہر وقت ہلنا چاہیے یا کم از کم بار بار اس کو بھونچال سے دوچار ہونا چاہیے۔ مگر ایسا نہیں ہوتا۔ بہار اور اس کے آس پاس کے علاقہ میں اس سے پہلے ۱۹۳۴ میں سخت زلزلہ آیا تھا جس میں ۱۰۷۰۰ آدمی ہلاک ہو گئے۔ اس کے بعد ۱۹۸۸ میں یہاں اس قسم کا زلزلہ آیا۔

ہمالیہ کا رقبہ، خاص طور پر اس کا شمال مشرقی علاقہ متحرک چٹانوں کے اوپر قائم ہے۔ اس قسم کے حلقہ کو بھونچالی حلقہ (Seismic belt) کہا جاتا ہے۔ زلزلے عام طور پر اسی طرح کے مقامات پر آتے ہیں۔ ہندستان میں اٹھارویں صدی کے آغاز سے زلزلوں کا باقاعدہ ریکارڈ رکھا جا رہا ہے۔ اس کے مطابق ۱۸۱۹ سے اب تک پندرہ بڑے زلزلے آچکے ہیں، سب سے زیادہ سخت بھونچال ۱۱ اکتوبر ۱۷۳۷ کو کلکتہ میں آیا تھا جس میں تین لاکھ سے زیادہ آدمی ہلاک ہو گئے۔

ہماری زمین ہر وقت زلزلہ کی زد میں ہے۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ زمین پر ہر سال ایک ملین (۱۰ لاکھ) بار تھرتھراہٹ پیدا ہوتی ہے۔ ان میں سے ۹۵ فیصد وہ ہیں جن کو صرف سائنس داں اپنی ریکارڈنگ مشین کے ذریعہ معلوم کر سکتے ہیں۔ بیسویں صدی میں دنیا کے مختلف مقامات پر جو زلزلے آئے ہیں، ان میں تقریباً دو ملین (۲۰ لاکھ) آدمی ہلاک ہو گئے اور ۱۰ ہزار کرور روپیہ کی املاک کو نقصان پہنچا۔ زمین کی تھرتھراہٹ جب غیر معمولی شدت اختیار کرلے تو اسی کا نام زلزلہ یا بھونچال ہے (ٹائمس آف انڈیا، ۲۳ اگست ۱۹۸۸)

زلزلے غیر محسوس حالت میں ہر روز آتے ہیں۔ خدا کبھی کبھی ان میں شدت پیدا کر کے ہمیں ان کی ہولناکی کو محسوس کرا دیتا ہے۔ یہ گویا ایک چیتاونی ہے کہ آدمی آنے والے بڑے زلزلہ (قیامت) کو یاد کرے اور اپنی اصلاح کر کے اپنے آپ کو خدا کی پکڑ سے بچالے۔

عجز کی قیمت

۳ مئی ۱۹۸۸ کو دہلی کے اخبارات میں صفحہ اول پر جن خبروں کو جگہ ملی، ان میں سے ایک خبر وہ تھی جو ہندستانی سینما کے مشہور شومین (Showman) مسٹر راج کپور سے متعلق تھی۔ ۲ مئی کو ایک خصوصی تقریب میں بہت سی فلمی شخصیتوں کو انعامات دیے گئے۔ مسٹر راج کپور کو ایک خصوصی اوارڈ دیا جانے والا تھا جو ایک لاکھ روپیہ نقد اور ایک قیمتی شال پر مشتمل ہے۔ اسٹیج کے اوپر ہندستان کے پریسیڈنٹ اور دوسرے کئی وزیر موجود تھے۔ نیچے بھرے ہوئے ہال میں سامنے کی سیٹ پر مسٹر راج کپور بیٹھے ہوئے تھے۔ عین اس وقت ان کو دمہ کا شدید دورہ پڑا، وہ اٹھنے سے معذور ہوگیے۔ قاعدہ کے مطابق، راج کپور کو اوپر جا کر پریسیڈنٹ کے ہاتھ سے انعام لینا تھا۔ مگر پریسیڈنٹ وینکٹارمن نے جب راج کپور کا یہ حال دیکھا تو تمام صدارتی آداب کو نظر انداز کرتے ہوئے وہ خود اسٹیج سے نیچے اتر پڑے تاکہ مسٹر راج کپور کو دادا صاحب پھالکے اوارڈ دے سکیں جو آڈیٹوریم میں اپنی سیٹ پر تقریباً گر پڑے تھے :

The President, Mr. R. Venkataraman, setting aside all protocol, walked down the steps of Siri Fort stage to hand over the Dadasaheb Phalke Award to an ailing Raj Kapoor who nearly collapsed in his seat in the auditorium.

راج کپور اپنے عمل کے اعتبار سے صرف " پھالکے اوارڈ " کے مستحق تھے۔ مگر جب وہ عجز اور معذوری کی سطح پر پہونچ گیے تو وہ " پریسیڈنٹ اوارڈ " کے مستحق قرار پائے۔

حدیث میں بتایا گیا ہے کہ کمزور مومن کے مقابلہ میں طاقت ور مومن اللہ کو زیادہ پسند ہے۔ مگر ہر ایک کے لیے خیر ہے۔ طاقت ور بندہ اگر حق کی حمایت کرکے اللہ کا پسندیدہ بنا تھا تو کمزور بندہ اپنے عجز کا اظہار کرکے اللہ کا محبوب بن جاتا ہے۔ عاجز انسان زیادہ بہتر طور پر اس پوزیشن میں ہوتا ہے کہ وہ خدا کی بے پناہ قدرت کے مقابلہ میں اپنے بے پناہ عجز کو دریافت کرے۔ وہ عاجزانہ عبدیت کے نازک ترین اور لطیف ترین جذبات کو پیش کرکے خدا کی رحمت خاص میں حصہ دار بن جائے۔

توہینِ رسول

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ذوالقعدہ ۶ھ میں مدینہ سے مکہ کے لیے روانہ ہوئے تاکہ وہاں پہونچ کر عمرہ کریں۔ آپ کے ساتھ تقریباً ڈیڑھ ہزار صحابہ بھی تھے۔ آپ مکہ کے قریب حدیبیہ کے مقام پر پہونچے تو معلوم ہوا کہ مکہ کے لوگ، جو اس وقت مشرک تھے، انھوں نے طے کیا ہے کہ آپ کو مکہ میں داخل نہ ہونے دیں۔ آپ حدیبیہ میں ٹھہر گیے۔

اس کے بعد اہل مکہ سے بات چیت شروع ہوئی۔ اس دوران اہل مکہ طرح طرح کی اشتعال انگیزی کرتے رہے۔ مگر آپ قطعاً اس سے مشتعل نہیں ہوئے اور صبر و برداشت کے ساتھ ان سے بات چیت جاری رکھی۔ آخر کار دونوں کے درمیان ایک معاہدہ ہوا۔ یہ معاہدہ بھی تقریباً یک طرفہ تھا۔ اس میں بظاہر وہ تمام باتیں مان لی گئی تھیں جن کا مطالبہ اس وقت اہل مکہ کر رہے تھے۔ اس معاہدہ کے تحت آپ کو پابند کیا گیا تھا کہ: آپ مکہ میں داخل نہ ہوں اور اس سال عمرہ کیے بغیر واپس چلے جائیں۔ مکہ کا کوئی آدمی مسلمان ہو کر مدینہ جائے تو اس کو دوبارہ مکہ واپس کر دیں۔ معاہدہ میں "محمد رسول اللہ" کا لفظ مٹائیں اور اس کے بجائے محمد بن عبداللہ کا لفظ لکھیں وغیرہ۔

اب ایک صورت یہ تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ سوچتے کہ اہل مکہ کی ان باتوں کو ہرگز نہیں ماننا ہے۔ کیوں کہ اس وقت اگر ان کی بات مان لی گئی تو آئندہ وہ اور زیادہ جری ہو جائیں گے۔ آج عمرہ کے لیے روک رہے ہیں، کل حج کے لیے روکیں گے۔ آج مکہ میں داخل ہونے پر پابندی لگا رہے ہیں، کل مدینہ میں داخلہ پہ پابندی لگائیں گے۔ آج نئے مسلمانوں کو واپس کرنے کے لیے کہہ رہے ہیں، کل پرانے مسلمانوں کو واپس کرنے کے لیے کہیں گے۔ آج رسول اللہ کا لفظ مٹانے کے لیے کہہ رہے ہیں، کل خدا کا لفظ مٹانے کا مطالبہ شروع کر دیں گے۔ وغیرہ، وغیرہ۔

مگر اہل مکہ کی ہٹ دھرمی کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح نہیں سوچا۔ آپ نے اس قسم کے تمام اندیشوں کو شیطانی وسوسہ قرار دیتے ہوئے انھیں بالکل نظر انداز کر دیا۔ اور اہل مکہ کی تمام شرطوں کو مان کر مدینہ واپس چلے آئے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ آپ کی یہ "واپسی" عظیم "اقدام" کے ہم معنی بن گئی۔ اس کے بعد اللہ کی مدد آئی اور صرف ۲ سال کے اندر مکہ بھی آپ کے قبضہ میں آ گیا

اور مکہ والے بھی ۔

موجودہ زمانہ میں بھی مسلمانوں کے سامنے اس قسم کے معاملات پیش آرہے ہیں۔ غیر مسلم طبقہ کی طرف سے بعض اوقات ایسے مطالبے کیے جاتے ہیں جو مذکورہ بالا مطالبات کے مشابہ ہیں۔ اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دوبارہ اپنی سنت کی زبان میں مسلمانوں سے کہہ رہے ہیں کہ میں تمہارے لیے خدائی نمونہ ہوں۔ تم وہی کرو جو میں نے کیا۔ مگر مسلمان ہر بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس کہنے کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ وہ جھوٹے لیڈروں کے کہنے پر چل رہے ہیں نہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کہنے پر ۔

جب بھی مذکورہ نوعیت کا کوئی معاملہ پیش آتا ہے تو نام نہاد لیڈر مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ دیکھو، ذرا بھی نرم نہ پڑنا۔ اگر تم نرم پڑے تو اغیار اور زیادہ کڑے ہو جائیں گے۔ دیکھو، ذرا بھی ان لوگوں کے ساتھ رعایت نہ کرنا۔ اگر تم نے رعایت کا معاملہ کیا تو وہ اور زیادہ دلیر ہو جائیں گے اور تمہارے ساتھ مزید سختی کا معاملہ کریں گے۔ ایسے مواقع پر مسلمان اپنے رسول کی سنت کو چھوڑ دیتے ہیں اور اپنے لیڈروں کے کہے کی طرف دوڑ پڑتے ہیں ۔

یہ بلاشبہ سب سے بڑی توہین رسول ہے۔ جب ایک طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوئے پکار رہے ہوں، اور دوسری طرف جھوٹے لیڈر اپنی جھوٹی آوازیں لگا رہے ہوں، ایسی حالت میں خدا کے رسول کی شان میں اس سے بڑی گستاخی اور کیا ہو سکتی ہے کہ مسلمان خدا کے رسول کی پکار کو نظر انداز کر دیں اور لیڈروں کی پکار کی طرف دوڑ پڑیں ۔

یہ توہین رسول کا سب سے زیادہ بڑا واقعہ ہے جو آج خدا کی زمین پر پیش آرہا ہے۔ اور اس توہین رسول کا ارتکاب کرنے والے وہ لوگ ہیں جو دوسروں کو توہین رسول سے روکنے کا جھنڈا اٹھائے ہوئے ہیں۔

مسلمانوں کو جاننا چاہیے کہ موجودہ حالت میں ان کا یہ فعل غفلت پر سرکشی کا اضافہ ہے۔ اور جو لوگ غفلت پر سرکشی کا اضافہ کریں وہ اللہ کے نزدیک صرف اپنے جرم کو بڑھاتے ہیں، وہ کسی درجہ میں بھی اس کو کم نہیں کرتے ۔

علمی مغالطے

موجودہ زمانہ میں جن مغربی محققین نے مذہب کا علمی مطالعہ کیا، انھوں نے عام طور پر یہ خیال قائم کر لیا کہ مذہب پہلے شرک کی صورت میں پیدا ہوا، اس کے بعد توحید کا عقیدہ آیا۔ اس مفروضہ کا سبب تاریخ کے بارہ میں ارتقائی تصور تھا۔ اپنے ارتقائی ذہن کے تحت انھوں نے سوچا کہ مذہب نے ارتقار کے انداز میں سفر کیا ہوگا۔ پھر اس "ہوگا" کو "ہے" مان کر انھوں نے کہہ دیا کہ مذہب کا سفر ارتقائی انداز میں ہوا ہے۔ کائناتی مظاہر میں تعدد کو دیکھ کر ابتدائی انسان نے سمجھ لیا کہ خدائی میں بھی تعدد ہے۔ پھر جب علم بڑھا تو تعدد نے توحید کی صورت اختیار کر لی۔

مگر بعد کی زیادہ گہری تحقیقات نے اس نظریہ کی غلطی واضح کر دی۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) کے مقالہ نگار نے توحید (Monotheism) کے زیر عنوان لکھا ہے کہ یہ فرض کرنے کی کوئی معقول وجہ نہیں کہ مذہب کی تاریخ میں کئی خداؤں کا تصور پہلے آیا اور ایک خدا کا تصور بعد کو پیدا ہوا۔ یہ ثابت کرنے کے لیے کوئی تاریخی مواد موجود نہیں ہے کہ ایک نظام عقائد دوسرے نظام عقائد کے مقابلہ میں زیادہ پرانا ہے، اگرچہ بہت سے اہل علم یہ مانتے ہیں کہ توحید مذہب کی اعلیٰ صورت ہے اور اس لیے بعد کو ظہور میں آئی، یہ فرض کرتے ہوئے کہ جو اعلیٰ ہے اسے بعد کو آنا چاہیے:

> There is no valid reason to assume that monotheism is a later development in the history of religions than polytheism. There exists no historical material to prove that one system of belief is older than the other, although many scholars hold that monotheism is a higher form of religion and, therefore, must be a later development, assuming that what is higher came later (12/381).

صحیح یہ ہے کہ توحید مذہب کی اصلی صورت ہے اور شرک مذہب کی بگڑی ہوئی صورت۔ لیکن مغربی علمار نے اپنے ارتقائی مفروضہ کے تحت یہ سمجھ لیا کہ شرک مذہب کی ابتدائی صورت ہے، اور توحید اس کی تکمیلی صورت۔ اس غلط مفروضہ کی بنا پر ان کا پورا نظریۂ مذہب غلط ہو گیا۔

توحید کو اصل اور شرک کو بگاڑ سمجھیے تو مذہب کی ایک شکل بنتی ہے، اور اگر توحید کو تکمیل اور شرک کو آغاز سمجھیے تو اس سے بالکل مختلف دوسری شکل۔

قربانی اسلام میں

حج ایک عالمی اور اجتماعی عبادت ہے۔ اس کی تاریخیں قمری مہینہ کے مطابق مقرر کی گئی ہیں۔ حج کے مراسم مکہ اور اس کے آس پاس کے مقامات پر پانچ دن کے اندر، ۸ ذی الحجہ سے ۱۲ ذی الحجہ تک ادا کئے جاتے ہیں۔ اس دوران دس ذی الحجہ کو منیٰ میں قربانی کی جاتی ہے۔ جانور کو ذبح کرتے ہوئے جو دعا پڑھی جاتی ہے وہ یہ ہے:

اِنِّی وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِی فَطَرَ السماواتِ والارضَ حنیفاً وما انا مِن المشرکین اِنَّ صَلاتی وَنُسُکی ومَحیایَ ومَمَاتِی لِلّٰہِ رَبِّ العالمین۔ لاشَرِیکَ لَہ وبِذالِکَ اُمِرْتُ وَاَنا مِنَ المُسْلِمِین اَللّٰھُمَّ مِنْکَ وَلَکَ۔ بِسمِ اللّٰہِ اللّٰہُ اَکْبَر

میں نے یکسو ہوکر اپنا چہرہ اس ذات کی طرف پھیر لیا جس نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا ہے۔ اور میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔ بے شک میری نماز اور میری قربانی اور میرا جینا اور میرا مرنا سب اللہ کے لئے ہے جو سارے جہان کا مالک ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ مجھے اسی کا حکم دیا گیا ہے۔ اور میں فرماں برداروں میں سے ہوں۔ اے اللہ، یہ تیرا ہی دیا ہوا ہے اور تیرے ہی لئے ہے۔ اللہ کے نام سے، اللہ سب سے بڑا ہے۔

اس دعا میں وہ مقصد پوری طرح جھلک رہا ہے جس کے لئے قربانی کا طریقہ مقرر کیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جانور کو ذبح کرنا محض ایک علامتی واقعہ ہے۔ اصل چیز جو حاجی سے یا صاحبِ قربانی سے مطلوب ہے وہ اس کی اپنی قربانی ہے۔ اصل مقصود ذاتی ذبیحہ ہے، جانور کا ذبیحہ تو صرف ایک ظاہری علامت کے طور پر مقرر کیا گیا ہے۔

ذاتی ذبیحہ یا ذاتی قربانی سے کیا مراد ہے۔ اس سے مراد وہ انسان بننا ہے جس کو مذکورہ دعا میں حنیف اور مسلم کہا گیا ہے۔ یعنی سرکشی کا طریقہ چھوڑ کر پوری طرح تابع دار اور فرماں بردار بن جانا۔ اپنی خواہش کو رہنما بنانے کے بجائے خدا کے حکم کو اپنا رہنما بنانا۔ اپنی چیز کو اپنا کسب سمجھنے کے بجائے اس کو خدا کا عطیہ سمجھنا۔ یہی اسلام (حوالگی) قربانی کی اصل روح اور

اس کی اصل اسپرٹ ہے۔ کسی شخص کی قربانی اسی وقت قربانی ہے جب کہ قربانی سے اس کے اندر یہ روح پیدا ہو جائے۔ اسی لئے قرآن میں کہا گیا ہے کہ اللہ کو جانور کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا۔ اللہ کو تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے (الحج ۲۷)

خوراک ہر آدمی کی ایک ناگزیر ضرورت ہے۔ آدمی اس دنیا میں کھائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اسی خوراک کو قربانی کے ذریعہ ایک بہت بڑے سبق میں ڈھال دیا گیا ہے۔ ذی الحجہ میں خدا کے نام پر جو جانور ذبح کیا جاتا ہے، وہ گویا وہی جانور ہے جس کو عام حالات میں بھی ذبح کر کے آدمی اپنی خوراک بناتا ہے۔ مگر حج کی مقدس عبادت کے ساتھ اس کو جوڑ کر اس بات کے سبق کا ذریعہ بنا دیا گیا کہ جس طرح تم جانور کو قربان کرتے ہو، اسی طرح تمہیں اپنے آپ کو قربان کرنا ہے۔ قربانی کے جانور کے گوشت کو صاحبِ قربانی خود کھاتا ہے اور دوسروں کو کھلاتا ہے۔ اور اگر وہ مقدار میں زیادہ ہو تو اجازت ہے کہ اس کو آئندہ استعمال کے لئے محفوظ کر لیا جائے۔

قربانی کی ظاہری صورت تو جانور کو ذبح کرنا ہے مگر اس کی روح اور اس کی اسپرٹ یہ ہے کہ اعلیٰ انسانی تقاضوں کے لئے اپنے آپ کو وقف کیا جائے۔ مقصد یا آدرش کی راہ میں اپنے آپ کو فنا کر دیا جائے۔ ہر چیز کی ایک ظاہری صورت ہوتی ہے اور ایک اس کی اندرونی اسپرٹ ہوتی ہے۔ یہی معاملہ قربانی کا ہے۔ اس کی ظاہری صورت ذبیحہ ہے، اور اس کی اصل اسپرٹ قربانی ہے۔

غور کیجئے تو ایک صحت مند سماج کو بنانے کے لئے واحد سب سے بڑی چیز جو درکار ہے، وہ یہ ہے کہ اس کے افراد کے اندر قربانی کی اسپرٹ زندہ ہو۔ افراد کی قربانی پر ہی سماج اور قوم کو زندگی ملتی ہے۔ یہی وہ سبق ہے جو قربانی کے ذریعہ صاحبِ قربانی کو دیا جاتا ہے۔

اس کی ایک مثال خود اس حکم کے اندر موجود ہے جو سفر حج کے دوران حاجی کو دیا گیا ہے۔ قرآن میں حکم ہوا ہے کہ جب حج کے لئے نکلو تو جدال نہ کرو (البقرہ ۱۹۷) یعنی سفر کے دوران تمہارا سابقہ جن لوگوں سے پیش آتا ہے ان سے جھگڑا اور تکرار نہ کرو۔ یہ ظاہر ہے کہ کوئی شخص خواہ مخواہ کسی سے جھگڑا اور تکرار نہیں کرتا۔ اس قسم کے ناخوشگوار واقعات ہمیشہ ردعمل کے طور پر پیش آتے ہیں۔ یعنی ایک ساتھی کی طرف سے کوئی قابل شکایت بات پیش آئی، اس پر دوسرا ساتھی بگڑ کر اس سے لڑنے لگا۔

اس حقیقت کو ذہن میں رکھئے تو مذکورہ حکم کا مطلب یہ ہے کہ قابل شکایت بات پیش آنے کے باوجود جھگڑا نہ کرو۔ یہ اعلیٰ اخلاق کی بات ہے، اور اس قسم کا اعلیٰ اخلاق قربانی کے بغیر ممکن نہیں۔ آدمی جب اپنے اندر اٹھنے والے جوابی اشتعال کو دباتا ہے، وہ اپنے منفی جذبات کو قربان کر دیتا ہے، تب جا کر یہ ممکن ہوتا ہے کہ وہ اپنے ساتھی کی قابل شکایت بات پر اس سے جدال نہ کرے۔ یہ قربانی ہی وہ زمین ہے جس پر وہ اخلاق قائم ہوتا ہے جو حاجی سے مطلوب ہے۔

فرد کے جذبات کی یہی قربانی صحت مند سماج بنانے کی واحد تدبیر ہے۔ جب بہت سے انسان مل کر رہتے ہیں تو لازماً ایسا ہوتا ہے کہ ایک کو دوسرے سے ٹھیس پہنچتی ہے۔ ایک کا مفاد دوسرے کے مفاد سے ٹکراتا ہے۔ ایسی حالت میں اگر لوگ جواب اور ردعمل کا طریقہ اختیار کریں تو پورا سماج خلفشار کا شکار ہو جائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ سماجی نظام کو بہتر حالت پر باقی رکھنے کی واحد تدبیر یہ ہے کہ لوگ ایک دوسرے کے بارے میں برداشت سے کام لیں جس کا دوسرا نام جذبات کی قربانی ہے۔ یعنی آدمی شکایت کو نظر انداز کرے۔ وہ ناگواری کو بھول کے خانہ میں ڈال دے۔ وہ اس طرح کے معاملات میں صبر و ضبط کا طریقہ اختیار کرے نہ کہ جواب اور ردعمل کا۔

قربانی کا سلوک ہی بہتر سماج کے قیام کا واحد ضامن ہے۔ جس سماج کے افراد میں برداشت اور قربانی کا مادہ نہ ہو، اس سماج میں کبھی امن اور انصاف کا ماحول قائم نہیں ہو سکتا۔ افراد کی قربانی سماج کو زندگی عطا کرتی ہے۔ جس سماج کے افراد قربانی والی روش پر راضی نہ ہوں، اس سماج کو اس دنیا میں زندگی اور ترقی کی نعمت بھی نہیں مل سکتی۔

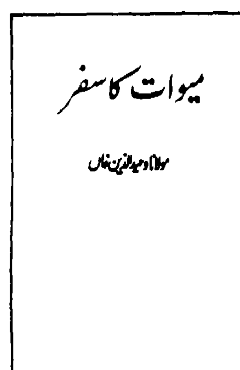
قربانی کا طریقہ ہر مذہب میں رائج رہا ہے۔ یہ ایک مذہبی رسم ہے جس میں کسی چیز کو خدا کی نذر کیا جاتا ہے تاکہ اس کا تقرب اور وسیلہ حاصل کیا جائے۔ یہ طریقہ ہر مذہب میں اور ہر دور میں پایا جاتا رہا ہے۔ یہ خدائے کبیر کے سامنے انسانِ صغیر کا نذرانہ ہے۔ آخری چیز جو کسی کے سامنے پیش کی جائے وہ جان ہے۔ انسان جب خدا کی عظمت سے سرشار ہوتا ہے تو وہ چاہتا ہے کہ اپنی جان اس کے اوپر فدا کر دے۔ اس موقع پر گویا اللہ تعالیٰ اپنی خصوصی عنایت سے آدمی کی جان کے فدیہ کے طور پر جانور کی قربانی کو قبول کر لیتا ہے۔ اور انسان کو موقع دیتا ہے کہ وہ زندہ رہ کر دنیا میں اعلیٰ مقصد کے لئے کام کرے۔ وہ اپنی سرفروشی کے جذبات کو تعمیری راہوں کی طرف موڑ دے۔

حج میں ضبط و تحمل کا تعلق محض انسانوں تک محدود نہیں ہے، بلکہ جانوروں تک کے بارہ میں حاجیوں کو اسی کا حکم دیا گیا ہے۔ حجۃ الوداع کے سلسلہ میں ایک حدیث ان الفاظ میں آئی ہے:

عن ابنِ عباسٍ أنّه دفع مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم یومَ عرفةَ فسمع النبی صلی اللہ علیہ وسلم وراءَہ زَجراً شدیداً وضرباً لِلإبِلِ۔ فاشار بسوطہ الیہم وقال: یا ایھا الناسُ، علیکم بالسَّکینةِ فإنَّ البرَّ لیسَ بالایضاع (رواہ البخاری)

حضرت عبد اللہ بن عباس کہتے ہیں کہ عرفہ کے دن انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کوچ کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پیچھے سخت ڈانٹ سنی اور اونٹ کو مارتے دیکھا۔ آپ نے اپنے کوڑے سے ان کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا کہ اے لوگو، تم پر سکون لازم ہے۔ کیوں کہ نیکی تیز چلنے کا نام نہیں۔

میوات کا سفر



میوات کے تاریخی علاقہ پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ مگر "میوات کا سفر" اپنی نوعیت کی منفرد کتاب ہے۔ وہ سادہ معنوں میں صرف ایک علاقہ کا تذکرہ نہیں، وہ ۲۰ سالہ مشاہدہ کا ایک تحریری ریکارڈ ہے۔ براہ راست طور پر اگرچہ وہ علاقۂ میوات کی ایک تصویر ہے۔ مگر بالواسطہ طور پر وہ پوری ملت اسلامیہ سے تعلق رکھتی ہے۔ وہ سفرنامہ کی زبان میں ملت کے حال کا جائزہ اور اس کے مستقبل کی تعمیر کا نقشہ ہے۔

صفحات ۲۱۸ ہدیہ ۲۵ روپیہ

نوٹ: یہ تقریر آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے ۲۵ جولائی ۱۹۸۸ کو نشر کی گئی۔

غلط بیانی

انگریزی روزنامہ انڈین اکسپریس (۱۹ اکتوبر ۱۹۸۸) میں اس کے ایڈیٹر مسٹر ارن شوری کے قلم سے ایک تفصیلی مضمون شائع ہوا ہے۔ اس کی سنسنی خیز سرخی یہ ہے ـــــــ مگر خود آیات کے بارے میں کیا :

But what about the verses themselves?

اس مضمون میں کئی باتیں کہی گئی ہیں۔ تاہم دوسری باتوں کو چھوڑتے ہوئے ہم اس کے صرف اس حصہ کے بارے میں کچھ عرض کریں گے جس کا تعلق براہ راست طور پر قرآن سے ہے۔ اس حصۂ مضمون کا خلاصہ یہ ہے کہ سلمان رشدی کی کتاب شیطانی آیات (Satanic Verses) پر حکومت نے جو پابندی لگائی ہے وہ اس لیے لگائی ہے کہ اس سے ایک فرقہ کے جذبات مجروح ہوتے ہیں۔ اس منطق سے خود قرآن پر بھی پابندی لگائی جانی چاہیے کیوں کہ اس میں بھی ایسی آیتیں موجود ہیں جن سے دوسرے فرقوں کے لوگوں کے جذبات مجروح ہو رہے ہیں یا مجروح ہو سکتے ہیں۔

یہ آیتیں کیا ہیں۔ یہ آیتیں وہ ہیں جو جنگ سے تعلق رکھتی ہیں۔ ارن شوری نے اس قسم کی کچھ آیتوں کو نقل کرکے یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ قرآن اپنے ماننے والوں کو یہ حکم دیتا ہے کہ کافروں کو مارو، انھیں قتل کرو۔ اس طرح کی آیتیں واضح طور پر غیر مسلموں کے جذبات کو مجروح کرنے والی ہیں۔ اس لیے ان کے خیال کے مطابق، خود قرآن پر بھی پابندی لگنا ضروری ہے۔

ارن شوری نے یہ بات آزادانہ تحقیق اور عقلی اظہار خیال (Rational discourse) کے نام پر کی ہے۔ مگر زیادہ صحیح یہ تھا کہ وہ اپنی اس بات کو خود ساختہ الزام یا غلط بیانی (Rational falsification) کا نام دیتے۔ کیوں کہ انھوں نے قرآن کی جو چند آیتیں پیش کی ہیں وہ سب سیاق وسباق سے کاٹ کر پیش کی ہیں۔ اور اس طرح ان سے ایک ایسا خود ساختہ مفہوم نکالنے کی کوشش کی ہے جو خود آیتوں کے اندر موجود نہیں۔ یہاں ہم نمونے کے طور پر ان کے پیش کردہ حوالوں میں سے دو بنیادی حوالوں کا ذکر کریں گے۔

سورہ البقرہ کی دو آیتوں کے جزئی حصہ کا ترجمہ (انگریزی میں) انھوں نے اس طرح نقل کیا ہے: اور ان کو نکالو جس طرح انھوں نے تم کو نکالا ہے، اور فتنہ قتل سے بھی زیادہ سخت ہے (۱۹۱) اور ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ نہ رہے اور دین اللہ کا ہو جائے (۱۹۳)

اس طرح جنگ سے متعلق چند آیتیں نقل کرنے کے بعد انھوں نے سورۂ الاحزاب کی ایک آیت کا ترجمہ (انگریزی میں) اس طرح دیا ہے: اور کسی مومن اور مومنہ کے لیے گنجائش نہیں جب کہ اللہ اور اس کا رسول کسی کام کا حکم دیدیں کہ پھر ان کو اس کام میں کوئی اختیار باقی رہے، اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کا حکم نہ مانے گا تو وہ صریح گمراہی میں پڑ گیا (۳۶)

اس طرح کے کچھ اقتباسات نقل کر کے مضمون میں یہ تاثر دینے کی کوشش کی گئی ہے کہ قرآن غیر مسلموں کو مارنے اور انھیں قتل کرنے کا حکم دیتا ہے۔ اور جب خدا کا حکم آجائے تو قرآن کے مطابق، مومنین قرآن پر لازم ہو جاتا ہے کہ وہ بے چون و چرا اس کی تعمیل کریں۔ یعنی تلوار لے کر اٹھیں اور غیر مسلموں کو ایک طرف سے مارنا شروع کر دیں۔

ارن شوری کی اس لغو تشریح کا قرآن سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ سراسر ایک خود ساختہ تشریح ہے جو ناقص اقتباسات کی بنیاد پر بنائی گئی ہے۔ یہ بات اس وقت نہایت آسانی سے واضح ہو جاتی ہے جب کہ مذکورہ آیات کو ان کے سیاق (Context) میں رکھ کر دیکھا جائے۔

۱۔ سب سے پہلے سورۃ البقرہ کو لیجیے۔ اس کے جس حصہ سے مذکورہ الفاظ لیے گیے ہیں، اس پورے حصہ کا ترجمہ یہ ہے:

اور اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑائی کرتے ہیں، اور زیادتی نہ کرو، اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اور ان کو قتل کرو جہاں انھیں پاؤ اور ان کو نکالو جہاں سے انھوں نے تم کو نکالا ہے۔ اور فتنہ قتل سے زیادہ سخت ہے، اور ان سے مسجد حرام کے پاس نہ لڑو جب تک کہ وہ تم سے اس میں جنگ نہ چھیڑیں، پس اگر وہ تم سے جنگ چھیڑیں تو ان سے جنگ کرو، یہی سزا ہے انکار کرنے والوں کی۔ پھر اگر وہ باز آجائیں تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ اور ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ (Persecution) باقی نہ رہے اور دین اللہ کا ہو جائے، پھر اگر وہ باز آجائیں تو اس کے بعد سختی نہیں ہے مگر ظالموں پر (۱۹۰-۱۹۳)

مذکورہ آیت میں " ان سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں " (وقاتلوا فی سبیل اللّٰہ الذین یقاتلونکم) کے الفاظ ہیں۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اس آیت میں دفاع (Defence) کا حکم دیا گیا ہے نہ کہ جنگ کا۔ یعنی یہ کوئی مطلق یا عمومی ہدایت نہیں ہے، بلکہ اس کا تعلق اس ہنگامی صورت حال سے ہے جب کہ کچھ لوگوں نے جارحیت کا آغاز کر کے اہل ایمان کے خلاف جنگ چھیڑ دی ہو۔ گویا کہ یہ دفاع کی آیت ہے نہ کہ قتال کی آیت۔ آیت کے اس ٹکڑے کا صحیح انگریزی ترجمہ یہ ہوگا :

And fight in the way of God those who fight you (2:190)

اب مسٹر ارن شوری یا ان کے ہم خیال لوگ بتائیں کہ دنیا کا کون سا قانون یا کون سا بین اقوامی رواج ہے جو دفاع کو قابل اعتراض قرار دیتا ہے۔ مسٹر ارن شوری کو اگر ہندستان کا پرائم منسٹر بنا دیا جائے تو کیا وہ ایسا کریں گے کہ وزارت دفاع کا شعبہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دیں۔ کیا وہ بری، بحری، اور ہوائی افواج کے تمام لوگوں کو ریٹائر کر کے گھر بھیج دیں گے۔ ملک کے بچاؤ کے لیے جو ہتھیار جمع کیے گیے ہیں ان کو وہ بحر ہند میں پھنکوا دیں گے اور ملک میں فوجی سامان تیار کرنے کے جتنے کارخانے ہیں ان سب کو تبدیل کر کے انھیں کھیل اور تفریح کا کلب بنا دیں گے۔ اگر وہ ایسا نہیں کریں گے اور یقیناً نہیں کریں گے تو انھیں کیا حق ہے کہ قرآن کے ایک ایسے حکم پر اعتراض کریں جو دنیا کے تمام قوانین اور تمام بین اقوامی رواج کے مطابق عین درست ہے اور مسلمہ طور پر ایک جائز حق ہے۔ یعنی جارحانہ کارروائی کے خلاف دفاع کا حق۔

۲۔ اب دوسری سورہ (الاحزاب) کے اقتباس کو لیجئے۔ اس آیت کا پورا ترجمہ یہ ہے : اور کسی مومن مرد یا کسی مومن عورت کے لیے گنجائش نہیں کہ جب اللّٰہ اور اس کا رسول کسی معاملہ کا فیصلہ کر دیں تو پھر ان کے لیے اس میں اختیار باقی رہے۔ اور جو شخص اللّٰہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا تو وہ صریح گمراہی میں پڑ گیا (۳۶)

سورۃ الاحزاب کی یہ آیت جس سلسلۂ بیان میں آئی ہے، اس کا قطعاً کوئی تعلق جنگ سے نہیں ہے۔ یہ آیت دراصل ایک معاشرتی اصلاح کے ذیل میں نازل ہوئی ہے۔ اس کی تفصیل تفسیر کی کتابوں میں موجود ہے جس کا خلاصہ یہ ہے۔

مدینہ میں ایک خاتون تھیں جن کا نام زینب بنت جحش تھا۔ وہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی زاد بہن تھیں، اور قریش کے اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے ۴ھ میں ان کے یہاں زید بن حارثہ کے لیے نکاح کا پیغام دیا جو ایک آزاد کردہ غلام تھے۔ یہ بظاہر ایک نابرابری کا رشتہ تھا۔ چنانچہ زینب بنت جحش اور ان کے گھر والوں نے اس کو نامنظور کر دیا، خود زینب نے کہا کہ میں زید سے نسب میں بہتر ہوں (انا خیر منہ حسبًا)

زینب اور ان کے گھر والے سب کے سب مسلمان تھے۔ انھوں نے حسب نسب کے فرق کی بنیاد پر اس رشتہ کو ماننے سے انکار کیا تھا جو قرآنی اسکیم کے سراسر خلاف تھا۔ اس وقت قرآن میں یہ آیت اتری۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اسلام کی شریعت خدا کے احکام پر مبنی ہے نہ کہ قومی اور خاندانی رواج پر۔ اگر تم واقعۃً اللہ اور رسول کے مومن ہو تو تمھیں وہی کرنا چاہیے جس کا حکم خدائی شریعت میں دیا گیا ہے۔ روایات بتاتی ہیں کہ اس آیت کے اترتے ہی زینب اور ان کے گھر والوں نے خاندانی نخوت کو ترک کر دیا اور خدا کے حکم کے مطابق زید بن حارثہ سے نکاح پر راضی ہو گیے (فامتنعت ثم اجابت)

اصل پس منظر کے اعتبار سے دیکھیے تو مذکورہ آیت ایک عظیم سماجی انقلاب کا عنوان ہے جب کہ تاریخ میں پہلی بار مصنوعی اونچ نیچ کو ختم کر کے حقیقی انسانی مساوات کو قائم کیا گیا۔ قرآن کی یہ آیت نہ صرف مومنین قرآن کے لیے بلکہ تمام قوموں کے لیے فخر کی آیت ہے۔ یہ آیت اس دن کو یاد دلاتی ہے جب کہ ہزاروں سال سے جکڑی ہوئی انسانیت کو جھوٹے بندھنوں سے آزادی حاصل ہوئی اور تاریخ میں یہ وہ نیا عمل شروع ہوا جو موجودہ زمانہ میں مساوات انسانی کے عمومی اعتراف کے مرحلہ تک پہنچا۔

آدمی کے اندر اگر اعتراف کا حوصلہ ہو اور اس کو دیکھنے والی آنکھ حاصل ہو تو وہ اس آیت میں سچی انسانیت کی روشنی دیکھے گا، مگر جو لوگ بصیرت سے محروم ہوں، ان کے لیے تو اجالا بھی ویسا ہی تاریک ہے جیسا کہ اندھیرا:

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم　　چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

ایک مثال

انڈین پینل کوڈ کی دفعہ ۹۶ سے لے کر دفعہ ۱۰۶ تک ذاتی دفاع کے بارے میں ہیں۔ اس کی دفعہ ۹۶ آدمی کو یہ حق دیتی ہے کہ وہ اپنے دفاع (بچاؤ) میں لڑے۔ اگر کسی شخص پر جارحیت کی

جائے اور وہ اپنے دفاع میں دوسرے شخص پر حملہ کرے تو یہ قانونی اعتبار سے اس کے لیے جرم نہیں ہوگا :

Nothing is an offence which is done in the exercise of the right of private defence.

اب اگر کوئی شخص ان دفعات کو لے کر یہ کہنے لگے کہ ہندستان کا قانون ہر آدمی کو کھلی اجازت دیتا ہے کہ وہ اپنے مذہب کے خلاف جس کو پائے اس کو مارنا شروع کر دے۔ تو ایسا شخص یقیناً غلطی کرے گا۔ کیوں کہ وہ خصوصی حکم کو عمومی حکم بنا رہا ہے۔ وہ دفاع کے حکم سے آزادی مذہب کا حکم نکال رہا ہے۔

ہندستان کا قانون مذہبی آزادی کے معاملہ میں کیا ہے، اس کو پینل کوڈ (قانون فوجداری) سے اخذ نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے لیے دستور ہند کی وہ دفعہ دیکھنی ہوگی جو بنیادی حقوق (Fundamental rights) سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کو دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ ہندستان کے قانون نے مذہب کے معاملہ میں ہر آدمی کو پوری آزادی عطا کی ہے۔ اس کے مطابق، نہ کسی سے اپنی پسند کا عقیدہ رکھنے کا حق چھینا جاسکتا اور نہ اس معاملہ میں اس کو مجبور کیا جاسکتا۔

مسٹر ارن شوری نے یہی غلطی قرآن کو سمجھنے میں کی ہے۔ وہ قانون دفاع اور قانونِ مذہب کو ایک دوسرے میں گڈمڈ کر رہے ہیں۔ انھوں نے قرآن سے "قتال" کی جو آیتیں نقل کی ہیں وہ سب دفاع کے مسئلہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ یعنی یہ کہ جارحیت کے وقت مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیے۔ جہاں تک اس دوسرے سوال کا تعلق ہے کہ مذہب کی آزادی کے بارے میں قرآن کا نقطۂ نظر کیا ہے، اس سلسلہ میں مسٹر ارن شوری کو چاہیے کہ وہ قرآن کی ان آیتوں کا مطالعہ کریں جو خاص طور پر اس دوسرے مسئلہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ مثلاً :

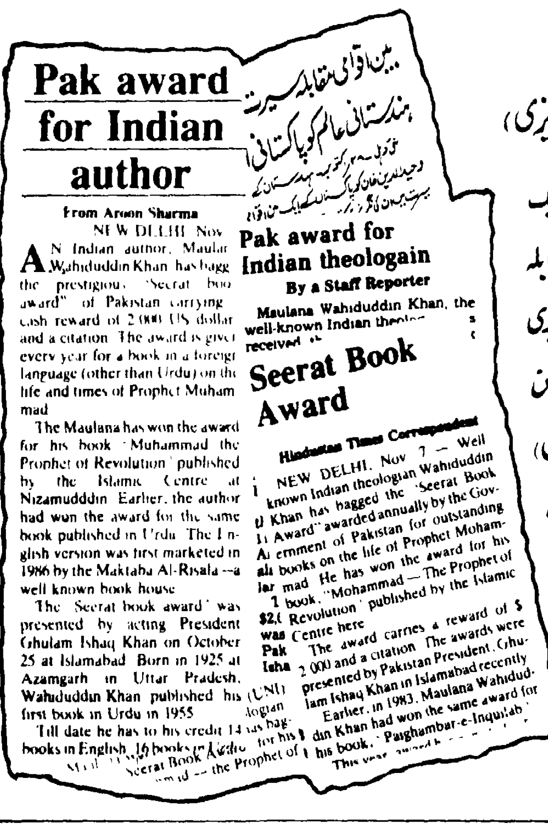
۱۔ دین کے معاملہ میں کوئی زبردستی نہیں، ہدایت گمراہی سے الگ ہو چکی ہے۔ پس جو شخص طاغوت (شیطان) کا انکار کرے اور اللہ پر ایمان لائے، تو اس نے مضبوط حلقہ کو پکڑ لیا جو ٹوٹنے والا نہیں، اور اللہ سننے والا، جاننے والا ہے (البقرہ ۲۵۶)

۲۔ پس تم لوگوں کو نصیحت کرو، تم صرف نصیحت کرنے والے ہو۔ تم ان کے اوپر داروغہ نہیں ہو۔

(الغاشیہ ۲۱-۲۲)

قرآن میں اس طرح کی بہت سی آیتیں ہیں جو واضح طور پر بتاتی ہیں کہ عقیدہ یا مذہب کا معاملہ تمام تر ذاتی ضمیر کا معاملہ ہے۔ ہر آدمی کو یہ حق ہے کہ وہ جس عقیدہ یا جس مذہب کو چاہے مانے اور جب چاہے اپنے ذاتی فیصلہ سے اس کو بدل دے۔ مذہب کے معاملہ میں کسی پر کوئی زبردستی نہیں۔ مذہب کے معاملہ میں صرف تبلیغ ہے نہ کہ جبر۔

خلاصہ یہ کہ اسلامی قانون جارحیت کے موقع پر ہر شخص یا قوم کو اپنے دفاع (بچاؤ) کا حق دیتا ہے۔ مگر جہاں تک مذہبی آزادی کا تعلق ہے، وہ ہر ایک کے لیے مذہبی آزادی کا حق تسلیم کرتا ہے۔ "قتال" کے قرآنی حکم کا تعلق صرف پہلے معاملہ سے ہے، دوسرے معاملہ سے جنگ وقتال کا کوئی تعلق نہیں۔



Pak award for Indian author

From Aroon Sharma

NEW DELHI Nov

AN Indian author, Maulana Wahiduddin Khan has bagg the prestigious "Seerat boo award" of Pakistan carrying cash reward of 2,000 US dollar and a citation The award is give every year for a book in a foreign language (other than Urdu) on the life and times of Prophet Muhammad

The Maulana has won the award for his book "Muhammad the Prophet of Revolution" published by the Islamic Centre at Nizamudddin Earlier, the author had won the award for the same book published in Urdu The English version was first marketed in 1986 by the Maktaba Al-Risala --a well known book house

The Seerat book award" was presented by acting President Ghulam Ishaq Khan on October 25 at Islamabad Born in 1925 at Azamgarh in Uttar Pradesh, Wahiduddin Khan published his first book in Urdu in 1955

Till date he has to his credit 14 books in English 16 books in Urdu

بین اقوامی مقابلہ سیرت

ہندستانی عالم کو پاکستانی

وحیدالدین خان کو پاکستان کے

Pak award for Indian theologain

By a Staff Reporter

Maulana Wahiduddin Khan, the well-known Indian theolo... received ...

Seerat Book Award

Hindustan Times Correspondent

NEW DELHI, Nov 7 — Well known Indian theologian Wahiduddin Khan has bagged the "Seerat Book Award" awarded annually by the Government of Pakistan for outstanding books on the life of Prophet Mohammad He has won the award for his book, "Mohammad — The Prophet of Revolution" published by the Islamic Centre here

The award carries a reward of $ 2,000 and a citation The awards were presented by Pakistan President, Ghulam Ishaq Khan in Islamabad recently

Earlier, in 1983, Maulana Wahiduddin Khan had won the same award for his book, "Paighambar-e-Inquilab"

پیغمبر انقلاب (انگریزی)

پاکستان میں سیرت کی کتابوں کا ایک بین اقوامی مقابلہ ہوا۔ اس مقابلہ میں اسلامی مرکز کی سیرت پر انگریزی کتاب پرافٹ آف ریولیوشن (مولفہ مولانا وحیدالدین خاں) کو پہلے انعام کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔

ایک تبصرہ

مسٹر دلیپ ہیرو مسلم دنیا کے معاملات کے ماہر سمجھے جاتے ہیں۔ انھوں نے اس موضوع پر کئی کتابیں لکھی ہیں۔ ان کی ایک کتاب ۱۹۸۸ میں لندن سے چھپی ہے، اس کا نام اسلامی بنیاد پرستی ہے:

Dilip Hiro, *Islamic Fundamentalism*

اس کتاب میں جو باتیں کہی گئی ہیں، ان میں سے ایک بات یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کے اسلامی بنیاد پرستوں کو شکست اور اس سے بھی زیادہ بری چیز ذلت، دونوں سے سخت طور پر دوچار ہونا پڑا۔ ان کا معاملہ صرف اتنا نہیں ہے کہ وہ اپنے پیغمبر محمد کی طرف لوٹ رہے ہیں اور اپنے مذہب کی بنیادی تعلیمات کو متعین کرکے اس کی پیروی کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی موجودہ سرگرمی شدید طور پر مغرب کے خلاف ردعمل اور ہر اس چیز سے نفرت کے نتیجہ میں پیدا ہوئی ہے جس کا تعلق مغرب سے ہو:

> Having experienced both defeat and, worse, contempt, the Islamic fundamentalists of today seek to do more than just follow their ancestor Muhammad and define the fundamentals of a religious system and adhere to them. Their drive today is explosively fuelled by a reactionary hatred of all that is Western.

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے درمیان اٹھنے والی وہ تحریکیں جن کو مغربی پریس اسلامی فنڈمنٹلزم کہتا ہے، اور خود مسلمان جس کو صحوۃ اسلامیہ (اسلامی بیداری) کہنا پسند کرتے ہیں، ان کی اصل حقیقت یہی ہے کہ وہ ردعمل اور نفرت کے طور پر اٹھی ہیں۔ وہ قومی تحریکیں ہیں نہ کہ اسلامی تحریکیں۔ اسلامی تحریک محبتِ اقوام کی زمین پر ابھرتی ہے۔ جب کہ یہ تحریکیں نفرتِ اقوام کی زمین پر ابھری ہیں۔ آپ ان تحریکوں کا کوئی پرچہ پڑھیں، یا ان کے کسی اجتماع میں شریک ہوں۔ آپ کو ان میں دوسروں کے لیے خیر خواہی اور شفقت کی خوشبو نہیں ملے گی۔ اس کے برعکس آپ پائیں گے کہ وہ شکایت اور احتجاج جیسی باتوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ یہی واقعہ مذکورہ بیان کی تصدیق کے لیے کافی ہے۔ بظاہر یہ تبصرہ بہت تلخ ہے، لیکن اگر خالی الذہن ہو کر دیکھا جائے تو وہ عین درست نظر آئے گا۔

مصنوعی کامیابی

ستمبر ۱۹۸۸ میں ۲۲ واں اولمپک سیول (کوریا) میں ہوا۔ اس موقع پر ۲۴ ستمبر کو سو میٹر کی دوڑ کا مقابلہ ہوا۔ اس مقابلہ میں کناڈا کے ۲۶ سالہ بن جانسن (Ben Johnson) نے سو میٹر کا فاصلہ تقریباً دس سکنڈ میں طے کر کے دوڑ کا جو کمال دکھایا وہ ناقابل یقین حد تک شاندار تھا۔ ٹی وی پر دوڑ کا منظر دیکھنے والے ایک شخص نے کہا کہ وہ اس طرح دوڑا جیسے کوئی سانڈ دوڑتا ہے:

He ran like a bull

بن جانسن مقابلہ جیت کر عالمی چمپئن بن گیا۔ اس نے صرف اپنے ۲۴ ستمبر کے حریفوں کو نہیں ہرایا تھا بلکہ دوڑ کے عالمی ریکارڈ کو توڑ کر دنیا کا سب سے زیادہ تیز رفتار انسان (Fastest man on earth) بن گیا تھا۔ اس نے چیخ کر کہا کہ میں دنیا کا نمبر ایک شخص ہوں (I am the world no. 1) اس کی فاتحانہ تصویریں اگلے دن تمام دنیا کے اخباروں کی زینت بنی ہوئی تھیں۔ گولڈ میڈل اور ایک ملین ڈالر سے زیادہ بڑی چیز وہ تھی جو اس کو عالمی شہرت کی صورت میں اچانک حاصل ہوگئی (ٹائمس آف انڈیا ۲۵ ستمبر ۱۹۸۸)

مگر بن جانسن کی خوشی دیر تک باقی نہ رہی۔ قاعدہ کے مطابق کھیل کے فوراً بعد اس کا پیشاب لیا گیا جو مخصوص ماہرین کے پاس سائنسی تجزیہ کے لئے بھیج دیا گیا۔ ۲۷ ستمبر کو اس جانچ کی رپورٹ آئی تو معلوم ہوا کہ بن جانسن کی کامیابی کا راز مصنوعی دواؤں کا استعمال تھا۔ کھیل کے عالمی مقابلوں میں، کھیل کے وقت، شراب، منشیات یا ایسی دواؤں کا استعمال سختی کے ساتھ ممنوع ہے جو وقتی نشہ یا فوری طور پر مصنوعی قوت پیدا کرتی ہیں۔ بن جانسن نے مقابلہ کے میدان میں داخل ہونے سے کچھ پہلے اسی قسم کی ایک متوی عضلات دوا (Muscle-building drug) پی لی تھی جس کو اسٹانازولول (Stanazolol) کہا جاتا ہے۔ چنانچہ اس وقت اس کی دوڑ دوا کے زور پر تھی نہ کہ اپنی فطری طاقت کے زور پر۔

مذکورہ دریافت کے بعد بن جانسن سے سونے کا میڈل چھین لیا گیا۔ اعلان کیا گیا کہ

اب اس کو کھیل کے عالمی مقابلوں میں شریک نہیں کیا جائے گا۔ کناڈا کی حکومت نے اس کو ماہانہ ملنے والی امداد بند کردی۔ اس طرح کی مختلف ذلتیں ایک کے بعد ایک اس کے سامنے اس طرح آئیں کہ اس نے سیول میں مزید ٹھہرنے کا حوصلہ کھو دیا۔ وہ فوری طور پر اپنے وطن (کناڈا) کے لئے روانہ ہوگیا۔ ۲۷ ستمبر کو ایر پورٹ کی جو تصویریں اخبارات میں آئی ہیں، ان میں دکھایا گیا ہے کہ فوٹو گرافر اس کی تصویر لینا چاہتے ہیں اور وہ مسلسل اپنا منہ چھپانے کی کوشش کر رہا ہے (ہندستان ٹائمز ۲۸ ستمبر ۱۹۸۸)

بن جانسن کے ایجنٹ لاری ہائڈبریخت (Larry Heidebrecht) سے پوچھا گیا کہ بن جانسن نے کیوں سیول چھوڑ دیا، حالاں کہ اس کو اپنے دفاع کے لئے یہاں موجود رہنا چاہئے تھا۔ انڈین اکسپریس (۲۸ ستمبر ۱۹۸۸) کے مطابق، ایجنٹ نے جواب دیا کہ کیا آپ کا خیال ہے کہ آپ اس وقت سوالات کا جواب دینے کے قابل رہیں گے جب کہ آپ اپنی زندگی کے سب سے بڑے صدمہ سے دوچار ہوئے ہوں:

Do you think you would be around prepared to answer questions after the biggest shock of your life.

دنیا کے اس واقعہ میں آخرت میں پیش آنے والے اسی قسم کے واقعہ کی تصویر ہے۔ حدیث میں بتایا گیا ہے کہ قیامت میں کچھ لوگ آئیں گے جنھوں نے دنیا میں بظاہر بڑے بڑے اسلامی کارنامے انجام دئے ہوں گے۔ کوئی شخص عالم کی حیثیت سے مشہور رہا ہوگا۔ کسی نے اس اعتبار سے شہرت پائی ہوگی کہ اس نے دین کے کام میں بہت زیادہ مال خرچ کیا ہے۔ کوئی شخص مجاہد کا ٹائٹل پائے ہوئے ہوگا اور دین کی راہ میں جان دینے والے کی حیثیت سے قوم کے اندر ہیرو بنا ہوا ہوگا۔ مگر آخرت میں یہ لوگ جہنم میں ڈال دئے جائیں گے۔ خدا کہے گا کہ تم نے جو کچھ کیا شہرت اور ناموری کے لئے کیا، نہ کہ میری رضا اور خوشنودی کے لئے۔ تمہاری مطلوبہ چیز تم کو دنیا میں مل چکی۔ یہاں اب تمہارے لئے کچھ نہیں۔

جو شخص دین کے میدان میں غیر خدائی زور پر دوڑے۔ جس کا جوش دنیا کے لیے ہو نہ کہ آخرت کے لیے، ایسے شخص کا انجام آخرت میں زیادہ بڑے پیمانہ پر وہی ہوگا جو بن جانسن کا انجام کمتر پیمانہ پر دنیا میں ہوا۔ مصنوعی زور پر دوڑنا نہ دنیا میں کسی کے لیے مفید ہے اور نہ آخرت میں۔

اسلام مغربی لٹریچر میں

ڈاکٹر ہٹی (Philip K. Hitti) عربی زبان اور تاریخ کے مشہور ماہر ہونے کی حیثیت سے مغربی دنیا میں مشرق قریب کے مسائل پر سند سمجھے جاتے ہیں۔ انھوں نے عرب اور اسلام کے موضوعات پر متعدد کتابیں لکھی ہیں اور مختلف انسائیکلو پیڈیا کے مقالہ نگار ہیں۔ ان کی کتابیں یورپ اور ایشیا کی مختلف زبانوں میں ترجمہ ہوتی رہی ہیں۔ وہ مختلف یونیورسٹیوں میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے ہیں۔ اور اس وقت پرنسٹن یونیورسٹی (نیو جرسی) میں سامی ادب کے پروفیسر ہیں۔

اسلام اور مغرب (Islam and the West) ڈاکٹر ہٹی کی کتاب ہے جو ۱۹۶۲ء میں امریکہ سے شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب کے ۱۹۰ صفحات ہیں اور اس کا موضوع عیسائی دنیا اور اسلام کے تمدنی تعلقات کی تاریخ ہے جس میں بازنطینی سلطنت کے وقت سے لے کر اب تک مختلف قسم کے اتار چڑھاؤ پائے جاتے رہے ہیں۔ موصوف نے ترجموں کی مدد سے نہیں بلکہ اصل ماخذ سے براہ راست استفادہ کرکے یہ کتاب تیار کی ہے۔

کتاب کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے کے ابتدائی تین ابواب میں اسلام کا بالترتیب مذہب ریاست اور کلچر کی حیثیت سے تعارف ہے۔ چوتھا باب ہے ——"اسلام مغربی لٹریچر میں" پانچویں اور چھٹے باب میں بالترتیب مشرق کا مغرب پر اور مغرب کا مشرق پر نفوذ و اثر دکھایا گیا ہے۔ ساتویں باب میں اس تحریک کا مختصر تعارف ہے جو اسلام اور مغربی تہذیب کے درمیان مطابقت پیدا کرنے کے لئے مختلف اسلامی ممالک میں جاری ہے۔ کتاب کے دوسرے حصے میں قرآن اور دوسری قدیم کتابوں سے اسلام اور اسلامی تاریخ اور اسلامی شخصیتوں کے بارے میں اقتباسات نقل کئے گئے ہیں۔ یہ اقتباسات کل ۲۹ ہیں۔

ذیل میں کتاب کے چوتھے باب (Islam in Western literature) کا ترجمہ دیا جارہا ہے، اس معذرت کے ساتھ کہ نقل کفر کفر نباشد۔

قرون وسطیٰ کے مغربی لٹریچر میں پیغمبر اسلام کو عام طور پر جعل ساز اور جھوٹے رسول کی حیثیت

سے متعارف کرایا جاتا تھا۔ قرآن ان کی ایک بناوٹی کتاب اور اسلام ایک نفس پرستانہ طریق حیات تھا، دنیا میں بھی اور دوسری زندگی میں بھی۔ اس زمانے میں مذہب، اسلام اور عیسائیت دونوں کے درمیان دشمنی کی سب سے بڑی وجہ تھی۔ دونوں طرف یہ دعویٰ کیا جاتا تھا کہ ان ہی کا مذہب تمام صداقتوں کا واحد خزانہ ہے۔ مگر سیاسی اور فوجی تصادم، نظریاتی تصادم سے بھی زیادہ سخت ثابت ہوا۔

محمدؐ کے بعد ڈیڑھ صدی تک ان کے پیرو پہلے مدینہ، پھر دمشق اور اس کے بعد بغداد سے نکل کر بازنطینی سلطنت کو روندتے رہے۔ یہاں تک کہ بڑھتے ہوئے مسیحیت کے مشرقی دارالسلطنت کے دروازے تک پہنچ گئے۔ قسطنطنیہ کے سقوط (۱۴۵۳ء) کے بعد چار صدیوں میں مسلم سلجوق اور عثمانی ترک اپنی ہمسایہ مسیحی طاقتوں کے لئے سب سے بڑا خطرہ بن گئے۔ ۷۱۱ء سے شروع ہو کر تقریباً آٹھ سو برس میں مسلمان اسپین کے ایک حصہ پر قابض ہو چکے تھے اور انھوں نے فرانس تک پر دھاوا بول دیا تھا۔ سسلی دو صدیوں تک ان کے قبضہ میں رہا۔ اور اٹلی کے خلاف ایک فوجی اڈے کا کام کرتا رہا۔ بارہویں اور تیرہویں صدی کے دوران میں مغربی اقوام مسلمانوں کی زمین پر صلیبی جنگ لڑتی رہیں۔ ان صلیبی لڑائیوں کی یاد آئندہ نسلوں میں باقی رہی۔

زرتشت، بدھزم اور دوسرے کم ترقی یافتہ مذاہب کی کبھی اس طرح سے نفرت اور تحقیر نہیں کی گئی، جیسا کہ اسلام کے ساتھ پیش آیا۔ وہ قرون وسطیٰ کے مغرب کے لئے کوئی خطرہ نہیں تھے۔ اور نہ انھوں نے مقابل میں آنے کی کبھی کوشش کی۔ اس لئے یہ بنیادی طور پر خوف، دشمنی اور تعصب تھا جس نے اسلام کے بارہ میں مغرب کے نقطۂ نظر کو متاثر کیا۔ اسلام کا عقیدہ ایک دشمن عقیدہ تھا۔ اس لئے وہ غلط نہ ہو جب بھی شبہ کی نظر سے دیکھا جانا لازمی تھا۔

پھر زبان کا روک بھی تھا۔ مسیحیت اور دنیائے اسلام کے درمیان سیاسی اور فوجی تصادم کے چھ سو سال تک یورپ قرآن کی زبان کے باقاعدہ مطالعہ کی سہولت سے محروم رہا۔ اس پوری مدت میں لاطینی زبان کا کوئی عالم یورپ میں ایسا نہیں ملتا جو عربی زبان پر بھی عبور رکھتا ہو۔ قرآن کی زبان سے اس کامل بے خبری نے قرآن کے بارے میں غلط تعارف کو پھیلنے کا موقع دے دیا۔

قرون وسطیٰ اور اس کے بعد کی مسیحیت نے جس تحریری یا زبانی ذرائع سے اسلام کے بارہ میں اپنا تصور قائم کیا، وہ وہی تھا جو صلیبی جنگوں کے دوران میں وجود میں آئے یا ان ممالک کی معرفت ملے

جن سے اسلام کی لڑائی پیش آچکی تھی۔ مسیحی علما اور پادریوں نے اسی کے ذریعہ سے اسلام کی تصویر بنائی۔ اسلام کی اس یورپی تصویر اور اس کی حقیقی اسلامی تصویر میں کوئی مشابہت محض اتفاقی ہے۔

شام کے مشہور عیسائی عالم سینٹ جان آف دمشق (۷۴۹ء) کو بازنطینی روایات کا بانی کہا جا سکتا ہے۔ جان نوجوانی کی عمر میں بنو امیہ کے دربار میں حاضر ہوا۔ وہ عربی، سریانی اور یونانی زبانیں جانتا تھا اور اپنے زمانہ کے اہل علم میں ممتاز درجہ رکھتا تھا۔ اس نے اپنی کتاب میں اسلام کا تعارف ایک بت پرستانہ مذہب کی حیثیت سے کیا ہے جس میں ایک جھوٹے رسول کی پرستش ہوتی ہے۔ اس کے بیان کے مطابق محمدؐ نے ایک آرین راہب کی سرپرستی میں بائبل کی مدد سے اپنے اصول وضع کئے۔ یہ اسلام کے متعلق عیسائیت کے قدیم اور عام تصور کی ایک مثال تھی۔ چنانچہ ڈانٹے (م ۱۳۲۱ء) نے اپنی مشہور کتاب میں محمدؐ اور علیؓ کو نویں جہنم کے سپرد کر دیا جو تفرقہ پردازوں اور رسوا کن اعمال کرنے والوں کے لئے مخصوص ہے (نعوذ باللہ)

بازنطینیوں میں پہلا شخص جس نے محمدؐ کا باقاعدہ ذکر کیا اور اسلام پر گفتگو کی، وہ مورخ تھیوفین (Theophane) ہے جس کا زمانہ ۷۵۸ - ۸۱۸ ہے۔ وہ ایک خانقاہ کا بانی بھی تھا۔ تھیوفین بغیر کسی حوالے کے محمدؐ کو "مشرقی باشندوں کا حکمراں اور ایک بناوٹی رسول" لکھتا ہے۔ ڈانٹے کا ایک ہم عصر مسیحی جس نے بغداد کا سفر کیا تھا، اس نے یہ نظریہ پیش کیا کہ شیطان جب خود مشرقی ممالک میں عیسائی مذہب کی ترقی کو روک نہ سکا تو اس نے اپنی طرف سے ایک آسمانی کتاب تیار کی اور ایک ابلیس فطرت آدمی کو اپنے وسیلہ کے طور پر استعمال کیا۔ یہ آسمانی کتاب قرآن اور وہ وسیلہ محمد ہیں۔ (نعوذ باللہ)

عبد المسیح بن اسحاق الکندی ایک مشرقی عیسائی تھا۔ اس کو اسپین میں ایک سید زادہ مسلمان نے تحریری طور پر اسلام قبول کرنے کی دعوت دی۔ اس واقعہ نے عرب کے اس عیسائی کو موقع دیا کہ وہ عیسائیت کا دفاع کرے اور اسلام پر حملہ آور ہو۔ الکندی نے محمدؐ کو ایک شہوت پرست اور ایک قاتل کی حیثیت سے پیش کیا جن کی کتاب محض مصنوعی الہامات کا مجموعہ تھی اور جن کا مذہب دھوکے، تشدد اور نفس پرستانہ تعلیمات کی چاٹ دلا کر پھیلایا گیا۔ (رسالات الکندی مطبوعہ قاہرہ ۱۹۱۲ء)

ان باتوں کے نتیجہ میں عیسائی دنیا میں محمدؐ کے خلاف کچھ ایسی فضا پیدا ہوگئی تھی کہ کوئی

فسانہ خواہ وہ کتنا ہی عجیب ہو اور اس کی کوئی اصل نہ ہو، فوراً قبول کر لیا جاتا تھا۔ قرطبہ کا ایک بشپ ایولوگیس (Eulogius) جو اپنے وقت کا بہت بڑا عالم تھا، وہ ایک لاطینی تحریر کے حوالے سے جو ایک عیسائی راہب نے تیار کی تھی، لکھتا ہے کہ محمدؐ کی وفات کے بعد ان کے اصحاب فرشتوں کا انتظار کر رہے تھے جو اتریں اور ان کے جسم کو اوپر لے جائیں۔ مگر اس کے بجائے کتے آئے اور ان کے جسم کو کھا گئے اسی لئے مسلمان ہر سال بہت بڑے پیمانے پر کتوں کو ہلاک کرتے ہیں۔ ایولوگیس، اسپین کے مسلم دارالسلطنت میں رہتا تھا۔ وہ معمولی کوشش سے جان سکتا تھا کہ اس پورے افسانہ میں صرف اتنی سی حقیقت ہے کہ مسلمان کتے کو ایک ناپاک جانور سمجھتے ہیں۔

لاطینی زبان سے یہ کتے کا افسانہ فرانسیسی میں پہنچا۔ چنانچہ ایک قدیم فرانسیسی نظم میں کتے اور سور دونوں کو دکھایا گیا ہے کہ وہ محمدؐ کے جسم کو کھا رہے ہیں۔ سور کی یہ روایت عوام میں بہت مقبول ہوئی اور قرآن میں سور کی حرمت کی بہت آسان توجیہہ بن گئی۔ (حالاں کہ سور کی حرمت آپ کی وفات سے بہت پہلے کا واقعہ ہے ــــ دروغ گو را حافظہ نباشد۔ مترجم) اسی طرح یہ بھی کہا گیا کہ محمد کا تابوت زمین و آسمان کے درمیان فضا میں معلق ہے۔ اور لوگوں نے اس پر یقین کر لیا۔

بارہویں اور تیرہویں صدی میں صلیبی جنگوں کے ذریعہ اسلام کو مغلوب کرنے کی کوشش جب ناکام ہوگئی تو مسیحی حلقہ میں ایک نیا رجحان ابھرا ــــ اسلام کو تبلیغ و تحریص کے ذریعہ تباہ کیا جائے۔ بے دخلی کی کوشش کی جگہ عقیدہ کی تبلیغ نے لے لی۔ مشنری تحریک وجود میں آئی۔ کارملی رہبانوں کا حلقہ (Carmelite Friar Order) ایک صلیبی ہی نے (۱۱۵۴) ماونٹ کارمل پر قائم کیا تھا۔ اس صلیبی کا نام (Berthold) ہے۔ اس جماعت کے لوگ سفید چغہ پہنتے تھے، اسی لئے ان کو سفید پوش رہبان (White Friars) کہا جاتا ہے۔ (مترجم) فرانسس کن نے اس کی پیروی کی۔ ۱۲۱۹ء میں سینٹ فرانسس آف اسیسی قاہرہ گئے اور یہاں فرانسس کن مشنری سرگرمیوں کا آغاز کیا۔ مگر اس دور کی سب سے بڑی مشنری تحریک ایک اسپینی تحریک تھی، جو ریمنڈ لل (Raymond Lull) نے شروع کی جس کا زمانہ ۱۲۳۵ - ۱۳۱۵ ہے۔ لل نے روحانی صلیبی جنگ (Spiritual Crusades) کے لئے بہت دانشمندانہ نقشے بنائے جس کا مقصد مسلمانوں کو عیسائی بنانا تھا۔ بحث و مناظرہ اور استدلال کے ذریعہ کامیاب ہونے کے بارے میں اس کا یقین آخر وقت تک قائم رہا۔ اس کی تیاری کے لئے اس نے عربی

پڑھی اور اپنی خانقاہ میں اس کا درس دینا شروع کیا جو اس نے مرامر (Miramar) میں قائم کی تھی۔ اس کی عربی زبان اور اسلام سے اس کی واقفیت اس زمانہ میں اپنی مثال نہیں رکھتی تھی مگر ٹیونس میں اس کی مشنری سرگرمیاں ناکام ہوگئیں۔ توحید پرست مسلمانوں کے ذہن میں تثلیث کا عیسائی عقیدہ بٹھانے کی کوشش اتنی فضول تھی کہ بالآخر اس نے اسلام پر حملہ کرنا شروع کیا۔ وہ گلیوں میں نکل کر چلاتا پھرتا تھا ــــ "عیسائیوں کا عقیدہ صحیح ہے اور مسلمانوں کا عقیدہ غلط ہے"۔ ٹیونس میں ایک مشتعل مجمع نے اس پر حملہ کیا اور پتھر مارنے شروع کئے۔ یہاں تک کہ وہ ھلاک ہوگیا۔

عیسائیت اور اسلام میں زبان کا روک پہلی بار اس وقت ٹوٹا جب فرانس میں قرآن کا ترجمہ لاطینی زبان میں کیا گیا۔ یہ بیرونی زبان میں قرآن کا پہلا ترجمہ ہے۔ یہ ترجمہ تخمیناً ۱۱۴۱ء میں کیا گیا اور اس کے کرنے والے تین عیسائی اور ایک عرب باشندہ تھا۔ اس ترجمۂ قرآن کے ساتھ ایک ضمیمہ اس عنوان کے ساتھ لگا ہوا تھا ــــ "مسلمانوں کے عقائد کی تردید" اس کے بعد ۱۶۴۹ میں سیور ڈو ریر (Sieur du Ryer) نے اس ترجمہ کی مدد سے قرآن کو فرانسیسی زبان میں منتقل کیا۔ یہ شخص اسکندریہ میں فرانسیسی قونصل رہ چکا تھا۔ پھر اسی سال سیور ڈو ریر نے براہ راست عربی زبان سے فرانسیسی زبان میں قرآن کا ترجمہ کیا اور اس کے بعد اس کو محمد کا قرآن (The Alcoran of Mahomet) کے نام سے انگریزی میں منتقل کیا گیا۔ اس ترجمہ کی اشاعت کا مقصد مترجم کے الفاظ میں "ان تمام لوگوں کو مطمئن کرنا تھا جو ترکی کے کھوکھلے مذہب (Turkish Vanities) کے جاننے کے خواہشمند تھے۔ لفظ Mahomet خود محمدؐ کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔ آکسفرڈ انگلش ڈکشنری میں اس کی اٹھارہ شکلیں بتائی گئی ہیں۔ اسی طرح Mahound کی سترہ شکلیں Mohammad کی پانچ Muhammad کو لے کر ایک ہی نام کی اہم مختلف شکلیں۔ مصنف نے یہاں Maumet کو شمار نہیں کیا جس کی سب سے زیادہ شکلیں آکسفرڈ ڈکشنری میں بتائی گئی ہیں اور ان کو شامل کرنے کے بعد ناموں کی یہ فہرست ستر سے بھی زیادہ تک پہنچ جاتی ہے (مترجم)

قرآن کا یہ گمنام ترجمہ الکزنڈر راس (Alexander Ross) کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ اسپین میں نام نہاد مورس (Moors) کے زوال کے بعد عثمانی ترک دشمن مذہب (اسلام) کے علم بردار نظر آرہے تھے۔ مارٹن لوتھر نے پہلے یہ خیال کیا کہ ترکوں کو مسیحیت کے گناہوں کی پاداش میں

خدا کا بھیجا ہوا عذاب سمجھ کر گوارا کرنا چاہئے۔ مگر ۱۵۲۹ میں جب ترک وائنا کے دروازوں تک پہنچ گئے تو اس نے اپنے ذہن کو بدل دیا اور یہ تبلیغ کی کہ ان کافروں کے خلاف جنگ کرنے کی ضرورت ہے۔

قرآن کا پہلا انگریزی ترجمہ براہ راست عربی زبان سے ۱۷۳۴ میں کیا گیا، اور اس کا مترجم جارج سیل (George Sale) تھا۔ سیل عیسائی علوم کی ترقی کی انجمن کا ایک رکن تھا اور اس نے شامی علماء کی مدد سے عربی زبان سیکھی تھی۔ سیل کا ترجمہ انگریزی دنیا میں ڈیڑھ صدی تک چھایا رہا۔

سترہویں صدی میں ایک نیا سنگ میل پیدا ہوا جب آکسفرڈ یونیورسٹی نے عربی کی تعلیم کے لئے ایک نشست اپنے یہاں مخصوص کی۔ اور ایڈورڈ پکاک (Edward Pocock) کو ۱۶۳۶ میں اس منصب پر مقرر کیا۔ پکاک چھ سال تک شام میں پادری کی حیثیت سے رہ چکا تھا اور عربی میں دستاویز اور اسلام کی براہ راست معلومات حاصل کر چکا تھا۔ آکسفرڈ میں عربی شعبہ کے کھلنے سے یورپی عربی داں پیدا ہونے کا دروازہ کھل گیا۔ پکاک خود غالباً اپنی صدی کا سب سے بڑا یورپی عربی داں تھا۔ اس نے متعدد کتابیں تصنیف یا ایڈٹ کیں۔ اس نے اپنے قارئین کو یقین دلایا کہ معلق تابوت کا افسانہ مسلمانوں کے لئے ایک مضحکہ خیز بات ہے جس کو وہ صرف عیسائیوں کی ایجاد سمجھتے ہیں۔ اس نے مزید اس مروجہ کہانی کو چیلنج کیا کہ اسلام کے بانی نے ایک سفید کبوتر کو تربیت دے رکھا تھا تاکہ وہ ان کے کندھے پر بیٹھا رہے اور کان کے اندر پڑے ہوئے دانے کو چگنے کے لئے کان میں چونچ مارتا رہے۔ اس سے وہ اپنے متبعین کو یہ یقین دلانا چاہتے تھے کہ کبوتر کے ذریعہ سے روح القدس ان کو الہام کر رہا ہے۔ یہ افسانہ اس قدر مشہور ہوا کہ وہ انگریزی ادب میں شامل ہو گیا۔ چنانچہ شکسپیئر کے ایک کردار کی زبان سے ہم سنتے ہیں:

Was Mahomet inspired by a dove,
Thou with an eagle art inspired then.

شکسپیئر سے بہت پہلے جان لڈگیٹ (John Lydgate) م ۱۴۵۱ اس کبوتر کا رنگ تک جانتا تھا۔ اس کے بیان کے مطابق کبوتر کا رنگ دودھیا سفید تھا۔ پھر یہ یقین یہاں تک بڑھا کہ اٹھارہویں صدی کے ایک کبوتروں کے ماہر نے ایک خاص قسم کے کبوتر کا نام موٹ (Maumet) رکھ دیا جو دراصل لفظ محمد کی بگڑی ہوئی شکل تھی۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ کبوتر عیسائیوں کے یہاں تو روح القدس کی علامت ضرور ہے (لوقا ۳ : ۲۲) مگر اسلام میں اس کی کوئی اصل نہیں۔

اسی طرح مومٹ (Maumet) کا لفظ بت کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ وہ شخص جس نے کعبہ میں سیکڑوں بتوں کو توڑا، جس کے پیرو فخر کرتے ہیں کہ وہی صرف حقیقۃً توحید پرست ہیں اور کسی قسم کے بت یا مورتی کو تسلیم نہیں کرتے۔ وہی شخص مغربی من گھڑت میں ایک خدا اور ایک بت بن گیا۔ قرون وسطیٰ کی انگریزی روایات میں مہون (Mahoun) بار بار پرستش کا ایک مظہر قرار دیا گیا ہے۔ یہ مان لیا گیا تھا کہ ترکوں اور مسلمانوں کے یہاں اس کی پوجا ہوتی تھی۔

مومٹ کی طرح قرآن بھی الکرون (Alkaron) کے نام سے مسلمانوں کا ایک بت قرار پایا۔ مغربیوں کو یقین دلایا گیا کہ مسلمان اپنے بتوں کے آگے عبادتی رسوم منعقد کرتے ہیں جن میں لوبان جلایا جاتا ہے اور نرسنگھا پھونکا جاتا ہے۔ اسی طرح سورج (Apollo) ان کا دوسرا دیوتا تھا۔ ایک فرانسیسی مصنف کے بیان کے مطابق ۷۷۸ء میں شارلی مین کی فوجوں سے مسلمانوں کو "شکست" ہوئی تو انھوں اپنا غصہ سورج دیوتا کے اوپر نکالا اور اس پر پل پڑے۔ ایلزبتھ کے دور کا ایک اور نامور مصنف فرانسس بیکن (Francis Bacon) محمدؐ کو عطائی (Mountebank) قرار دیتا ہے۔ اس نے اپنے مقالہ "ہمت واستقلال" (Boldness) میں نقل کیا ہے:

"محمد نے لوگوں کو یقین دلایا کہ وہ ایک پہاڑی کو بلائیں گے اور وہ ان کے پاس چلی آئے گی۔ لوگ جمع ہوئے۔ محمد نے پہاڑی کو اپنے پاس آنے کے لئے کہا۔ وہ بار بار پکارتے رہے اور جب پہاڑی اپنی جگہ کھڑی رہی تو وہ ذرا بھی نہیں شرمائے۔ بلکہ انھوں نے کہا — " اگر پہاڑی محمد کے پاس نہیں آسکتی تو محمد تو پہاڑی تک جا سکتے ہیں۔"

Works of Francis Bacon, Vol. II. London 1929, p. 279

مگر حقیقت یہ ہے کہ اسلام میں اس واقعہ کی کوئی اصل موجود نہیں ہے۔ تاہم قرون وسطیٰ کے تمام مصنفین نے اسی خلاف اسلام انداز کو نہیں اپنایا تھا۔ صلیبی دور کا ایک بشپ جس کی پیدائش شام میں ہوئی تھی، ولیم آف ٹریپولی (William of Tripoli) نے ۱۲۷۰ میں ایک رسالہ لکھا جس میں اگرچہ محمد کو وہ جھوٹے رسول کی حیثیت سے تسلیم کرتا ہے۔ مگر آپ کے حالات میں دشنام طرازی اور افسانوی حصے کو بہت کم کر کے پیش کیا ہے۔ اسی طرح ۱۶۷۹ میں ایک انگلش پادری لانسلاٹ اڈیسن (Lancelot Addison) نے ایک کتاب لکھی جس میں اس نے ان من گھڑت اجزاء کو الگ کرنے کی

کوشش کی جو محمد کے نام کے ساتھ وابستہ ہو گئے تھے۔ بعض بعض مواقع پر اس نے پہلے کسی واقعہ کی افسانوی تصویر کو نقل کیا ہے اور اس کے بعد تاریخی حقیقت کو بیان کیا ہے۔ اڈیسن کے ایک ہم عصر ہمفری پرائیڈکس (Humphrey Prideaux) نے آپ کی مکمل سوانح حیات لکھی جس میں کبوتر کے قصہ کو اور اسی طرح دوسری بہت سی کہانیوں کو یہ کہہ کر رد کر دیا کہ ان کو صحیح ماننے کے لئے کوئی واقعی بنیاد موجود نہیں ہے۔ تاہم اس سوانح حیات کا مقصد صرف یہ ثابت کرنا تھا کہ اسلام ایک مکارانہ مذہب (Fraudulent Religion) کا معیاری نمونہ ہے۔ یہ سوانح عمری ایک صدی تک مغربی حلقوں میں مستند سمجھی جاتی تھی۔

زیادہ رواداری کا نقطۂ نظر اٹھارہویں صدی میں پیدا ہوا۔ اس زمانہ میں مغرب کے عربی دانوں نے اسلام کے متعلق زیادہ قابل اعتماد ذرائع کا ترجمہ کیا۔ سیاح اور تاجر زیادہ اچھے تاثرات لے کر لوٹے اور سفیروں اور مشنری کے عہدیداروں نے بھی اضافۂ معلومات میں حصہ لیا۔ مثال کے طور پر جارج سینڈیز (George Sandys) جس نے قسطنطنیہ، مصر اور فلسطین کی زیارت کی تھی، وہ ۱۶۱۵ء میں اپنے سفر کی روداد لکھتے ہوئے مسلمانوں کی اور بہت سی چیزوں کے ساتھ زکوٰۃ کی تعریف کرتا ہے جو عیسائی اور یہودی غربار کو بھی دی جاتی تھی۔ تاہم زیادہ تر مثالوں میں لوگ ذاتی تحقیق سے زیادہ روایتی معلومات ہی پر اکتفا کرتے رہے۔ حتیٰ کہ متخصصین پروفیسروں تک کا یہ حال تھا کہ پیدائشی طور پر سنی سنائی روایات کو دہرا دیا کرتے تھے۔ پکاک کا جانشیں جوزف وائٹ (Josef White) ۱۷۸۴ میں اپنے مشہور بیمپٹن لکچرز (Bampton lectures) میں مسیحیت کی حمایت کرتے ہوئے جب اسلام پر آیا تو محمد کے لئے اس کے پاس جو لفظ تھا وہ وہی عام روایتی لفظ تھا یعنی مکار اور فریبی (Imposter) اسی طرح بعد کے ممتاز علمار مثلاً ولیم میور (اڈنبرا یونیورسٹی) ڈاٹ ایس۔ مارگولیتھ (آکسفورڈ) ہنری لامنز (بیروت یونیورسٹی) کے یہاں بھی قدیم رجحانات کے آثار ملتے ہیں۔

مقالہ نگاروں اور مورخوں کے ہاتھوں میں محمدؐ، قرآن اور اسلام کا معاملہ اس سے بہتر رہا ہے جو پہلے مذہبی علمار، ناول نگاروں اور شاعروں کے ہاتھ میں ان کا حشر ہوا تھا۔ اس سلسلے میں پہلا قابل ذکر نام سائمن آکلے (Simon Ockley) کا ہے جو کیمبرج یونیورسٹی میں عربی کا پروفیسر تھا۔ اس نے مسلمانوں کی تاریخ پر دو جلدوں میں ایک کتاب لکھی ہے۔ اگرچہ کیمبرج کا یہ عالم بھی مکار (Imposter) کو محمد کے ہم معنی لفظ کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ اور اسلام اور توہمات اس کے یہاں مرادف الفاظ ہیں۔ مگر

مخصوص تاریخی واقعات کے بیان میں اس نے راست گوئی سے کام لیا ہے۔ شام کی فتح کا حال بتاتے ہوئے، مثال کے طور پر، وہ بازنطینیوں کی غارت گری اور دغا بازی کا مقابلہ ابوبکر کی نوجوں کی شجاعت اور ان کے اعلیٰ رویہ سے کرتا ہے جن کو خلیفہ کی ہدایت تھی کہ کسی عورت یا بچہ کو قتل نہ کریں، کھجوروں کے درخت نہ کاٹیں اور نہ کھیت کو نقصان پہنچائیں۔ آکلے کی اس کتاب نے مستند درجہ حاصل کیا اور گبن کے ظہور سے پہلے تک وہ عرب تاریخ پر بنیادی ماخذ سمجھی جاتی رہی۔

اڈورڈ گبن (Edward Gibbon) جو جدید انگریزی تاریخ کا بانی ہے، اس نے اپنی مشہور کتاب "سلطنت روما کا زوال" کی پانچویں جلد کے پچاسویں باب کو اس موضوع کے لئے مخصوص کیا ہے۔ اپنے اعتراف کے مطابق وہ "مشرقی زبانوں سے مکمل طور پر ناواقف" تھا۔ اس لئے قدرتی طور پر اس کا ماخذ وہی کتابیں تھیں جو اس سے پہلے یورپ میں لکھی گئی تھیں اور اس بنا پر اس کی ترجمانی بھی واقعہ کے مطابق نہ ہوسکی۔ تاہم اس نے بہت سی روایات کو غلط قرار دیا مثلاً اس نے کہا کہ مکار نبی کا لقب ایک خطرناک اور ناقابل اعتبار (Perilous and Slippery) چیز ہے۔

فرانس میں والٹیر پیدا ہوا جو بحیثیت مورخ زیادہ محتاط تھا مگر بحیثیت المیہ نگار (Tragedian) محتاط نہیں تھا۔ اپنی تاریخی کتاب ۱۷۵۶ میں وہ محمدؐ کا ذکر رواداری کے ساتھ کرتا ہے۔ وہ محمد کا مقابلہ کرامویل (Cromwell) سے کرتا ہے۔ وہ ان کے کارناموں کو انگلینڈ کے نجات دہندہ (کرامویل) سے بہت زیادہ عظیم قرار دیتا ہے مگر اپنے المیہ ناٹک (Tragedy) ۱۷۴۲ میں وہ محمد کو قرون وسطیٰ کے لباس میں مکار، ظالم اور عیاش بنا کر پیش کرتا ہے۔ اگرچہ یہ بھی حقیقت ہے کہ والٹیر کا اسلام پر حملہ، عموی طور پر اس کے مخالف مذہب ہونے کا نتیجہ تھا۔ والٹیر کا انحصار انگریزی ماخذ پر تھا۔ خاص طور پر سیل کا ترجمہ قرآن کیوں کہ وہ انگلینڈ میں رہا تھا اور انگریزی زبان سیکھی تھی۔

والٹیر سے زیادہ جرمن شاعر گوئٹے (۱۸۳۲-۱۷۴۹) وہ شخص تھا جو جدید اسپرٹ اور نئے بین اقوامی نقطۂ نظر کا پیغامبر بنا۔ گوئٹے نے اپنی زندگی میں محمدؐ کے حالات پر ایک نظم شروع کی مگر وہ اس کو مکمل نہ کرسکا۔ گوئٹے یہ یقین کرنے کے لئے تیار نہ تھا کہ عربی پیغمبر ایک مکار شخص تھا۔ سعدی کی گلستاں کے جرمن ترجمے نے خاص طور پر گوئٹے کو بہت متاثر کیا۔ ۱۸۱۲ میں حافظ کے کلام کا جرمن زبان میں ترجمہ ہوا تو گوئٹے کو اس میں حکمت، تقدس اور سلامتی نظر آئی جو اس کے خیال میں مغرب

کو خاص طور پر درکار تھی۔

اسلامی کلچر کے بارے میں مغربی علما کا بدلا ہوا نقطہ نظر جس کا آغاز انگریز اور فرانسیسی پروفیسروں نے کیا تھا اور جرمن اور دوسرے ادیبوں اور شاعروں نے جس کو تقویت دی تھی، وہ انیسویں صدی کے وسط تک بالکل واضح ہو گیا۔ کارلائل کا محمدؐ کو پیغمبرانہ ہیرو کے کردار کے لئے منتخب کرنا، بیک وقت نئے رجحان کی طرف اشارہ تھا۔ اور اس میں اضافہ کرنے والا بھی تھا۔ کارلائل کی کتاب میں مشکل سے کوئی ناخوشگوار فقرہ ہوگا۔ درحقیقت یہ کتاب اس لئے قابل تنقید ہو سکتی ہے کہ وہ غیر تنقیدی ہے "محمدؐ ایک سازشی مکار ہیں، وہ جھوٹ کا مجسمہ ہیں۔ ان کا مذہب محض عطائی نسخوں کا مجموعہ ہے ـــــ اس قسم کی باتیں کارلائل کو گوارا نہیں تھیں۔ اس کا ہیرو (محمد) واقعی ایک انسان تھا، سچا انسان۔

عرض مترجم

اوپر جو ترجمہ نقل کیا گیا ہے، وہ بتاتا ہے کہ عیسائی حضرات نے پیغمبر اسلام کو بدنام کرنے کے لئے کتنی زیادہ لغو حرکتیں کی ہیں۔ مزید یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قدیم زمانہ میں پیغمبروں کے ساتھ کس قدر ظالمانہ سلوک کیا گیا ہے۔

خدا کے پیغمبر خالص سچائی کے علمبردار تھے۔ ان کا وجود ان لوگوں کو غیر معتبر ثابت کرنے کے ہم معنی تھا جو جھوٹ پر کھڑے ہوئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ پیغمبروں کو برداشت نہ کر سکے۔ انھوں نے پیغمبروں کی سخت ترین مخالفت کی اور ان کے بعد ان کی تاریخ کو اس طرح بگاڑ ڈالا کہ کوئی شخص ان کی سیرت اور ان کے پیغام کو جاننا چاہے تو اس کے لئے اس کے متعلق صحیح معلومات حاصل کرنا ممکن ہی نہ رہے۔

اوپر یورپ کے مسیحی لٹریچر کی جو مثالیں، نقل کفر کفر نباشد کے اصول کے تحت درج کی گئی ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی وہی سب کچھ بدترین شکل میں کیا گیا جو دوسرے پیغمبروں کے ساتھ کیا گیا تھا۔ آپ کے مخالفین نے آپ کی سیرت اور آپ کے پیغام کو بگاڑنے کے لئے وہ سب کچھ کیا جو وہ کر سکتے تھے۔

مگر یہاں دونوں کے درمیان ایک زبردست فرق ہے۔ دوسرے پیغمبروں کی سیرت اور

ان کے پیغام کو بگاڑنے والے بظاہر اپنے اعتبار سے کامیاب ہو گئے۔ یعنی انھوں نے بگاڑنا چاہا اور عملاً بگاڑ دیا۔ چنانچہ ان سابق پیغمبروں کے بارہ میں آج قرآن کے باہر کہیں صحیح تاریخی ریکارڈ نہیں ملتا۔ حتی کہ ان کی اپنی کتابوں میں بھی نہیں۔ لیکن پیغمبر اسلامؐ کے معاملہ میں صورت حال بالکل مختلف رہی۔ یہاں مخالفین کی ساری کارروائیاں بالکل ناکام ہو کر رہ گئیں۔ لوگوں کی بدترین مخالفانہ کوششوں کے باوجود، آج آپ کی تاریخ اور آپ کی لائی ہوئی تعلیمات کا متن اس طرح کامل صورت میں محفوظ ہے کہ اس سے زیادہ محفوظ اور مستند صورت موجودہ دنیا میں ممکن نہیں۔

یہ کوئی سادہ سی بات نہیں۔ یہ فرق دراصل پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم الرسل ہونے کا عظیم الشان ثبوت ہے۔ پچھلے زمانوں میں جو پیغمبر آئے، وہ علم الٰہی کے مطابق، سلسلہ نبوت کے خاتم نہ تھے۔ ان کے بعد بھی نبیوں کی آمد کا سلسلہ جاری رہنے والا تھا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ یہ معاملہ نہیں کیا کہ ان کے مخالفین کی معاندانہ کارروائیوں کو غیر موثر بنا دے تاکہ وہ ان کی تاریخ اور ان کی تعلیمات کو بگاڑنے سے عاجز رہ جائیں۔

مگر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا معاملہ یہ تھا کہ علم الٰہی کے مطابق وہ آخری رسول اور خاتم النبیین تھے۔ آپ کے بعد پھر کوئی نبی یا رسول آنے والا نہ تھا، اس لئے ضروری تھا کہ آپ کی سیرت اور آپ کی تعلیم کامل طور پر محفوظ رہے۔ کیوں کہ آپ کی سیرت اور آپ کی تعلیم کے غیر محفوظ ہو جانے کی صورت میں دوسرے نبی کا آنا ضروری ہو جاتا۔

خاتم النبیین صرف سلسلۂ نبوت کو ختم کرنے والے نہ تھے۔ اسی کے ساتھ آپ مخالفین حق کے لئے اس موقع کو بھی ختم کر دینے والے تھے کہ وہ پیغمبر کی سیرت اور اس کی تعلیمات کو بگاڑنے یا مٹانے میں کامیاب ہو سکیں۔ ختم نبوت لازمی طور پر حفاظت نبوت کی مقتضی ہے، اور اس کا اہتمام اللہ تعالیٰ کی طرف سے پوری طرح کر دیا گیا ہے۔

اب پیغمبر کی آمد کا سلسلہ بلاشبہ ختم ہو چکا ہے۔ مگر خود ختم نبوت ہی کے طفیل میں مومنانہ نبوت کو ایک عظیم الشان خدائی مدد ابدی طور پر حاصل ہے۔ وہ یہ کہ اگر وہ پیغمبر خدا کی سچی اور بے آمیز دعوت کو لے کر اٹھیں تو ان کے مخالفین کی بڑی سے بڑی کوششیں ہباءً منثوراً ہو کر رہ جائیں گی۔ دعوتِ رسالت کو بدنام کرنے یا اس کو ناکام بنانے کی ہر کوشش کا وہی انجا

ہوگا جو خود ذات رسالت کے معاملہ میں ہوا۔ یہ خداوند عالم کا فیصلہ ہے، اور خداوند عالم کے فیصلہ کو کوئی بدلنے والا نہیں۔

ختم نبوت کا لازمی تقاضا حفاظت نبوت ہے، اور حفاظت نبوت کا لازمی تقاضا حفاظت امت۔ یہ تینوں آپس میں لازم وملزوم ہیں۔ ختم نبوت اس کے بغیر مکمل نہیں کہ نبوت کا ریکارڈ پوری طرح محفوظ حالت میں موجود رہے۔ اور اس عالم اسباب میں نبوت کا ریکارڈ اسی وقت محفوظ رہ سکتا ہے جب کہ ایک امت مسلسل اس کی پشت پر کھڑی ہوئی ہو۔

یہ صورت حال امت محمدی کی حفاظت کی سب سے بڑی ضمانت ہے۔ اب امت کو صرف ایک کام کرنا ہے۔ وہ نبوت کی چوکیدار بنی رہے، جس میں نبوت کی تبلیغ واشاعت بھی لازمی طور پر شامل ہے۔ اس کے بعد اغیار اور اعداء کے مقابلہ میں اس کی حفاظت کا کام خود خدا کی طرف سے قیامت تک کیا جاتا رہے گا، اس کے لئے امت کو الگ سے اہتمام کرنے کی ضرورت نہیں۔

خاتونِ اسلام

اسلامی شریعت میں عورت کا مقام

اسلام اور جدید تہذیب کا تقابل

از: مولانا وحید الدین خاں

(صفحات ۲۹۲، قیمت ۳۵ روپیہ)

مکتبہ الرسالہ

سی-۲۹، نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی-۱۳ فون: 697333, 611128

خبرنامہ اسلامی مرکز ۴۶

۱۔ گول مارکیٹ (نئی دہلی) میں ایک اجتماع ہوا جس میں تعلیم یافتہ افراد شریک ہوئے۔ اس موقع پر صدر اسلامی مرکز نے ایک مفصل تقریر کی۔ تقریر کا موضوع تھا: موجودہ زمانہ میں اسلام کا احیاء، مسائل اور امکانات۔

۲۔ محمد حسین مقدم صاحب (پیدائش ۱۹۵۴) عرب میں رہتے ہیں۔ وہ کلاتھ امپورٹر ہیں۔ اپنے کام کے سلسلہ میں انھیں اکثر انگلینڈ، سوئٹزرلینڈ، جرمنی اور دوسرے یورپی ملکوں میں جانا ہوتا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ وہ اپنے ساتھ الرسالہ انگریزی کے پرچے رکھتے ہیں اور سفر کے دوران جن سنجیدہ لوگوں سے ملاقات ہوتی ہے ان کو پیش کرتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ جو لوگ پڑھتے ہیں وہ اچھے تاثر کا اظہار کرتے ہیں۔

۳۔ صدر اسلامی مرکز کا ایک درس ۲۰ اگست ۱۹۸۸ کو نئی دہلی میں ہوا تھا۔ اس کا موضوع "عقیدۂ آخرت کا عقلی تجزیہ" تھا۔ درس کے بعد حاضرین میں سے ایک صاحب کا خط مورخہ ۲۷ اگست ۱۹۸۸ موصول ہوا ہے۔ اس خط کا ایک حصہ یہ ہے:

I take this opportunity to inform you that your talk on *Akhirat* had tremendous effect on the audience. Your points have been very well received and appreciated. One of the persons, who attended the meeting for the first time, said that he never expected such deeply explored materials from a theologian. (S. Shafiuddin, M.A.)

۴۔ جن جاگرن جن کلیان مومنٹ کی آل انڈیا کانفرنس ۱۷-۱۸ ستمبر ۱۹۸۸ کو کاچی پورم (مدراس) میں ہوئی۔ اس میں شرکت کے لیے صدر اسلامی مرکز کے نام دعوت نامہ موصول ہوا تھا۔ مگر بعض دوسری مصروفیات کی بنا پر موصوف اس میں شرکت نہ کرسکے۔ البتہ تحریک کے ذمہ داروں کے نام مرکز کا انگریزی لٹریچر بذریعہ ڈاک روانہ کردیا گیا ہے۔

۵۔ "گاڈ ارائزز" خدا کے فضل سے جدید طبقہ میں غیر معمولی مقبولیت حاصل کررہی ہے۔ اس کا اندازہ کرنے کے لیے یہاں ایک خط کے الفاظ نقل کیے جاتے ہیں۔ مسٹر ایس بورا (سپرنٹنڈنگ انجینئر آسام) اپنی فرمائش بھیجتے ہوئے لکھتے ہیں:

Please rush me one copy of *God Arises* (In English language) by Maulana Wahiduddin Khan.

۶۔ الرسالہ مشن کے ذریعہ خدا کے فضل سے ایک نیا ذہن بن رہا ہے جو فرقہ وارانہ فسادات کی جڑ کاٹ رہا ہے۔ ایک مقام کے بارہ میں معلوم ہوا کہ وہاں ایک شرپسند نے خنزیر کاٹ کر اس کا سر مسجد کے اندر ڈال دیا۔ فجر کے وقت چند مسلمان جب اس مسجد میں نماز پڑھنے کے لیئے آئے تو انھوں نے خنزیر کا سر دیکھا۔ یہ الرسالہ کے پڑھنے والے لوگ تھے۔ چنانچہ انھوں نے فوراً ہی اس کو بوری میں لپیٹا اور لے جاکر ایک گہرے گڑھے میں ڈال دیا۔ یہ واقعہ جب مشہور ہوا تو بستی کے سربرآوردہ لوگ اس سے بہت خوش ہوئے۔ جو واقعہ عام حالات میں بستی کی بربادی کا سبب بنتا وہ بستی کے اندر مسلمانوں کی اخلاقی عظمت اور ہندو مسلم تعلقات کی بہتری کا سبب بن گیا۔

۷۔ مسٹر کے۔ این۔ تیاگی (ریڈر میرٹھ کالج۔ میرٹھ) اپنے خط ۳ ستمبر ۱۹۸۸ میں لکھتے ہیں:

I am a regular reader of your benevolent Journal for over a year now. Its contents are not to the benefit of Muslims alone but to the people of all communities, castes and creed and to the members of any sex. The article 'A Journey' by Maulana Wahiduddin Khan (*Al-Risala*, Sept. 88) was revealing. The Conference on Communalism and National Integration held in August 1986 at Bombay gave the matured, deep rooted thinking of the Maulana on the vulnerable subject of communalism. At a time when fundamentalists in various communities are bent upon injecting the venom of communalism into the blood of ignorant masses this article and sustained thoughts portraying the real man in the Maulana will go a long way to diffuse the detonator of the communal bomb. I keep the Maulana with great esteem. I have carefully read the book *Muhammad — The Prophet of Revolution* by the same author.

۸۔ الرسالہ میں جس طرح دعوت پر زور دیا جارہا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ قارئین الرسالہ میں عام طور پر دعوت کا طاقت ور جذبہ پیدا ہو رہا ہے۔ لوگ اپنے اپنے حالات کے اعتبار سے مختلف صورتوں میں دعوتی ذمہ داری کو ادا کر رہے ہیں۔ ایک بڑے مقام پر بہت سے بیرونی ماہرین کام کرنے کے لیے آئے ہوئے ہیں۔ وہاں ہمارے ساتھی ان سے رابطہ قائم کر کے الرسالہ انگریزی انھیں پہنچا رہے ہیں۔ احمد شریف صاحب (سیلم) نے حال میں اپنا نیا گھر بنوایا تو تعمیر کے دوران غیر مسلم

مزدوروں اور مستریوں کو الرسالہ کے مضامین پڑھ کر سناتے اور ٹامل زبان میں اس کی تشریح کرتے۔ وغیرہ

۹۔ ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ (حیدرآباد) کے تحت مولانا ابوالکلام آزاد کی صدسالہ برسی منائی گئی۔ اس کے تحت حیدرآباد میں تین روزہ پروگرام تھا۔ اس کے لیے دعوت نامہ موصول ہوا، اور ۱۲ نومبر ۱۹۸۸ کے پروگرام میں صدر اسلامی مرکز کو چیف گیسٹ کے طور پر مقرر کیا گیا۔ مگر صدر اسلامی مرکز اپنی بعض مصروفیات کی بنا پر اس میں شریک نہ ہو سکے۔ البتہ متعلقہ موضوع سے متعلق کچھ تحریری مواد کانفرنس کے منتظمین کے نام روانہ کر دیا گیا۔

۱۰۔ ایک صاحب اپنے خط یکم ستمبر ۱۹۸۸ میں لکھتے ہیں: الرسالہ میری روح کی غذا بن چکا ہے۔ وہ قدم قدم پر میری رہنمائی کرتا ہے۔ اس طرح میں بہت سے غلط اقدام سے محفوظ رہتا ہوں۔ یہ الرسالہ ہی ہے جس نے مجھے اس قابل کیا کہ میں اپنا احتساب خود کر سکوں (ڈاکٹر انور عباس، امروہہ)

۱۲۔ ڈاکٹر شکری سری لنکا کے انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کے ڈائرکٹر ہیں۔ انہوں نے اپنے خط مورخہ ۳۰ اگست ۱۹۸۸ میں الرسالہ (انگریزی) کے پیغام اور اس کی زبان و اسلوب کا غیر معمولی اعتراف کرتے ہوئے مرکز کی انگریزی کتابوں کے بارہ میں مزید لکھا ہے:

I am also very much pleased to receive your two books *Religion and Science* and *God Arises*. You have marshalled all your arguments beautifully and convincingly in justifying the case for Divine revelation and also invalidating the secularist, empirical approach in the understanding of the mysteries of the universe and life. This will no doubt clear the mental confusion in which the contemporary youths are entangled due to the pernicious influence of modern secular civilization. (Dr M.A.M. Shukri)

۱۱ ایک صاحب اپنے خط ۱۱ ستمبر ۱۹۸۸ میں لکھتے ہیں کہ الرسالہ کئی سالوں سے زیر مطالعہ ہے۔ الحمد للہ الرسالہ وقت کی اہم ترین تحریک ہے۔ یہ وہ آواز ہے کہ انشاء اللہ اس آواز سے قلوب مسلم ایسے بیدار ہوں گے جو اسلاف اسلام کی جیتی جاگتی تصویر ہوں گے۔ یہ وہ شمع ہے جو ہر اس قلب میں منور رہے گی جس میں ایمان کی چنگاری موجود ہو (محمد الیاس حبان رحیمی، بنگلور)

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور صاحبِ ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴۔ صاحبِ استطاعت افراد کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کردیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط و کتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

زرِ تعاون الرسالہ

زرتعاون سالانہ	۴۸ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	۲۵۰ روپیہ
بیرونی ممالک سے	
ہوائی ڈاک	۲۰ ڈالر امریکی
بحری ڈاک	۱۰ ڈالر امریکی

Accession Number 121725
Date 27.10.92

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلیشر مسئول نے مایل آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

تذکیر القرآن

جلد اول : سورۃ فاتحہ ۔ سورۃ بنی اسرائیل

جلد دوم : سورۃ الکہف ۔ سورۃ الناس

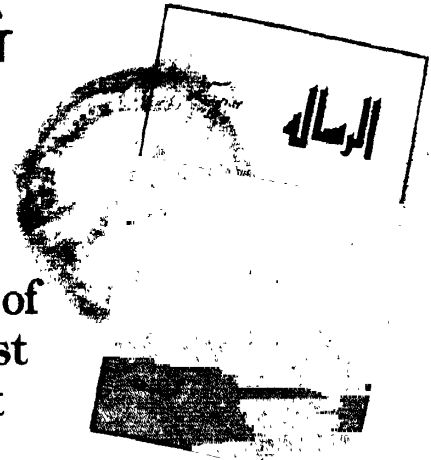
ن کی بے شمار تفسیریں ہر زبان میں لکھی گئی ہیں۔ مگر تذکیر القرآن اپنی نوعیت
پہلی تفسیر ہے۔ تذکیر القرآن میں قرآن کے اساسی مضمون اور اس کے بنیادی
سد کو مرکز توجہ بنایا گیا ہے۔ جزئی مسائل اور معلوماتی تفصیلات کو چھوڑتے
ئے اس میں قرآن کے اصل پیغام کو کھولا گیا ہے اور عصری اسلوب میں اس
ے دعوتی اور تذکیری پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے۔ تذکیر القرآن عوام و خواص
ں کے لیے یکساں طور پر مفید ہے۔ وہ طالبینِ قرآن کے لیے فہم قرآن کی کنجی ہے۔

ہدیہ جلد اول ۱۰۰ روپیہ

جلد دوم ۱۰۰ روپیہ

مکتبہ الرسالہ، نئی دہلی

GIFTING The Word of God



To spread the word of God is the highest form of charity. It appeals to the mind, the heart, the soul, that being the earnest endeavour of this magazine, how noble-spirited it would be of you, dear readers, if you sent it on regularly to friends and relatives. Make a **GIFT** of it. Think of a whole year's subscription as being both a delightful present as well as a contribution to a worthy cause.

Please send AL-RISALA to my friend/ relative to the following address:

Name ....

Address ....

....

....

(Pl[illegible]

I am [illegible] /Postal Order/

B. [illegible]

[illegible]

Please tick box where applicable

☐ URDU

☐ ENGLISH

☐ ONE YEAR

☐ TWO YEARS

Annual Subscription Rates

INLAND Rs. [illegible]

ABROAD

[illegible]

[illegible]

GIFT AL-RISALA TO YOUR FRIENDS & RELATIVES